
بہترین کہانیوں کا انتخاب
ڈائجسٹ
سب رنگ

رنگ رنگ

مدیر
شکیل عادل زادہ

ادارۂ تحریر
حسن ہاشمی، شاہد اسماعیل لودھی

نائب مدیر
انور شعور

معاونین
عابد حسین، عابد حسن، تحریر احمد زبیری

مصورین
انعام راجا، ذوالفقار آرٹس، عبدالرحیم مومن

قانونی مشیر
[illegible]

تعلقات عامہ
اکرام احمد

اشتہارات
[illegible]

مالیات
اقبال قریشی

تزئین
رشید شاہد، [illegible]

طباعت
افضال احمد

اشاعت
محمد یوسف

سب رنگ

پبلشر اینڈ پرنٹر
شکیل عادل زادہ [illegible]
[illegible]
سے چھپوا کر 19 [illegible]
[illegible]
کراچی سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ
47-48 [illegible]
آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی
فون
211944 - 211961
[illegible]
[illegible] پشاور
جلد : 29
شمارہ : 117-118
[illegible]
قیمت 40 روپے
[illegible]
[illegible]
SUBRANG
فیکس 262-6201
ای میل
<SAZECYBER.NET.PK>

سوال نامہ

تمام سوالوں کے جواب لازم ہیں۔ خوب غور و فکر کے بعد کم سے کم وقت میں اپنے جوابات تحریر کیجیے۔
کل نشانات 100 ہیں۔

حصۂ اوّل

سوال ١- مندرجہ ذیل اشیا سے متعلق موجدوں اور دریافت کرنے والوں کے نام و ان کی ولدیت لکھیے۔

الف : لالٹین، پیٹرومیکس، بجلی، موٹر کار، ریل گاڑی، طیارہ۔

ب : گھڑی، دوربین، کیمرا، چشمے، پنسل، فاؤنٹین پین، بال پین، بیٹری، سائکل، موٹر سائکل، ریڈیو، گراموفون، لاؤڈ اسپیکر۔

ج : ٹائپ رائٹر، ٹیلے فون، ٹیلے گرام، ٹیلے پرنٹر، کیل کولیٹر، فیکس، کمپیوٹر، ٹیپ رکارڈر، سی ڈیز پلے یر، فوٹو اسٹیٹ مشین، چھاپا مشین، اخبار۔

د : جوسر، بلینڈر، مکسچر، اوون، مائکرو ویو اوون، باربی کیو مشین، فریج، فریزر، ڈش واشر، ٹوسٹر، ہیٹر، گیزر، ہاٹ پاٹ۔

ہ : چارجڈ لائٹ لیمپ، ہیٹر، بجلی کا پنکھا، روم کولر، ایر کنڈیشنر، ٹی وی، وی سی آر، ڈش انٹینا (سیٹلائٹ نشریات)

حصۂ دوم

سوال ١- کیا آپ کو معلوم ہے، فصلوں کی حفاظت کے لیے جراثیم کش ادویہ پر کس نے تحقیق کی اور زمین سے پانی نکالنے کے برقی انجن، جلد سے جلد اجناس صاف کرنے کی مشین، دھاگا بنانے اور مختلف قسم کا کپڑا بننے کی مشینیں کس نے ایجاد کیں؟

سوال ٢- بڑے پیمانے پر ڈیری فارمنگ، پولٹری فارمنگ کا تجربہ سب سے پہلے کہاں ہوا؟

سوال ٣- فلائی اوور برج، ٹریفک سگنل، آب رسانی اور آب نکاسی آب کے طریقے کس نے متعارف کرائے؟

سوال ٤- ایکس رے، الٹرا ساؤنڈ، تھرمامیٹر، مختلف امراض کی تفتیش اور سرجری کے آلات، شعاعوں سے علاج کس نے ایجاد اور دریافت کیا؟

سوال ٥- پیٹرول، گیس، شمسی توانائی، جوہری توانائی کس نے دریافت کی؟

سوال ٦- ایلوپیتھک طب کی مقبولیت کا سبب کیا ہے؟

سوال ٧- سب سے زیادہ یونی ورسٹیاں، کتب خانے کس براعظم میں واقع ہیں؟

سوال ٨- ماحولیات، جینیات، شماریات، نفسیات، حیاتیات، فلکیات، جوہری توانائی، خلائیات، زرعیات اور کیمیا کے بڑے تحقیقی ادارے کہاں قائم ہیں؟

سوال ٩- جاپان، کوریا اور ملائیشیا کی تیز تر ترقی کا راز کیا ہے؟

حصۂ سوم

سوال ١- حصۂ اوّل میں جن اشیا کا ذکر کیا گیا ہے، آپ کی زندگی سے نکال دی جائیں تو آپ کے پاس کیا کچھ باقی رہ جائے گا؟

سوال ٢- تہذیب کے ارتقا میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا کتنا دخل ہے؟

سوال ٣- دنیا کی قدیم، عظیم تہذیبوں، چین، بابل و آشور، یونان و مصر، اور ہندوستان کے زوال کے اسباب کیا تھے؟

سوال ٤- کیا آپ اس خیال سے متفق ہیں کہ برتر تہذیبیں، کم تر تہذیبوں پر غالب آجاتی ہیں؟

سوال ٥- اطلبو العلم ولو کان بالصین سے کیا مراد ہے اور ہم نے کب سے اسے محض وظیفۂ لب بنا رکھا ہے؟

حصۂ چہارم

سوال ١- مدلل انداز میں مغرب کے کم از کم دس سنگین جرائم کی نشان دہی کیجیے، زیادہ کی کوئی حد نہیں۔
(آخری سوال کے نشانات 50 ہیں)

ذاتی صفحہ

[illegible]

روڈ ڈیل، جدی تعلق، ناروے، پیدائش، گلے مورگن، انگلستان 1961، رپٹن اسکول میں تعلیم، نیو فاؤنڈ لینڈ میں تیل کی تلاش کی مہم میں شرکت اور شیل آئل کمپنی سے وابستگی، چار سال بعد کمپنی کی طرف سے دارالسلام روانگی، سال بھر بعد دوسری عالمی جنگ چھڑ جانے پر برطانیہ کی شاہی فوج میں شمولیت اور جنگ جو ہوائی دستے، مقیم نیروبی میں تعیناتی۔ لیبیا کے علاقے میں جہاز پر دشمن کا حملہ اور شدید زخمی۔ صحت یاب ہوتے ہی دوبارہ ہوائی فوج کا رخ اور برطانوی سفارت خانے، واشنگٹن میں نائب ہوائی اتاشی کا منصب، وہاں سے طلبی پر محکمہ سراغ رسانی میں تقرری۔ جنگ کے اختتام پر ونگ کمانڈر کے عہدے پر سرفرازی اور سبک دوشی۔ یہ ہے ایک فوجی، ہوا باز، سفارت کار، سراغ رساں کی زندگی کا خلاصہ مگر اس کی ایک فضیلت سب پر حاوی ہے، ایک قلم کار کی عزت و مرتبت۔ واشنگٹن میں قیام کے دوران اس نے ادب کاری کی طرف توجہ کی تھی اور اسی دوران اس کی بارہ کہانیاں اشاعت میں کثیر، مرتبے میں سربلند امریکی جریدوں میں شائع ہو چکی تھیں۔ بعد میں ان کہانیوں کا مجموعہ "تمھارے حوالے" Over To you کے نام سے صورت پذیر ہوا۔ دنیا کی بہت سی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ برطانیہ واپس آ کے اس نے اپنا تخلیقی سفر تمام تر توانائی سے جاری رکھا اور ساری دنیا سے عزت سمیٹی۔ "تمھارے حوالے" کے بعد اس کی فکر آموز، خیال افروز کہانیوں پر مشتمل تین اور مجموعے شائع ہوئے، پینگوئن سے ایک ناول بھی۔ انگلیا ٹیلی وژن نے اس کی متعدد کہانیوں کی ڈرامائی تشکیل کی۔ روڈ ڈیل نے بچوں کے ادب پر بھی طبع آزمائی کی اور کئی مجموعہ کتابیں تحریر کیں، قصہ مختصر، خوب نام کمایا، خوب مقام حاصل کیا۔ روڈ ڈیل کی زیر نظر کہانی حافظہ، تخیل و ادا سے اس کے لیے کمال میں صرف ایک داد لی ہی جائے۔

تریا

امریکہ سے ایک آئینہ نما تحریر
ایک ذہین وحسین، نجز رس و نکتہ بیں عورت کی کہانی
اس نے اپنے ہنر تمام کیے تھے
ترجمہ ❋ محمد ظفر

امریکہ میں عورتوں کے لیے دولت کمانے کے مواقع زیادہ ہیں۔ اسی فی صد دولت کی مالک خواتین ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب وہ صد فی صد کی مالک ہوں گی۔ طلاق حاصل کرنا یہاں ایک منافع بخش کاروبار ہے۔ خاص طور پر متناسب جسم کی خواتین نے شادی کرنا اور طلاق لینا پیشہ بنا لیا ہے۔ شوہروں کی اموات کی شرح بھی خاصی تسلی بخش ہے۔ اس کا فائدہ بھی خواتین ہی کو ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طلاق یافتہ خواتین اپنے شوہروں پر مسلسل دباؤ ڈالتی رہتی ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کا شوہر دن رات گدھے کی طرح کام کرتا رہے، زیادہ سے زیادہ ذہنی دباؤ میں رہے اور جلد از جلد مرجائے، مرتے وقت اس کے ایک ہاتھ میں بینزی ڈرائنیز کی بوتل ہو اور دوسرے ہاتھ میں خواب آور گولیوں کا پیکٹ۔

طلاق اور اموات میں ہول ناک اضافے نے امریکی مردوں کو پریشان کر دیا ہے۔ شادی کے رجحان میں غیر معمولی کمی ہو گئی ہے۔ جو نوجوان شادی کر رہے ہیں تو ان کی ازدواجی زندگی ایسی ہے جیسے چوہا بلی کے ساتھ رہ رہا ہو۔ جوانوں کی ایک بڑی تعداد اپنی کم و بیش دو سابق بیویوں کو آمدنی کا ساٹھ فی صد ماہانہ ادا کرنے پر مجبور ہے۔ ایسے مرد بہت کم ہیں جو دو ناکام شادیوں کے بعد تیسری شادی کا تجربہ کریں۔ وہ ہی مطلقہ بیویوں کے مطالبات پورے کرنے میں انھیں دن رات مشین کے مانند کام کرنا پڑتا ہے۔ چالیس سال کے بعد سے پختہ عمر مرد اپنے مستقبل سے خوف زدہ بھی ہیں اور بے نیاز بھی۔ یہ لوگ شام ہوتے ہی کلبوں، شراب خانوں اور جوئے خانوں کا رخ کرتے ہیں۔ یہ شوہروں کا سب سے مظلوم طبقہ ہے۔ اب ان کی زندگی کا مقصد شاید یہی ہے کہ شراب سے اپنا غم ہلکا کریں اور ایک دوسرے کو اپنی عبرت انگیز کہانی سنائیں۔ ان کہانیوں کا پلاٹ تقریباً ایک سا ہوتا ہے۔ یعنی ایک بیوی، ایک شوہر اور ایک ڈرٹی ڈاگ۔ ڈرٹی ڈاگ سے مراد رقیب با مراد



یہ کہانی کا آغاز عموماً ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ شوہر ایک نہایت شریف اور وفا پرست شخص تھا مگر بیوی ذلیل نکلی' وہ شوہر کی مصروفیات کے اوقات میں رنگ رلیاں مناتی تھی' آخر ایک دن شوہر نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ یہاں تک پہنچ کر کہانی سنانے والا اپنی تعریف میں دو چار جملے ضرور کہتا ہے اور اپنی بیوی کے اس قدر عیب گنواتا ہے کہ سننے والوں کے چہرے سرخ ہو جاتے ہیں مگر اب یہ کہانیاں پرانی ہو گئیں ہیں۔ اب لوگ اس قسم کی کہانیاں سن کر مسکرا دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہ واقعات اخبارات میں کثرت سے نہیں چھپتے کیوں کہ ان میں کوئی نیا پن نہیں رہا۔ لیکن کل رات ایک

شرابی نے مجھے ایسی رُوداد سنائی جو بلاشبہ کسی بہترین رسالے کی زینت بننے کے قابل ہے۔ اس کہانی کا عنوان ہے۔
"مسز بیکسی اور کرنل کا کوٹ"

مسٹر اینڈ مسز بیکسی کا قیام نیویارک کے ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں ہے۔ مسٹر بیکسی دندان ساز ہیں۔ ان کی آمدنی معقول ہے مگر مسز بیکسی کو رقم کے معاملے میں ہمیشہ شکایت رہتی ہے۔ مسز بیکسی ان عورتوں میں سے ہیں جن کی خواہشات بہت زیادہ ہیں اور آمدنی کے ذرائع محدود۔ مہینے میں ایک بار مسز بیکسی ریل میں بالٹی مور کا چکّر ضرور لگاتی ہیں۔ وہاں ان کی ایک بوڑھی خالہ رہتی ہے۔ مسز بیکسی اپنی خالہ کے گھر ایک رات قیام کرتی ہیں اور دوسرے دن شام سے پہلے نیویارک لوٹ آتی ہیں۔ رات کا کھانا وہ خود پکاتی ہیں اور مسٹر بیکسی کے ساتھ کھاتی ہیں۔ مسٹر بیکسی کو اپنی بیوی کے بالٹی مور جانے پر کوئی اعتراض نہیں' یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اُنھوں نے اس سلسلے میں سمجھوتا کرلیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ آنٹی میوری بالٹی مور میں رہتی ہیں۔ وہ ایک بوڑھی اور بیمار خاتون ہیں اور ان کی بیوی کے لیے بہت جذباتی ہیں۔ ان کی بیوی کو بھی اپنی بوڑھی خالہ سے بے حد محبت ہے۔ بظاہر ایسی کوئی وجہ نہیں تھی کہ مسٹر بیکسی مہینے میں ایک بار اپنی بیوی کو بالٹی مور جانے سے روکیں۔

تم ہمیشہ اکیلی جانے پر اصرار کرتی ہو' اگر پسند کرو تو میں بھی تمھارے ساتھ چلوں؟" مسٹر بیکسی نے ابتدا میں ایک دن اپنی بیوی سے یہ کہا تھا مگر بیوی کے جواب نے اُنھیں لاجواب کردیا۔ "وہ میری خالہ ہیں' تمھاری نہیں۔"

مسٹر بیکسی نے اس کے بعد کبھی ساتھ جانے کے لیے نہیں کہا۔ بیوی کی خالہ نے بھی کبھی اُنھیں یاد نہیں کیا اس لیے اُنھوں نے بھی کبھی اس کی خیر و عافیت کے متعلق جستجو نہیں کی۔ مسز بیکسی ہر ماہ اطمینان سے بالٹی مور جاتی رہی۔

خالہ تو محض بہانہ تھی۔ مسز بیکسی کا پابندی سے بالٹی مور جانا دراصل ایک کرنل کی محبت کی وجہ سے تھا۔ اس کرنل کے ساتھ ہماری ہیروئن کے تعلقات مسز بیکسی بننے سے پہلے کے تھے۔ کرنل ایک مال دار آدمی تھا۔ بالٹی مور کے نواح میں اُس کا ایک شان دار مکان تھا۔ اس کے ساتھ بیوی بچوں اور خاندان وغیرہ کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ زندگی بھر اس نے غیر شادی شدہ رہنے کا عہد کر رکھا تھا۔ وہ اپنے عالی شان بنگلے میں ملازمین کی فوج کے ساتھ رہتا تھا۔ مسز بیکسی سے مہینے میں ایک رات کی ملاقات کے بعد وہ باقی تمام وقت اپنے پالتو گھوڑوں اور لومڑی کے شکار میں منہمک رہتا۔ مسز بیکسی اور کرنل کے درمیان ایک عرصے سے تعلقات تھے اور کسی گڑبڑ کے بغیر جاری و ساری تھے۔ دونوں سال بھر میں محض بارہ مرتبہ ملتے تھے' کم ملاقاتوں سے تشنگی کا احساس اور محبت میں اضافہ تو ممکن ہے' بیزاری کا امکان نہیں۔ پورے ایک مہینے کی جُدائی کے بعد دونوں کی ملاقات انتہائی بے تابانہ ہوتی تھی۔ کرنل مقررہ وقت پر شان دار بیوک گاڑی میں اپنی محبوبہ کی آمد کا لمحہ لمحہ گن کر کاٹتا اور رخصت کرنے کے لیے بھی اسٹیشن آتا۔ گاڑی کے تاریک شیشوں کے پیچھے سے کرنل جذباتی الفاظ کے ساتھ اسے رخصت کرتا' اُس نے کار سے اُتر کر کبھی مسز بیکسی کا انتظار کرنے کی حماقت نہیں کی تھی۔ مسز بیکسی بھی کسی ایسی غلطی سے اجتناب کرتی تھی اسی لیے یہ معاملہ برسوں سے بہ خیر و خوبی چل رہا تھا۔

حُسن و عشق کے اس ڈرامے میں سنسنی خیز موڑ کرسمس کے موقع پر آیا۔ اپنے بہترین لباس میں سجی ہوئی مسز بیکسی طے شدہ پروگرام کے مطابق بالٹی مور کے اسٹیشن پر کرنل کا راستہ تک رہی تھی۔ اس سے پہلے اُسے کبھی ایک منٹ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا مگر آج کرنل کی گاڑی پارکنگ لاٹ پر موجود نہیں تھی' مسز بیکسی کی جبیں پُر شکن ہوئی لیکن کچھ موسم کی سہانی کچھ کرنل کے منانے کا انداز یاد کر کر کے وہ وقفے وقفے سے مسکراتی رہی۔ کرنل نے ہمیشہ اُسے محبت ہی سے نوازا تھا۔ وہ ہمیشہ اسے ایک بہترین عورت قرار دیتا اور اس کے حُسن کی تعریف میں کبھی بخل سے کام نہ لیتا۔ اتنی تعریف کرنا کسی دندان ساز کے بس کی بات نہ تھی۔ کرنل کے پاس سے ہر بار وہ بے حد مسرور اور سرشار لوٹتی۔ انتظار کرتے کرتے مسز بیکسی کے دل میں کرنل کی ناگہانی بیماری کا خیال آیا اور مختلف وسوسے ذہن میں پیدا ہوئے' اس کا دل

چاہا کہ وہ گاڑی میں خود کرنل کے پہلو میں بیٹھ جائے مگر اس سے پہلے کہ وہ اس ارادے پر عمل کرتی، کرنل کی بیوک نمودار ہو گئی۔

"کرنل کہاں ہیں؟" مسز بیکسی نے گاڑی میں اپنے محبوب کے ڈرائیور سے پوچھا۔ "وہ کچھ بیمار تو نہیں ہیں؟"

"نہیں مادام!" ڈرائیور نے جذبات سے عاری مگر ادب سے لبریز لہجے میں جواب دیا۔ "وہ بالکل خیریت سے ہیں۔"

"تو لیکن!" مسز بیکسی نے سراسیمہ ہو کر ڈرائیور کا نام لیا۔ "معلوم ہوتا ہے، تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔ بتاؤ، کرنل خود کیوں نہیں آئے؟ انھیں مجھ سے زیادہ کیا ضروری کام پڑ گیا؟" وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

"مادام!" ڈرائیور کے لہجے میں احترام تھا۔ "میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے صاحب نے اتنا حکم دیا ہے کہ میں یہ پارسل آپ کو پیش کروں اور آپ جہاں جانا چاہیں، وہاں پہنچا دوں" ڈرائیور کے اشارے پر مسز بیکسی نے اگلی نشست پر رکھا ہوا بنڈل دیکھا اور بے اختیار مسکرا دی۔ اس میں یقیناً میرے لیے کرسمس کا تحفہ ہے۔ مسز بیکسی نے بنڈل اٹھا کر گود میں رکھ لیا اور کچھ دیر تک تحفے کے بارے میں قیاس کرتی رہی، اس کی مالیت کا اندازہ لگاتی رہی۔ پھر ڈرائیور سے مخاطب ہوئی۔ "میرے لیے کوئی پیغام؟ کیا صاحب نے تمھیں کوئی زبانی پیغام دیا ہے؟"

"جی نہیں۔" ڈرائیور بولا۔ "آپ کہاں تشریف لے چلیں گی؟"

"کہیں نہیں۔ میں واپس نیویارک جاؤں گی۔" مسز بیکسی گاڑی سے اتر گئی۔

ریل میں جیسے ہی مسز بیکسی کو خواتین کے مخصوص کمرے میں جانے کا موقع ملا، اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور کرنل کا تحفہ کھول کر دیکھا۔ بنڈل کے وزن اور حجم سے اسے یقین ہو گیا تھا کہ کرنل نے اسے کوئی لباس بھیجا ہے۔ بنڈل کھولنے پر خوشی کے باعث اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کے ہاتھوں میں منک کا ایک بیش قیمت کوٹ تھا۔ چند لمحوں کے لیے اس کی سانسیں رک گئیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کرنل نے اسے اتنا قیمتی تحفہ دیا ہوگا۔ کوٹ پہن کر آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ واقعی منک کا کوٹ ہے۔ کوٹ نے اس کی شخصیت ہی بدل دی تھی۔ وہ دیر تک اس کے فر پر ہاتھ پھیرتی رہی اور اس کے رنگ کے بارے میں سوچتی رہی۔ کوٹ کا رنگ اسے کبھی سیاہ معلوم ہوا، کبھی گہرا نیلا۔ کئی مرتبہ جائزہ لینے کے باوجود وہ رنگ کے بارے میں حتمی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ رنگ سے قطع نظر، مسز بیکسی نے قیمت کے متعلق بھی اندازہ لگانا چاہا۔ کوٹ پر قیمت کا لیبل نہیں تھا، کالر کی پشت پر محض "ولڈ لیبراڈور منک" کے الفاظ کندہ تھے۔ یہ کوٹ کس کمپنی نے تیار کیا ہے، اس کے متعلق مسز بیکسی کچھ نہ جان سکی، لیکن کرنل کا تحفہ چھ سات ہزار ڈالر سے کم کا ہرگز نہیں تھا۔ یہ امر ایک طرف خوش آیند تھا، دوسری طرف پریشان کن بھی۔ وہ اس قدر قیمتی کوٹ پہن کر ریل میں تماشا بن سکتی تھی۔ اتنا قیمتی کوٹ دیکھ کر نیویارک کے اسٹیشن کا آدھا عملہ اس کی خدمت کے لیے مؤدب ہو جاتا اور یہ ایک خطرناک بات ہوتی۔ اس کوٹ میں وہ ایک دولت مند عورت نظر آ رہی تھی، ایک ایسی دولت مند عورت جو دنیا کی ہر شے خریدنے کی استطاعت رکھتی ہو۔ مسز بیکسی نے سوچا کہ کاش میرا شوہر منک کے کوٹ کی قیمت کے بارے میں کچھ نہ جانتا ہو۔ اس نے کوٹ تہ کیا اور دوبارہ اسے پیکٹ میں رکھنا چاہا۔ اچانک اس کی نگاہ پیکٹ میں رکھے ہوئے ایک لفافے پر پڑی۔ اس کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔ لفافے پر اس کا نام تحریر تھا۔ اس نے بے تاب ہو کر لفافہ چاک کیا اور خط نکال کر پڑھنے لگی۔ کرنل نے لکھا تھا۔ "ڈارلنگ! ایک بار تم نے بتایا تھا کہ تمھیں منک کے فر سے بنی ہوئی چیزوں کے استعمال کی انتہائی خواہش ہے۔ آج میں تمھاری یہ خواہش پوری کر رہا ہوں۔ براہ مہربانی یہ تحفہ قبول کرو، مگر ساتھ ہی مجھے افسوس ہے کہ یہ میرا آخری تحفہ ہے۔ چند ذاتی وجوہ سے آیندہ میں تم سے نہیں مل سکوں گا۔ الوداع۔ ہمیشہ خوش رہو۔"

دیر تک مسز بیکسی کو یقین نہیں آیا کہ وہ واقعی کرنل سے

برائے فروخت

یاسمین سید

ایک سابق اطالوی وزیر اور برازیلی سرجن کی تحقیق کے مطابق اٹلی کے چالیس باشندے گردوں کی بیماری میں مبتلا تھے۔ وہ گردے خریدنے بھارت گئے۔ وہاں اُنھوں نے اپنے ناکارہ گردوں کی جگہ بھارتیوں کے کارآمد گردے خرید کے پیوندکاری کروائی مگر اکثر مریضوں کو یہ تبدیلی راس نہیں آئی۔ پانچ اطالوی بھارت ہی میں چل بسے' اٹھارہ دوسری سنگین بیماریوں میں مبتلا ہوگئے۔ دوسری طرف بے چارے گردے بیچنے والے سب کے سب صرف چند ماہ میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ گردوں کی خرید و فروخت ایک تجارت بن گئی ہے۔ نئے گردوں کے اکثر ضرورت مند بھارت کا رُخ کرتے ہیں۔ وہاں سودے بازی ہوتی ہے اور سفاک دلالوں کے سبب باہر سے آئے ہوئے صاحبِ حیثیت مریضوں کو دلّی یا کلکتے ہی میں دفن ہونا پڑتا ہے یا اُن کی لاش اُن کے وطن روانہ کردی جاتی ہے۔ بھارت میں گردوں کی جراحی پر تقریباً دس لاکھ روپے خرچ ہوتے ہیں۔ نصف رقم گردہ بیچنے والے کو ملتی ہے' باقی نصف ڈاکٹر اور دلال میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ شدید غربت کے باعث بہت سے لوگ اپنا گردہ فروخت کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ گردہ فروشوں میں زیادہ تعداد عورتوں کی ہے جن کی "مرضی" میں اُن کے شوہروں کا "حکم" بھی شامل ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ آدمی ایک گردے سے بھی زندگی گزار سکتا ہے لیکن مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے بیشتر افراد زیادہ عرصے زندہ نہیں رہ پاتے۔

ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئی ہے۔ کرنل اُسے اتنا بڑا صدمہ بھی پہنچا سکتا ہے' مسز بیکسی نے کبھی یہ تصور نہیں کیا تھا۔ خط نے اسے جھنجوڑ کے رکھ دیا۔ چند لمحوں کے لیے منک کے کوٹ کی خوشی کافور ہوگئی مگر پھر یہ سوچ کے وہ اس صدمے سے سنبھل گئی کہ اس نے کرنل کی دوستی میں کھویا کچھ نہیں' پایا ہی پایا ہے۔ اس نے خود کو سمجھایا' میں نے واقعی کچھ نہیں کھویا' میں جہاں سے چلی تھی' وہیں کھڑی ہوں۔ وہ ایک تنفّر کے ساتھ خط پُرزے پُرزے کردینا چاہتی تھی مگر خط کی پشت پر لکھے ہوئے ایک جملے نے اس کا ہاتھ ساکت کردیا۔ کرنل نے اسے مشورہ دیا تھا کہ اپنے شوہر سے اس کوٹ کے بارے میں کہہ دینا کہ یہ تمھاری آنٹی نے کرسمس کا تحفہ دیا ہے۔ کرنل پاگل ہوگیا ہے' مسز بیکسی خط پھاڑتے ہوئے بڑبڑا اُٹھی۔ کیا اُسے یہ معلوم نہیں کہ آنٹی اس قدر مہنگا کوٹ نہیں خرید سکتیں۔ لیکن اگر آنٹی نے مجھے یہ کوٹ نہیں تو پھر کس نے دیا ہے؟ یہ سوال مسز بیکسی کے سارے وجود پر مسلط ہوگیا۔ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ یقیناً بیکسی جیسا سیدھا سادہ شوہر کوٹ کے متعلق چند ایک سوالات ضرور کرے گا۔ یہ واقعی اس کے لیے ایک اہم معاملہ ہوگا کہ اس کی بیوی تو اپنی بیمار خالہ کی عیادت کے لیے گئی تھی' واپسی میں وہ چھ سات ہزار ڈالر کا کوٹ کہاں سے لے آئی؟ مسز بیکسی کو غصہ آنے لگا کہ کرنل نے یہ بیش قیمت تحفہ مجھے خوش کرنے کے لیے نہیں بلکہ اذیت پہنچانے کے لیے دیا ہے۔ کرنل کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میری آنٹی اتنا مہنگا کوٹ خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی وہ یہ بھی جانتا ہے کہ میں یہ کوٹ اپنے استعمال میں نہیں لاسکوں گی۔

سوچتے سوچتے آخر اُس کی مسکراہٹ بحال ہونے لگی۔ میں یہ کوٹ اپنے پاس رکھوں گی اور اسے اپنے استعمال میں لاکر دکھاؤں گی۔ وہ قدرے پُرسکون ہوگئی۔ میں اپنے شوہر کو مدّتوں سے بہلا رہی ہوں۔ میں ایک ہوش مند' زیرک عورت ہوں اور میرا شوہر ایک خاص حد سے آگے سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس بار بھی میں اسے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دوں گی۔

مسز بیکسی پنسلوانیا ریلوے اسٹیشن پر اُتری تو خاصی مطمئن تھی۔ باوقار انداز میں اُس نے اسٹیشن عبور کیا' کوٹ کا بنڈل پہلو میں دبائے ٹیکسی روکی اور ڈرائیور سے پوچھا۔ "تم قیمتی اشیا گروی رکھنے والی کسی دُکان کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟ براہِ کرم مجھے وہاں لے چلو۔"

"چھٹے ایونیو پر اس قسم کی دُکانیں ہیں۔" ڈرائیور نے مسز بیکسی کو ٹیکسی میں بیٹھنے کے لیے کہا۔

"جو پہلی دُکان نظر آئے' اُس پر گاڑی روک لینا۔" مسز بیکسی نے آنکھیں موند لیں۔

کچھ دیر بعد گاڑی ایک دُکان پر رُک گئی۔ "تمہیں زحمت ہوگی۔ میں بس گئی اور واپس آئی۔" مسز بیکسی ٹیکسی سے اُتر کے سیدھی دکان میں داخل ہوگئی۔

"فرمایئے۔" دُکان کے مالک نے مسز بیکسی کا استقبال کیا۔ "میں کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

مسز بیکسی سرسری نظر سے شوکیس میں رکھی ہوئی قیمتی اشیا دیکھتی رہی۔ دُکان میں زیادہ تر گھڑیاں' سونے کے سگریٹ لائٹر' نیک لس' انگوٹھیاں اور اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی مگر قیمتی چیزیں رکھی تھیں۔ مسز بیکسی خجل سے انداز میں مسکرا کے دکان دار سے مخاطب ہوئی۔ "میں محسوس کررہی ہوں کہ آپ میری بات سن کر مذاق اُڑائیں گے مگر مشکل یہ ہے کہ میں ایک اُلجھن میں ہوں۔ میری چیک بُک گھر رہ گئی ہے۔ ویسے بھی آج سنیچر ہے' بینک اب پیر کو کھلیں گے۔ میں یہاں تعطیلات منانے آئی ہوں۔ مجھے کچھ رقم کی ضرورت پیش آگئی ہے۔ میرے پاس اس وقت منک کے اس قیمتی کوٹ کے سوا کوئی چیز نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ میرا کوٹ گروی رکھ کے مجھے کچھ رقم دے دیجیے۔ میں بہت جلد آپ کو رقم ادا کردوں گی۔۔۔۔"

مسز بیکسی جواب کا انتظار کرنے لگی لیکن دکان دار کو ناگوار انداز میں گھورتا محسوس کرکے اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا' اس نے فوراً بنڈل کھولا اور منک کا کوٹ دُکان دار کے سامنے کردیا۔ "میں یہ گروی رکھنا چاہتی ہوں۔"

"اوہ۔" دُکان دار کی آنکھیں حرص سے چمکنے لگیں۔ وہ کوٹ اُلٹ پلٹ کے اس کی مالیت کا اندازہ کرنے لگا پھر بولا۔ "معاف کیجیے گا۔ میں صرف گھڑیاں اور سونے کی چھوٹی موٹی چیزیں گروی رکھتا ہوں۔"

"اگر میرے پاس سونے کی کوئی چیز ہوتی تو میں پہلے وہی پیش کرتی۔" مسز بیکسی نے کہا۔ "آپ یہ کوٹ گروی رکھ کے کچھ رقم دے سکتے ہیں یا نہیں؟"

"یہ کوٹ بالکل نیا ہے۔" دُکان دار ذومعنی انداز میں مسکرانے لگا۔ "فر بھی عمدہ ہے مگر مجھے اس کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔"

"اس وقت مجھے صرف پچاس ڈالروں کی ضرورت ہے۔ آپ صرف پچاس ڈالر دے سکتے ہیں یا نہیں؟"

"ہاں آں۔" دُکان دار نے تذبذب سے اقرار کیا۔ "میں پچاس ڈالر دے دیتا ہوں۔" اس نے اپنی میز کی دراز سے ایک فارم نکالا اور قلم سنبھالتا ہوا مسز بیکسی کی طرف دیکھنے لگا۔ "نام کیا لکھوں؟"

"نام لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔" مسز بیکسی نے کہا۔ "مجھے کچھ جلدی ہے' باہر ٹیکسی کھڑی ہے' ویسے بھی میں یہ رقم پیر کو ادا کرکے اپنا کوٹ لے جاؤں گی۔"

"پتہ تو لکھوا دیجیے۔ یہ ضروری ہے ورنہ تو کوئی بھی شخص ٹوکن دکھا کے آپ کی چیز لے جاسکتا ہے۔ ہمارا طریقہ یہ ہے کہ ہم ٹوکن کے دو حصّوں میں سے ایک اپنے گاہک کو دے دیتے ہیں اور دوسرا حصّہ گروی رکھی جانے والی چیز کے ساتھ منسلک کردیتے ہیں۔ ایک رسید بھی دی جاتی ہے تاکہ کسی گڑبڑ کا امکان نہ رہے۔ اگر آپ نام پتہ نہیں لکھوائیں گی تو یہ چیز اس شخص کے حوالے کردی جائے گی جو ہمارا ٹوکن لے کر آئے گا۔"

"فکر نہ کیجیے۔" مسز بیکسی نے بے پروائی سے کہا۔ "میں ٹوکن سنبھال کر رکھوں گی۔"

"ایک بات اور ذہن نشین کرلیجیے" دُکان دار نے پچاس ڈالر اور ٹوکن مسز بیکسی کو دیتے ہوئے تنبیہہ کی کہ "اگر یہ ٹوکن کھو گیا تو آپ اپنی چیز کی ملکیت کا دعوا نہیں کرسکیں گی۔"

"ٹھیک ہے جناب!"

"اگر آپ کہیں تو میں ٹوکن پر رہن شدہ چیز کی نوعیت درج کردوں؟" یہ آپ کے حق میں اچھا ہوگا۔ ممکن ہے' آپ کو ٹوکن فروخت کرنے کی ضرورت پڑ جائے۔ ٹوکن پر گروی رکھی جانے والی چیز کی وضاحت ہوگی تو آپ کو مناسب قیمت مل جائے گی۔"

"اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" مسز بیکسی نے کہا۔ "آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کررہے کہ میں چیک بُک گھر بھول آئی ہوں اور محض اتفاق سے مجھے رقم کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ میں یہ بیش قیمت کوٹ فروخت ہرگز نہیں کروں گی۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" دکان دار نے فارم میز کی دراز میں رکھ لیا۔

مسز بیکسی نے چلتے چلتے دکان دار کو ممنونیت سے دیکھا۔ "میں نے کچھ ذاتی وجوہ سے اپنا نام اور پتہ نہیں لکھوایا۔ اس ٹوکن پر بھی گروی رکھی جانے والی چیز کی تفصیل نہیں ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب میں اپنا کوٹ لینے آؤں تو آپ مجھے اس کوٹ کی جگہ کوئی دوسرا کوٹ پکڑا دیں۔ میں دھوکا کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتی۔"

"اسی لیے تو میں عرض کر رہا تھا کہ ٹوکن پر کوٹ کی تفصیل لکھوا لیجیے" دکان دار کے تیور قدرے بگڑ گئے۔ "کہیے میں لکھ دوں۔"

"نہیں۔" مسز بیکسی نے نفی میں گردن ہلائی۔ "مجھے آپ پر اعتبار کرنا ہی پڑے گا۔"

دکان سے نکل کر وہ کل تک کا وقت گزارنے کے لیے درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں مقیم ہو گئی اور بیش تر وقت آرام کرتی رہی۔

دوسرے روز مسز بیکسی نے گھر میں داخل ہوتے ہی شوہر کو ایک طویل بوسہ دیا پھر کہا۔ "اس مرتبہ بالٹی مور میں میں نے تمھاری بہت کمی محسوس کی۔ تمھیں بہت یاد کیا۔"

"تم آج بارہ منٹ تاخیر سے گھر پہنچی ہو۔" مسٹر کارل بیکسی نے بیوی کو دیواری گھڑی کی جانب متوجہ کیا۔

مسز بیکسی نے افسوس اور معذرت کا اظہار کیا اور کہا۔ "آج ریل میں بہت بھیڑ تھی۔ ٹیکسی ملنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ آنٹ نے تمھارے لیے نیک تمنائیں بھیجی ہیں۔ اور ہاں پلیز، مجھے اپنے ہاتھ سے ایک جام بنا کر دو۔ بہت تھک گئی ہوں۔"

مسز بیکسی ایک فرماں بردار شوہر کی طرح بیوی کے لیے شراب کا گلاس تیار کرنے لگے۔ مسز بیکسی کن انکھیوں سے شوہر کو دیکھتی رہی پھر بے اختیار اس کا ذہن اپنے شوہر کا کرنل کے ساتھ موازنہ کرنے لگا۔ کرنل کے مقابلے میں کارل بیکسی کم زور اور دبلا شخص تھا۔ کرنل کسی گھوڑے کے مانند طاقت ور تھا۔ اس کے پورے جسم پر ریچھ کی طرح بال تھے۔ کرنل کے انداز میں جارحیت تھی اور بیکسی کے انداز میں بے چارگی۔ مسز بیکسی ایک آہ بھر کر رہ گئی۔ اسے کرنل سے محروم ہونے کا دکھ تھا۔ کرنل اپنے کپڑوں کا کس قدر خیال رکھتا تھا، اور ایک یہ شخص ہے، ایک ہی لباس مسلسل استعمال کرتا ہے۔

"جام حاضر ہے جناب!" مسز بیکسی کی آواز ابھری

مسز بیکسی مسکرا دی۔ بیکسی اتنا برا بھی نہیں۔ مسز بیکسی نے غور سے اپنے شوہر کا جائزہ لیا۔ اسے خیال آیا۔ بیکسی کے کلینک میں زیادہ تر مریض خواتین آتی ہیں، کیوں نہ آئیں، میرا شوہر ایک سیدھا سادہ، شریف اور بے ضرر آدمی ہے۔ کارل بیکسی میں کرنل کی نسبت بس مردانہ وجاہت کی کمی ہے۔ مسز بیکسی مارٹینی کی چسکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "کل رات تم کیا کرتے رہے کارل؟"

"کل کلینک پر خاصا رش تھا۔" بیکسی نے جواب دیا۔ "میں مریضوں میں دیر تک مصروف رہا پھر حساب کتاب کرتا رہا۔"

"تم حساب کتاب کا کام اپنی سیکریٹری سے کیوں نہیں لیتے؟ اسے آخر تم نے کس لیے ملازم رکھا ہے۔"

"رکھا تو اسی کام کے لیے ہے۔" مسز بیکسی نے سادگی سے کہا۔ "مگر حساب کتاب خود بھی دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔"

"تم نے مارٹینی کا گلاس بہت عمدہ بنایا ہے۔" مسز بیکسی نے گفتگو کا رخ بدل دیا۔ "میں اس وقت ایسی ہی کسی چیز کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔" باتیں کرتے کرتے مسز بیکسی نے اچانک اپنے ہینڈ بیگ سے رومال نکالنے کے بہانے کوٹ گروی رکھنے کا ٹوکن گرا دیا اور سرسری سے انداز میں بولی۔ "ذرا دیکھنا کارل! یہ کیا چیز ہے۔ یہ ٹیکسی کی نشست سے ملا تھا۔ میں نے لاٹری کا ٹکٹ سمجھ کر اٹھا لیا۔"

"یہ لاٹری کا ٹکٹ نہیں ہے۔" مسز بیکسی دیر تک ٹوکن دیکھتے رہے۔ "کیا واقعی یہ تمھیں ٹیکسی میں ملا ہے؟ کیا تم نہیں جانتیں کہ یہ کس چیز کا ٹوکن ہے؟"

"نہیں۔" مسز بیکسی نے کہا۔ "مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ کس چیز کا ٹوکن ہے۔"

میرا طریق اپنا ہی نہیں

نازِ پاکستان حکیم محمد سعید کے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید صاحب ہندوستان میں ہمدرد دواخانے کے سربراہ ہیں۔ دہلی میں ہمدرد کا وسیع ترین کاروبار نواحی علاقوں تک پھیلا ہوا ہے۔ ہمدرد نگر ہے ہمدرد یونی ورسٹی تغلق آباد میں ہے۔ انسٹی ٹیوٹ آف دی ہسٹری آف میڈیسن ہے۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز ہے۔ غرض کئی عظیم الشان ادارے اُن کی نگرانی میں اور اُن کے وسائل سے چل رہے ہیں۔ غالب کا مقبرہ حکیم صاحب نے تعمیر کرایا۔ غالب اکیڈمی قائم کی اور ہمدرد کی لائبریری دیکھنے تو دُور دُور سے لوگ آتے ہیں۔ حکیم صاحب کی عمر اسّی برس سے زائد ہے۔ وہ ہمدرد نگر کے جس کمرے میں بیٹھ کر کام کرتے ہیں، اُس میں ایک چھوٹی سی میز اور ایک کرسی ہے۔ کمرے میں نہ دری ہے نہ قالین ہے۔ ایئرکنڈیشنر بھی نہیں ہے۔ سردیوں کے لیے ہیٹر بھی نہیں ہے۔ صبح کا سادہ ناشتہ اور رات کا ہلکا کھانا حکیم صاحب کی غذا ہے۔ وہ اب بھی اپنے کپڑے خود دھو لیتے ہیں، اپنے جوتوں پر انھوں نے کبھی کسی سے پالش نہیں کروائی۔ جو کھانے کو مل جاتا ہے کھا لیتے ہیں۔ ایک بار ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا، "کبھی کبھی کچھ میٹھی فرمائش سے پکوا لیتا ہوں۔" انھوں نے نئے کپڑے سلوانا ترک کر دیا ہے۔ وہ ہمیشہ زمین پر سوتے ہیں اور اُن کا بستر یہ ہے، گرمی میں چٹائی، سردی میں ہلکی توشک۔

ستار طاہر کی [illegible] سعید سے

ہمارے قبضے میں ہے اس لیے وہ چیز بھی ہماری ہے۔ میں کل وہ چیز حاصل کرنے کے لیے جاؤں گا۔"

"مگر یہ ٹوکن میرا ہے۔" مسز بیکسی نے بڑے ناز سے احتجاج کیا۔ "دیکھو کارل! یہ ٹوکن مجھے ملا ہے۔"

"میں نے کب کہا یہ میرا ہے۔" مسٹر بیکسی نے ہلکی سی ناراضی کا اظہار کیا۔ "اس ٹوکن کے بدلے میں جو کچھ بھی ملے گا، میں تمھی کو لا کر دوں گا۔"

"کاش وہ کوئی گھڑی ہو، یا سونے کی انگوٹھی وغیرہ ہو۔" مسز بیکسی دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہنے لگی۔ "خدا کرے اس ٹوکن کے بدلے کوئی زنانہ چیز ہاتھ لگے۔ خاص طور پر کوئی سونے کی چیز۔"

"میری خواہش ہے کہ کوئی خزانہ ہاتھ لگے۔" مسٹر بیکسی

"یہ قیمتی اشیا گروی رکھ کر قرض دینے والی کسی کمپنی کا ٹوکن ہے۔" مسٹر بیکسی نے انکشاف کیا۔

"میں سمجھی نہیں۔" مسز بیکسی نے بے خبری ظاہر کی۔

"ٹوکن پر کمپنی کا پتہ درج ہے مگر حیرت ہے گروی رکھی جانے والی چیز کا کوئی ذکر نہیں۔"

"تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟" مسز بیکسی نے لاتعلقی سے کہا۔

"بات تو پریشان ہونے ہی کی ہے۔" مسٹر کارل بیکسی نے دبے دبے جوش سے کہا۔ "پریشانی کے علاوہ خوشی کی بات بھی ہے۔" مسٹر بیکسی نے قیمتی سامان گروی رکھ کر قرض دینے والی کمپنیوں کے بارے میں تفصیل سے اپنی بیوی کو آگاہ کیا۔

"تمھارا مطلب ہے کہ اس ٹوکن سے ہمیں کوئی بیش قیمت چیز حاصل ہو سکتی ہے؟" مسز بیکسی نے حیرت سے کہا۔ "کیا تم کسی خوش کن کہانی سے دوچار ہو گئے ہو؟"

"سمجھنے کی کوشش کرو۔" مسٹر بیکسی بولے۔ "ٹوکن پر صرف پچاس ڈالر کی رقم درج ہے۔ ظاہر ہے، اصل چیز کم و بیش چار گنا مالیت کی ضرور ہو گی۔"

"یعنی دو سو ڈالر کی؟"

"دو ہزار ڈالر کی بھی ہو سکتی ہے۔ میں اس قسم کا کاروبار کرنے والوں کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ لوگ ایک ہزار کی چیز پر ایک سو کا قرض دینے میں بھی سو نخرے کرتے ہیں۔"

"مسٹر بیکسی بالکل اَن جان بن گئیں۔ یہ میری معلومات میں ایک اضافہ ہے۔"

"میری جان!" مسٹر بیکسی چہکے۔ "تم ایک سادہ شعار خاتون ہو، زندگی کے بہت سے معاملات اور پیچیدگیوں کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتیں۔ بعض عزت دار لوگ اپنی قیمتی اشیا گروی رکھتے ہوئے شرم کے باعث اپنا نام پتہ نہیں لکھواتے۔ یہ بھی کوئی ایسا ہی معاملہ معلوم ہوتا ہے۔"

"تو کیا ہم پچاس ڈالر ادا کر کے وہ قیمتی چیز حاصل کر سکتے ہیں؟"

"ہاں۔" مسٹر بیکسی مسکرانے لگے۔ "اب یہ ٹوکن

سب کچھ

اپنی بیوی سے بھی بڑا خواب دیکھنے لگے۔ "ممکن ہے' اس ٹوکن پر کوئی بہت قدیم اور نایاب چیز گروی رکھی گئی ہو جیسے اہرامِ مصر سے برآمد کیا ہوا کوئی مجسمہ' کوئی نادر تصویر وغیرہ۔"

"کیا یہ بھی ممکن ہے کارل؟" مسز بیکسی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "پھر تو یہ ٹوکن مجھے دے دو' میں کل خود وہاں جاؤں گی۔"

"نادانی کی باتیں نہ کرو۔" مسٹر بیکسی نے بیوی کو جھڑک دیا۔ "تم بس یہ دعا کرو کہ کوئی خزانہ ہمیں مل جائے جس سے کوئی دائمی فائدہ حاصل ہو۔ بہرحال جو کچھ بھی ہوگا' کل تمہارے سامنے آجائے گا۔ یہ کمپنی میرے کلینک کے راستے میں ہے۔"

"تم یہ کام مجھے کیوں نہیں کرنے دیتے۔" مسز بیکسی نے اصرار کیا۔

"اس لیے کہ تم گروی لین دین کرنے والوں کو دھوکا نہیں دے سکتیں۔" مسٹر بیکسی نے بیوی کو لاجواب کردیا۔ "تمہاری ذرا سی غفلت سے سارا کھیل بگڑ بھی سکتا ہے۔"

"میں اتنی بے وقوف بھی نہیں ہوں۔" مسز بیکسی نے اعتماد سے کہا۔ "میں شرط لگا سکتی ہوں کہ انتہائی کامیاب لوٹوں گی۔"

"تمہارے پاس پچاس ڈالر ہیں؟" مسٹر بیکسی نے استفسار کیا۔ مسز بیکسی سوچ میں پڑ گئی' مسٹر بیکسی نے قہقہہ لگایا۔ "اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ ٹوکن میرے پاس رہنے دو۔ میں پچاس ڈالر بھی خرچ کروں گا اور وہ چیز بھی حاصل کروں گا۔"

"مسز بیکسی نے جذباتی ہو کر کہا۔ "مگر وعدہ کرو کہ وہ جو چیز بھی ہوگی' میری ہوگی۔"

"یہ بات تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ کوئی زنانہ چیز ہی ہوگی' یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ سونے کے کف لنک ہوں' سگریٹ لائٹر ہو یا مردانہ گھڑی ہو۔ کیا اس صورت میں بھی تم اصرار کرو گی کہ میں۔۔۔"

"نہیں" مسز بیکسی نے فوراً کہا۔ "اگر کوئی مردانہ چیز نکلی تو وہ تمہاری۔ میری طرف سے کرسمس کا تحفہ سمجھ لینا اسے۔"

"ہاں' اب تم نے مناسب بات کی۔" مسٹر بیکسی خوش ہو کر بولے۔ "خیر میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر زنانہ استعمال کی کوئی چیز ہوئی تو تمہاری۔" چند لمحے خاموش رہ کر مسٹر بیکسی نے کہا۔ "تم ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ کل میرے ساتھ ہی چلو۔" مسز بیکسی کا سر اقرار میں ہلا مگر وہ فوراً سنبھل گئی۔ شوہر کے ساتھ جانے میں بھید کھلنے کا خطرہ تھا۔ "نہیں۔ میرے لیے اس میں زیادہ تجسس ہوگا کہ میں یہیں رہوں اور دعا کرتی رہوں کہ پٹارے میں سے کوئی قیمتی چیز برآمد ہو۔"

مسٹر بیکسی کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ چیز سرے سے ہمارے کام ہی کی نہ ہو۔ ایسی صورت میں' میں وہ چیز لینے سے انکار کردوں گا۔"

"ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ خواہ کوئی چیز ہو' وہ پانچ سو ڈالر سے کم کی نہیں ہوگی" مسز بیکسی کا دل دھڑک اٹھا۔

"ہاں' اس کا تو مجھے یقین ہے۔"

"اوہ کارل! تم نے مجھے اختلاج میں مبتلا کردیا ہے۔ اب مجھ سے کل تک انتظار کیسے ہوگا۔"

پیر کی صبح مسز بیکسی کی حالت قابلِ دید تھی۔ وہ دروازے تک مسٹر بیکسی کو رخصت کرنے آئی۔ "تم نے ٹوکن سنبھال کر رکھ لیا نا؟"

"ہاں۔" مسٹر بیکسی نے اطمینان دلایا۔ "میں کلینک جانے سے پہلے یہ کام کروں گا۔"

"اور شام چھ بجے سے پہلے گھر لوٹ آؤ گے؟" مسز بیکسی نے وعدہ لیا۔ "میں اس سے زیادہ انتظار نہیں کرسکوں گی۔"

"ہاں جان! کس طرح یقین دلاؤں۔" مسٹر بیکسی مسکرا دیے۔

"اچھا' ایک کام کرنا۔ جیسے ہی وہ چیز حاصل ہو' مجھے ٹیلی فون کردینا۔" مسز بیکسی مسلسل جذباتی ہو رہی تھی۔ "کاش وہ میرے استعمال کی کوئی بہت ہی قیمتی چیز ہو۔"

"ٹھیک ہے۔" مسٹر بیکسی نے ہامی بھری۔ "میں کلینک سے فون کردوں گا۔"

"تم بہت اچھے ہو کارل!" مسز بیکسی نے اٹھلا کے کہا۔

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو مسز بیکسی نے فوراً چونگا اٹھالیا۔ دوسری طرف مسٹر بیکسی ہی تھے۔

"ہنی! میں نے وہ چیز حاصل کرلی ہے۔"

"او کارل!" مسز بیکسی نے بے قراری سے سوال کیا۔ "کیا چیز ہے وہ؟ جلدی سے بتاؤ' وہ کیا چیز ہے؟"

"کچھ صبر کرو ڈارلنگ!" مسٹر بیکسی نے قہقہہ لگایا' وہ بیوی کی بے صبری سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"تم وہ چیز دیکھو گی تو خوشی سے پاگل ہوجاؤ گی۔ تم خوش قسمت ہو۔ وہ تمھارے ہی استعمال کی چیز ہے۔"

"شکر ہے۔" مسز بیکسی نے ایک طویل سانس لی۔ "کارل! وہ کیا چیز ہے؟ بتاؤ نا؟"

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا ڈارلنگ" مسٹر بیکسی نے جواب دیا۔ "تمھیں بھی یقین نہیں آئے گا' محض پچاس ڈالر کے عوض' کوئی پاگل عورت کتنی قیمتی چیز گروی رکھ گئی تھی۔"

"آخر وہ ہے کیا؟ فوراً بتاؤ۔" مسز بیکسی نے احتجاج کیا۔ "میں مزید انتظار نہیں کرسکتی۔"

"شام تک تو ضرور انتظار کرنا ہوگا تمھیں۔" مسٹر بیکسی نے کہا۔ "شام تک قیاس آرائیاں کرتی رہو۔ تمھیں بہت لطف آئے گا۔"

"اچھا۔" مسز بیکسی نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "میں ابھی اندازے لگاتی ہوں۔ اگر میں صحیح چیز بوجھ لوں تو تم ہاں کہہ دینا۔ ٹھیک؟"

"ٹھیک۔" مسٹر بیکسی نے ہنکار بھری۔ "بوجھو؟"

سنبھل کر' مسز بیکسی نے خود کو سمجھایا۔ اس وقت بہت احتیاط کی ضرورت ہے ورنہ سارا کھیل بگڑ جائے گا' پھر وہ شوہر سے مخاطب ہوئی۔ "نیک لس؟"

"نہیں۔ نیک لس نہیں ہے۔"

"ہیرے کی انگوٹھی؟"

"یہ بھی غلط۔" مسٹر بیکسی نے قہقہہ لگایا۔ "اچھا چلو' میں تمھیں ایک اشارہ دیتا ہوں۔ اس کا شمار پہننے اوڑھنے کی چیزوں میں ہوتا ہے۔"

"اوہ۔" مسز بیکسی نے کہا۔ "وہ کوئی زنانہ ہیٹ تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔" مسٹر بیکسی بولے۔ "ہیٹ ہرگز نہیں ہے۔"

"خدا کے لیے کارل!" مسز بیکسی روہانسی ہوگئی۔ "تم بتا کیوں نہیں دیتے۔"

"ابھی بتانے میں مزا نہیں آئے گا۔" مسٹر بیکسی نے جواب دیا۔ "شام تک انتظار کرو۔ شام کو وہ چیز تمھاری خدمت میں پیش کردی جائے گی۔"

"میں شام کا انتظار نہیں کرسکتی۔ لہٰذا میں ابھی خود تمھارے پاس آرہی ہوں۔"

"میں تمھیں آنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔"

"کیوں؟" مسز بیکسی چلائی۔ "میرے آنے میں کیا قباحت ہے؟"

"میں اس وقت بے حد مصروف ہوں۔" مسٹر بیکسی نے جواب دیا۔ "مریض بہت سے جمع ہوگئے ہیں۔ میں پہلے ہی انھیں آدھے گھنٹے انتظار کراچکا ہوں۔"

مسز بیکسی چند لمحوں کے لیے خاموش ہوگئی پھر قدرے تردد سے بولی۔ "اچھا' میں لنچ کے وقفے میں آرہی ہوں۔ تمھارے لیے سینڈوچ بھی لیتی آؤں گی۔"

✱ مسز بیکسی ٹھیک ایک بج کر تین منٹ پر اپنے شوہر کے کلینک پہنچ گئی۔ "کارل! تم اندازہ نہیں کرسکتے کہ میری کیا کیفیت ہے۔"

"مجھے اندازہ ہے ہنی!" مسٹر بیکسی بیوی کو ساتھ لے کر سرجری کے کمرے میں آگئے۔ اُن کی ماتحت نرس آپریشن کی میز سے اوزار اٹھانے میں مصروف تھی۔

"مس فرگوسن!" مسٹر بیکسی نے نرس کو مخاطب کیا۔ "باقی کام بعد میں کرلینا' اب تم لنچ کے لیے جاسکتی ہو۔"

"یس ڈاکٹر۔" مس فرگوسن فوراً سرجری روم سے چلی گئی۔

"مسٹر بیکسی موج میں تھے' انھوں نے اپنی بیوی سے آنکھیں بند کرنے کے لیے کہا۔ "آنکھیں بند کرلو ڈارلنگ! میں سامنے والی الماری کھولتا ہوں۔ تمھارا تحفہ الماری میں

ہے۔ جب تک میں نہ کہوں' اپنی آنکھیں بند رکھنا۔" مسز بیکسی نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی اور الماری کھلنے کی آواز پر کان لگا لیے۔

چند لمحوں بعد مسٹر بیکسی نے الماری چوپٹ کھولتے ہوئے کہا۔ "اب آنکھیں کھول لو اور دیکھو کہ میرے ہاتھوں میں کیا ہے۔"

مسز بیکسی نے مسکراتے ہوئے آنکھیں کھول دیں اور بے تابانہ آگے بڑھی۔ "یہ تو منک ہے۔ صدفی صد منک کا..... ہے" اچانک مسز بیکسی کو گویا ایک برقی جھٹکا لگا۔

مسٹر بیکسی کے ہاتھوں میں واقعی منک کی کھال تھی مگر وہ کوئی کوٹ نہیں تھا' منک کی کوئی چھوٹی سی چیز تھی۔ بہ مشکل مسز بیکسی نے خود کو سنبھالا۔ "منک کا مفلر؟" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

"میں نہ کہتا تھا کہ اپنا تحفہ دیکھ کر تم مبہوت رہ جاؤ گی۔" مسٹر بیکسی نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "بالکل اصلی منک کی کھال کا مفلر ہے۔ میں تم سے شرط لگا سکتا ہوں کہ اس مفلر کی قیمت پانچ سو ڈالر سے بھی زیادہ ہوگی۔" بیوی کو گم سم دیکھ کر مسٹر بیکسی نے کہا "آخر بات کیا ہے؟ تم خاموش کیوں ہو گئیں؟ کیا تمہیں منک کا مفلر پسند نہیں آیا؟"

"نہیں.... نہیں۔" مسز بیکسی کے منہ سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ "بہت اچھا ہے۔ بہت پسند آیا.... ہے۔"

"بس اتنا ہی چاہیے۔" مسٹر بیکسی نے آگے بڑھ کر مفلر بیوی کے گلے میں ڈال دیا۔ "اب تمہاری شخصیت ہی بدل گئی ہے۔ تم پر خوب جچ رہا ہے یہ۔"

"شکریہ۔" مسز بیکسی پژمردہ سی ہنسی ہنس دی۔

مسٹر بیکسی چہک کر بولے۔ "میرا مشورہ ہے کہ یہ مفلر کبھی شاپنگ کے لیے جاتے وقت ہرگز نہ پہننا ورنہ لوگ تمہیں بہت مال دار سمجھیں گے اور ہر چیز کی دگنی تگنی قیمت بتائیں گے۔"

"میں تمہارا مشورہ یاد رکھوں گی۔" مسز بیکسی بڑبڑا کر رہ گئی۔

"یقین کرو ڈارلنگ! میں پچاس ڈالر میں تمہیں کرسمس کا اس سے اچھا تحفہ نہیں دے سکتا تھا۔ تم واقعی خوش قسمت ہو۔"

"بہت بہت شکریہ۔ اب میں چلتی ہوں۔" مسز بیکسی اجازت چاہی۔

"ہاں۔ ضرور جاؤ۔" مسٹر بیکسی نے فوراً اجازت دے دی۔ "مگر سنو' میں آج شام جلدی گھر نہیں لوٹ سکوں گا۔ میرے ایک مریض کا جبڑا ٹوٹ گیا ہے۔ مجھے اسے دیکھنے کے لیے اسپتال جانا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" مسز بیکسی تیز تیز چلتی ہوئی کلینک سے نکل آئی۔ وہ جلد از جلد اس دکان کے مالک سے ملنا چاہتی تھی۔ جس کے پاس اس نے بیش قیمت کوٹ گروی رکھا تھا' وہ اپنی گردن میں لپٹا ہوا مفلر اس کے منہ پر دے مارنا چاہتی تھی۔

مسٹر کارل بیکسی کلینک کے دروازے پر کھڑے ہوئے اپنی بیوی کو جاتے دیکھتے رہے۔ اُن کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ' تھی۔ ان کی مسکراہٹ نرس مس فرگوسن کو واپس آتے دیکھ کر اور گہری ہو گئی۔ مس فرگوسن کے ہاتھ میں دو لنچ بکس تھے۔ مسٹر بیکسی نے اُس کے ہاتھ سے لنچ بکس لے لیے۔ "بہت بھوک لگ رہی ہے جانِ من۔ اب اطمینان سے کھانا کھائیں گے۔"

"پہلے میرا تحفہ دو۔" مس فرگوسن نے ایک ادا سے کہا۔ "ذرا دیکھوں تو کرسمس پر تم نے میرے لیے کیا تحفہ خریدا ہے۔"

"اس بار تمہیں تمہاری توقع سے بڑھ کر تحفہ ملے گا۔" مسٹر بیکسی نے اُسے یقین دلایا۔ "تم تحفہ دیکھو گی تو اچھل پڑو گی۔"

"مجھے یقین ہے ڈارلنگ!" مس فرگوسن اس کے قریب ہو کر بولی۔ "جب تم نے اپنی بیوی کو منک کا قیمتی مفلر دیا ہے تو میرے لیے یقیناً منک کا کوٹ خریدا ہوگا۔"

طاؤس چمن کی مینا

اردو کے شیوہ بیان ادیب نیّر مسعود کے قلم سے
ایک مینا، ایک غلام، ایک غلام زادی اور ایک بادشاہ کی داستان
ایک عہد کی کہانی۔

روز کا معمول تھا۔ میں باہر سے آتا، دروازہ کھٹکھٹاتا۔ دوسری طرف سے جھراتی کی اماں کے کھانسنے کھنکارنے کی آواز قریب آنے لگتی لیکن اس سے پہلے ہی دوڑتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدموں کی آہٹ دروازے پر آکر رکتی۔ ادھر سے میں آواز لگاتا۔ "دروازہ کھولو۔ کالے، کالے، کالے خاں آئے ہیں۔" دروازے کے پیچھے سے کھل کھلانے کی دبی دبی آواز آتی اور قدموں کی آہٹ دور بھاگ جاتی۔

کچھ دیر بعد جھراتی کی اماں آپہنچتیں، دروازہ کھلتا اور میں گھر میں ہر طرف کچھ ڈھونڈتا ہوا سا داخل ہوتا۔ ایک ایک کونا دیکھتا اور آواز لگاتا۔ "ارے بھئی، کالے خاں کی گوری گوری بیٹی کہاں ہے؟" کبھی پکارتا۔ "یہاں کوئی فلک آرا شہزادی رہتی ہے؟" اور کبھی کانسی کی شامیں ہلا کر کہتا۔ "ہماری پہاڑی مینا کسی نے دیکھی ہے؟" ساتھ ساتھ کن انکھیوں سے دیکھتا جاتا کہ ننھی فلک آرا ایک کونے سے بھاگ کر دوسرے کونے میں چھپ رہی ہے اور رہ رہ کر ہنس پڑتی ہے۔ لیکن میں اندھا بہرا بنا اسے وہاں ڈھونڈتا جہاں وہ نہیں ہوتی تھی۔

آخر مجھے اپنے پیچھے اس کے کھل کھلا کر ہنسنے کی آواز سنائی دیتی۔ میں چیخ مار کر اچھل پڑتا، پھر گھوم کر اسے گود میں اٹھا لیتا اور وہ واقعی پہاڑی مینا کی طرح چہکنا شروع کر دیتی۔

روز کا یہی معمول تھا اور یہ اس دن سے شروع ہوا تھا جب شاہی جانوروں کے داروغہ نبی بخش نے مجھے قیصر باغ کے طاؤس چمن میں ملازمت دلائی تھی۔ اس سے پہلے میں گومتی کے کنارے جانوروں کے رمنوں کے آس پاس آوارہ گردی کیا کرتا اور نیچے اونچے کٹہروں کے پیچھے گھومتے ہوئے شیر اور تیندوے دیکھتا اور تمنا کرتا کہ کسی رمنے کا شیر کٹہرا پھاند کر باہر آئے اور مجھے پھاڑ کھائے۔ اس وقت یہی میرا روز کا معمول تھا اور یہ اس دن سے شروع ہوا تھا جب میری بیوی گیارہ مہینے کی فلک آرا کو چھوڑ کر مر گئی تھی۔ اس سے پہلے میں وقف حسین آباد مبارک میں نوکر تھا۔ امام باڑے روشنیوں کا انتظام میرے ذمے تھا۔ تنخواہ کم تھی لیکن گز ہو جاتی تھی۔ بیوی سگھڑ تھی۔ اسی تنخواہ میں گھر چلاتی او پرندے پالنے کا شوق بھی پورا کرتی۔ ہمارے ہاں کئی طو پلے ہوئے تھے جنھیں اس نے خوب پڑھایا تھا۔ دیسی مینا بھی تھیں لیکن اسے پہاڑی مینا کا ارمان تھا کیونکہ اس سن رکھا تھا، پہاڑی مینا بالکل آدمیوں کی طرح باتیں کر ہے۔ اسے خوش کرنے کے لیے میں نے وعدہ کر لیا تھا کہ تنخواہ پر اس کے لیے پہاڑی مینا لے آؤں گا لیکن تنخواہ سے چار دن پہلے اس کے سینے میں درد اٹھا اور دوسرے دن وہ چل بسی۔

میرا ہر شے سے جی اچاٹ ہو گیا۔ نوکری پر جانا بھی چھ دیا۔ اپنے آپ سے بیگانہ ہو گیا پھر بھلا فلک آرا کی پرورش کرتا۔ جھراتی کی اماں نہ ہوتیں تو اس بچی کا ٹھکانہ ہوتا میرے ہی مکان کی باہری کوٹھری میں رہتی تھیں۔ کچھ پہلے ان کا کماتا ہوا جھراتی گومتی کے کسی کنڈ میں پھنس ڈوب گیا تھا، اس کے بعد سے میری بیوی ان کی خبر ر تھی۔ بیوی کے بعد فلک آرا کی نگہداشت انھوں نے اپنے ذمے لے لی تھی۔ جب تک میں گھر سے باہر رہتا، وہ میرے گھر میں رہتیں، روٹی بھی پکا دیتیں۔ میں دو وقت کے کھانے

کے علاوہ ڈلی تمباکو کے لیے کچھ پیسے اُن کے ہاتھ پر رکھ دیتا تھا۔

نوکری ختم ہو گئی تھی۔ حسین آباد کے داروغہ احمد علی خاں نے کئی بار آدمی بھی بھیجا لیکن میں نے پلٹ کر اُدھر کا رُخ نہ کیا تو ان بے چاروں نے بھی مجبور ہو کر تنخواہ موقوف کرا دی اور میں مہاجنوں سے سُودی قرض لے لے کر کام چلانے لگا۔

گھر صرف رات کو جاتا۔ اس وقت فلک آرا سو چکی ہوتی۔ صبح صبح طوطے میری بیوی کے سکھائے ہوئے بول دہراتے تو مجھے گھر میں ٹھہرنا مشکل ہو جاتا۔ آخر ایک دن میں اُٹھا اور سارے پرندے چڑیا بازار میں بیچ آیا۔

اسی زمانے میں ایک دن داروغہ نبی بخش نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ کئی دن سے وہ مجھے رمنوں کے پاس آوارہ گردی کرتے دیکھ رہے تھے۔ اُنھوں نے کچھ ایسی دل سوزی سے میرا حال دریافت کیا کہ میں نے سب کچھ بتا دیا۔ اُنھوں نے بڑی تسلی دی لیکن مہاجنوں سے قرض لینے کی بات پر بہت ناراض ہوئے۔ قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں جو کچھ ہوتا تھا اُس کا ایسا نقشہ کھینچا کہ میں بدحواس ہو گیا اور خود کو کبھی زندان کی دیواروں سے سر ٹکراتے، کبھی ننھی بچی کی انگلی تھامے لکھنؤ کے گلی کوچوں میں بھیک مانگتے دیکھنے لگا۔ "دیکھو وقت ابھی سویرا ہے۔" داروغہ نے کہا۔ "تمھیں نوکری جاری کرو اور قرض چکانے کی فکر شروع کر دو۔ میں تو۔۔۔"

"داروغہ صاحب، مگر نوکری کہاں کروں؟"

"کہیں؟" اُنھوں نے کہا۔ "ایک تو وقف حسین آباد مبارک ہی کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔"

"وہاں مل تو سکتی ہے لیکن داروغہ احمد علی خاں صاحب سے کس طرح آنکھیں چار کروں گا۔ اُنھوں نے کتنی بار آدمی بلانے بھیجا، میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اب کیا منہ لے کر ان سے نوکری مانگوں۔"





جناب نیّر مسعود، اردو کے ایک ممتاز ادیب، ناقد، محقق، اور دانش ور، 16 نومبر 1936، مرحوم اودھ کے دارالحکومت، شہر خوش شعاراں، نازک خیالاں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ والدِ محترم پہلے استاد تھے، نام ور ادیب اور محقق پروفیسر مسعود حسن رضوی، رضوی صاحب نے اپنے ہونہار فرزند کی تربیت اپنے طور پہ کی، قلم کاری سے پروفیسر نیّر کو ابتدا سے رغبت تھی، 1957 میں فارسی میں ایم اے کے بعد فارسی میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی اور والدِ محترم کی پیروی میں درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔ 1965 میں کچھ دنوں فضل الرّحمان اسلامیہ انٹر کالج بریلی میں اردو اور ہندوستان بدر فارسی کے معلّم کی حیثیت سے وابستگی رہی، پھر اسی سال لکھنؤ یونی ورسٹی میں فارسی زبان کے استاد مقرّر کر دیے گئے۔

قلم سے ہمارے خطے کی زمین پر عزّت و شہرت ہی حاصل ہوتی ہے، تیسری فضیلت یہاں عنقا ہے، اور اردو کی نسبت سے صنعت و حرفت میں سربلند، کمپیوٹر ٹیکنالوجی میں سرگرم اور جوہری صلاحیت کے حصول میں تیز قدم ہندوستان میں تو بہ طورِ خاص۔ لوگ یہ الم ناک پیش گوئی نہایت سفاکی سے کرتے ہیں کہ ہندوستان میں اردو کا یہ آخری دور ہے۔ قلم سے معانقت کو یوں بھی ایک عاشقی چاہیے اور عاشقی کتنی ہی صبر طلب ہو، پیغمبری نہیں ہوتی۔ زندگی کے سارے راستے کسی نہ کسی طور تنگ اور کشادہ اور تاریک و روشن گلیوں کے بعد معاش پر تمام ہوتے ہیں۔ بے طلب اجناس کی فصل نہیں بوئی جاتی۔ ہندوستان میں اردو اب تیزی سے آثارِ قدیمہ میں شامل ہو رہی ہے۔ دیکھنا ہے، اردو کا ہندوستانی ادیب کب تک ہواؤں کے مخالف چلتا رہے، کہاں تک اس بے اماں، بے سایہ، بے زمین زبان سے کارِ عشق کی دیوانگی یا قلندری کرتا

"اچھا، باغوں میں کام کرو گے؟"

"کر لوں گا۔" میں نے کہا۔ "گھاس کھودنے کا کام ہو گا، وہ بھی کر لوں گا۔"

"بس تو چلو میرے ساتھ، ابھی۔" اُنھوں نے کہا۔ "ایک اسامی خالی ہے۔"

داروغہ اسی وقت مجھے بادشاہ منزل کے دفتروں میں لے گئے۔ کئی جگہ میرا نام اور حلیہ وغیرہ درج کیا گیا۔ ضمانتی کی جگہ داروغہ نے اپنا نام لکھوایا۔ پھر ہم نکھی دروازے پر پہنچے۔ یہاں سرکاری محلے کے آدمیوں، سپاہیوں وغیرہ کا ہجوم تھا۔ داروغہ نے کئی لوگوں سے صاحب سلامت کی، پھر مجھ سے کہا، "یہاں کھڑے رہو۔ ابھی نام پکارا جائے گا۔" وہ دروازے پر جھولتا ہوا مخملی زربفت کا پردہ ذرا سا ہٹا کر اندر چلے گئے۔

میں نکھی دروازے کی صنعتیں دیکھتا اور حیران ہوتا رہا۔ آخر دفتروں سے میرے کاغذات بن کر آ گئے اور میرا نام پکارا گیا۔ ایک خواجہ سرا نے مجھ سے کئی سوال کیے، میرے جواب کاغذات سے ملائے، پھر مخملی پردے کی طرف اشارہ کیا اور کہا، "طاؤس چمن میں چلے جاؤ۔"

اب میں پردے کے دوسری طرف کھڑا تھا۔ اُس وقت کی گھبراہٹ میں وہاں کی بہار کیا دیکھتا، کئی روشوں پر مور ناچتے گھومتے نظر آئے تو سمجھا، یہی طاؤس چمن ہے۔ لیکن داروغہ نبی بخش کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کدھر کا رُخ کروں۔ ہر طرف سنّاٹا سا تھا۔ درختوں پر اور بارہ دری کی شکل کے بڑے بڑے پنجروں میں پرندے البتّہ بہت تھے۔ فاختہ اور شاما کی آوازیں رہ رہ کر آ رہی تھیں۔ کبھی کبھی دور درختوں کی طرف کوئی ہاتھی چنگھاڑ رہا تھا، بس۔ میں پریشان کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ دُور بہت بڑے بڑے سبز مور کھڑے نظر آئے۔ ذرا غور سے دیکھا تو پتہ چلا، درخت ہیں جنھیں موروں کی صورت میں چھانٹا گیا ہے۔ "طاؤس چمن۔" میں نے دل میں کہا اور لپکتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ چمن کے پھاٹک پر بھی چاندی کے پتروں سے مور بنائے گئے تھے۔ اندر داروغہ تلے اوپر رکھی ہوئی سنگِ مرمر کی سِلوں کے پاس کھڑے تھے۔ "چلے آؤ میاں کالے خاں!" اُنھوں نے مجھے پھاٹک کے باہر رُکا ہوا دیکھ کر آواز دی۔ میں اُن کے پاس چلا گیا۔

چمن کے بیچوں بیچ کی مستری ایک نیچا سا چبوترا بنا رہے تھے۔ داروغہ نے اُنھیں کچھ ہدایتیں دیں، پھر میرا ہاتھ پکڑ کر چمن کا ایک چکر لگایا۔ میں ان درختوں کی چھنتائی دیکھ کر حیران

سب رس

97ء میں پروفیسر نیر مسعود 61 سال کے ہو رہے ہیں۔ اردو کے کسی سرمست کے بقول، اب تو کام کرنے کی عمر آئی ہے' ہمارے عہد کے منفرد و ممتاز ناقد شمس الرحمان فاروقی نے بھی کچھ پروفیسر نیر مسعود کی علمی و ادبی معرکہ آرائیوں میں مہمیز کا کام کیا ہے۔ نیر صاحب بیس اہم کتابوں کے مصنف ہیں۔ چند کے نام ہیں۔ رجب علی بیگ سرور، 1967، تعبیر غالب 1973، کافکا کے افسانے 1978، دیوان فارسی' میر تقی میر 1983، افسانوی مجموعہ، سیمیا 1984، سوتا جاگتا پتّا (بچوں کے لیے) 1985، اور دوسرا افسانوی مجموعہ، عطر کافور 1990، میر انیس کی سوانح تصنیف کے مرحلے میں ہے۔ مختلف رسالوں میں شائع ہونے والی تحریروں کی تعداد 170 کے قریب ہے۔ اب تو مطالعے، مشاہدے، خیال و خواب کا ایک تجربہ ان کے ساتھ ہے تخلیق کار کا شباب طویل مجاہدوں کے بعد آتا ہے اور آتا ہے تو موسموں سے بے نیاز ہوتا ہے، بلکہ دھوپ کی شدت اور پت جھڑ کے موسم میں اور نکھرتا اور سنورتا ہے۔

پروفیسر نیر مسعود نے علامتی، تجریدی طرز کی تحریروں سے اپنے افسانوی سفر کا آغاز کیا تھا لیکن ان کی اشارت و علامت، واقعیت اور حقیقت کی آمیزش سے بے گانہ نہیں تھی۔ اب کچھ ایسا ہے کہ رفتہ رفتہ وہ اردو کے روایتی افسانے کی طرف مائل نظر آتے ہیں' ہم سادہ دلاں کی طرف، ہمارا اصرار ہے کہ کہانی تو کہانی ہوتی ہے۔

زیر نظر کہانی پروفیسر صاحب کی تازہ کہانیوں میں سے ایک ہے، اس میں جدت، واقعیت، افسانوی اور داستانی اسلوب کا ایک دلکش امتزاج ہے۔ یہ تحریر کوئی لکھنؤ نشیں ہی تخلیق

تھا۔ موروں کی ایسی پکّی شکلیں بنی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا، درخت پگھلا کر کسی سانچے میں ڈھال دیے گئے ہیں۔ کلغی کی کلغیاں اور نوک دار چونچیں تک صاف نظر آ رہی تھیں۔ سب سے کمال کا وہ مور بنایا گیا تھا جو گردن پیچھے موڑ کر اپنے پَر کُرید رہا تھا۔ ہر مور یہاں لگے ہوئے پتلے تنوں والے دو درختوں کو کتر کر بنایا گیا تھا۔ کئی سیدھے موروں کے پیروں کا کام [illegible] اور ان کی [illegible] اس طرح [illegible] ڈھال بنا دی گئی تھیں کہ بالکل مور کے پنکھ ہی لگتے تھے۔ داروغہ نے بتایا کہ [illegible] سے [illegible] سیڑھیاں لگا کر اور [illegible] ایک ایک درخت کی چھنٹائی کرتے ہیں۔ میں نے [illegible] پر تعریفیں شروع کیں تو داروغہ ہنسنے لگے۔ "تم [illegible] دیکھ کر [illegible] کر رہے ہو۔" انھوں نے کہا۔ "اس [illegible] تو ان کی [illegible] اتاری گئی ہیں۔ نئی [illegible] کے [illegible] رنگ دکھاتا۔"

اس کے بعد وہ مجھے قریب کے ایک اور چمن میں لے گئے جس کے سب درخت شیر کی شکل کے تھے۔ "یہ اسد چمن ہے۔" انھوں نے بتایا۔ "بادشاہ نے اس چمن کے درختوں کے نام بھی رکھے ہیں۔"

پھر وہ مجھے طاؤس چمن میں واپس لائے۔ "تمھارا کام طاؤس کو آئینے کی طرح رکھنا ہے۔" انھوں نے کہا اور ادھورے چبوترے کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کی تیاری کے بعد کام کچھ بڑھے گا' بڑھ کر بھی آدھے دن سے زیادہ کا نہ ہوگا۔ تمھاری باری ایک ہفتے صبح سے دوپہر تک' ایک ہفتے دوپہر سے مغرب تک۔" انھوں نے میرے کاموں کی کچھ تفصیل بتائی۔ آخر میں کہا۔ "آج سے تم سلطانِ عالم کے ملازم ہو۔ اللہ مبارک کرے۔ بس اب گھر جاؤ۔ کل سے کام شروع کرو' اور یہ واہی تباہی پھرنا چھوڑو۔" میں انھیں دعائیں دینے لگا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو؟" انھوں نے کہا اور مستریوں کو ہدایتیں دینے لگے۔

(۲)

بیوی کے مرنے کے بعد اُس دن پہلی بار میں نے اپنی فلک آرا کو غور سے دیکھا۔ اُس نے بالکل ماں کا رنگ روپ پایا تھا۔ یقین کرنا مشکل تھا کہ یہ چینی کی گڑیا ایسی بچّی اسی کالے دیو کی بیٹی ہے جسے لوگ شیدیوں کے احاطے کا کوئی حبشی سمجھ لیتے ہیں۔ مجھے فلک آرا پر ترس آیا اور خود پر غصّہ بھی کہ ماں سے بچھڑ کر یہ ننھی سی جان اتنے دن تک باپ کی محبّت کو بھی ترستی رہی مگر خیر' دو ہی تین دن میں وہ مجھ سے ایسی ہل گئی کہ اپنی ماں سے بھی نہ ہلی ہوگی' اور میں بھی بس کسی دن

کر سکتا تھا، جس کا واسطہ فریاد کناں حویلیوں میں شور مچاتی، پھڑپھڑاتی چمگادڑوں سے صبح و شام پڑتا ہو۔ تیر مسعود تاریخ اور تہذیب کے آدمی ہیں، جتنے پرانے، اتنے نئے، جتنے نئے، اتنے پرانے۔ وہ کیسے ہی جدّت طراز ہوں، کافکا اور بورخیز کے قائل، اپنے آپ سے بھی تو وہ اتنے ہی بندھے اور جکڑے ہوئے ہیں۔ کاش آدمی اپنی رسیاں، اپنی زنجیریں ایک دم سے کاٹ دینے کی مقدرت رکھتا!

وقت کے تیور اب پہلے جیسے نہیں رہے۔ بہت عرصے سے یہ شورش و عناد پر آمادہ ہے۔ اپنے گرد و پیش کی کشاکش، سماجی و تہذیبی نیرنگی، تاریخ کی بوالعجبی ہمارے اکثر فسانہ نگاروں کی طرح تیر مسعود کا بھی المیہ ہے، خارجی مظاہر کبھی یکساں نہیں رہتے مگر سانس لینے کی ایک مہلت تو ملنی چاہیے۔ یہ چشم زدن میں تغیّر و تبدل کے شعبدے ہمارے شیشہ نفس قلم کاروں کے ریشہ و رگ میں بڑی سوزش کرتے ہیں۔

طاؤس چمن کی مینا بہ ظاہر ایک داستان ہے، ایک مینا، ایک غلام، ایک غلام زادی اور ایک بادشاہ کی کہانی۔ جو دیکھیے تو ایک عہد کی داستان ہے۔ سب کچھ تو لکھنے والے پر ہوتا ہے کہ اس کے ہاں اپنے مدّعا کے بیان میں کیسی چابک دستی و ہنرمندی ہے مگر اظہار و بیان کی مشّاقی و میناکاری کو مدعی کی شمولیت کی بھی ضرورت پڑتی ہے، تخلیق کار کے درون خانہ پہچان و تلاطم کے بغیر ساری قوت و قدرت کلام دھندلا جاتی ہے۔ ادھر سننے والے کا زمانے سے ایک ہی شیوہ ہے، اسے عرض مدعا سے زیادہ اصل مدعا سے غرض ہوتی ہے۔ جو کہے ہوئے میں نہیں ہوتا اور لکھے ہوئے میں نہیں ہوتا۔ وما علینا الا البلاغ

بازاروں کی سیر کر لینے کے سوا کام پر سے سیدھا گھر آتا اور دروازے کے پیچھے اس کے دوڑتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدموں کی آہٹ کا انتظار کرتا تھا۔ میں اس کے لیے بازار سے کچھ نہیں لاتا تھا۔ تنخواہ حالانکہ حسین آباد سے زیادہ ملتی تھی لیکن قرضوں کی واپسی میں اتنی کٹ جاتی تھی کہ بس دال روٹی بھر کا خرچ نکل پاتا۔ خود اس نے ابھی فرمائش کرنا نہیں سیکھا تھا لیکن ایک دن مجھ سے باتیں کرتے کرتے اچانک وہ بولی۔ "ابا اللہ ہمیں پہاڑی مینا لا دو۔"

میں چپ رہ گیا۔ بیوی کے مرنے کے بعد میں نے قسم سی کھائی تھی کہ اب گھر میں کوئی پرندہ نہیں پالوں گا۔ پھر بھی جب میں نے دیکھا کہ وہ اتنی بھری آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی ہے تو میں نے کہا۔ "ہم اپنی پہاڑی مینا کو اس کی پہاڑی مینا لا کے بالکل دیں گے۔"

اس دن سے وہ روز اپنی مینا کا انتظار کرنے لگی۔ ایک دن میں نے چڑیا بازار کا ایک پھیرا بھی کیا۔ پہاڑی مینا کے دام دیسی مینا سے زیادہ تھے، اتنے زیادہ بھی نہیں کہ میں مول نہ لے سکتا لیکن جتنی تنخواہ اس وقت ہاتھ آتی تھی، اس میں نہیں لے سکتا تھا۔ میں چڑیوں سے ذرا ہٹ کر پنجرے والوں کے قریب چلا گیا۔ گاہکوں کی بھیڑ تھی اور اس بھیڑ میں اس دن پہلی بار میں نے حضورِ عالم کے ایجادی قفس کا ذکر سنا۔ لوگوں کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ بادشاہ کو نذر کرنے کے لیے بہت دن سے ایک بڑا پنجرا بنوا رہے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ لکھنؤ میں ہر طرف اس کا چرچا ہے۔ چڑیا بازار کے گاہکوں میں سے کئی نے اسے بنتے دیکھنے کا دعوا کیا اور یہ بھی کہا کہ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا اتنا بڑا پنجرا قیصر باغ میں پہنچایا کس طرح جائے گا۔ اس پر ایک پرانے بڈھے نے کہا "اے میاں! یہ وزیروں کے معاملے ہیں۔ یہ چاہیں تو سلطنت کی سلطنت اِدھر سے اُدھر پہنچا دیں۔ آپ اتنی سی پنجری کے لیے ہلکان ہو رہے ہیں۔" سب لوگ ہنسنے لگے۔

پنجرا دیکھنے کا ایک دعوے دار بولا۔ "بڑے میاں! آپ بے دیکھے کی بات کر رہے ہیں۔ پنجری! اجی اگر آپ نے اس کی اونچائی......"

"کتنی ہوگی؟ رومی دروازے سے زیادہ؟"

"رومی دروازہ تو خیر، لیکن حسین آباد کے پھاٹکوں سے کم نہ ہوگی۔"

"بس!" بڑے میاں بولے۔ "پھر اسے تو وہ باغیں باغ کی جھنگیوں میں لٹکا کر رومی دروازے کے اوپر......" قہقہے لگنے لگے۔ میں وہاں سے گھر چلا آیا۔

دوسرے ہی دن میں نے طاؤس چمن میں بھی حضورِ عالم کے ایجادی قفس کا ذکر سنا۔ چبوترا تیار ہو گیا تھا۔ چمن کی ہریالی میں اس کی چکیلی سنگین سفیدی آنکھوں کو بھلی بھی لگتی تھی اور کھلتی بھی تھی۔ داروغہ نبی بخش نے مجھے بتایا کہ قفس اسی چبوترے پر رکھا جائے گا۔

"مگر داروغہ صاحب!" میں نے پوچھا۔ "اتنا بڑا قفس یہاں تک پہنچے گا کس طرح؟"

"ٹکڑوں ٹکڑوں میں آ رہا ہے بھائی!" داروغہ نے بتایا۔ "پھر یہیں جوڑا جائے گا۔ حضورِ عالم کے آدمی آتے ہوں گے۔ اب یہاں ان کا تصرّف ہو گا۔ رات بھر کام کریں گے، کل قفس میں جانور چھوڑے جائیں گے۔"

"جانور چھوڑے جائیں گے یا بند کیے جائیں گے؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"ایک ہی بات ہے۔ اماں زبان کے کھیل چھوڑو اور مطلب کی سنو۔ حضورِ عالم تو خیر آ ہی رہے ہیں، عجب نہیں، حضرت سلطانِ عالم بھی تشریف لائیں۔ کل سے تمھارا اصلی کام شروع ہو گا۔ تمھیں ایجادی قفس اور اس کے جانوروں کی نگہداری پر رکھا گیا ہے، سمجھے؟ اور کل آئیے گا ضرور، کہیں چھٹی نہ لے بیٹھیے گا۔"

اسی وقت ایک چوبدار طاؤس چمن میں داخل ہوا۔ اس نے داروغہ کے پاس جا کر چپکے چپکے کچھ باتیں کیں۔ داروغہ نے جواب میں کہا، "سر آنکھوں پر آئیں۔ ہمارا کام پورا ہو گیا۔" انھوں نے چبوترے کی طرف اشارہ کیا پھر مجھ سے کہا، "چلو بھائی! قفس کے لیے چمن چھوڑ دو۔"

دوسرے دن میں وقت سے بہت پہلے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ [illegible] آرا نے روز کی طرح چلتے چلتے یاد دلایا۔ "ابّا! [illegible]؟"

"[illegible] لائیں گے۔"

"آپ روز بھول جاتے ہیں۔" اس نے خفگی سے کہا اور میں دروازے سے باہر آ گیا۔

کچھ دور چلنے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا، وہ دروازے کا ایک پٹ پکڑے مجھے دیکھ رہی تھی، بالکل اسی طرح جیسے اس کی ماں مجھے نوکری پر جاتے دیکھا کرتی تھی۔

رمنوں کے پاس سے ہوتا ہوا میں قیصر باغ کے شاہی پھاٹک میں، وہاں سے لکھی دروازے میں داخل ہوا اور سیدھا طاؤس چمن پہنچا۔ آج وہاں بڑی چہل پہل تھی۔ چمن کے باہر سپاہیوں کا پہرا تھا اور داروغہ نبی بخش اُن سے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے۔ "آؤ بھئی کالے خاں! دیکھا، میں نے کیا کہا تھا؟ حضرت سلطانِ عالم تشریف لا رہے ہیں۔ تم نے اچھا کیا جو آج سویرے سے آ گئے۔ میں آدمی دوڑایا ہی چاہتا تھا۔"

پھر وہ مجھے لے کر طاؤس چمن میں داخل ہوئے۔ سامنے ہی چبوترے پر حضورِ عالم کا ایجادی قفس نظر آ رہا تھا۔ میں سمجھتا تھا، یہ قفس کوئی بڑا سا، خوب صورت پنجرا ہو گا، بس۔ مگر اُسے دیکھ کر میری تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ قفس کیا تھا، ایک عمارت تھی۔ اُس کا ڈھانچا کوئی چار چار انگل چوڑی پٹیوں سے تیار کیا گیا تھا۔ پٹیاں ایک رُخ سے لال، دوسرے رُخ سے سبز تھیں۔ معلوم نہیں لکڑی کی تھیں یا لوہے کی لیکن اُن پر روغن ایسا کیا گیا تھا کہ لعل اور زمرّد کا دھوکا ہوتا تھا۔ جس دیوار کی پٹیاں باہر لال، اندر سبز تھیں اُس کے مقابل والی دیوار کی پٹیاں باہر سبز اندر لال رکھی گئی تھیں۔ اس طرح ایک طرف سے دیکھنے پر پورا قفس لال نظر آتا تھا، دوسری طرف جا کر دیکھو تو سبز۔ پٹیوں کے بیچ کی جگہوں میں پھولوں اور پرندوں کی شکلیں بنائی ہوئی رُو پہلی جالیاں اور بیلوں کے بیچ کی جگہوں میں سنہرے تاروں کی نازک جالیاں تھیں۔ ہر طرف چھوٹے دروازے اور کھڑکیاں بنائی گئی تھیں۔ اصل دروازہ قدِ آدم سے اُونچا تھا اور اس کی پیشانی پر دو جل پریاں شاہی تاج تھامے ہوئے تھیں۔ چھت کے چاروں کونوں پر رُو پہلی بُرجیاں اور بیچ میں بڑا سا سنہرا گنبد تھا۔ گنبد کے کلس پر بہت بڑا چاند تھا۔ بُرجیوں کی کلیاں تلے اوپر تھامے ہوئے ستاروں سے بنائی گئی تھیں۔

قفس کے بڑے دروازے سے کچھ ہٹ کر دس دس کی چار قطاروں میں چھوٹے چھوٹے گول پنجرے رکھے تھے اور ہر پنجرے میں ایک پہاڑی مینا تھی۔ داروغہ نے کہا۔ "انھیں اچھی طرح دیکھ لو کالے خاں! اصیل پہاڑی مینائیں ہیں، مینائیں نہیں، سونے کی چڑیاں ہیں، بادشاہ نے اس قفس کے

لیے مہیّا کرائی ہیں۔ انھیں شہزادیاں سمجھو۔"

پنجروں کے سامنے صندل کی ایک اونچی نازک سی میز تھی جس پر ہاتھی دانت سے پھول پتیاں اور طرح طرح کی چڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ "اچھا اب اِدھر دیکھو۔" داروغہ نے میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس پر ایک ایک پنجرا رکھا جائے گا' حضرت ملاحظہ فرماتے جائیں گے۔ تم یہاں دروازے کے پاس کھڑے ہوگے۔ حضرت کے ملاحظے کے بعد ہر پنجرا ہاتھوں ہاتھ ہوتا ہوا تمھارے پاس آئے گا۔ تمھارا کام جانور پنجرے سے نکال کر قفس میں ڈالنا ہوگا۔ یہ بہت چو کسی کا کام ہے۔ ذرا ڈھیلے پڑے اور چڑیا پھر۔۔۔"

"فکر نہ کیجیے استاد!" میں نے کہا۔ "ہزار چڑیاں اِس پنجرے سے اُس پنجرے میں کردوں' مجال ہے جو ہاتھ بہک جائے۔"

"سچ کہتے ہو بھائی!" داروغہ بولے۔ "پھر بھی حضرت کا سامنا ہوگا' ذرا اوسان ٹھکانے رکھنا۔"

اس کے بعد وہ باہر چلے گئے اور میں پھر قفس دیکھنے لگا۔ اندر سے وہ ایک چھوٹا سا قیصر باغ معلوم ہو رہا تھا۔ فرش پر سنگِ سرخ کی بجری بچھی تھی۔ بیچ میں پانی سے بھرا ہوا حوض جس میں چھوٹی چھوٹی سنہری کشتیاں تیر رہی تھیں اور ان کشتیوں میں بھی تھوڑا تھوڑا پانی تھا۔ فرش پر لال سبز چینی کی نیچی نیچی نادوں میں پتلی لمبی شاخوں والے چھوٹے قد کے درخت تھے۔ دیواروں سے ملی ملی بسنت مالتی' عشق پیچاں' جوہی اور کچھ ولایتی پھولوں کی بیلیں تھیں۔ ان میں ٹہنیوں سے زیادہ پھول تھے اور انھیں اس طرح چھایا گیا تھا کہ قفس کی سلاخیں ان میں چھپ جانے کے بجائے اور اُبھر آئی تھیں۔ جگہ جگہ ستاروں کی وضع کے آئینے جڑے تھے جن کی وجہ سے قفس میں جدھر دیکھو' پھول ہی پھول نظر آتے تھے۔ پانی کے کلے' دانے کی کٹوریاں' ہانڈیاں' چھوٹے چھوٹے جھولے' گھونسلے والے اڈے' پتلے پتلے مچان اور آشیانے ہر طرف تھے اور انھی سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ جگہ پرندوں کے لیے ہے۔

ہوا چل رہی تھی اور پورا قفس بہت ہلکی آواز میں جھن جھنا رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ طاؤس چمن میں اچانک خاموشی چھا گئی ہے۔ میں چونک پڑا۔ میں نے دیکھا' بادشاہ' حضورِ عالم اور اپنے خاص خاص مصاحبوں کے ساتھ طاؤس چمن میں داخل ہو رہے ہیں۔ سب سے پیچھے داروغہ نبی بخش سینے پر ہاتھ باندھے' سر جھکائے چل رہے تھے۔ صندل کی میز کے پاس آکر بادشاہ رُکے اور دیر تک قفس دیکھتے رہے۔

"واہ!" انھوں نے کہا پھر وزیرِ اعظم کو دیکھا۔ "یہ ہمارے ہی یہاں کا کام ہے؟"

"جہاں پناہ!" حضورِ عالم سینے پر ایک ہاتھ رکھ کر جھکے۔ "ایک ایک تار لکھنؤ کے کاری گروں کا موڑا ہوا ہے۔"

"تو انھیں کچھ اوپر سے بھی دیا؟"

"سلطانِ عالم کے تصدّق میں ایک ایک کی سات پشتیں کھائیں گی۔"

"اچھا کیا۔" بادشاہ بولے۔ "تو کچھ بڑھا کے ہم سے بھی دلوا دیجیے۔"

حضورِ عالم اور زیادہ جھک گئے۔ میں بادشاہ کے چہرے کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا' کوئی بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ سب آنکھیں جھکائے' ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ کچھ دیر بعد بادشاہ کی آواز سنائی دی۔ "لاؤ بھئی نبی بخش!"

میں نے داروغہ کی طرف دیکھا۔ اُنھوں نے سر اور ابروؤں کو بہت خفیف سی جنبش دے کر مجھے سنبھل جانے کا اشارہ کیا۔ ان کے پیچھے سے کسی ملازم نے پہلا پنجرا بڑھایا۔ داروغہ نے اُسے دونوں ہاتھوں میں سنبھالا اور دو قدم آگے بڑھ کر شیشے کے کسی نازک برتن کی طرح بہت احتیاط سے میز پر رکھ دیا اور پیچھے ہٹ گئے۔ بادشاہ نے پنجرا ہاتھ میں اُٹھا لیا۔ مینا پنجرے میں اِدھر سے اُدھر پھدک رہی تھی۔ بادشاہ نے ہنس کر کہا۔ "ذرا قرار تو لو چلبلی بیگم!" اور پنجرا واپس میز پر رکھ دیا۔

ایک مصاحب نے پنجرا اُٹھا کر دوسرے مصاحب کو دیا' دوسرے نے تیسرے کو' اور آخر میں پنجرا میرے پاس آگیا۔ میں نے اسے قفس کے دروازے کی جھری کے قریب کیا اور بڑی پھرتی سے چلبلی بیگم کو نکال کر قفس میں ڈال دیا۔ ایک اور ملازم نے خالی پنجرا میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اتنی دیر میں

پھر یہ دوسرا پنجرا آگیا تھا۔ بادشاہ نے اسے بھی ہاتھ میں اٹھایا۔ اس کی مینا اڈّے پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ بادشاہ نے اسے انگلی سے چمکاری دی تو اس نے اور زیادہ سر جھکا لیا۔ بادشاہ نے کہا: "اے بی! صورت تو دیکھنے دو۔" پھر پنجرا میز پر رکھ کر بولے: "یہ حیادار دُلھن ہیں۔"

پھر یہ پنجرا میرے پاس آیا اور میں نے حیادار دُلھن کو بھی قفس میں ڈال دیا۔ اسی طرح ایک کے بعد ایک 'مینائیں' بادشاہ کے پاس آتی رہیں اور وہ ان کے نام رکھتے رہے۔ کسی کا نام نازک قدم رکھا، کسی کا آہو چشم، کسی کا بہروپن۔ ایک پنجرا ایسے ہی بادشاہ کے ہاتھ میں آیا، اس کی مینا نے پر پھڑپھڑا کر چہچہانا شروع کر دیا۔ بادشاہ نے اس کا نام زہرہ پری رکھا۔ مجھے سب مینائیں ایک سی معلوم ہو رہی تھیں لیکن بادشاہ کو ہر ایک میں کوئی نہ کوئی بات سب سے الگ نظر آتی اور وہ اسی کی رعایت سے اس کا نام رکھتے۔

دس تک پنجرے میرے ہاتھ میں آئے اور میناؤں کے نام میرے کان میں پڑتے رہے۔ بادشاہ کی موجودی سے شروع شروع میں مجھے جو گھبراہٹ ہو رہی تھی، وہ اب کچھ کم ہو گئی تھی اور میں ہر مینا کو قفس میں ڈالنے سے پہلے ایک نظر دیکھ بھی لیتا تھا۔ بائیس تیئیس پنجروں کے بعد اچانک میں نے بادشاہ کی آواز سنی۔ "فلک آرا۔" اور ایک پنجرا میرے ہاتھ میں آگیا۔

میں نے دل ہی دل میں دہرایا۔ "فلک آرا" اور اس مینا کو غور سے دیکھا۔ وہ بھی دوسری میناؤں کی طرح تھی، میری سمجھ میں نہیں آیا کہ بادشاہ نے اس کا نام فلک آرا کیوں رکھا ہے۔ مینا کو دیکھ کر انھوں نے جو کچھ کہا ہو گا، وہ میں سُن نہیں پایا تھا۔ میں نے فلک آرا کو اور غور سے دیکھا۔ وہ گردن اٹھائے پنجرے میں بیٹھی تھی۔ اس نے بھی مجھے دیکھا، مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں اپنی ننھی فلک آرا کو دیکھ رہا ہوں۔ اس میں مجھے کچھ دیر لگ گئی اور ابھی پنجرا میرے ہاتھ میں تھا اور چڑیا پنجرے ہی میں تھی کہ میں نے دیکھا، اگلا پنجرا میری طرف آرہا ہے۔ میں نے بوکھلا کر فلک آرا کو ایسے بے تکے پن سے قفس میں ڈالا کہ وہ ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ خیریت گزری کہ کسی نے دیکھا نہیں اور فلک آرا قفس میں پہنچ کر ایک جھولے پر بیٹھ گئی۔

اس کے بعد سولہ سترہ پنجرے اور آئے۔ ہر مینا قفس میں چھوڑنے سے پہلے میں ایک نظر فلک آرا پر ضرور ڈال لیتا تھا۔ وہ اسی طرح جھولے پر بیٹھی تھی اور مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس وقت مجھے یہ محسوس کر کے تعجب ہوا کہ اگرچہ میں اس



میں اور دوسری میناؤں میں کوئی فرق نہیں بتا سکتا لیکن اسے سب میناؤں سے الگ پہچان سکتا ہوں۔

چالیسوں مینائیں قفس میں پہنچ چکی تھیں اور ادھر سے اُدھر اُڑتی پھر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد فلک آرا نے بھی اپنے جھولے سے ہلکی اُڑان بھری اور قفس کے پوربی حصے میں ایک ٹہنی پر جا بیٹھی۔ بادشاہ دھیمی آواز میں داروغہ کو کچھ سمجھا رہے تھے کہ رمنوں کی طرف سے ایک شیر کی دہاڑ سنائی دی۔ بادشاہ نے بولتے بولتے رک کر پوچھا۔ "یہ موہنی کس پر بگڑ رہی ہیں بی بخش؟"

داروغہ چپکے سے مسکرائے اور سر ذرا نیچے کر کے آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولے۔ "غلام جان کی امان پاوے تو عرض کرے۔"

"کہو کہو۔"

"وہ سلطانِ عالم ہی پر بگڑ رہی ہیں۔"

"ارے ارے! ہم نے کیا کیا ہے بھئی؟" بادشاہ کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ "اچھا اچھا! ہم سمجھ گئے۔ آج ہم ان سے ملے بغیر یہ سیدھے ادھر ہی چلے آئے، کیوں یہی بات ہے؟"

داروغہ جی نے دونوں ہاتھ رکھ کر جھک گئے۔ "سلطانِ عالم سے زیادہ ان کی ادائیں کون پہچانے گا۔ ابھی پر باز دکھائی ہیں۔ پھر بولی ہیں، کبھی ہیں، ان سے اور کٹ گئی ہیں اور رہی ہیں۔ غلام کی تو بات ہی نہیں سنتیں۔"

"سچ کہتے ہو!" بادشاہ نے مصاحبوں کی طرف دیکھا، پھر حضورِ عالم کی طرف، پھر محل کی طرف اور بولے۔ "تو چلو بھئی ان کو منائیں۔"

سب لوگ اور ان کے پیچھے پیچھے داروغہ جی بھی چمن سے باہر نکل گئے۔ اتنی دیر میں داروغوں نے دانے کی تھالیاں اور پانی کے برتن لا کر قفس کے دروازے کے پاس رکھ دیے

تھے۔ میں نے دروازہ ذرا سا کھولا اور ترچھا ہو کر قفس میں داخل ہو گیا۔ ایک چھوٹے دروازے سے ہاتھ بڑھا بڑھا کر تھلیاں اور بدھنے اُٹھا لیے اور سب برتنوں میں دانہ پانی بھر دیا۔ مینائیں اُڑتی ہوئی ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر بیٹھ رہی تھیں۔ سب اسی طرح ایک سی نظر آ رہی تھیں لیکن فلک آرا کو میں نے پھر پہچان لیا اور اس کے پاس کھڑا کچھ دیر تک اسے چمکارتا رہا۔ "میں تمھیں فلک مینا کہوں گا۔" میں نے اسے چپکے سے بتایا۔

قفس سے باہر نکل کر میں طاؤس چمن کی حد بندی کرنے والی بغیوں میں پہنچا جنھیں جالی سے گھیر کر اُوپر جالی ہی کی چھتیں بنائی گئی تھیں۔ ان میں طرح طرح کی ہزاروں چڑیاں چہک رہی تھیں۔ یہاں بھی میں نے دانے پانی کے برتن بھرے، زمین کی صفائی کی، چھوٹی جھاڑیوں پر پانی کے چھینٹے دیے اور پھر طاؤس چمن میں چلا آیا۔

داروغہ رمنوں سے واپس آ گئے تھے اور قفس کے پاس کھڑے شاید میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ "چلو بھائی! یہ مہم بھی سر ہوئی۔" وہ قفس کے چاروں طرف سے گھوم پھر کر دیکھنے لگے۔

"ہمارے شہر میں بھی کیسا کیسا کاری گر پڑا ہے داروغہ صاحب!" میں نے کہا لیکن داروغہ قفس کی سیر دیکھنے میں محو تھے۔

"اتا ہم کہیں گے۔" آخر وہ بولے۔ "حضورِ عالم نے اسے دل لگا کر بنوایا ہے۔"

(۳)

طاؤس چمن میں میرا کام کچھ مشکل نہیں تھا۔ تھوڑے دنوں میں مجھے کو ہر بات کا ڈھب آ گیا۔ میں جلدی کام ختم کر لیتا اور جتنا وقت بچتا، وہ قفس کی مزید صفائی ستھرائی میں

لگا رہا۔ مینائیں اب مجھے اچھی طرح پہچاننے لگی تھیں اور دیکھتے ہی دانے کے خالی برتنوں کے پاس بیٹھنا شروع کر دیتی تھیں۔ فلک مینا کو شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ اس پر میری خاص توجہ ہے۔ وہ مجھ سے بہت ہل گئی تھی۔ مجھے قفس کے دروازے پر دیکھ کر قریب آتی اور سب میناؤں سے پہلے پہچان لیتی۔

ایک دن معلوم نہیں کیا تھا کہ طاؤس چمن اور اباوی قفس کی سیر کو کوئی نہیں آیا۔ میں نے اپنا سارا کام ختم کر لیا تھا اور اب قفس سے ذرا پیچھے ہٹ کر دیکھ رہا تھا۔ حوض میں تیرتی ہوئی دو کشتیاں آپس میں ہل گئی تھیں اور دیکھنے میں اچھی نہیں معلوم ہو رہی تھیں۔ میں ایک بار پھر قفس میں داخل ہوا اور کشتیاں الگ کر کے وہیں کھڑا رہا۔

پہچانی ہوئی مینائیں قفس بھر میں اُڑتی پھر رہی تھیں۔ سب کے پیٹ بھرے ہوئے تھے اس لیے کسی کی توجہ میری طرف نہیں تھی لیکن فلک مینا بار بار میرے قریب آتی، زور زور سے بولتی، پھر دور کسی اڈے یا جھولے پر بیٹھ جاتی، پھر وہاں سے اُڑان بھر کر میری طرف آتی، بولتی اور دور بھاگ جاتی۔ بالکل اسی طرح میری ایک ننھی فلک آرا کسی کسی دن مجھ سے کھیل کرتی تھی۔ مجھے یہ سوچ کر اس پر بہت ترس آیا کہ وہ اب میرے پاس ہوتی تو وہ مجھ سے بھاگ کر پیچھے کے جالی دار دروازے تک پہنچ جاتی اور پوچھتی: "ابا، ہماری مینا لائے؟" اور میرے خالی ہاتھ دیکھ کر اداس ہو جاتی۔ اس کا اُترا ہوا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا۔ اچانک میرے دل میں خیال آیا اور میں نے کچھ اور ہی

سوچنا شروع کر دیا۔ قفس میں چالیس مینائیں اُڑتی پھرتی ہیں، ان کی صحیح صحیح گنتی کرنا آسان نہیں۔ آسان کیا، ممکن ہی نہیں۔ ستاروں کی شکل والے آئینے ایک ایک کو دس دس کر کے دکھاتے ہیں۔ یوں بھی چالیس اور اُنتالیس میں فرق ہی کون سا ہے؟ ایک مینا کم ہو جائے تو کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا۔ اسی وقت فلک مینا میرے قریب آ کر بولی اور میں نے ہاتھ بڑھا کر اُسے بہت آہستگی سے پکڑ لیا۔ اُس کے پر سہلاتا ہوا میں قفس کے ایک گوشے میں آ گیا اور اُڑتی ہوئی مینائیں گننے لگا۔ بار بار گننے پر بھی پتہ نہیں چل پایا کہ مینائیں چالیس ہیں یا اُنتالیس۔ مجھے اطمینان ہو گیا۔ فلک مینا کو میں نے ایک جھولے پر بٹھا کر ہلکا سا پینگ دیا اور قفس سے باہر نکل آیا۔

اُس دن قفسی دروازے سے نکلتے نکلتے میں فلک مینا کو گھر لے آنے کا پکا فیصلہ کر چکا تھا اور اسے ایک معمولی سا کام سمجھ رہا تھا جس میں مجھے شرم یا پشیمانی والی کوئی بات نظر نہیں آ رہی تھی بلکہ شرمندگی تھی تو صرف اپنی فلک آرا سے کہ میں اتنے دن تک خواہ مخواہ اُسے مینا کے لیے ترساتا رہا، اور پچھتاوا تھا تو بس اس کا کہ فلک مینا کو آج ہی قفس سے کیوں نہیں نکال لایا۔

چڑیا بازار میں رک کر میں نے تھوڑے مول تول کے بعد ایک سستا سا پنجرا خرید لیا۔ پنجرے والے نے پیسے گنتے گنتے پوچھا: "کون سا جانور ہے؟"

"پہاڑی مینا۔" میں نے کہا اور میرا دل آہستہ سے دھڑکا۔

"پہاڑی مینا پالی ہے تو شیدی صاحب! پنجرا بھی ویسا ہی رکھنا تھا۔" اس نے کہا۔ "خیر، آپ کی خوشی۔"

میں پنجرا لے کر آگے بڑھ گیا لیکن چند ہی قدم چلا ہوں گا

کہ ہاتھ پاؤں سنسنانے لگے اور گلا خشک ہو گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی میرے کان میں کہہ رہا ہو، کالے خاں! بادشاہی پرندے کی چوری؟ راستے بھر مجھے یہی آواز سنائی دیتی رہی۔ کئی بار ارادہ کیا، پنجرا پھیر آؤں، پھر خیال آیا فلک آرا کو کسی طرح خالی پنجرے سے بہلاؤں گا۔ گھر پہنچتے پہنچتے مجھے خود پر حیرت ہونے لگی کہ میں نے ایسی خطرناک بات کا ارادہ کیا تھا۔ خوشی بھی بہت ہو رہی تھی کہ میں نے فلک مینا کو قفس سے نکال نہیں لیا۔ یقین مجھے اب بھی تھا کہ ایک مینا کی چوری پکڑی نہیں جا سکتی پھر بھی معلوم ہو رہا تھا، موت کے منہ سے نکل آیا ہوں۔

گھر پہنچا تو فلک آرا میرے ہاتھ میں پنجرا دیکھ کر خوشی سے چیخ پڑی۔ "ہماری مینا آ گئی۔" لیکن جب وہ دوڑتی ہوئی میرے قریب آئی تو پنجرا خالی دیکھ کر اس کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور روہانسی ہو گئی۔

میں نے اسے گود میں اٹھا لیا اور کہا۔ "بھئی آج پنجرا آیا ہے، کل مینا بھی آ جائے گی۔"

"نہیں۔" اس نے کہا۔ "آپ جھوٹ بہت بولتے ہیں گے۔"

"جھوٹ نہیں بیٹی! کل دیکھنا"۔ میں نے کہا۔ "تمہاری مینا ہم نے لے بھی لی ہے۔"

"سچ؟" وہ چونک کر بولی اور اس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ "تو وہ کہاں ہے؟"

"ایک بہت بڑے پنجرے میں ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ تو ضد کر رہی تھی کہ ہم آج ہی اپنی فلک آرا کے پاس جائیں گے۔ ہم نے کہا ابھی آج تو ہم تمہارے لیے پنجرا مول لیں گے۔ پھر فلک آرا پنجرا دھوئے گی، سجائے گی، اس میں تمہارے کھانے پینے کے برتن رکھے گی، تب ہم تم کو لے چلیں گے۔"

فلک آرا کی خوشی دیکھنے والی تھی۔ فوراً میری گود سے اتر کر اس نے پنجرا ہاتھ سے لے لیا اور گئی۔ اسی وقت اسے خوب اچھی طرح دھویا پونچھا، اس کے اندر کاغذ کی پتیوں کا فرش کیا، پھر مٹی کا آب خورہ اور دانے کے لیے سکوری رکھی۔ مجھ سے مینا کی ایک ایک بات پوچھتی رہی، اس کی چونچ کیسی ہے، پر کس رنگ کے ہیں، کیا کیا باتیں کرتی ہے؟

رات کو اسے ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ بار بار جاگ کر مینا کی باتیں کرنے لگتی۔

دوسرے دن گھر سے نکلا تو دور تک اس کی آواز سنائی دیتی رہی۔ "آج ہماری مینا آئے گی، آج ہماری مینا آئے گی۔"

راستے بھر میں یہی سوچتا رہا کہ آج جب خالی ہاتھ گھر لوٹوں گا تو فلک آرا سے کیا بہانہ کروں گا۔ چمن میں میناؤں کو دانہ پانی دیتے ہوئے بھی طرح طرح کے بہانے سوچتا رہا۔ اس دن کام میں میرا دل نہیں لگ رہا تھا پھر بھی مغرب تک میں نے سارے کام نپٹا دیے اور ایک بار پھر پلٹ کر قفس کے اندر گیا۔ مجھے خیال آیا کہ آج میں نے فلک مینا کی طرف دیکھا تک نہیں۔ اس وقت وہ قفس کی پچھلی جالی کے ایک مچان پر بیٹھی تھی اور چپ چاپ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اس کے قریب گیا تو اس نے گردن گھمائی اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اسے چمکارا۔ اس نے دھیرے سے پر پھڑپھڑائے اور پھر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے قفس میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں، سب مینائیں اپنی اپنی جگہ ساکت بیٹھی تھیں پھر بھی ان کی گنتی آسان نہیں تھی اس لیے کہ ان میں سے آدھی کے قریب ٹہنیوں میں چھپی ہوئی تھیں۔ کل مجھے شاہی مینا کی چوری کے خیال سے جو ڈر لگا تھا، وہ اچانک جاتا رہا۔ فلک آرا کو بہلانے کے لیے جو بہانے سوچے تھے، وہ بھی دماغ سے نکل گئے اور مینا کی چوری پھر ایک معمولی بات معلوم ہونے لگی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ طاؤس چمن میں سناٹا تھا۔ مالی کام ختم کر کے جا چکے تھے۔ کوئی مجھے نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے پھر فلک مینا کو چمکارا۔ اس نے پھر دھیرے سے پر پھڑپھڑا کر میری طرف دیکھا اور میں نے ایک دم سے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا۔ اس نے خود کو چھڑانے کے لیے زور کیا لیکن جب میں چمکار چمکار کر اس کے پروں پر ہاتھ پھیرنے لگا تو اس نے آنکھیں موند لیں اور بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔ میں کچھ دیر دم سادھے کھڑا رہا پھر اسے اپنے کرتے کی لمبی جیب میں ڈالا اور قفس سے نکل آیا۔

لکھی دروازے تک کئی جگہ پہرے کے سپاہی ملے لیکن

انھیں معلوم تھا کہ میں طاؤس چمن میں شام تک باری کر رہا ہوں' کسی نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا اور میں جیب میں ہاتھ ڈالے ڈالے قیصر باغ سے نکل کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جی تو چاہتا تھا' پوری رفتار سے دوڑنے لگوں لیکن کسی طرح اپنے قدم تھامے ہوئے چلتا رہا۔

گھر پہنچا۔ فلک آرا سو چکی تھی۔ جھراتی کی اماں میرا راستہ دیکھ رہی تھی۔ انھیں کھانا دے کر رخصت کیا۔ مکان کا دروازہ اندر سے بند کر کے مینا کو جیب سے نکالا اور پنجرے کے پاس لے گیا۔ آج فلک آرا نے پنجرا اور بھی سجا رکھا تھا۔ تیلیوں کے بیچ بیچ میں چاندنی کے پھول لگائے تھے' جھاڑو کے تنکے میں رنگین کپڑے کی کترن باندھ کر اپنے خیال میں جھنڈا بنایا تھا جو پنجرے کے سہارے ٹیڑھا میڑھا کھڑا تھا' پنجرے کے اندر آب خورے میں لبالب پانی بھرا تھا' سکوری میں روٹی کے ٹکڑے بھیگ رہے تھے اور پرانی روئی کی دو تین گدیاں سی بنا کر شاہی مینا کے لیے گاؤ تکیے تیار کیے گئے تھے۔

میں نے مینا کو آہستہ سے پنجرے میں پہنچایا اور پنجرا الگنی میں لٹکا دیا۔ مینا کچھ دیر تک پنجرے میں ادھر سے ادھر چکر کاٹتی رہی پھر آرام سے ایک جگہ ٹھہر گئی۔

صبح فلک آرا کے کھل کھلانے اور مینا کے چہچہانے کی آوازوں سے میری آنکھ کھلی۔ فلک آرا نے معلوم نہیں کس وقت الگنی کے نیچے مونڈھا رکھ کر پنجرا اتار لیا تھا اور اب اسی مونڈھے پر پنجرا رکھے' زمین پر گھٹنے ٹیکے بار بار پنجرا چومتی تھی اور مینا بار بار بول رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی فلک آرا نے خبر سنائی۔ "ابّا! ہماری مینا آ گئی۔"

دیر تک وہ مجھے بتاتی رہی کہ مینا کیا کہہ رہی ہے۔ میں نے بھی پنجرے کے پاس بیٹھ کر مینا سے دو تین باتیں کیں لیکن اس نے اس طرح میری طرف دیکھا گویا مجھے پہچانتی ہی نہیں۔ اتنے میں فلک آرا نے پوچھا۔ "ابّا! اس کا نام کیا ہے؟"

"فلک آرا۔" میرے منہ سے نکلا پھر میں رکا اور بولا۔

"فلک آرا بیٹی! اس کا نام مینا ہے۔"

"واہ' مینا تو یہ خود ہے۔"

"اسی لیے تو اس کا نام مینا ہے۔"

"تو مینا تو سب کا نام ہوتا ہے۔"

"اسی لیے اس کا بھی نام مینا ہے۔" اس طرح میں اس کا چھوٹا سا دماغ الجھاتا رہا۔ اصل میں خود میرا دماغ الجھا ہوا تھا۔

کئی دن تک میں ڈرتا ہوا طاؤس چمن پہنچتا اور ڈرا ہوا وہاں سے واپس آتا۔ ہر وقت چونکا رہتا۔ قیصر باغ میں کوئی مجھے ذرا غور سے دیکھتا تو جی چاہتا' بھاگ کھڑا ہوں۔ گھر پر دیکھتا کہ فلک آرا مینا کا پنجرا سامنے رکھے اس سے دنیا جہان کی باتیں کر رہی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بتانا شروع کر دیتی کہ آج



مینا نے اس سے کیا کیا باتیں کی ہیں۔ دھیرے دھیرے میری دہشت کم ہونے لگی۔

ایک دن جب فلک آرا مینا کی باتیں بتا رہی تھی، میں نے کہا۔ "مگر تمھاری مینا ہم سے تو بولتی نہیں۔"

"آپ بھی تو اس سے نہیں بولتے" وہ شکایت کر رہی تھی۔"

"اچھا؟ کیا کہہ رہی تھی بھلا؟"

"کہہ رہی تھی، تمھارے ابا تم کو چاہتے ہیں، ہم کو نہیں چاہتے۔"

"مگر اس کی بہن تو اسے بہت چاہتی ہے۔"

"کون بہن؟"

"فلک آرا شہزادی!" اس پر وہ اس طرح ہنسی کہ میرا سارا ڈر ختم ہو گیا۔

دوسرے دن میں بے دھڑک طاؤس چمن میں داخل ہوا۔ شام کے وقت میں نے کئی مرتبہ مینائیں گنیں مگر صحیح صحیح نہیں گن سکا۔ صفائی کے بہانے قفس کے سارے آئینے اُتار لیے پھر گنا، پھر بھی گنتی غلط ہو گئی۔

اس کے بعد میں روز کسی نہ کسی حیلے سے دو ایک مالی طاؤس چمن میں بلاتا اور ان سے میناؤں کی گنتی کراتا۔ ان کی بتائی ہوئی تعدادیں ایسی ہوتیں کہ مجھے ہنسی آ جاتی۔ مالیوں سے مینائیں گنوانے میں مجھے اتنا ہی مزہ آیا جتنا فلک آرا کو اپنی مینا سے باتیں کرنے میں آتا ہوگا۔

یہ میرا روز کا معمول ہو چلا تھا کہ ایک دن بادشاہ پھر طاؤس چمن میں تشریف لائے۔ اچانک قفس کے پاس رک کر وہ درباریوں اور داروغہ نبی بخش سے باتیں کرنے لگے۔ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی لیکن میرا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ بادشاہ نبی بخش کو رستے کے ہاتھیوں کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔ بیچ میں وہ ایک نظر قفس پر بھی ڈال لیتے اور اُس کی مینائیں اِدھر سے اُدھر اڑتی دیکھتے۔ ایک بار انھوں نے زیادہ دیر تک مینائیں دیکھیں، پھر نبی بخش سے پوچھا۔ "ان کو تعلیم شروع کرا دی؟"

"جہاں پناہ!" داروغہ ہاتھ جوڑ کر بولے۔ "میرا [illegible] روز بھر [illegible]"

اب بادشاہ نے اپنے مصاحبوں سے قفس کی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ اسے بنانے میں کاری گروں نے جو صنعتیں دکھائی تھیں، ان کا ذکر ہوا۔ کچھ کاری گروں کے نام بھی لیے گئے جن میں بعض لکھنؤ کے مشہور سنار تھے۔ میری گھبراہٹ اب دور ہو چکی تھی۔ میں سوچ رہا تھا، ہمارے بادشاہ اپنے نوکروں سے بھی کیسے التفات سے بات کرتے ہیں اور ان کی آواز کس قدر نرم ہے۔ اسی وقت مجھے بادشاہ کی نرم آواز سنائی دی۔ "بھئی نبی بخش! آج فلک آرا نہیں دکھائی دے رہی ہیں؟"

ایک دم جیسے کسی نے میرے بدن سے سارا خون کھینچ لیا۔ داروغہ نے کہا۔ "جہاں پناہ! کہیں ٹہنیوں میں چھپ گئی ہیں۔ ابھی تو سارے میں اُڑتی پھر رہی تھیں۔"

بادشاہ دھیرے سے ہنسے اور بولے۔ "ہم سے شرما تو نہیں رہی ہیں؟ اور انھیں دیکھو حیادار دُلھن کو، کیسی چہلیں کر رہی ہیں۔ حیادار دُلھن! ابھی تمھارے لچھن رہے تو ہم تمھارا نام بدل کر شوخ ادا رکھ دیں گے۔"

سب لوگوں نے سر جھکا کر منہ پر رومال رکھ لیے اور بے آواز ہنسنے لگے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں بھی بادشاہ کو اس طرح مزے مزے کی باتیں کرتے دیکھ کر نہال ہو جاتا اور اپنے تمام جاننے والوں کے سامنے ان کا ایک ایک لفظ دہراتا لیکن اس وقت میرے کانوں میں ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔ "بھئی نبی بخش! آج فلک آرا نہیں دکھائی دے رہی ہیں۔"

بادشاہ اب پھر ہاتھیوں کی باتیں کر رہے تھے اور میں قفس سے کچھ ہٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ بادشاہ کی بات سن کر پہلے تو مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ میں اچانک سکڑ کر بالشت بھر کا رہ گیا ہوں لیکن اب یہ معلوم ہو رہا تھا کہ میرا بدن پھیل کر اتنا بڑا ہوا جا رہا ہے کہ میں کسی کی بھی نظروں سے خود کو چھپا نہیں پاؤں گا۔ میں مٹھیاں بھینچ بھینچ کر سکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کش مکش میں مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ بادشاہ کب واپس گئے۔ جب میں چونکا تو طاؤس چمن میں سناٹا تھا، صرف قفس کے اندر اُڑتی ہوئی میناؤں کے پروں کی آواز آ رہی تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی اُڑ کر گھر پہنچ جاؤں اور

شاہی مینا لا کر قفس میں ڈال دوں۔

مغرب کے وقت تک کسی طرح کام ختم کر کے گھر واپس ہوا۔ راستے بھر تو اسی فکر میں رہا کہ مینا کو کس طرح چپکے سے قفس میں پہنچاؤں لیکن جب گھر پہنچا اور فلک آرا نے دوسرے روز کی طرح چہک چہک کر مینا کا دن بھر کا حال سنانا شروع کیا تو مجھے یہ فکر بھی لگ گئی کہ مینا کو تو لے جاؤں مگر فلک آرا سے کیا کہوں گا۔ اس رات بہت دیر تک جاگتا اور کروٹیں بدلتا رہا۔

دن چڑھے سو کر اٹھا تو خیال آیا کہ کل طاؤس چمن میں میری باری صبح کی ہو جائے گی۔ پھر ایک ہفتے تک مینا قفس میں پہنچانا آسان نہ ہو گا۔ جو کچھ کرنا ہے' آج ہی کرنا ہے۔ فلک آرا اس وقت بھی مینا سے کھیل رہی تھی۔ دونوں میں جدائی ڈال دینے کا خیال مجھے تکلیف دے رہا تھا لیکن اسی وقت ایک تدبیر میرے دماغ میں آ گئی۔ میں نے پنجرے کے پاس جا کر مینا کو غور سے دیکھا' اور فلک آرا سے کہا "بیٹی! یہ تمھاری مینا کی آنکھیں کیسی ہو رہی ہیں؟"

"ٹھیک تو ہیں۔" فلک آرا نے مینا کی آنکھیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہیں بھی نہیں ٹھیک ہیں۔ میلی میلی تو ہو رہی ہیں اور دیکھو کناروں پر زردی بھی ہے' اوہو! اسے بھی یرقان ہو گیا ہے۔"

"یرقان؟" فلک آرا نے گھبرا کر پوچھا۔

"بہت بڑی بیماری ہوتی ہے۔ بادشاہ کے باغ کی کئی مینائیں اس میں مر چکی ہیں۔"

فلک آرا اور بھی گھبرا گئی۔ "تو حکیم صاحب سے دوا لے آؤ۔"

"حکیم صاحب چڑیوں کی دوائیں تھوڑی دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اسے تو نصیر الدین حیدر بادشاہ کے انگریزی اسپتال میں بھیجنا ہو گا۔ شاید بچ ہی جائے۔ اس کی حالت تو بہت خراب ہے۔ پھر بھی شاید... دیکھو کہیں راستے ہی میں نہ مر جائے۔"

غرض میں نے بھولی بھالی بچی کو اتنا ڈرا دیا کہ وہ رونے لگی۔ "اللہ ابا! اسے جلدی لے کر جاؤ۔"

"ابھی تو اسپتال بند ہو گا۔" میں نے اسے بتایا۔ "جب کام پر جائیں گے تو لیتے جائیں گے۔"

جانے کا وقت آیا تو میں نے مینا کو پنجرے سے نکالا۔ فلک آرا بولی۔ "ابا! پنجرے ہی میں لے جاؤ۔"

"وہاں چڑیاں پنجروں میں نہیں رکھی جاتیں' ان کے لیے پورا مکان بنا ہوا ہے۔ تم پنجرا صاف کر کے رکھو۔ جب یہ اسپتال سے اچھی ہو کر آئے گی تو مزے سے اپنے پنجرے میں رہے گی۔"

فلک آرا نے مینا میرے ہاتھ سے لے لی' دیر تک اسے پیار کرتی رہی پھر بولی۔ "ابا! اس پر کوئی دعا پھونک دو۔"

"راستے میں پھونک دیں گے۔" میں نے کہا "لاؤ دیر ہو رہی ہے۔ اسپتال بند ہو جائے گا۔"

مینا اس کے ہاتھ سے لے کر میں نے کرتے کی جیب میں ڈال لی اور جلدی سے دروازے سے باہر نکل آیا۔ جانتا تھا کہ فلک آرا ہر روز کی طرح دروازے کا ایک پٹ پکڑے مجھے جاتے دیکھ رہی ہے لیکن میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

قسمت نے ساتھ دیا اور طاؤس چمن میں داخل ہوتے ہی موقع مل گیا۔ مالیوں میں سے کوئی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ میں قفس کے اندر آ گیا۔ مالی اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے ایک بار زور سے کھانس کر گلا صاف کیا پھر بھی کسی نے میری طرف نہیں دیکھا۔ اب قفس کے ایک کنارے پر جا کر میں نے فلک مینا جیب سے نکالی اور ہلکے سے اچھال دی۔ اس نے پر پھٹ پھٹا کر خود کو ہوا میں تولا' پھر ایک جھولے پر بیٹھ گئی' وہاں سے اڑی' ایک مچان پر پہنچی' مچان سے نیچے غوطہ مارا اور حوض کے کنارے آ بیٹھی۔ جہاں بھی وہ بیٹھتی' دوسری کئی مینائیں اس کے پاس آ بیٹھتیں اور اس طرح چہچہاتیں جیسے پوچھ رہی ہوں' بہن! اتنے دن کہاں رہیں؟

جس دن طاؤس چمن میں مینائیں آئی تھیں' اس کے بعد سے آج پہلا دن تھا کہ میرے دل پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ ننھی فلک آرا کو بہلانے کے لیے بہت سی باتیں میں نے راستے ہی میں سوچ لی تھیں اور مجھے یقین تھا کہ کئی دن وہ اسی میں خوش رہے گی کہ اس کی مینا اسپتال میں اچھی ہو رہی ہے پھر اسے

بھول بھال جائے گی۔ آج میں نے قفس کی ساری مینائیں غور سے دیکھیں اور مجھے بھی ان میں کچھ کچھ فرق نظر آیا، اور فلک مینا کو تو میں ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ اس وقت وہ سب سے الگ تھلگ ایک ٹہنی پر بیٹھی تھی اور ٹہنی دھیرے دھیرے نیچے اوپر ہو رہی تھی۔ میں نے قریب جا کر اسے چمکارا۔ وہ چپ چاپ میری طرف دیکھنے لگی۔ "فلک آرا یاد آ رہی ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔ وہ اسی طرح میری طرف دیکھتی رہی۔ میں نے کہا۔ "ہم سے ناراض تو نہیں ہو؟"

اچانک مجھے خیال آیا کہ میں بالکل بادشاہ کی طرح بول رہا ہوں۔ میں آپ ہی آپ ڈر گیا اور جلدی جلدی قفس کا کام ختم کر کے باہر نکل آیا۔

(۳)

گھر آ کر، جیسا میرا خیال تھا، مجھے فلک آرا کو بہلانے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ میں نے خوب مزے لے لے کر اُسے بتایا کہ کس طرح اُس کی مینا نے کڑوی دوا پینے سے انکار کر دیا اور اُس کے لیے میٹھی میٹھی دوا بنوائی گئی۔ "اور بھیا! جب اُسے مونگ کی کھچڑی کھانے کو دی گئی۔" میں نے بتایا۔ "تو اس نے کہا، ہم مونگ کی کھچڑی نہیں کھاتے۔ ڈاکٹر نے پوچھا، پھر کیا کھاتی ہو؟"

"اس نے کہا ہو گا، ہم تو دودھ جلیبی کھاتے ہیں۔" فلک آرا بیچ میں بول پڑی۔

"ہاں"۔ میں نے کہا۔ "ڈاکٹر کی سمجھ میں نہیں آیا۔ بے چارہ انگریز تھا نا۔ ہم سے پوچھنے لگا، ویل مسٹر کالے خاں! یہ جلیبی کیا ہوتا ہے؟"

فلک آرا ہنسی سے لوٹ گئی۔ اس نے خالی پنجرا اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا اور 'جلیبی کیا ہوتا ہے، جلیبی کیا ہوتا ہے' کہہ کہہ کر دیر تک ہنستی رہی۔ رات گئے تک میں نے اُسے اپنا حال اور اس کی مینا کے قصے سنائے۔

جب وہ سو گئی تو میں نے اُٹھ کر پنجرا اس کی سجاوٹوں سمیت کوٹھری کے کباڑ میں چھپا دیا۔ میں چاہتا تھا، فلک آرا اپنی مینا کو بالکل بھول جائے۔

صبح وہ سو کر اٹھی تو چپ چپ تھی۔ دیر کے بعد اس نے مجھ سے صرف اتنا پوچھا۔ "تو ہماری مینا اچھی ہو جائے گی؟"

"ہاں، اچھی ہو جائے گی۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن بٹی! بیمار کی زیادہ باتیں نہیں کرتے ہیں، اس سے بیماری بڑھ جاتی ہے۔" اس کے بعد اس نے مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اس کی مینا کا کیا ہوا؟

میں اُسے بہلانے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا کہ کسی نے دروازہ کھٹ کھٹایا۔ میں باہر نکلا۔ داروغہ نبی بخش کا آدمی کھڑا تھا۔ "خیریت تو ہے محرم علی؟" میں نے پوچھا۔

داروغہ صاحب نے آج سویرے سے بلایا ہے۔" اس نے کہا "حضرت سلطانِ عالم طاؤس چمن میں تشریف لا رہے ہیں۔"

"آج؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "ابھی پرسوں ہی تو۔"

"چڑیاں بڑھ گئی ہیں نا۔" محرم علی بولا۔ "وہی سننے۔"

"اچھا تم چلو۔"

میں نے جلدی جلدی کپڑے بدلے۔ باہر نکل کر جعراتی کی ماں سے فلک آرا کے پاس جانے کو کہا اور لپکتا ہوا طاؤس چمن پہنچ گیا۔ راستے میں کئی بار میں نے فلک مینا کو قفس میں پہنچا دینے پر خود کو شاباش بھی دی۔

آج ابجادی قفس کے سامنے چاندی کی منقّش چوبوں پر سبز اطلس کا منقیشی جھالروں والا چھوٹا شامیانہ تنا ہوا تھا۔ داروغہ اور بہت سے ملازم قفس کے پاس جمع تھے۔ ان کے بیچ میں بوڑھے میر داؤد اس طرح اینٹھے ہوئے کھڑے تھے جیسے وہ بادشاہ ہوں اور ہم سب ان کے غلام۔ میر داؤد کی نازک مزاجیوں اور اکڑ کے قصے طرح طرح کی رنگ آمیزیوں اور مبالغوں کے ساتھ لکھنؤ بھر میں مشہور تھے لیکن سب جانتے تھے کہ پرندوں کو پڑھانے میں ان کا جواب نہیں ہے۔

"ہاں میاں کالے خاں؟" داروغہ نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "قفس کو دیکھ بھال لو ذرا جلدی۔"

میں نے بڑی پھرتی سے قفس کا فرش صاف کیا، پودوں پر پانی چھڑکا، گرے پڑے پھول پتّے سمیٹے اور باہر نکلا ہی تھا کہ جلو خانے کی طرف شہنائیاں اور نقارے بجنے لگے۔ ہم سب ہوشیار ہو کر کھڑے ہو گئے۔

میر داؤد کی آواز سنائی دی۔ "پھر کہتا ہوں، سبق کے بیچ

میں کوئی نہ بولے، نہیں جانور ٹھٹک جائیں گے۔"

داروغہ کو کچھ غصہ آگیا۔ "میر صاحب! ایک بار کہہ دیا' حضور کے سامنے کس کی مجال ہے جو چوں بھی کر جائے، مگر آپ ہیں کہ اب سے کئی دفعہ کہہ چکے ہیں۔"

اور اب میں میر صاحب نے بڑے اطمینان سے داروغہ کے ہونٹ پر انگلی رکھ کر پھر وہی کہا۔ "محل کے بیچ میں کوئی نہ بولے، نہیں جانور ٹھٹک جائیں گے۔"

"اماں جاؤ میر صاحب!" داروغہ منہ بنا کر بولے۔ "کیا مصوروں کی سی باتیں کر رہے ہو۔"

میر صاحب تلملا کر کچھ کہنے چلے تھے کہ شاہی جلوس نظر آنے لگا۔ ہم سب طاؤس چمن کے پھاٹک پر دو قطاریں بنا کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر میں جلوس پھاٹک پر آ پہنچا۔ آج بادشاہ کے ساتھ حضورِ عالم اور مصاحبوں کے علاوہ بیلی گارد کے کئی انگریز افسر بھی تھے۔ حضورِ عالم انھیں قفس کی ایک ایک چیز دکھانے لگے پھر بادشاہ نے ان سے دھیرے دھیرے کچھ کہا اور میر داؤد کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ میر صاحب تسلیم بجا لائے اور بڑھ کر قفس کے قریب آگئے۔ انھوں نے منہ سے کچھ سیٹی سی بجائی۔ قفس میں اڑتی ہوئی مینائیں ان کی طرف آکر جھولوں اور اڈوں پر بیٹھ گئیں اور زور زور سے چہچہانے لگیں۔ میر صاحب نے گلے پھلائے، پر پھیلائے اور ایک عجیب سی آواز منہ سے نکالی۔ مینائیں ذرا دیر کو چپ ہوئیں، پھر سب کے گلے پھول گئے اور ان کی آوازیں ایک آواز ہو کر سنائی دیں۔

سلامت شاہ اختر جانِ عالم
سلیمانِ زماں، سلطانِ عالم

ایک ایک لفظ اتنا صاف نکل رہا تھا کہ مجھے حیرت ہو گئی۔ بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ بہت سی گانے والیاں ایک ساتھ مل کر مبارک باد گا رہی ہیں۔ میناؤں نے دوبارہ یہی شعر پڑھا، دم بھر کو رکیں، پھر بھاری آواز اور مردانے لہجے میں بولیں۔

"ول کم ٹو طاؤس چمن!"

اس پر انگریز افسروں کو اتنا مزہ آیا کہ وہ بار بار مٹھیاں باندھ کر ہاتھ اوپر اچھالنے لگے۔ میناؤں نے پھر شعر پڑھا، پھر ایک اور شعر، پھر ایک اور۔ بادشاہ کچھ کچھ دیر بعد مسکرا کر میر داؤد کی طرف دیکھتے۔ میر صاحب عجیب تماشا سا دکھا رہے تھے، سینہ پھلا کر تن جاتے اور فوراً اس قدر جھک کر تسلیم کرتے کہ معلوم ہوتا قلابازی کھا جائیں گے۔

میناؤں نے ایک نیا شعر پڑھا اور پھر پہلا شعر پڑھنا شروع کیا۔ سلامت شاہ اختر جانِ عالم

لیکن ابھی شعر پورا نہیں ہوا تھا کہ قفس کے پوربی حصے سے ایک تیز چہکاتی آواز آئی۔ "فلک آرا شہزادی ہے۔"



سب مینائیں ایک دَم چُپ ہو گئیں اور میرو اوز کا منہ کُھلا کا کُھلا رہ گیا۔ فلک مینا ایک ٹہنی پر اکیلی بیٹھی تھی اور اس کا گلا پھولا ہوا تھا۔ اُس نے پھر کہا۔ "فلک آرا شہزادی ہے۔ دودھ جلیبی کھاتی ہے۔"

بالکل میری ننھی فلک آرا کی آواز تھی۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ دوسروں پر ان بولوں کا کیا اثر ہوا لیکن میں یہ سوچ کر تھرا گیا کہ محل کی کٹوریاں بھی دودھ جلیبی کو زیادہ منہ نہیں لگاتیں اور یہ ظالم مینا شہزادی کو دودھ جلیبی کھلائے دے رہی ہے' وہ بھی بادشاہ کے سامنے۔ مجھے کچھ لوگوں کے دھیرے دھیرے بولنے کی آوازیں سنائی دیں لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ کون کیا کہہ رہا ہے اس لیے کہ میرے کانوں میں سیٹیاں بج رہی تھیں اور اب مجھے ان سیٹیوں سے بھی زیادہ تیز سیٹی کی سی آواز سنائی دی۔

"فلک آرا شہزادی ہے' دودھ جلیبی کھاتی ہے۔ کالے خاں کی گوری گوری بیٹی ہے۔" پھر فلک آرا کے کِھل کِھلا کے ہنسنے اور تالیاں بجانے کی آواز' اور پھر وہی۔ "کالے خاں کی گوری گوری بیٹی ہے۔ کالے خاں کی گوری گوری بیٹی ہے۔"

اپنی آنکھوں کے آگے چھائے ہوئے اندھیرے میں بھی میں نے دیکھا کہ داروغہ نبی بخش آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ بادشاہ نے داروغہ کو دیکھا' پھر آہستہ آہستہ گردن گھمائی اور ان کی نظریں مجھ پر جم گئیں۔ میرا بدن زور سے تھرتھرایا اور دانت بیٹھ گئے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ قفس کا سفید پتھریلا چبوترا اوپر اُچھلا اور میرے سر سے ٹکرا گیا۔

دوسرے دن ہوش آیا تو میں نصیر الدین حیدر کے انگریزی اسپتال میں لیٹا ہوا تھا اور داروغہ نبی بخش جُھک کر مجھے دیکھ رہے تھے۔ داروغہ پر نظر پڑتے ہی مجھے سب کچھ یاد آ گیا اور میں اُٹھ کر بیٹھنے لگا لیکن داروغہ نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "لیٹے رہو' لیٹے رہو" اُنھوں نے کہا۔ "اب سر کی چوٹ کیسی ہے؟"

"چوٹ؟" میں نے پوچھا اور سر پر ہاتھ پھیرا تو معلوم ہوا کہ [illegible] لگی ہے۔ کچھ تکلیف بھی ہو رہی تھی لیکن اس وقت مجھے تکلیف کی پروا نہیں تھی۔ میں نے داروغہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "داروغہ صاحب! آپ کو قسم ہے' سچ سچ بتایئے' وہاں کیا ہوا تھا؟"

"سب معلوم ہو جائے گا بھائی! سب معلوم ہو جائے گا۔ پہلے اچھے تو ہو جاؤ۔"

"میں بالکل اچھا ہوں داروغہ صاحب!" میں نے کہا۔ "آپ کو قسم ہے۔"

داروغہ کچھ دیر ٹالتے رہے' آخر مجبور ہو گئے۔ "کیا پوچھتے ہو میاں کالے خاں!" اُنھوں نے کہنا شروع کیا۔ "تم تو غش کھا کے آرام پا گئے' وہاں ہم لوگوں پر جو گزر گئی۔۔۔ مگر پہلے یہ بتاؤ تم اُسے کس وقت پڑھا دیتے تھے؟"

"کسے؟"

"فلک آرا مینا کو' اور کسے۔"

"میں نے اُسے کچھ نہیں پڑھایا داروغہ صاحب! قسم ہے۔"

"پھر؟" اُنھوں نے پوچھا۔ "پھر یہ بیہودہ کلام اُس نے کہاں سُن لیے۔"

میں کچھ دیر ہچکچاتا رہا' آخر بولا۔ "میرے گھر پر۔"

داروغہ ہکا بکا رہ گئے۔ "کیا کہہ رہے ہو!"

"تب میں نے اُنھیں اوّل سے آخر تک پورا قصّہ سنایا۔ داروغہ سنّاٹے میں آ گئے۔ دیر تک منہ سے آواز نہیں نکلی' آخر بولے۔ "غضب کر دیا تم نے کالے خاں! بادشاہی پرندے کی چوری! اچھا' اُس دن جو حضرت نے فرمایا تھا کہ فلک آرا نہیں دکھائی دے رہی ہیں تو کیا اس دن بھی وہ تمھارے گھر تھی؟" میں نے سر جھکا لیا۔ داروغہ نے کہا۔ "تم نے مجھے مار ڈالا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا' میں نے کہہ دیا' ابھی تو یہیں اُڑتی پھر رہی تھیں۔ واہ بھائی! تم تو ہماری بھی نوکری لے گئے تھے۔ اب کل جو اس نے صاحبوں کے سامنے آ کے جادو بکنا شروع کیا تو حضرت پر سب کچھ روشن ہو گیا۔ اُف' اُف' اس کی کل کی لن ترانیاں سن کر حضرت نے جو بات کہی۔۔۔ وہی میں کہوں کہ یہ کیا زبانِ مبارک سے ارشاد ہو رہا ہے۔"

"کیا؟" میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "حضرت نے کیا فرمایا؟"

"فرمایا تو بس اتنا کہ داروغہ صاحب! ہمارے جانوروں کو

باہر نہ بھیجا کیجیے۔" داروغہ نے بتایا اور ٹھنڈی سانس بھری۔

"داروغہ صاحب! آج تک حضرت نے نبی بخش کے سوا داروغہ نہیں کہا تھا' نہ کہ داروغہ صاحب! اتنے دن کی نمک خواری کے بعد تمھارے سبب یہ بھی سننا پڑا۔ ابھی تک کان گونج رہے ہیں۔"

"داروغہ صاحب!" میں نے لجاجت سے کہا۔ "اب تو قصور ہوا' جو سزا چاہے۔"

"اچھا خیر' انھوں نے ہاتھ اٹھا کر مجھے چپ کرا دیا۔

"حضرت تو ریذیڈنسی کے صاحبوں کو لیے ہوئے سدھار گئے' یہاں طاؤس چمن میں غدر مچ گیا۔ حضورِ عالم ایک ایک کو پھاڑ کھاتے ہیں۔ ادھر میر داؤد صاحب گردن اچھل رہے ہیں کہ دشمنوں نے ان کی میناؤں کو ہشکانے کے لیے باہر کا جانور لا کے قفس میں چھوڑ دیا۔ میں کہہ رہا ہوں' یہ باہر کا جانور نہیں' حضرت کی پہچانی ہوئی مینا ہے۔ حضورِ عالم سامنے کھڑے ہوئے تھے' میر صاحب نے ان کا بھی لحاظ نہیں کیا' لگے چلانے کہ میں نے اسے نہیں پڑھایا ہے' میں نے اسے نہیں پڑھایا ہے۔ اوپر سے حضورِ عالم نے اور یہ کہہ کے ان کے منہ میں لگا دیں کہ میر صاحب! وہ تو ظاہر ہے کہ تم نے اسے نہیں پڑھایا ہے' اس واسطے کہ یہ تمھاری میناؤں سے اچھا بولتی ہے۔ اب تو میر صاحب نے 'کیا تاؤں' قفس سے [illegible] [illegible] [illegible] گئے تھے۔"

مجھے میر صاحب کی گود چاہے سے کیا لینا دینا تھا۔ میں نے کہا۔ "داروغہ صاحب! یہ بتائیے' وہاں میرا کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا۔" وہ بولے۔ "جہاں پناہ یہ مقدمہ حضورِ عالم کو سونپ کر سدھارے تھے۔ سب پر کھلا ہوا تھا کہ یہ تمھاری ہی کارستانی ہے۔ اس علاوہ چڑیا نے کوئی کسر چھوڑی تھی؟ حضورِ عالم وہیں کھڑے کھڑے تمھارا فیصلہ کر دیا تھا۔ میں نے ... ان کے ... میں ڈال دی۔ پھر وہ کسی طرح ... 'علامات' ... گرفتاری کا حکم واپس لیا۔ اب مقدمہ ہوا کے اختیار میں ہے گے۔ دیکھو کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ جرمانہ تو ہوا ہی' سمجھو آگے سے۔"

"داروغہ صاحب!" میں گھبرا کر بولا۔ "یہاں پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔ جرمانہ کہاں سے بھروں گا؟"

"ارے بھائی! کیوں پریشان ہوتے ہو۔" داروغہ نے کہا۔ "آخر ہم کس دن کے لیے ہیں؟ لیکن بات جرمانے ہی پر ٹل جائے تب نا۔ حضورِ عالم کھسیائے ہوئے ہیں' صاحبوں کے آگے کرکری ہوئی ہے۔ کیا پتہ' بند ہی کرا دیں یا گنگا پار اتروا دیں۔"

قید خانے سے زیادہ مجھے گنگا پار ہونے کے خیال سے وحشت ہوئی۔ ساری عمر لکھنؤ میں گزری تھی' باہر کہیں جاتا تو پاگل ہو جاتا۔ میں نے کہا۔ "داروغہ صاحب! اس سے تو اچھا ہے حضورِ عالم مجھے توپ دم کرا دیں' خدا کے واسطے کوئی ترکیب نکالیے۔" پھر مجھے ایک خیال آیا۔ "کیوں داروغہ صاحب! بادشاہ کو عرضی لکھوں؟ شاید معافی مل جائے۔"

"عرضیاں بادشاہ کو پہنچتی کہاں ہیں میرے بھائی!" داروغہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ "ایک ایک کاغذ پہلے حضورِ عالم کے ملاحظے سے گزرتا ہے۔ اب وہ جس پر چاہیں' آپ حکم صادر کریں' جسے چاہیں' حضرت کی خدمت میں پیش کریں۔" داروغہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ چلتے چلتے ذرا رکے اور بولے۔ "مگر یہ ضرور ہے کالے خاں! عرضی کی تمھیں سوجھی اچھی ہے۔"

"داروغہ صاحب لیکن خدارا یہاں سے نکلوائیے۔" میں نے کہا۔ "نہیں دواؤں کے یہ بھبکے مار ڈالیں گے۔"

"سچ کہتے ہو۔ اچھا تو چھٹی میں ابھی دلائے دیتا ہوں۔ تم گھر جا کر ایک دو دن آرام کر لو پھر کسی اچھے خوش نویس سے عرضی لکھوانا' آپ نہ لکھنے بیٹھ جائیے گا۔"

"میں داروغہ صاحب! جاہل آدمی' آپ لکھ کر بنتا کام بگاڑوں گا؟"

"اور ہم کہہ کیا رہے ہیں۔"

داروغہ صاحب اسپتال والوں سے بات کر کے ادھر کے ادھر نکل گئے اور میں کچھ دیر بعد چھٹی پا کے گھر آ گیا۔

ننھی فلک آرا کو گود میں بٹھا کر میں دیر تک بہلاتا رہا لیکن مجھے خبر کچھ نہیں تھی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور وہ کیا کہہ رہی ہے۔

(۵)

دوسرے ہی دن میں منشیوں کی فکر میں نکل کھڑا ہوا۔ اس وقت لکھنؤ میں ایک سے ایک لکھنے والا پڑا تھا۔ منشی کالکا پرشاد تو میرے ہی محلّے میں تھے۔ تین کو میں جانتا تھا کہ بادشاہ کی خدمت میں رسائی رکھتے ہیں' ایک مرزا رجب علی صاحب ☆' ایک منشی ظہیرالدین صاحب' ایک منشی امیر احمد صاحب ☆ مرزا صاحب بڑی چیز تھے' ایک عالم میں ان کے قلم کی دھوم تھی' اُن سے کہنے کی تو میری ہمت نہ ہوئی۔ منشی ظہیر الدین کو پوچھتا پاچھتا اُن کے گھر پہنچا تو معلوم ہوا" بلگرام گئے ہوئے ہیں۔ اب منشی امیر احمد صاحب رہ گئے۔ ان کا گھر بتانے والا کوئی نہ ملا لیکن یہ معلوم ہوا کہ وہ جمعرات کے جمعرات شاہ مینا صاحب کے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ اتفاق کی بات' اس دن جمعرات ہی تھی' وہ بھی نوچندی جمعرات۔

مغرب کے وقت منشی بھون کے پہلو سے ہوتا ہوا میں شاہ مینا صاحب پہنچ گیا۔ آدمیوں کی ریل پیل تھی' کسی طرح مزار تک پہنچا' وہاں قوالی ہو رہی تھی۔ منشی صاحب ہی کا کلام گایا جا رہا تھا۔ وہ خود بھی وہیں تشریف رکھتے تھے۔ میں انھیں قیصر باغ میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ ایک کونے میں کھڑا ہو کر قوالی سُننے لگا۔ رات گئے محفل برخاست ہوئی تو منشی صاحب کو لوگوں نے گھیر لیا۔ اب باتیں ہو رہی ہیں۔ خدا خدا کر کے منشی صاحب اُٹھے۔ میں پیچھے ہو لیا۔ اب منشی صاحب تسبیح گھماتے ہوئے ایک گلی سے دوسری' دوسری سے تیسری میں مڑتے جا رہے ہیں اور میں سائے کی طرح ساتھ ساتھ۔ آخر وہ ٹھٹک کر رک گئے۔ میں نے سامنے آ کر سلام کیا۔ انھوں نے جواب دے کر مجھے غور سے دیکھا۔ میں نے کہا۔ "آپ کے کرم کا محتاج ہوں۔" منشی صاحب جیب میں ہاتھ ڈالنے لگے۔ میں نے ہاتھ جوڑ دیے۔ "حضور! فقیر نہیں ہوں۔"

"اچھا تو پھر؟"

"فقیروں سے بھی بدتر ہوں۔ آپ چاہیں تو خانہ خرابی سے بچ جاؤں۔"

"الٰہی خیر! کیوں پہیلیاں بجھوا رہے ہو؟ کہہ کر کھُل کر نہیں کہو گے؟"

میں نے وہیں کھڑے کھڑے اپنا قصّہ شروع کر دیا مگر منشی صاحب نے تھوڑی ہی دیر میں مجھے روک دیا۔ ان کا مکان قریب آ گیا تھا' وہاں لے گئے۔ میں نے کتنا کتنا کہا کہ رات بہت آ گئی ہے' میں کل حاضر ہو جاؤں گا مگر اُنھوں نے اسی وقت سارا حال سُنا' بیچ بیچ میں کبھی افسوس کرتے' کبھی حیرت۔ کبھی ہنس پڑتے' کبھی بادشاہ کی تعریف کرنے لگتے۔ میں نے پورا قصّہ سنا کر اپنا مطلب عرض کیا تو وہ کچھ سوچ میں پڑ گئے پھر بولے۔ "سنو بھائی کالے خاں! قصّہ ہمارے دل کو لگ گیا۔ عرضی تو تمھاری ہم لکھ دیں گے' اور جی لگا کے لکھیں گے' لیکن وہ حضرت تک پہنچے تو کیوں کر پہنچے؟ یہ تمھارے بس کا کام نہیں' کوئی وسیلہ ہے تمھارے پاس؟"

"وسیلہ؟" میں نے کہا۔ "منشی صاحب! میرا تو جو کچھ وسیلہ ہیں' آپ ہی ہیں۔ آپ حضرت سلطانِ عالم کی خدمت میں۔۔۔"

"ہاں بھائی! لگا ہے کا ہے حاضری تو دیتا ہوں۔ غریب پروری ہے حضرت کی کہ یاد فرما لیتے ہیں۔"

"تو پھر منشی صاحب! میں نے کچھ خوش ہو کر' کچھ ڈرتے ڈرتے کہا۔ "اگر وہ عرضی آپ ہی۔۔۔"

منشی صاحب ہنسنے لگے۔ "بھئی کالے خاں!۔۔۔ مگر سچ ہے' تم بادشاہی کارخانے کو کیا جانو۔ وہاں یہ تھوڑی ہوتا ہے کہ حضرت ظلِ سُبحانی آداب! یہ چٹھی لے لیجیے' اور حضرت نے ہاتھ بڑھا کر۔۔۔"

میں جھینپ گیا' بولا۔ "منشی صاحب! یہ میرا مطلب نہیں تھا' اصل یہ ہے کہ سلطانِ عالم کو عرضی پہنچوانے کے لیے میں آپ کے سوا کسی سے نہیں کہہ سکتا۔"

"عرضی بادشاہ تک پہنچی بھی تو ہزار ہاتھوں سے ہوتی ہوئی پہنچے گی۔ پھر مقدمہ تمھارا حضورِ عالم کے حوالے ہوا ہے' وہ کاہے کو پسند کریں گے کہ۔۔۔"

منشی صاحب رک رک کر دیر تک کچھ سوچتے رہے۔ بیچ بیچ میں اپنے آپ سے باتیں بھی کرنے لگتے۔ کچھ لوگوں کے نام بھی لیتے جاتے' میاں صاحبان' مقبول الدّولہ' راحت السّلطان' امامین اور معلوم نہیں کون کون۔ آخر میں کہنے

☆ مرزا رجب علی بیگ سرور

☆ منشی امیر احمد امیر مینائی

لگے۔ ''اچھا میاں کالے خاں! اللہ نے چاہا تو عرضی تمھاری حضرت کے ملاحظے سے گزر جائے گی۔ آگے تمھاری قسمت۔''

میں نے منشی صاحب کو دعائیں دے دے کر ان کی تعریفیں شروع کر دیں تو گھبرا کر بولے۔ ''ارے بھائی! ارے والا! کیوں گناہ گار کرتے ہو؟ کام بنانے والا اللہ ہے۔ تو بس اب تم گھر سدھارو۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

میں چلنے لگا تو دروازے تک پہنچانے آئے۔ میں نے رخصت ہوتے وقت کہا۔ ''منشی صاحب! اس کا اجر اللہ آپ کو دے گا۔ غریب آدمی ہوں، آپ کا حقِ محنت۔۔۔''

''ہا! ہا!'' منشی صاحب نے زبان دانتوں تلے دبالی۔ ''اس کا تو نام بھی منہ سے نہ لینا۔'' اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پھر وہاں کہا۔ ''بات یہ ہے کالے خاں! تمھارا قصہ ہمارے دل کو لگ گیا ہے۔''

آصف الدولہ بہادر کے امام باڑے کا نوبت خانہ رات کا پچھلا پہر بجا رہا تھا۔ جمراتی کی اماں بے چاری، میں نے سوچا، ہوا تو راہ دیکھتے دیکھتے سو گئی ہوں گی۔ انھیں جگانا اچھا معلوم نہیں ہوا۔ صبح تک شہر میں آوارہ گردی کرتا رہا۔

(٦)

تین چار دن گزرے ہوں گے کہ کیا دیکھتا ہوں، داروغہ نبی بخش دروازے پر کھڑے ہیں۔ میں گھبرا گیا لیکن انھوں نے مجھے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا، کہنے لگے۔ ''ارے میاں کالے خان بھائی تم تو قیامت نکلے۔''

میں اور بھی گھبرا گیا۔ ''داروغہ صاحب! اللہ، مجھے کچھ خبر نہیں کیا ہوا؟''

''کیا ہوا؟'' داروغہ بولے۔ ''یہ ہوا کہ تمھاری عرضی حضرت سلطانِ عالم کی خدمت میں پہنچ گئی اور ملاحظے سے گزرتے ہی اس پر حکم بھی ہو گیا۔''

''حکم ہو گیا؟'' میں نے بے تاب ہو کر کہا۔ ''کیا حکم ہوا داروغہ صاحب؟''

''سلطانی فیصلے ہم لوگوں کو بتائے جائیں گے؟ کیا بات کرتے ہو کالے خاں! لیکن اسے لکھ رکھو۔ اچھا، پہلے یہ بتاؤ، عرضی میں سارا حال لکھوا دیا تھا؟ بٹیا کا بِن ماں کی ہونا، پہاڑی بیٹا کے لیے تمھیں دق کرنا، اور۔۔۔''

''اوّل سے آخر تک۔ عرضی میں نے دیکھی تو نہیں لیکن منشی امیر احمد صاحب نے کہا تھا، ''بی لگا کر لکھوں گا۔''



"منشی امیر احمد صاحب؟" داروغہ تعجب سے بولے۔ "تمھیں پکڑ لیا؟ اماں ہم تمھیں ایسا نہیں سمجھتے تھے۔ وہی ہم کہیں' یہ عرضی حضرت سلطانِ عالم تک پہنچ کیوں کر گئی؟"

"داروغہ صاحب! وہ ابھی آپ کیا کہہ رہے تھے؟"

"اماں جو کہہ رہے تھے' وہ کہہ رہے ہیں۔"

"نہیں' وہ آپ نے کیا کہا تھا' اسے لکھ رکھو۔"

"وہ' ہاں۔" داروغہ کو یاد آ گیا۔ "ہم کہہ رہے تھے اسے لکھ رکھو کہ تمھیں معافی مل گئی اور تمھاری بٹیا کو مینا۔"

"بٹیا کو مینا؟" میں حیران ہو کر بولا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہیں داروغہ صاحب؟"

"تم ابھی بادشاہ کے مزاج سے واقف نہیں ہو۔" داروغہ بولے "آج جو سویرے بندے علی' ان کا چوب دار مجھ سے تمھارا گھر پوچھنے آیا تو میں بھانپ گیا۔ بھئی جی خوش ہو گیا۔"

لیکن میں نے دیکھا' داروغہ بہت خوش نہیں ہیں۔ رک رک رہے تھے اور معلوم ہوتا تھا' کچھ اور بھی کہنا چاہتے ہیں۔ مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ میں نے کہا۔ "داروغہ صاحب! آپ نے ہمیشہ میرے سر پر ہاتھ رکھا ہے۔ اس وقت آپ خوش نہ ہوں گے تو کون ہو گا لیکن داروغہ صاحب! کیا کچھ اور بات بھی ہے؟"

داروغہ ذرا کسمسائے پھر بولے۔ "کہہ نہیں سکتے کالے خاں! ہو سکتا ہے کوئی بات نہ ہو' ہو سکتا ہے بہت بڑی بات ہو جائے مگر تمھاری خیر رہے گی۔"

"داروغہ صاحب! خدا کے لیے۔۔۔"

اب داروغہ صاف پریشان نظر آ رہے تھے۔ "بھائی!" انھوں نے کہا۔ "تازہ واردات بھی سن لو۔ آج نواب صاحب کے تین آدمی طاؤس چمن میں آ گئے۔"

"کون؟" میں نے وحشت سے پوچھا۔

"ارے حضورِ عالم' دستورِ معظم' وزیرِ اعظم الدولہ نواب علی نقی خاں بہادر۔ کو سمجھے؟"

"سمجھا۔"

"تو شاید چار آدمی تھے۔" داروغہ نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ "مجھی نے مجھے طاؤس چمن میں بلوایا۔ میں گیا تو دیکھا' ایجادی قفس کے سامنے کھڑے ہیں۔ مجھے دیکھتے

ہی بڑے تیوروں سے پوچھنے لگے' ان میں فلک آرا کون سی مینا ہے؟ میں جل گیا' بولا انھی میں کہیں ہو گی' میں کوئی سب کے نام یاد رکھتا پھرتا ہوں؟ ان کے بھی دماغ آسمان پر تھے۔ کہنے لگے' اتنے دن سے داروغہ ہو اور جانور کو نہیں پہچانتے؟ میں نے کہا' چلیے پہچانتے ہیں' نہیں بتاتے۔ آپ پوچھنے والے کون؟ بات بڑھنے لگی۔ ان میں ایک شاید نئے نئے مصاحبی میں آئے تھے' مونچھیں نکل رہی تھیں' ذرا صورت دار بھی تھے' انھوں نے کچھ زیادہ رنگ دکھانا شروع کیا تو میں نے کہا' صاحب زادے صاحب! اپنا جوبن سنبھال رکھیے' پٹھان بچہ ہوں' جب تک داڑھی مونچھیں پوری نہ نکل آئیں' میرے سامنے آگا پیچھا دیکھ کر آیئے گا۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ "داروغہ صاحب! ابھی آپ کی زبان سے اللہ کی پناہ!"

"ہاں نہیں تو۔" داروغہ واقعی تاؤ میں آئے ہوئے تھے۔ "اب وہ لگے ڈنکارنے' میں نے کہا' میرے شہزادے! ہم سلطانی خاصے کے شیروں کو نوالہ کھلاتے ہیں۔ لے بس' اب چونچ بند کیجیے' نہیں اٹھا کر موتی کے کٹہرے میں پھینکوں گا پہلے' نام پوچھوں گا بعد میں۔ شور سن کر محلات کے بہت سے آدمی نکل آئے' معاملہ رفع دفع کرایا۔"

کچھ دیر ہم دونوں سوچ میں ڈوبے رہے۔ پھر میں نے کہا۔ "بری واردات ہوئی داروغہ صاحب!"

"واردات؟" داروغہ بولے۔ "واردات میرے یار ابھی تم نے سنی کہاں۔ اب سنو' محلات والوں میں نواب صاحب کے آدمیوں کے دوست آشنا بھی تھے' وہ ان کو الگ لے گئے۔ تب بھید کھلا کہ اس دن ریزی ڈنسی کے جو صاحبان طاؤس چمن میں آئے تھے' ان میں سے کسی کو تمھاری مینا کے بے ہنگم بول بھا گئے۔ اس نے نواب صاحب سے اس کی تعریف کی۔ نواب صاحب کھٹ سے وعدہ کر بیٹھے کہ مینا ریزی ڈنسی پہنچا دی جائے گی۔ یہی نہیں۔ اس کے لیے ایجادی قفس کے نمونے کا چھوٹا پنجرا بھی بنوا لیا ہے۔"

میں اتنی ہی دیر میں فلک مینا کو اپنے گھر کا مال سمجھنے لگا تھا۔ میں نے کہا۔ "لیکن مینا تو حضرت نے میری بچی کو عنایت کی ہے؟"

"ہی ہے دوست! اگر نواب نے بھی تو گورے صاحب بہادر سے وعدہ کیا ہے۔"

"تو کیا نواب اپنے بادشاہ کا حکم نہیں مانیں گے اور اس۔۔۔"

"اس بس، آگے کچھ نہ کہو کالے خاں! تمھیں خبر نہیں، یہاں کیا ہو رہا ہے۔ مگر خیر، نواب صاحب بادشاہ کے فیصلے پر اپنا حکم ڈھیلا چلائیں گے، البتہ وہ مینا کو تم سے مول ضرور لے لیں گے، وہ بھی منہ مانگے داموں۔ اچھا ٹھیک ہے، بادشاہی تحفے اسی لیے ہوتے ہیں کہ آدمی انھیں بیچ باچ کے پیسے بنالے لیکن اتنا یاد رکھو کالے خاں! مینا اگر ریزی ڈنسی پہنچ گئی تو بادشاہ کو ملال ہوگا۔"

"ملال ہو اُن کے دشمنوں کو۔" میں نے کہا۔ "نواب صاحب تحریر کا اول ڈالیں گے تو کھلا دوں گا، میری بیٹی راضی نہیں، اس نے مینا کو بہن بنایا ہے۔"

"اور نواب صاحب چُپ ہو کے بیٹھ جائیں گے۔" داروغہ فوراً بولے۔ "کہاں رہتے ہو بھائی؟ اچھا اب جو ہم کہہ رہے ہیں ذرا دھیان سے سُنو۔ چھوٹے میاں یاد ہیں؟"

"کون چھوٹے میاں؟"

"اماں وہی جن کے پاس تصویریں اتارنے والا ولایتی بکسا ہے۔ نام لو بھئی! ہمیں تو عرفیت ہی یاد رہتی ہے۔"

"اچھا وہ چھوٹے میاں داروغہ احمد علی خاں۔" میں نے کہا "انھیں بھول جاؤں گا؟ حسین آباد مبارک میں کام کر چکا ہوں۔"

"بس تو اگر مینا تمھارے پاس پہنچ گئی تو وہ تمھارے گھر آئیں گے۔ جو وہ کہیں، وہی کرنا۔ ذرا اس میں خلاف نہ ہو، اور دیکھو، پریشان نہ ہونا، تمھارا بھلا ہی بھلا ہوگا۔ اچھا ہم چلے۔ باقی چھوٹے میاں بتائیں گے۔"

"داروغہ صاحب! کچھ آپ بھی تو بتاتے جائیے۔" میں نے کہا۔ "مجھے ابھی سے ہول ہو رہی ہے۔"

"تو سنو کالے خاں! ہم نہیں چاہتے کہ بادشاہی پرندہ ریزی ڈنسی میں جائے۔ تم چاہتے ہو؟"

"زندگی بھر نہیں۔"

"جاؤ بس چین سے بیٹھو۔"

داروغہ رخصت ہوئے تو میں گھر میں آیا۔ طاؤس چمن والے قصے کے بعد آج پہلی بار میں نے اپنی فلک آرا کو غور سے دیکھا۔ وہ بہت جھک گئی تھی۔ میں سمجھ گیا' اپنی مینا کے لیے ہڑک رہی ہے لیکن اس کا نام لیتے ڈرتی ہے۔ جی چاہا' اسے ابھی بتادوں کہ تمہاری مینا تمہارے پاس آرہی ہے لیکن ابھی مجھے خود ہی ٹھیک ٹھیک کچھ نہیں معلوم تھا' اُسے کیا بتاتا' بس اُسے گود میں لیے دیر تک ٹہلتا رہا۔

داروغہ نبی بخش کا خیال صحیح تھا۔ دوسرے ہی دن سویرے سویرے شاہی چوب دار اور دو سرکاری اہل کار میرے دروازے پر آموجود ہوئے۔ داروغہ خود بھی ان کے ساتھ تھے' ان سے میری شناخت کرا کے ایک اہل کار نے شاہی حکم نامہ پڑھنا شروع کیا جس کا مضمون کچھ اس طرح تھا۔

کالے خاں ولد یوسف خاں کو معلوم ہو کہ عرض داشت اُس کی حضور میں گزری۔ ہر گاہ طاؤس چمن کی مینا اسمی فلک آرا کو چرا کر اپنے گھر لے جانا اُس کا بہ موجب اقرار اُس کے ثابت ہے۔ بنابریں اُس کو ملازمتِ سلطانی سے برطرف کیا گیا مگر تنخواہ اُس کی بحال رہے گی۔

مینا اسمی فلک آرا کو تعلیم دینے کے جلدو میں مینا مذکورہ مسماۃ فلک آرا بیگم' بنتِ کالے خاں کو بر سبیلِ انعام عطا ہوئی ونیز خزانۂ عامرہ سے مینا مذکورہ کے دانے پانی کا خرچ ایک اشرفی ماہانہ مقرر ہوا ہے۔

ونیز کالے خاں ولد یوسف خان کو معلوم ہو کہ چوری اُس گھر میں کرتے ہیں جہاں مانگے سے ملتا نہ ہو۔

اس آخری فقرے نے مجھے پانی پانی کر دیا' سر جھکا کر رہ گیا۔

اتنے میں دوسرے اہل کار نے سرخ بانات کے غلاف سے ڈھکا ہوا پنجرا چوب دار کے ہاتھ سے لے کر میرے ہاتھ میں دیا پھر کرتے سے ایک چھوٹی سی تھیلی کھول کر مجھے دی اور اس کے اندر کی بارہ اشرفیاں میرے ہاتھ میں گنوائیں۔ بتایا' یہ مینا کا سال بھر کا خرچ ہے۔ اور رسید نویسی کی مختصر کارروائی کے بعد مجھے مبارک باد دی' داروغہ نبی بخش نے بھی مبارک باد دی' پھر چوب دار سے کہا۔ "اچھا میاں بندے علی! ہمارا کام ختم ہوا؟"

"کام ہمارا بھی ختم ہوا۔" اُس نے جواب دیا۔ "کیوں داروغہ صاحب! ساتھ نہ چلیے گا؟"

"نہیں بھائی! سوچتے ہیں' حسین آباد مبارک میں حاضری دے آویں۔"

"ہاں ہاں' ضرور جائیے۔" بندے علی نے بڑے چاؤ سے کہا۔ "ہمارے لیے بھی دعا کر دیجیے گا۔"

"تو یہ بھی کہنے کی بات ہے؟"

داروغہ نے میری طرف دیکھا اور سر کے ہلکے اشارے سے پوچھا' یاد ہے؟ میں نے بھی آہستہ سے سر ہلا دیا کہ یاد ہے۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد گھر آیا تو معلوم ہوتا تھا' خواب میں ہوا پر چل رہا ہوں۔ فلک آرا ابھی سو رہی تھی' میں نے پنجرا صحن میں رکھ کر اس پر سے غلاف ہٹایا تو آنکھیں چکاچوند ہو گئیں۔

"سونا!" میرے منہ سے نکلا اور پنجرے کی خوب صورتی میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

میں اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ اس کی مالیت کتنی ہو گی؟ اسی وقت مجھے فلک مینا کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ وہ میری طرف بچی بچی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اُس نے سر اوپر نیچے کیا اور پر چلا کر زور سے چہچہانے لگی۔ میں دوڑتا ہوا کوٹھری میں گیا اور اس کا پرانا پنجرا نکال لایا۔ مینا کو اس پنجرے میں کر کے نیا پنجرا کوٹھری میں چھپا رہا تھا کہ باہر فلک آرا کی آواز سنائی دی۔ "ہماری مینا اچھی ہو گئی' ہماری مینا اچھی ہو گئی۔"

میں کوٹھری سے باہر آیا تو اُس نے چہک کر مجھے بھی یہ خبر سنائی لیکن میں دوسری فکروں میں تھا۔

"اچھا' پہلے منہ ہاتھ دھو لو' پھر اس سے جی بھر کے باتیں کرنا۔" میں نے اُس سے کہا اور باہر دروازے پر جا کھڑا ہوا۔

گھر کے اندر سے مینا کے چہچہانے اور فلک آرا کے کھل کھلانے کی آوازیں چلی آرہی تھیں۔ واقعی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دو بہنیں بہت دن بعد ملی ہیں۔ آوازیں دم بھر کو رکیں' پھر میں نے سنا۔

"فلک آرا شہزادی ہے' دودھ جلیبی کھاتی ہے۔ کالے خاں کی گوری بیٹی ہے۔" پھر ہنسی' پھر تالیوں کی آواز۔

میں کچھ نہیں سکا کہ یہ فلک آرا تھی یا اُس کی مینا۔

(۷)

دن بھر میں کبھی گھر میں آتا' کبھی دروازے پر جاتا۔ ہر وقت مجھے گمان تھا کہ داروغہ احمد علی خاں آتے ہی ہوں گے لیکن دروازے پر دیر تک اُن کی راہ دیکھنے کے بعد پھر گھر میں آجاتا۔ آخر قریب شام وہ آتے دکھائی دیے۔ ان کے ساتھ ایک آدمی اور تھا' کچھ دیہاتی سا معلوم ہوتا تھا' لنگی باندھے' موٹا کرتا پہنے' کمر میں چادر لپٹی ہوئی اور سر پر بڑا سا صافہ جس کا شملہ اس نے منہ پر اس طرح لپیٹ لیا تھا کہ صرف آنکھیں اور ناک کا آدھا بانسا کھلا رہ گیا تھا۔ مجھے اُس کی آنکھوں کی چمک سے کچھ ڈر سا لگا۔ اتنی دیر میں وہ دونوں دروازے پر آپہنچے۔ علیک سلیک ہوئی۔ احمد علی خاں نے جلدی جلدی میرا حال احوال پوچھا' پھر سامنے والے آدمی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ "اِنھیں پہچانتے ہو کالے خاں؟"

"صورت دیکھوں تو شاید پہچان لوں۔"

"نہیں' یوں ہی پہچانتے ہو؟" انھوں نے کہا' پھر پوچھا۔ "آگے کبھی کہیں دیکھو گے تو پہچان لو گے؟"

"ان کے ڈھاٹے کو پہچانوں تو پہچانوں۔"

"قاعدے کی کہی۔" داروغہ بولے۔ "اچھا دیکھو' یہ بادشاہی مینا اور انعامی پنجرے کے خریدار ہیں۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

"میرے منہ سے صاف انکار نکلتے نکلتے رہ گیا۔ میں نے کہا۔ "میں کیا کہوں داروغہ صاحب! آپ مختار ہیں۔"

اچھا تو تم نے ہمیں اپنا مختار کیا؟"

"کیا۔"

"تو مینا تمھاری ہم نے ان کے ہاتھ بیچی' پنجرا بھی بیچا۔ پیسے سوچ سمجھ کر طے کرلیں گے۔" داروغہ نے کہا' پھر اس آدمی سے بولے۔ "لیجیے' انھیں بیعانہ دیجیے۔ قسم بھی دیجیے۔"

آدمی نے ایک روپیہ میرے ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔ "کالے خاں ولد یوسف خاں! اللہ پاک کی قسم کھاؤ' کسی کو نہیں بتاؤ گے کہ مینا تم نے کتنے کو بیچی۔ پنجرے کے پیسے البتہ بتا دینا۔ مینا کے پیسے کوئی پوچھے تو کہہ دینا' ہم پر قسم پڑ چکی ہے۔" میں نے قسم کھالی۔

چھوٹے میاں نے مجھ سے کہا۔ "جاؤ' ذرا بٹیا کو بہلا کر مینا اور پنجرا لے آؤ۔"

میں گھر کے اندر آیا۔ فلک آرا پنجرے کے پاس بیٹھی تھی۔ میں نے اُس سے کہا۔ "فلک آرا! بٹی اب اس کے بسیرے کا وقت ہے۔ نیند خراب کرو گی تو پھر بیمار ہو جائے گی۔ ہم اسے ہوا کھلا کے لاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے۔"

فلک آرا جلدی سے اُٹھ کر اندر دالان میں چلی گئی۔ میں نے کوٹھری سے شاہی پنجرا نکالا' فلک مینا کا بھی پنجرا اٹھایا اور باہر آگیا۔ داروغہ چھوٹے میاں خوش ہو کر بولے۔ "پنجرا بدل دیا؟ اچھا کیا کالے خاں!" انھوں نے دونوں چیزیں آدمی کو دے دیں اور پوچھا۔ "پنجرا پایا؟"

"پایا۔" وہ بولا۔

"مینا پائی؟"

"پائی"

"سدھاریے۔"

آدمی دونوں پنجرے اُٹھائے ہوئے مڑا اور روانہ ہو گیا۔ میں اُس کے پیچھے لپکنے ہی کو تھا کہ چھوٹے میاں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں بولا۔ "داروغہ صاحب! مینا کے بغیر میری بچی۔"

"غم کھاؤ' کالے خاں! غم کھاؤ۔" انھوں نے کہا اور سامنے اشارہ کیا۔

ڈھاٹے والا آدمی واپس آرہا تھا۔ شاہی پنجرا اس نے کمر کے چادرے میں لپیٹ کر سر پر رکھ لیا تھا اور بالکل دھوبی معلوم ہو رہا تھا' قریب آکر اس نے مینا والا پنجرا چھوٹے میاں کے ہاتھ میں دے دیا اور تیز قدموں سے واپس چلا گیا۔

سورج ڈوب چکا تھا اور چھوٹے میاں کا چہرہ مجھے ٹھیک سے نظر نہیں آرہا تھا۔ انھوں نے پنجرا میرے ہاتھ میں دے دیا۔ مجھے کچھ بے چینی سی ہو رہی تھی۔ وہ بولے۔ "تمھاری خیر ہی خیر ہے کالے خاں! بہ شرط ٹھنڈے ٹھنڈے بات کرو' نہ آپ غصّے میں آؤ نہ دوسرے کو دلاؤ۔ اور بھائی آج سویرے سے نہ سو جانا۔"

"سویرے سے؟" میں نے کہا۔ "آج نیند کس کو آتی ہے داروغہ صاحب!"

"ارے بھائی! کہہ جو دیا تمھاری خیر ہے۔ بس ٹھنڈے رہنا ضرور ہے۔"

وہ واپس گئے۔ میں پنجرا لیے گھر میں آیا۔ اُسے صحن کی الگنی میں ٹانگتے ٹانگتے میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ فلک آرا دالان کے کھمبے کی اوٹ سے جھانک رہی تھی۔ میں نے جا کر اُسے تخت پر لٹا دیا۔ مینا کی باتیں کرتے کرتے وہ جلدی ہی سو گئی۔ میں اُسے کچھ اُڑھانے کے لیے اُٹھا تھا کہ داروغہ جی نے دھیرے سے دروازہ تھپ تھپایا۔ "سب انتظام ہو گیا۔" انھوں نے کہا۔ "کچھ کو نہیں، بس چلے چلو۔ بٹیا اور اُس کی مینا کو لے لو۔ گھر میں کوئی اور تو نہیں ہے؟"

"کوئی نہیں۔" میں نے کہا، مجھے یاد آ گیا۔ "بس جھراتی کی [illegible] ہے۔"

"وہ کون ہیں؟ خیر، انھیں بھی لو، ڈولی ساتھ لایا ہوں، اور ذرا جلدی کرو کالے خاں!"

"اور داروغہ صاحب، گھر کا سامان؟"۔

"تم تو ابھی واپس آؤ گے۔ بس بٹیا، اور وہ کس کی اماں ہیں، اُن کا سامان اُٹھا لو۔ ایک دو عدد چاہے اپنے بھی رکھ لو۔"



(۸)

[illegible] کے پیچھے [illegible] کے ایک [illegible] مکان تھا۔ وہاں ہم [illegible] جھالر والی ڈولی [illegible] دالان میں چوکی پر [illegible] فلک آرا سو رہی تھی۔ میں نے اسے ایک پلنگڑی پر لٹا کر مینا کا پنجرا سرہانے لٹکا دیا۔ سامان رکھنے دھرنے میں کچھ دیر نہیں لگی۔ داروغہ ہمیں اُتار کر کہیں چلے گئے تھے۔ ذرا دیر میں واپس آئے۔ مجھے دروازے پر لائے، کمر سے ایک تھیلی کھول کر مجھے دی اور بولے۔ "پنجرا بک گیا۔ رقم چھوٹے میاں کی تحویل میں ہے۔ اوپر کے خرچ کے واسطے یہ سو [illegible]"

"نہیں داروغہ صاحب!" میں گھبرا کر بولا۔ "میرا تو [illegible] جا رہا ہے۔"

داروغہ ہنسنے لگے، پھر بولے۔ "اور وہ اپنے پالی کی اشرفیوں

سب ایک

کو بھول گئے؟" میں واقعی بھول گیا تھا بلکہ اس وقت مجھے یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں نے اشرفیاں کیا کیں؟ داروغہ نے میری سراسیمگی دیکھی تو پوچھنے لگا۔ "کیا ہو گیا بھائی؟"

اسی وقت مجھے یاد آ گیا۔ دوڑتا ہوا مکان میں گیا، ایک اچھی کھولا، شاہی پنجرے کے غلاف میں لپٹی ہوئی اشرفیاں اٹھائیں اور باہر آ کر داروغہ کی طرف بڑھا دیں۔

"داروغہ صاحب! میں انھیں کہاں رکھوں گا۔" میں نے کہا۔ "ان کو اپنی تحویل میں رکھیے، خواہ چھوٹے میاں کے پاس رکھوا دیجیے۔"

"اوروں پر اتنا اعتبار نہ کیا کرو کالے خاں!" انھوں نے کہا۔

"شرمندہ نہ کیجیے داروغہ صاحب!" میں نے کہا۔ "آپ لوگ کوئی اور ہیں؟"

"شاباش ہے تم کو۔" داروغہ نے کہا اور اشرفیاں کمر بند میں رکھ لیں پھر بولے۔ "اچھا، کھانا آتا ہو گا، کھا پی کر اپنے

حصولِ لذت کا بڑا اصول یہ ہے کہ ہر چیز پوری خواہش اور کامل طلب کے بعد استعمال کی جائے۔ کھاؤ پوری بھوک پیو خوب پیاس میں پھر دیکھو، معمولی مطعومات و مشروبات میں بھی کس طرح لذت ملتی ہے۔ ✽

مکان کو بے دھڑک، رات کو وہیں رہا کرو، دن کا تمھیں اختیار ہے۔ حضورِ عالم کے آدمی اگر آئیں تو دل جمعی کے ساتھ اُن سے بات کرنا، اور دیکھو چھوٹے میاں کا نام نہ آنے پائے۔ وہ تو کہتے ہیں متعزز آئے، بگڑے دل آدمی ہیں، لیکن خواہی نخواہی کا تیور دکھانے سے فائدہ؟ تم خیال رکھنا۔ سمجھو وہ تمھارے گھر آئے ہی نہیں تھے۔ اچھا، اللہ حافظ۔"

زیادہ رات نہیں گئی تھی کہ میں اپنے مکان پر پہنچ گیا۔ فلک آرا کے بغیر اچھا نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ دل بول رہا تھا، کچھ ہونے والا ہے۔ آخر مجھ سے لیٹا نہ گیا۔ اُٹھ کر مکان سے باہر نکل آیا اور دروازے کے سامنے ٹہلنے لگا۔

رات تھوڑی اور گئی تو میں نے دیکھا، دو جلتی ہوئی مشعلیں میرے مکان کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ میں تیزی سے گھر میں داخل ہوا اور دروازہ اندر سے بند کر کے بستر پر جا لیٹا۔ ذرا دیر میں دستک ہوئی۔

مشعلچیوں کے علاوہ چار اور تھے۔ اُنھوں نے میرا نام وغیرہ دریافت کیا، رُوکھے پن سے شاہی انعام کی مبارک باد دی، پھر مینا کو پوچھا "کہاں ہے؟"

"بک گئی۔" میں نے کہا۔

"بک گئی۔" ایک نے حیرت سے پوچھا۔ "آج کے آج؟"

"میں فقیر آدمی، بادشاہی پرندہ گھر میں کہاں رکھتا؟"

اس کے بعد ان لوگوں نے سوالوں کی بوچھار کر دی۔ مشعلوں کی روشنی سیدھی میرے منہ پر پڑ رہی تھی اور میرا ڈر بڑھتا جا رہا تھا لیکن میں نے اپنے حواس بحال رکھے اور ہر سوال کا فوراً جواب دیا۔ "کس نے خریدی؟"

"معلوم نہیں، وہ چہرہ چھپائے ہوئے تھا۔"

"دیکھو گے تو پہچان لو گے؟"

"نہیں، وہ چہرہ چھپائے ہوئے تھا۔"

"کتنے میں بیچی؟"

"نہیں بتا سکتا، اس نے قسم دے دی ہے۔"

"کیوں؟"

"وہ جانے۔"

"چھوٹے میاں آئے تھے؟"

"کون سے چھوٹے میاں؟"

اس کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی، پھر پوچھا گیا۔ "تو مینا بک گئی؟"

"بک گئی۔"

"پیسے کیا کیے؟" ایک نے پوچھا۔ "ہم مدار الدولہ بہادر کے آدمی ہیں، ذرا سوچ سمجھ کے بات کرنا۔ پیسے کیا کیے کالے خاں؟"

"ابھی صرف بیعانہ لیا ہے۔"

"کتنا؟"

"ایک روپیہ۔" میرے منہ سے نکل گیا۔

پھر مجھے پسینے چھوٹنے لگے۔ کون مان سکتا تھا کہ میں نے صرف ایک روپیہ بیعانہ لے کر سونے کا پنجرا اور بادشاہی پرندہ کسی اَن جانے آدمی کے ہاتھ میں پکڑا دیا ہو گا۔ اسی وقت کسی نے کڑک کر کہا۔ "کالے خاں! سوچ سمجھ کر بات کرو۔"

ایسی آواز تھی کہ گلی کے کئی گھروں سے آدمی باہر نکل آئے۔ میں خاموش کھڑا تھا۔ آگے والے مشعلچی نے اپنی مشعل اس ہاتھ سے اُس ہاتھ میں لے لی، مشعل کا شعلہ لہرایا اور بولنے والے کے منہ پر روشنی پڑی۔ نوجوان آدمی تھا۔ نوجوان کیا، لڑکی کہنا چاہیے۔ پوری مونچھیں بھی نہیں نکلی تھیں۔ صورت اچھی تھی۔ اس نے پھر کڑک کر کہا۔ "کالے خاں! تم اس آدمی کو نہیں پہچانتے؟"

اچانک میرا ڈر ہوا ہو گیا۔ "چلیے، پہچانتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "مگر نہیں بتاتے۔ آپ پوچھنے والے کون؟"

وہ لوگ کچھ دیر تک خاموش کھڑے مجھے گھورتے رہے پھر سب ایک ساتھ مڑے اور واپس چلے گئے۔ محلے والے بڑھ کر میرے قریب آ گئے۔ پوچھنے لگے "کیا ہوا؟ کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں" میں نے کہا۔ "بُرا زمانہ آ گیا ہے۔"

میں نے گھر کا دروازہ بھی اندر سے بند نہیں کیا۔ بستر پر لیٹ کر سوچتا رہا۔ بات بگڑ گئی کالے خاں۔ آخر میں نے خود سے کہا اور سچ کہا۔ دوسرے دن سویرے مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ میرے گھر سے ایجادی قفس کی ایک لنگا جمنی کٹوری برآمد ہوئی تھی۔

میں بھول چکا ہوں کہ میں نے قید خانے میں کتنی مدت گزاری۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری ساری عمر اسی پنجرے میں گزری جا رہی ہے۔ قیدیوں میں زیادہ تر لکھنؤ کے اوباش اور اُٹھائی گیرے تھے۔ اُن سے میرا دل نہیں ملتا۔ سب سے الگ تھلگ رہتا۔ فلک آرا بہت یاد آتی تھی۔ کبھی کبھی تو کہیں پاس قریب سے اُس کے کھِل کھِلانے اور فلک مینا کے چہچہانے کی آوازیں کان میں آنے لگتیں۔ بڑی بے کلی ہوئی لیکن یہ سوچ کر کچھ اطمینان ہو جاتا کہ اپنی مینا کے ساتھ اس کا جی بہلا رہتا ہو گا اور نبی بخش اور چھوٹے میاں اس کی خبر گیری مجھ سے زیادہ کر رہے ہوں گے۔ سب سے زیادہ اس بات کا اطمینان تھا۔ اپنی تنخواہ تو خیر اب کیا ملتی لیکن فلک مینا کی بدولت ایک اشرفی اور شاہی پنجرے کی قیمت ملا کر [illegible] میں نہ آتا [illegible]

[illegible]

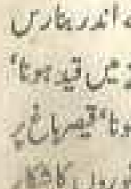
لیکن ایک دن مجھ کو [illegible] اچانک ہی مجھے رہا کر دیا گیا۔ [illegible] داروغہ نے منشی امیر احمد صاحب [illegible] میری طرح اور بھی شاید [illegible] ہو رہا تھا مگر میں ایک [illegible] سیدھا سٹرک کی طرف چلا۔

[illegible] مجھے سب کچھ [illegible] معلوم ہونے لگا۔ شہر پر عجب تمرول سی چھائی ہوئی تھی۔ چوڑے راستوں پر گوروں کے فوجی دستے گشت کر رہے تھے۔ میں جس گلی میں مڑتا اس کے دہانے پر انگریزی فوج کے دو تین سپاہی تنے کھڑے نظر آتے۔ گلیوں کے اندر لوگ ٹولیاں بنائے چپکے چپکے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ مجھے پہنچنے کی جلدی تھی اس لیے کہیں رُکا نہیں۔ ہر طرف ایک ہی گفتگو تھی۔ رُکے بغیر بھی مجھے معلوم ہو گیا کہ اودھ کی بادشاہی ختم ہو گئی۔ سلطانِ عالم واجد علی شاہ کو تخت سے اُتار دیا گیا ہے' وہ لکھنؤ چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ اودھ کی حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں آ گئی ہے اور اس خوشی میں اُنھوں نے بہت سے قیدی آزاد کیے ہیں۔ از آں جملہ میں بھی تھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ ایک پنجرے سے نکل کر دوسرے پنجرے میں آ گیا ہوں۔ جی چاہا' لوٹ کر قید خانے میں چلا جاؤں پھر فلک آرا کا خیال آیا اور میں ست کھنڈے کی سیدھی سڑک پر دوڑنے لگا۔

گھر پہنچا تو سب کچھ پہلے کی طرح نظر آیا۔ فلک آرا پہلے تو مجھ سے کچھ کھنچی کھنچی رہی' پھر جلد ہی گود میں بیٹھ کر اپنی مینا کے نئے نئے قصّے سنانے لگی۔

لکھنؤ میں میرا دل نہ لگتا اور ایک مہینے کے اندر بنارس میں آ رہنا' متکاوں کی لڑائی' سلطانِ عالم کا کلکتے میں قید ہونا' چھوٹے میاں کا انگریزوں سے ٹکرانا' لکھنؤ تباہ ہونا' قیصر باغ پر گوروں کا دھاوا کرنا' کٹہروں میں بند شاہی جانوروں کا شکار کھیلنا' ایک شیرنی کا اپنے گورے شکاری کو گھائل کر کے نکل بھاگنا' گوروں کا طیش میں آ کر داروغہ نبی بخش کو گولی مار دینا۔ یہ سب دوسرے قصّے ہیں اور ان قصّوں کے اندر بھی قصّے ہیں۔

لیکن طاؤس چمن کی فلک مینا کا قصّہ وہیں ختم ہو جاتا ہے جہاں ننھی فلک آرا میری گود میں بیٹھ کر اس کے نئے نئے قصّے سنانا شروع کرتی ہے۔



[illegible]

اُردو کے ایک بے فطرت نگار افسانہ نگار محمد الیاس کی ایک تحریر
ایک عورت کی کہانی،
اس کا نام زلیخا تھا اور کوئی یوسف اُسے مطلوب نہیں تھا۔

عورت، گھوڑا اور مرد

اُردو ادب کا عطر، دوسری منتخب کہانی

گرمیوں کے موسم میں صبح سویرے تین بجے ہی سڑک کے کنارے لگی ہوئی سرکاری ٹونٹی میں سے پھرپھر کے ساتھ پانی نکل کر سیمنٹ کے فرش پر گرنے لگتا اس کے تیز شور کی وجہ سے چند گز کے فاصلے پر اپنے ایک کمرے پر مشتمل گھر کے دروازے کے آگے بچھی چارپائی پر سوئے ہوئے چھمن کی نیند کا سلسلہ ٹوٹ جاتا۔ پاس ہی ایک جھلنگا چارپائی پر اُس کی کم سن بیٹی اور بیٹا ایک دوسرے کے اوپر نیچے پڑے سو رہے ہوتے۔ چونکہ گھوڑا بیٹی اور بیٹے کی نسبت زیادہ کار آمد اور قیمتی تھا لہٰذا اسے دروازے کے آگے اس طرح سے باندھ رکھا ہوتا کہ دونوں چارپائیاں، تانگے اور گھر کے حصار میں محفوظ رہے۔ گھوڑے سے دو گز آگے تانگا اپنے دونوں پائیوں کے سہارے ٹیڑھا زمین سے ٹکائے دونوں بازو آسمان کی جانب بلند کیے رات بھر خدا سے بچوں اور ان کی ماں کے گناہوں کی معافی مانگتا رہتا۔ بچوں کی ماں زلیخا کمرے کے اندر ٹاٹ کے پردے کی اوٹ میں فرش پر پڑی سو رہی ہوتی۔ چھمن اپنی ہی طرز کا ایک سو تھا۔ محض اپنے مرد ہونے ہی پہ بڑا فخر تھا۔ بقول اس کے زنانہ اولاد چھمن خان کی جورو تھی اور "راج پوتنی" کی بہو ہے، کسی ایرے غیرے کی نہیں ہو رذیلوں کی طرح باہر سڑک پر پڑی سوتی رہے۔ بھلے گرمی سے مر جائے لیکن اندر ہی رہے۔

چھمن کی کسل مندی دور کرنے کے لیے گھوڑا ہلکی آواز میں ہنہناتا مارتے ہوئے اپنی پچھلی ٹانگیں قدرے وا کر کے ... اور ... زور بھاگ دار پیشاب کی موٹی سی دھار ... اونچے فرش ... سرکاری نل کے سے پریشر کے ساتھ ... اور چھمن کے ... بکھر جاتی۔ وہ

یک دم کروٹ لے کر اُٹھ جاتا اور گھوڑے کو دو چار ننگی گالیوں سے نواز کر اپنے دن کا آغاز کرتا۔ جاگ جانے کے باوجود چھمن کی آنکھیں ابھی بند ہوتیں۔ وہ تیل اور میل کچیل میں گندھے ہوئے تکیے کے نیچے سے استری شدہ ریڈ لیپ مار کا سگریٹ کا پیکٹ ہاتھ میں لے کر اس میں سے ایک سگریٹ نکالتا جو پیکٹ دب جانے کی وجہ سے چپٹا ہوا ہوتا۔ سگریٹ زبان پر رکھ کر گھماتا، جب وہ تھوک سے تر بتر ہو جاتا تو زبان سے چپک جانے والے تمباکو کے ذرّات تھوکتے ہوئے تکیے کے نیچے سے دیا سلائی کی ڈبیا ٹٹول کر نکالتا۔ جوں ہی سگریٹ سلگتا، پھیپھڑوں کی صفائی کا مشقت طلب عمل از خود شروع ہو جاتا۔ ہر کش سے پہلے اور بعد کھنگرم بگڑم کی لَے پر کھانسی اور بلغم کی اتھل پتھل کا گمبھیر دورہ پڑتا۔ بھلے سموں تو ایک آدھ سگریٹ ہی سے کام چل جایا کرتا تھا لیکن اب دوسرے سگریٹ کے پہلے نصف پر کہیں جا کر اس کے بھاگ جاگتے تھے۔ اپنے سرتاج کی کھانسی کے الارم پر بھی زلیخا فوراً نہ جاگتی تو ارشاد ہوتا۔ "اری اُٹھ جا بے شرم نیند



جاتے کھایا رے پڑی رہوتے"۔
کمرے کے اندر اُلٹے ہاتھ کونے میں ٹین کے ایک خالی ڈبے کے اوپر ڈیڑھ فٹ سائز کا مکعب نما لکڑی کا کریٹ اوندھا پڑا ہوتا۔ کریٹ کے اوپر ایک بڑا سا سوراخ تھا۔ دو اطراف سے کمرے کی دیواروں نے بڑے احسن طریقے سے مطلوبہ پردہ پوشی کے مقاصد پورے کر رکھے تھے' بقیہ دونوں جانب لٹکا ہوا ٹاٹ' پردہ چاک کیے رکھتا تھا۔ یہ اس گھرانے کا بیت الخلا تھا۔ اس سے استفادہ کرنے کے وہی آداب تھے جو عموماً کموڈ کے استعمال میں روا رکھے جاتے ہیں۔ پچھمن خلا کی مہم جوئی میں مصروف ہو جاتا تو زلیخا بیٹے کو بازو سے پکڑ کر جھنجوڑتی اور بیٹی کو بالوں سے نوچتی۔ ابھی دونوں بچے آدھے سوئے آدھے جاگے کی کیفیت ہی میں ہوتے تو اُنھیں بازوؤں سے پکڑ کر توری کی طرح لٹکائے گھر کے دروازے کے ساتھ والی گندے پانی کی نالی پر بٹھا دیا جاتا۔ زیرِ عمل فعل پر پورا دھیان صرف کرنے کے بجائے دونوں بچے اپنے گھوڑے کی طرح ایک پاؤں پر سارا بوجھ ڈال کر دیوار کے ساتھ ... سپنے دیکھنے لگتے اور انھی سہانے سپنوں میں اپنی تکمیل خواہشات میں ناجائز طور پر تجاوز کر کے ایک ایک آنے والی کھوئے ملائی کی ٹھنڈی میٹھی قلفیاں کھانے لگتے۔ گھوڑا بچوں کو اپنی نقل اُتارتے دیکھتا تو پھررر پھررر کی آوازیں اپنے نتھنوں سے خارج کر کے انھیں ٹوکتا۔ گھوڑے کی ہر تنبیہہ پر وہ اپنی اعصابی قوت براہِ راست بروئے کار لا کر جاری فطری عمل مرحلہ وار پایۂ تکمیل تک پہنچاتے۔ اس دوران پچھمن میدان مار چکا ہوتا لیکن پسینے میں شرابور' اَدھ موا ہو کے باہر چارپائی پر آ کے ڈھیر ہو جاتا۔
زلیخا بیت الخلا سے ڈبا اُٹھا کر باہر آجاتی اور جو کچھ بھی اس میں اس کے خاوند نامراد کی کاوشوں کا ثمر ہوتا' نالی میں بہا دیتی۔ علی الصباح معروضی حالات اس خاندان کی موافقت میں ہوتے۔ بدرو میں پانی کا بہاؤ تیز ہوتا۔ زلیخا اسی پانی میں ڈبا کھنگال کر خود عازم بیت الخلا ہو جاتی' حالانکہ تھی وہ پاؤں کی جوتی لیکن اکثر کام ایسے کرتی جیسے انسان کے فطری تقاضوں کے عین مطابق ہوتے ہیں' جس کی وجہ سے پچھمن کو تاؤ آجاتا۔ وہ اپنی کھوئی ہوئی توانائی بحال کر چکتا تو دونوں گھڑے اور بالٹی پانی سے بھر کے اندر لے آتا۔ بیت الخلا کے مقابل دائیں کونے میں پڑے اسٹوو اور کھانا پکانے کے برتنوں کے پاس رکھ دیتا۔ یہ اس گھرانے کا باورچی خانہ تھا۔



محمد الیاس، اردو کے ایک تازہ کار افسانہ نگار، بنیادی طور پر مصور۔ پیدائش، گجرات، پاکستان، 22 دسمبر 1946۔ الف بے کی شناخت سے پہلے لکیروں اور رنگوں سے شغف تھا۔ مدیر سب رنگ کے نام، ان کے ایک خط کے مطابق، محمد الیاس کی زبانی۔

"میٹرک تک قلم میں خاصا نکھار آ گیا تھا۔ ہائی اسکول کی تعلیم کے دوران چند افسانے لکھے جو اس وقت کے معروف فلمی جرائد میں شائع ہوئے۔ طبعاً نفاست طبع، نہایت خوش لباس۔ اسے کوئی نفسی پیچیدگی کہہ لیجیے، لباس کے معاملے میں بہت زیادہ SELECTIVE تھا۔ اسی دور میں لاہور سفر کے دوران پاک ٹی ہاؤس میں جانا ہوا اور شاعر خوش نوا حبیب جالب سے ملاقات ہوئی۔ بہت اشتیاق تھا ان سے ملنے کا۔ ان کی ظاہری حالت بڑی خستہ و شکستہ تھی۔ لباس میلا، شیو اور بال بڑھے ہوئے۔ ان کی مالی حالت کے بارے میں بڑے مایوس کن انکشافات ہوئے تو مصوری اور ادب سے خوف زدہ ہو گیا۔ تعلیم کا سلسلہ بی اے سے آگے نہ بڑھ سکا اور شکنجے نے کس لیا۔ معدنیات کے حصول کے لیے ملک کے دور دراز پہاڑی علاقوں کے مسلسل سفر، پھر بڑے شہروں میں ان کی نکاسی کے لیے سوداگری ہی سے مہلت نہیں ملتی تھی۔ زندگی کا بڑا حصہ اس کاروبار میں صرف ہوا۔ پھر ایک اور آزمائش سے دوچار ہوا۔ ایسا صدمہ برداشت کرنا پڑا کہ شاید مر گیا ہوتا۔ چھوٹا بیٹا حیدر علی ساول ابھی ساڑھے چار سال کا تھا کہ کینسر کے عارضے میں بچھڑ گیا۔ وہ بہت ہی پیار کرنے والا بیٹا تھا۔ اس سے بڑا بیٹا اور دو بیٹیاں اور بیوی زندہ رہنے کا جواز تھے۔ ساول کی موت کے بعد گرمیوں کی چھٹیوں میں ڈیڑھ ماہ کے لیے بیوی بچے کراچی گئے تو تنہائی میں خود کو دریافت کرنے کے عمل سے گزرنے کا موقع ملا۔ اس عرصے میں تھوڑی سی شاعری کی اور افسانے لکھے۔ ان کی پذیرائی توقع سے زیادہ ہوئی تاہم براہ راست اپنے اصل دکھ کے پس منظر میں کوئی افسانہ لکھنے میں کامیابی نہ ہو سکی۔ البتہ 1996ء کے آخر میں ایک افسانہ بوسہ وداع محض اس موضوع پر لکھا۔ یہ "اوراق" میں شائع ہوا اور ڈاکٹر وزیر آغا نے بہت پسند کیا۔ ادب کا یہ احسان ہے کہ بکھرنے سے بچا لیا۔ اس لیے فیصلہ کیا ہے کہ باقی زندگی اس احسان کا قرض چکاتا رہوں۔ ابتدائی اور موجودہ افسانوں کے

چونکہ ہوم رول کا پردہ زیادہ اہم مسئلہ تھا اس لیے شیوہ مردانگی کے تقاضوں کے عین مطابق وہ پانی اور سودا سلف لانے کی مشقت برداشت کر لیتا۔

اس اثنا میں فجر کی اذانیں ہونے لگتیں۔ اگر اب تک زلیخا کی کچھ خلاصی ہو چکی ہوتی تو وہ بیت الخلا سے نکل کر چند منٹوں کے اندر اندر چائے کا پانی ابلنے کے لیے رکھ دیتی ورنہ پھمن کھانسی کے وقفوں میں مختلف النوع الفاظ ملا کر اگلنے لگتا۔

"ابے جلدی کر تیرے باوا کی ٹرین نکل جاوے گی۔ اری وہ ماں کا خصم سرکاری سانڈ آنے والا ہے۔"

سرکاری سانڈ علی الصباح ہی اس کے حواس پر چھانے لگتا۔ پھمن کی خواہش ہوتی کہ اس کے آنے سے قبل ہی زلیخا دوسری مرتبہ ہائی تک کا سفر مکمل کر کے لوٹ جائے۔ اس عورت کی مت واقعی ماری گئی تھی، نہ جانے کن مسائل میں الجھ کر مزید تاخیر کر دیتی تو حضرت سرتاج کا پارا سوا نیزے پر آ جاتا۔ اس لیے اپنے مسخ اور متعفن الفاظ قریب ہی بہتی ہوئی گندی نالی میں رولا رولا کر مرکب آمیزے میں ڈبو ڈبو کر اور اچھالنے لگتا۔ "اے وہ مسری اٹھ جا۔ تیری ماں..... تو کرا

بھر کے کھاوے اور بھینس کی ترہا (طرح)..." ذاتی طور پر گالیوں میں عملی کردار ادا کرنے سے اکتا جاتا تو رضاکارانہ طور پر اپنی سرتاجی گھوڑے کے سر پہ سجا دیتا۔

جب تک پھمن بلور (ایلومینیم) کے گلاس میں ایک پاؤ دودھ، ایک آنے والا بروک بانڈ چائے کا پتی، گڑ کی بھیلی اور چھ عدد رس لے کر لوٹتا، کم و بیش اسی وقت مقامی تھانے کا حوالدار شاہ سوار شاہ سرکاری نل پہ نہانے آ جاتا۔ وہ نزدیک ہی کرائے کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ بقول پھمن وہ واقعی سرکاری سانڈ کی طرح پلا ہوا تھا۔ لگ بھگ چالیس سال کا تھا۔ اونچا لمبا، چوڑا چکلا، جن کا جن اور شہ زور۔ لگتا تھا جیسے خدا نے اسے بناتے ہوئے کھلے دل سے ہر میٹریل استعمال کیا تھا اور جو بیکار مال مسالا اس کی تعمیر میں سے بچ گیا تھا اس سے کسی شاگرد پیشہ فرشتے کے ہاتھوں پھمن کو مختصر وجود کے قالب میں ڈھال دیا گیا۔ سوار شاہ کا چہرہ اور سر بہت بڑا سا تھا۔ گردن خاصی موٹی اور ہونٹ بھرے بھرے، سر کے بال چھوٹے لیکن سیاہ کالے۔ اوپر والے ہونٹ کے اوپر اور ناک کے نیچے خاصی چوڑی جگہ

درمیان تعطل کا عرصہ اٹھائیس برس کے قریب ہے۔

بہتر ہے، اس دوسرے دور میں محمد الیاس کے افسانوں کے بارے میں چند مشاہیر کی رائے بھی ذہن نشین کر لیجیے۔

"محمد الیاس کا بہت قائل ہو رہا ہوں۔ ان کے افسانے پانی، سادہ اور دارے کی عورت ابلاغ میں پڑھے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے دیہات کو ایک گبھرو افسانہ نگار مل گیا ہے۔ (مدیر ابلاغ کے نام محمود ہاشمی کے ایک خط سے اقتباس)

"محمد الیاس، میرپور کے پہاڑوں کی اوٹ سے اچانک برآمد ہوا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا مگر وہ عین میرے سامنے پہاڑ کا پہاڑ کھڑا تھا اور آسمان کو چھوتے اس پہاڑ کا سبزہ اور سبزے پر پلے ہوئے درخت اور چرند و پرند اور کیڑے مکوڑے اور آدم زاد بھی میرے ذہن میں اس مانند گھس آئے گویا وہ ہمیں میرے دل و دماغ میں آباد ہوں یا پھر میں ہی ازل سے وہیں رہ رہا ہوں۔ مجھے آئندہ رسائل میں محمد الیاس کی ٹوہ لگی رہے گی اور ملاقات ہونے پر میں اسے بہ مسرت اپنے ہاتھوں میں لے کر بیٹھ جاؤں گا" (جوگندر پال)

"سعادت حسن منٹو بھی حقیقت نگار تھا مگر محمد الیاس میں مٹھاس زیادہ ہے۔ اس نے سفاک سچائیوں کو شوگر کوٹڈ لفظوں میں ملفوف کر دیا ہے، کہیں طنز کی تیز دھار دو دھاری تلوار کی طرح جسدِ احساس کے آر پار ہو جاتی ہے، دوسری جانب اس نے اردو کی خوب صورتیوں سے صرفِ نظر نہیں کیا ہے" (پروفیسر محمد فیروز شاہ)

"محمد الیاس کی افسانہ نگاری اور کہانیوں میں روشن روشن ہمیں مصوری، بت تراشی، شاعری اور محبت کے امتزاج کا خوب صورت امتزاج ملتا ہے۔ اس فطری امتزاج نے نہ صرف الیاس کو تخلیقی و فنی سطح پر بصیرت عطا کی ہے بلکہ رنگِ دوام بھی ارزاں کیا ہے"۔ (احسان رانا)

"محمد الیاس اردو افسانے کی دنیا میں نیا نام سہی لیکن افسانے کے فن پر ان کی دست رس، زبان و بیان پر قدرت اور جملے

[illegible]

کہیں کھو جاتا۔ موصوف اپنا طویل ترین 'زندہ تابندہ غسل' پھمن کے گھر کی جانب رُخ کر کے پایۂ تکمیل تک پہنچاتا۔ پھمن اس دوران ٹاٹ کے پردے کی اوٹ میں بیٹھا مسلسل زیرِ لب مغلظات بکا کرتا اور معاشرے کی بگڑتی ہوئی اخلاقی اقدار پر دل و جان سے کُڑھ کر اپنے من کا بھاری بوجھ ہلکا کرنے کی سعیِ ناتمام کرتا رہتا۔ کافی دنوں سے سنا جا رہا تھا کہ سوار شاہ چھوٹا تھانے دار بننے والا ہے اور ترقی پاتے ہی وہ تھانے کے نزدیک سرکاری کوارٹرز میں منتقل ہو جائے گا۔ پھمن دل میں خیال کرتا کہ اس بھینسے کو موت آئی تو ممکن نہیں لہٰذا اللہ کے حضور سچے دل سے دعا کرتا کہ وہ چھوٹا چھوڑ سب سے بڑا تھانے دار بن جائے 'جہنم میں جائے' لیکن اس محلّے سے جلد از جلد دفع ہو جائے۔

گجراتی مٹی کا پیالہ دو مرتبہ گُڑ کے گرم گرم امرت سے لبالب بھر کے مع تین عدد رس تناول کر کے پھمن خان تانگے میں بیٹھتے ہی پھاتا گھوڑے کے بدن سے ایک دو گز دور ہوا میں تیزی سے لہرا کر سائیں سائیں کی آوازیں نکالتا اور للکارتا۔ "چل میرے شہزادے" (شہزادے)

تراشنے کا ہنر اس امر کا متقاضی ہے کہ ان کا نام ہمارے سرکردہ افسانہ نگاروں کے ساتھ لیا جائے۔ ان کی کہانیاں اپنے موضوع اور ٹریٹمنٹ کے لحاظ سے اس قدر متنوع اور حقیقت سے قریب تر ہیں کہ قاری دیر تک اپنے آپ کو اس فضا میں محسوس کرتا ہے"۔ (محسن بھوپالی)

ان معزز و محترم اسمائے گرامی کے بعد مدیر سب رنگ کے لیے کہنے کو کیا رہ جاتا ہے۔ صورت یہ ہے کہ 70ء کے بعد اردو افسانہ عجب انتشار بلکہ کس مپرسی سے دوچار ہے، 70ء کے بعد چند معتبر افسانہ نگار اور چند یادگار افسانے انگلیوں پر شمار کیے جاسکتے ہیں۔ طرح طرح سے ہمارے مسیحا، ہمارے نگراں ناقدین کرام، اس کم یابی و نایابی کی تشخیص کرتے ہیں اور صرف تشخیص تک بات رہ جاتی ہے۔ باعثِ دردوں کچھ رہا ہو، احوالِ واقعی اس قدر ہے کہ اردو افسانہ کہیں کھو گیا، بھٹک گیا ہے۔ وہ افسانہ جو دوسری زبانوں کے مقابلے میں ایک زمانے سے ہمارا افتخار قائم کیے ہوئے تھا۔ اور کوئی کیا جائے، ایسے میں کسی نیلو فر اقبال، کسی محمد الیاس اور کسی نیر مسعود وغیرہ کی جانب سے کوئی ایسی چیز جسے عرفِ عام میں بھی افسانہ یا کہانی کہا جاتا تھا، سامنے آجائے تو کیا خوب درمانِ چشمِ ویراں ہو۔ افسانے کے نام پر انشائیہ، تجریدیہ، تجربہ، علامیہ سے تو سوزش اور فزوں ہو جاتی ہے۔ اس قحط الرجال میں معدودے چند روایتی افسانے کے علم بردار نوواردوں میں ایک محمد الیاس بھی ہیں۔ ان کی یہ کہانی، عورت گھوڑا اور مرد، دیکھیے ان کی واقعیت، میں بڑی تیکھی اور طرحداری ہے۔ محمد الیاس کی صاف گوئی و بے باکی اور کہانی برتنے کے طور سے امکانات کی کونپلیں پھوٹتی نظر آتی ہیں۔ اپنے بس میں یہی کچھ ہے کہ محمد الیاس کے عزم کی استواری کے لیے دستِ دعا دراز کریں۔ یوں اس خرابے پر تو چہار اطراف دھندی دھند چھائی ہوئی ہے۔ کچھ دکھائی، سجھائی نہیں دیتا کہ کس کا رخ کس طرف ہے، یہ شورش ہوا آدمی کو کس دیوار پر جا کے ڈھیر کردے۔ (مدیر)

زلیخا ٹاٹ کی اوٹ سے زیرِ لب بڑبڑا کر اپنے دل میں سرسوں رائی جیسی ایک خواہش 'کمان پر چڑھا کر بد دعا کا زہریلا تیر چھمن کی پیٹھ پر رسید کر دیتی۔ "جا تیں مر جائے' تیری لاس (لاش) آئے گھر یاں (میں) منجے دھار کے لڈو بانٹوں۔"

دونوں بچے خود ہی دیواروں کے سایوں کے ساتھ ساتھ اپنی چارپائی کھینچتے رہتے۔ وہ سگریٹ کی خالی ڈبیاں اور دیگر بے شمار اشیا جو سڑک پر ادھر ادھر گری پڑی ملتیں' اپنے توشہ خانے میں شامل کر لیتے اور ان کے ساتھ ہی جان سے کھیلتے رہتے۔ انھوں نے اپنی ماں سے کوئی مطالبہ کر کے اسے کبھی دکھ نہیں دیا۔ انسانی فطرت میں شامل کسی خواہش کی تکمیل کی خاطر مطالبہ کرنے کے لیے اگر کوئی مخصوص عنصر بطور جزو شامل ہونا ضروری ہوتا ہے تو زلیخا کے بچوں کی خمیر کے عمل پر مامور کسی کارکن فرشتے نے ان کا خمیر گوندھتے ہوئے بھولے سے ترک کر دیا تھا۔

چھمن ہر روز رات گھر لوٹتے ہوئے سبزی منڈی لوٹ کر لے آیا کرتا اس لیے دوسرے روز زلیخا ہنڈیا پکا چکتی تو آٹا گوندھ کر رکھ چھوڑتی تاکہ چھمن گھر لوٹے تو تازہ پھلکا پکا کر پیش کرے۔ کیوں کہ روٹی کے معاملے میں موصوف کا ذوق بڑا بلند تھا۔ کام کاج سے فارغ ہو کر زلیخا آرام کرنے کے لیے لیٹ جاتی۔ آرام کرنے کے لیے اسے پورے مواقع میسر تھے چونکہ اس کے سر کا سائیں صبح جاتے ہوئے اپنی کھاٹ اندر رکھ کر جاتا تھا۔ سردیاں گرمیاں اس کے لیے ایک جیسی تھیں۔ کبھی کوئی رُت اس کے لیے سکھ کے لمحے لے کر نہیں آئی۔ سکھوں سے اس کا جنم جنم کا بیر تھا۔ اس کا یہ ایمان تھا کہ وہ جہاں بھی جائے گی 'مقدر' تعاقب میں رہے گا۔ وہ کبھی کسی مرد سے متاثر نہیں ہوئی' نہ ہی کسی میں اسے کوئی دل چسپی تھی۔ وہ دنیا کے تمام مردوں سے نفرت کرتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ مردوں کے بہروپ تو مختلف ہو سکتے ہیں لیکن اصل روپ ایک سے ہیں۔ اس کا اپنا مرا ہوا باپ اور بھائی بھی ایسے ہی تھے۔ اوپر چوبارے میں رہنے والا بابو سعید احمد سیڑھیاں اُترتے چڑھتے اور سامنے سے گزرتے ہوئے کسی شدید جذبۂ خیر سگالی کے زیرِ اثر کن انکھیوں سے اسے دیکھتا اور مسکرایا کرتا لیکن جب چھمن گھر میں ہوتا تو اس کی ذات میں چھپی ہوئی شرافت کی دبیز چادر اس کا سارا سراپا ڈھانپ

تھی۔

کرے کے پچھواڑے میں جو دُکان بازار میں کھلتی تھی، بھمّن کے سگے ماموں رانا فتح محمد کی تھی جسے وہ خود بھی اور دیگر برادری والے بھتے پھوٹ مرچنٹ کہتے تھے۔ رانا کی بیوی کب کی مر چکی تھی۔ اب وہ ساٹھ کے پیٹے میں تھا۔ اس کی اولاد اپنے اپنے گھروں میں آباد تھی۔ رو بھنگی طرز میں نفاست کے ساتھ کیسری رنگ کی پگڑی باندھتا۔ بڑی بڑی مونچھیں گالوں پر پھیل کر گُل مچھے بناتی تھیں۔ چوڑے، سانولے چہرے اور جسم سے ساری جوانی کافور ہو کر صرف آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ اپنے حلیے اور متکبر رکھ رکھاؤ کی وجہ سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ایک کڑا راجپوت ہے۔ اپنی دکان میں فروخت کے لیے جوڑے گئے کریٹوں کے پیچھے اقامت پذیر تھا۔ بھمّن کا کمرا اور رانا کی دکان ایک ہی دیوار دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی جس میں ایک دروازہ تھا جسے بھمّن نے روزِ اول ہی سے لمبی لمبی میخیں لگا کر مستقل بند کر رکھا تھا۔ وہ اپنے ماموں سے شدید نفرت کرتا تھا۔ ماماں بھی تو عمر کے ساٹھ والا میں تھا۔ شادی سے پہلے جب زلیخا ابھی چھوٹی تھی [illegible] نہیں رہتا تھا، دُکان پر سودا لینے [illegible] جس قدر چاہے [illegible] زلیخا کی [illegible] [illegible] تیں پلا شرکت [illegible] رنگین پوسٹر ساری دکان [illegible] اس کی ہر فلم کا دو سرا یا تیرا شو [illegible] تعلق تھی اس لیے [illegible] پراجمان ہو کر [illegible] اپنی آنکھوں [illegible]

فلم کا نظارہ کر رہا تھا۔ دوران رقص موصوف نے کوئی ایسا غیر معمولی ایکشن پیش کیا جو غالباً سنسر کی نذر ہونے سے بچ کر حق بہ حق دار رسید کے مصداق تماشائیوں کے رُوبرو آ گیا۔ رانا جی اس ادا پر بے بس و بے اختیار ہو کر ایسے فریفتہ ہوئے کہ بھرے سینما ہال کے اندر دیوانگی میں بے ساختہ بہ آوازِ بلند پکار اُٹھے۔ "ہائے ری لیلو تھوڑا پشاب (پیشاب) پی لوں۔" یہ موصوف کی نیلو سے حد درجے کی عقیدت کا شاخسانہ تھا۔ وارفتگی کے منہ زور جذبات کے باعث وہ اس انتہائی اقدام پر بھی مجبور گئے تھے۔ انھوں نے تو حقیقی محسوسات کی عکاسی بڑے قدرتی، سچے اور کھرے انداز میں کسی بناوٹ کے بغیر کر دی تھی لیکن ظالم سماج نے اس کے بجائے کہ ان کی سادگی اور حقیقت پسندی قدر کی نگاہ سے دیکھتا، اس نعرۂ مستانہ کو مذاق کا رنگ دے دیا۔

ماماں نے چھڑا چھانٹ ہونے کے بعد کئی ایک مرتبہ بھانجے سے بچتے بچاتے، موقع نکال کر اپنی دیرینہ پیش کش مزید پرکشش مراعات، ترغیبات، ترمیم و تجدید کے ساتھ زلیخا کے رُوبرو بہ ہمدردانہ غور اور فوری عمل درآمد کے لیے رکھ دی تھی مگر کوئی روپے پیسے والا دکان دار ہو، فیشن ایبل بابو ہو یا ونگ جوان دار، زلیخا کو کسی سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ وہ سب مردوں کی نظروں کا مطلب اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اشارے کنائے اور مسکراہٹیں، لیکن وہ چپ رہتی۔ وہ مرد کو ایک مطلق مخلوق سمجھتی جس میں ایک مخصوص طرح کی غلاظت بھری ہوتی ہے، مردوں کے تصور ہی سے اس کا جی متلانے لگتا۔ وہ منہ بھر کے ایک موٹا سا تھوک پھینکتی اور مرد کو ایک موٹی سی گالی دے کر مطمئن ہو جاتی۔ ماماں کبھی کبھار حوصلہ کر کے رشتے داری کا حق جتاتا اور بھانجے سے نصیحت کے رنگ میں کہتا۔ "ابے کم عقل اُدھ مارا کر جو رو کو، یہ بڑا ظلم ہووے"۔ دراصل وہ ایک تیر سے دو نشانے لگانا چاہتا کہ شاید اس کی ہمدردی زلیخا پر اثر کرے اور دل کے اندر کسی گوشے میں اس کے لیے نرماہٹ عمل پذیر ہونے لگے لیکن بھمّن کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلے ہوئے تھا۔ پہلے تو وہ صاف صاف کہتا۔ "ماماں! تیں ہمارے بیچ ماں مت بول، تنے ساری جندگی ماں کی گلامی کری۔ ارے تنے کو جوان ہوں

کوچوان۔ سو بدماش ڈالو' ایک مُلیا بنے اور سو مُلیا ڈالو' سالا ایک کوچوان بنے۔ میں سب جانوں' ارے وہ بھڑوا بھی کوئی مرد ہووے جو جنانی کی ٹھکائی نہ کرے۔ تیں مجھے جورو کا گلام بناوے؟" جوش میں اس کی سانس پھولنے لگتی تو قدرے توقف سے پھر اپنے شوہری نسخہ ہائے کیمیا بیان کرنے لگتا۔ "کام سکل (شکل) کی جورو کو دن ماں ایک بار مارو تو کھوب صورت کو دوبار۔ ارے بلیکھی کو تین بار ماروں تو بھی کم ہے۔ سسری ہے ہی بھیڈ کی بھیڈ' اس لیے کبھی چھینٹی لگاؤں کبھی ناگا کر دیوں۔" پھر وہ غصّے کے گھونٹ پی کر کہتا۔ "ماں! اُنّے کئی بار بولا 'تیں اِدھر مت آیا کر۔"

زلیخا کو اس بات پر بڑی الجھن ہوتی جب کوئی اسے کہتا کہ وہ خوب صورت ہے۔ وہ سوچتی کہ بس کوڑے کا ڈھیر ہوں۔ پھر اپنے ہاتھ دیکھ کر کہتی۔ "ہاں رنگ گورا ہے' نین نقش پتہ نہیں کیسے ہیں؟ کبھی غور نہیں کیا۔" پھر خود ہی اپنے سوال کا جواب دیتی۔ "جیسے بھی ہیں' میں نے کوئی ریجھ کے کھانے ہیں' بھاڑ میں جاویں۔" فارغ اوقات میں وہ چارپائی پر پڑی ہوتی تو ڈھلے ہوئے لٹھے کی طرح' جیسے کوئی ایسا مُردہ جو زندگی میں گورا چٹا رہا ہو لیکن مرنے سے قبل کسی حادثے کی وجہ سے اس کے بدن سے خون کا آخری قطرہ بھی نچڑ گیا ہو۔ وہ زندہ تھی بھی نہیں' کب کی مر چکی تھی۔ شاید بہت سی گالیاں' ٹھڈے' تھپڑ اور چھانٹے اس کے مقدر میں لکھے تھے جو ابھی اس نے پھمّن کی وساطت سے وصول کرنے تھے' اسی وجہ سے اس کا بے روح بت کمرے میں چلتا پھرتا رہتا۔ اسے اس سے کوئی سروکار نہ تھا کہ اس بہت بڑے شہر میں ایک کمرے کے گھر کے باہر بہت بڑی دنیا آباد ہے۔ نہ ہی اس کی کوئی واضح خواہشات تھیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ چاہتی تھی کہ بچوں کو پیٹ بھر کے کھانا مل جائے اور اس کی مارکٹائی ذرا کم ہو یا یہ کہ پھمّن چھانٹے سے نہ مارے۔ اس کا چھانٹا بڑا ظالم تھا۔ بید کی سوٹی کے آگے چمڑے کی لمبی باریک آپس میں گندھی ہوئی رسّیاں لگی تھیں۔ وہ اپنے گھوڑے کو چھانٹا مارتے ہوئے گھماتا زیادہ تھا لیکن ضرب لگانے کے بجائے پیٹھ پر صرف رکھ دیتا تھا جب کہ گھر میں وہ چھانٹا گھماتا تو شوں شڑپ کر کے لگاتا۔ جس روز صبح یا دوپہر اس کے بدن پر تین چار چھانٹے پڑ جاتے' سارا وقت جلن ہوتی رہتی۔ حبس اور گرمی میں وہ چارپائی پر لیٹی ہوتی تو مساموں سے پسینے کے قطرے پھوٹنے لگتے' جلد سے چپکی ہوئی میل گھل جاتی' چھانٹوں سے پڑے ہوئے نیل یوں دُکھنے لگتے جیسے ان پر نمک یا تیزاب لگا دیا گیا ہو۔ اس کے کپڑے بدن سے چپک جاتے' لمبے گھنے بالوں کی جڑوں میں پسینے کے سیلاب سے جوئیں پریشان ہو کر کھوپڑی میں گھسنے کی کوشش کرنے لگتیں۔ زلیخا اپنے دونوں ہاتھوں کی کنگھیاں کھبڑ کھبڑ بالوں میں چلانے لگتی۔ ٹاٹ کا پردہ ہلتا تو اس کا جی چاہتا' کاش یہ آگے سے ہٹ جائے اور عقبی دیوار میں نصب شدہ دروازہ چوپٹ کھل جائے' روشنی اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کمرے میں سرسراتے پھریں۔ یہ خواہش بیدار ہوتے ہی وہ تصوّر میں کھو جاتی اور یوں محسوس کرنے لگتی جیسے وہ کسی گھنے درخت کے نیچے کھلی فضا میں سُوتر کی بنی ہوئی کھاٹ پر سوئی ہوئی ہے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کے بدن سے مَس ہو رہے ہیں جن سے اس کے جسم و جان میں راحت اور سکون رچ گیا ہے۔ ایسے ہی لمحات میں وہ بیچ بیچ سو جاتی اور تب اُٹھتی جب پھمّن اس کی کھاٹ کو چھانٹے کی سوٹی سے

[illegible] لاکر کھناک کی آواز کے ساتھ واشتا۔ "اب سالی! [illegible] تو نمیں کرنے لگی۔ یوں بے گھبر سوئے ہے۔ [illegible] کوئی لاٹکا ماں کا یار اندر گھس آوے تو پھر؟ تیں ایک نہ ایک روز میرے سے کتل کرادے گی۔" شسری نئے کھاہ مخواہ کو بھی لگ جاوے گا۔" (خواہ مخواہ پھانسی چڑھ جائے گا)

نہ جانے اس کا نام کیا تھا اور وہ کون تھی۔ سارے کوچوان اسے لیڈی کہتے تھے۔ وہ کالا ریشمی برقع اوڑھے ہوتی۔ گورے پاؤں میں کالے چمکیلے سینڈل، ہاتھوں کی جلد [illegible] اور ملائم۔ ایک ہاتھ میں ڈائری اور بڑا سا پرس۔ [illegible] آنکھوں کے نیچے تک باریک سیاہ نقاب اس نفاست [illegible] دونوں کانوں کے اوپر برقع میں اُڑسا ہوتا کہ بڑی بڑی آنکھیں اور بھی لمبی اور سحرانگیز لگتیں۔ جسمانی خدوخال [illegible] اور جاذبیت کا یہ عالم تھا کہ برقع مجبورِ محض [illegible] سراپے اُلجھی ہوئی زلفیں بھینی بھینی مہک ایک [illegible] کردیتی۔ چھمن بی جان سے فریفتہ ہو چکا تھا لیکن اس کی [illegible] معاشی حیثیت، رکھ رکھاؤ اور حُسن کی سحر [illegible] اس قدر مرعوب تھا کہ اسے اپنے جذبات کے اظہار [illegible] چھمن اب وہ اس کے تانگے کی [illegible]

[illegible]

شروع شروع میں چند ایک بار چھمن نے کرایہ لے لیا۔ [illegible] کرایے کی رقم آگے بڑھائی' اس [illegible] "آپ پر حلال' مجھ پر [illegible] ایک دل آویز مسکراہٹ [illegible]

[illegible]

لگا تھا۔ پاؤں میں اپنے گھوڑے کے نتھنوں جیسے سوراخوں والے سلیپر دھو کے سجالیتا۔ رگڑ کے داڑھی منڈواتا تو چھلے ہوئے آلو کی طرح لگتا' الٹی مانگ نکالتا۔ اس روز ریڈ لیمپ کے بجائے ہتھوڑا مارکا سگریٹ کا پیکٹ خریدتا۔ خوشبو والا پان کلے میں دبائے گنگناتا پھرتا۔ "بین نہ وجائیں منڈیا میری گت چپنی بن جائے دی"۔ کچھ زائد خرچ ہوجانے کے باعث اس روز ٹھیکے دار کے اڈے پر جوا بھی نہ کھیلتا لیکن گھوڑے کی قسط ٹھیکے دار ضرور وصول کرلیتا' خواہ اسے گھوڑوں کی راسوں میں ہاتھ ڈالنے پڑجاتے۔ وہ یہ بھی لحاظ نہ کرتا کہ تانگے میں کوئی مریض یا زنانہ سواریاں بیٹھی ہیں۔ چرس اور جوئے میں ایک آنے کا اُدھار نہ کرتا۔ لین دین کے معاملات میں ٹھیکے دار اپنے وضع کردہ اصول و ضوابط پر سختی سے کاربند تھا۔ وہ کہا کرتا کہ کسی کے گھر میں آٹا ہو یا فاقہ' وصولی کے معاملے میں رعایت نہیں ہوسکتی۔ بقول اس کے وہ چار آنے کا بزنس کرتا تھا۔ مثلاً تانگا اسٹینڈ کا کمیشن چار آنے فی پھیرا' چرس فی گولی چار آنے' فلاش کھلاتے ہوئے چار آنے اڈے کی کاٹ فی بوڈ' جوئے خانے میں چار آنے کی کپ چائے۔ جب کسی غریب یا مجبور کوچوان کو گھوڑا تانگا یا ان دونوں میں سے کوئی ایک چیز قسطوں پر خرید کر دیتا تو ایک روپے پر چار آنے زائد منافع وصول کرتا۔ یعنی ہر مال ملے گا چار آنے۔

چھمن نے کئی دنوں سے ایک روپے والی لاٹری کا ٹکٹ

خرید کر رکھا تھا جس پر پانچ ہزار روپے کا انعام نکلنا تھا۔ جوں جوں لیڈی، چمّن کے حواس پر چھاتی گئی، اس نے دن میں بھی کھلی آنکھوں سے سپنے دیکھنے شروع کر دیے۔ وہ دیکھتا کہ پینٹ بو شرٹ میں ملبوس ایک ہاتھ جیب میں، دوسرا لیڈی کے ہاتھ میں، منہ میں پاسنگ شو کا سگریٹ، کبھی باغوں میں گھوم رہا ہے، کبھی کسی سینما ہاؤس کے باکس میں ایک ہی صوفے پر لیڈی کے ساتھ بیٹھا فلم دیکھ رہا ہے۔ تصوّر کے گھوڑے پہ سوار وہ ایسی ایسی خوش نما وادیوں کی سیر کرنے لگا کہ سرخوشی اور سرشاری سے چُور چُور ہو گیا۔ زلیخا کے خیال ہی سے اسے گھِن آنے لگی۔ وہ بڑبڑانے لگتا، کیسی مردار بیوی ملی ہے، کوئی جوش نہ ولولہ، یوں جیسے وہ زندگی نہیں گزار رہی بلکہ زندگی اسے گزار رہی ہے۔

آج آخری پھیرا اٹھانے کے بعد وہ اڈّے پر گیا۔ ٹھیکے دار کو گھوڑے کی قسط ادا کی، دو گولیاں چرس کی خریدیں۔ پہلے وہ دو ڈھائی روپے گھر کے خرچ کے لیے بچا کر بقیہ رقم سے فلاش کھیلا کرتا تھا، آج لیڈی کی محبت کا نشہ سمایا ہوا تھا، پھر اسے یقین تھا کہ دوسرے روز صبح آٹھ بجے لاٹری کی قرعہ اندازی ہونی ہے، پانچ ہزار روپے اسے کمپنی کے اعلان کے مطابق نقد مل جانے ہیں اور پھر کل ہے بھی سنیچر۔ پچھلے پہر لیڈی سے ملاقات بھی ہونی ہے۔ گویا دوسرے دن کا سورج اس کی زندگی میں ایک انقلاب لے کر آ رہا تھا۔ وہ ترنگ میں سارے پیسے ہار گیا۔ گھر میں آٹا بھی ختم تھا۔ وہ سبزی آنے کے بغیر ہی گھر جا کے سو گیا۔ صبح اپنے وقت پہ اُٹھا۔ بیت الخلا سے نکل کر گھوڑا جوتنے لگا۔ جب چھانٹا لینے اندر آیا تو زلیخا نے ناشتے کے بارے میں استفسار کر دیا۔ وہ زہرخند سے بولا۔ "ارے جَر کھالے خود بھی اور سالے پلّوں کو بھی کھلا۔ نُسری ناشتہ مانگے ہے۔"

وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔ "بچّوں کے لیے تو لا دو، مجھے نہیں چاہیے۔"

وہ [illegible] ہو گیا اور چیخا۔ "ارے نہیں مرتے یہ کنجری کے [illegible] سال [illegible] کرے جا رہی۔ (قدرے توقف سے) ہائے [illegible] گھوڑ [illegible] کبھی نہیں ہوں جیسی لڑکیاں مریں۔ چمّن پہ اور [illegible] سال [illegible] سوار کہیں کی۔ [illegible] لگ گئی۔"

ذرا مزید تکرار بڑھی تو اس مرد کے بچّے نے چار پانچ چھانٹے شوں شڑپ زلیخا کی پیٹھ پر جھاڑ دیے۔ بچّے رونے لگے تو لگتے ہوئے ایک ایک بطور ناشتہ انھیں بھی رسید کر دیا۔

لاٹری والی کمپنی کے دفتر پر تالے پڑے تھے۔ سیکڑوں لوگ وہاں کھڑے شور مچا رہے تھے کہ فراڈ ہو گیا۔ چمّن نے یہاں اپنی گالیوں کا فلتھ (FILTH) اَن لوڈ کیا، اسے غصّہ آ رہا تھا کہ صبح ہی صبح زلیخا متھے لگ گئی، سالی سے منہ ماری ہو گئی۔ منحوس نے پانچ ہزار روپے کا نقصان کرا دیا۔

پہلا پھیرا لے کر اسٹیشن پہنچا تو چائے رس کا ناشتہ کرنے لگا، اس دوران اُس نے بڑی گہری سوچ بچار کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ لیڈی اس سے پیسے کے لیے تو محبت کرتی نہیں، ویسے ہی مرتی ہے۔ پھر اس نے خود ہی سوال کیا۔ "کیا اسے معلوم نہیں کہ میں ایک معمولی کوچوان ہوں؟؟" ... "بے شک، بے شک" وہ اس جواب پر نہال ہو گیا۔ چناں چہ اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ زادِ راہ کے بغیر محض اپنے خالص جذبات کے بل بوتے پر محبت کے نئے سفر کا آغاز کر دیا جائے تاکہ عشق کی نئی منزل پر جلد از جلد پہنچ کر اس کے جملہ ثمرات سے فیض یاب ہوا جا سکے۔ اس نے آج ہی لیڈی سے صاف صاف بات کرنے کی ٹھان لی۔

دوپہر کو چمّن گھر نہیں گیا۔ اسٹینڈ کے عقبی حصے میں نیم کے درخت تلے گھوڑا کھول کر اس کی پیٹھ اور گردن پر تھاپڑے مارے، تھوڑا سا کھرکنا لگا کر بڑے پیار سے ہاتھوں کے ساتھ مالش کی، ماتھے پر سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی سے مساج کرتے ہوئے اس کے ساتھ دھیمے لہجے میں پیار سے باتیں کرنے لگا۔ "دیکھ بے سالے! آج چمّن کی لاج رکھیو۔ تُسرے پھولاں جیسی لیڈی اپنے ساتھ بیٹھی ہووے تو تیری مُرلیاں یوں باجے جیسے بین من بوجھ لدا ہو، کتنے سرم آوے اے میرے باپ! ایسی چال کر، یوں جیسے کوئی ہوا میں تیر رہا ہووے۔" گھوڑے نے اپنے الف کھڑے کانوں کا رُخ اس کی جانب کر کے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پھڑکا مارا جیسے اس کی ساری باتیں غور سے سن کر پلّے باندھ لی ہوں۔ چمّن مطمئن ہو کر مڑا ہی تھا کہ گھوڑے نے بڑے سُر میں ہنہنا کر اسے متوجہ کیا۔ چمّن کو بھی جیسے کوئی بات یاد آ گئی، مسکرا

[illegible] "ہاں لاٹ صاحب! اب چسکی بھی لگائے گا' اچھا [illegible]" چھمن ڈبل سگریٹ سلگا کر اس کے سامنے بیٹھ [illegible] کش لے کر دھواں گھوڑے کے نتھنوں پر [illegible] سگریٹ سلگتے سلگتے اتنا رہ گیا کہ جن دونوں [illegible] رکھا تھا' ان کے ناخنوں اور ہونٹوں پر تیز جلن [illegible] لگی' مزید کش لگانا ممکن نہ رہا۔ گھوڑے نے [illegible] چھوڑ کر گردن جھکالی۔ چھمن نے توبڑا اس [illegible] چڑھایا اور خود مست چال چلتا ہوا "نیو ماڈرن کراچی [illegible] وکرم تمام" میں گھس گیا۔

[illegible] فل میک اپ کے ساتھ وہ اسٹیشن پہنچا تو ساتھی [illegible] اسے دیکھ دیکھ کر ہنسے جا رہے تھے اور رنگ رنگ [illegible] کس رہے تھے۔ وہ کسی کی بات کی طرف دھیان [illegible] رہا تھا۔ دراصل ماضی میں جب بھی وہ ایک نئے [illegible] کے ساتھ کسی ساتھی سے بھڑا' نتیجہ ہر بار یہی نکلا کہ [illegible] پٹ گیا۔ آج چونکہ ویسے بھی وہ ذہنی طور پر خود کو [illegible] برادری سے خارج کرچکا تھا اس لیے کسی بھی [illegible] کی بات کا جواب دینے کا روادار نہیں تھا۔

[illegible] لیڈی اسٹیشن کی سیڑھیاں اُترتی دکھائی دی' [illegible] والوں نے بندروں کی طرح دانت نکوس کر ایک [illegible] کو متوجہ کیا اور ودو نے ہانک لگائی۔ "چل اوئے [illegible] بے آئی آ۔" "لیڈی تانگے میں بیٹھ چلی تو [illegible] نعرہ لگایا۔ "قسمت والیاں نے ہاتو تانگے تے بہائی [illegible]"

[illegible] میں چھمن نے اپنی چندھی آنکھوں سے دنیا جہان [illegible] اور [illegible] انڈیلتے ہوئے' پان کی پیک میں ڈوبے [illegible] ہوئے کالے دانت نمایاں کرکے اپنا مدّعا [illegible] ہوا مہمل سا جملہ سن کر خود اُلجھ [illegible] بولی۔ "چھمنا! تمھارا تانگا [illegible]

[illegible]

روپے خرچ کرسکتا ہے۔ کوئی دو لاکھ کی کوٹھی میرے نام کرا رکھی ہے۔ چڈا انکل خیرو۔ میرے چندا' خواب دیکھنے چھوڑ دے۔ یہ لے سو روپیہ' میری طرف سے اپنی بیوی کے لیے کوئی تحفہ لے کر جانا۔ جھنڈو کہیں کے۔" اس نے سو روپے کا ایک کنوارا نوٹ پرس سے نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے نچایا اور اس کے شلوکے کے گریبان میں اُڑس کر ایک شانِ بے نیازی سے مسکرا کر بولی۔ "تمھارے اب تک بیالیس روپے بنتے ہیں۔ کبھی اور ضرورت پڑے تو بلا جھجک مانگ لینا"....

چھمن نے کئی مرتبہ ماریں کھائی تھیں' پولیس سے' سواریوں کے ہاتھوں اور اپنے ساتھیوں سے لیکن آج اسے یوں لگا جیسے لیڈی نے اسے بھرے تانگا اسٹینڈ پر الف ننگا کرکے بڑی ستھری مار ماری ہے۔ آج اس نے ایک کے بجائے چار گولیاں چرس کی خریدیں اور قبرستان کے ساتھ درخت کے نیچے تانگا کھڑا کرکے گھوڑے کے آگے راتب کا توبڑا رکھ دیا۔ خود گھاس پہ لیٹ کر وقفے وقفے سے ڈبل سگریٹ پینے لگا۔ سگریٹ کا گل لمبا ہو جاتا تو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پہ جھاڑ کر تبرک کے طور پر زبان سے چاٹ جاتا' شاید اس خیال سے کہ کچھ نہ کچھ اثر راکھ میں رہ گیا ہو۔ وہ بہرحال اپنے پیسوں کا نعم البدل وصول کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ ہواؤں کی اُڑان مکمل کرچکا تو اسے صبح گھر میں زلیخا کو مارنے کا منظر یاد آگیا۔ آج اسے دل میں افسوس ہونے لگا۔ اس نے سوچا کہ پہلے تو وہ یوں ہی ذرا اپنی مردانگی کا رنگ جمانے کے لیے مارتا تھا لیکن آج سالی لیڈی نے خواہ مخواہ بےچاری کی پٹائی کرادی۔ لیڈی کا خیال دل میں آتے ہی وہ بڑبڑانے لگا۔ "بت تیرے کی سالی' بڑی لیڈی بنی پھرے' کنجری۔ ارے

تیری ایسی پوساک (پوشاک) میری جلیکھی پہنے تو پری لگے پری۔" پھر وہ لیڈی کے انداز میں اپنی گالیوں کا خزینہ لٹانے لگا۔ جب تھک گیا تو ماضی قریب ترین کی اپنی تشنہ تکمیل خواہش کی تسکین کے لیے اپنے گھوڑے کو بھی ملوث کر لیا۔ پھر کچھ مطمئن ہو گیا گویا اہم مقدمہ لڑنے کے لیے کوئی مناسب وکیل کر لیا ہو۔

گھوڑا تو بڑے میں تھوتھنی گھسیڑے راتب کھاتے کھاتے ایک لمحے کو رک کر اپنے مالک کو تکتا اور لمبی سی پھرررر کرتا۔ پھمّن کو یوں محسوس ہوتا جیسے گھوڑا کہہ رہا ہو "دُر فٹے منہ پھمنا۔" پھمّن نے اسے بُری طرح ڈانٹ دیا جیسے گھوڑے نے زوردار آواز میں ہنہنا کر اُسے چڑایا ہو۔ پھمّن سمجھا جیسے گھوڑا کہہ رہا ہو۔ "چھڈا گل خیرو۔ میرے چندا۔ کچھ کش اِدھر بھی۔" پھمّن کو گھوڑے کی اس حرکت پر غصہ آگیا۔ اس نے گھوڑے کو ماں کی گالی بکی۔ گھوڑے نے گالی کا جواب گالی سے دینے کے بجائے تھوتھنی اس کی طرف بڑھا کر اوپر والا ہونٹ پورے کا پورا اُٹھایا۔ پچنے اور چھلکے کے آمیزے سے لبریز دانتوں کی نمائش کی گویا اپنے مالک کا منہ چڑا رہا ہو۔ پھمّن گھوڑے کی گستاخی پر سیخ پا ہو گیا اور اسے اونچی آواز میں گالیاں بکنے لگا۔ گھوڑے نے شرمندہ ہو کر پھر سے توبڑے میں منہ گھسایا اور کڑک کڑک کرنے لگا۔ بہ مشکل دو ہی اسل سگریٹ پیے ہوں گے کہ پھمّن کے حواس مختل ہو گئے اور وہ تحت الثرا میں اُترنے لگا۔

☆ ــــ ☆ ــــ ☆

زلیخا آج صبح والی مار پر اتنی دل گرفتہ نہیں تھی جتنی بچوں کی بھوک پر رنجیدہ تھی۔ وہ پھمّن کے ظلم برداشت کرتی رہی تھی کہ اس کے بچوں کو صبح چائے رس اور دن رات کا کھانا مل جایا کرتا تھا۔ جب دن کو بھی پھمّن گھر نہ آیا اور کھانے کو کچھ نہ ملا' بچے بلکنے لگے تو زلیخا کے خالی پیٹ میں ایک روح نے جنم لے لیا۔ اسے قطعاً پروا نہ رہی کہ راج چوڑی کی ہو سے پرو ہونے جا رہی ہے' نہ اسے پھمّن کا خوف رہا۔ وہ سیدھی ماسے کی دکان پر گئی۔ ماماں نوٹ گن رہا تھا۔ زلیخا کو سامنے دیکھ کر کچھ دیر چپ رہا' اس کا چہرہ پڑھتا رہا پھر اسے سوالیہ انداز میں پلکوں کا اشارہ کیا۔ زلیخا نے کہا۔ "ماماں! بچے بھوکے ہیں' کچھ پیسے دے دے۔"

ماماں بولا۔ "اری جلیکھاں! تیں پاگل پن چھوڑ دے' اری جالم! آج تیں پھر پٹی اس کتے سے' میں سب سنوں تھ والے دروبچے سے لگ کے جو تیرے سے پیٹے۔"

"ماماں! بچے بھوکے ہیں' کچھ پیسے دے دے۔" زلیخا پھر بولی۔

ماماں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے صبر کی تلقین کی اور خود اپنی بات جاری رکھی۔ "اری بھاگ چل میرے ساتھ۔ میرے پلّے اتنے روپے ہیں کہ تیں سوچ بھی نہ سکے۔ تمام جندگی عیس (عیش) کرے گی۔"

"ماماں! تیں کچھ دے گا بھی یا میں جاؤں۔ بچے بھوک سے تڑپ رہے۔" اس کی جان بس بچوں کی بھوک میں اٹکی ہوئی تھی۔ وہ ایک ہی بات دہراتی رہی۔ ماماں نے چند نوٹ اس کے ہاتھ میں تھمائے' اسے گھر چلنے کو کہا اور بتایا کہ وہ خود روٹی لے کر اس کے پاس آجائے گا۔ زلیخا گھر لوٹ گئی۔

تھوڑی ہی دیر میں ماماں بہت سی تندوری روٹیاں' ڈھیروں قیمے کی تلی ہوئی ٹکیاں' کباب اور چٹنی اخبار میں لپیٹ کر لے آیا اور بچوں کے آگے رکھ کر بولا۔ "جلیکھاں! تنے دکان کب کی بیچ رکھی' رقم میرے کھیسے ماں پڑی۔ میں رات ملتان جا رہیا۔ تنے وہاں مکان اور دکان کھرید رکھی۔ تیں جو دماغ سے سوچو تو ابھی روٹی پانی کھا پی کے اڈے پہ چلو۔ میں دکان کی چابی حوالے کر کے ابھی سیدھا اُدھر پہنچیا۔ اگر تیں اُدھر اڈے پہ ہوئی تو اکٹھے چلیں گے۔ نہیں تو بھائی اپن اکیلے ہی جاویں گے۔" اور ٹھٹکتے ٹھٹکتے رک کر پھر بولا۔ "تیرا وہ چرسی کھوند (خاوند) کبرستان میں مزار کی تریا پڑ رہیا' نشہ سا۔ تنے کھود اپنی اکھیاں سے دیکھا۔" ماماں باہر نکل گیا۔

بچے ندیدوں کی طرح کھائے جا رہے تھے۔ زلیخا جلدی جلدی کچھ کپڑے سمیٹ کر ایک ٹرنک میں ڈالنے لگی۔

لاری اڈے پر زلیخا ماماں سے بولی۔ "ماماں! اگر تیں کبھی میرے بچوں کو مارا یا پیٹ بھر کے کھانے کو نہ دیا تو یاد رکھ' مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ ابھی سوچ لے۔ میں پھمّن کے گھر لوٹ چلوں۔"

ماماں مسکراتے ہوئے بولا۔ "اری پگلی! میں کیوں ماروں گا

"اس مسوماں کو لے تمیں ابھی ساری رقم پاس رکھ لے۔" وہ گھونسے میں ہاتھ ڈالنے لگا۔ زلیخا نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

☆

پھمن تھانے میں دہائی دے رہا تھا۔ "رے میں لٹ گیا' برباد ہو گیا۔ کوئی میری ارج سنو۔"

شاہ سوار دونوں کندھوں پر ایک ایک پھول سجائے اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس نے طنزیہ انداز میں پھمن سے استفسار کیا۔ "اچھا بتا' تیرا سونا کتنا لے گئی اور نقد رقم؟"

پھمن رو کے بولا۔ "جہور! وہ مجھ سے دھوکا کر گئی' میری لاڈو تھی' دل کی رانی' بے وفائی کر گئی۔ میں کیا بولوں' وہ میری ساری کمائی لے گئی۔"

شاہ سوار نے اس کے شلوکے کی جیبیں ٹٹولیں تو چرس کی گولیاں برآمد ہوئیں۔ شاہ سوار نے گولیاں گھما پھرا کے دیکھیں اور اس کے بالوں میں ہاتھ کی انگلیاں پھنسا کے ایسا جھٹکا دیا کہ پھمن کے پاؤں کی انگلیوں تک کرنٹ دوڑ گیا۔ اس نے درد سے جھرجھری لی اور ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔ "سرکار! میں فریادی (فریادی) ہوں' کچھ ترس کرو۔"

شاہ سوار نے ہوا کہا۔ "کتے کے بچے! یہ جتنی تو چرس پیتا ہے' اپنی بیوی کو کچھ کھلایا پلایا ہوتا تو مکھن ملائی جیسی لڑکی۔ وہ ضرور آج تیرے پاس ہی ہوتی۔" قدرے توقف سے اس نے پہلا تھپڑ پھمن کے سیدھے گال پر جڑ دیا اور ابھی وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ دوسرا الٹے گال پر۔ پھمن زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ شاہ سوار کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کا دوسرا تھپڑ کھانے کے بعد کوئی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں رہتا۔ اس نے گرج کر [illegible] ...... اصل بات کیا ہے؟"

[illegible] تھا۔ شاہ سوار نے اسے بالوں سے [illegible] پھمن کے گھٹنے بج [illegible] اور شر شر [illegible] شاہ سوار نے ایک اور [illegible] کے خال و [illegible]

خوف اور دہشت سے پھمن کی حالت غیر ہو گئی تو [illegible]

پاس کھڑا ہوا کانسٹیبل فکر مند ہو کر بولا۔ "شاہ جی! جنانی کسی یار کے ساتھ بھاگ گئی ہو گی۔"

شاہ سوار نے اپنے پاؤ پاؤ بھر کے لال لال ڈیلوں پر سے پپوٹوں کے غلاف یکسر نوچ ڈالے اور گرج کر سپاہی کو جواب دیا۔ "بھونک نہیں اوئے کتے۔ پورا سال میں نے ٹرائی کرلی اس پر' وہ مجھ سے نہیں پھنسی۔ پتھر پہ لکیر ہے' وہ رن بدمعاش نہیں۔ اس ماں کے یار نے کہیں خود بیچ دی ہے یا جوئے میں ہار گیا ہے۔ اب کنجر کی نسل شاہ سوار شاہ کو چکر دے رہا ہے۔" کانسٹیبل سہم کر چپ ہو گیا۔

شاہ سوار بپھرے ہوئے ببر شیر کی طرح دہاڑا اور الٹا ہاتھ پھمن کی گدی پہ رکھ کے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی اس کی ٹھوڑی کے نیچے جمائی تو پورے سوا فٹ لمبے ہاتھ نے اس کا شاہ دولہ کے چوہے جیسا سر آہنی شکنجے کی طرح اپنی گرفت میں کس لیا۔ دوسرے ہی لمحے شاہ سوار نے پھمن کو ہوا میں معلق کر دیا' وہ اپنی ننگی ٹانگوں سے تیز تیز سائیکل چلانے لگ گیا۔ ابھی چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ پھمن پھڑکنے لگا جیسے شیر کے پنجے میں خرگوش۔ شاہ سوار نے اپنا دیو کا سا ہاتھ ذرا اور اونچا کر کے آگے کی طرف جھٹکا دے کر واپس کھینچ لیا' پھمن دھڑام سے نیچے آ رہا۔

شاہ سوار نے قدرے توقف کر کے اپنے تئیں کچھ اطمینان کر لیا تو اگلے مرحلے پر اپنا ہاتھی جیسا پاؤں پھمن کے جسم پر ایک ایسی جگہ رکھ کر ذرا سا دبایا کہ اگر وہ مرد کا بچہ آج زندہ بھی بچ جاتا تو مستقبل میں اپنی کسی گالی میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے قابل نہ رہتا۔ وہ وحشت اور اذیت کے مارے دبا ہوا ایسی خوف ناک اور دل خراش آواز میں چلانے لگا جیسے کسی ویران سڑک پر کوئی تیز رفتار ٹرک آوارہ کتے کا پچھلا دھڑ اپنے ٹائروں تلے کچل کر نکل گیا ہو۔

شاہ سوار نے اپنا پاؤں اٹھایا تو وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بلک بلک کے فریاد کرنے لگا۔ "جہور مائی باپ! ماف کر دو۔ مٹے گھیر نے کھد نیک بخت کو گھر سے نکالا۔ آپ سچ بولو ہو' وہ بھاگی نہیں۔"

دنیا بھر سے اِدھر اُدھر سے انوشا فخاص، انتخاب ہفت رنگ
چھ زبانوں کی ست رنگی برنگی کہانیاں، مختصر مختصر،
فرحت فزا، عبرت اثر، خیال آفریں، خواب نگار۔

تیسرا

ایک روشن خیال حاکم کی کہانی،
وہ رنگ، روشنی، ریشم اور ترنم کا دلدادہ تھا مگر وہ فرنگی تھا۔

فرگوسن کے بارے میں کہانی لکھنے کی مجھے کوئی خواہش نہیں تھی لیکن اس نے خود مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں اُس کے بارے میں کہانی لکھوں مگر نہیں، میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں کہ اُس نے خود مجھے اپنی کہانی لکھنے پر مجبور کر دیا، جب کہ وہ اِس دنیا میں موجود ہی نہیں ہے، صاحب پاڑے کے قبرستان میں پختہ قبر کے اندر دفن ہے اور اُس کی قبر کے چاروں طرف اُگی ہوئی پھول دار گھاس قبر پر ایستادہ صلیب کو گھور رہی ہے۔

فرگوسن زندہ تھا تو اُس نے کتنی ہی بار ہنس کر مجھ سے کہا تھا۔ "تمھارے دیس میں کتنی خوب صورت گھاس اُگتی ہے اور اس کے سفید سفید پھول کتنے بھلے لگتے ہیں پھر تم لوگ، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس غم میں مرمر پر کتبہ لکھواتے ہو۔" شاید اسی لیے فرگوسن کی قبر پر کتبہ نہیں ہے اور اس کی موت بھی ایک غم ناک واقعے سے وابستہ ہے۔ بہت دنوں بعد صاحب پاڑے کے قبرستان کے قریب سے گزرتے ہوئے یکایک میری نگاہ فرگوسن کی قبر پر جا پڑی، مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی قبر پر جھکی ہوئی گھاس کتبے سے زیادہ نمایاں ہے اور ہوا کے جھونکوں سے جھوم جھوم کر فرگوسن کے کان میں سرگوشیاں کر رہی ہے۔ میرا دل افسردہ ہو گیا۔ میری حالت ہمیشہ ایسی ہی ہو جاتی ہے، حال مجھے بے معنی، بے سہارا، اَن جانا اور ناقابلِ برداشت نظر آنے لگتا ہے اور ماضی جانا پہچانا، یگانہ، اپنے سے بہت قریب اور بہت پرانا رفیق معلوم ہوتا ہے۔ سُکھ کے لمحے ہوں یا دُکھ کی گھڑیاں، ہر احساس [illegible] جمع کیے ہوئے موتی کی طرح، ماضی دل کے فریم میں [illegible] رہتا ہے۔ اسی لیے میرا دل افسردہ ہو جاتا ہے [illegible] افسردگی بھی نہیں کہا جا سکتا بلکہ کبیر کے الفاظ میں سُکھ پہنچانے والا درد کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔

لیکن فرگوسن کے لیے میرے دل میں ایسا کوئی جذبہ نہیں جسے سُکھ پہنچانے والے درد کا نام دیا جا سکے۔ ہاں، یہ جذبہ ایک درد جگانے والی یاد ضرور کہہ سکتے ہیں۔ دشمن ہو یا دوست، تمام مُردہ انسان اسی طرح زندہ رہتے ہیں۔ ایسی بات بھی نہیں کہ وہ ہر وقت ہمارے دل میں رہتے ہوں، نہیں، وہ دل کی تہ میں چھپے رہتے ہیں اور جب تہ سے اُبھر کر دل میں آ جاتے ہیں تو دل افسردہ ہو جاتا ہے، ملول ہو جاتا ہے۔ اگر فرگوسن انگریز تھا اور کسی زمانے میں قابلِ نفرت حکم راں تھا تو کیا ہوا، آج تو وہ مُردہ ہے۔

سن بیالیس کے آندولن کے آخر میں فرگوسن فرسٹ کلاس مجسٹریٹ بن کر بنگال کے ایک مشہور ضلع میں آیا تھا۔ وہ "دار" آئی سی ایس تھا اور بڑا سخت افسر تھا، لیکن اس کے ساتھ نہ تو نیم عریاں میم آئی تھی، نہ کتے آئے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی تھی، لیکن تعارف ہونے کے بعد فرگوسن نے ایک دن خود اس کی وجہ بتا دی تھی۔ "اس جنگ میں فتح ہماری ہو گی کیلپ! لیکن اس فتح کو ہم فتح نہیں کہہ سکتے، جنگ کے بعد پینسٹھ فی صد انگریز عورتیں امریکن یا ہندوستانیوں کے حوالے کرنی پڑیں گی، انھیں فرانسیسیوں کے حوالے بھی کیا جا سکتا تھا مگر ہی جینولائن کے ساتھ فرانسیسی مرد بھی گئے ہوئے ہیں۔"

پتہ نہیں، فرگوسن کو کس طرح یہ معلوم ہو گیا تھا کہ میرا نام احمد خلیفہ ہے، میں آبائی پیشے کے اعتبار سے درزی ہوں مگر اُن دنوں صدر سرشتے میں پیش کار تھا اور اس طرح فرگوسن کا ماتحت تھا مگر وہ میرے ساتھ دوستوں کا سا سلوک



پہلا رنگ

بنگال سے بھارت کے بیٹے دنوں کی ایک عبرت ناک داستان

عبدالغفار چودھری ؔ/ احمد سعدی

کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک دن میں نے ہمت کر کے اس سے کہہ دیا۔ "میرا نام کیلپ نہیں ہے، میرا خلیفہ ہے۔"

فرگوسن زور سے ہنس پڑا، پھر اپنی آنکھوں میں اور چہرے پر بے شمار سوالات پھیلا کر اس نے پوچھا۔ "تم کس نام سے مخاطب کرنے پر خوش ہو گے، کیلپ یا خلیفہ؟"

"خلیفہ سر!" میں نے مودبانہ لہجے میں جواب دیا۔

فرگوسن تھوڑی دیر تک حیرت بھری نگاہوں سے میری [illegible] اس نے آہستہ سے کہا۔ "ہم لوگوں کے [illegible] جانتے ہو؟ ہم لوگ غیر [illegible] تک کے صحیح تلفظ [illegible] کیلپ اور [illegible] گو یہ [illegible] کوئی [illegible] مسکرایا پھر اس [illegible] سچ ہے [illegible]

میں تمھیں تمھارے صحیح نام سے مخاطب کرنے کی کوشش کروں گا۔"

لیکن دو دن بعد ہی فرگوسن کے لیے پھر ایک مصیبت کھڑی ہو گئی۔ اس کے خاص چپراسی کا نام برکت تھا۔ اُسے اس نے کنگ پابر کے نام سے بلانا شروع کیا۔ اُس کی اس حرکت پر ہمارے دفتر میں دبی دبی سرگوشیاں پھیل گئیں۔ انکارت کے اوسیو بابو بھی سودیشی تحریک میں تھے، انھوں نے سبھوں کو بلا کر کہا۔ "تم لوگ سمجھتے نہیں ہو۔ اس نے ہمارے راجوں اور بادشاہوں کے ساتھ مذاق شروع کر دیا ہے۔ اس طرح وہ ہمارے دل مجروح کرنا چاہتا ہے۔"

"مجروح کرنا چاہتا ہے؟" معاملے کی اہمیت بہتوں کی سمجھ میں نہیں آئی۔

اوسیو بابو نے انھیں سمجھاتے ہوئے کہا۔ "فرگوسن کی ناک کے پاس کھڑے ہو کر تم میں سے کوئی اپنے نوکر کو کنگ

جارج کہہ کر مخاطب کرے، پھر دیکھنا، وہ برداشت کرتا ہے یا نہیں۔"

میں نے کہا۔ "ہم لوگ بھی برداشت نہیں کریں گے۔"

اوسیو بابو نے آنکھیں بند کرلیں۔ "پہلے ایک کپ چائے کا آرڈر تو دو بابو! میں سوچ کرتا ہوں۔"

چائے آتے ہی اُنھوں نے ایک چُسکی بھری اور نسّی کی ڈبیا نکال کر تھوڑی سی نسّی ناک میں ڈال لی پھر خمار آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔ "کسی کو بھی کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، برداشت بھی کرنے کی ضرورت نہیں، اب تو وہ آہی رہے ہیں۔"

"کون؟ آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟" ہم میں سے کئی نے ایک ساتھ پوچھا۔

اوسیو بابو مسکرائے۔ "ہٹلر آتا ہے، ڈنکارک کے بعد اب اس کی پیراشوٹ فوج سیدھی لندن میں اُترے گی۔"

روس کے برفانی میدان میں ان دنوں زبردست جنگ ہو رہی تھی اس لیے اوسیو بابو کی دی ہوئی خبر سے کسی نے بھی دل چسپی کا اظہار نہیں کیا۔

آخر، میں نے ہی یہ بات فرگوسن کے کان میں ڈال دی۔ "برکت کو بابر کے نام سے آپ کا بلانا مناسب نہیں ہے سر! اس سے ہماری تذلیل ہوتی ہے۔"

فرگوسن نے اسی وقت گھنٹی بجائی۔ برکت اس کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ فرگوسن نے دراز سے تاریخ کی ایک کتاب نکال کر میرے سامنے رکھ دی اور ورق اُلٹ کر بابر کی تصویر دکھاتے ہوئے بولا۔ "دیکھو، ان دونوں کی پوشاک میں کوئی فرق ہے؟"

میں نے برکت کو دیکھا، واقعی دونوں کی پوشاک ایک جیسی تھی، وہی جبا، وہی قبا، وہی عمامہ۔ گو فرگوسن نے مجھ سے کچھ نہیں کہا مگر برکت کی داڑھی بھی بڑی حد تک بابر کی داڑھی سے ملتی جلتی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے تاریخ کے اوراق سے نکل کر خود شہنشاہ بابر آکر کھڑا ہوگیا ہے۔ میں نے اَن جانے طور پر ایک لمبی سانس کھینچی۔ فرگوسن نے پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟" لیکن میں جو کچھ سوچ رہا تھا، اگر کہہ دیتا تو بڑی مصیبت آجاتی اس لیے خاموش رہا۔ فرگوسن نے کہا۔

"پلیز خلیفہ! ٹیل می وہاٹ یو آر تھنکنگ؟ فار دس ویری مومنٹ، آئی ایم ناٹ یور باس، اے فرینڈ، اے رئیل فرینڈ۔" (خلیفہ! مہربانی کرکے مجھے بتاؤ کہ تم کیا سوچ رہے ہو، اس وقت میں تمھارا افسر نہیں ہوں، دوست ہوں، واقعی دوست)

ہمت پاکر میں نے کہا۔ "چپراسیوں کے جسم پر یہ لباس تو آپ ہی لوگوں نے چڑھایا ہے سر!"

"لیکن کیوں، کبھی تم نے سوچا ہے؟" میں خاموش رہا۔ فرگوسن کی دونوں آنکھیں سانپ کی طرح چمکنے لگیں۔ اس نے ایک عجیب سی آواز نکال کر کہا۔ "ایسا صرف تم لوگوں کو ذلیل کرنے کے لیے کیا گیا ہے اور تمھارے بادشاہوں اور تمھارے ماضی کی تاریخ مضحکہ خیز بنا کر ساری دنیا کی نظر میں تمھیں حقیر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔" فرگوسن چند لمحوں کے لیے رک گیا پھر اس نے سرخ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر ایسا کوئی واقعہ میرے ملک میں ہوتا تو دو دِنوں میں خون کی ندیاں بہہ جاتیں لیکن تم لوگ؟ لائک پیٹ ڈاگس۔ (پالتو کتوں کی طرح ہو) کتّے کو بھی غصّہ آتا ہے تو وہ دانت نکال کر غرّاتا ہے مگر تم لوگوں سے تو یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ آج ڈیڑھ سو سال سے انگریز، چپراسیوں اور اردلیوں کو تمھارے شہنشاہوں کی پوشاک پہنا رہا ہے، اس سے تمھاری تذلیل نہیں ہوتی، صرف برکت کو بابر کہہ کر بلانے سے تمھاری تذلیل ہوتی ہے، حیرت ہے۔ جاؤ۔" فائل کے کاغذات دستخط کرکے اس نے میز پر پھینک دیے۔ میں چپکے سے کاغذات اُٹھا کر باہر چلا آیا۔ اپنے حاکم سے میرا اس قدر میل ملاپ کبھی نہیں ہوا تھا اس لیے فرگوسن کی برہمی دیکھ کر میں ڈر گیا۔ سوچا نیا ہونے کی وجہ سے اب تک اس نے اپنا اصل چہرہ چھپا رکھا تھا لیکن اب دوستی کا خول ہٹا کر حاکم کے روپ میں سامنے آرہا ہے۔

مگر اس میں فرگوسن ہی کا قصور تھا۔ اس سے پہلے سینڈی نام کا مجسٹریٹ تھا، ڈن کن سینڈی۔ وہ مونچھوں والا گراں ڈیل قسم کا آدمی تھا۔ اُس کے ڈر سے پورے دفتر پر سکتہ سا چھایا جاتا تھا لیکن فرگوسن کے آنے کے بعد سب کا خوف جاتا رہا۔ وہ حاکم اور ماتحت کا رشتہ بدل کر سبھی کا دوست بن گیا

سرفروشی کی تمنا

سب رنگ کے گزشتہ شمارے کے ایک اقتباس میں مشہور شعر

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

[illegible] مولانا ظفر علی خاں سے منسوب کیا گیا تھا۔ حقیقت [illegible] شعر ان کی تخلیق نہیں بلکہ تحریک آزادی کے ایک عظیم [illegible] رام پرشاد بسمل کے زورِ فکر کا نتیجہ ہے۔ بسمل نے شاہ جہاں پور [illegible] ایک [illegible] مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ابتدا ہی سے ان کے دل [illegible] اپنے وطن کو برطانوی تسلط سے آزاد کرانے کی تڑپ موجود تھی۔ ۱۹۱۶ء میں ان کا رابطہ اپنے ہی جیسے چند اور نوجوانوں سے ہوا تو یہ [illegible] ایک انقلابی جدوجہد میں بدل گئی۔ بسمل کی زندگی میں صحیح انقلابی [illegible] والوں میں پنڈت گیندالال ڈکشت کا بہت اہم حصہ ہے۔ [illegible] موصوف ۱۹۱۸ء کے مین پوری سازش کیس کے ایک اہم رہنما [illegible] اس سازش میں بسمل بھی شریک تھے۔ وہ کچھ عرصے زیرِ زمین [illegible] اور جب ایک شاہی فرمان کے مطابق ان کے وارنٹ گرفتاری [illegible] لیے گئے تو وہ ریشمی کپڑے کا کارخانہ کھول کر خاموش زندگی [illegible] مگر خالق نے انھیں خاموش زندگی بسر کرنے کے لیے [illegible] نہیں کیا تھا۔

۱۹۲۲ء میں رام پرشاد بسمل، ہندوستان سوشلسٹ ری پبلک ایسوسی [illegible] کے اہم رہنما بن گئے۔ وہ ماہر نشانہ باز اور نظم و ضبط کے لیے [illegible] تھے۔ ۹ اگست ۱۹۲۵ء کو انھوں نے کاکوری ٹرین ڈکیتی کی [illegible] میں حصہ لیا۔ یہ سراسر سیاسی نوعیت کی واردات تھی۔ گرفتار [illegible] انھوں نے مقدمے کی کارروائی کا جواں مردی سے سامنا کیا اور [illegible] کے سزاوار ہوئے۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو انھیں پھانسی [illegible] دی گئی۔

[illegible] کے علاوہ ادب کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ان کے [illegible] دوران ان کی کئی نظمیں مشہور ہوئیں۔ حکام نے ان کے کلام پر پابندی عائد کردی تھی مگر ان کا کلام پھر بھی گمنامی میں پلنے نے ہوا ہے۔

بسمل کی جو نظمیں زمانے کی دست برد سے محفوظ رہ گئی ہیں، ان میں سے مشہور نظم یہی ہے "سرفروشی کی تمنا..." نظم کے ابتدائی چار اشعار اور مقطع ۱۹۲۷ء میں ہندے ماترم نامی رسالے میں اور بقیہ اشعار اور مقطع ۱۹۲۹ء میں کانگریس پتریکا میں شائع ہوئے تھے۔ پوری نظم ملاحظہ فرمائیں۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
رہ رو راہِ محبت رہ نہ جانا راہ میں
لذتِ صحرا نوردی دوریِ منزل میں ہے
وقت آنے دے، بتادیں گے تجھے اے آسماں
ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے
اے شہیدِ ملک و ملت تیرے جذبوں کے نثار
تیری قربانی کا چرچا غیر کی محفل میں ہے
دیش پہ قربان ہوتے جاؤ تم اے ہندیو
زندگی کا راز مضمر خنجرِ قاتل میں ہے
ساحلِ مقصود پہ لے چل خدارا ناخدا
آج ہندوستان کی کشتی بڑی مشکل میں ہے
دور ہو اب ہند سے تاریکیِ بغض و حسد
اس کی حسرت ہے، اک ارماں ہمارے دل میں ہے
اب نہ اگلے ولولے ہیں اور نہ ارمانوں کی بھیڑ
ایک مٹ جانے کی حسرت اب دلِ بسمل میں ہے

اسلام آباد سے عقیل عباس جعفری کا عطیہ

[illegible] وہ اس سے باتیں کرنے لگا تھا [illegible] خوف دور کرکے خوف [illegible] فرگس ان دونوں سے [illegible]

[illegible] خوف دور ہو گیا [illegible] فرگس ان سے [illegible] جا کر دیکھا کہ وہ [illegible]

برآمدے میں اپنے چاروں طرف چائے، سگریٹ اور اخبار پھیلائے، بید کی ایک کرسی پر بیٹھا ہے۔ "ہیلو۔ اے کپ آف ٹی۔" اُس نے مجھے دیکھ کر کہا۔ پھر اُس نے خود میری طرف دودھ اور چینی بڑھادی اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر ریکارڈ پلیئر کا سوئچ آن کرکے بولا۔ "کچھ دیر موسیقی سنو، میں ابھی آتا ہوں۔"

فرگوسن اندر چلا گیا۔ برہم پترا دریا کے پانی میں شام کا تارا

جھلملا رہا تھا اور آسمان ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے گلال چھڑک دیا ہو۔ دور گارو پہاڑ کی سیاہ لکیروں سے گھری ہوئی فضا میں ان گنت ستارے چمک رہے تھے۔ برہم پترا سانپ کی طرح اپنا جسم پھیلائے، بہتی ہوئی سرکش موجوں کے درمیان سویا ہوا تھا۔ یکایک موسیقی سن کر ایسا محسوس ہوا جیسے برہم پترا جاگ اٹھا ہو اور پانی کی رواں دواں موجوں کے ساتھ اس کی جوانی گارو پہاڑ کی تاریکی سے گھبرا کر نکل آئی ہو اور کبھی ہلکے سروں، کبھی گرج دار آواز میں گاتی ہوئی بھاگی جا رہی ہو۔

فرگوسن نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "کیسا لگ رہا ہے؟"

"مغربی موسیقی ہے سر! سمجھ میں کم آتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

تاریکی میں فرگوسن کے پائپ کی آگ چمک اٹھی۔ تھوڑی دیر تک خاموشی طاری رہی پھر فرگوسن نے پوچھا۔ "تمھیں میں نے کیوں بلایا ہے، معلوم ہے؟"

"نہیں۔"

"تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو، یہ جاننے کے لیے۔"

صبح کا واقعہ یاد آتے ہی میں چونک اٹھا۔ "نو سر!"

فرگوسن دھیرے سے مسکرایا۔ "ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ بیٹھو، ہم دونوں اس وقت افسر اور ماتحت نہیں، دوست ہیں۔ لو سگریٹ پیو۔" اتنی دیر میں ریکارڈ ختم ہو گیا اور دوسرا ریکارڈ بجنے لگا۔ یہ دھیمے سروں کی موسیقی تھی۔

فرگوسن نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ "ہاں تم کتے اور میم صاحب کی کیا بات کر رہے تھے؟"

مجھے اپنی بات یاد آ گئی۔ میں نے کہا۔ "سر! آپ نے شادی نہیں کی اس لیے مسز نہیں آئیں اور چونکہ مسز نہیں آئیں اس لیے کتے بھی نہیں آسکے۔" اس سے آگے میں کچھ نہ کہہ سکا۔

فرگوسن ہنسنے لگا۔ "انگریزوں کو پہلے اپنے جسم کی حفاظت کرنے دو [illegible]! اس کے بعد سب کچھ ہو گا۔ اگر میں جنگ سے پہلے یہاں آتا تو نہ صرف اپنے ساتھ میم صاحب اور کتے [illegible] اور [illegible] تمھیں کئی نوکریاں بھی لے کر آتا، اور [illegible] تم لوگوں کے پیچھے [illegible] دوڑی ہوئی ہوتیں۔" اس

نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ "تمھاری عمر کے انگریز یہاں جج اور مجسٹریٹ ہوتے ہیں مگر تم لوگ کلرک سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ فرق سمجھتے ہو؟"

شہ پا کر میرے جذبات بھڑک اٹھے، میں نے کہا۔ "لٹیروں نے سب کچھ تو لوٹ لیا، ہم لوگوں کے پاس اس کے سوا باقی ہی کیا رہ گیا ہے سر!"

فرگوسن نے پُر استفسار نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ "لٹیرے؟ وھاٹ ڈو یو مین؟ (کیا مطلب ہے تمھارا؟) ہم لوگ لٹیرے ہیں؟"

ہزار بے تکلف ہو، مگر تھا تو وہ حاکم ہی اس لیے میں نے بات گھما کر جواب دیا "کلائیو کے عہد میں بھی مرشد آباد، لندن سے زیادہ خوب صورت اور دولت مند شہر تھا لیکن صرف ڈیڑھ سو سال میں اسی مرشد آباد اور لندن کا موازنہ کر کے دیکھ لیجیے سر! پورے ملک کی حالت سمجھ میں آجائے گی۔"

فرگوسن غصے میں آنے کے بجائے قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا، پھر اس نے بات کا رُخ موڑ دیا۔ "تاریخ کا غلط تجزیہ مت کرو۔ تہذیب ہمیشہ قتل و غارت اور لوٹ مار کے بطن سے جنم لیتی ہے۔ تم کسے لٹیرا کہتے ہو؟ خود تم لوگوں نے ہندوستان سترہ بار نہیں لوٹا تھا؟"

حکام کے ساتھ بحث تو نہیں کی جا سکتی۔ میں خاموش ہو گیا۔ فرگوسن نے پائپ میں تازہ تمباکو ڈال کر سلگایا۔ "صرف قوم کے لیے نہیں، انفرادی طور پر کسی فرد واحد کے نزدیک بھی تہذیب کا مطلب خود کو زندہ رکھنا اور ترقی کرنا ہے۔ تہذیب اسی طرح پھیلتی ہے۔ صرف تمھاری زندگی کے تحفظ کے لیے دنیا کی کتنی چیزیں، کتنی جانیں ضائع ہو رہی ہیں اس کی خبر رکھتے ہو؟" تاریخ سے ہٹ کر وہ منطقی دلائل پر اتر آیا۔

یہ سب کچھ وہ عدالت کے ایک پیش کار سے کہہ رہا تھا، میں دل ہی دل میں ہنستا رہا پھر اجازت چاہی۔ "اچھا اب مجھے اجازت دیجیے سر!" برہم پترا پر شام کی تاریکی کا ایک عجیب رنگ محیط تھا، اور سڑک کی روشنیوں میں اس کا پانی کہیں دھندلا، کہیں گھپ اندھیرے کی طرح اور کہیں درختوں کے

سوچوں کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

فرگوسن یکایک کرسی سے کھڑا ہو گیا اور بے تکلفی سے بولا "لطیف! تم نے شادی کی ہے؟"

"ہاں' سر!"

"کتنے بچے ہیں؟"

"پانچ"

"مائی گاڈ! تمہاری عمر کتنی ہے؟"

"تیس سال"

"مسز لطیف کیسی ہیں؟"

"صحت اچھی نہیں رہتی' ہمیشہ بیمار رہتی ہے۔"

فرگوسن نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "تم لوگ نہ تو زندہ رہنا جانتے ہو' نہ زندہ رہنا چاہتے ہو۔ تم لوگ موت کے خواہش مند ہو۔ زندگی تمہیں ہاتھ کے اشارے سے بلا کر بھی کیا کرے گی؟ اچھا' سچ سچ بتاؤ۔" فرگوسن نے میری آنکھوں میں جھانکا' ایک ثانیے کے لیے رُک کر کچھ سوچا' پھر بولا۔ "مسز لطیف سے شادی کرنے سے پہلے تم نے کبھی کسی لڑکی کو آنکھ بھر کر دیکھا تھا؟"

میں نے فخر سے جواب دیا۔ "نہ۔"

فرگوسن نے منہ سے پائپ نکال لیا۔ "زندگی کا رنگ کتنا اُجلا ہے۔ تم نے تو کچھ بھی نہیں دیکھا' انجوائے کرنا تو دور کی بات ہے۔ صرف عورتوں میں نہیں' اور جوانی ہی میں نہیں' زندگی میں ہر جگہ اتنے سارے رنگ ہیں' اتنی ساری خوشبو ہے پھر بھی تم لوگ ان سب کو چھوڑ کر کس چیز کی آرزو میں بیٹھے رہتے ہو؟ بتاؤ تو؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن دل میں فیصلہ کیا کہ کل اس سے کہوں گا' اس چھوکرے مجسٹریٹ کے دماغ میں خلل ہو گیا ہے' یہاں نہ تو اس کی جانی پہچانی چیزیں ہیں' اس کے دماغ میں خلل تو ہوگا ہی۔

فرگوسن بے اختیار ہنس پڑا۔ اس نے میرا بایاں ہاتھ کھینچ کر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور آہستہ سے بولا۔ "رنگوں کی شکل [illegible] میں نے دیکھا ہے' اجلا رنگ سفید ہے' تمہارا بایاں ہاتھ [illegible] زرد' گہرا سرخ اور گہرا سیاہ رنگ ہے گا۔

بھی ہوتے ہیں' کتنے لاتعداد رنگ ہیں۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ اس شخص کا دماغ خراب ہے' شاید ایسا ہی ہے۔ میں اپنے سماج میں اٹھتا بیٹھتا نہیں ہوں' کلب نہیں جاتا اور اپنے پیش کار کو دوست بنا کر اس سے باتیں کرتا ہوں۔ یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے؟ لیکن تمہی بتاؤ' جس کی آنکھوں میں بہت سارے رنگ لہرا رہے ہوں' وہ صرف سفید رنگ پر کیسے توجہ دے سکتا ہے' اس دیس میں کتنے انوکھے انوکھے رنگ ملتے ہیں۔ جب سورج غروب ہوتا ہے' اس وقت اس کے سرخ رنگ کے گرد چھائی ہوئی سیاہی سرخ رنگ میں بدلتی ہوئی تم نے دیکھی ہے؟"

ریکارڈ کی موسیقی بند ہو گئی' ساتھ ہی کسی نے ایک ساتھ کئی بلب جلا دیے' اندھیرے کا پردہ چیرتی ہوئی بہت ساری روشنیوں کی موجیں بکھریں اور پھیل گئیں اور روشنیوں کے بہتے ہوئے دھارے میں ایک گہرا سیاہ جسم ابھر آیا۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ وہ جست کی کوئی مورتی ہے لیکن اسے متحرک دیکھ کر فوراً مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ چوبیس پچیس سال کی ایک سیاہ فام لڑکی تھی' فرگوسن کی خادمہ۔ فرگوسن نے اسے آواز دی۔ "الفتی۔"

"صاحب! حضور!" فوراً اس کی آواز گونجی۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے فرگوسن رنگوں کے کھیل کھیل رہا ہو۔ الفتی کے گٹھے ہوئے سیاہ جسم پر پڑتی ہوئی روشنی میں اور زیادہ چمک پیدا ہو گئی۔ اُسے دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ اندھیرے میں بجلی کی روشنی اتنی تیز کیوں ہوتی ہے۔ وہ نائلون کی بنی ہوئی سرخ ڈورے والی سیاہ ساٹن کی ساڑی

پہنے ہوئے تھی اور کندھے تک کٹے ہوئے بلاؤز کے باہر اس کے سڈول اور دل موہ لینے والے بازو جھول رہے تھے۔ اوپر اٹھے ہوئے جوڑے میں سرخ پھول ٹنکے تھے۔ میری نظر اس کے سینے کی تمیں بھی ٹٹول گئی۔ میں نے سینڈی صاحب کی کوٹھی میں بھی ایک دیسی خادمہ دیکھی تھی لیکن اس کی تو بات ہی اور تھی۔

فرگوسن نے مجھ سے کہا۔ "اچھا' اب تم جا سکتے ہو۔ مجھے ذرا ایک جگہ جانا ہے۔" میں پھاٹک کھول کر باہر نکل آیا۔

راستہ چلتے چلتے یکایک میں نے سوچا' جب سورج غروب ہوتا ہے تو سرخی اور سیاہی کی آمیزش سے جو رنگ بنتا ہے' کیا وہ بھی الفتی کی طرح رنگین ہوتا ہے؟

پھر ایک روز اومیو بابو نے بڑی گرم جوشی سے ایک خبر سنائی۔ "شہنشاہ بابر نے فقیری لے لی ہے اور دنیا تیاگ دی ہے۔"

میں نے کہا۔ "پہیلی نہ بجھایئے' قصہ کیا ہے' وہ بتایئے۔"

اومیو بابو کے دوست صداقت علی نے دھیرے سے ہنس کر چٹکی لی۔ "افریقہ فرنٹ سے رومیل کی فوج پیچھے ہٹ رہی ہے اس لیے ہٹلر اتنا مصروف ہے کہ اومیو بابو کو اصل خبر اب تک نہیں بھیج سکا ہے۔"

اس قسم کے مذاق سے اومیو بابو عموماً خفا نہیں ہوتے تھے لیکن آج بگڑ گئے۔ "تم جیسے چھوٹا پونی کے منہ سے ہٹلر کا نام اچھا نہیں لگتا۔"

صداقت نے کہا۔ "یہ تو ٹھیک ہے لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم گستاپو کے ممبر تو نہیں ہو؟"

بات کا رخ پلٹتے دیکھ کر میں نے کہا۔ "جنگ کی باتیں رہنے دو' اومیو بابو شہنشاہ بابر کی بات کر رہے تھے' اس کا کیا ہوا؟"

اومیو بابو نرم پڑ گئے۔ "وہ بات یہ سننا چاہے گا تب نا بھائی! تم تو سمجھ دار آدمی ہو' ایک کپ چائے کا آرڈر دو تو بتاؤں۔"

چائے آتے ہی جلدی سے چسکی بھر کر انھوں نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "برکت نوکری چھوڑ رہا ہے۔"

میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں؟"

اومیو بابو نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "اس کی بیوی نے اسے چھوڑ دیا ہے۔"

"چھوڑ دیا ہے؟"

"بات کچھ ایسی ہی ہے۔" انھوں نے کہا۔ "اور اگر ... بات جاننا چاہتے ہو تو میں کہوں گا کہ وہ فرگوسن کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے۔" میری نگاہوں کے سامنے الفتی کا ... داغ چہرہ گھوم گیا' تو گویا وہ برکت کی بیوی ہے؟ ... اومیو بابو نے کہا۔ "فرگوسن نے برکت سے ایک خادمہ ... کرنے کے لیے کہا تھا' برکت اپنے لالچ پر قابو نہ پا ... نے سوچا' اگر بیوی ملازمت کر لے تو کیا حرج ہے' آمدنی ... جائے گی۔ یہ اسی کا انجام ہے۔"

"بھلا اس بات پر بھی کوئی ملازمت چھوڑتا ہے اور ... اختیار کرتا ہے؟" میں نے کہا۔

اومیو بابو نے ترچھی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ "تمھاری کیا محبت کی شادی ہے؟"

"نا۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر زیادہ سمجھنے کی کوشش مت کرو۔" اومیو بابو ہنسنے لگے۔

فرگوسن دو روز عدالت نہیں آیا۔ معلوم ہوا کہ اس کی طبیعت خراب ہے' کوٹھی میں بیٹھ کر ہی عدالت کر رہا ہے۔ مجھے کئی ضروری کاغذات پر دستخط کروانے تھے اس لیے ... میں حاضری لگا کے میں سیدھا اس کی کوٹھی کی طرف بھاگا۔ اس کی کوٹھی میں کندھوں تک اونچا لکڑی کا پھاٹک تھا۔ سنتری کے پھاٹک کھولتے ہی میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ گھاس کے سبز چبوترے پر ایک جھولے میں الفتی پینگیں لے رہی تھی۔ آج وہ ڈھاکے کی سفید جام دانی کی ساڑی پہنے ہوئے تھی جس پر سیاہ اور سرخ پھول کڑھے تھے' اس کی پیشانی پر ایک بڑا سا سرخ ٹیکا تھا اور پشت کی طرف لمبے لمبے بال سفید ساڑی پر لہرا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ایک دم بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس کے زینے کے نیچے پہنچتے ہی فرگوسن کی آواز ابھری۔ "سوئی!" ہال کمرے کے دروازے پر فرگوسن نمودار ہوا' اتنی دیر میں الفتی زینہ چڑھ کر دروازے تک پہنچ چکی تھی۔

دو ہاتھ اس کی طرف پھیلے اور اسے دبوچ لیا۔ الفتی سہمی ہوئی آواز میں چیخی۔ "پیش کار۔" فرگوسن نے اسے چھوڑ دیا۔

میں پھاٹک کے پاس کھڑا تھا۔ فرگوسن زینہ پھلانگتا ہوا نیچے آیا۔ اُس نے جلدی سے فائل لے کر کھڑے کھڑے تمام کاغذات پر دستخط کیے اور ایک لفظ کہے بغیر واپس برآمدے میں چلا گیا۔

اس کے بعد فرگوسن اور الفتی کتنی ہی بار میری نظروں کے سامنے آئے، کبھی ایک ساتھ کار میں بیٹھے ہوئے، کبھی شام کے اندھیرے میں ساتھ ساتھ جھولا جھولتے ہوئے۔ شہر بھر میں ان کے معاشقے کی خبر پھیل گئی تھی لیکن فرگوسن واقعی بڑا دلیر آدمی تھا۔ اسی طرح ایک سال گزر گیا۔

ایک دن خبر ملی کہ فرگوسن کی ترقی ہو گئی ہے اور وہ رنگ پور یا دیناج پور جا رہا ہے۔ اس خبر سے پورے شہر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ہم لوگ بھی خوش تھے۔ فرگوسن کی جگہ ایک بنگالی افسر وجے اچاریہ آ رہا تھا۔

دوسری صبح وجے اچاریہ چارج لینے آیا۔ اسی شام فرگوسن رخصت ہو رہا تھا۔ الوداعی محفل کا انتظام زور و شور سے ہو رہا تھا۔ فرگوسن نے مجھے بلا بھیجا۔ میں نے جا کر دیکھا، وہ آرام کرسی پر لیٹا ہوا مغربی موسیقی سُن رہا تھا۔ میں ایک کرسی کھینچ کر اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ دھیرے سے مسکرایا۔ "خلیفہ! تم تو بہت خوش ہو گے؟"

"کیوں سر؟"

"اس لیے کہ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔"

"نہیں تو۔" میں نے کہا۔ "آپ کا یہ خیال غلط ہے۔"

"غلط نہیں، صحیح ہے۔ تم جو کچھ بھی کہو، حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہو ورنہ الفتی میرے ساتھ جانے پر رضامند کیوں نہیں ہے؟"

میں نے حیرت آمیز اُلجھن سے پوچھا۔ "الفتی کہاں نہیں جا رہی جناب؟"

"میرے ساتھ۔"

میں نے ہمّت کر کے کہا۔ "شاید وہ آپ کے وقار کے خیال سے نہ جانا چاہتی ہو۔"

فرگوسن کو غصّہ آ گیا۔ "ایسا نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ سوچتی ہے، میرا نشہ ایک دن اُتر جائے گا اور میں شادی کر کے میم لے آؤں گا، اُس وقت اس کی کیا حیثیت ہو گی؟ اسی لیے وقت سے پہلے وہ اپنا گھر بسا لینا چاہتی ہے اور وہ بھی کس کے ساتھ، معلوم ہے؟ میرے سنتری کے ساتھ۔" میں نے اُس سے پوچھنا چاہا "تو اس میں کیا بُرائی ہے؟" فرگوسن نے میرے دلی تاثرات بھانپ لیے۔ اس نے کہا۔ "یہ صحیح ہو یا غلط، لیکن ایک بار وہ میرے ساتھ بیٹھ گئی ہے تو اب میں اُسے نچلی سطح پر نہیں اُترنے دوں گا، اب اس کا اُترنا میرے اُترنے کے برابر ہے۔ برطانوی گورنر یہاں سے جاتے وقت اپنے پالتو گھوڑے کو گولی کا نشانہ بنا کر کیوں مار ڈالتا ہے، جانتے ہو؟"

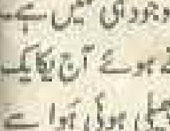
"نہیں سر!" میں نے جواب دیا۔

فرگوسن نے موسیقی بند کر دی۔ "جانے دو، یہ بات تمھارے جاننے کی ہے بھی نہیں، اگر تم سے ہو سکے تو تم الفتی کو سمجھا دو۔ میں نے اسی لیے تمھیں بلایا ہے۔"

دوسرے دن خبر ملی کہ فرگوسن اپنے سنتری کی گولی کا نشانہ بن گیا ہے۔ سنتری الفتی کو لے کر فرار ہو رہا تھا لیکن فرار ہو نہیں سکا، گرفتار کر لیا گیا۔ اُس نے پولیس کے سامنے اعترافِ جرم بھی کر لیا۔ اُس نے پولیس کو بیان دیا کہ فرگوسن کو اسی نے گولی ماری ہے مگر ایسا اس نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔ اس نے بتایا کہ "واقعے کی رات یکایک الفتی کی چیخ پکار سن کر میں دوڑتا ہوا وہاں پہنچا تو فرگوسن کے ہاتھ میں بھری ہوئی بندوق تھی اور الفتی اس کی زد پر کھڑی خوف سے کانپ رہی تھی، اسی وقت یکایک میرے ہاتھ سے لبلبی دب گئی۔"

مجھے یکایک فرگوسن کی بات یاد آ گئی کہ برطانوی گورنر یہاں سے جاتے وقت اپنے پالتو گھوڑے کو گولی کا نشانہ بنا کر کیوں مار ڈالتا ہے۔

میں نہیں جانتا کہ کیوں مار ڈالتا ہے، اس کا جواب خود فرگوسن دیتا، لیکن اب تو وہ اس دنیا میں موجود ہی نہیں ہے۔ پھر بھی اُس کی قبر کے قریب سے گزرتے ہوئے آج یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے قبر کے گرد پھیلی ہوئی ہوا سے جھومتی ہوئی گھاس سرگوشیوں میں اس بات کا جواب دے رہی ہو۔





[illegible]

سندھ ہی سے سندھی زبان کے سرمایۂ ناز ادیب
محمد ابراهیم جویو کی تحریر دل پذیر:
ایک بھکاری کی کہانی' اس کی بھی ایک شناخت تھی
دوسرا رنگ

زندگی کی سب رحم چکی میں پس پس کر شام کی شفیق فضا میں آزادی میں برنس گارڈن کی سیر، وہ بھی بہار کے موسم میں [illegible] انسان کا ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ سارا دن دانہ [illegible] مارے مارے، زمین سے دور بھاگتے بھاگتے [illegible] پرندے گھر [illegible] درختوں پر بسیرا کرتے ہیں۔ رات کے چار پہر ہر ایک کو کہیں نہ کہیں کسی [illegible] کی لوٹ میں آرام کے لیے ٹھکانا مل ہی جاتا ہے۔ اداس زندگی کے دکھوں بھرے دن کی یہ [illegible] آخری ہوتی ہے جیسے ایک [illegible] ورق الٹ دیا ہو۔

[illegible] سے مغرب کی طرف [illegible] کرنے سے [illegible] کی طرف جاتی ہے [illegible] کی [illegible] شریف [illegible]

کی چوکھٹ پر ختم ہوتی ہے۔ سامنے پانچ منزلہ بلڈنگوں کی تین قطاریں چپ چاپ ایک دوسرے کو گھورتی دوسری طرف سے ایک لوڈ روڈ (آئی آئی چندریگر روڈ) سے مل جاتی ہیں۔ ان بلڈنگوں میں پہلے تو دوسرے رہتے تھے مگر پاکستان بننے کے بعد وہ ہندوستان چلے گئے اور ہندوستان سے ایسے ہی دوسرے خدا کے بندے کچھ تو زبردستی دھکیلے ہوئے اور کچھ شوق سے آکر ان بلڈنگوں میں آباد ہو گئے۔ [illegible] کالج کے برابر والی مسجد بھی انہی ایمان والوں کے جذبۂ بندگی کا نتیجہ ہے ورنہ اس مقام پر پہلے برنس گارڈن کی نرسری ہوا کرتی تھی۔

گزشتہ ماہِ رمضان، بہار کے موسم ہی میں وارد ہوا تھا۔ اس بابرکت مہینے کی پچھلی تاریخوں میں، ایک شام برنس گارڈن کی سیر کر کے جیسے ہی میں باہر نکلا ویسے ہی سامنے فٹ پاتھ پر خانہ بدوش گیدڑی کا ایک آٹھ دس برس کا معصوم بچہ دکھائی دیا۔ پشت برہنہ، جسم مٹی اور میل میں لتھڑا، کمر

محمد ابراہیم جویو، پیدائش، ۱۹۱۵ء، گوٹھ آباد، تیرتھ لکی، تعلقہ کوٹری، صوبۂ سندھ، تعلیم بی، اے، بی، ٹی، ایس ٹی کالج، بمبئی، سندھی زبان کے مایۂ ناز محقق، مورخ، تعلیمات داں، سماجیات داں، ادیب اور دانش ور۔ زندگی بھر قلم سے واسطہ رہا ہے۔ بے شمار، سیکڑوں کی تعداد میں مختلف موضوعات پر مضامین، کتابوں کے پیش لفظ اور تبصروں کے علاوہ عالمی اور مقامی ادب پر مشتمل ۱۶کتابیں بھی تصنیف و تالیف اور ترجمہ کی ہیں۔ بیاسی سال کے یہ صوفی منش آج بھی علم و فن کی نشوونما، ترویج و توسیع میں جوانوں کی طرح سرگرم و مستعد ہیں، ان دنوں سندھی ادبی بورڈ کے چیرمین ہیں۔ سندھی کی نصابی کتابوں کی ازسرنوترتیب و تدوین میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔ مختصر کہانیوں میں شاہ کار کہانیاں تخلیق کی ہیں اور دریا رواں ہے۔ عاشقان سب رنگ کے لیے جناب محمّد ابراہیم جویو کی ایک نہایت مختصر کہانی سات رنگوں کے اس انتخاب میں شائع کی جارہی ہے۔ اسے دیکھیے اور جویو صاحب کی درازیٔ عمر کے لیے دعا کیجیے۔

اور ہاں، **افطاری** کے انتخاب میں تعاون کے لیے سندھ کے نوجوان ادیب سلیم انور عبّاسی کا شکریہ بھی واجب ہے۔ مدیر

سے ران تک چندی چندی شلوار کیچڑ میں لت پت۔ اُس شام وہ اس خواب آور فضا میں اپنے کسی معذور رشتے دار کو لکڑی کی گاڑی میں دھکیلتا لے جارہا تھا۔ گاڑی میں پڑے معذور کی دل نچوڑنے والی فریاد آج بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ "میں بھوکا لاچار ہوں...... بابا دے جا اللّٰہ کے نام پر...... میں بھوکا لاچار ہوں...... بابا۔"

مغربی کونے سے مڑ کر جیسے ہی پانچ دس قدم آگے بڑھا تو سامنے کی بلڈنگوں کے کسی دین دار گھرانے کا ایک خوش لباس صاف ستھرا بارہ چودہ سال کا رحم دل لڑکا دونوں ہاتھوں میں شائستگی سے ڈھکا ہوا کھانا لیے سامنے نظر آیا۔ یہ کھانا شاید خوش بخت روزے داروں کو ہی نذر کیا جاتا تھا۔ مگر روزہ کھلے کافی وقت ہوچکا تھا اور نمازی مسجد سے نکلنے ہی والے تھے۔ چلتے چلتے لڑکا کھانے سمیت معذور کے پاس آکھڑا ہوگیا۔ غریب بچّے نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے۔ لڑکے نے کہا "کیوں نہیں برتن نکال تو تجھے دوں۔"

برتن کا نام سن کر اور گاڑی کو وہیں چھوڑ کر بچّہ پیچھے دوڑا۔ وہ خوشی میں ایسا بھاگا جارہا تھا کہ ایڑیاں کنپٹی سے لگ رہی تھیں۔ بس ہوا ہی ہوگیا۔ معذور کی فریاد بند ہوگئی۔

اچانک سامنے سے کوئی چلّایا۔ "طفیل او طفیل کسی مسلمان کو افطاری دے بدبخت!" طفیل کا مسلمان باپ مسجد سے دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا اور گھر کی طرف جاتے ہوئے طفیل کو پاپ کرتے پکڑ لیا تھا۔

تھوڑی دور ایک مسلمان بڑھیا فقیرنی کھڑی تھی۔ وہ خود کو حق دار سمجھ کر انتہائی یقین کے ساتھ سرک سرک کر قریب ہوئی۔ اِدھر گیدڑی کا بچّہ بھی پیالہ ہاتھ میں اٹھائے ایک سانس میں دوڑتا واپس آرہا تھا۔ اتنے میں طفیل کا باپ تیز تیز بڑھ کر جائے واردات پہنچا اور اپنے بیٹے کے ہاتھ سے کھانا جھپٹ لیا اور سارے کا سارا مسلمان بڑھیا کے کشکول میں ڈال دیا۔ گیدڑی بچّے نے خالی برتن اٹھا کر سامنے کیا۔ "صاحب تھوڑا سا کھانا مجھے بھی دیں۔" اور قدموں میں جو معذور پڑا تھا اس نے فریاد کی۔ "یہ بھوکا لاچار۔ بابا۔ دے کچھ اللّٰہ کے نام پر۔"

طفیل اور طفیل کا باپ تو چلے گئے۔ اُن کے پیٹھ موڑتے ہی بوڑھی فقیرنی نے کشکول میں ہاتھ ڈال کر جو کچھ ملا تھا۔ وہ بس بھر کر خشکا ایک ڈوئی سالن کی، قیمے کی ایک ٹکیا اور مٹھائی کا ایک لڈو سب میں سے آدھوں آدھ گیدڑی بچّے کے پیالے میں ڈال دیا اور بچّے کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیر کر اپنے رستے پر چل دی۔

اس انسانی ہم دردی سے مجھے خوشی ہوئی، انسانیت کے اس جذبے نے مجھے سرشار کردیا اور کملائی ہوئی زندگی بہار کا نیا لباس پہن کر ایک دفعہ پھر میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔



مداوا

ایک دل بستہ و دل برشتہ عورت کی کہانی،
وہ ایک دن بھی اپنے محبوب کی جدائی برداشت نہ کر سکی۔
امریکہ کے انگریزی کی ایک تازہ اور تند و تیز تحریر۔
ارسکن کالڈویل [illegible] محمد مشتاق راج پوت
تیسرا رنگ

[illegible] کی آخری رسوم ادا ہو چکیں تو تعزیت کرنے والے [illegible] رخصت ہو گئے۔ اب ہم دونوں گھر میں اکیلے تھے۔ وہ [illegible] تھی۔ میں نے اب تک اس سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ میرے پاس وہ الفاظ ہی نہیں تھے جو اس کی [illegible] سے اس کی شادی کو محض ایک [illegible] ابھی کم عمر تھی اور شادی شدہ دکھائی نہیں [illegible] معصوم نظر آ رہی تھی۔ [illegible] مسلسل باہر دیکھ رہی تھی۔ [illegible] لگتا تھا مگر مجھے [illegible]
وہ [illegible] مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سیاہ پتھر کا مجسمہ ہو۔ اس کی خاموشی اداسی کو اور گمبیر کر رہی تھی۔ میں بھی دکھی تھا۔ فنے میرا اکلوتا دوست اور واحد قریب ترین رشتے دار تھا۔ اس کی وفات کے بعد میں بھری دنیا میں تنہا رہ گیا تھا۔ اب صرف فنے کی بیوہ ایسی ہستی تھی جسے میں اپنی رشتے دار کہہ سکتا تھا۔

اس کا نام تھانیا تھا لیکن میں نے ابھی تک اس کا نام اپنی زبان سے ادا نہیں کیا تھا۔ مجھے اس کا نام پکارنے میں جھجک ہو رہی تھی۔ میں اپنی دانست میں ایک ایسا اجنبی تھا جسے اس نے اپنا نام لینے کی اجازت نہ دی ہو۔ میں اس کے لیے اور اس گھر کے لیے اجنبی تھا۔ یہ اس کا گھر تھا۔ اس کے شوہر کا گھر تھا۔ میری دوستی اور رشتے داری تو فنے سے

تھی اور اس کی موت کے بعد اس گھر سے یہ تعلق بھی ختم ہو گیا تھا تاہم مجھے احساس تھا اور شاید اُسے بھی خیال تھا کہ ہم دونوں زیادہ دیر ایک دوسرے سے بات کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ضروری تھا کہ ہمارے درمیان ایک سمجھوتا ہو جائے جس سے ہم دونوں کی حیثیت اس چھت کے نیچے متعین ہو سکے۔

میری خواہش تھی کہ اسے دلاسا دوں مگر میری زبان پر گویا مہر لگی ہوئی تھی۔ میں نے یہ بھی چاہا کہ اپنی زبان سے کچھ نہ کہوں' بس خاموشی سے اپنا ہاتھ اس کے لرزتے کندھے پر رکھ دوں۔ مجھے احساس تھا کہ اس وقت اُسے ایک غم گسار کی ضرورت ہے مگر میں اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکا۔ رات کی تاریکی ہمارے درمیان دیوار بنی رہی۔

رات کا ایک پہر خاموشی سے گزر گیا۔ وہ فنلے کے ساتھ گزارا ہوا خوش گوار وقت فراموش کرنے کی اذیت سے گزر رہی تھی اور شاید یہ سمجھ رہی تھی کہ وہ فنلے کی یادوں کے ساتھ گھر میں بالکل تنہا ہے اسی لیے میرے اُٹھنے پر وہ بری طرح چونک گئی۔ میں اس کے کندھے پر ہاتھ نہیں



رکھ سکا۔ یہاں آنے سے پہلے میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ فنلے کے گھر میں تانیسا نام کی ایک حسین و جمیل لڑکی رہتی ہو گی اور جب میں اُس سے ملوں گا تو وہ بیوہ ہو گی۔

وہ چونک کر پلٹی تھی کہ اندھیرے کے باعث اس کا ہاتھ میز پر رکھے ہوئے پھولوں سے ٹکرا گیا۔ لوگ یہ پھول فنلے کی قبر پر رکھنے کے لیے لائے تھے۔ پھول بکھرنے سے ان کی خوشبو پھیلی اور ہم دونوں کو فنلے کی موت کا احساس دلا گئی۔ اس نے سسک کے سرگوشی کی۔ "تم نے فنلے کے خرگوشوں کو کھانا دے دیا؟"

"ہاں"۔ میں نے کہا۔ "میں نے خرگوشوں کو وہ سب کچھ کھلا دیا ہے جو فنلے اپنے ہاتھ سے کھلاتا تھا۔" وہ اس طرح خاموش ہو گئی گویا اب اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ رہا ہو۔ اندھیرا کمرے میں پوری طرح آ گیا تھا مگر اس کے سنہرے بال اور چہرہ اندھیرے میں نمایاں تھے۔ ہاں' اس کے سیاہ ماتمی لباس کی وجہ سے اُس کا بدن اندھیرے کا حصّہ بن گیا تھا۔ مجھے غور سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کمرے میں چاند اُتر آیا ہو۔ اس کے بکھرے بکھرے بال دیکھتے ہوئے میرے ذہن پر کوئی خوش نما منظر ابھرنے لگا۔ میں نے تصور میں دیکھا کہ اس کی زلفیں فنلے کے شانوں پر بکھری ہوئی ہیں' پھر زلفوں نے اس کا چہرہ اپنے اندر چھپا لیا۔

تصور پھیلتا چلا گیا جیسے ساکت جھیل میں بارش کے قطرے دائرے بناتے چلے جاتے ہیں۔ میں نے اسے فنلے کے ساتھ خلوت میں دیکھا پھر مجھے اس کے لباس کی سرسراہٹ سنائی دینے لگی اور دبی دبی ہنسی کانوں میں کھنکھنانے لگی۔ چند لمحوں کے لیے موت کے سنّاٹے پر زندگی غالب آ گئی۔ میرا دل چاہا کہ اس سے کہوں' میں وہ سب کچھ محسوس کر رہا ہوں جو تمھارے دل پر گزر رہی ہے' مجھے بھی تمھارے مانند یقین نہیں آ رہا کہ کل تک اس کمرے میں زندگی مچلتی تھی۔ مگر میں کچھ نہیں کہہ سکا۔ کچھ باتیں صرف محسوس کرنے کی ہوتی ہیں' انھیں الفاظ کا لباس نہیں پہنایا جا سکتا۔

ہم دونوں خاموش تھے۔ رات دھیرے دھیرے اپنے پَر

[illegible] رہی تھی۔ میں یہ نہیں دیکھ سکا کہ وہ معاً کس طرح
[illegible] اور خواب گاہ میں چلی گئی۔ البتہ میں نے اس کے
[illegible] کی سرسراہٹ سے اندازہ لگایا کہ وہ خواب گاہ کی
طرف جا رہی ہے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا اب اس کی
[illegible] میں گم ہو گئی ہے۔

میں اٹھا اور اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر اندازے سے خواب گاہ کی طرف بڑھا۔ خواب گاہ کا فرنیچر بھی میرے لیے مانوس تھا۔ میں ایک کرسی کے قریب پہنچ کر ٹھٹک گیا۔ اگرچہ میرے قدموں نے کوئی آہٹ نہیں ہونے دی تھی پھر بھی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ میری آمد پر چونک پڑی ہے۔ میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ اب میں منتظر تھا کہ وہ اپنی خاموشی توڑے گی اور محض اتنا کہے گی کہ "نکل جاؤ۔" اور مجھے واپس ہونا ہو گا پھر اس سے صبح ملاقات ہو گی، مگر اس [illegible] رہا، خاموشی نہیں ٹوٹی۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور خواب گاہ کی کھلی کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ باہر گہرا اندھیرا تھا۔ وہ تاریکی میں [illegible] نظریں جمائے کھڑی رہی۔ میں سوچ رہا تھا، اب یہ کہے گی کہ میں اسے تنہا چھوڑ دوں اور باہر جاتے ہوئے خواب گاہ کا دروازہ بند کر دوں مگر اس کی زبان گنگ [illegible]۔ وہ جانتی تھی کہ مجھے جانے کا حکم دیتے ہی وہ کمرے میں اکیلی رہ جائے گی، اس کمرے میں ایک موت ہو چکی ہے اس لیے اسے اندھیرے اور تنہائی سے ڈر لگ رہا تھا۔ مجھے [illegible] نے ایک بار اپنے خط میں لکھا تھا کہ تھانیسا اس کے بغیر ایک رات بھی تنہا نہیں گزار سکتی۔ یہ اس کمرے میں [illegible] ایک سال سے ہے۔ اس ایک سال میں ایک رات [illegible] نہیں گزری جب [illegible] اس کے ساتھ نہ رہا ہو مگر [illegible] چھوڑ گیا ہے۔ آج میں اس کے ساتھ [illegible] میں جانتا تھا کہ یہ غریب کتنی [illegible] جاتے ہی اس کے منہ [illegible]

[illegible]

شادی

دبئی کے مرحوم حکمران شیخ راشد بن سعید المکتوم کے بیٹے محمد کی شادی مئی ۱۹۸۱ میں ہوئی۔ شادی کی تقریبات ایک ہفتے تک جاری رہیں۔ تقریبات کے لیے ایک خصوصی اسٹیڈیم تعمیر کیا گیا تھا جس میں بیس ہزار مہمان ٹھہرانے کے انتظامات کیے گئے تھے اس موقع پر تقریباً دو کروڑ بیس لاکھ پونڈ خرچ ہوئے۔

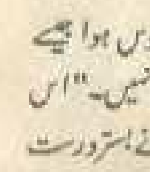
[illegible] سے فرخ مہدی کی سوغات

اس بت میں جنبش ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ سسک رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک بچی کے مانند بلک بلک کے رونے لگی۔ میں اس کے رونے کی آوازیں سنتا رہا پھر وہ خاموش ہو گئی اور اس نے اچانک اٹھ کر ایک جھٹکے سے کھڑکی کے پٹ بند کیے اور دوبارہ بستر پر گر پڑی۔ چند لمحوں بعد اس کا ہاتھ پلنگ کے پاس رکھی ہوئی سنگھار میز سے ٹکرایا۔ میز پر رکھا ہوا بالوں کا برش فرش پر آ رہا۔ میں ساکت کھڑا تھا۔ اسی حالت میں نہ جانے کتنی رات گزر گئی۔ آخر میری زبان میں حرکت ہوئی۔ "شب بخیر تھانیسا!"

"نہیں۔" وہ خوف زدہ ہو گئی، ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دل میں خنجر اتار دیا گیا ہو۔ "نہیں، نہیں۔" اس کی دوسری کراہ میں بہت کرب تھا۔ پھر اس نے بستر درست کیا اور آدھا بستر خالی چھوڑ کر لیٹ گئی۔

"اوہ اوہ۔" میرے ذہن میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ اس کے ہاتھ میں تکیہ تھا، وہ چھوٹ کر فرش پر گر پڑا، تکیہ فرش پر گرنے کی آہٹ سناٹے میں میری سماعت کے لیے ایسی تھی جیسے جنگل میں کوئی تناور درخت اپنی جڑوں سے اکھڑ کے گر پڑا ہو۔

اندھیری رات نے خواب گاہ اپنی آغوش میں لے لی۔



پارٹیشن

ہندوستان کے ہندی کے ممتاز داستان گو سوہیم پرکاش کی
ایک تازہ اور نقش گر تحریر۔
ایک بے زمین کی کہانی، وہ بار بار راستہ بھٹک جاتا تھا،
مگر ٹوکنے والے بھی کم نہ تھے۔
ہمارے آج کی ایک کہانی

آپ قربان بھائی کو نہیں جانتے؟ قربان بھائی اس قصبے کے سب سے شان دار شخص ہیں۔ قصبے کا دل ہے آزاد چوک' اور عین آزاد چوک پر قربان بھائی کی چھوٹی سے کرانے کی دکان ہے۔ یہاں ہر وقت سفید قمیص پاجامہ پہنے دو دو چار چار آنے کا سودا سلف مانگتے بچوں بڑوں کی بھیڑ میں گھرے قربان بھائی آپ کو نظر آجائیں گے۔ بھیڑ نہیں ہوگی تو اکڑوں بیٹھے کچھ لکھتے ہوں گے۔ بار بار موٹے فریم کا چشمہ انگلی سے اوپر چڑھاتے اور ماتھے پر بکھرے آوارہ ادھ کچرے بال دائیں یا بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں پھنسا کر پیچھے درست کرتے۔ اگر آپ یہاں سے سودا لینا چاہیں تو آپ کا سواگت ہے۔ سب سے واجب دام اور سب سے زیادہ صحیح تول اور خالص چیز۔ جس چیز سے انھیں خود تسلی نہیں ہوگی' کبھی نہ بیچیں گے۔ کبھی دھوکے سے دکان میں آبھی گئی تو چاہے پڑی پڑی سڑ جائے' آپ کو صاف منع کردیں گے۔ مرچ؟ آپ کے لائق نہیں ہے' رنگ ملی ہوئی آگئی ہے۔ تیل؟ مزے دار نہیں ہے' کڑوا تیل ملا ہے' دیا بتی کے لیے چاہیں تو لے جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ ایک بار جو یہاں سے سامان لے جاتا ہے' دوسری بار اور کہیں نہیں جاتا۔ یوں چاروں طرف بڑی بڑی دکانیں ہیں۔ سندھیوں کی' مارواڑیوں کی' قربان بھائی کا مطلب ہے ایمان داری۔ قربان بھائی کا مطلب ہے ادھار کی سہولت اور بھروسا۔

لیکن ایک بات کا دھیان رکھیے گا۔ جو سامان لے جا رہے ہیں اس کا لفافہ یا تھیلی دیکھے بغیر مت پھینکیے۔ ممکن ہے' اس پر کوئی خوددار یا خوں خوار شعر لکھا ہو۔

جانے کتنے لوگ ان سے کہہ کہہ کر ہار گئے کہ گلے میں ایک کاپی رکھ لیں' شعر ہوتے ہی فوراً اس میں درج کرلیں۔ قربان بھائی سنتے ہیں' قائل بھی ہوجاتے ہیں جو چیزیں کھو گئیں' ان پر دکھی بھی ہوتے ہیں' پر کرتے وہی ہیں۔

میرا بھی اس شان دار آدمی سے اسی طرح تعارف ہوا۔ دفتر سے لوٹتے ہوئے قربان بھائی کی دکان سے کوئی چیز لے کر گھر آیا' لفافے پر لکھا تھا

فقط پاسِ وفاداری ہے ورنہ کچھ نہیں مشکل
بجھا سکتا ہوں انگارے' ابھی آنکھوں میں پانی ہے

اور یہ آدمی آج بھی چار چار آنے کے سودے تول رہا ہے اور کیوں تول رہا ہے' اس کی بھی ایک کہانی ہے۔

قربان بھائی کے والد کا اجمیر میں رنگ کا لمبا چوڑا کاروبار تھا۔ دو بڑے بڑے مکان تھے' حویلیاں کہنا چاہیے۔ نیا بازار میں خوب بڑی دکان تھی۔ بارہ نوکر تھے۔ گھر میں بگھی تو تھی ہی' ایک "بے بی آسٹن" بھی تھی جو "سیر" کے لیے جانے کے کام آتی تھی۔ مختصر خاندان تھا۔ والد' مولانا آزاد کے شیدائیوں میں سے تھے۔ بڑے بڑے لیڈر اور شاعر گھر آکر ٹھہرتے تھے۔ قربان بھائی اس وقت علی گڑھ یونی ورسٹی میں پڑھ رہے تھے۔ نہ مستقبل کی فکر تھی نہ بڑھاپے کا ڈر۔ مزے سے زندگی گزر رہی تھی۔ عشق' شاعری' ہاسٹل' خواب!

تبھی پارٹیشن ہوگیا۔ دنگے ہوئے' دکان جلادی گئی۔ رشتے دار پاکستان بھاگ گئے' دو بھائی قتل کردیے گئے۔ والد نے صدمے سے کھٹیا پکڑلی اور مرگئے۔ نوکر گھر کی پونجی لے کر بھاگ گئے۔ بچے کھچوں کو لے کر اپنی جان



جوتھان نگ • ترجمہ • رفیق احمد نقش

[illegible] قربان بھائی ناگور چلے گئے۔ وہاں سے میرٹھ [illegible]
[illegible] لوگ۔ کہاں جائیں؟ کہاں سر چھپائیں؟ کیا پاکستان
چلے جائیں؟ نہیں گئے۔ کیوں کہ جوش نہیں گئے۔ کیوں
[illegible] کیوں کہ قربان بھائی کو اچھے لگنے والے
[illegible] گئے تو قربان بھائی کیوں جاتے؟
[illegible] بیچنے لائق چیزیں سب بک
[illegible] نہیں ملی' جو اس دور
[illegible] مشکل تھا۔ اگر کوئی جانتے
[illegible] اگر ایک [illegible] کے ہاں
[illegible] ایمان
[illegible] کے سبب
[illegible]

جلد ہی نکال دیے گئے لیکن مالک ہونے کا گھمنڈ ایک بار ٹوٹا تو ٹوٹتا چلا گیا۔ حالت یہ تھی کہ ہندوؤں میں بٹنے کی کوشش کرتے تو شک شبے کی برچھیوں سے چھید چھید دیے جاتے اور مسلمانوں میں کھپنے کی کوشش کرتے تو لیگیوں کے مذہبی جنون کا جواب دیتے دیتے ٹوٹ ٹوٹ ہی جاتے۔ مزدوری تک' حمالی تک' چھوٹی موٹی کاری گری تک' نئے نئے کام سیکھے۔ مجبوری سکھا ہی دیتی ہے۔ سائی کل کے پنکچر جوڑے' چھوں کنستروں کی جھالن لگائی' تالے' چھتریاں' لالٹینیں ٹھیک کیں۔ چیزوں کی رنگائی کا کام کیا۔ ہاتھی دانت کی چوڑیاں کاٹیں۔ شہر در شہر۔ اب حملہ فرقہ وارانہ جنون کا نہیں'

مشین کا ہو رہا تھا۔ جو چیز پکڑتے، دھیرے دھیرے ہاتھ سے پھسلنے لگتی۔ دھکے کھاتے پتہ نہیں، کب کیسے اس قصبے میں آ گئے اور ایک بزرگ نمازی مسلمان سے پچاس روپے اُدھار لے کر ایک دن یہ دکان کھول بیٹھے۔ طویل داستان صرف اپنی سہولت کے لیے چند الفاظ میں نبٹا دینا نہ صرف زیادتی ہے بلکہ اس جدوجہد کی تذلیل اس کا مذاق اُڑانے جیسا بھی ہے۔ پر کیا کروں، کہانی جو کہنے جا رہا ہوں، دوسری ہے!

دکان ذرا جمتے ہی قربان بھائی نے اخبار خریدنا اور رسالے منگانا شروع کر دیا۔ رٹھیا ہو گیا، پہننے کو دو جوڑی کپڑے ہو گئے، روٹیشن چل گیا، گاڑی جم گئی تو آگے خواہش کون سی تھی؟ بچے کوئی جنے نہیں تھے، شوق، موج، سیر سپاٹا بھول ہی چکے تھے۔ میاں بیوی دو جنوں کے لیے اللہ کا دیا بہت کچھ تھا۔ رسالے کیوں نہ منگاتے؟ اور اس وقت کوئی رسالہ آتا تو بک پوسٹ ہو یا وی پی، اسے لینے قربان بھائی خود پوسٹ آفس پہنچ جاتے۔ رسالہ بڑے جتن سے سنبھال کر رکھتے اور اس کا صفحہ صفحہ، حرف حرف چاٹ جاتے، کئی کئی بار۔ جیسے کسی بھوکے پیاسے کو چھپن کھانے مل گئے ہوں۔ ادب سے اب بھی اسی طرح محبت کرتے ہیں۔ رسالے منگا کر، خرید کر پڑھتے ہیں اور ان کی فائل حفاظت سے رکھتے ہیں۔

اسی سلسلے میں ان کے جوہر ظاہر ہونے لگے۔ لوگوں نے دیکھا، یہ شخص کبھی جھوٹ نہیں بولتا، اسگی چار سو بیسی نہیں کرتا، کم نہیں تولتا، کبھی کچھ نہیں کرتا، گندے مذاق نہیں کرتا، ادب سے بولتا ہے اور آڑے وقت پر ہر ایک کے کام آتا ہے۔ ہر کام میں اس کے ایک ثقافت، ایک تہذیب جھلکتی ہے۔ اسی لیے دھیرے دھیرے قصبے میں حیثیت بننے لگی۔ اچھے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہونے لگا۔ صاحبِ حیثیت لوگ دعا سلام کرنے لگے۔ بیوپاریوں کے یہاں شادی بیاہ کچھ ہوتا، ان کے کارڈ آنے لگے۔ مسحور ہو کر پرندے کے پاس پرندے بھی آنے لگے۔ اب قربان بھائی انھیں چائے پلا

رہے ہیں اور دکان داری چھوڑ کر غالب پر بحث کر رہے ہیں۔

آہستہ آہستہ قربان بھائی کی دکان پڑھے لکھوں کا اڈا بن گئی۔ لیکچرر، استاد، صحافی، پڑھنے لکھنے والے۔ شام ہوتے ہی قربان بھائی کی دکان قہقہوں اور بحثوں سے گل زار ہو جاتی۔ قربان بھائی آداب عرض کرتے، چائے والے کو چائے کے لیے آواز لگاتے اور ٹاٹ کی کوئی بوری نکال کر چبوترے پر بچھا دیتے۔ دکان داری بھی چلتی رہتی، بحثیں بھی، قہقہے بھی اور بیچ بیچ میں وہ اس میں بھی جھجک نہ کرتے کہ کسی کو چھابڑی پکڑا کر دور رکھے تھیلے سے کلو بھر ثابت مرچ بھرنے یا فلاں کنستر سے پسے نمک کی تھیلی نکال دینے یا دس چیزوں کا ٹوٹل ملا دینے جیسا کام پکڑا دیں۔ بڑا مزے دار منظر ہوتا کہ لیکچرر سڑک پر کھڑا پھنک پھنک کر لہسن کے چھلکے اُڑا رہا ہے یا مقامی اخبار کا نامہ نگار اکڑوں بیٹھ کر چبوترے کے نیچے رکھی بوری سے ملتانی مٹی نکال رہا ہے یا تاریخ کا سینیئر استاد......

ہم لوگوں کے میل جول سے قربان بھائی بدلنے لگے۔ انھیں پہلی بار محسوس ہوا کہ ان کی ایک ادبی شخصیت بھی ہے۔ ہم نے ان سے اردو سیکھی، ان کی لائبریری ترتیب دی جو کافی بڑی ہو گئی تھی۔ رسالوں کی جلدیں بنوائیں اور اس لائبریری کا خوب فائدہ اُٹھایا۔ ہم لوگ قربان بھائی کو پکڑ پکڑ کر مشاعروں، نشستوں میں لے جانے لگے۔ ہم نے انھیں ایسے رسالے دکھائے جو اُنھوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے ایسے ادیبوں شاعروں کے بارے میں بتایا جو صرف اُن کی آرزو ہی میں تھے، ایسے شاعروں کی تخلیقات سنائیں جو ساقی شراب وغیرہ کو کب کا الوداع کہہ چکے تھے اور ایسے سیاست دانوں سے ان کا تعارف کرایا جن کے بارے میں انھوں نے اب تک صرف اُڑتی اُڑتی باتیں سنی تھیں۔ ان کے دماغ میں بھی کافی مذہبی کباڑ بھرا ہوا تھا۔ شروع سے خبردار ہونے کے باوجود ہم جھاڑو لے کر پل پڑے، ہم نے انھیں اخبار اور وچار کا چسکا لگا دیا، اس سے پہلے کسی نے

ایسا کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔
نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ہفتے میں ایک روز چھٹی رکھنے لگے۔ رات کو کھانے کے بعد ہمارے ساتھ گھومنے جانے لگے۔ اپنے ماضی کے بارے میں سوچ سوچ کر غصے میں بھرے رہنے کے بجائے مستقبل کی طرف دیکھ کر کبھی کبھی چہکنے بھی لگے اور ہمارے نزدیک سے نزدیک تر ہونے لگے۔ ایک نئے قسم کا لونڈ پن ان پر چڑھنے لگا۔ انھیں ہماری لت پڑنے لگی۔ وہ ہر شام ہمارا انتظار کرتے اور ہم نہ پہنچ پاتے تو وہ خود ہمارے گھر آجاتے۔
اب ہوا یہ کہ قصبے کی شریف اور نام وَر شخصیت ہونے کی قربان بھائی کی شہرت سے ہمیں چاہے فائدہ نہ ہوا ہو' ہماری بدنامی کی لپیٹ میں وہ بھی آنے لگے۔ جس مقدار میں قربان بھائی کا جو وقت ہمیں ملتا' اسی مقدار میں وہ ان کے پرانے دوستوں لطیف صاحب' حاجی صاحب' امام صاحب وغیرہ کے حصے سے کم ہو جاتا۔ نماز پڑھنے وہ صرف جمعے کو جاتے تھے' اب وہ بھی بند کردیا۔ وعظ وغیرہ میں چلنے کو کوئی پہلے بھی انھیں نہیں کہتا تھا' اب بھی نہیں کہتا۔ مدرسے کو پہلے بھی چندہ دیتے تھے' اب بھی دیتے۔ ہاں کبھی کبھی ہونے والے سیاسی جلسوں میں جانے کو اور قصبے کی سیاست میں دل چسپی لینے کو ان کے لیے خطرناک سمجھ کر برادری والے انھیں ٹوکنے ضرور لگے۔ 'پالیٹیکس اَپن لوگوں کے لیے نہیں ہے' سمجھے؟ چپ چاپ سالن روٹی کھاؤ اور اللہ کا نام لو۔ چین سے جینا ہے تو ان لفڑوں میں مت پڑو۔ بے کار کبھی دھر لیے جاؤگے' ہمیں بھی پھنسواؤ گے۔ اب یہاں رہنا ہے تو پانی میں رہ کر مگرمچھوں کو منہ چڑانے سے کیا فائدہ؟
لیکن اپنی مستی میں مست تھے ہم لوگ۔ نہ ہمیں پتہ چلا نہ خود قربان بھائی کو کہ اب اُنھیں امام باڑے والے ہی نہیں' چٹیا والے بھی گھورتے ہوئے نکلنے لگے ہیں۔ شام کو ان کی دکان پر آنے والے کچھ محبِّ وطن قسم کے لوگوں کی مستقل غیر حاضری کا مطلب بھی ہم نے نہیں سمجھا' اس لیے آخر وہ واقعہ ہوگیا جس نے یہ کہانی ایک

ایسے قابلِ نفریں مقام تک پہنچادی جو مَن کو کڑواہٹ سے بھر دیتا ہے۔

ایک دن دوپہر کی بات ہے، ایک بیل گاڑی والے نے ٹھیک اُن کی دکان کے سامنے گاڑی روکی، بیل کھولے اور گاڑی کا اگلا حصّہ قربان بھائی کے چبوترے پر ٹکا دیا۔ گاؤں سے آنے والے اسی چوک میں اپنی گاڑیاں کھڑی کرتے ہیں، بیل کھولتے ہیں اور انھیں چارا ڈال کر اپنا کام نپٹانے چلے جاتے ہیں۔ شام کو لوٹتے ہیں اور جوت کر چلے جاتے ہیں۔ لیکن وہ گاڑی کسی کی دکان کے عین سامنے کھڑی نہیں کرتے اور کسی چبوترے پر رکھنے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا۔ اس شخص نے تو اس طرح گاڑی کھڑی کی تھی کہ اب کوئی گاہک قربان بھائی کی دکان تک پہنچ ہی نہیں سکتا تھا بلکہ وہ خود بھی پڑوسی کے چبوترے سے گزرے بغیر نیچے نہیں اُتر سکتے تھے۔ گاڑی والا وکیل لوکھ چند کا مزارع تھا اور قربان بھائی کو معلوم تھا کہ ابھی یہ گاڑی کھڑی کرکے گیا تو شام ہی کو لوٹے گا۔ قربان بھائی نے اس سے گاڑی ذرا بازو میں کھڑی کرنے اور بیل کنارے باندھ دینے کو کہا۔ اس نے سُنی اَن سُنی کردی۔ قربان بھائی نے پھر کہا تو ایک نظر انھیں دیکھ کر اپنے رستے چل پڑا۔ قربان بھائی نے خود اُٹھ کر چبوترے پر ٹکے اس کی گاڑی کا اگلا چھور اُٹھایا اور گاڑی دھکیل کر.... لیکن تبھی اس آدمی نے قربان بھائی کا گریبان پکڑ لیا اور گالیاں بکنے لگا اور قربان بھائی کا چشمہ نوچ لیا اور دھکا مکی کرنے لگا۔ ٹھیک اسی وقت کورٹ سے لوٹتے ہوئے وکیل لوکھ چند اِدھر سے گزرے اور انھوں نے آواز مار کر پوچھا۔ "کیا ہوا رے گومیا؟"

گومیا بولا۔ "ممنے کوٹے!" یعنی مجھے مار رہا ہے۔

وکیل لوکھ چند نے پوچھا۔ "کون؟"

گومیا بولا۔ "یہ میاں!"

قربان بھائی سُن رہ گئے۔ بات سمجھ میں آتے آتے اندر تک ہچ مچا گئے۔ آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ وہیں زمین پر اکڑوں بیٹھ گئے اور سر پکڑ لیا۔ اندھیرے کا ایک ٹھوس گولا کلیجے سے اُٹھا اور حلق میں آکر پھنس گیا۔ برسوں سے تھمی رلائی ایک پڑنے کو زور مارنے لگی۔ یہ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ انھیں جاننا نہیں؟ ایک ہی منٹ میں وہ "... سے "میاں" کیسے بن گئے؟ ایک منٹ بھی ... برسوں سے پَل پَل مرکر جو عزت انھوں نے ... ہر پَل جیسے ایک آتشیں امتحان سے گزر کر ... پیار حاصل کیا، ہر دن خود کو سمجھا کر کہ پاکستان ... کوئی نوالی نہیں مل جاتی، یہیں بہت مست ... سب دیکھتا ہے۔ جانے دو جوش کو، ڈوبنے دو ... بھلا دینے دو دوستوں کو، لُٹ جانے دو کاروبار ... بدمعاشوں کے قبضے میں چلی جانے دو حویلیاں، ... رہنے دو بھائیوں کی قبریں، دفنا دو بھرے پُرے ... خواب۔ شاید کبھی پھر اپنا بھی دن آئے تب تک ... کرلو۔ کیا کیا قیمت روز چکا کر قصبے میں تھوڑا سا ... تھوڑا سا سماجی تحفظ، تھوڑی سی خود اعتمادی، تھوڑی ... نرمی انھوں نے حاصل کی تھی اور کتنی بڑی دولت ... رہے تھے اسے، اور لو اپل پَل کرکے بنا پہاڑ ایک ... میں اُڑ گیا! ایک جاہل آدمی! لیکن جاہل وہ ہے یا میں۔ ... ایک منٹ میں قربان بھائی سے میاں ہو جاؤں گا، یہ ... سوچا کیوں نہیں؟ اپنی محنت کا کھاتے ہیں۔ پھر بھی ... لوگ ہمیں اپنی چھاتی پر بوجھ ہی سمجھتے ہیں۔ یہ بات ... نظر کیوں نہیں آئی؟ پاکستان چلے جاتے تو لاکھ ... برداشت کرلیتے، کم سے کم ایسی اوچھی بات تو نہیں ... پڑتی۔ حیف ہے! پھٹکار ہے! لعنت ہے ایسی زندگی پر۔ اللہ! اللہ!

وکیل لوکھ چند گومیا مزارع کو سمجھاتے بجھاتے ساتھ لے گئے۔ گاڑی بیل وہیں چھوڑ گئے۔ اڑوسیوں پڑوسیوں نے قربان بھائی کو سنبھالا۔ اُن کی گھگھی بندھ گئی تھی اور ہونٹوں کے کونوں سے جھاگ نکل رہے تھے۔ لوگوں نے گاڑی بیل ہٹائے۔ قربان بھائی کو چبوترے پر لٹایا، ہوا دی، منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیے۔ انھیں کیا معلوم کہ قربان بھائی کے اندر کیا ٹوٹ گیا ابھی ابھی جسے انھوں نے اتنے برس نہیں ٹوٹنے دیا تھا۔ اندر کی

چوٹ دکھائی دیتی ہے۔

لوگ اکٹھے ہو گئے۔ سارے قصبے میں خبر پھیل گئی۔ جس جس کو معلوم ہوتا گیا' آتا گیا۔ ہم لوگ بھی پہنچے۔ اب بیسیوں لوگ تھے اور بیسیوں باتیں۔ کافی دیر بھنتانے چیمہ کرنے کے بعد طے ہوا کہ یہ بدتمیزی' چپ چاپ برداشت نہیں کرنا چاہیے۔ تھانے میں رپٹ لکھوانی چاہیے۔

لہٰذا چلا جلوس تھانے۔ پر راستے میں کسی کو پیشاب لگ گیا' کسی کو ہگاس۔ تھانے پہنچتے پہنچتے صرف ہم لوگ رہ گئے قربان بھائی کے ساتھ۔

تھانے دار نہیں تھے۔ ابھی ابھی موٹر سائیکل لے کر کہیں نکل گئے تھے۔ منشی نے رپٹ لکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ کیوں نہ کرتا؟ تھانے دار کے پاس پہلے ہی وکیل لوکھ چند کا ٹیلی فون آچکا تھا۔ وکیل لوکھ چند قوت پارٹی کے ضلع منتری تھے۔ قربان بھائی کون تھے؟ یہ لوگ کون تھے؟

آدھے گھنٹے تک جھت اور ڈیڑھ گھنٹے تک تھانے دار کا انتظار کرنے کے بعد اپنا سا منہ لے کر لوٹ آئے شام کو پھر آئیں گے۔ شام کو ہم لوگوں کے سوا وہاں پر کوئی نہیں پہنچا۔

اور ہم لوگوں کے ساتھ تھانے چلنے کا ذرا بھی تردد قربان بھائی نے نہیں دکھایا۔ دکان داری نے انھیں جیسے ایک دم مصروف کر دیا جیسے ہم سے بات کرنے کا بھی وقت نہیں۔

ایک احساسِ جرم کے تحت ہم بھی قربان بھائی سے کٹے کٹے رہنے لگے۔ حالانکہ بات اتنی بڑی نہیں تھی کہ طول دیا جائے۔ تھانے دار تو کیا' کوئی بھی ہوتا۔ خود پولیس والے پولیس کے چکر میں پڑنے کے بجائے جو ہو گیا' اسے ایک جاہل آدمی کی حماقت مان کر بھول جانے کو تیار ہو جاتا' پر ہم...... ہمیں لگ رہا تھا' ہمارے دوست پر حملہ ہوا اور ہم کچھ نہیں کر سکے' کسی کام نہیں آسکے۔ یہ بھی لگ رہا تھا کہ زیادہ تردد دکھایا تو قربان بھائی کے لیے اور مصیبتیں کھڑی ہو جائیں گی' ہم کچھ نہیں کر پائیں گے۔ یہ بھی لگ رہا تھا کہ جو ہوا' اس میں پولیس سے دخل اندازی اور مدد کی امید بے کار ہے، اس کا مقابلہ سیاسی سطح پر کیا جا سکتا ہے، اس کے لیے جلد از جلد اپنی قوت بڑھانی چاہیے، پانچ سے پچاس ہو جانا چاہیے۔

لیکن یہ سب بہانے بازی تھی۔ سچ یہ ہے کہ ہم نے قربان بھائی کو ایک دم اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ شاید ہم ان کی تکلیف شیئر کر ہی نہیں سکتے تھے، پر ہمیں کوشش ضرور کرنی چاہیے تھی۔

قربان بھائی کی دکان پر کئی دن پہلے کا سا زگمٹ دار مجمع نہیں ہوا، وہ بجھے بجھے سے رہتے تھے، بہت کم بولتے اور ہمیں دیکھتے ہی دکان داری میں مصروف ہو جاتے۔ وہ گھٹ رہے تھے اور گھل رہے تھے پر کھل نہیں رہے تھے۔

ہم انھیں نہیں کھول پائے۔ ایک دن جب میں پہنچا میری طرف ان کی پیٹھ تھی، کسی سے کہہ رہے تھے "آپ کیا خاک ہسٹری پڑھاتے ہیں؟ کہہ رہے ہیں پارٹیشن ہوا تھا ہوا تھا نہیں، ہو رہا ہے، جاری ہے۔" اور مجھے دیکھتے ہی چپ ہو کر کام میں لگ گئے۔

اس کہانی کا انجام اچھا نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے نہ پڑھیں، اور پڑھیں تو یہ ضرور سوچیں کہ کیا اس کا کوئی اور انجام ہو سکتا تھا؟ اچھا انجام؟ اگر ہاں تو کیسے؟

بات بس یہ بچی ہے کہ کئی دن بعد جب ایک دوپہر میں آزاد چوک سے گزر رہا تھا، جس کا نام اب بجے چوک کر دیا گیا ہے اور وہ جمعے ہی کا دن تھا، میں نے دیکھا کہ قربان بھائی کی دکان کے سامنے لطیف بھائی کھڑے ہیں اور قربان بھائی دکان میں تالا لگا رہے ہیں، اور انھوں نے ٹوپی پہن رکھی ہے۔ اور پھر دونوں مسجد کی طرف چل دیے ہیں۔





پانچواں رنگ

ایک عورت کی داستان، وہ ساری زندگی ایک غیر مرد کو تکتی رہی

ہنگری سے ایک نرم و نازک تحریر

لاڈیوش بیرو ⊕ نذیر الحسن انصاری

ویانا Vienna کی سڑکوں پر موسم بہار کی تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ شو سلز خاندان کے تینوں لڑکے تھیٹر آرکسٹرا میں کام کرتے تھے، وہ ایک ساتھ تھیٹر سے باہر نکلے۔۔۔ انھوں نے سردی سے بچنے کے لیے کوٹ کے کالر چڑھا لیے اور بجھے بجھے، تھکے تھکے، اداس اداس گھر کی سمت چل دیے۔

گھر میں انھیں ماں ملی، ان کی اپنی ماں ایک نحیف و نزار، دل شکستہ، بوڑھی اور ستائی ہوئی مظلوم عورت لیکن اس نے انتہائی شفقت کے انداز میں ان کے اوور کوٹ تھام لیے پھر ان کے لیے رات کا کھانا لانے باورچی خانے میں چلی گئی۔

شو سلز خاندان کے تینوں لڑکے نگاہیں جھکائے بہت اداس اور بے حد مغموم سے بیٹھ گئے۔ "پاپا ابھی تک گھر نہیں آئے؟" رودلف نے اچانک اپنے دانت پیستے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں۔ وہ ابھی نہیں لوٹے۔" اس کی ماں نے ڈرائے ہوئے انداز میں دھیرے سے جواب دیا۔ رودلف نے کھانا شروع کر دیا۔۔۔

ماں نے ذرا توقف کیا، اس امید پر کہ شاید وہ کچھ اور پوچھے یا اس کا کوئی دوسرا بیٹا کچھ کہے۔ مگر ہمیشہ کی طرح اس کے کسی بیٹے نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ مایوس ہو کر بالکل قابلِ رحم حالت میں سر جھکائے دوبارہ باورچی خانے میں چلی گئی۔

تینوں بیٹے مکمل خاموشی کی بوجھل فضا میں کھانا ختم کرنے

1824 کی ایک رات، ویانا کے شہریوں کے سامنے ایک عظیم موسیقار اپنے فن کا جادو جگا رہا تھا۔ اس کی نو تخلیق نویں سمفنی ایوان رقص میں گونج رہی تھی۔ یہ نئی طرز ترنم سب کے لیے ایک حیرت تھی۔ آزمودہ سازوں کی ترکیب و ترتیب سے تخلیق پانے والے راگ نے سامعین سے ان کا اختیار چھین لیا تھا۔ ایوان کے بام و در بھی جیسے سازوں کے ہم نوا بن چکے تھے۔ سارا ماحول مرتعش تھا۔ ہر شخص ایوان میں گونجنے والے سُروں کا حصہ بن چکا تھا۔ سب کسی طلسم کے اسیر تھے۔ موسیقار ان سب سے بے نیاز، اپنے سازندوں کو مخصوص انداز میں ہدایات دے رہا تھا۔ ساز خاموش ہوجانے پر ایوان میں سناٹا چھا گیا۔ سامعین کو اس ہیجان انگیز کیفیت سے باہر آنے میں کچھ مہلت چاہیے تھی۔ چند لمحوں کے اضطراب آمیز سکوت کے بعد تحسین و آفریں کا شور بلند ہوا، لوگ اپنی نشستوں سے اٹھ گئے اور دیر تک ایوان تالیوں سے گونجتا رہا۔

آج کی طرح یہ دستور کل بھی تھا۔ اختتام نغمہ پر داد و تحسین کے جواب میں موسیقار سامعین کی طرف منہ کرکے تعظیماً سر جھکا کے شکریہ ادا کرتے تھے مگر اس رات اس شائستگی کی پیروی میں موسیقار کو خاصی دیر لگ گئی۔ پھر اسے خیال آیا اور اس نے سیدھے ہو کے سر جھکا کے اپنے بے قرار سننے والوں کا شکریہ ادا کیا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیسی والہانہ صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ وہ تمتماتے چہروں اور تالیاں بجانے کی حرکات سے سامعین کے خراج تحسین کی شدت کا ایک اندازہ کرسکتا تھا۔ وہ سماعت سے محروم تھا۔

اور وہ دنیا کا ایک سنگ میل، صد ساز موسیقار تھا۔ اس کا نام اپنے زمانے کے سحرکاروں میں تھا، آج دو صدیاں گزر جانے کے بعد بھی معتبر و محترم، زندہ و تابندہ ہے۔ موسیقی میں اس کا مقام اور اعزاز اسی کو سزاوار ہے۔ اس کی ترتیب دی ہوئی دُھنوں کی فہرست طویل ہے۔ کتنے پیانو اور وائلن سوناٹا، کتنے آرکسٹرا کنسرٹو اس کی اختراع ہیں اور اس کی نو سمفنیاں عالم موسیقی میں نوادر کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اصل نام لڈوگ وان تھا۔ بتھوون کے خاندانی نام سے مشہور ہے۔ 16 دسمبر 1770ء جرمنی کے شہر بون میں پیدا ہوا۔ آبائی مشغلہ و پیشہ ہی موسیقی تھا۔ دادا، گلوکار، پیانو نواز، درباری موسیقار اور ایک ذہین خلیق آسودہ حال شخص تھا۔ دادا کا اکلوتا بیٹا، بتھوون کا باپ جوہان بھی گلوکار تھا اور موسیقی میں اچھا درک رکھتا تھا۔ باپ کے مقابلے میں بیٹا دربار میں زیادہ قدم نہیں جما سکا۔ وہ شراب سے عشق کرتا تھا اور یہ عشق شاید کسی کو راس نہیں آتا۔ ایک باورچی کی بیٹی ماریا میگڈالینا سے شادی کی، سات بچوں کا باپ بنا، صرف تین زندہ رہ سکے۔ بتھوون سب سے بڑا تھا۔ سارا گھر، خاندان کے سربراہ کی بلا نوشی کی زد پہ آگیا تھا۔ پہلے جمع پونجی گئی، پھر باپ کی جائداد ٹھکانے لگی اور نوبت فاقہ کشی

کی کوشش کرتے رہے۔ اس کے بعد فرانز نے اپنے لمبے بالوں پر بے کلی سے ہاتھ پھیرا اور ایک لمبی سانس لی۔ "میں اب اور زیادہ برداشت نہیں کرسکوں گا۔"

میکس میلین نے اپنا شیر ببر جیسا بھاری بھرکم سر گھمایا۔ "میں اب یہاں سے چلا جاؤں گا۔" اُس نے بھرّائے ہوئے مگر انتہائی سنجیدہ لہجے میں کہا۔ اُس کے لہجے میں درد کی گہری ٹیس تھی۔

"مِل کے پاس نشیب میں ایک اچھا سا کمرہ ہے، وہ مکان نان بائی کا ہے اور اُس کی بیٹیاں بھی حسین ہیں۔ میں وہاں جا رہوں گا۔" روڈولف نے اعلان کیا۔

"تو پھر ہم بھی وہیں چلیں گے۔" میکس میلین نے اصرار کیا۔

اپنے خیالوں میں گُم وہ کھانا زہر مار کرتے رہے۔ کھانا ختم کرنے سے ذرا پہلے انھوں نے اپنے باپ کی آواز سُنی، اس لیے جلدی جلدی کھانا ختم کرکے وہ تیزی سے اپنے کمروں میں چلے گئے اور چپ سادھ کر اپنی چارپائی پر دراز ہوگئے۔

اُن کے والد مسٹر شوسلو شہنشاہ کے دربار کے سُبک روش پیغام رساں تھے۔ وہ مضبوط قدموں کی دھمک کے ساتھ آہستہ آہستہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ آج شام وہ اپنے خاص دوستوں کے ساتھ پیرس میں ہونے والے انقلاب کے متعلق دیر تک گفتگو کرتے رہے تھے۔ گفتگو کے دَوران ان لوگوں نے انقلاب کی جی بھر کے مذمت کی تھی اور انقلابیوں کو خوب کوسا تھا۔ اس گفتگو نے شاہی دربار کے سابق خدمت گزار کو اس قدر مشتعل کردیا تھا کہ اس نے معمول سے کہیں زیادہ شراب ڈکار لی تھی اور اب وہ ڈرائنگ روم کی طرف قدم بڑھاتا ہوا بکتربند توپوں کی طرح خاصی گڑگڑاہٹ اور گھن گرج کے ساتھ چل رہا تھا۔

اُس کے میز پر بیٹھنے سے قبل ہی اُس کی بیوی کھانا لے کر حاضر ہو گئی پھر بھی وہ خواہ مخواہ تیوریاں چڑھا کر بھونڈے انداز میں بھن بھنانے لگا۔ "اگر میں بھوکا مرجاؤں تو تمھیں خوشی ہی ہوگی؟ یقیناً! بے شک۔ تمھاری تو دیرینہ آرزو پوری ہو جائے گی۔ تمھارا تو یہی دل چاہتا ہو گا کہ تم مجھے

اس کے بعد بیتھوون کا تعلیمی سلسلہ بھی کٹتا رہا۔ کم عمری ہی میں باپ سے پیانو اور وائلن بجانا سیکھ لیا تھا۔ روزی کا بھی کچھ سہارا تھا۔ باپ کی خواہش تھی کہ بیٹا نام ور موسیقار موزارٹ کی ترتیب دی ہوئی دھنوں پر حاوی ہو جائے لیکن بیتھوون شروع ہی سے خود سر تھا۔ اس کے وائلن بجانے کا انداز بھی روایتی نہیں تھا۔ روایت سے انحراف اور صبح و شام سخت ریاضت اور نئی نئی طرزیں وضع کرنا اس کا شیوہ تھا۔ بارہ سال کی عمر میں وہ بون کے مشہور آرگن نواز کرسچن گوٹ لیب نیفے کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ 14 سال کی عمر میں اسے دربار میں رسائی کا موقع مل گیا اور یوں گھر کے معاملات کسی طرح درست ہو گئے۔ پھر سترہ سال کی عمر میں وہ کسی طرح اپنی منزل مقصود ویانا کے سفر میں کامیاب ہو گیا۔ ویانا اس زمانے میں مغربی موسیقی کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ وہاں اس نے شہرۂ آفاق موزارٹ کے روبرو کچھ بجایا۔ موزارٹ نے موسیقی سے اس کی وابستگی اور جنون دیکھ کے پیش گوئی کی تھی کہ اس نوجوان میں ایک عظیم موسیقار کی تمام علامتیں موجود ہیں۔ بیتھوون نے موزارٹ سے استفادے کا آغاز کیا تھا کہ بستر مرگ پر پڑی ماں کی علالت کی خبر سنتے ہی اسے بون واپس آنا پڑا۔ پاؤں والے ... یہ گھر بھی کیسی زنجیر ہوتے ہیں۔ ماں زندہ نہ رہ سکی۔ بے کار باپ، دو چھوٹے بھائی، اب سارا گھر بیتھوون کو چلانا تھا۔

گھر کی نگہداشت کے ساتھ اس نے موسیقی کی شاعری ترک نہیں کی۔ بہت سے ثقہ موسیقاروں کو اس کی روایت شکنی سے ملال تھا مگر بیتھوون کا یہ انداز اس کی شناخت بن گیا۔ روز بہ روز اس کے عشاق میں اضافہ ہوتا رہا اور یہ دل چسپ صورت بھی ممکن ہوئی کہ اس کی محفل میں شرکت عزت و افتخار کا موجب سمجھی جانے لگی۔ امرا میں بہ طور خاص اس کے مداحوں کا وسیع حلقہ بن گیا تھا۔ وہاں کے ... خاندان نے ایک طرح اس جواں سال موسیقار کو اپنا لے پالک بنا لیا تھا۔ ڈاکٹر ایف جی ویگلر اس پر جان سے نثار تھا اور ... انہیں تو عاشقی کی حد تک اس کا پرستار تھا۔ انہی دوستوں کی سفارش پر حکومت نے اسے دوبارہ شہر موسیقی ویانا بھیج دیا اور مستقل ایک وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔ اسی عرصے میں موزارٹ دنیا سے رخصت ہو چکا تھا مگر اب شاید بیتھوون کو موزارٹ کی رہبری کی ایسی ضرورت بھی نہیں رہ گئی تھی۔ اس نے خود راستے تلاش کر لیے تھے بلکہ وضع کر لیے تھے۔ تاہم کسب علم کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ 1792ء میں 22 سال کی عمر میں وہ ویانا پہنچا تو اشرافیہ نے خوب پذیرائی کی۔ بیتھوون کو قرار نہیں تھا۔ اس نے ویانا کے مشہور موسیقی کاروں کی خدمت میں حاضری دی۔ وہ فرانز جوزف ہیڈن کے پاس پہنچا۔ ہیڈن نے کسی خاص رغبت کا اظہار نہیں کیا۔ بیتھوون نے خفیہ طور پر جوہان شینک سے رابطہ قائم کیا اور بعد میں ... البرکس برگر کے ہاں رسائی حاصل کی اور ... انتونیو سیلری کے دربار موسیقی میں بھی زانوئے تلمذ تہ کیا۔

اپنے ہاتھوں سے دفن کرو، ہیں نا؟ مجھے زمین پر لٹا کر ڈھک دو۔ کیوں لیزا! یہی چاہتی ہو نا تم؟ ٹھیک یہی بات ہے نا؟ لیکن تمھاری یہ تمنا کبھی پوری نہ ہو سکے گی۔ یہ سب کچھ سوچنے سے تمھیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ سمجھیں؟ لیزا! ایک دن میں ہی تمھیں دفن کروں گا، تمھاری لاش دیکھے بغیر میں مروں گا نہیں، ہرگز نہیں۔"

سہمی سہمی، لرزتی کانپتی عورت سنی ان سنی کرتے ہوئے کھانا چننے میں مصروف تھی، بالکل قابلِ رحم، بے بس اور لاچار۔

مسٹر شولز چنگھاڑے "تم کانپ رہی ہو مگر تم اس وقت کیوں نہیں کانپیں؟ اس وقت؟ لیکن اس وقت تو عالم ہی اور ہو گا، تمھاری سیاہ کار روح اور تمھارے گناہ گار جسم، دونوں پر اس وقت لذتیت سوار تھی، ہوس ناکی کا جنون سوار تھا۔ اس وقت تم پر، تمھاری بدکار اور آوارہ روح پر ——"

بچے کی طرح لرزتی ہوئی لاچار عورت اس سے بچ کر باورچی خانے میں جانے لگی، شاید وہی اس کی جائے پناہ تھا۔ مگر وہ جا نہ سکی۔

"ٹھہر جاؤ۔" سابق درباری پیانو نواز شیر کی طرح دہاڑا۔ اس عورت کی گویا سانسیں رک گئیں۔

مسٹر شولز بے ہنگم انداز میں کھاتے رہے، جام پر جام لنڈھاتے رہے اور چیختے چلاتے رہے۔ "مجھے خوب معلوم ہے کہ تم میری نہیں مان رہی ہو لیکن تمھاری منتوں اور دعاؤں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ جو بھی چاہے کر لو، تم مجھ سے نہیں بچ سکتیں۔ تم جہنم میں زندہ جلو گی لیکن اس سے پہلے کہ میں تمھیں جہنم رسید کروں، تمھیں اپنے قانونی خاوند سے بے وفائی کرنے کا، پاکیزہ عہد وفا توڑنے کا کفارہ ادا کرنا ہی پڑے گا۔ وہ عہد توڑنے کا کفارہ، جو تم نے پاک بارگاہ کے سامنے کیا تھا اور شادی کی تمام پاکیزہ روایات توڑنے کا کفارہ، دین داری رسوا کرنے، بدعہدی اور بے وفائی کرنے کا کفارہ۔ خبردار! یہاں سے ہلنا نہیں۔ بس کھڑی رہو۔ یہ کفارہ تم گزشتہ اکتیس برس سے مسلسل ادا کر رہی ہو، آیندہ بھی ادا کرتی رہو گی۔ تمھیں تمھارے منصف کے پاس روانہ کر دوں

1796ء میں 26 سال کی عمر میں اس نے محسوس کیا کہ اس کے کانوں میں بھن بھناہٹ سی ہونے لگی ہے۔ اس کا ذکر اس نے ڈاکٹروں کے علاوہ کسی سے نہیں کیا۔ ڈاکٹروں نے اسے شور سے اجتناب کا مشورہ دیا مگر موسیقی تو آواز ہی ہے۔ وہ دنیا میں اپنے قریبی دوستوں سے پہلے کی طرح ملتا رہا، موسیقی تو اس کی زندگی تھی، وہ تو بہرے طرزیں تخلیق کرتا رہا۔ کہتے ہیں اپنا مرض وہ ایسی خوش اسلوبی سے چھپاتا رہا کہ اس کے مخلص احباب بھی اس کی گراں گوشی سے بے خبر رہے۔ دوستوں کی گفتگو میں اس کی عدم شمولیت کو کسی نے استغنا سمجھا، کسی نے اسے غائب دماغ قرار دیا۔ 32 سال کی عمر میں وہ سماعت سے یک سر محروم ہو گیا۔ خود اپنی آواز، اپنی ترتیب دی ہوئی دھنیں سننے سے محروم ہو گیا۔ اسے کوئی اور کام بھی نہیں آتا تھا۔ ساز تو اس کی عادت تھے اور ترنم تو اس کے خون میں گھلا ہوا تھا۔ اس کی انگلیاں سازوں پر مچلتی، دھڑکتی رہیں۔ مورخوں کے مطابق، اس کے باطنی اوصاف، اس کی غیر معمولی تخلیقی قوت نے اسے بے حوصلہ ہونے نہیں دیا۔ 1802ء میں وہ ایک پرسکون مقام ہیلی جین سیٹڈ منتقل ہو گیا۔ وہاں اس نے اس اذیت ناک عارضے سے متعلق اپنے کرب کا احوال رقم کیا۔ یہ تحریر اس نے بھائیوں کے لیے لکھی تھی اور تلف کر دینے کی تاکید کی تھی۔ بھائیوں نے اسے محفوظ رکھا۔ بعد میں یہ ایک دستاویز بن گئی اور دستاویز ہیلی جین سیٹڈ کے عنوان سے مشہور ہوئی۔

بنیادی طور وہ ایک رومانی اور کلاسیکی موسیقار تھا۔ اس نے بہت سی سحر انگیز دھنیں دنیا کو دی ہیں۔ ان طرزوں نے مغربی موسیقی میں انقلاب برپا کیا اور نئی جہتوں سے روشناس کرایا تھا۔ وہ صدیوں کا سفر طے کرنے کے بعد اب بھی یہ موسیقی میں مثال کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ورنم سے عاشقانہ کیفیت پیدا کرنے والے موسیقار کی اپنی زندگی رومان سے عاری تھی۔ بے شمار عورتیں اس کے قریب آئیں، کوئی بھی اس کی نہ بن سکی، طرح طرح کی روایتیں اس باب میں مندرج ہیں۔ کہتے ہیں، وہ ایک نہایت تنہا، قنوطی، اپنے آپ میں گم، ضدی اور کسی حد تک برگشتہ، ہمہ وقت متفکر، ہمہ دم برہم مزاج شخص تھا۔ کسی سے اس کی کم ہی بنتی تھی۔ بعض عورتیں اسے بدصورت کہتی تھیں، بعض، خبطی اور دیوانہ۔ اس کے ہم عصروں کے خیال میں، یہ تو اس کی افتاد طبع تھی۔ اسے اس سرکشی کی رعایت ملنی چاہیے کہ وہ ہمیں اپنے تخلیقی کمالات سے بہت شاد کام کرتا تھا۔ وہ کوئی بدطینت شخص نہیں تھا۔ کوئی برا آدمی اتنا اچھا کام نہیں کر سکتا۔ قوت سماعت سے محرومی نے بتھوون کو اور تنہا کر دیا تھا۔ اس کا مشہور زمانہ طربیہ راگ "چاندنی رات" دوشیزہ گلیتا سے منسوب ہے۔ یہ اطالوی نواب زادی حسن و جمال میں یکتا تھی۔ بتھوون کی آنکھوں میں بھی یہ دل رُبا، رہ زن بسی ہوئی تھی۔ اس کے فن کی مداح اور ممدوح سے شادی سے گریزاں دوشیزہ اس

گا لیکن موت تک میں تمھیں یہ سزا دیتا رہوں گا۔ پروردگار نے تمھیں اسی طرح سزا دینے اور اذیت پہنچانے کے لیے مجھے مامور کیا ہے۔۔۔ یہ ایک فرض مجھے سونپا گیا ہے اور میں اسے۔۔۔"

برابر کے کمرے میں تینوں بیٹے انتہائی کرب سے کروٹیں بدل رہے تھے۔ انھیں جیسے کسی خطرے کا احساس ہو رہا تھا، کسی سنگین واردات کا خدشہ تھا۔ ان کے دل دھڑک رہے تھے۔ "اب وہ بچاری کو زدوکوب کرے گا۔" رودلف بڑبڑایا۔

میکس ملی لین نے بے چینی سے کندھے اچکائے۔ "کیا اب تک تم اس بات کے عادی نہیں ہو چکے ہو؟" اس نے اداسی سے کہا۔

فرانسز کے ہونٹ دفعتاً پھڑک اٹھے۔ "بائیس برسوں سے مسلسل۔۔۔" اس نے بے بسی سے کہا۔

"اف! اتنا زمانہ گزر گیا، ماں بے پناہ غم جھیل چکی ہے لیکن اب بھی، اب بھی۔۔۔"

"ہم ساری زندگی یہ اذیت جھیلتے رہے ہیں۔" رودلف نے مشتعل ہوتے ہوئے کہا۔

"ہمیں آگے بھی یہی کچھ جھیلنا ہے۔" میکس ملی لین نے کہا۔ "ماں نے ذلت کا بدنما داغ ہماری پیشانی پر لگا دیا ہے۔"

"کیسا داغ؟ کہاں کی ذلت؟ کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے۔" فرانسز اس سے متفق نہیں تھا۔

"ہمیں تو معلوم ہے۔ یہی کافی ہے۔" میکس ملی لین کے لہجے میں خاصی تلخی اور درشتی تھی۔ وہ بستر سے اٹھ بیٹھا اور کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

ڈرائنگ روم میں سابق درباری پیغام رساں کھانا ختم کر چکا تھا اور اب اپنی بیوی کی پٹائی کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کا روز کا یہی مشغلہ تھا، جنونی اور وحشیانہ مشغلہ۔ "گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ، دو زانو۔" وہ گرجا۔ "جس خداوند سے تم نے بے وفائی اور بد عہدی کی ہے، اس کے حضور میں دونوں ہاتھ پیر جوڑ کر بیٹھ جاؤ۔۔۔ ہاں، ٹھیک ہے۔ اب بتاؤ، کیا تم اقبالِ جرم کرتی ہو کہ تم نے میرے ساتھ بے وفائی کی؟"

کے برعکس وہ اب دوری کی بجائے مستقل طور پر اپنے محبوب سے وابستگی کی آرزومند تھی لیکن بیتھوون نے خود پر جبر کیا۔ اس کا عذر تھا کہ کسی معمولی شخص کو ایک ایسی حسین لڑکی کا شوہر نہیں ہونا چاہیے۔ آسٹریا کے بادشاہ کے بھائی شہزادہ روڈولف سے بھی بیتھوون کی دوستی قائم تھی۔ آخر تک یہ تعلق قائم رہا۔

اپنے ایک بھائی کی موت پر وہ بہت آزردہ ہوا تھا۔ اس جانی بھائی کے نو سالہ بیٹے پر اس کی شفقتوں کی ارزانی کی انتہا نہیں تھی۔ کارل کا [illegible] اس نے بھتیجے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ نپولین کا بھی وہ بہت قدردان تھا۔ اس نے اپنی ایک سمفنی کو نپولین کے نام معنون کرنے کا فیصلہ کیا مگر ادھر نپولین نے بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ یہ جان کے کہ اب اس کا محور فکر سیاست وہی صرف اپنا [illegible] ہو گیا ہے، اس نے ارادہ بدل دیا اور اپنے ایک مربی شہزادہ لاب کووٹز سے یہ سمفنی موسوم کر دی۔

وہ اپنے ہم زمانہ عظیم المرتبت جرمن سخن کار گوئٹے کی تحریروں کا فدائی تھا۔ اس نے گوئٹے کا کلام اپنے فن میں سمویا۔ سازوں میں اس [illegible] کے شعروں کے معانی و مفاہیم اجاگر کرنے اور کیفیت و تاثر منتقل کرنے کا کام بیتھوون نے بڑے ذوق و شوق سے کیا تھا۔ گوئٹے کی تمثیل [illegible] کے لیے موسیقی بھی اسی نے ترتیب دی تھی۔ یہ سلسلہ جاری رہتا اگر وہ ایک دوسرے کے مشتاق دید تو ہو [illegible] 1812ء میں دونوں کی پہلی ملاقات کیمپلٹز پر تمام ہوئی۔ ایک نہایت شائستہ، دوسرا الگ مزاج تھا گو دونوں ایک دوسرے کے فن کے قائل تھے لیکن دونوں ایک دوسرے کو برداشت نہ کر سکے۔ گوئٹے نے اس ملاقات کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی صلاحیت نے مجھے حیران کر دیا لیکن مزاجاً وہ بہت مختلف ہے، شاید اس نے تہذیب سیکھی ہی نہیں۔

26 مارچ 1827ء۔ 57 سال کی عمر تک وہ بے تکان کام کرتا رہا، اور زندہ رہتا تو کیا بات تھی، پر کوئی کتنا ہی بڑا [illegible] زندگی اور موت کے معاملے میں سب کا نوشتہ ایک ہی ہے۔ کاش بعض لوگ اس تماشے سے ماورا ہوتے۔

[illegible] کے حملے سے بیتھوون جلد ہی حوصلہ کھو بیٹھا۔ وہ یکتا و یگانہ بھی ان لوگوں کی طرح چلا گیا، جو خاموشی سے آئے، خاموشی سے چلے جاتے ہیں۔ وہ تو کلام میں سب سے الگ نظر آتا تھا۔

زیر نظر کہانی بیتھوون سے متعلق ہے۔ اس موقع پر بیتھوون کے شخصی خال و خد پر مبنی یہ تعارفی تحریر، امید ہے آپ کو اس رنگ کو [illegible] کرے گی۔ مدیر

"ہاں۔" لرزتی، کانپتی نحیف و نزار عورت نے سہم کر اقرار کیا۔

"تمھارے کُل کتنے عاشق تھے اور کہاں کہاں تھے تمھارے یار؟"

"صرف ایک تھا۔ میں قسم کھاتی ہوں۔"

"یہ تم ہمیشہ کہتی ہو کہ صرف ایک تھا۔ اچھا، میں مانے لیتا ہوں مگر آج تمھیں اس ایک کا نام بتانا پڑے گا۔ بتاؤ، وہ کون تھا۔ بولو، کون تھا وہ؟"

کراہتے اور سسکتے ہوئے عورت نے نہایت آہستہ سے کچھ کہا۔

میکس ہی لیبن حیران و سراسیمہ دروازے کی اوٹ میں کھڑا کانپ رہا تھا۔ دفعتاً اس نے اپنا شیر سے مشابہ سر جھٹکا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ دروازے سے پلٹ کر وہ اپنے بھائیوں کی جانب مڑا جو بستروں پر لیٹے تھے۔ خاموش و ساکت۔ ان کے چہروں پر کرب کی گہری پرت منجمد ہو گئی تھی۔ "کیا تم نے کچھ سنا؟"

"نہیں نہیں۔" میکس ہی لیبن نے عجلت میں جواب دیا۔ روڈولف اور فرانسز اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ تینوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو مضطرب نگاہوں سے دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے گویا انگارے لپک رہے تھے۔ پھر تھوڑی دیر کے لیے وہ بالکل خاموش ہو گئے اور بے حس و حرکت وہیں کھڑے رہے۔ ان کی حالت زخمی پرندوں جیسی کسی بے بسی کی تھی۔

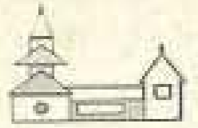
ڈرائنگ روم میں مشتعل مرد اپنی عورت کی وحشیانہ پٹائی کے لیے پر تول رہا تھا۔ اس نے پھر دریافت کیا۔ "کون تھا وہ؟ جواب دو۔" اس نے عورت کو مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔

عورت کے منہ سے ایک نام نکلا۔

اسی وقت ایک دھماکے کے ساتھ دروازے کا پٹ کھلا اور میکس ہی لیبن روندتا ہوا جنونی انداز میں بپھرا ہوا اندر گھس آیا۔ غصے میں بھرے ہوئے میکس ہی لیبن کے مضبوط ہاتھ نے اپنے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "اسے چھوڑ دو۔" میکس ہی لیبن چیخا۔ "یہ بے پناہ اذیتیں جھیل چکی ہے۔"

سب رنگ

عقیدت شعار



پرانے زمانے کا ذکر ہے۔ دوسری معاصر قوموں کی طرح ہندوؤں میں بھی مذہبی عصمت فروشی کو فروغ حاصل ہوا۔ مندروں میں سیکڑوں دیوداسیاں پروہتوں اور یاتریوں کی تسکین ہوس کیا کرتیں۔ پروہتوں نے لوگوں کو اس بات کا یقین دلا رکھا تھا کہ جو شخص اپنی بچی دیوتا کی بھینٹ کرے گا، وہ سورگ یعنی جنت میں جائے گا۔ راجے مہاراجے اور امرا اپنی بیٹیاں مندروں کے لیے وقف کردیتے۔ ان لڑکیوں کو رقص و سرود کی تعلیم دی جاتی۔ دیوداسیاں صبح و شام دیوتاؤں کی آرتی اتارتی اور گاتی بجاتی تھیں۔ [illegible] ان سے مستفید ہوتے۔ عصمت فروشی کی رقم پروہتوں کی جیب میں جاتی۔ سومناتھ کے مندر میں ہزاروں دیوداسیاں یہ کاروبار کرتی تھیں۔ مندروں کا ماحول نہایت ہوس پرور تھا۔ پروہت دیوتاؤں کی جنسی بے راہ روی کے افسانے مزے لے لے کر سناتے۔ لنگ اور یونی کے مجسمے دیوتاؤں کی طرح پوجے جاتے۔ در و دیوار پر جنسی ملاپ کے مختلف آسن پوری تفصیل سے دکھائے جاتے جنھیں دیکھ کر بوالہوسوں کو ترغیب ملتی۔ ان کے بھڑکے ہوئے جذبات کی تسکین کا وافر سامان دیوداسیوں کی صورت میں موجود ہوتا۔ یہ مقدس کسبیاں ناچتے وقت نہایت ترغیب انگیز طریقوں سے بھاؤ بتاتیں۔ دیوتاؤں کے علاوہ راجاؤں کے ذوقِ جمال کی آسودگی کے لیے راج نرتکیاں تھیں جو گانے بجانے کے علاوہ علوم و فنون میں بھی دست گاہ رکھتی تھیں۔ نرتکیوں کی تربیت کرنے والی کو نائکہ کہتے۔ نائکہ انھیں فن جذب و کشش کے دقیق نکات کی تعلیم دیتیں۔

کراچی سے جمیل احمد صدیقی کا عطیہ

"کیا میں نے تمھیں باپ کے ساتھ یہی برتاؤ کرنا سکھایا ہے؟" مسٹر شوسلز غرائے۔

"نہیں۔" میکس ملین نے کہا۔

"نہیں سکھایا مگر اب حد ہو چکی ہے، ہم بہت جھیل چکے ہیں۔" فرانسز اور رودولف بھی اندر آ گئے

مسٹر شوسلز نے اپنے بازو بیٹے کی گرفت سے آزاد کرا اور بیوی پر ٹوٹ پڑنے کے لیے سارا زور لگا ڈالا مگر میکس ملین انھیں اپنی آہنی گرفت میں جکڑے ہوئے تھا۔

"تم نے باپ پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت کیسے کی؟" شو نے کسی ناشدنی کا اشارہ دیا اور یہ جملہ پیش بندی کے طور اس کے منہ سے نکل پڑا۔ "جو اولاد اپنے باپ پر ہاتھ اٹھا ہے، وہ گناہ گار ہے۔"

"تو آپ ماں کو چھوڑ دیجیے۔"

"کیسے چھوڑ دوں۔" شوسلز بولا۔ "اس نے مقدس کے سامنے لی گئی قسمیں توڑی ہیں۔"

"تو آپ ان سے الگ ہو جاتے۔ آپ الگ کیوں نہ ہوئے؟ انھیں آپ نے چھوڑ کیوں نہ دیا؟" فرانسز غصے میں بپھرا ہوا تھا۔ "اگر آپ نے انھیں رکھا ہوا ہے تو اذیت نہ دیجیے۔"

سخت جان باپ ہر قیمت پر جرم و سزا کی ناپ تول پر مصر تھا۔ وہ بیٹوں کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے اپنے ہاتھ جھٹک پٹک رہا تھا لیکن اس کے تینوں بیٹے اُسے دبوچ کر تیسرے کمرے میں ڈال آئے اور کمرہ باہر سے مقفل کر دیا۔ بڈھے کھوسٹ شوسلز نے دو تین بار دروازے کو دھکا دیا پھر نڈھال ہو کر پڑ گیا۔ اُسے نیند بھی آ گئی۔

عورت آنکھوں میں آنسو بھرے ڈرائنگ روم کے بیچ میں کھڑی تھی۔ اُس میں جیسے ہلنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔ چہرے سے اضمحلال، بے کسی، بے بسی اور بے چارگی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ اپنے اسکرٹ کی سلوٹیں درست کرنے لگی۔ اس کے تینوں بیٹے اُس کے گرد حلقہ بنائے گہری الجھن اور انتشار کے عالم میں کھڑے تھے۔

"ماں! بیٹھ جاؤ۔" آخر میکس ملین نے کہا۔ رندھی ہوئی آواز سے اس کی پریشانی نمایاں تھی۔

"ہمارے ساتھ بیٹھ جاؤ ماں!" رودولف نے کہا۔ فرانسز نے ایک کرسی گھسیٹ کر اُس کے سامنے رکھ دی۔

اُنھوں نے ماں کو میز کے سرے پر بٹھایا اور خود بھی بیٹھ گئے۔ مگر کافی دیر تک وہ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکے۔ تینوں بیٹے اپنی ماں سے متفکر تھے۔ عجیب سی الجھن کے باعث

اختصار

دنیا کی مختصر ترین جنگ ۲۷ اگست ۱۸۹۶ کو برطانیہ اور زنجبار کے درمیان لڑی گئی تھی۔ زنجبار پہلے ایک الگ ملک تھا، اب تنزانیہ کا حصہ بن چکا ہے۔

زنجبار کے سلطان کی وفات کے بعد اس کے محل پر سلطان سعید خالد اور اس کے حامیوں نے قبضہ کر کے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا۔ زنجبار کے ساحل پر برطانوی بحری بیڑا لنگر انداز تھا، اسے یہ صورت حال قبول نہیں تھی۔ بیڑے کے سربراہ ریئر ایڈمرل ہیری راسن نے سعید خالد اور اس کے حامیوں کو الٹی میٹم دیا کہ وہ صبح نو بجے تک محل خالی کر دیں۔ دوسرے روز ساڑھے سات بجے یہ الٹی میٹم دہرایا گیا مگر کوئی رد عمل سامنے نہیں آیا۔ بعد ازاں ٹھیک دو منٹ پر بیڑے کے جہازوں ریکون، اسپیرو اور تھرش نے محل پر بم باری شروع کر دی۔ خود ساختہ سلطان سعید خالد کے توپچیوں نے کچھ دیر بم باری کا جواب دیا مگر جلد ہی ان کی توپیں خاموش ہو گئیں اور محل ریت کا ڈھیر بن گیا۔ ۴۵ منٹ بعد سعید خالد نے ہتھیار ڈال دیے اور دنیا کی یہ مختصر ترین جنگ اختتام کو پہنچ گئی۔ ہیری راسن نے حمود بن محمد کو زنجبار کا نیا سلطان بنا دیا۔ بعد میں حمود بن محمد نے اپنے محسن کو زنجبار کے سب سے بڑے اعزاز بریلینٹ اسٹار آف زنجبار سے نوازا۔

گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز سے

ماحول بوجھل تھا۔ اُن کی زبان سے، دل کی گہرائی سے ہم دردی اور درد مندی کے الفاظ ادا کرنا مشکل تھا۔ عورت نے اپنے تینوں بیٹوں کو غم ناک اور ویران دو نگاہوں سے دیکھا۔ بیٹوں نے نظریں جھکا لیں۔

آخر میکس می لین نے اپنا شیر جیسا سر اوپر اُٹھایا اور ماں سے مخاطب ہوا۔ "ماں! تم نے ابھی جو کچھ کہا ہے کیا میں نے وہ ٹھیک سنا ہے؟"

"کیوں؟"

"وہ شخص۔۔۔ اُس شخص کا نام جس کے ساتھ۔۔۔ وہ کون تھا؟ ابھی تم نے کیا نام لیا تھا؟"

عورت کی تھکی تھکی پلکیں اُس کی گیلی آنکھوں پر چھا گئیں۔ "بیتھوون!" وہ رُک رُک کر سرگوشی کے انداز میں بولی۔

تینوں بیٹوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ "کون بیتھوون؟" ایک لڑکا بہ مشکل کہہ سکا۔

عورت کی ترچھی، مضمحل، ملتجی پلکیں ایک پل کے لیے کھلیں۔ "وہ صرف ایک تھا، صرف ایک۔ دیانا کا گوہرِ یگانہ" اُس نے اسی دھیمے لہجے میں کہا۔

"لڈوگ فان بیتھوون؟" میکس می لین کے الفاظ حیرت واستعجاب میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ تقریباً چیخ پڑا۔

"ہاں! لڈوگ فان بیتھوون۔" ماں نے جواب دیا۔ "تمہیں یاد ہوگا، یہ اُس وقت کی بات ہے جب ہم ایک مکان میں رہتے تھے، بیتھوون اپنے ساتھ رہتا تھا۔ اس تعلقِ خاطر کے سبب میں نے تم تینوں کو موسیقار بنایا۔"

کمرے میں پُراسرار سناٹا طاری ہو گیا۔ بیٹے اس کاری ضرب سے سکتے میں آ گئے۔ ان کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکل رہا تھا۔ وہ اپنی ماں کے اور نزدیک کھسک آئے۔ انھوں نے ہمّت باندھی اور شرماتے ہوئے اپنی ماں کے کپڑے سہلائے۔ رودلف نے انتہائی منّت اور عاجزی کے انداز میں کہا۔ "ماں! ہمیں کچھ اور بتاؤ؟"

"ہمیں اس کے بارے میں ضرور بتاؤ۔" فرانسز نے زور دے کر کہا۔ گھنے ابروؤں والے میکس می لین نے بھی تائید سے سر ہلا دیا۔

عورت نے ان کی طرف دیکھا پھر دور کہیں خلا میں نگاہ گاڑے گھورتی رہی، پھر آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں ایک نرم سی چمک پیدا ہوئی اور وہ نحیف و نزار مگر مشفقانہ خواب ناک لہجے میں اپنی روداد سنانے لگی۔

اس کے تینوں موسیقار بیٹے سانسیں روکے اس داستان کا ایک ایک لفظ گھونٹ گھونٹ کر کے پی رہے تھے، سعادت مندی سے، اُمڈتے ہوئے عقیدت مندانہ جذبات سے لبریز ہمہ تن گوش سن رہے تھے۔



سترِ عبا

ترکستان کے ترک کا ایک مختصر مگر جاذب ستائش فکر انگیز افسانہ
ایک فلسفی کی کہانی، اس دانا و بینا کی نظر میں وہ
ایک ستر عبا ... تھا۔

چنگیز ایتماتوف ○ کرنل (ریٹائرڈ) مسعود اختر شیخ

چھٹا رنگ

ایک تھا فلسفی۔ پڑھتا کم، لکھتا زیادہ تھا بلکہ لکھنے پڑھنے سے بھی بڑھ کر وہ سوچنے کا زیادہ شوقین تھا۔ ایک دفعہ اس شخص کے جی میں آئی کہ کائنات کے راز سے پردہ اٹھایا جائے۔ اس فکر میں اس نے اپنے دن رات ایک کر دیے۔ لمبے پریشان بال، بکھری بکھری داڑھی، آنکھوں میں ایسی گہرائی جو صرف ان لوگوں کی آنکھوں میں پیدا ہوتی ہے جو دوسروں کو دکھائی نہ دینے والی دنیا دیکھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

وہ دوسرے انسانوں کے درمیان یوں اپنے روحانی دبدبے سے چلتا جیسے ہرکولیس چلا کرتا تھا۔ اسے دیکھ کر لوگ حیرت سے کہتے: "اس شخص کے پاس ضرور کوئی جادو ہے۔ اسے ہمارے بارے میں ہم سے بھی بڑھ کر علم ہے۔"

فلسفی لوگوں سے پوچھتا: "تم لوگ اس قدر بے چین کیوں رہتے ہو؟"

ہزاروں لوگ یک زبان ہو کر جواب دیتے۔ "ہمارا پیٹ

قدیم ایران کا ایک منصف رشوت لیتا تھا۔ ملک کے بادشاہ کو جب اس کی اطلاع ملی تو اس نے حکم دیا کہ منصف کی زندہ کھال کھینچ لی جائے۔ حکم کے مطابق مجرم کی کھال کھینچ لی گئی اور اسی مسند پر منڈھ دی گئی جس پر وہ بیٹھ کے عدالت لگاتا تھا۔ بعد میں بادشاہ نے متوفی منصف کے بیٹے کو اس کے عہدے پر مامور کر دیا۔

خالی ہے، ہماری روح اندھیروں میں بھٹک رہی ہے، ہمیں محبت کی تلاش ہے۔"

قلفی بولتا چلا جاتا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں شعلے بھڑکنے لگتے۔ "لوگو! اپنی نظریں اپنے دلوں کی طرف پھیر کر تاریک دل روشن کرو۔ اپنے خیالات سے اپنی روحیں گرماؤ۔ وہ قوت جو تمھاری انگلیوں میں حرکت پیدا کرتی ہے، اسی میں محبت تلاش کرو۔"

لوگ قلفی کی باتوں پر عمل کرنا چاہتے مگر انھیں کسی طرح خوشی نہ ملتی۔ وہ یہی گلہ کرتے کہ "ہمارے پیٹ خالی ہیں، ہم بھوکے ہیں، ہماری روح محبت کے بغیر اندھیروں میں بھٹک رہی ہے۔"

قلفی یہ دیکھتا کہ اس کی نصیحتیں انسانوں کے غم کا مداوا نہیں بن سکتیں تو اسے بڑا دکھ ہوتا۔ وہ کائنات کے راز سے پردہ اٹھانے کی سعی تیز کر دیتا۔

آخر لوگ اس کی لمبی لمبی تقریروں، کھوئی کھوئی نگاہوں اور غیر معجزانہ آنکھوں سے تنگ آ گئے۔ انھوں نے اس کی بات پر توجہ دینا چھوڑ دیا، یہاں تک کہ ان کی عدم دلچسپی ان کے دلوں میں نفرت کے جذبات پیدا کرنے لگی۔ وہ بڑبڑانے لگے۔ "آخر یہ شخص ہے کیا چیز؟ ہمارے سامنے لمبی لمبی تقریریں جھاڑتا رہتا ہے لیکن ہمارا مسئلہ تو خالی پیٹ کا ہے۔ اس سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔" لوگوں کی نفرت اتنی بڑھی کہ انھوں نے قلفی کو شہر چھوڑ کر جنگل میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔

قلفی نے جنگل میں پہنچ کر کائنات کے راز سے پردہ ہٹانے کی کوشش ترک نہیں کی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے یہی سوچتا رہتا۔ اس کے ذہن میں جو کچھ آتا وہ دھیمی آواز میں منہ سے بھی بڑبڑاتا رہتا۔ اس کی بڑبڑاہٹ سن کر جنگل کے کتے اس کے ارد گرد جمع ہو جاتے۔ قلفی کے اندر دبی ہوئی تقریر کرنے کی حسرت اس کی آنکھوں میں جگمگا اٹھتی۔ چناں چہ ایک روز اس نے بے بس ہو کر کتوں سے خطاب شروع کر دیا۔ "اے کتو! میری باتیں غور سے سنو۔ میری آواز تمھاری خوابیدہ روحوں میں روشنی پھونک دے گی۔ تم دنیا ایک نئے پہلو سے دیکھنے لگو گے، بلندیوں کی جانب پرواز کرنے لگو گے، ہدایت پا لو گے۔ تمھارا اکتاپن ختم ہو جائے گا، تم اس سے نجات پا لو گے۔"

کتوں نے وجد میں آ کر کان کھڑے کر لیے، دُمیں ہلانا شروع کر دیں۔ قلفی نے تقریر جاری رکھی۔ بولتا گیا، بولتا گیا اور جوش میں آتا گیا۔ کتے اس کی آواز کے جادو سے کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہروں کے تاثرات سے پتہ چلتا تھا کہ وہ قلفی کی تقریر کا ہر لفظ سمجھ رہے ہیں۔ قلفی کہہ رہا تھا۔ "اے کتو! اپنے جسم کی قید سے اپنے آپ کو آزاد کر لو۔ کائنات کا راز سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم اسی راز کا ایک حصہ ہو۔"

معلوم ہوتا تھا کہ ابھی کوئی معجزہ ظہور پذیر ہو گا اور کتے قلفی کی باتوں کا جواب دیں گے لیکن قادر مطلق کو قلفی کی یہ مافوق الفطرت طاقت ایک آنکھ نہ بھائی۔ کتے قلفی کی باتوں سے متاثر ہو کر قوتِ ناطقہ حاصل کرنے ہی کو تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ جنگل میں اتارا، اس نے آتے ہی ایک ہڈی کتوں کے سامنے پھینک دی۔ ہڈی پھینکنا تھا کہ قلفی کے تمام سامعین کی جبلت عود کر آئی اور وہ سب ہڈی پر پل پڑے۔ قلفی اکیلا تقریر کرتا رہ گیا۔

ہڈی پر لپکتے، غراتے اور آپس میں الجھتے کتوں کو دیکھ کر آخر قلفی مسکرایا اور بے ساختہ اس نے یہ نعرہ مارا۔ "پالیا، پالیا! میں نے کائنات کا راز پالیا۔ وہ راز کیا ہے؟ کتوں کے لیے بس ایک ہڈی۔"



کی ایک جان سوز عبرت آموز کہانی
آہن گر کا قصہ، ہر چند کہ وہ مٹی کا بنا ہوا تھا۔
کے ممتاز ادیب عمر سیف الدین کے قلم سے۔

ترجمہ: ثروت صولت

کوچ علی قفس میں بند ایک تربیت یافتہ شیر کے طرح اپنی دکان میں تن تنہا رات دن ہتھوڑا چلاتا اور چنگاریاں اڑاتا رہتا۔ اس کی دکان میں دروازے کے سوا کہیں سے روشنی نہیں آتی تھی۔ جسمی طور پر وہ ایک طویل قامت، چوڑے چکلے پہلوان کی طرح تھا۔ پنجے بھاری اور بازو قوی تھے۔ وہ اس تاریک کمرے میں دس سال سے کچا لوہا پیٹ پیٹ کر وہ تلواریں بنا رہا تھا، ان کی وجہ سے اس کا نام نہ صرف اناطولیہ کے طول و عرض میں بلکہ سارے رومیلی اور سلطنت عثمانیہ کے تمام سرحدی علاقوں میں مشہور ہو چکا تھا۔ خاص اناطول

میں بھی (ترکی کا ایشیائی علاقہ اناطولیہ کہلاتا تھا اور یورپ میں ترکی کے مقبوضات 'رومیلی' کہلاتے تھے۔) ینی چری پاس وہی خنجر، تلوار اور نیزے خریدتے تھے جن پر "عمل استاد علی" لکھا ہوتا تھا۔ (عثمانی سلطنت کی پیدل فوج کو ینی چری یعنی نئی فوج کہتے تھے۔ یہ دنیا کی پہلی باضابطہ فوج سمجھی جاتی تھی، اس کی تشکیل چودھویں صدی کے آغاز میں ہوئی تھی۔) استاد علی، تلوار کو آب دینے اور دھار لگانے کے فن میں ماہر تھا۔ اس کی تلواروں میں اتنی لچک ہوتی تھی کہ وہ دوہری ہو جاتی تھیں لیکن ٹوٹتی نہیں تھیں۔ یہی خوبی اس کے

بنائے ہوئے خنجروں اور چاقوؤں میں تھی۔ ایسی تلواریں اور خنجر کوئی دوسرا شخص نہیں بنا سکتا تھا' یہ اس کا مخصوص راز تھا جس سے کوئی دوسرا واقف نہیں تھا۔ اس کام میں اس کا کوئی مددگار اور ساتھی بھی نہیں تھا۔

کوجہ علی کم گو شخص تھا' زیادہ باتیں کرنے کا عادی نہیں تھا۔ تلوار' لوہے اور آگ کے علاوہ اس کی گفتگو کا کوئی موضوع نہیں ہوتا تھا۔ فروخت کے موقع پر وہ کوئی سودے بازی بھی نہیں کرتا تھا۔ خریدار جو قیمت دیتا' وہی لے لیتا۔ وہ اپنی دکان سے باہر بہت کم جاتا۔ اُس کی بھٹی صرف جنگ کے زمانے میں بجھتی تھی۔ اس موقع پر وہ دروازہ بند کر کے تالا لگا دیتا اور غائب ہو جاتا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد وہ پھر واپس آ جاتا اور اپنے کام میں پہلے کی طرح مصروف ہو جاتا۔

شہر میں اس کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں۔ کوئی کہتا کہ وہ جلاد کے ہاتھ سے بھاگا ہوا ایک شریف انسان ہے۔ کوئی کہتا کہ وہ ایک غریب انسان تھا اور اس کا کوئی پیارا مر گیا تھا جس کے غم میں وہ ترکِ دنیا پر مجبور ہو گیا۔ لیکن کوجہ علی جس پُروقار انداز' جس سکون و اطمینان سے متوازن اور معقول گفتگو کرتا' وہ اس قسم کی باتوں کی تردید کرتی تھی۔ کسی کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے اور کہاں سے یہاں آیا ہے۔ لوگ صرف یہ جانتے تھے کہ وہ موٹے سے موٹا اور سخت سے سخت لوہا ہتھوڑے سے پیٹ پیٹ کر کھی کے پتے کی طرح باریک بنا دیتا ہے اور اپنے فن میں ماہر ہے۔ لوگ یہ بھی کہتے سُنے گئے تھے کہ اسے ذوالفقار کا راز معلوم ہے۔ بہرحال کوجہ علی کی ذات ہر شخص کے لیے باعث افتخار تھی اور ہر شخص اپنے اپنے انداز میں اس کی تعریف کرتا تھا۔ کوجہ علی نے یہ فن کسی دوسرے سے نہیں سیکھا تھا۔ وہ خود اس کا موجد تھا۔

جو لوگ اس سے زیادہ واقف تھے' ان کا کہنا تھا کہ کوجہ علی ابھی بارہ سال کی عمر کا تھا کہ کسی نے اس کے باپ کو قتل کر دیا تھا۔ اس کا باپ ایک سخت مزاج بیلر بے یعنی صوبے دار تھا۔ اس کا چچا وزیر تھا اور بہت دولت مند۔ اس نے کوجہ علی کو اپنے پاس رکھ کر اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا تاکہ وہ کسی اعلا سرکاری عہدے پر فائز ہو سکے لیکن کوجہ علی کسی کا احسان نہیں لینا چاہتا تھا۔ چناں چہ اپنے چچا کے گھر سے فرار ہو گیا اور ایک آوارہ انسان کی طرح پہاڑ' جنگل اور دریا ناپتا ہوا مختلف ملکوں اور شہروں کے چکّر لگاتا رہا۔ آخر میں مشرقی ترکی کے شہر ارض روم میں وہ ایک بوڑھے لوہار کے پاس ملازم ہو گیا۔ تیس سال کی عمر تک اناطولیہ میں کوئی ایسا شہر نہیں تھا جہاں اُس نے کچھ دن نہ گزارے ہوں لیکن اُس نے کسی کے آگے سر نہیں جھکایا' کسی کا احسان نہیں لیا۔ وہ محنت سے جی نہیں چُراتا تھا اور اپنی روزی خون پسینہ ایک کر کے کماتا تھا۔ دولت کی اس نے کبھی ہوس نہیں کی۔ جتنا کماتا' اسی پر قناعت کرتا اور مگن رہتا۔ ایک تخلیقی کام کرنے والے انسان کی طرح اس نے اپنا فن دولت کے لیے استعمال نہیں کیا بلکہ فن کو ترقی دے کر اپنے ذوق کی تسکین کی۔ تلوار کی دھار پر آب چڑھانا اس کا دل پسند مشغلہ تھا۔

کوجہ علی جنگوں میں رضاکار کی حیثیت سے شرکت کرتا تھا اور جب اس موقع پر ینی چیری سپاہیوں اور سگ بانوں سے اپنی بنائی ہوئی تلواروں کی تعریف سنتا تو خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ (سلطان کے کتّوں کے رکھوالے سگ بان کہلاتے تھے اور ینی چیری فوج کا ایک حصّہ تھے۔) اگر کوجہ علی زندگی بھر اسی طرح کام کرتا رہتا تو نہ معلوم کتنے ہزار غازیوں کو نہ ٹوٹنے والی تلواریں' ڈھالیں ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والے نیزے اور زرہ کاٹنے والے خنجر بنا کر دیتا۔ وہ جب کام کے وقت اپنی اس خدمت پر غور کرتا تو دل ہی دل میں خوش ہوتا' چہرے پر مسکراہٹ آ جاتی' سندان پر ہتھوڑے کی رفتار تیز ہو جاتی اور ہر طرف چنگاریاں اُڑنے لگتیں۔ (سندان لوہے کا وہ ٹکڑا جس پر ہتھوڑے سے لوہا کوٹا جاتا ہے۔ اسے نہائی بھی کہتے ہیں۔)

صبح کی نماز کے بعد سے کوجہ علی دس گھنٹے تک برابر کام میں لگا رہتا۔ وہ کبھی ہتھوڑا چلاتا' کبھی لوہا بھٹی میں ڈالتا اور کبھی اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے پانی میں ڈالتا۔ آگ کے شعلے بجھنا شروع ہوتے تو اُنھیں بھڑکاتا۔ اذان کی آواز کان میں آتی تو کام بند کر دیتا' ہتھوڑا رکھ کر پسینہ پونچھتا' دروازے پر آتا اور ایک چادر کندھوں پر ڈال کر باہر نکل جاتا۔ دکان کے دروازے پر تالا ڈالنے کی ضرورت اس نے کبھی محسوس

تھی کہ اس دروازہ اچھی طرح بند کر دیتا اور میدان میں واقع مسجد کی طرف روانہ ہو جاتا۔ اس نے اکثر عصر کے وضو سے مغرب کی نماز پڑھی۔ ایسے میں وہ صرف ہاتھ دھونے پر اکتفا کرتا۔ مسجد شہر کے ایک کنارے واقع تھی۔ اس سادا سی مسجد میں صرف قریب بستے کے لوگ آتے۔ مینار میں سڑک کی طرف ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی، موذن اسی سے سر باہر نکال کر اذان دیتا تھا۔

ایک دن کوجہ علی مغرب کے وقت مسجد میں گیا تو اس نے وہاں معمول سے بہت زیادہ لوگ بیٹھے دیکھے۔ روزانہ مسجد میں صرف تین مشعلیں جلتی تھیں، لیکن آج رمضان کے دنوں کی طرح ہر طرف مشعلیں روشن تھیں اور لوگ دروازے تک بیٹھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ قونیہ سے دو قوال آئے ہیں، وہ عشا کی نماز تک مثنوی پڑھیں گے۔ مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد کوجہ علی گھر نہیں آیا۔ وہ بہت سارے لوگوں کے ساتھ مسجد ہی میں بیٹھا رہا، اس کے سر میں درد ہو رہا تھا، اس نے سوچا، مثنوی سننے سے ذرا طبیعت بہلے گی، چناں چہ وہ درویشوں کے روح پرور نغمے خشوع و خضوع سے سنتا رہا۔ مثنوی کے اشعار پر وہ ایک دیوانے دل کی طرح بار بار وجد میں آجاتا۔ وہ شعروں کا مطلب نہیں سمجھتا تھا کیوں کہ مولانا روم کی مثنوی فارسی زبان میں تھی اور اس کی زبان ترکی تھی لیکن زبان کا آہنگ اور درویشوں کا ترنم کوجہ علی کو مست کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اس کے خون میں گرمی پیدا ہوئی اور سارے جسم پر کیفیت طاری ہو گئی۔ قریب تھا کہ اس کی زبان سے اللہ کا نعرہ بلند ہو لیکن جذبات کی شدت میں گلے سے آواز نہیں نکلی۔ اسی حالت میں اس نے عشا کی نماز پڑھی پھر مسجد سے نکلا لیکن دکان کی طرف نہیں گیا حالاں کہ دکان اس کا گھر بھی تھی۔ نیند غائب ہو چکی تھی۔ گرمیوں کی رات تھی، تارے چمک رہے تھے، سنہرے بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ادھر ادھر تیر رہے تھے۔ وہ اس راستے پر چلتا رہا جو بستی سے مویشیوں کی منڈی تک جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک پل آیا، پل کے نیچے ایک چشمہ بہہ رہا تھا۔ وہ پل کے کنارے بنی ہوئی دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ چشمے کے

پانی میں تاروں کا عکس پڑنے سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے پانی کے اندر کے پتھر جگ مگ جگ مگ کر رہے ہوں۔ کوجہ علی دیر تک مست و بے خود کھڑا رہا، وہ اپنے آپ میں کھو چکا تھا۔ مثنوی نے اس کے دل کے تار ہلا دیے تھے۔ کافی دیر تک وہ اسی طرح کھڑا رہا، ابھی اسی حالت میں تھا کہ اچانک پیچھے سے ایک گرجتی ہوئی آواز آئی۔ "کون ہو تم؟"

آواز کے ساتھ ہی کوجہ علی خواب کے عالم سے بیدار ہو گیا۔ اُس نے پُل کے دوسرے کنارے پر نظر ڈالی تو اسے وہ تین سائے اپنی طرف بڑھتے ہوئے نظر آئے۔ اُس نے بے اختیاری میں جواب دیا۔ "اجنبی نہیں ہوں۔"

"آخر ہو کون؟"

"علی ہوں۔"

"کون علی؟" سائے قریب آ چکے تھے۔ وہ کوجہ علی سے دو تین قدم دور رہ گئے تو انھوں نے اُسے پہچان لیا۔ "کوجہ علی، کوجہ علی۔"

"......"

"ارے تم ہو استاد علی؟" ایک نے کہا۔

"ہاں میں ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"تم اس وقت یہاں کیا تلاش کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے، شاید تمھارا ہتھوڑا پانی میں گر گیا ہے؟" کوجہ علی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

یہ لوگ شہر کے صوباشی یعنی پولیس سپرنٹنڈنٹ کے آدمی تھے اور بستی کا گشت کر رہے تھے۔ کوجہ علی نے کوئی جواب نہیں دیا تو انھیں حیرت ہوئی۔ راتوں کو آوارہ پھرنے والے لوگ ان کی نظر میں چوروں سے زیادہ خطرناک ہوتے تھے۔ اگر کوجہ علی کے علاوہ کوئی شخص اس طرح کھڑا پایا جاتا تو سپاہی اس کی ڈنڈوں سے مرمت کرتے لیکن وہ استاد علی کو اچھی طرح جانتے تھے اس لیے انھوں نے اس سے بد سلوکی نہیں کی۔ "استاد! کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟" افسر نے سوال کیا۔

"نہیں۔"

"تو پھر آدھی رات کو یہاں کیا کر رہے ہو؟ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ عشا کے بعد ادھر اُدھر پھرنا ہمارے آقا کو پسند

نہیں۔"

"معلوم ہے۔"

"تو پھر تم یہاں کس کی تلاش میں ہو؟"

"کسی کی تلاش میں نہیں۔"

علی نے کسی سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ وہ زیادہ بات کرنے کا عادی بھی نہیں تھا لیکن افسر شریف تھا اور جانتا تھا کہ علی ایک باعزت اور نیک آدمی ہے اس لیے اُس نے صرف یہ کہا کہ "اچھا' اب اپنے گھر جاؤ' اِدھر اُدھر نہ پھرو۔"

کوجہ علی واپس ہو گیا۔ اُس کے قدم گھر کی طرف تیزی سے اُٹھ رہے تھے لیکن دل و دماغ میں مثنوی کے اشعار گونج رہے تھے۔ دور مویشیوں کے باڑے سے کتے بھونکنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ دکان کے سامنے پہنچا تو دروازہ کسی قدر کھلا نظر آیا۔ کچھ دیر وہ خیالات میں گم کھڑا رہا اور سوچنے لگا کہ دروازہ تو اس نے سختی سے بند کر دیا تھا' پھر یہ کیسے کھل گیا؟ شاید ہوا سے کھل گیا ہو۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ دکان میں سندان اور ہتھوڑے کے سوا کون سی قیمتی چیز تھی جسے کوئی چُراتا۔ یہ دونوں چیزیں ایسی تھیں جو کسی کے کام کی نہیں تھیں' چور انھیں اُٹھانے کی زحمت کیوں مول لیتا۔ کوجہ علی اندر چلا گیا' لیکن اندر سے اُس نے کواڑ میں چٹخنی لگائی۔ پولیس کی مداخلت کے باعث وہ ذہنی کوفت میں مبتلا تھا۔ اُس نے سوچا کہ اس طرح شہر میں رہنا اور قید کی زندگی گزارنا برابر ہے لیکن کیا کیا جائے' دیہات میں روزگار نہیں۔ وہ اسی حالت میں تھا کہ نیند کا غلبہ ہوا۔ اُس نے ایک کونے سے ریچھ کی کھال نکالی اور اسے بچھا کر لیٹ گیا۔

☆ ☆ ☆

کوجہ علی گہری نیند سو رہا تھا کہ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز کانوں میں آئی۔ وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ "کون ہے؟" اس نے نیم غنودگی کی حالت میں پوچھا۔

صبح ہو چکی تھی اور کواڑ کی جھریوں سے دن کی روشنی اندر داخل ہو رہی تھی۔ کوجہ علی اس طرح گہری نیند کبھی نہیں سویا تھا' وہ ہمیشہ سورج نکلنے سے پہلے اُٹھ جاتا۔ وہ جلدی سے اُٹھا اور جوتے پہنے بغیر اس نے دروازے پر جا کے چٹخنی کھول دی۔ سامنے بڑی بڑی مونچھوں اور اونچی ٹوپی والا پولیس افسر کھڑا تھا۔ اُس کے پیچھے نمدے کی ٹوپی پہنے دو آدمی اور کھڑے تھے۔ کوجہ علی نے حیرت سے ان پر نظر ڈالی اور دل میں سوچا کہ کیا معاملہ ہے؟

"علی استاد! ہم تمھاری دکان کی تلاشی لیں گے۔" پولیس افسر نے کہا۔

"کس لیے؟" علی نے پوچھا۔

"آج رات بوداک بے کے مویشیوں کے باڑے میں چوری ہو گئی ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟" علی نے جواب دیا۔

"ہم اس سلسلے میں تمھاری دکان کی تلاشی لینے آئے ہیں۔ جن لوگوں نے بھیڑ چُرائی ہے' انھوں نے اسے پُل کے نیچے ذبح کیا تھا اور جو رقم چُرا کر لے گئے ہیں' اس میں سے کچھ تھیلی میں وہیں چھوڑ گئے تھے۔" افسر نے وضاحت کی۔

"ارے بھائی! اس سارے واقعے سے میرا کیا تعلق؟"

"تھیلی کے سکّوں میں سے ایک سکّہ آج صبح تمھاری دکان کے سامنے ملا ہے۔ ذرا اپنی دہلیز پر نظر ڈالو' یہاں خون کے دھبّے بھی موجود ہیں۔" علی نے اپنے دروازے کی صاف ستھری دہلیز پر نظر ڈالی تو واقعی خون کے دھبّے موجود تھے۔ افسر نے دریافت کیا۔ "میں نے پچھلی رات تمھیں پُل کے پاس کھڑے دیکھا تھا۔ تم وہاں کیا کر رہے تھے؟"

علی نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا اور پولیس افسر سے کہا۔ "آئیے' تلاشی لے لیجیے۔"

افسر اپنے سپاہیوں کے ساتھ دکان میں داخل ہوا۔ وہ ... کے پاس پہنچا تو چیخ پڑا۔ "یہ ہے' یہ ہے۔"

علی نے بے اختیار اُس طرف دیکھا۔ زمین پر ایک کھال پڑی تھی جو تازہ تازہ اُدھیڑی گئی تھی۔ علی حیران رہ گیا کہ یہ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ سپاہی نے فوراً کھال اُٹھائی' وہ ابھی تک ... تھی۔ سپاہی اور ساتھ آنے والے دوسرے لوگ کبھی پولیس افسر کو دیکھتے' کبھی استاد علی پر نظر ڈالتے۔ "بتاؤ! چُرائی ہوئی رقم تم نے کہاں چھپائی ہے؟" افسر نے غضب ناک انداز میں علی سے پوچھا۔

"میں نے کوئی رقم چوری نہیں کی۔"

"انکار مت کرو۔ بھیڑ کی کھال تمھاری دکان سے ...

وں کی ہے۔"

"تو کھال میں نے یہاں نہیں رکھی۔"

"تم نے نہیں رکھی تو کس نے رکھی؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

رات کو جب پولیس افسر نے کوجہ علی سے پوچھا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے تو اس نے اپنی کم گوئی کے باعث کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس کا یہ طرزِ عمل اب اس کے خلاف جا رہا تھا۔ علاوہ ازیں بوداک بے نے پانچ سو بھیڑیں فروخت کر کے جو رقم حاصل کی تھی، وہ بھی باڑے سے چوری ہو گئی تھی اور چوروں نے باڑے کے چوکی دار کو رسّیوں سے باندھ دیا تھا۔ دوسرے دن چوکی دار نے حاکم شہر کے سامنے بیان دیتے ہوئے ایک چور کو علی کی شکل و صورت جیسا بتایا۔ رات کو دیر تک گھر سے باہر رہنا، بھیڑ کی کھال اس کے گھر سے ملنا اور چوری کی رقم میں سے ایک سکّہ علی کے دروازے کے پاس پایا جانا ایسی شہادتیں تھیں کہ اب علی کا جرم سے انکار کرنا بے معنی تھا۔

قاضیِ عدالت نے چوری کے الزام میں اس کا بایاں ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا۔ کوجہ علی کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ فیصلہ سن کر اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ غصے سے ہونٹ کاٹنے لگا لیکن اب تقدیر کے آگے سر جھکانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے کھڑا ہوا اور بلند آواز میں اس نے قاضی سے درخواست کی۔ "جنابِ عالی! میرا ہاتھ نہ کاٹا جائے بلکہ سر قلم کرنے کا حکم دیا جائے۔" اس نے ساری عمر میں پہلی مرتبہ کوئی درخواست کی تھی۔

لیکن قاضی ایک منصف حاکم تھا، اس نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں میرے فرزند! تم نے کسی انسان کو قتل نہیں کیا۔ اگر تم چوکی دار کو قتل کر دیتے تو تمھارا سر قلم کیا جاتا۔ سزا جرم کے مطابق دی جاتی ہے۔ تم نے صرف چوری کی ہے اس لیے صرف ہاتھ کاٹا جائے گا۔ حق یہی ہے اور شریعت بھی یہی کہتی ہے۔"

کوجہ علی کو سزا کی تکمیل ہونے تک ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ علی کے لیے اس کے ہاتھ سر سے زیادہ قیمتی تھے۔ پھل دار تلوار بنانا اور اسے آب دینا ہاتھوں ہی کا کام تھا۔ وہ غازیوں کے لیے یہ کام دولت کمانے کی خاطر نہیں کرتا تھا بلکہ

اپنا فرض سمجھ کر کرتا تھا۔ اسے اپنے کام سے غیر معمولی عشق تھا لیکن اب وہ ایک کمرے میں قید قصاص کے دن کا انتظار کر رہا تھا۔ اپنے پسندیدہ کام سے محروم ہو جانے اور لُولا ہو کر زندگی گزارنے کا خیال اُس کے لیے سوہانِ روح ثابت ہو رہا تھا۔ چوں کہ اس نے دولت کمانے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی اس لیے بازو کی دیت ادا کرنے کے لیے اس کے پاس رقم نہیں تھی۔

شہر کے تمام لوگ کوجہ علی جیسے ماہرِ فن کا ہاتھ کٹنے کے اندیشے سے رنجیدہ تھے۔ ہر شخص اسے پسند کرتا تھا۔ وہ ایک خوب رُو، جواں مرد اور محنتی انسان تھا۔ ایسے شخص کا ساری عمر ایک لُولے آدمی کی طرح زندگی گزارنا سب کے لیے تکلیف دہ تھا چناں چہ فوج کے جن سپاہیوں کے لیے وہ وقتی تلواریں تیار کرتا تھا، انھوں نے آپس میں مشورہ کرکے اسے بچانے کی تدابیر پر غور کیا۔ وہ بستی کے سب سے دولت مند حاجی محمد کے پاس گئے۔ یہ شخص ایک قصّاب تھا اور قارون کی طرح دولت کا مالک تھا لیکن انتہائی کنجوس تھا۔ اس نے فوجیوں کی اس تجویز پر دیر تک غور کیا کہ وہ کوجہ علی کے ہاتھ کی دیت ادا کر دے۔ پہلے تو اس نے طرح طرح کے نخرے کیے، منہ بنایا، انکار میں سر ہلایا لیکن آخر میں سوچا کہ فوج والوں کو خوش رکھنا بھی ضروری ہے، اس لیے بولا۔ "چوں کہ آپ لوگ اتنا اصرار کر رہے ہیں، اس لیے میں علی کے ہاتھ کی دیت ادا کرنے کو تیار ہوں لیکن ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا؟" سپاہیوں نے پوچھا۔

"اسے زندگی بھر کسی معاوضے کے بغیر میری خدمت کرنی ہوگی۔ اگر اُسے یہ شرط منظور ہے تو میں اُس کے ہاتھ کی دیت ادا کروں گا۔"

"ٹھیک، بالکل ٹھیک۔" سپاہیوں نے کہا۔

سپاہی پولیس چوکی پہنچے اور حاجی قصّاب کی شرط کوجہ علی کو بتائی۔ اس نے پہلے تو یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ قصّاب کا کام نہیں کر سکتا۔ لوگوں نے سمجھایا کہ قصّاب کا کام کرنا تمھارے لیے کیا مشکل ہے، تم نے اس قدر جنگوں میں حصّہ لیا ہے اور تلوار چلائی ہے پھر تمھارے لیے ایک بے زبان بھیڑ بکری کو ذبح کرنا کون سا مشکل کام ہے؟ لیکن کوجہ علی کے لیے کسی شخص کا احسان لینا اور زند[گی] بھر کسی کی غلامی کرنا، ایک بدترین عذاب تھا۔ اس [نے] نوجوانی میں اپنے چچا کا احسان مند ہونا گوارا نہیں کیا تھا [اور] عیش و آرام کی زندگی پر لات مار کے غربت کی زندگی گزا[رنا] پسند کیا تھا مگر اب قسمت کی ستم ظریفی سے اسے ایک [کنجوس] قصّاب کی غلامی کرنی پڑ رہی تھی۔ سپاہیوں کا اصرار بڑ[ھ رہا] تھا۔ انھوں نے علی کو سمجھایا کہ حاجی قصّاب کی عمر ستر [برس] سے زیادہ ہو گئی ہے، اب وہ اور کتنا جیے گا۔ اس کے مر[نے] کے بعد تم آزاد ہو جاؤ گے۔ آزاد ہو کے اپنا کام پھر [سے] شروع کر دینا اور ہمارے لیے تلواریں اور نیزے بنانا، ا[س] لیے اب زیادہ مت سوچو اور حاجی قصّاب کی شرط تسلیم کر[لو]۔

سپاہیوں کے مسلسل اصرار پر آخر کار کوجہ علی راضی [ہو] گیا۔ حاجی قصّاب نے اُس کے ہاتھ کی دیت ادا کر دی ا[ور] اُس کا ہاتھ کٹنے سے بچ گیا۔

☆ ☆ ☆

حاجی قصّاب نے جس دن کوجہ علی کے ہاتھ کی دیت ادا [کی] تھی، اسی دن سے اسے کام پر لگا دیا گیا۔ حاجی قصّاب بدمزاج اور چڑچڑا انسان تھا۔ وہ ہر وقت بڑبڑاتا رہتا۔ کنجو[سی] کی وجہ سے اس نے کبھی کوئی نوکر نہیں رکھا۔ کوجہ علی [کے] آنے کے بعد اس نے ساری ذمے داریاں اسی کے سپر[د کر] دیں اور خود کام کرنا بالکل چھوڑ دیا۔ دکان کے ایک کونے [میں] اس نے چبوترا بنا کے چٹائی ڈال لی، وہ اسی پر بیٹھا دن بھر [احکام] صادر کرتا رہتا۔

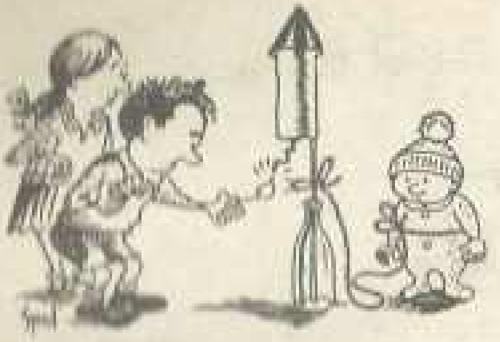
کوجہ علی صبح کی نماز سے کئی گھنٹے پہلے اٹھتا اور بکرا منڈی جاتا، منڈی بستی سے دو گھنٹے کی مسافت پر تھی۔ وہاں سے جانور خرید کر لاتا، انھیں ذبح کرتا، کھال اُتارتا، پھر ٹکڑ[ے] ٹکڑے کرکے گوشت لٹکاتا اور سارے دن گوشت فرو[خت] بھی کرتا۔ مغرب کی نماز تک وہ مصروف رہتا، اس کے [بعد] اسے اُبلے اور کوٹے ہوئے گیہوں کا شوربا دیا جاتا، صر[ف] شوربا۔ کھانے کی کوئی اور چیز ساتھ نہیں ہوتی تھی۔ ہاں [کبھی] کبھی حاجی اپنا بچا ہوا کھانا اس کے سامنے کر دیتا تھا جیسے ک[تے کو] دیا جاتا ہے۔ رات کو دکان بھی علی دھوتا۔ جنگل سے لکڑ[یاں] کاٹنا، پانی بھرنا، حتیٰ کہ گھر کے باغیچے کے لیے کھاد لانا اور

گی وضع داری تھی۔

اور علی صرف گیہوں کے شوربے اور بچی کچھی روٹی سالن کے عوض اپنے مالک کی خدمت کرتا رہا لیکن کام سے زیادہ اس حاجی کے طعنے تکلیف کا باعث تھے۔ کوئی دن نہ جاتا کہ حاجی اپنا احسان نہ جتاتا ہو۔ "ابے علی! میں نے تیرے ہاتھ کی دیت ادا کی ہے۔ تو میرا غلام ہے۔ اگر میں دیت ادا نہ کرتا تو لولا ہوتا۔" یہ جملے حاجی علی کا تکیۂ کلام بن گئے تھے۔ علی چاہے کتنی ہی محنت و مشقت کرتا، اسے یہ جملے دن میں ایک دو بار ضرور سننے پڑتے۔ حاجی کو اپنی اس نیکی کا بار بار ذکر کیے بغیر چین نہیں پڑتا تھا۔ وہ ہر حکم کے ساتھ اپنی ناگوار سی بدصورت شکل اور اندر دھنسی ہوئی آنکھوں سے علی کو نیچے سے اوپر تک دیکھتا اور کہتا۔ "یاد رکھ تو میرا غلام ہے۔" علی کے تن بدن میں آگ لگ جاتی لیکن خاموشی کے سوا کیا چارہ تھا۔

جانوروں کی کھال اتارتے ہوئے، خریداروں کے لیے گوشت تولتے ہوئے اور دوسرے کام انجام دیتے وقت اس کے کانوں میں یہی طعنے گونجتے رہتے اور وہ سوچتا رہتا کہ اس عذاب سے کس طرح نجات پائے لیکن وہ کسی فیصلے تک نہ پہنچ پاتا۔ وہ سوچتا کہ اس نے تو کبھی کسی پر انگلی تک نہیں اٹھائی، کبھی کسی کو برا بھلا نہیں کہا۔ وقار و قناعت سے زندگی گزاری لیکن اب حاجی کی صورت میں ایک بلا اس پر نازل ہو گئی ہے۔ وہ بھاگنا پسند نہیں کرتا تھا کیوں کہ اس طرح اس کی عزت پر حرف آتا تھا۔ لوگ اسے واقعی چور سمجھنے لگتے۔ مگر علی حاجی کے جملے اس کے لیے موت سے زیادہ سخت ہوتے جا رہے تھے۔

حاجی قصاب کا غلام بنے علی کو کئی روز ہو گئے تھے۔ ایک روز علی الصباح مویشیوں کی منڈی گیا اور بھیڑیں خرید کر لایا۔ مذبح میں انھیں ذبح کیا، کھال اتاری اور کاٹ کاٹ کر دکان پر لٹکا دیے۔ وہ دکان کے بائیں طرف رکھے ہوئے ایک بڑے سے کالے پتھر پر چھرا تیز کر رہا تھا۔ حاجی قصاب ابھی نہیں آیا تھا۔ چھرا تیز کرنے کے بعد علی نے بڑی ران کاٹنی شروع کی تو حاجی قصاب آ گیا۔ "ابے! یہ کیا کر رہا ہے؟" حاجی نے نہایت کرخت آواز میں پوچھا۔



"ران کاٹ رہا ہوں۔" علی نے جواب دیا۔

"ابے سست، کاہل! صبح سے ابھی تک تو نے بس اتنا کام کیا ہے؟"

علی نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن حاجی قصاب کو گھور کے دیکھا۔ علی پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ آج تک کسی نے اُسے سست اور کاہل نہیں کہا تھا لیکن یہ شخص اس کے ساتھ صرف بدزبانی نہیں کر رہا تھا بلکہ اس کی تحقیر کر رہا تھا۔ حاجی قصاب نے علی کو گھورتے دیکھا تو اپنی اصلیت پر اتر آیا۔ "مجھے گھور کیا رہا ہے۔ شاید تو بھول گیا کہ تیرے ہاتھ کی دیت میں نے ادا کی تھی۔ اگر میں دیت ادا نہ کرتا تو آج تو لولا نظر آتا۔"

کوچہ علی نے کوئی جواب نہیں دیا، کھسیانے انداز میں مسکرانے لگا۔ دوسرے ہی لمحے وہ یہ کہتا ہوا تیزی سے مڑا کہ "ہاں لولا نظر آتا۔" اُس کا رنگ پہلے سرخ ہوا، پھر زرد۔ اس نے ایک بڑا سا چھرا اٹھایا، آستین چڑھائی اور اپنا بایاں ہاتھ گوشت کاٹنے والی لکڑی پر رکھ کے دائیں ہاتھ سے چھرے کی ایسی ضرب لگائی کہ اس کا ہاتھ کٹ کر الگ ہو گیا۔ حاجی قصاب نے وحشت سے آنکھیں پھیر لیں۔ علی نے اپنا کٹا ہوا پنجہ دوسرے ہاتھ سے اٹھایا اور اسے حاجی قصاب پر پھینکتے ہوئے کہا۔ "لو! جس ہاتھ کی تم نے دیت دی تھی، وہ واپس لے لو۔" پھر اس بہتے ہوئے ہاتھ پر آستین سے گرہ لگائی اور دکان سے نکل گیا۔

جس طرح لوگوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے، اسی طرح کسی کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ وہ کہاں گیا۔



سب رنگ کا ایک نیا سلسلہ

اُردو کے ایک طرز ساز طرفہ انداز قلم کار اسد محمد خاں کی طرف سے

رات کا پچھلا پہر تھا۔ ظفریاب نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں۔ کوئی زور زور سے دستک دے رہا تھا جیسے دروازہ توڑ ڈالے گا۔ اس کا دل خوف سے دھڑکنے لگا۔ وہاں بیٹھے سے بھاگ گیا۔ پھر دستک دینے والے نے آواز لگائی تو وہ پہچان گیا کہ وہ کون ہے۔ وہ اس کا میزبان اور فارم کا مالک بلوچ تھا۔ ظفریاب نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ اُس کا خوف بے وجہ نہ تھا۔ وہ شہر سے دور ایک سبزی فارم میں اجنبیوں کے درمیان چھپا ہوا تھا۔ پولیس یا اس کے نامعلوم دشمن کسی وقت بھی چلا کر اُسے گھیر سکتے تھے۔ وہ ایک نہایت دولت مند نوجوان تھا۔ یاور ”مشیوط“ ایک بڑی تجارتی فرم کا مالک، ایک معروف اشتہاری ایجنسی اور خاصے بڑے ہوٹل کا حصے دار ہونے کے علاوہ وہ گھوڑے اور ریس، سربری کانوں کے ٹھیکے بھی لیتا تھا۔ شہر کے متمول علاقے میں اُس کی عظیم الشان کوٹھی اور دوسری جائداد اب وہ ایک مفرور تھا۔ اُس سے اَن جانے میں ایک قتل ہو گیا تھا اور پولیس نیز قتل کا راز جاننے والے نامعلوم دشمن اُس کی تلاش میں تھے۔ بوڑھے بلوچ نے کھوپڑی میں داخل ہو کے بتایا کہ ظفریاب کی فرم کا اکاؤنٹس افسر جوالی اپنے فلیٹ میں قتل کر دیا گیا ہے۔ قتل سے پہلے سنگ دل قاتلوں نے اسے اذیتیں بھی دی تھیں۔ جوالی کا قصور یہ تھا کہ اُس نے اپنے مالک کو فرار ہونے میں مدد دی تھی اور دشمن یہ سمجھ رہے تھے کہ اُسے اپنے مالک کے چھپنے کی جگہ معلوم ہے۔ حالانکہ صرف ظفریاب کے ملازم غفار کے علم میں تھی۔ اسی نے ظفریاب کے چھپنے کا انتظام کیا تھا۔ غفار، بلوچ بزرگ کے بھتیجے میر محمد کا واقف کار تھا۔ وہ خبر دینا اپنے مالک کی خیر خبری کے لیے فارم پر آتا تھا۔ بلوچ میزبان نے جوالی کے قتل کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ اب غفار یہاں نہیں آئے گا کیوں کہ اُسے پولیس کے ڈر سے کہیں چھپا دیا ہے اور وہ سکتا ہے اب اسے بھی فارم کی حالت گھوڑ کے کہیں اور پہنچنا پڑے۔ ظفریاب نے بے بسی سے سوچا کہ اگر اس کے نامعلوم دشمنوں کا گھیرا تنگ ہوا تو اسے نہ صرف فارم سے بلکہ اپنے شہر اور ملک سے بھی فرار ہونا پڑے گا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ پوری طرح تیار ہو کر کھوپڑی کا فرش کھود کر اس نے ایک بریف کیس دفن کیا تھا۔ اس میں بے شمار بیش قیمت ہیرے، خالص سونے کی ٹکیاں اور بھاری مالیت کی ہنڈیاں تھیں۔ قتل کی





میں مدد تھیں۔ یہ چیزیں کروڑوں روپے کی ہونے کے باوجود اس کے اخلاص کا عشر عشیر بھی نہیں تھیں جو اُسے اس شہر میں چھوڑ کر جانا پڑ رہا تھا۔ اس عرصے میں لوا
میر محمد بھی شہر سے آ چکا تھا۔ وہ بھی نامعلوم دشمنوں کی طرف سے فکر مند تھا۔ بلوچ بزرگ برابر کی جھونپڑی میں کسی کام سے چلے گئے۔ تنہائی میں ظفریاب اپنے
اور اس ملک میں آمد کے بارے میں سوچنے لگا۔ اُسے اپنی ماں یاد آ رہی تھی جس نے اپنی زندگی میں جان توڑ محنت کی تھی اور وہ تومیں کے اس گنجے کو فرش سے اٹھا
عرش تک لے آیا تھا۔ وہ گھر بار کے راستے جب اس نئے ملک پاکستان کے دارالحکومت آئے تھے تو ان کے پاس سر چھپانے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ پاکستان آ
دو بے آسرا جیسے یہاں ان کے ساتھ ہو گئے اور تین افراد کا یہ گھرانا ایک نئی کالونی کے زیر تعمیر مکان میں رہنے لگا۔ بی بی بہت باہمت عورت تھیں
دوسری مزدور عورتوں کے ساتھ ٹوکریاں ڈھو ڈھو کر دو وقت کی روٹی کا بندوبست کرتی رہیں پھر ایک دن تعمیراتی کام ختم ہو گیا اور مکان دار اپنا اپنا گھر آباد کرنے آ پہنچے
بی اپنے بیٹے اور دو بوڑھے ماں باپ کو لے کر سڑک کے کنارے پڑے ہوئے ایک پائپ میں آ بسیں۔ یہاں آ کے انھوں نے اپنی تقدیر بدلنے کے لیے ایک جست
دونوں نے پہلے پھیری لگا کر دال روٹی بیچنے کی کوشش پھر زیر تعمیر کالونی کی ایک جھونپڑی میں ہوٹل کھول لیا۔ چند مہینوں میں ماں بیٹے نے دن رات محنت کر کے اپنی
کا م کری اور چھوٹی موٹی چائے پارٹیوں کے ٹھیکے لے کر کچھ پیسے بچا لیے۔ بی بی نے اپنی بچائی ہوئی رقم سے ایک چھوٹا سا پلاٹ خرید لیا تھا۔ بے آسرا بوڑھے میاں
لورم میں داخل کر دیے گئے اور دونوں ماں بیٹا اپنی ذاتی زمین پر جھونپڑی ڈال کر رہنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے جھونپڑی ایک ٹین پوش مکان میں بدل گئی۔ آخر تو ہی
اور ایک جوان عورت صرف اپنے بل بوتے پر زندگی گزار رہے تھے۔ بے سہارا بی بی کو بڑی آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پیٹ بھرنے اور عزت سے زندگی بسر کر
لیے شب و روز کی محنت کے علاوہ انھیں بوالہوس بدکار لوگوں کی نگاہوں سے اپنا چہرہ اپنا سرا پا چھپائے رکھنے کی مشقت الگ کرنی پڑتی تھی۔ طرح طرح کے لوگوں
سے ان کا واسطہ پڑتا تھا۔ ایک بدمعاش نے تو حد ہی کر دی۔ اُس نے اصرار کر کے کینٹین میں بی بی کی امداد کی اور ایک رات نشے میں جھومتا ہوا بی بی کے دروا
پر آ دھمکا۔ بی بی کے عزم اور ارادے کی قوت تھی جو اُس بدمعاش پر حاوی آ گئی۔ ایسے جانے کتنے لوگ بی بی کو ناتواں عورت سمجھ کے ستانے پر آمادہ ہوئے مگر
نے گھات لوٹ دلوں جلتی ہوئی راتوں کی تھکن اور سفاکی سے کسی طور خود کو اور اپنے بیٹے کو بچائے رکھا۔ بی بی کی پکی کینٹین جس کمپنی کے مزدوروں کو چائے فراہم
تھی اس کا اعلیٰ افسر بی بی کی ہمت و جرأت اور ان کے بیٹے کی معصومیت سے متاثر ہو گیا تھا۔ اس نے کئی مرحلوں پر اس چھوٹے سے کنبے کی اخلاقی مدد کی۔
ایک شریف مرد عورت تھیں اور احسان شناس بھی۔ وہ محنت و مشقت پر یقین رکھتی تھیں۔ وہ منیجر کے حسن سلوک سے متاثر بھی تھیں اور ممنون احسان بھی۔

اپنی بیتی ہوئی زندگی اور اپنی حوصلہ مند ماں کے بارے میں نوجوان ظفریاب نہ جانے کب تک سوچتا رہا پھر اُس کی آنکھ لگ گئی۔ رات کے آخری پہر اچانک اس
آنکھ کھل گئی۔ عدم تحفظ کے احساس سے وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ اُس نے شاید خواب میں گولی چلنے کی آواز سنی تھی مگر یہ خواب نہیں تھا۔ وہ جائزہ لینے کے لیے جھو
سے باہر آیا تو کسی نے اُسے واپس جھونپڑی میں جانے کو کہا۔ یہ اس کے میزبانوں کا متعین کیا ہوا محافظ تھا۔ محافظ کے عین اس وقت آ پہنچنے سے اس کی جان بچ گئی
کی بے دردانہ کے حملے سے اس پر حاوی ہو گیا تھا۔ محافظ نے اُسے زمین پر گرا کر یقینی موت سے بچا لیا۔ اگلے چند منٹ انتہائی ہیجان خیز تھے۔ نامعلوم دشمن مسلسل
کر رہا تھا اور ادھر سے بھی برابر جواب دیا جا رہا تھا۔ آخر سامنے سے فائرنگ بند ہو گئی۔ کچھ دیر بعد اس کا نوجوان میزبان میر محمد آ گیا۔ اُس نے بتایا کہ حملہ آور دھوکا دے
لے اور اس کے ساتھیوں کو جھونپڑی سے دور لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے مگر مہمان کے محافظ نے اس کی جان بچا لی۔ طے کیا گیا کہ ظفریاب کو فارم سے
جائے۔ میر محمد کی لانچ بندرگاہ پر موجود تھی اس لیے یہی مناسب تھا کہ پولیس اور دشمنوں کی ناکہ بندی سے بچ بچا کر لانچ میں پناہ لینے کی کوشش کی جائے۔ وہ
انتظام کرنے میر محمد جھونپڑی سے چلا گیا تھا۔ ظفریاب نے فارم سے روانہ ہونے سے پہلے جھونپڑی کا فرش کھود کر اپنے ہیرے، سونا اور ہنڈیاں حاصل کیں اور
بیگ اپنی جیکٹ میں چھپا لیں۔ کچھ دیر بعد وہ میر محمد اور محافظوں کے ساتھ فارم کی اسٹیشن ویگن میں بندرگاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ بندرگاہ تک کا سفر کسی خاص
کے بغیر کٹ گیا۔ مچھلی بندر پر جہاں سے پہنچ پہنچا کے انھیں میر محمد کی لانچ "البیر" تک پہنچنا تھا۔ پولیس اور کسٹم والوں نے ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ پولیس کا ایک
مچھلی مچھیروں کے بیوپاری کی حیثیت سے میر محمد کی پارٹی کے ساتھ ہو لیا۔ ہر لمحے پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ محافظوں نے بندوقیں تیار کر لی تھیں۔ وہ ہر قیمت پر
مہمان کو مچھلی بندر سے نکال لینا چاہتے تھے۔ پولیس [illegible] میر محمد کی لانچ کی تلاشی لینے پر تلا ہوا تھا مگر ظفریاب کے ستاروں نے ساتھ دیا۔ محافظوں کی حکمت عملی
آخر لانچ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ کھلے سمندر میں کھڑی ہوئی اس لانچ پر صرف اُس کا منیجر غفار موجود تھا
وہ پوری لانچ کا آدمی بھی تھا اور دراصل مچھلی کے بیوپاری کے بھیس میں پولیس کا مخبر تھا مگر مخبری حالانکہ یہ تھی کہ منہ میں کپڑا ٹھونس کر اور ہاتھ پیر باندھ کر ایک
طرف ڈال دیا گیا تھا۔ ظفریاب کو یقین ہو گیا کہ اب وہ قتل کے علاوہ سرکاری اہل کار کے اغوا کی سازش میں بھی شریک سمجھا جائے گا۔ اسے پریشان دیکھ
میزبان میر محمد نے تسلی دی اور کہا کہ جب تم لانچ سے چلے جاؤ گے تو ہم اس مخبر کو آزاد کر دیں گے۔ ظفریاب وقتی طور پر مطمئن ہو گیا مگر کوئی گھڑی اس
سر پر جھولتی رہی۔

بندرگاہ کا منظر کسی حد تک دور ہو گیا تھا۔ لانچ کھلے سمندر کی طرف چل پڑی تھی۔ ظفریاب کے پاس اب سوچنے سمجھنے کے لیے کچھ نہیں تھا سوائے پیچھے رہ
جانے والے دنوں کی یادوں کے۔ اُسے وہ دن یاد آ رہے تھے جب کراچی کا کاروبار سنبھالتے ہوئے وہ دونوں ماں بیٹا نانا کی خیریت معلوم کرنے کے لیے حیدرآباد پہنچے تھے اور اتفاقاً وہاں
ان کی عباس صاحب سے ملاقات ہو گئی تھی۔ عباس صاحب سے دوست شناسی میں ماہر تھے۔ بی بی کو ان کے بیٹے کے مستقبل کے بارے میں بڑی حیرت انگیز
باتیں بتائیں۔ یہ باتیں دولت مندی کی پیش گوئی کے علاوہ اس کی آئندہ زندگی کے کسی بھیانک پہلو کے بارے میں تھیں اور یہ صرف بی بی کے علم میں تھیں۔ اسی
دن ان ماں بیٹے کو کالونی کے منیجر نے ایک تقریب کا انتظام سنبھالنے کے لیے گھر بلایا تھا۔ وہاں یہ دونوں دعوت اور کمروں میں بھٹک گئے تھے۔ خواب گاہ میں اتفاقاً ایک
سے ان کا سامنا ہو گیا تھا۔ بچی والہانہ انداز میں بی بی کو "امی امی" پکارتی ہوئی لپٹ گئی۔ منیجر نے جو اس واقعے سے پریشان ہو گیا تھا بچی کا تعارف تو کرا دیا لیکن
پھر ان دونوں ماں بیٹے کو اس کمرے سے نکال دیا گیا۔ بعد میں ظفریاب کو اُس بچی کے بارے میں تفصیلات کا علم ہوا مگر وہ وقت کچھ اور تھا۔ جب تو دنیا ہی بدل

گئی۔ لانچ اس بندرگاہ سے نکلا ہو سے روانہ [illegible] صاحب نے اس کو براہِ راست کر دیا۔ کسٹم کی ایک بوٹ ظفریاب کی میزبان لانچ "البیر" کو مشتبہ سمجھ کر پیچھے لگ گئی

[illegible] روک لیا۔ ظفریاب جانتا تھا کہ کسٹم والے لانچ پر چڑھ کر تلاشی لیں گے تو وہ اُن کے ہاتھوں گرفتار کر لیا جائے گا۔ آنے والی افتاد کے تصور نے اس کے ہوش و حواس بھی منتشر کر دیے تھے مگر فراری لانچ کا ناخدا بڑا چالاک تھا۔ اُس نے اسپیڈ بوٹ پر کھڑے ہوئے کسٹم والوں میں سے کسی کو مخاطب کر کے بیان دینا شروع کر دیا۔ بعد میں سب کو پتہ چلا کہ وہ جس شخص کو اپنے غصے اور ملامت کا ہدف بنائے ہوئے تھا وہ کوئی اور نہیں اُس کا بھانجا ہے اور دونوں کسی خاندانی قضیے [illegible] بھانجے نے ماموں کی کسی بات پر مشتعل ہو کر سرکاری رائفل سیدھی کر لی۔ لگتا تھا دونوں ایک دوسرے کی جان لے لیں گے۔ کسٹم انسپکٹر لانچ [illegible] آ رہا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ سرکاری فرائض کی ادائی کے دوران خاندانی جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ افسرانِ بالا تک یہ بات پہنچی تو اس کے نظم و ضبط پر [illegible] اس نے لانچ کی تلاشی نہیں لی، پوچھ تاچھ کیے چھوڑ دیا۔ لانچ آگے چلی تب انکشاف ہوا کہ یہ سارا جھگڑا ناخدا کی اداکاری تھی۔ اُس کی حاضر دماغی نے [illegible] بچا لیا تھا۔ اب لانچ کھلے سمندر کی طرف نکل پڑی تھی۔ ظفریاب کے منیجر غفار اور اس کے معاون میر محمد کا رویہ اس دوران بدل گیا تھا کہ ظفریاب کو گھبراہٹ [illegible] غفار مسلسل سمجھانے بیٹھا تو اس نے مالک کی عدم موجودگی میں کاروبار چلانے کے مقصد سے کچھ انتظامات تجویز کیے اور بعض دستاویزات پر ظفریاب [illegible] چاہے۔ ظفریاب نے دستخط کیے بغیر کاغذات لوٹا دیے اور عذر کیا کہ وہ اس معاملے پر پہلے پوری طرح غور کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے منیجر کی دیانت داری کو [illegible] سمجھتا تھا۔ رات ہو گئی۔ ظفریاب کھلے سمندر میں ادھر سمندر کو دیکھتا اُدھر آسمان کو تکتا تھا۔ اس کی آنکھیں بوجھل ہوتی جا رہی تھیں کہ [illegible] والے محافظ شیرل نے اُسے جھنجھوڑ کر اُٹھا دیا۔ وہ ظفریاب سے کوئی اہم بات کرنا چاہتا تھا۔ محافظ نے دیواروں کی طرف سے محتاط ہو کے بتایا کہ اُس نے غفار کی باتیں سُنی ہیں، یہ لوگ کاغذات پر دستخط لینے کے بعد ظفریاب کو ہلاک کر دیں گے مگر ظفریاب اس بات پر کیسے یقین کر سکتا تھا۔ غفار اُس کا پرانا [illegible] ملازم تھا۔ اس نے گمان کیا کہ ضرور محافظ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ محافظ کہنے لگا کہ پولیس کے مخبر کو باندھ کر ایک طرف ڈال دینے کا وہ تماشا [illegible] ظفریاب خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ رات میں اُنھوں نے مخبر کو آزاد کر دیا ہے' دیکھو وہ سکون سے پڑا سو رہا ہے۔ مگر محافظ کی یہ اطلاع غلط ثابت [illegible] ظفریاب نے جستجو کی تو مخبر کو اسی طرح بندھا ہوا اور بے آرامی کے ساتھ سوتا ہوا دیکھا۔ اسے محافظ کی کج فہمی پر شبہ ہوا۔ اس نے خود کو پُرسکون رکھنے کی [illegible] سمندر میں ان اندیشوں کا حاصل بھی کیا تھا۔ لانچ ایک ویران ساحل پر کنارے لگی تو وہ سب کے ساتھ اُتر گیا۔ اَن جانے میں وہ غفار کے ساتھ لانچ [illegible] پہاڑی کے علاقے میں آ گیا تھا مگر اب غفار اور اس کے شریکِ کار میر محمد کے چہروں سے نقابیں اُتر چکی تھیں۔ اُنھوں نے ظفریاب کو بے بس کر دیا تھا۔ [illegible] دستخط کرنے کے لیے اس کے سامنے رکھ دیے گئے جنھیں اُس نے لوٹا دیا تھا۔ ظفریاب کے لیے ایک پرانے خادم کی بے وفائی کسی بدترین حادثے سے کم [illegible] ہو چکا تھا مگر بدحواس ہونا گویا خود کو کمزور بنانا تھا۔ ظفریاب ایک ذرا موقع ملنے پر بے تحاشا بھاگ اٹھا اور بھاگتا رہا۔ ستم یہ تھا کہ اُس کے پاس [illegible] نہیں تھا۔ پنڈلی سے بندھی ہوئی بس ایک سنگین تھی اور دشمن پوری طرح مسلح تھے۔

ظفریاب کو بہرحال یہ اطمینان تھا کہ دشمن اسے گولی نہیں ماریں گے۔ دستاویزات پر دستخط کرنے تک اس کی زندگی محفوظ ہے۔ اس اُمید میں اُس نے رفتار [illegible] کہ مقصد میں کامیابی کے بعد شاید اس کے دشمنوں کے دلوں میں نرمی آ جائے۔ کیا عجب وہ قائل ہو جائیں کہ قانون سے بھاگا ہوا کوئی شخص اب کس [illegible] لوٹ سکتا ہے۔ وطن کے دروازے جس طرح آج بند ہو گئے ہیں کل بھی بند ہی رہیں گے۔ املاک پر مکمل تصرف کے بعد کوئی موت تو ان سنگ دلوں کے [illegible] ہونی چاہیے۔ ظفریاب نے سپر ڈال دی اور رد و قدح کے بعد کاغذات پر دستخط کر دیے لیکن دشمنوں کی نیت نہیں بدلی۔ جلد ہی ظفریاب کی یہ خوش خیالی [illegible] کہ اس کے لباس میں چھپی ہوئی دولت کا علم دشمنوں کو نہیں ہے۔ میر محمد نے اُسے یہ خزانہ بھی نکالنے کا حکم دیا۔ اس حکم کی تعمیل خودکشی کے مترادف [illegible] ظفریاب نے آخری کوشش کے طور پر واسکٹ کی جیب سے سونے کی مٹھی بھر ٹکیاں اور ہیروں کی تھیلیاں باہر نکالیں اور اس دوران اُسے [illegible] پر وار کرنے کا موقع مل گیا۔ وار کاری تھا مگر دوسری جانب غفار رائفل پر قابو پا چکا تھا۔ اس کے ہاتھوں ظفریاب مارا جاتا کہ آخری لمحے میں [illegible] ان لوگوں کے تعاقب میں آنے والے گارڈ شیرل نے فائر کر کے غفار کو بے بس کر دیا۔ غفار بری طرح بھاگ کھڑا ہوا۔ ظفریاب نے اُس کی رائفل [illegible] میں جا پڑا تھا۔ اب صرف ظفریاب مسلح تھا۔ لانچ والے فائروں کی آواز کے تعاقب میں چل پڑے تھے۔ ظفریاب کے پاس [illegible] سمیٹ کر وہ گارڈ شیرل کی رہنمائی میں بھاگ نکلے۔ [illegible] علاقے کے بعد انھیں درختوں کا جھنڈ دکھائی دیا۔ یہ محفوظ جگہ تھی۔ [illegible] میں جاتے ہی ان کے جسم ڈھیر ہو گئے۔ شیرل نے یہ خدشہ ظاہر کر کے ظفریاب کو اور بدحواس کر دیا کہ دشمنوں کی جماعت میں [illegible] ان تک پہنچ سکتا ہے تاہم وہ وہیں پڑے رہے۔ ظفریاب کو پچھلے دن یاد آ رہے تھے' اپنی ماں اور آبائی [illegible] ۲۷ تھا۔ [illegible] پوش مکان میں رہتے ہوئے [illegible] اور مسجد کے نمازیوں کے لیے [illegible] ظفریاب کی تعلیم شروع ہو [illegible] بہت انہماک سے اسے سبق ازبر کرایا کرتی تھیں۔ [illegible] کاروبار کی [illegible] بھی جاری تھی۔ [illegible] صاحب نے ظفریاب [illegible] پیش گوئیاں کی تھیں' یہ اللہ [illegible] کی تعبیر تھی۔ ظفریاب دولت مند ہو چکا تھا اور ظفریاب [illegible] معلوم نہیں [illegible] کے انکار پر مسجد کے منتظم نے ان کے لیے [illegible] کر دی تھیں۔ [illegible] والی سازشوں سے [illegible] بچا لیا۔ یہی وجہ تھی کہ [illegible] صاحب اور ظفریاب کا [illegible] ظفریاب کے سامنے [illegible] دو سال [illegible] کی آہٹ پر وہ چونک گیا۔ [illegible] دشمن کے پہنچ جانے کا [illegible] ایک [illegible] عورت اپنا بچہ گود میں اٹھائے [illegible] طرح طرح کے جھوٹے سچے [illegible] کامیاب ہو گئے۔ عورت [illegible] اور شوہر کے ساتھ ساتھ [illegible] جھونپڑی میں [illegible] اسمگلنگ کی کارروائیوں میں مدد کرتا تھا اور [illegible] خوش قسمتی سے [illegible] انھیں جھونپڑی میں چھپا لیا۔ اس [illegible] ظفریاب اور شیرل کے [illegible] خاتون نے اپنے شوہر کی سازش [illegible] اُدھر [illegible] انھیں [illegible] میں لیا جا سکتا تھا۔ ظفریاب کے پاس ایک خالی

رائفل اور سنگین تھی مگر شیرل کے پاس کارتوسوں کی پیٹی۔ ان دو ہتھیاروں سے کتنی دیر تک دشمن روکے جا سکتے تھے۔ ظفریاب اور گارڈ شیرل سرد موسم میں [illegible]
سے پسینے پسینے ہو گئے۔

عورت کے کہنے کے مطابق اس کی کشتی کنارے پر کھڑی تھی مگر ملاح کے بغیر سفر آسان نہیں تھا۔ کسی نتیجے پر پہنچنے کے تذبذب میں انھیں دیر لگ گئی [illegible] عورت کا بوڑھا سسر اچانک اندر آ گیا۔ وہ اکیلا آیا تھا اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر رہا تھا لیکن یہ سراسر عیاری تھی۔ گارڈ شیرل نے اب ظفریاب سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس نے جھپٹ کے ظفریاب کے ہاتھ سے رائفل چھین لی اور سب کو نشانے پر لے کے جھونپڑی سے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ ظفریاب کچھ خوش ہوا مگر اسے یاد آیا کہ رائفل تو کارتوسوں سے عاری ہے۔ عورت نے مزاحمت کی تھی کہ شیرل نے بے دریغ اسے طمانچہ رسید کیا۔ شیرل کے حکم پر عورت نے اپنے شیر خوار بچے کو بھی گود میں لے لیا۔ اندھیرے میں وہ جلد ہی جھونپڑیوں سے دور ہو گئے۔ شیرل کے درشت رویے سے صحرائی عورت ایک جگہ بھڑک اٹھی۔ بچہ اپنے سسر کے حوالے کر کے وہ شیرل کے آگے سینہ سپر ہو گئی۔ اس دوران بوڑھے نے پیچھے پیچھے ایک طرف کھسکنا شروع کر دیا تھا۔ یہ دیکھ کر شیرل نے رائفل کا گھوڑا دبا دیا۔ رائفل کا وار خالی جانے پر اسے حیرت ہوئی۔ اس نے اشتعال میں بوڑھے کے سر پر بٹ کھینچ ماری۔ حملہ کرتے ہی شیرل نے رائفل لوڈ کرنے کے لیے میگزین بلٹ کھینچ لی۔ ظفریاب اسی لمحے کا منتظر تھا۔ کوئی توقف کیے بغیر اس نے رائفل اور میگزین بلٹ میں مصروف شیرل کے جسم میں سنگین اتار دی۔ وہ دونوں ڈھیر ہو گئے۔ شیرل کی بٹ سے بوڑھا اور ظفریاب کی سنگین سے شیرل۔ بچہ بوڑھے کے جسم سے لپٹا ہوا تھا۔ عورت بین کرنے لگی لیکن بچہ شاید بوڑھے کے جسم کے بوجھ سے زندہ سلامت تھا۔ کچھ میل دوری ہندوستان کی سرحد تھی۔ رائفل اور میگزین بلٹ پر قبضہ کر کے ظفریاب نے ارادہ کیا کہ عورت کو اس کے گوٹھ پہنچا کے کسی آدمی کی رہنمائی میں وہ سرحد پار کرنے کی کوشش کرے گا۔ دونوں گوٹھ واپس جانے کے لیے تیار ہوئے تھے کہ گوٹھ کی سمت سے فائر نکل گیا اور گولیوں کی آوازیں رفتہ رفتہ قریب ہوتی گئیں۔ یہ عقار اور اس کے ساتھی ہی ہو سکتے تھے۔ اپنے حریفوں کو متنبہ کرنے کے لیے جواب میں ظفریاب نے بھی گولی چلائی۔ وہ لوگ ضرور اس کے نشانے پر آئے ہوں گے کہ فائرنگ رک گئی۔ اب گوٹھ کی طرف جانا خطرناک تھا۔ عورت اور ظفریاب اطراف میں خاموشی دیکھ کر کشتی گھاٹ کی طرف رینگتے ہوئے بڑھے۔ کنارے پر کشتی کھڑی تھی۔ ظفریاب نے بچہ گود میں لے لیا۔ عورت کشتی کے رسّے کھولنے لگی۔ جیسے ہی عورت نے کشتی کی لالٹین روشن کی فائرنگ پھر شروع ہو گئی۔ بچہ زمین پر لٹا کے ظفریاب نے بھی فائر کھول دیا۔ ادھر بچہ بری طرح رونے لگا تھا۔ کشتی کی سمت مسلسل خاموشی سے ظفریاب کو تشویش ہونے لگی کہ کہیں عورت زخمی تو نہیں ہو گئی ہے۔ ایک ہاتھ میں رائفل دوسرے میں بچہ سنبھالے وہ گولیوں کی گونج میں کشتی تک پہنچ ہی گیا۔ عورت کا بیان ابھی تھا کہ اس کے حریف قریب ہی کنارے کی کسی اونچی جگہ موجود تھے اور انھوں نے سنگ باری شروع کر دی تھی۔ ظفریاب کو اپنے پاس کارتوسوں کی کمی کا احساس تھا۔ اس نے احتیاط سے ہوائی فائر کیے اور ایک شخص کو مار گرانے میں کامیاب رہا۔ دونوں نے پھر عجلت کی۔ عورت نے کشتی کا موٹر اسٹارٹ کیا اور بہت مہارت سے کشتی کنارے سے دور لے گئی۔ ایک محفوظ جگہ آ کے انھوں نے لنگر ڈال دیا۔ ظفریاب اتنا تھک چکا تھا کہ ذرا سکون ملنے پر اس کے اعصاب جواب دینے لگے۔ کچھ دیر بعد عورت نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ سپاہی والوں کی روشنی کشتی میں جھلک رہی تھی۔ کسٹم والوں کی کشتی قریب آ رہی تھی۔ عورت نے کیبن سے لائف جیکٹ لا کے ظفریاب کو پہنائی اور اسے جلد سے جلد کشتی سے اترنے کی ہدایت کی۔ کشتی سے اتر کر ظفریاب کوئی آواز پیدا کیے بغیر مشکل سے اونچی گھاس کے نیچے چھپ گیا مگر وہ دلدلی علاقہ تھا اور ظفریاب کا جسم زمین میں دھنس گیا تھا۔ اس طرف کسٹم والوں نے کشتی میں اتر کر باقاعدہ تلاشی لی، عورت کو ڈرایا دھمکایا بھی۔ دور سے عورت اور کسٹم والوں کی گالم گلوچ کی آوازیں آتی رہیں پھر ایک اور کشتی قریب آ جانے پر کسٹم والوں نے اپنی کشتی کا انجن بند کر دیا اور تیزی سے عورت کی کشتی سے اتر گئے۔ ظفریاب زندگی اور موت کی کشمکش میں تھا۔ اس کا جسم دلدل میں دھنستا جا رہا تھا۔ وہ مدد کے لیے بے تحاشا عورت کو آوازیں دینے لگا۔ بہت دیر بعد عورت کی جوابی آواز اسے سنائی دی۔ اس نے رسا پھینکا۔ اسے پکڑ کر کشمکش میں تھرتھراتے ہوئے ظفریاب کو دلدل سے نکالا۔ دوبارہ کشتی میں آ کے وہ بے سدھ ہو گیا۔ عورت نے بتایا کہ دوسری کشتی درحقیقت کسٹم کی تھی۔ پہلی کشتی والوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر وہ کشتی پر موجود رہے تو دونوں جماعتوں میں تصادم ہونا ممکن ہے۔ انھوں نے خاموشی میں عافیت سمجھی۔ جاتے ہوئے وہ ظفریاب کی رائفل بھی ساتھ لے گئے۔ اب ظفریاب کے پاس صرف سنگین رہ گئی تھی۔ دونوں کشتیوں کے دور چلے جانے کے بعد ہی عورت ظفریاب کی طرف متوجہ ہو سکی تھی۔ عورت کا خیال تھا کہ روشنی ہونے سے پہلے وہ کشتی کسی ایسی جگہ لے جانے کی کوشش کرے گی جہاں خشکی کے راستے سرحد پار کی جا سکے۔ اس نے یہی کیا۔ تمام رات مسافت طے کر کے ایک جگہ لنگر ڈال دیا۔ فراغت ملنے پر انھیں ایک دوسرے سے بات کرنے کا موقع ملا۔ عورت نے اپنا نام آل بتایا۔ [illegible] کے لیے اس نے صبح تک آرام کا مشورہ دیا اور خود بھی سو گئی۔ رات کے آخری پہر ان کی آنکھ کھلی تو سمندر کی تیز لہریں بہت دور کشتی بہائے لے گئی تھیں۔ آل کو امید تھی کہ دوپہر تک کشتی کسی کنارے ضرور لگ جائے گی۔ اس کے حساب سے وہ ہندوستان کی سمندری حدود میں آ گئے تھے۔ ظفریاب سمندروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس کی آنکھیں دور دور تک کنارے کی جستجو میں متلاشی رہیں۔

زندگی بھی کیسے کیسے رنگ دکھاتی ہے۔ ظفریاب سے تو زندگی نے بہت تماشے کیے تھے۔ اس کی یادیں کچوکے لگا رہی تھیں۔ اس کی ماں بی بی نے کیسی جان سے اس کی پرورش کی تھی۔ پاکستان میں پہلا گھر بن جانے پر انھوں نے چھوٹا سا جشن منایا تھا۔ ادھر شیخ امام کی ریشہ دوانیاں شدت سے جاری تھیں۔ وہ بی بی کو رسوا کرنے پر تلا ہوا تھا۔ محلے کے لوگ بھی اس کی بڑی برائیوں کے فریب میں آ گئے تھے۔ ماں بیٹے کا وہاں رہنا دوبھر ہو گیا تھا۔ نتیجے میں بی بی کو اپنا مختصر سامان چھوڑ دینا پڑا۔ [illegible] صاحب بھی شیخ امام کی حرکتوں اور بی بی کی بے چارگیوں پر بہت آزردہ ہوئے۔ یہاں تک کہ ایک دن گل دستہ لے کر ظفریاب کے گھر آ گئے۔ انھوں نے اشاروں کنایوں میں بی بی کو شادی کا پیغام دے دیا۔ بی بی نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ تو سُن سی ہو گئی تھیں۔ رات کو انھوں نے اپنے بیٹے سے [illegible] صاحب کے پیغام کے بارے میں پوچھنا چاہا۔ ظفریاب کو اس وقت اتنی باتیں کہاں آتی تھیں۔ تاہم اس کا دل چاہتا تھا کہ بی بی ہاں کر دیں۔

کھلے پانی میں کشتی بہتی جا رہی تھی۔ انھیں کنارہ نہیں ملا اور رات ہو گئی۔ آدھی رات کے وقت تیل بھی ختم ہو گیا تھا۔ ظفریاب نے آل کی ہدایت پر لنگر سمندر میں ڈال دیا اور انھوں نے خود کو سمندر اور خدا کے حوالے کر دیا۔ پینے کا پانی بھی بہت کم رہ گیا تھا۔ صبح ہوتے ہی آل نے اعلان کیا کہ کشتی راستہ بھٹک گئی ہے اور مستزاد یہ کہ اس کے بچے کو بخار ہے۔

وجیہ صاحب جب پہلی دفعہ ہمارے گھر آئے تھے تو انھوں نے جاتے وقت بی جی سے کہا تھا کہ میں پھر آؤں گا اور آتا رہوں گا۔ چار دن بعد وہ مغرب سے کچھ پہلے آئے۔ اسی طرح اپنی گاڑی خود چلاتے ہوئے، اکیلے اور ہاتھ میں پھول لے کر۔ بی جی اُن کے آنے سے خوش ہوئی تھیں، انھوں نے ظاہر نہیں ہونے دیا مگر میں سمجھ رہا تھا۔ بی جی اب روز ہی کمرہ ایسا رکھنے لگی تھیں کہ چاہے کسی وقت بھی مہمان آ جائیں، کسی بے ترتیبی کی وجہ سے انھیں شرمندگی نہ ہو۔ اب ہر وقت صاف ستھری چادریں پلنگوں پر بچھی رہتیں۔ کرسیوں پر پھول دار کپڑے کے غلاف سی کر چڑھا دیے گئے تھے۔ گھر کا سامان جتنا بھی تھا سلیقے سے جما دیا گیا تھا۔ روز شام کو صحن اور کمروں میں جھاڑو دے کر چھڑکاؤ اور پونچھا لگایا جاتا۔

وجیہ صاحب کے آنے پر اس دفعہ ایک نئی بات ہوئی تھی کہ اُن کی گاڑی بستی میں داخل ہوتی دیکھی تو محلے کے تین آدمی سیدھے ہماری گلی میں پہنچ کر مسجد کے سامنے شیخوں کی طرح پڑے ہوئے آر سی سی کے پائپوں پر جا بیٹھے۔ میں دروازہ کھولنے گیا تو وہ ہمارے گھر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اُن میں سے ایک بلند آواز سے کھنکارا اور باقی نے سب کو سُنا سُنا کر باتیں شروع کر دیں۔ باتیں کچھ اس طرح کی تھیں کہ محلے والوں نے وارننگیں دی ہیں اور اب جلد ہی پولیس چھاپا مارنے والی ہے۔ ان میں سب سے بڑھ چڑھ کر وہ آدمی باتیں کر رہا تھا جس نے مُلّاں سراج دین کے کہنے پر یہ جھوٹی گواہی دی تھی کہ اس نے کئی آدمی چوروں کی طرح گھر ہمارے سے نکلتے دیکھے ہیں۔ یہ عجیب سا اور فضول سی شکل کا آدمی تھا۔ اس کے چہرے پر کان سے لے کر رخسار کے اُبھار تک زخم کا بالکل سیدھا نشان تھا، ایسا جیسے کسی نے چاقو سے قلمی آم کاٹا ہو۔ اس کالے بھجنگ پان کھانے والے آدمی کو میں نے کئی بار پولیس والوں کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا تھا۔ ویسے تو یہ مسجد کی طرف [illegible]

رخ نہیں کرتا تھا لیکن جمعے کے دن پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر فرش پر ڈالتا اور دریاں بچھاتا نظر آتا۔ دریاں بچھاتے ہوئے وہ اپنے سر سے میلا سفید رومال لپیٹ لیتا تھا۔ جمعے کی تیاریاں ہو چکتیں تو وہ مسجد میں نہ ٹکتا۔ میں نے اُسے کبھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا، ممکن ہے پڑھتا ہو۔ بی جی کہتی تھیں کہ خواہ مخواہ کسی کی طرف سے بدگمان ہونا اچھا نہیں، کیا خبر وہ اسی مسجد میں کہیں ایک طرف جا کر نماز پڑھتا ہو یا کسی اور محلے میں پڑھتا ہو۔ جو بھی تھا، مجھے نشان والا یہ کالا بھجنگ آدمی دیکھ کر غصہ آتا تھا مگر میں زیادہ دیر غصے میں کیسے رہ سکتا تھا، وجیہ صاحب اس دفعہ بھی آئے تھے تو مسکراتے ہوئے آئے تھے۔ انھوں نے اسی طرح پانی بھرے جگ میں پھول سجا دیے اور دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی کرسی پر جا کر بیٹھ گئے۔

بی جی نے پوچھا۔ "آپ چائے تو یقیناً پئیں گے؟"

کہنے لگے۔ "بہت تھوڑی دیر کے لیے آیا ہوں، کیا اس میں سے بھی کچھ وقت آپ چائے بنانے میں صرف کر دیں گی؟"

بی جی نے پوچھا۔ "کیا کہیں بہت جلدی پہنچنا ہے آپ کو؟"

کہنے لگے۔ "آپ کو ایک مکان دکھانے لے چلنا ہے۔"

بی جی خاموش ہو گئیں۔ وجیہ صاحب کچھ دیر اُن کے ردِ عمل کا انتظار کرتے رہے پھر بولے۔ "میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس محلے سے آپ کو نکال لے جاؤں گا۔"

"کہاں ہے مکان؟" بی جی نے ایک ایک لفظ جیسے سوچ سوچ کر ادا کیا۔

"صدر بازار میں۔"

"کیا کرایہ ہے؟"

"اتنا ہے کہ آپ آسانی سے دے سکتی ہیں۔"

"پھر بھی؟"

"آپ پہلے مکان دیکھیے، پسند کیجیے، ظفریاب سے اس کی منظوری لیجیے، پھر کرایہ بھی معلوم ہو جائے گا۔"

مکان کا سن کر میں ایک دم خوش ہو گیا۔ اتنے دن سے محلے میں جو کچھ ہو رہا تھا بہت ہی عذاب ناک تھا۔ یہاں سے نکلیں گے تو گویا نجات مل جائے گی۔ جتنی دیر میں میں کپڑے بدل کر تیار ہوا بی جی نے وجیہ صاحب کے لیے چائے بنائی اور وجیہ صاحب نے چائے پینے میں جو وقت لگایا وہ بی جی کی تیاری کے لیے کافی تھا۔ مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں ہم گھر بند کر کے گلی میں نکلے اور وجیہ صاحب کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ وہ تینوں آدمی اسی طرح سلیبوں پر بیٹھے تھے۔ مسجد کے صحن سے ملّاں سراج دین ہماری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ وضو کا پانی اپنے چہرے سے پونچھتا جاتا اور دونوں ہاتھ بڑی طاقت سے جھٹک جھٹک کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دھیرے سے وجیہ صاحب سے کہا۔ "یہ جو مسجد کے صحن میں کھڑا ہے یہی پیش امام ہے۔"

ہم بیٹھ گئے۔ وجیہ صاحب اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے اور کھلی آنکھوں سے سلیب پر بیٹھے آدمیوں کو پلک جھپکائے بغیر دیکھتے رہے۔ اُن کے اس طرح دیکھنے سے وہ تینوں گڑبڑا گئے۔ دو نے تو نظریں جھکا لیں۔ چاقو کے نشان والا زور سے "بسم اللہ" کہہ کر اٹھا اور وضو خانے کے چبوترے پر بیٹھ کر خوب شور کرتا ہوا کُلیاں اور غرارے کرنے لگا۔ وجیہ صاحب کے چہرے پر اُن کی آنکھوں میں اتنا رعب ہو گا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ وجیہ صاحب نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم بستی سے روانہ ہو گئے۔

صدر بازار میں زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ وجیہ صاحب نے سینما والے چوک پر گاڑی ایک طرف روک لی۔ مغرب کے بعد صدر کی رونق بڑھ گئی تھی لیکن اُس زمانے میں ایک اچھی بات یہ تھی کہ بازاروں میں اس قدر شور و غوغا نہیں ہوتا تھا۔ فٹ پاتھوں پر لوگ ایک دوسرے سے ٹکرائے بغیر آہستہ آہستہ گزرتے تھے جیسے نمائش دیکھنے نکلے ہوں۔ ہاکروں کو چیخ پکار کرنے کا اتنا شوق بھی نہیں تھا۔ اپنا سامان ہاتھوں میں اٹھائے یا ٹھیلوں پر لگائے وہ یا تو ایک طرف کھڑے رہتے یا راہ گیروں کے درمیان سہولت سے راستہ بناتے اِدھر اُدھر گھوم پھر کر اپنا سامان فروخت کرتے۔ وجہ بس یہی تھی کہ شہر کی آبادی کا یہ حال نہیں تھا جو اَب ہے۔

وجیہ صاحب گاڑی بند کر کے ہمیں کشادہ زینوں والی ایک عمارت میں دوسری منزل پر لے گئے۔ میں نے شہر کے گنجان آبادی والے علاقے کے فلیٹ بھی دیکھے ہیں۔ یہ بھی اقامتی فلیٹوں کی عمارت تھی مگر صدر بازار کے ان فلیٹوں اور دوسرے علاقے کے فلیٹوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ہر منزل پر جہاں فلیٹ کے دروازے زینے کی لینڈنگ پر کھلتے تھے، سرخ گملوں میں بڑے بڑے دبیز پتّوں والے پودے تھے اور ہر فلیٹ کی دیوار پر چھوٹا شفاف آئینہ لگا تھا۔ ایک تختی پر فلیٹ کا نمبر کھدا ہوا تھا۔ زینوں کے ساتھ لکڑی کی ریلنگ تھی، لگتا تھا کہ اس پر ابھی پالش کیا گیا ہے۔ ہم جب چڑھ رہے تھے تو ہم نے دو ضعیف پارسی عورتیں ریلنگ کا سہارا لیے آہستہ آہستہ اُترتی دیکھیں۔ وجیہ صاحب نے اُنھیں سلام کیا۔ اُنھوں نے مسکرا کر وجیہ صاحب کا حال پوچھا۔ میں اس عمارت کی پوری فضا اور صفائی ستھرائی دیکھ کر بہت خوش ہوا لیکن میں نے دیکھا کہ بی جی کے چہرے پر یہ سب کچھ دیکھ کر فکر اور پریشانی بڑھ گئی ہے۔ عمارت کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں چہک رہا تھا۔ بی جی بالکل چُپ تھیں۔ دوسری منزل کا جو فلیٹ وجیہ صاحب ہمیں دکھانے لائے تھے اس کے سامنے موٹے پتّوں والے کئی گملے اور سفید پھولوں والا ایک بڑا سا شہر گملا رکھا تھا۔ میں نے اُچھل کر چھوٹے شفاف آئینے میں اپنی شکل دیکھی، بلند آواز سے فلیٹ کا نمبر پڑھا۔ یہ چار نمبر کا فلیٹ تھا۔ وجیہ صاحب نے جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولا تو نئے پینٹ اور وارنش کی بُو سے پوری لینڈنگ اور اوپر نیچے جانے والے زینے جیسے شرابور ہو گئے۔ اُنھوں نے ہاتھ بڑھا کر اندر دیوار پر سوئچ تلاش کیا اور فلیٹ تیز روشنی سے بھر گیا۔ میں گہری گہری سانسیں لیتا ہوا تیزی سے فلیٹ میں داخل ہوا اور وسیع و عریض خالی کمرے میں دیوار سے دیوار تک دوڑنے لگا۔ بی جی نے مجھ سے کچھ کہا تو اُن کی

فلیٹ کے خالی کمروں میں اِس طرح گونجی جیسے گنبد میں۔ دوڑنا ملتوی کر کے میں فلیٹ کا جائزہ لینے لگا۔ کمروں کی روشنیاں جلاتا پھر رہا تھا۔ فلیٹ کی دیواروں کو ہلکا رنگ کیا گیا تھا۔ چھت انڈے کی طرح سفید تھی۔ بھاری دروازوں اور کھڑکیوں پر ہلکا چاکلیٹی رنگ کا وارنش کی گئی تھی فرش پر چاکلیٹی اور سفید رنگ کے ٹائل لگے تھے بہت خوش نما ڈیزائن تھا۔ میں نے باورچی خانے اور غسل خانے میں جھانک کر دیکھا۔ دونوں جگہ خاصی بلندی تک دیواریں سفید چکنے ٹائلوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ دونوں جگہ اچھی طرح کی ٹونٹیاں اور بیسنک لگے ہوئے تھے۔ میں نے کھڑکیوں پر جڑی ہوئی مچھروں سے بچاؤ والی جالیوں پر انگلیوں سے طبلہ بجایا۔ ہر کمرے میں آ کر آواز پیدا کی اور اس کی گونج سن کر قہقہہ لگایا اور قہقہے کی گونج سنی اور جب میں ایک کمرے میں کھڑے ہوئے وجیہ صاحب اور بی جی کے پاس پہنچا تو میں نے بی جی کو اداسی اور قطعیت کے ساتھ نفی میں سر ہلاتے دیکھا، میں جیسے فرش پر ایک جگہ گڑ کر رہ گیا۔ بی جی کہہ رہی تھیں۔ "نہیں وجیہ صاحب! یہ فلیٹ ہمارے بس کا نہیں ہے۔"

"بس کا نہیں۔ کیا مطلب؟"

"ہم اس کا کرایہ دینے کے قابل نہیں ہیں۔"

"آپ کو کیا معلوم اس کا کرایہ کتنا ہے۔"

"چلیے بتا دیجیے کتنا ہے؟"

"اَسّی روپے ماہوار۔" بی جی لمحے بھر تک وجیہ صاحب کا منہ دیکھتی رہیں۔ پھر بے ساختہ اُن کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وجیہ صاحب نے جیسے بے چارگی سے میری طرف دیکھا پھر بی جی سے کہنے لگے۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

وہ بولیں "جی کچھ نہیں۔ شہر کے بیچوں بیچ تین کمروں کا یہ کشادہ فلیٹ جس کے کچن میں تین لوگ مزے سے کھڑے ہو کر کھانا پکائیں تو بھی جگہ بچ جائے۔ یہ فلیٹ آپ نے ہمارے لیے اَسّی روپے ماہوار کرایہ پر طے کیا ہے۔"

"آپ نے شاید سنا ہو گا کہ بڑے شہروں کے فلیٹوں میں ایک چیز ہوتی ہے پگڑی سسٹم۔ مالک کو ایک خاصی بڑی رقم پگڑی کے طور پر ادا کر دی جاتی ہے اور وہ برائے نام کرایے پر فلیٹ اٹھا دیتا ہے۔ یہاں کے سب فلیٹ پگڑی پر اُٹھے ہوئے ہیں مگر کرایہ کسی کا زیادہ نہیں ہے۔"

بی جی سکون سے سنتی رہیں پھر بولیں۔ "اس فلیٹ کے مالک کو خاصی بڑی رقم پگڑی کے طور پر کون ادا کرے گا؟"

"وہ رقم تقریباً ڈپازٹ کی طرح ہوتی ہے۔ فلیٹ چھوڑتے وقت عموماً اصل پیسوں سے زیادہ واپس مل جاتے ہیں۔"

بی جی نے اثبات میں سر ہلایا۔ "جی ہاں یقیناً مل جاتے ہوں گے۔ میں تو یہ پوچھ رہی ہوں کہ پگڑی ادا کون کرے گا؟"

وجیہ صاحب نے آہستہ سے کہا۔ "آپ کی اجازت سے میں دے دوں گا۔" پھر جلدی سے بولے۔ "ظاہر ہے میری رقم بہرحال مجھے واپس مل جائے گی۔"

بی جی نے اداسی سے اُن کا چہرہ دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر میرا بازو چھوا۔ "نہیں وجیہ صاحب! ہم یہ فلیٹ نہیں لیں گے۔ چلو ظفریاب۔" وجیہ صاحب کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگے۔ بی جی نے نرم آواز میں انھیں مخاطب کیا۔ "وجیہ صاحب! آپ نے اتنی محنت سے یہ فلیٹ تلاش کیا۔ اتنے خلوص سے پگڑی ادا کرنے کی پیش کش کی۔ میں اس مہربانی کا شکریہ ادا کرنے کے بھی لائق نہیں ہوں۔ میں کیا کروں! یہ عنایت قبول نہیں کر سکتی۔ آپ ہمیں گھر پہنچا دیجیے۔" بی جی میرا ہاتھ تھامے آہستہ آہستہ فلیٹ کے ہال سے گزر کر دہلیز پار کر گئیں۔ وہ میرے ساتھ لینڈنگ پر کھڑی تھیں اور وجیہ صاحب کے باہر آنے کا انتظار کر رہی تھیں۔

ہم دونوں فلیٹ کے باہر کھڑے رہے۔ وجیہ صاحب آہستہ آہستہ فلیٹ کے دروازے تک پہنچے اور اندر ہی رک گئے۔ انھوں نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کی چوکھٹ تھام لی اور گہری مغموم آنکھوں سے ہم دونوں کو بس

دیکھتے رہے، کہا کچھ نہیں۔ اتنے میں اوپر کے زینوں سے کسی کے تیزی سے اترنے کا شور سنائی دیا۔ چندرا سولہ برس کا ایک لڑکا پھول دار بش شرٹ اور نیلی جینز پہنے ہلکی سیٹی پر کوئی دھن بجاتا اُتر رہا تھا۔ وہ اپنے چہرے مہرے سے گوانیز لگتا تھا۔ اس نے وجیہ صاحب کو دیکھ کر "ہیلو واجی صاحب" کہا اور اسی طرح پر شور انداز میں نیچے اتر گیا۔ وجیہ صاحب نے گوانیز لڑکے کی ہیلو کے جواب میں اُس کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا تھا۔ وہ اور ہم دونوں اِسی طرح کچھ دیر کھڑے رہے پھر وجیہ صاحب نے فلیٹ کے کمروں میں جا جا کر سب روشنیاں بجھائیں، باہر کا دروازہ بند کیا اور بند دروازے کے سامنے رُک کر ایک بار گہری سانس لی پھر بی جی سے کہنے لگے۔ "تہمینہ! میں نے آپ کو پوری بات نہیں بتائی۔ اب پوری بات اِسی جگہ بتا دینا چاہتا ہوں۔ یہ بلڈنگ 'رضی کورٹ' میرے والد نے بنوائی تھی۔ اُن کے انتقال کے بعد اس کا مالک میں ہوں۔ اِس فلیٹ کی پگڑی کوئی کسی کو ادا نہیں کرے گا۔ چار دن پہلے تک یہاں میرا دفتر تھا اور زیادہ تر بند رہتا تھا۔ میں نے صفائی اور رنگ وغیرہ کرا دیا، اِس خیال سے کہ فلیٹ آپ کو پسند آ جائے گا۔ لیکن..." وہ خاموش ہو گئے۔

بی جی ان کی تقریر انہماک سے سن رہی تھیں، وہ رُک گئے تو ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔ "مجھے پسند آ جائے گا اور میں اَسّی روپے کے بھاری کرایے پر یہ فلیٹ لے لوں گی۔ جی؟"

"جی ہاں۔ مگر کرایے کے سلسلے میں، میں نے غلط بیانی سے کام نہیں لیا ہے۔ میں اگر یہ فلیٹ الجھائے نہ رکھتا تو اس کا کرایہ شاید اتنا ہی ہوتا۔"

بی جی نے اثبات میں سر ہلایا اور نرمی سے کہا۔ "اگر آپ چار دن پہلے ہی بتا دیتے تو یہاں سے دفتر منتقل کرنے اور رنگ و روغن پر جو کچھ خرچ ہوا ہے، وہ بچ جاتا۔"

وجیہ صاحب نے اداسی سے نفی میں سر ہلایا۔ "چلیے اسی بہانے صفائی اور رنگ و روغن ہو گیا۔ اگر آپ کا یہ فیصلہ قطعی ہے اور جیسا کہ نظر آ رہا ہے کہ یہ قطعی ہے تو دفتر پھر یہیں لوٹ آئے گا۔" وہ پھیکی ہنسی ہنسے۔ "اِکلوتے منشی جی خوش ہو جائیں گے۔ برسوں میں بیٹھے اونگھتے رہے تھے۔ اب ایک روشن دفتر میں بیٹھ کر اونگھیں گے، آئیے چلیں۔"

صدر بازار سے گھر واپسی کا سفر تقریباً خاموشی سے کٹا۔ بی جی نے وجیہ صاحب سے معذرت کی، ان کا وقت اور پیسہ ضائع کرانے پر شرمندگی کا اظہار کیا۔ وجیہ صاحب نے بی جی سے بڑی دُکھی آواز میں کہا۔ "میں درخواست کرتا ہوں آیندہ ایسی بات نہ کہیے گا۔" پھر کہنے لگے۔ "میں اپنی طرف سے بہت چالاک بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچھا ہوا، میرے جھوٹ کی قلعی آپ پر کھل گئی۔"

مگر میں جانتا تھا، وجیہ صاحب جھوٹے آدمی نہیں ہیں۔ شاید بی جی بھی یہ جانتی تھیں اس لیے کہ انھوں نے اس لفظ پر وجیہ صاحب سے احتجاج کیا۔ دونوں اسی طرح کی کچھ باتیں کر کے خاموش ہو گئے۔ میں نے بے دلی سے سڑک کی روشنیاں دیکھتے ہوئے سفر طے کیا۔

ہم گھر پہنچے تو گلی سنسان تھی، اگرچہ ابھی رات کے نو بھی نہیں بجے تھے۔ وجیہ صاحب نے گلی میں داخل ہوتے وقت کئی بار ہارن دیا اور ہمارے دروازے پر گاڑی کے انجن کو ریس دی۔ وہ دروازے پر اس وقت تک ٹھیرے رہے جب تک ہم نے کمرے کھول کر روشنی نہیں کر لی پھر وہ بلند آواز سے مجھے خدا حافظ کہتے ہوئے چلے گئے۔

میں نے بے دلی سے رات کا کھانا کھایا اور بی جی سے زیادہ بات کیے بغیر بستر پر چلا گیا تھا۔ آج میں پہلی بار بی جی سے ناراض تھا۔

رات کو کسی وقت ہمارے صحن میں اور چھت پر کسی نے بڑے بڑے پتھر پھینکے۔ بی جی نے بہت دن سے کمروں میں روشنی کر کے سونا شروع کر دیا تھا۔ ہم اپنے اپنے بستروں پر اُٹھ کر بیٹھ گئے اور اُس وقت تک بیٹھے رہے جب تک پتھر آنا بند نہیں ہو گئے۔ پتھر بند ہونے کے بعد بھی کافی دیر تک مجھے نیند نہیں آئی۔ میں بستر پر

سب

آنکھیں بند کیے چُپ چاپ لیٹا رہا۔ مجھے معلوم تھا بی جی بھی جاگ رہی ہوں گی مگر میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔ پھر نہ معلوم میں کب سو گیا۔ صبح اُٹھ کر میں نے ان سے یہ تک نہیں پوچھا کہ وہ رات کو دوبارہ سو بھی سکیں یا نہیں' میں اس روز اتنا خفا تھا۔

رات کو آنے والے پتھروں سے صحن میں رکھا ہوا پرانا گھڑا ٹوٹ گیا تھا۔ ٹین کی چھت پر گرنے والے پتھروں سے ہماری اور باقی محلے والوں کی نیند خراب ہوئی تھی۔ یہ ایک اعتبار سے اچھا ہی ہوا۔ ہم دونوں صبح کینٹین جانے کے لیے نکلے تو محلے والے دو تین ٹولیوں میں بٹے ہوئے گلی میں باتیں کر رہے تھے۔ ٹھیلے والے مولانا بھی ایک ٹولی کے ساتھ کھڑے تھے ہمیں گھر سے نکلتے دیکھ کر وہ سر جھکائے ایک طرف نکل گئے۔ ایک ٹولی سے محلے کے ایک بڑے میاں نکلے اور بی جی کو مخاطب کر کے اُنھوں نے کہا۔ "بھئی وہ تمھارے....."

بی جی نے اُن کی طرف سپاٹ اجنبی نظروں سے دیکھا' انھیں بات بھی پوری نہیں کرنے دی اور بلند آواز میں کہا۔ "سلام علیکم۔" اور میرا ہاتھ پکڑے گلی سے گزر گئیں۔ ہمیں شاید اب اپنے معزز محلے داروں کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

کینٹین میں آج کا دن خاصا بے کیف تھا۔ اب میں اور لڑکا کمپنی کے افسروں کی چائے لے جانے لگے تھے۔ میں نے وجیہ صاحب کو چائے پینے کے دوران پتھروں والی بات بتائی۔ وہ بہت دیر تک پیشانی پر بل ڈالے چپ چاپ بیٹھے رہے پھر کہنے لگے کہ کام ختم کر کے آج وہ ہم دونوں کو اپنی گاڑی میں گھر لے جائیں گے۔ کہنے لگے "جب تک تم لوگ اپنا محلہ چھوڑ نہیں دیتے' یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔" پھر دھیرے سے بولے۔ "کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔"

میں نے بی جی کو نہیں بتایا کہ میں پتھروں والی بات وجیہ صاحب سے کہہ آیا ہوں۔ سوچا شام کو گھر چلتے وقت انھیں خود معلوم ہو جائے گا۔

شام کے وقت ایک لمبی تڑنگی بوڑھی عورت سفید اُجلی ساڑی پہنے کینٹین میں آئی اور بی جی کے پاس کھینچ کر بیٹھ گئی۔ خبر نہیں' بہت دیر تک وہ اُن سے باتیں کرتی رہی۔ لگتا تھا' کوئی بحث چل رہی ہے۔ انھوں نے اُسے بالائی والی چائے پلائی۔ چائے پی کر وہ نہیں' اسی طرح بیٹھی رہی۔ آخر کینٹین بند کرنے کا وقت آگیا۔ بی جی نے لڑکے کو رخصت کر دیا۔ وہ اور میں ساڑی والی بڑی بی کے ساتھ نکلے تو وجیہ صاحب سیکریٹری کے کمرے میں جا بیٹھے۔ دس بارہ منٹ بعد وجیہ صاحب اپنا بریف کیس اٹھائے برآمد ہوئے اور ہم جلوس کی شکل میں اُن کی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ بی جی سے اُنھوں نے کچھ زیادہ بات نہیں کی۔ وجیہ صاحب ڈرائی ور کے برابر بیٹھے اُسے راستے بھر ہدایات دیتے رہے۔ میں بی جی اور بڑی بی پیچھے بیٹھے تھے۔ زیادہ تر خاموش رہے۔ گاڑی اسی طرح ہمارے محلے میں داخل ہوئی۔ ڈرائی ور نے گلی میں داخل ہوتے ہوئے بار بار ہارن دیا۔ ہم دونوں اور بڑی بی گھر میں چلے گئے۔ وجیہ صاحب اور ڈرائی ور ہمارے دروازے کے سامنے گاڑی کھڑی کرنے کے بعد گلی کے دونوں سروں پر راستے میں اس طرح کھڑے ہو گئے کہ گلی سے گزرنے والے آدمی کو اُن سے بچ کر گزرنا پڑا۔ وہ کوئی آدھے گھنٹے اس طرح گلی میں کھڑے رہے' کبھی ٹہلتے رہے پھر وجیہ صاحب نے مجھے آواز دے کر بلایا۔ ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے' ڈرائی ور گلی میں ٹہلتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ساڑھی والی بڑی بی میرے اور وجیہ صاحب کے لیے چائے بنا لائیں جو ہم نے گاڑی میں بیٹھ کر پی۔ مغرب کے بعد ڈرائی ور' وجیہ صاحب کو لے کر چلا گیا۔ بی جی نے بڑی بی کے لیے دوسرے کمرے میں سونے کا بندوبست کر دیا تھا۔ اُنھوں نے رات کا کھانا پکانے میں بی جی کا ہاتھ بٹایا۔ کوئی دس بجے رات تک وہ ہمارے کمرے میں کرسی پر بیٹھی اپنے آبائی وطن دار جلنگ کے قصے سناتی رہیں۔ وہاں کا موسم' وہاں کے لوگ' چائے کے باغات' جنگلی جانوروں کے قصے اور نہ جانے کیا کیا۔ دس بجے ہمارے دروازے پر وجیہ صاحب کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ بڑی

لگیں۔ "صاحب کا ڈرائیور چوکی دار کو کھانا دے گیا ہو گا۔" بی جی کی اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بڑی بی نے دروازے پر کھڑے ہو کر اس آدمی کو جو وہ چوکی دار کہہ رہی تھیں، بلند آواز میں مکالمہ شروع کر دیا۔ "چوکی دار! تم نے کھانا کھا لیا؟"

وہ بولا۔ "کھا لیا۔"

"ٹھیک ہے۔ گلی سب دیکھ لی؟"

"ہاں دیکھ لیا۔"

"اب ادھر ہی رہنا، جانا نہیں۔"

"ہم نے کدھر۔ ادھر ہی رہے گا۔"

"وہ سامنے مسجد کے ساتھ سلیب پڑے ہیں۔ مرضی ہو تو ادھر بیٹھنا۔"

"اچھا۔"

"سونا نہیں۔"

چوکی دار شاید بُرا مان گیا۔ "بی بی! ہم چوکی دار ہے، کوئی نہیں ہے۔ سوئے گا کیسے۔"

اس طرح بات کر کے بڑی بی پورے محلّے کو سنا رہی تھیں کہ اب ہمارے گھر کی چوکی داری کی جائے گی۔

چوکی دار کی بات پر انھوں نے اپنی بھاری اور تقریباً مردانہ آواز میں قہقہہ لگایا۔ "تو کیا سو ہی سو جاتے ہیں؟"

چوکی دار ابھی تک برہم تھا، کھردری آواز میں کہنے لگا۔ "ہمارے کو کیا پتہ سو جاتا ہو گا۔"

اس دن کے بعد سے ہم بے خوف بلکہ بھاری بن کر رہنے لگے۔ پھر کبھی پتھر نہیں پھینکے گئے، نہ ہی محلّے کے لڑکوں نے سلیب کی بینچ پر بیٹھ کر ہمیں کچھ کہا۔

صبح بڑی بی ہمارے ساتھ کینٹین آ جاتی تھیں۔ وہاں سے وہ صاحب کا ڈرائیور انھیں لے جاتا اور شام کو واپس لے آتا۔ کوئی دس بجے چوکی دار آ کر مجھے آواز دیتا کہ "صاحب خانا! میں آ گیا ہوں۔" بڑی بی روز اس سے دروازے پر کھڑی ہو کے مکالمہ کرتیں۔ کبھی اسے تاریخ بدلنے کا مشورہ دیتیں۔ کبھی کہتیں قسم اٹھا اور ... کیوں بھاگتے ہو، اپنا محلّے والوں کو سونے نہیں دو گے۔ یہ ساری باتیں حسب معمول زور دار آواز میں کی جاتیں۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ پھر بی جی کو عزیز مستری کے رشتے دار اسلم صاحب کا دکھایا ہوا ایک مکان پسند آ گیا اور ہم اپنے مکان میں تالا ڈال کے نئے مکان میں اٹھ آئے۔ اس کا کرایہ نوّے روپے تھا۔ دو کمرے، بجلی اور پانی کا آرام تھا۔ سب سے عمدہ بات یہ تھی کہ کینٹین سے یہ مکان بہت قریب تھا۔

نئے مکان میں آ کر کوئی خاص خوشی تو نہیں ہوئی، بس وہ بوجھ اُتر گیا جو پرانے محلّے میں ہر وقت ذہن پر مسلط رہتا تھا۔ یہ ذرا پڑھے لکھے لوگوں کا علاقہ تھا، مکان کے کمرے بڑے اور ہوادار تھے۔ بی جی کو کرایے کے نوّے روپے مہینہ دینا اچھا نہیں لگتا تھا، بجلی اور پانی کا خرچ علیحدہ تھا، وہ کہتی تھیں، سر چھپانے کے لیے ایک گھر پر اتنی رقم خرچ کرنا ہماری حیثیت سے زیادہ ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کینٹین میں آنے والے لوگوں سے برابر کچھ کہہ سن رہی تھیں۔ ایک روز وہ اور میں جائداد کے ایک دلّال کے ساتھ پرانے محلّے میں اپنے مکان پر بھی گئے۔ دلّال نے دیواریں تک ٹھونک بجا کر دیکھیں۔ میں

نے ٹیوب ویل چلا کر دکھایا بجلی جلا کر دکھائی مگر وہ کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوا۔ بُرا سا منہ بنا کر کچھ رقم بتا کر چلا گیا جو بی جی کے خیال میں بہت کم تھی۔ بی جی نے دوسرے دن انکار کر دیا مگر اسی دلّال کو کمیشن کا لالچ دے کر بی جی نے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ ہمارا مکان کرائے پر اٹھوا دے۔ ہفتے بھر بعد ساٹھ روپے مہینے پر مکان اُٹھ گیا۔ ٹیوب ویل کی وجہ سے کرایہ اچھا ملا ورنہ لوگ چالیس پچاس سے آگے بڑھتے ہی نہیں تھے۔

بی جی کو اب نئے مکان کا کرایہ دینا بوجھ نہیں لگتا تھا۔ میں نے اس محلّے میں آ کر باقاعدہ ٹیوشن سینٹر میں داخلہ لے لیا۔ ٹیوشن سینٹر گھر کے بالکل سامنے تھا۔ میں رات آٹھ بجے سے گیارہ بجے تک باقاعدہ کلاس میں شریک ہونے لگا۔ اس مکان پر وجیہ صاحب دوسری بار آئے تو ہمیشہ کی طرح پھول لائے۔ اس سے پہلے میں نے اُنھیں اکثر مسکراتے دیکھا تھا یا کم سے کم اُن کے چہرے پر ایک طرح کی طمانیت ہوتی تھی مگر آج خاصے بکھرے ہوئے اور نڈھال دکھائی دے رہے تھے۔ بی جی نے پوچھا تو کہنے لگے کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے پھر بولے۔ "طبیعت اس لیے ٹھیک نہیں ہے کہ میری بچی اسپتال میں ہے۔" بی جی ہاتھ کا کام رکھ کر وجیہ صاحب کے قریب جا کھڑی ہوئیں۔ "کیا بات ہے۔ بے بی اسپتال میں کیوں ہے؟" بی جی نے اس بچی کو ایک ہی بار وجیہ صاحب کے گھر ضیافت والے دن دیکھا تھا۔ اتفاقاً ہم بچی کے بیڈ روم میں چلے گئے تھے۔ وہ ہمارے جانے سے گھبرا کر اُٹھ بیٹھی تھی اور بی جی سے آئی آئی کہہ کر لپٹ گئی تھی۔ بی جی کئی بار یہ واقعہ یاد کر چکی تھیں۔ وہ اکثر بچی کا تذکرہ کرتی تھیں۔ آج وجیہ صاحب نے اس کے بارے میں تفصیل بتائی تو ہمیں پہلی بار معلوم ہوا کہ وہ بچی عام بچوں کی طرح نہیں ہے بلکہ پیدائشی طور پر اس کا ذہن کمزور ہے۔ وہ اپنے ہاتھ پیر عام بچوں کی طرح استعمال کر سکتی ہے مگر کبھی کبھی مرض کی زیادتی ہو تو دشواری بھی محسوس کرتی ہے۔ علاج ہوتا رہتا ہے۔ ماں کے مرنے کے بعد اُس کی حالت بگڑی ہے۔ کبھی تو وہ پورے پورے لفظ اس طرح ادا کرتی ہے کہ آسانی سے سمجھ میں آ جاتے ہیں اور کبھی اُس کی زبا[ن] قابو میں نہیں رہتی۔ اس خوب صورت بچی کے بار[ے] میں یہ سب کچھ معلوم کر کے بی جی کے دل میں افسو[س] اور ہمدردی پیدا ہونا فطری تھا۔ خود مجھے ایسا محسوس ہو[ا] جیسے کسی نے میری کوئی بہت پیاری چیز ٹوٹ جانے یا گم جانے کی خبر سنائی ہو۔ وجیہ صاحب نے یہ سب باتیں دُکھے ہوئے لہجے اور دھیمی آواز میں سنائیں۔ اُن کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنی بیمار اور معذور بچی کس شدّت سے چاہتے ہیں۔ اُنھوں نے بتایا کہ وہ [illegible] کو علاج کے لیے یورپ بھی لے گئے تھے مگر سبھی ماہرو[ں] نے ہر طرح دیکھنے بھالنے کے بعد یہ کہا کہ بہتری کی کو[ئی] صورت نہیں بلکہ خطرہ ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ [illegible] کیفیت اور بگڑ جائے گی۔ مکمّل طور پر یہ بچی شاید کبھ[ی] معتدل نہ ہو سکے۔ بس یہ ہو سکتا ہے کہ محبت، توجّہ او[ر] دیکھ بھال سے اُس کی حالت جیسی ہے ویسی ہی رکھنے [کی] کوشش کی جائے۔ یہی اس کا علاج ہے۔ وقتی پریشانیو[ں] اور عارضوں کے لیے بھی اسے خصوصی کلینک لے جا[نا] پڑتا تھا۔ اب نمونیے کے علاج کے لیے وہ دو روز سے ایک خصوصی کلینک میں داخل تھی۔ چوبیس گھنٹے ایک نرس اُس کی خدمت کے لیے مامور تھی۔ وجیہ صاحب صبح و شام اُسے دیکھنے جاتے تھے۔

بی جی نے پہلی بار وجیہ صاحب سے جیسے کچھ طلب کیا۔ اُنھوں نے درخواست کے انداز میں کہا کہ "مجھے [illegible] بی کے پاس لے چلیے، ممکن ہو تو ابھی۔" وجیہ صاحب کچھ دیر خاموشی سے ان کا چہرہ دیکھتے رہے پھر بولے۔ "ضرور لے چلوں گا مگر ابھی نہیں، صبح۔ اُسے مغرب کے بعد دوا دے کے سُلا دیا جاتا ہے پھر صبح اُٹھایا جاتا ہے۔ صبح آپ کو میں یہیں سے لے چلوں گا۔" وجیہ صاحب افسر[دہ] ہونے کے باوجود بی جی کے ساتھ جانے کا پروگرام بنا[تے] کرتے وقت زندگی سے بھرپور اور پُرجوش لگ رہے تھے۔ کئی دنوں کی اُداسی کے بعد خود میں نے وجیہ صاحب کے لیے مسرّت کی ایک لہر اپنے دل میں اُٹھتی محسوس کی۔ [بی] جی کے بعد میں اگر کسی کو چاہنے لگا تھا اور کسی سے قریب

محسوس کرتا تھا تو وہ وجیہ صاحب ہی تھے۔ میں نے فلیٹ والے قصے کے بعد انھیں افسردہ دیکھا تھا آج بی جی سے باتیں کرتے ہوئے میں نے انھیں خود سے بہت قریب محسوس کیا۔ میرا جی چاہا بڑھ کر اُن کے گلے لگ جاؤں۔

دوسرے دن بی جی اور وجیہ صاحب بے بی کو دیکھنے اسپتال گئے۔ میں کینٹین میں مصروف رہا۔ میں نے بھی دبے لفظوں میں جانے کا خیال ظاہر کیا تھا لیکن وجیہ صاحب نے کہا کہ بچّوں کا داخلہ اسپتال کے اس حصّے میں منع ہے۔ کوئی دو گھنٹے بعد بی جی اسپتال سے لوٹیں تو کھوئی کھوئی سی تھیں۔ سارا دن وہ اسی طرح رہیں۔ میں نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ جب بی جی کو کسی طرح کی پریشانی ہوتی تو وہ نڈھال ہونے کے بجائے دُگنی شدّت سے مستعد ہو جاتیں۔ اُس روز بھی وہ شام تک میرے اور لڑکے کے ہاتھ سے چھین چھین کر کام کرتی رہیں۔ انھیں مدّتوں کے چھوڑے اور ٹالے ہوئے چھوٹے بڑے کام یاد آرہے تھے۔ اس رات وہ بستر پر لیٹیں تو تھکن کے مارے سو نہ سکیں۔ میں نے کہا۔ "بی جی! آج آپ بہت تھکی ہوئی ہیں! لائیے میں آپ کے ہاتھ پیر داب دوں۔"

وہ پھیکی ہنسی کے ساتھ بولیں۔ "تھکا تو تُو ہے، آج زیادہ کام تُو نے کیا ہے، ہاتھ پیر تو تیرے دُکھ رہے ہوں گے۔" میں ضد کرنے لگا تو بولیں۔ "اچھا میں باری باری اپنے بازو پھیلا دوں گی، تو یہاں آجا اور ان پر سر رکھ کر لیٹ جا اور مجھ سے باتیں کر۔"

اُس رات ہم نے گھنٹوں باتیں کیں۔ باتوں باتوں میں بی جی نے اپنی اور ظاہر ہے، میری زندگی کے بارے میں ایک بہت اہم فیصلہ کیا۔ بی جی نے کہا۔ "میں نے وجیہ صاحب کو ایک ہمدرد اور شریف آدمی پایا ہے لیکن صرف ہمدردی اور شرافت جیسے اچھے اوصاف بنیاد بنا کر زندگی بھر ساتھ رہنے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے دیکھنا یہ تھا کہ کیا میں ان کے لیے اور وہ میرے لیے ضروری ہیں۔ میں نے پاکستان میں جس طرح زندگی شروع کی اور جان توڑ محنت اور کوشش کے بعد اب جہاں تک پہنچی ہوں اس کے بعد تو مجھے سکون کی سانس لینی چاہیے لیکن مجھے ظفریاب تمھاری خاطر ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ وجیہ صاحب کی سماجی اور مالی حیثیت یقیناً ایسی ہے کہ مجھے اُن کی تجویز پر فوراً "ہاں" کہہ دینا چاہیے تھا۔ اسی حیثیت کا آدمی مجھے اور تمھیں آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ ہمیں کسی وجیہ الدین ہی کی ضرورت تھی مگر شاید ہم بھی اُن کی ضرورت ہیں کہ نہیں، صرف یہ غور کرنا تھا۔ اِسی لیے میں نے اُن کی تجویز کا کوئی جواب نہ دیا تھا۔ انھوں نے ایک گندے ماحول سے ہمیں صاف ماحول میں لے جانے کے لیے بہت اچھا اور اعلا درجے کا انتظام کیا تھا، میں اس پر بہت مسرور ہوئی تھی مگر اس وقت تک مجھے اس سوال کا جواب نہیں ملا تھا کہ کیا ہم میں بھی وجیہ صاحب کی ضرورت ہوں؟ تم بچّے ہو ظفریاب! ابھی تم اس لفظ ضرورت کے تہہ در تہہ معنی نہیں سمجھو گے۔ بی جی کے بہت سے لفظوں کے معانی میں واقعی نا آشنا تھا مگر مجھے کہیں وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی میں سب کچھ اچھی طرح اخذ کر رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ کہنے لگیں۔ "بیوی ہر گھر کی ضرورت ہوتی ہے مگر میں ایک گہری روحانی رشتے کے ساتھ ساتھ سماجی اور مادّی ضرورت کی شرط بھی پوری کرنا چاہتی تھی۔ اب اُن کا دکھ، میری شرط پوری کر گیا ہے اور وہ بچّی جس نے آدھی رات کو نیند سے چونک کر مجھے امّی کہہ کر آواز دی تھی، میرے لیے بھی ایک روحانی ضرورت بن گئی ہے۔ میں وجیہ صاحب کے لیے اس بچّی کی خدمت کروں گی، اُس کی دیکھ بھال کر کے، اس پر توجہ صرف کر کے میں خود وجیہ صاحب کی سماجی، مادّی اور روحانی ضرورتوں کی تکمیل بن کر رہوں گی۔ اس طرح سب شرائط پوری کروں گی۔ ظفریاب! سنو، میں نے بی کو دیکھنے اس سے بات کرنے کے بعد وجیہ صاحب سے ہاں کر دی ہے۔ میں وجیہ الدّین صاحب سے شادی کر رہی ہوں۔"

☆ .... ○ .... ☆

امّی اپنے بیٹے کو گود میں لیے عرشے پر دھوپ میں بیٹھی تھیں۔ گزشتہ روز اس نے مجھے سمجھایا تھا کہ میں

[illegible] میں زیادہ نہ رہوں'' اس سے پیاس بڑھتی ہے اور
[illegible] تھا کہ پیاس بڑھنے کا مطلب ہے پانی کے محدود
[illegible] طلب کا بوجھ بڑھ جانا۔ میں نے آلی کو نرمی سے
[illegible] کر اٹھایا اور اُسے اس کے بچّے کے ساتھ انجن
روم کی پناہ میں لے جا کر بٹھا دیا۔ اگرچہ اس نے مجھے
[illegible] کی کوشش کی تھی کہ بچّے کو سردی لگ جانے
کی وجہ سے وہ زیادہ پریشان نہیں ہے' کہہ رہی
تھی ''ٹھیک ہو جائیں گا چھوکرا۔ میرے کو دوا دارو آتا
[illegible] لیکن میں جانتا تھا کہ کوئی ماں کتنی ہی بے خوف کا
[illegible] ہو کہ اُس کی سب سے پہلی فکر اولاد ہوتی ہے۔
[illegible] ایندھن ختم ہو جانا' پانی ختم ہو جانا' خوراک نہ
[illegible] سب دوسری سطح کی فکریں تھیں' آلی کے لیے پہلی
فکر اس کا بیٹا تھا جو نمونیے کے بخار میں جل رہا تھا۔
آلی کچھ دیر اپنے بیٹے کو چھاتی سے لگائے بیٹھی رہی
پھر اٹھی اور انجن روم کی محدود جگہ میں لکڑی کے فرش
[illegible] بنے ہوئے چور خانوں اور لاکروں میں کچھ ڈھونڈنے
لگی۔ [illegible] طرح کی ڈبیاں اور شیشیاں اُٹھائے وہ اپنے بیٹے
کے پاس آ بیٹھی۔ ایک ڈبیا کھول کر اُس نے تیز بُو والی
[illegible] دوا نکالی پھر اسی ڈبیا کے ڈھکنے میں تھوڑا سا پانی لے
کر اُس نے سُوکھے ہوئے چمڑے کی دھجیوں جیسی دوا پانی
میں گھولنی شروع کر دی۔ پندرہ بیس منٹ تک وہ دوا تیار
کرتی رہی' جب اس کی صورت سیاہ محلول کی سی ہو گئی تو
آلی تھوڑا تھوڑا کر کے اپنے بیٹے کو چٹانے لگی۔ دوا بدمزہ
ہو گی' بچّہ کم زور آواز میں روتا' شور مچاتا اور احتجاج
کرتا رہا۔ آلی نے اپنا ہاتھ نہیں روکا' بچّے کو پوری دوا
پلا دی۔ اس نے ایک بوتل سے تھوڑی سی کوئی رقیق چیز
نکالی' بچّے کے کپڑوں میں ہاتھ ڈالا اور اُس کے سینے پر
مالش کی۔ بوتل کا یہ مائع اس نے بچّے کو بھی پلایا۔ بچّے
نے بڑا سا منہ بنا کر مالش والی دوا پی لی پھر سو گیا۔ آلی نے
[illegible] بیٹھنے کی دری کئی بار تہ کر کے موٹا سا ایک گدا سا
بنا لیا تھا اور اُسے کمبل کی دوہری تہ اُڑھا دی تھی' وہ اُسے
[illegible] آرام پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے
[illegible] ہوئے بچّے کا رخسار چھو کر دیکھا' بخار کم نہیں ہوا
[illegible]

تھا لیکن بچّے کی طبیعت کچھ بحال ہوئی تھی۔ اُس کی سانس
بھی قابو میں آتی جا رہی تھی۔ میرے ذہن سے یہ بوجھ اُتر
گیا کہ آلی کے بیٹے کی حالت فی الحال تشویش ناک نہیں
ہے۔ اب ہم لوگوں کو اپنی فکر کرنی چاہیے۔ پانی اور
خوراک کے بغیر ہماری زندگی کے دن گنے جا چکے
ہیں۔ دوسرے سامان کے علاوہ آلی نے کشتی کے لاکروں
اور چور خانوں سے ڈور اور کانٹا نکال کر باہر ڈال دیا تھا۔
کانٹے پر نائلون اور سلک کی بنی ہوئی ڈرائی فلائی لگی
تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ہر مچھلی اس پر منہ ضرور مارے
گی۔ خاص قسم کی مچھلیاں اِدھر ہوئیں تو ہو سکتا ہے' ہم
کچھ شکار کر لیں۔ میں نے ڈور اور سینکر سلجھا کر دُور کانٹا
پھینکا اور کچھ مچھلی لگنے کی توقع میں کچھ اپنی حالت پر غور
کرنے کے لیے ڈور ڈال کر بیٹھ گیا۔ آلی بھی جانتی تھی کہ
اب انتظار کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنے بیٹے کے
پاس لیٹی تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ سمندری لنگر کے
باوجود کشتی نے بہنا شروع کر دیا ہے۔ اب کیا معلوم کہ جو
سمندری رَو ہمیں بہائے لیے جا رہی ہے' وہ کنارے سے
دُور لے جائے گی یا ساحل پر لگا دے گی۔ پچھلے چند روز
کے طوفانی واقعات کے بعد اب خاموش ہو کر آیندہ پیش
آنے والے حالات کا انتظار اعصاب کو سکون دے رہا
تھا لیکن ذہن ان تمام خدشات کی آماج گاہ بنا ہوا تھا جو
ایسے حالات میں گرفتار مسافروں کو پیش آ سکتے ہیں۔ وہ
متضاد کیفیتوں سے گزرتا ہوا میں سر پر دری کا سایہ کیے
کشتی کے پہلو سے جڑا بیٹھا تھا اور منتظر تھا انتظار کہ کیا
کچھ بھی ہونے کا۔ میں ڈھائی گھنٹے پانی میں ڈور ڈالے بیٹھا
رہا۔ کچھ نہیں ہوا۔ آخر ڈور وہیں باندھ کر دری کھینچتا ہوا
میں انجن روم میں آ گیا اور آلی کے برابر دری بچھا کر لیٹ
گیا۔ آلی نے ایک بار آنکھیں کھول کر سر گھما کر میری
طرف دیکھا تھا۔ شاید میرے چہرے پر تھکن اور مایوسی
کے اثرات دیکھ کر اُس نے کچھ نہیں پوچھا' آنکھیں بند کر
لیں اور ذرا سا سرک کر مجھے جگہ دے دی۔ بچّے کی
کیفیت اور جس مصیبت میں ہم خود گرفتار تھے' اس نے
آلی کا ذہن گھیر رکھا تھا' وہ اپنی حالت کے بارے میں کیا

سوچتی۔ میں نے اس کا بازو چھو کر محسوس کر لیا تھا کہ اُسے پھر بخار ہو گیا ہے۔ میں نے دھیرے سے اسے آواز دی۔ "آلی!"

"ہوں۔"

"تجھے پیاس لگ رہی ہے؟"

"ہوں۔"

"میں تجھے پانی لا کے دیتا ہوں۔"

"لا دے۔"

"تجھے پھر بخار ہو گیا ہے۔ کوئی دوا ہے تیرے پاس؟ ہو تو بتا دے کہاں ہے' پانی کے ساتھ کھلا دوں گا۔"

"دوا؟" وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے آنکھیں کھول دیں' کسمسا کر اُٹھنے کی کوشش کی۔

میں نے کہا۔ "لیٹی رہ۔ تجھے اُٹھنے کی ضرورت نہیں' مجھے بتا دے کہاں ہے؟"

"تجھے نہیں ملے گا۔" وہ پھر اُٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے جھجکتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے سہارا دے کر اُسے اُٹھایا تو آلی تکلیف سے چیخ پڑی۔ غلطی سے میں نے اُس کے زخمی شانے پر ہاتھ کا دباؤ ڈال دیا تھا۔ اس کی آنکھیں تکلیف سے جیسے اُبل پڑیں' آنسو رخساروں پر بہنے لگے۔ میں اس سخت کوش صحرائی عورت کی تکلیف کا اندازہ لگا سکتا تھا جس نے اب تک اس زخمی شانے کے ساتھ ہر طرح کا سخت کام کیا تھا' اب جو وہ چیخی تو درد یقیناً اُس کی غیر معمولی قوتِ برداشت سے زیادہ ہو گا۔ وہ لرز رہی تھی' اُس کی پیشانی پر پسینے کے قطرات بہنا شروع ہو گئے۔ میں نے اُس کی بھیگی ہوئی پیشانی ہاتھ سے پونچھی اور پوچھا۔ "زخم میں تکلیف بڑھ گئی ہے کیا؟" وہ سرہلا کے رہ گئی۔ میں نے پوچھا "کیا بخار بھی اسی وجہ سے ہوا ہے؟"

اُس نے سرہلا کر کہا۔ "ہاں۔"

"آلی! تُو نے پٹی باندھی تھی پھر اس کے بعد زخم کی صفائی بھی نہیں کی۔ سامان میں کوئی دوا' کوئی مرہم ہو تو پہلے پٹی بدل لے پھر بخار کے لیے کچھ کرنا۔" وہ میرے اس طرح فکر کرنے سے خوش ہوئی۔ کہنے لگی "چور

خانوں سے نکالے ہوئے سب ڈبے اور بوتلیں یہاں لا' میں پھر کچھ کر لیں گی۔" میں سب سامان اُس کے پاس لے گیا۔ یہ ان ملاحوں کا سیدھا سادا فرسٹ ایڈ کا سامان تھا۔ رُوئی اور پٹی کے نام کی بھی کچھ چیزیں ایک ڈبے میں بھری تھیں۔ ڈیزل کے دھویں کے قرب سے ڈبا' رُوئی اور پٹی داغ دار اور کالی ہو گئی تھیں۔ آلی نے میری مدد پرانی پٹی اتارنے کی کوشش کی۔ پٹی چپک گئی تھی۔ اس نے اُوپری بدن پر جو شلوکا پہن رکھا تھا' وہ اس قابل نہیں تھا کہ اُسے پٹی اور زخم کے برابر رہنے دیا جاتا۔ نے بلیڈ لے کر شلوکے کا پورا بازو گریبان سے لے کاٹ پھینکا۔ زخم کے درد کے علاوہ بھی آلی کے لیے تکلیف وہ بات یہ ہو گی کہ ایک غیر مرد اُسے نہ صرف کھلا دیکھ رہا ہے بلکہ ایک حصۂ بدن کا چھو بھی رہا ہے لباس کا ایک حصہ ہٹانے میں اس کی مدد کر رہا ہے مگر کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ آلی نے اپنے بیٹے کے جس دوا سے مالش کی تھی' اصل میں وہ برانڈی تھی مجھے معلوم تھا' برانڈی جراثیم کُش مانع ہے۔ میں نے کا زخم برانڈی میں رُوئی بھگو بھگو کر خوب اچھی طرح صاف کیا۔ وہ تکلیف سے دہری ہو ہو گئی مگر یہ ضروری تھا۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد اُسے حوصلہ دلانے کو سر تھپکتا رہا اور اُس کی پیشانی پر آنے والا پسینہ پونچھتا رہا۔ تکلیف حد سے گزر جاتی تو وہ ڈرے ہوئے کی طرح میرے بازو سے چمٹ جاتی' کچھ دیر لرزتی رہتی پھر رور سی آواز میں کہتی۔ "ہاں صاب! اب ٹھیک ہوں۔" میں پھر اس کا شانہ نرمی سے تھام کر زخم کی صفائی کرنے لگتا۔ آلی نے سبز مرہم زخم پر لگانے کو دیا۔ مرہم لگاتے ہی جیسے ٹھنڈک پڑ گئی' اس نے آسائش اور سکون کی سانس نکالی۔ زخم گہرا نہیں تھا لیکن دو دن تک صفائی نہ ہونے اور خون آلود کپڑوں سے مَس ہوتے رہنے کی وجہ سے شاید آلی کی سخت محنت کی وجہ سے کچھ خراب ہو گیا متورم اور تازہ تازہ لگ رہا تھا۔ میں نے زخم پر مرہم لگا کے کچھ دیر اسے کھلا رہنے دیا۔ ٹھنڈی سمندری ہوا سے آلی کو کافی سکون محسوس ہوا۔ آخر میں نے تنبیہ "صا

روئی اور پٹّی لے کر زخم باندھ دیا۔ اس کے شانے، بازو اور اوپری بدن کا جو حصّہ شلوکا کاٹ دیے جانے کی وجہ سے کُھلا تھا، وہاں میں نے دیکھا ٹھنڈی ہوا چھونے سے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے اس بات پر راضی کیا کہ وہ اپنے چیتھڑوں سے چھٹکارا حاصل کر لے اور میری قمیص پہن لے۔ میں نے آپی کو اپنی قمیص اُتار کر دی اور خود کوٹ گلے کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر عرشے پر آ گیا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اُس نے نقاہت بھری آواز میں مجھے اِطّلاع دی کہ میں اب انجن روم کی پناہ میں واپس آ سکتا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ وہ میری قمیص پہنے کمبل میں لپٹی ہوئی لکڑی کے پارٹیشن سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے "آپ ہی آپ مسکرائے جا رہی ہے۔ میں اس کے برابر جا بیٹھا۔ اُس نے آنکھیں کھولے بغیر ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تھام لیا اور اُسے اٹھا کر اپنے چہرے کے برابر لے گئی پھر اُس نے میرے ہاتھ پر اپنا رخسار ٹکا دیا اور جیسے سرگوشی میں کہنے لگی۔ "صاب! توں باوُنت کی باوُنت چوکھا آدمی ہیں۔ تیرے بچّے جیویں۔"

مجھے اُس کی یہ صحرائی دُعا بہت اچھی لگی مگر میں نے مسخرے پن سے کہا۔ "تو ایک گھر آگے چل رہی ہے آپی! بچّے ابھی کہاں، میری تو شادی بھی نہیں ہوئی۔"

وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے بُدبُدائی۔ "مولا تیرا شادی کرائیں، وری پھر تیرے بچّے جیویں۔"

میں نے کہا۔ "پہلے کشتی کنارے تو لگ جائے، جان بچ جائے پھر کرائے گا مولا شادی۔ تو اب بھی ایک گھر آگے ہے۔"

آپی نے اسی طرح زیرِ لب کہا۔ "مولا تیری ڈگی کنارے لگائیں۔ پھر تیرا ویاہ کرائیں، وری پھر تیرے بچّے جیویں۔"

میں نے بھی اسی کی رَو میں کہہ دیا۔ "ہاں مولا ہماری کشتی کنارے لگائے، ہمارا بیاہ کرائے پھر ہمارے بچّے جیویں۔" آپی نے ہنستے ہوئے آنکھیں کھول دیں پھر وہ نئی ماند می اولی پٹّی پر ہاتھ رکھ کے کمزوری سے مگر مسلسل

ہنستی رہی بیچ بیچ میں کہتی جاتی۔ "چل چھیا ہمیں کہہ گیا ہیں۔ چل چھیا!" میں اُس کے ساتھ تھا۔ مگر وہ پھر ڈھل گئی اور ہر طرف سمندر اور نظر آتے تھے خشکی کا دُور دُور پتہ نہیں تھا۔ میں اور اپنے ساتھیوں کی حالت کے بارے میں میری ہنسی یک لخت بند ہو گئی۔ ہم اس طرح کب الم ناک انجام ٹال سکیں گے۔ آپی نے میرے تاثرات پڑھ لیے اور وہ بھی چپ ہو گئی۔ کشتی رَو کے ساتھ بہہ رہی تھی۔

آپی نے مجھ سے کہا کہ میں اگر سمندری سنبھال سکتا ہوں تو اب اسے کھینچ کر عرشے پر ڈال اس کا خیال تھا کہ یہ تیز سمندری رَو شاید ہمیں طرف لے جائے اور شاید اس راستے پر لگا دے جانے والی دیسی کشتیوں اور بین الاقوامی سمندروں چلنے والے مال بردار جہازوں کا طے شدہ راستہ ہے۔ یہ کرنٹ ہمیں اس راستے پر لے جاتا ہے تو پھر ہم بچ جائیں گے، کوئی جہاز ہمیں دیکھ لے گا لیکن اس سمندری لنگر ڈال کر بحرِ ہند کے نامعلوم حصّے میں رفتار سے بہتے رہنے میں عافیت کی کوئی صورت نہیں سکتی۔ میں نے جیسے تیسے لنگر کھینچ کر عرشے پر ڈال دیا۔ اُٹھاتے ہی سمندری رَو نے کشتی اپنی گرفت میں لے اُسے محسوس ہونے والی رفتار سے نامعلوم سمت کی بہانا شروع کر دیا۔ میں انجن روم کے سائے میں اور مایوس جا لیٹا۔

بھوک اور پریشانی کے باوجود میں سوتا رہا مگر وقفے سے میری آنکھ کھل رہی تھی۔ میرا خیال ہے نے نیند میں آبی پرندوں کی آوازیں سنی تھیں۔ میں کہیں پڑھا تھا کہ آبی پرندے کھلے سمندر میں زیادہ نہیں جاتے خشکی کے نزدیک رہتے ہیں۔ اگر ہم خشکی قریب پہنچ رہے ہیں تو مجھے اُٹھ جانا چاہیے۔ نقاہت باوجود کوشش کر کے میں اُٹھ بیٹھا۔ آپی آنکھیں کھولے پڑی تھی۔ اُس کے چہرے پر میں نے زردی کھنڈی دیکھی تو اشارے سے پوچھا کہ کیسی ہے؟ اُس نے اشارے

ہوں۔ اُس کا بیٹا گہری نیند سو رہا ... پر نکل آیا۔ کشتی کے عقبی حصے ... سی گل بیٹھا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ دور ... اُڑتے دیکھے سی گل تعداد میں ... سمندری ہوا پر جیسے بہتے جا رہے تھے۔ ... دور دور تک نظر ڈالی۔ خشکی کا کہیں پتہ ... کسی بڑے مرغ کی طرح وزنی لگتا تھا۔ ... "یقینا" ہو گا۔ پرندہ میری طرف ... تھا۔ میں نے دبے قدموں سے کشتی کے ... طرف بڑھنا شروع کیا میرا خیال تھا کہ اگر ... سی گل تک پہنچ جاتا ہوں تو ہاتھ کے جھپٹے ... سے پکڑ لینا مشکل نہ ہو گا۔ عرشے پر ... ایک ایک قدم رکھتے ہوئے میں پرندے ... پہنچ گیا کہ بس ہاتھ بڑھا کر ایک جست ... کر سکتا تھا۔ ایک بار جی میں آئی کہ اسے ... نے خود پر قابو پا لیا۔ میں یہ شکار کھونے ... نہیں لے سکتا تھا۔ یہ پرندہ ہاتھ آ جانے کا ... دو انسانوں کے لیے خوراک کا انتظام ... سے کھانے کو کچھ نہیں ملا تھا۔ میں نے ... ایک قدم اُٹھایا۔ سی گل نے بے چینی ... مگر وہ اب بھی دوسری سمت دیکھ رہا تھا۔ میں ... عقب میں تھا۔ دھوپ کا رُخ کچھ ایسا تھا کہ ... سایہ دیکھ کر بھی ہوشیار نہیں ہو سکتا تھا۔ میں ... قدم سادھے رہا۔ ایک اور قدم مجھے اس کے ... لے جائے گا پھر اس کے بعد کسی تردد کے بغیر ... ہاتھ ڈال سکوں گا۔ میں نے اگلا قدم اُٹھا ... سے دونوں ہاتھ بڑھائے اور سی گل کی ٹانگیں ... پھر جو تماشا ہوا وہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ میں آنکھیں بند کر کے اپنا سر نہ جھکا لیتا تو اس کے پروں ... پھڑپھڑاہٹ سے میری آنکھوں اور چہرے پر ... اچھال۔ سی گل کسی پالتو پرندے کی طرح ٹھنڈا جا رہا ... اور وہ کچھ پُرسکون ہو گیا۔ میں نے وحشیانہ خوشی کا ... اب میرے اور آئی کے اور اس کے بیٹے کے

بھوک سے مرنے کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ کم سے کم تین چار دن تک ہم اس پرندے کے گوشت پر گزارا کر سکیں گے۔ میں نے سی گل اپنی گود میں بھینچ لیا اور اس کی چونچ قابو میں کر لی تھی' کسی جنگلی کبوتر کی طرح وہ وحشت کے عالم میں اپنی آنکھیں پھرا رہا تھا۔

بھوک' مایوسی اور سخت ذہنی عذاب میں اتنے گھنٹے گزارنے کے بعد اب خوراک کا بندوبست ہوا تھا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ میں نے کسی سے سنا تھا کہ سی گل کا گوشت کچا کھا لیا جائے تو اس سے پیاس بھی بجھتی ہے۔ ہمارے پاس ایندھن بالکل نہیں تھا۔ مجھے یاد آیا' آئی نے کشتی میں ایک طرف پڑے ہوئے اسٹوو سے بھی تیل نکال کر کشتی کی موٹر میں ڈال دیا تھا۔ ہمیں اپنا شکار کچا ہی کھانا پڑے گا۔ میرا نعرہ سن کر آئی انجن روم سے نکل آئی تھی اور اس وقت اس کی چھت کا سہارا لیے مجھے سی گل قابو میں کیے دیکھ رہی تھی۔ "تو نے اسے ایسا ہی ہاتھ سے پکڑ لیا؟"

"ہاں' اور کیسے پکڑتا؟"

وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ "بڑا جبر سکاری ہے ڑے۔"

"اور نہیں تو کیا۔" میں نے بھی بھاری "ایک" عورت پر رعب جماتا تھا۔

"اب کیا کریں گا اس کا؟" آئی نے عجیب سوال کیا



تھا۔

"کھائیں گے ہم دونوں؟"

"اسے کھائیں گا؟"

"اور کیا میں نے سنا ہے اس کا گوشت مرغی سے زیادہ مزے دار ہوتا ہے۔"

"کھبر نہیں۔" وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے پاس آ کھڑی ہوئی۔

میں سی گل لیے ہوئے عرشے پر ہی بیٹھ گیا۔ وہ بھی میرے پاس بیٹھ گئی اور سی گل کے بے داغ سفید پروں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ میں نے آلی سے سوال کیا۔ "کوئی چھری بھی ہوگی تیری کشتی میں؟"

وہ میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ "نہیں۔ چھری کا ادھر کیا کام۔"

"خیر میرے پاس سنگین ہے۔ میں اسے ذبح کیے دیتا ہوں تو صاف کر دے۔"

آلی نے سمندر کے پھیلاؤ پر نظر ڈالی پھر وہ بیٹھے بیٹھے ہر طرف گھوم گئی جیسے خشکی کے اشارے تلاش کر رہی ہو مگر وہ کچھ اور دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی "اس کے ساتھ کا پاکھی ابی اُودر اُڑتا پھرتا ہیں' یہ اودر پکڑا گیا۔"

میں نے اس کا چہرہ ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔ "آلی تیرا بخار کچھ کم ہوا؟"

"ہاں" ابی کم ہے مگر ابی چھوکرے کو جاستی ہو گیا ہیں۔"

مجھے یہ سن کر ذرا سی پریشانی ہوئی مگر بھوک پریشانی پر غالب آ گئی۔ میں نے سوچا کہ پیٹ بھرنے کے بعد اس کے بچے کے لیے کچھ کیا جائے گا۔ ہم دونوں کا زندہ رہنا ضروری ہے آلی کچھ کھائے گی پیے گی نہیں تو اپنے بیٹے کو دودھ کیسے پلا سکے گی۔ میں نے کہا۔ "ابھی چھوکرے کو دیکھتے ہیں' پہلے اس کا کچھ انتظام کر دیں۔" میں نے عرشے پر بیٹھے بیٹھے پیر پھیلا کر ٹانگ پر بندھی ہوئی سنگین کھولنا چاہا۔

آلی نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "بات سُن' چھوکرے کا حالت اچھا نہیں ہے۔ ہم لوگ کی جان کا بی کوئی آسرا نہیں ہے۔ اسے چھوڑ دے۔ اللہ میاں ہمارے آسانی کریں گا۔ تو اسے چھوڑ دیں گا صاب۔ چھوکرا وی ٹھیک ہو جائیں گا۔ ہم لوگ کو خشکی جائیں گا۔ مانی پانی بی ملیں گا۔ ہاں نا۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ صحراؤں والی یہ مچھیرن' اسے معلوم ہے کہ بھوک پیاس ہے بجھکے سمندر میں بے آسرا ڈولتی ہوئی ناؤ کے لوگوں کو بھوک اور پیاس کس آسانی سے مار دے خوب جانتی ہے اور یہ سب جانتے ہوئے بھی چھوڑ دینے کے لیے کہہ رہی ہے۔ میں نے آنکھوں میں قیدی پرندے کے لیے ترحم دیکھا اور بیٹے کے لیے ایک توہم پرستانہ خوف' میں نے تپے ہوئے اس کے چہرے پر موت سے نبرد آزما عزم بھی دیکھا۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔ "تجھے آلی! اسے ہم چھوڑ دیں گے تو معلوم نہیں پھر کب کو کچھ ملے۔ ہو سکتا ہے ابھی نہ ملے۔ پھر ہم دونوں تیرا بیٹا بھوک سے ختم ہو جائیں گے معلوم ہے تجھے

آلی کی آواز میں ایک صلابت تھی۔ "ہاں کھبر ہے۔"

"تیرا بیٹا کم زور ہے تو اسے دودھ نہ دے سکی اور کم زور ہو جائے گا پھر۔"

"میرے کو سب کھبر ہے صاب! میرا دل کہ ہمارے کو اس پاکھی کی دعا برو بر لگیں گا' ہمارا ٹھیک ہو جائیں گا۔ ہم لوگ کو کھانا پانی وی ملیں اسے چھوڑ دے صاب" آلی نے اس یقین سے کہی کہ اب کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے کے سی گل ہوا کے رُخ اُچھال دیا۔ سی گل میرے سے نکلا تو ایک سفید چشمے کی طرح ہوا کے دھارے چلا گیا۔ میں نے اور آلی نے اُسے بلند ہوتے پھر سطح کے قریب غوطہ لگاتے دیکھا۔ سی گل ایک بار ہوا پھر اُس نے شاید مسرت کی کلکاری ماری اور اُڑ کر کسی بادل کے ٹکڑے میں شامل ہو گیا' یا غوطہ لگا کر لہر کے جھاگ میں گم ہو گیا۔

"آئی کا چہرہ خوشی سے رنگین ہو گیا۔ "صاب! تون جیوے سو لاڑے تو جیوے۔" پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر میرا بازو تھام لیا۔ "آپ' میں سوئیں گی۔ اُوری جائیں گی۔" میں آئی کو سہارا دے کر اُس کے بیٹے کے پاس لے گیا' وہ لیٹ گئی۔ اُس نے بیٹے کو ناتواں ہاتھ سے تھپکی دی اور آسودگی کی سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔

اب جو بھی ہو۔ میں نے قسمت پر شاکر کسی وحشی جواری کی طرح ناممکن باتیں سوچتے ہوئے سر جھکا اور بھوک اور نقاہت سے لڑنے کے لیے دری پر لیٹ گیا۔ درمیان میں کئی بار اُٹھا عرشے پر جا کر میں نے نظر دوڑائی۔ ہر طرف سمندر تھا۔ خشکی یا کوئی اور کشتی' جہاز' کہیں کچھ نہیں تھا۔ میں آ کر پھر لیٹ گیا۔

بھوک ایک نشہ لانے والی دوا کی طرح حواس پر دھیرے دھیرے قابو پا لیتی ہے۔ دیکھے بھالے لوگ' جانی پہچانی چیزیں اور جگہیں نئی' اجنبی اور سمجھ میں نہ آنے والی شناخت اختیار کر لیتی ہیں' خواب اور زیادہ بے معنی' بے ربط ہو جاتے ہیں اور ناممکن مناظر دکھانے لگتے ہیں۔ میں اسی طرح کے بے معنی بے ربط اور ناممکن خوابوں میں پڑا رہا۔ معلوم نہیں' میں نے دن ڈھلنے اور رات ہونے کا خواب دیکھا تھا یا واقعی رات آ گئی تھی۔ میں نے اٹھنا چاہا اور یہ جان کر لرز اٹھا کہ مجھ میں اُٹھ کر بیٹھنے کی بھی سکت نہیں ہے۔ میں آنکھیں کھولے کچھ دیر انجن روم کی نیچی چھت تکتا رہا۔ مجھے اپنے برابر لیٹی ہوئی عورت کی گہری گہری سانس لینے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ سو رہی ہو گی' پیاس اور بھوک کے احساس سے بے پروا' وہ شاید میٹھے پانی سے چھلکتے ٹھنڈے آب خورے کا خواب دیکھ رہی ہو گی اور تندور سے نکالی ہوئی جوار کی سرخ روٹی کا اور تازہ مکھن بھری کٹوری کا خواب دیکھ رہی ہو گی۔ اور وہ ماں بھی تو ہے' وہ اپنے بیٹے سے لگائے' اسے دودھ پلانے کا خواب دیکھ رہی ہو گی۔ اس کے بچے کا خیال آتے ہی میں فکر میں مبتلا ہو گیا۔ نیند یا نقاہت' وہ جو کچھ بھی تھی' میں نے اُس سے لڑ کر خود کو فرش سے اُٹھایا۔ میں نے رات ہونے کا خواب نہیں دیکھا تھا' رات واقعی ہو چکی تھی۔ میں نے محسوس کشتی اسی طرح سمندری رَو کے رحم و کرم پر ہی ہے۔ میں نے شاید غفلت میں اپنے برابر لیٹی ہوئی گہری سانس لیتے سنا تھا۔ اب اُس کی پیشانی چھو کر تو وہ بخار میں تپ رہی تھی۔ میں نے برابر پڑا ہوا بھی اس پر ڈال دیا۔ اُس نے اپنے بیٹے کو خوب طرح کمبل میں لپیٹ کر اپنے برابر سُلا رکھا تھا۔ بچے بخار نہیں تھا مجھے یہ معلوم کر کے بہت اطمینان ہو اُس کی نبض کم زور تھی۔ بھوک اور پیاس نے نڈھال کر دیا تھا۔

کشتی میں میرے اور ان دونوں کے لیے اب ہو گا۔ میں یہ سوچ کر لرز گیا کہ ہم تین جانوں بس برائے نام پانی ہو گا' کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ ہاتھ آیا ہوا پرندہ چھوڑ کر اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ عورت اور بچے کو تھوڑی بہت غذا مل جاتی تو ان جانے کے امکانات روشن ہو سکتے تھے' اب خالی کتنے دن چلیں گے۔ پھر بھی اُٹھا اور اندھیرے میں کنستر تلاش کیا۔ گلاس میں پانی انڈیلا تو بہ مشکل سے کچھ زیادہ گلاس بھر پایا۔ اس سے ہم تینوں کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے' آگے کا اللہ مالک ہے۔ نے آئی کو بیدار کیا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ آیا' وہ اپنے بیٹے کو ٹٹول کر اطمینان کرنے کے بعد لے کر سو جانا چاہتی تھی مگر میں نے مسلسل آوازیں ہوئے اور گال تھپتھپا کر اُسے بیدار رکھا' پانی پلا اٹھا کر بٹھا دیا پھر اُس سے کہا کہ وہ اپنے بیٹے پلائے' تھوڑا سا میرے لیے بچا دے۔ بچّہ بھوکا خالی پانی سے بہلانا آسان نہیں تھا مگر پیاس نے بے حال کر رکھا تھا۔ بہت مشکل سے اس نے میرے دو گھونٹ پانی چھوڑا۔ پانی پینے کے بعد میں پھر دری کر آئی کے برابر لیٹ گیا۔ رات کس طرح کٹے گی قطرے پانی جو صرف میرا حلق تر کر سکا ہے مجھے کب زندہ رکھے گا؟ نوجوان اور قوی ہونے کی وجہ سے کے بعد تک زندہ رہوں گا۔ میری آنکھوں کے سا

اور عورت بھوک پیاس سے چپ چاپ ہلاک ہو جائے مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ان کی موت آتی ہی نہ ہو۔ کیا بھوک پیاس کی وجہ سے مرتا ہوا انسان رگڑ رگڑ کر مرتا ہے؟ مجھے معلوم نہیں تھا اس طرح کی باتیں سوچ کر موت سے پہلے بار بار مرنا کوئی بات نہ تھی۔ میں نے کوشش کر کے ذہن اس پریشان کن خیالوں سے آزاد کیا۔ اب نیند اس الف میری پناہ ہو گی جب تک موت میرا حساب [illegible]۔

رات ایک عذاب ناک مشقت کی طرح کٹی۔ مجھے معلوم نہیں کتنی بار چونک کر بیدار ہوا پھر غفلت میں سو گیا۔ انجن روم سے نظر آتا ہوا پورا طرح روشن ہو گیا تو میں سمجھ گیا کہ رات گئی اور دن نکل آیا ہے۔ بہت دیر تک دن کی روشنی رہی پھر شام ہوئی اور پھر رات آ گئی۔ رات میں ایک بار میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر جیسے ہاتھ پیروں کی جان نکل گئی تھی۔

میں لیٹا رہا پھر کسی وقت آنکھ کھلی تو ایک اور دن نکل آیا تھا۔ میں نے ڈوبتے دل سے سوچا کہ یہ میری زندگی کا آخری دن ہو گا۔ اٹھنا تو کجا مجھ میں کروٹ بدلنے کی سکت بھی نہیں تھی۔ میں نے بہ مشکل سر گھما کر آئی کی طرف دیکھا، وہ چت لیٹی منہ سے سانس لے رہی تھی۔ کمزور بہت کم زور آواز میں میں نے اسے پکارا۔ کئی بار آواز دینے پر اس کی پلکیں پھڑپھڑائیں۔ وہ میری آواز سن رہی تھی مگر جواب دینا تو ایک طرف رہا وہ آنکھیں کھولنے کے قابل بھی نہیں تھی۔ اس کے بیٹے کا کیا حال ہو گا میں اٹھ کر دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اب آخر ہے۔ میں نے سوچا۔ ہم نہ معلوم کب سے بھوکے پیاسے مرے جا رہے ہیں۔ میں نے پانی کتنے دن پہلے پیا تھا؟ کھانے کے نام سے کوئی چیز مجھے کب ملی تھی؟ میں نے ذہن پر زور دے کر یاد کرنا چاہا۔ کچھ یاد نہیں آیا۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں سوچ سکتا تھا کہ بھوک اور پیاس سے مرتے ہوئے آدمی کی جان بہت دن میں نکلتی ہو گی۔ میں بے ہوش ہو گیا۔



حادثہ

دنیا کا سب سے بڑا فضائی حادثہ ۲۷ مارچ ۱۹۷۷ کو بحیرہ اوقیانوس میں جزائر کناری کے ایک جزیرے ٹینیرف میں پیش آیا تھا۔ یہ جزائر اسپین کی ملکیت ہیں۔ ہالینڈ کی فضائی کمپنی کے ایل ایم کا ایک جمبو جیٹ طیارہ لینڈ کرتے وقت رن وے پر کھڑے ہوئے پین امریکن ایرلائنز کے جمبو جیٹ سے ٹکرا گیا۔ دونوں طیارے مسافروں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس حادثے میں ۵۸۳ افراد ہلاک ہوئے۔

بے خبری اور بیداری کی اس درمیانی کیفیت میں کب تک رہوں گا؟ کب پوری طرح بے خبر ہو جاؤں گا؟ میں نے کوشش کر کے ہاتھ بڑھایا اور آئی کی پیشانی چھو لی۔ اس کی پیشانی پسینے سے تر تھی۔ آئی کا بخار اتر رہا تھا لیکن یہ بخار اترتے ہوئے تو قطرہ قطرہ اس کی جان لے رہا ہے۔ پسینہ بہہ بہہ کر اس کے بدن کا سب پانی ضائع کر دے گا تو بہت جلد یہ ڈی ہائیڈریشن سے مر جائے گی مگر کوئی کیا کر سکتا ہے۔ اب ہم تینوں ہی کچھ دنوں کے مہمان ہیں۔ میں نے آئی کی پیشانی سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور بے سدھ ہو کر رہ گیا۔

معلوم نہیں اور وہ چار دن گزرے یا ایک دن یا کوئی وقت نہیں گزرا۔ میں نے اپنے برابر سے ایک عجیب آواز سنی۔ ایسی آواز جیسے کسی کا گلا دبایا جا رہا ہو یا کوئی الٹی کر رہا ہو۔ میں صرف سن سکتا تھا، سر گھما کر دیکھنے کی طاقت نہیں تھی۔ وہی آواز پھر آئی۔ مجھے یاد آیا اس طرف آئی پڑی ہے۔ تو یہ آئی تھی۔ آئی مر رہی ہے۔ اس کا بیٹا اس سے پہلے مر گیا ہو گا۔ جب آئی جیسی مضبوط عورت مر گئی تو اس کا بیٹا جیسی سی جان دو تو پہلے ہی چل بسا ہو گا۔ اب میری باری ہے۔ میں نے غشی کی بے خبری میں ڈوبتے ہوئے آخری بات یہ سوچی کہ اب میں بیدار نہیں ہو سکوں گا اور یہ آخری بیداری ہے جس میں میں نے آئی کو دم توڑتے ہوئے سنا ہے۔

یہ موت تھی کہ بے ہوشی؟ میں مر چکا تھا کہ زندہ تھا؟ ہال کل سامنے یہ بیٹھے جاگتے انسان ہیں یا سوال و

جواب کے لیے منکر نکیر آئے ہیں؟ دو سفید سائے مجھ پر جھکے ہوئے تھے اور وہ کچھ پوچھ رہے تھے' اونچی آواز میں کچھ کہہ رہے تھے۔ میری آنکھیں کھلی تھیں' میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ نظر آنا بند ہو گئے مگر وہ گئے نہیں۔ انھوں نے پھر کچھ کہا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں' وہ بالکل مجھ پر جھک آئے۔ اُن میں سے ایک نے مجھے چھوا۔ میں نے اُس کے ہاتھ کی گرمی محسوس کی اور جان گیا کہ یہ دونوں جیتے جاگتے انسان ہیں اور میں ابھی مرا نہیں ہوں' زندہ ہوں۔ آنے والوں نے مجھے ہاتھوں اور پیروں سے پکڑ کر کھینچنا شروع کیا۔ میں تکلیف سے چیخنے لگا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔

بہت سخت سردی تھی جو میرے بدن میں اُتر کر مجھے لرزائے دے رہی تھی۔ میں سردی کی جھنجوڑتی لہروں سے لڑتا ہوا کراہنے لگا۔ میری اپنی آواز دوسری تمام آوازوں پر حاوی ہو گئی تھی مگر دوسری تمام آوازیں کیا تھیں؟ کیا یہ اسٹیم رولر کی آواز ہے؟ اسٹیم رولر کا پیس دینے والا ٹھنڈا بوجھ سر سے لے کر پیر کی انگلیوں کی پوروں تک مجھے پیسے جا رہا تھا۔ میں نے کراہتے ہوئے کروٹ لینے کی کوشش کی تو پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ میں ایک نرم کمبل میں لپٹا ہوا ہوں اور میرے سر پر ایک روشن پرندہ منڈلا رہا ہے۔ میں نے خوف سے چیخ ماری اور وہ پرندہ جلتے ہوئے پیٹرومیکس میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا۔ پیٹرومیکس پر تام چینی کا شیڈ چڑھا تھا اور جلتے ہوئے وہ کسی نیلے روشن پرندے کی طرح لگ رہا تھا۔ ایک ہاتھ کہیں سے میری پیشانی پر آیا' ہاتھ بہت گرم تھا جیسے تیز بخار میں ہوتا ہے۔ کسی نے نرم آواز میں مجھ سے کچھ کہا۔ میں نے سر گھما کر اسے دیکھا' وہ ایک نوجوان آدمی تھا' سفید کپڑوں میں ملبوس وہ سر پر سفید رومال باندھے ہوئے تھا۔ مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر اس نے کچھ کہا' وہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے پھر کچھ کہا۔ میرے ہیجان زدہ ذہن میں رفتہ رفتہ اس کے الفاظ بامعنی بن گئے۔ اس نے مجھے سلام کیا تھا۔ میں نے جواب دینا چاہا مگر آواز نہیں نکلی' بس ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ اُس نے پوچھا۔ "کیسا حال ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پوچھنے وال حال کی "ح" بہت واضح ادا کی تھی' وہ کول میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرا کوشش کی۔ اس نے بھی مسکراتے ہوئے پوچھا پانی پینا؟" پہلے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہ پھر سمجھ میں آ گیا تو میں اثبات میں سر ہلانے لگا۔ وہ برابر سے اٹھا اور دو قدم چل کر واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں شیشے کا گلاس تھا۔ گلاس کا پانی چو کی طرح سفیدی مائل گاڑھا تھا۔ اس نے میر سہارا دے کر اٹھایا اور گلاس منہ سے لگا دیا۔ مجھے ا ہوا کہ پانی پینا بھی میرے لیے آسان نہیں ہے۔ ہو جیسے گوند جم گئی تھی۔ اور منہ کھولنے سے زخم لگتے تھے۔ میں نے تھوڑا سا دہانہ کھول کر دو تین گ لیے۔ سفیدی مائل گاڑھے پانی کا مزا عجیب خوش اور کچھ تیل جیسا تھا۔ عرب نے ایک بار پھر میر سے گلاس لگا دیا۔ اس بار میں نے کئی گھونٹ لیے بدن میں تازگی اترتی محسوس کی۔ عرب نے نرمی کے میرا سر تکیے پر رکھ دیا۔

"نارجیل کا پانی۔ کوکونت 'کوکونت۔" تیل جیسے کی خوش گوار مہک اب میری سمجھ میں آ گئی۔ عرب مجھے ناریل کا پانی پلایا تھا۔ زندگی کے خوش گوار احسا سے میں نے کچھ توانائی محسوس کی پھر میرے بدن میں بجلی کی ایک رو دوڑ گئی۔ آلی اور اس کا بچہ؟ میں نے ا کی کوشش کی۔ عرب نے نرمی سے میرے سینے پر ہاتھ کے مجھے اٹھنے سے روک دیا میرا سر پھر تکیے میں گر کانپتے' ترختے زخمی ہونٹوں سے میں بس ایک لفظ ادا سکا "عورت؟" عرب نے جھک کر میرے ہونٹوں سے کان لگایا میں نے لفظ پھر دہرایا۔ "عورت؟"

اس نے مسکراتے ہوئے اپنا سر اٹھایا اور ہاتھ اشاروں سے مجھے بتانے لگا کہ عورت ٹھیک ہے اور رہی ہے۔ آلی زندہ ہے' میں نے اطمینان کی سانس لی۔ میں نے اس کے بچے کے بارے میں معلوم کرنا چا

اور لفظ "بچہ" کہا۔ عرب شاید سمجھا نہیں یا وہ مجھ سے کچھ اور کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔" اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ کیا آئی کا بیٹا مر گیا؟ کیا عرب کو اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم؟" اس نے نفی میں کیوں سر ہلایا ہے؟ تکلیف کے باوجود میں نے پورا جملہ کہا۔ "وہ۔وہ اس کا بیٹا؟ طفل۔طفل؟"

عرب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے زور زور سے سر ہلانا شروع کیا۔ وہ میری بات سمجھ گیا تھا۔ مسکراتے ہوئے اس نے بھی "طفل" کہنا شروع کیا۔ پھر اس نے کہا "خیر۔ خیر طفل' خیر" اس نے پہلے ایک انگلی اٹھائی اور پھر دوسری انگلی اٹھا کر دلاسا دینے کے انداز میں ہاتھ ہلایا۔ گویا عورت اور بچہ دونوں خیریت سے ہیں۔ شکر ہے تیرا پروردگار۔ میں نے نڈھال ہو کر تکیے پر سر گرا دیا۔ عرب نوجوان نے میرا سر آہستگی سے دائیں طرف گھمایا اور ایک اشارہ کیا۔ کچھ دور پیٹرو میکس کی گردش کرتی روشنی میں کمبلوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ میں نے عرب کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان چھایا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "عورت؟ طفل؟"

عرب نے اقرار میں سر ہلایا۔ "نعم۔" کمبل کا ڈھیر آئی اور اس کا بیٹا تھے۔ وہ دونوں زندہ تھے' ہم تینوں زندہ تھے۔ میں طمانیت کے احساس سے پھر سو گیا۔

رات ہی کو کسی وقت عرب نوجوان نے مجھے بیدار کیا اور چمچے سے بہت سا پتلا دلیا کھلایا۔ دلیے کا مزا عجیب سا تھا' دواؤں جیسا مگر اس میں کافی دودھ پڑا تھا۔ اس نے اور اس کے ساتھی نے مجھے سہارا دے کر اٹھا دیا تھا۔ آئی اور اس کا بیٹا اسی طرح کمبلوں میں لپٹے پڑے تھے۔ پیٹرو میکس کی تیز روشنی میں میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ یہ خلیج اور بحیرہ ہند کی بندرگاہوں کے درمیان مال اور جانور لے جانے والی لکڑی کی دیسی انجن بوٹ تھی۔ ایسی کشتیاں عام طور پر کنٹری کرافٹ کہلاتی ہیں۔ کشتی کہماں رفتار سے چل رہی تھی۔ نوجوان عرب کا نیا ساتھی بڑی عمر کا آدمی تھا' وہ نچلے عرشے پر گیا اور دلیا لے

میں مزید دلیا لے کر آ گیا۔ میں نے سر کے اشا
منع کیا تو وہ میرے برابر بیٹھ گیا اور میرا ہاتھ تھ
بولا۔ "یہ اچھا ہے' کھا لو۔ طاقت آتا ہے۔"
کے عرب کی اردو خاصی صاف تھی۔

اس کے کہنے سے میں نے کچھ دلیا اور کھا
آئی اور اس کے بیٹے کے بارے میں جاننا چاہتا تھا
نے ہاتھ اٹھا کر ان کی طرف اشارہ کیا تو بڑی عمر
لگا۔ "اس کو پانی اور غذا دیا ہے' دوا دیا ہے' اب
سوتا ہے۔" میں کشتی والوں سے باتیں بھی کرنا
اور سب سے پہلے یہ جاننا چاہتا تھا کہ ہمیں وہ لو
کہاں لے جا رہے ہیں۔ میں نے بات شروع کی
نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ وہ اپنے سا
بھوری سی گاڑھی دوا لایا تھا۔ اس نے چمچے سے
پلائی اور کمبل اوڑھا کر چھت میں لٹکی ہوئی پیٹرو
اتارتا ہوا نیچے چلا گیا۔ نوجوان عرب میرے برا
اوڑھ کر لیٹ گیا۔ مجھے پیٹ بھرنے کے بعد خمار
شاید دوا کے اثر سے نیند کے جھونکے آ رہے تھے۔
دیر بعد میں گہری نیند سو گیا۔

صبح میری آنکھ بچے کے رونے سے کھلی۔ کمزو
اتنی نہیں تھی جتنی میں نے رات محسوس کی تھی۔
اٹھ بیٹھا۔ نوجوان عرب اور ایک نیا شخص نچلے
سے بالٹیوں میں کالا پینٹ یا شاید پگھلا ہوا تارکول
آ رہے تھے۔ وہ مجھے اٹھتے دیکھ کر مسکرائے اور با
سنبھالتے ہوئے عرشے پر ایک طرف چلے گئے جہاں
پینٹوں کی میز رکھی تھی اور لکڑی کے چھوٹے
ٹکڑے ڈھیر کی صورت پڑے تھے۔ میں نے اٹھ کر
کے روتے ہوئے بچے کی طرف جانا چاہا تو مجھے ایک دم
آ گیا' میں دوبارہ بستر پر بیٹھ گیا۔ نوجوان عرب نے
چکراتے دیکھا تو پکار کر کچھ کہا۔ نچلے عرشے سے بڑی
عرب ایپرن باندھے اپنے ہاتھ خشک کرتا ہوا میری طر
آیا۔ "کیا بات ہے؟"

میں نے کہا۔ "بچہ رو رہا ہے۔ اس کی ماں کو
دو۔"

اس کو آواز دے دے کر اور جھنجوڑ کر

... سر تھامے بیٹھی رہی پھر سہارا لے

کر ... میری طرف دیکھ کر مسکرائی' اس نے

... چاہا مگر کمزوری نے اُسے بے بس کر

... کے برابر لیٹ گئی اور اسے تھپکنے

... عرب یہ کہہ کر دوبارہ نچلے عرشے پر جا چکا

... اور بچے کے لیے کھانے کو کچھ لا رہا

... کبھی چاروں ہاتھوں پیروں سے

... برابر جا بیٹھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد

... ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں اور جگہ

... پھٹ گئے تھے' خون جھلک رہا تھا مگر اس

... ہی روشن' اُتنی ہی زندہ تھیں۔ وہ میری

... آنکھوں سے مسکراتی رہی۔ میں نے ہاتھ

... رخسار چھوا۔ اس کا چہرہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

... بیٹے کو چپ کرانے میں کامیاب ہو گئی

... کی حالت اگرچہ خستہ تھی لیکن ناتوانی کے سوا

... تکلیف نہیں تھی۔ آلی نے بتایا کہ بڑی عمر کا

... بکری کا تازہ دودھ پلاتا رہا ہے۔ اُس نے یہ

... لوگ کئی درجن بکریاں اور سامان میں دال

... مسالے' ناریل اور انناس لے کر جا رہے ہیں۔

... سوتے جاگتے' غذا اور دوا پیتے ہوئے اور اپنے

... بھرتے ہوئے اتنی بہت سی باتیں معلوم کر لی

... اس نے بیدار ہوتے ہی میری خیریت پوچھی تھی

... سکون سے سو سکی تھی۔

بڑی عمر کا عرب اپنے اور ساتھیوں کے لیے کھانا

... اس دفعہ وہ دو پھیروں میں ہمارے ناشتے کا

... بہت سا دَلیا' دودھ اور کھجور کا حلوہ' زیتون

... تیل میں پکایا ہوا مرغ اور ڈھیر سے نمکین بسکٹ۔ وہ

... اور ایک بڑے جگ میں ناریل کا پانی بھی

... اور ہم سے کہہ گیا کہ اب تم لوگوں کی زندگی کو کوئی

... نہیں ہے' تم دَلیا اور ناریل کا پانی بہت پی چکے ہو'

... ٹھوس غذا استعمال کرو' گوشت اور میٹھا کھاؤ۔ کل

... نقاہت رفع ہو جائے گی۔ آلی نے اپنے بیٹے کو گلاس



سے دودھ پلایا' اسے تھوڑا سا دَلیا اور حلوہ بھی دیا۔ بچہ کھانے پینے کے بعد مگن ہو کر ہاتھ پیر چلانے لگا۔ ہم دونوں نے جم کر ناشتہ کیا۔ آہستہ آہستہ کوئی ایک گھنٹے میں ہم کھا پی کر فارغ ہوئے۔

کشتی والے صبح سے اپنے اپنے کام کا آغاز کر چکے تھے۔ آلی نے بتایا۔ کل آٹھ آدمی ہیں' جو نوجوان مجھے اپنے ہاتھ سے دَلیا کھلاتا تھا' وہ اس کشتی کا مالک اور ناخدا ہے۔ پہلے اس نے اور بڑی عمر والے نے ہماری کشتی بہتی دیکھی تھی اور ہزار مشکلوں سے کشتی قابو میں کر کے وہ ہمیں اپنے کنٹری کرافٹ میں اُٹھا لائے تھے۔ یہ بات تین روز پہلے کی ہے۔ حیرت سے میری آنکھیں کھلی رہ گئیں کہ تین دن گزر گئے؟ مگر ہمیں گزرتے وقت کا اندازہ کس طرح ہو سکتا تھا۔ ہم نے تو یہ سارا وقت غشی بلکہ نیم مُردنی کی کیفیت میں گزارا تھا۔ ناشتے کے بعد کشتی کا ناخدا اور معمّر عرب ہمیں بیٹھے اور باتیں کرتے دیکھ کر پاس آ گئے۔ نوجوان نے اپنی عربی آمیز اردو میں اور بڑے ملّاح نے صاف اردو میں ہم سے باتیں کیں۔ اُنھوں نے بتایا کہ یہ کرافٹ "الاحمد" جس پر ہم سوار ہیں' اپنے مالک احمد المستقی کے نام سے موسوم ہے۔ "الاحمد" چار سال پہلے کراچی میں تھی' اب مسقط اس کا مستقل ٹھکانا ہے۔ یہ پاکستان اور ہندوستان کی بندرگاہوں سے مال اُٹھاتی ہے۔ اُدھر کراچی گوادر' پسنی اور اِدھر ہندوستان میں سورت' ڈیو' پوربندر اور پورٹ

اوکھا اس کے قصبے نے 'مال چڑھانے اُتارنے کے ساحل ہیں۔ سال میں ایک دو بار یہ کشتی ڈمن اور بمبئی بھی چلی جاتی ہے مگر اسی وقت جب احمد اپنے اور گھر والوں کے کپڑے سلوانا یا گھومنا پھرنا چاہتا ہو اور ان بندرگاہوں کے لیے تھوڑا بہت بزنس بھی مل رہا ہو۔ اس دورے میں یہ لوگ سورت سے مال اُٹھا کر مسقط جا رہے تھے اسی لیے کھلے سمندر میں ان کا اور ہماری کشتی کا آمنا سامنا ہو گیا۔ اگر انھیں پوربندر یا پورٹ اوکھا سے مال اُٹھاتے ہوئے جانا ہوتا تو یہ اپنا کرافٹ خلیج کھمبات سے نکلنے کے بعد کاٹھیاواڑ کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلاتے' کھلے سمندر میں نہ نکلتے' پھر ہمارا اور ان کا سامنا نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے انھیں بتایا "میں کاٹھیاواڑ کا بیوپاری ہوں۔ اپنے شوق کے لیے کشتی خریدنا چاہتا تھا۔ اس عورت کے شوہر سے کشتی کی بات ہو رہی تھی۔ آزمائشی سفر کے لیے وہ اوکھا سے ہمیں لے کر چلا تو کھلے پانی میں کسٹم والوں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ کسی پرانے جھگڑے کی وجہ سے سرکاری آدمیوں نے کشتی روک کر عورت کے شوہر کو پکڑ لیا۔ عورت مجھے واپس اوکھا لے چلی تو ہم بھٹک گئے پھر تیل ختم ہو گیا اور کشتی بہتی ہوئی کھلے سمندر میں نکل گئی۔ اگر تم لوگ ہمیں نہ دیکھ لیتے تو ہم تو ختم ہو جاتے۔" میں نے اپنی اور آلی کی ہندوستانی شہریت اس لیے بتائی تھی کہ میں پاکستان کی کسی بندرگاہ پر اترنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا اور اوکھا کی بندرگاہ کا نام یوں لیا تھا کہ وہ پاکستانی سرحد سے قریب تھی' آلی کی واپسی آسان ہوتی۔

میں نے اور آلی نے ان کے احسان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے اپنا وقت خراب کیا' اتنی مشقت اٹھا کر ہماری جانیں بچائیں لیکن ہم جاننا چاہتے تھے کہ وہ اب ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں؟ ظاہر ہے' ہم مسقط تو نہیں جا سکتے تھے۔

احمد ہماری بات سن کر اپنے ساتھی سے عربی میں دیر تک کچھ کہتا رہا۔ معمر ساتھی نے شاید اس کے ساتھ کچھ جرح بھی کی۔ آخر ان کی باہمی ... نے معذرت کے انداز میں ... دی وہ کچھ یوں تھی کہ ہم تو مسقط ... کہ سورت سے یہ مال وہیں ... سورت پورٹ اتھارٹی نے ہمیں مسقط ... کیا ہے' کاغذوں میں بہت جگہ ... کھونا نہیں کر سکتے' ویسے ہی ہم ... تمھاری کشتی پکڑنے میں ضائع کر ... میں اپنے ملک کے سفیر وغیرہ سے مل ... احمد اور اس کا ساتھی یہ باتیں کہ ... ہماری میزبانی کے لیے تیار تھے لیکن وہ ... تھے اس وقت ان کی کشتی کا کرایہ ہم ادا ... تھے' پھر وہ ہماری وجہ سے مالی نقصان ... انھیں مسقط جانا ہے' وہ ہمیں مسقط ... سے ہماری مرضی ہے جو ہمارا جی چاہے کریں' ... ہو' چلے جائیں۔

میں اور آلی سناٹے میں بیٹھے رہے۔ میں ... چھوڑ کر بھاگ رہا تھا۔ ہندوستان نہ سہی عمان ... اور اس کا بچہ خواہ مخواہ اپنا گھر چھوڑ کر موت ... کرتے ہوئے میرے ساتھ ادھر نکل آئے ... کرافٹ انھیں مسقط لے جا کر پھینک دے گا' ... میری وجہ سے۔

عربوں کے لہجے اور ان کی مضبوط دلیلوں کے ... سے کچھ کہنا فضول تھا۔ پھر بھی میں نے دو گھنٹے ... جاگتے اپنے بستر پر پڑے رہنے کے بعد ایک بار ... عرب کو بلا کر اس سے اپنی پریشانی بیان کی لیکن کوئی ... نہیں ہوا۔ وہ کہنے لگا کہ میں احمد کی والدہ کا بھائی ہوں ... میرا لحاظ کرتا ہے لیکن دیکھا جائے تو میں اس کے کرافٹ ... پر ملازم ہوں' مجھے تنخواہ ملتی ہے۔ البتہ دوسرے ملا... کے برخلاف احمد نے مجھے اجازت دے رکھی ہے کہ ... جب بھی کہیں سے مال اُٹھائے' میں تھوڑا سا اپنا تجارتی ... مال بھی رکھ لوں۔ اس طرح وہ مروت میں میری ... اضافی آمدنی کرا دیتا ہے۔ میں اس کے معاملات میں زیا...

مداخلت نہیں کر سکتا، صرف مشورہ دے سکتا ہوں، وہ میں دے چکا ہوں۔ یہ ملاح سلجھا ہوا آدمی تھا، کہنے لگا کہ احمد کی بات بھی درست ہے، وہ اگر تم لوگوں کو پورٹ اوکھا پر اتارنے کے لیے راستہ بدلے گا تو وقت اور ایندھن کے حساب سے اسے چار پانچ ہزار کا نقصان ہوگا۔ انسانی ہم دردی میں اس نے تمھیں بچایا ہے مگر اس پھیرے میں اسے نقصان تو نہیں ہونا چاہیے۔ یہ سن کر مجھے بڑا اطمینان ہوا۔ محض پانچ ہزار روپے کا معاملہ ہے تو کوئی خاص بات نہیں، میں نے کمبل میں لپٹے لپٹے اپنی جیکٹ اور جیکٹ میں بھرا ہوا خزانہ ٹٹول لیا تھا۔ سونے کی صرف ایک ٹکیا احمد کا نقصان پورا کرنے کے لیے کافی سے زیادہ تھی۔

میں نے آئی کو پوری بات بتائی۔ میرے مقابلے میں وہ ملاحوں وغیرہ سے زیادہ واقف تھی۔ "ٹھیک ہے"۔ اس نے کہا۔ "یہ ہمیں اوکھا پر اتارنے کے لیے تیار ہو جائے تو تم اپنے جیکٹ والے "راشن پانی" میں سے اسے کچھ دے دینا، خوش ہو جائے گا۔"

میں نے احتیاط کے ساتھ کمبل لپیٹے لپیٹے سونے کی دو ٹکیاں جیکٹ سے نکال لیں۔ ایک تو میں نے باہر کوٹ کی جیب میں رکھی، دوسری اپنی پتلون کی چور جیب میں چھپالی تاکہ اگر ناخدا سودے بازی میں سختی دکھائے تو اسے دوسری ٹکیا دے کر آمادہ کر لوں۔ کرافٹ کی رفتار خاصی تیز تھی۔ میں نے سوچا کہ کھلے سمندر میں زیادہ راستہ طے کرنے سے پہلے ہمیں یہ معاملہ ٹھیک کر لینا چاہیے ورنہ واپسی میں وقت بھی زیادہ لگے گا اور ملاحوں کو سفر کھوٹا کرتے ہوئے جھنجلاہٹ بھی ہوگی۔

میں نے ملاح کو خلاصی بھیج کر بلوایا اور اس سے کہا کہ میں احمد کے وقت اور ایندھن کا نقصان پورا کر سکتا ہوں۔ وہ احمد کو بلا لایا۔ احمد پکا کاروباری تھا۔ اس نے باقاعدہ حساب لگا کر بتایا کہ اصل میں اس کا آٹھ ہزار روپے کا نقصان ہوگا۔ اسے خلاصیوں کو اوور ٹائم یا انعام بھی دینا پڑے گا۔ پورٹ اوکھا پر کسٹمز یا امی گریشن یا کسی اور ایجنسی کے حکام کا سامنا ہوگیا تو انھیں بھی کچھ بخشش دینی ہوگی۔ میں نے اپنا حساب لگا کر دیکھا ٹکیا کی قیمت احمد کے آٹھ ہزار کے مقابلے زیادہ ہوتی تھی۔ میں نے کہا، میں نہ صرف نقصان پورا کر رہا ہوں بلکہ تحفے کے طور پر معاوضہ پیش کر رہا ہوں۔ تم نے مجھ پر جو احسان اس کا بدلہ تو ممکن نہیں۔ ہاں یہ چھوٹا موٹا دوستی کی شروعات بن سکتا ہے۔ میں تم سے میں نے کوٹ کی جیب سے گولڈ بلین کی تصدیق والی ایک ٹکیا نکال کر احمد کے ہاتھ پر رکھ دی۔ وہ لے جیسے کوئی جانی پہچانی چیز تھی، اسے الٹ پلٹ دیکھنے اور اطمینان کرنے کے بعد احمد نے اطمینان ہلایا۔ سونے کی ٹکیا اپنی جیب میں رکھنے سے پہلے ایک بار مجھ سے یہ ضرور پوچھا کہ کیا یہ میں نے کسی شدہ فرم یا بینک سے خریدی ہے؟ میرا جواب میں نے کشتی خریدنے والی کہانی اور زیادہ معتبر ہوئے کہا کہ یہ میں گھر سے لے کر چلا تھا اس لیے کشتی مجھے پسند آگئی تو سودا پکا کر کے عورت کے بیعانے کے طور پر ٹکیا دے دوں گا۔ کاٹھیاواڑ کے سونے کی صورت میں سودا کرنا پسند کرتے ہیں مگر اس نوبت ہی نہیں آئی۔ بہرحال یہ چیز اب ہمارے کام ہے۔ احمد خوش خوش چلا گیا۔ دس پندرہ منٹ میں کرافٹ پر ملاحوں کی سرگرمی ایک دم بڑھ گئی۔

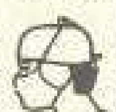
میں نے کشتی کا رخ بدلتے محسوس کیا اور اوڑھ کر جیسے اپنی کارگزاری سے مطمئن ہو کر تھکا ہو آئی اور اس کے بیٹے کے بستروں کے قریب جا کر پڑ گیا کچھ دیر بعد سو گیا۔ کشتی سارے دن، ساری رات رہی۔

دوسرے روز کاٹھیاواڑ کا ساحل نظر آیا۔ ساحل سرسبز لکیر میرے لیے خاصے اچنبھے کا باعث تھی۔ نے ساحل اب تک ریتیلے، پتھریلے، کٹے پھٹے بنجر کنار کی شکل ہی میں دیکھے تھے۔ کاٹھیاواڑ کے ساحل پر نار کے گھنے جھنڈ تھے۔ افق کا سرسبز خط کھجور، آم، چوڑ اور کاہی رنگ کے پتوں والے درختوں سے بنا پڑا تھا

ساحل سمندر کا یہ منظر غیر قدرتی بلکہ ہماری کسی خواب کا منظر معلوم ہوا۔ ساحل ایسے کب ہوتے ہیں۔ میں کشتی کے جنگلے کا سہارا لیے کنارہ قریب آتے دیکھتا رہا۔ آلی کو گود میں اٹھائے میرے برابر آ کھڑی ہوئی۔ بندرگاہ میں داخل ہونے سے پہلے عام طور پر ماہی گیروں کی کشتیاں اور بندرگاہ سے متعلق اہل کاروں کی لانچیں، اسٹیمر، موٹر بوٹ، یاٹ، ڈونگیاں وغیرہ نظر آنے لگ جاتی ہیں۔ ہم ساحل سے قریب ہوتے جا رہے تھے اور ہم نے اب تک آبی پرندوں کے غول اور ہچکولے لیتے ہوئے سرخ و سفید پینٹ کے دو ایک بوٹ ہی دیکھے تھے، کشتی ایک بھی نظر نہیں آئی تھی۔ مجھے اوکھا پورٹ کی اہمیت کا اندازہ تھا۔ یہ معمولی بندرگاہ نہیں تھی۔ دور عمارتوں کے پیچھے بجلی سے چلنے والی جدید کرینیں اور پچھلی صدی کی بھاپ والی کے کل کرینیں نظر آ رہی تھیں۔ سب رکی ہوئی تھیں۔

اس بندرگاہ سے سترہ اٹھارہ میل نیچے کاٹھیاواڑ کے ساحل پر ہندوستانی بحریہ کا اڈا دوارکا تھا۔ اسی وجہ سے پورٹ اوکھا کی اہمیت بڑھ گئی تھی اور دوارکا کی تنصیبات ظاہر ہے، کراچی کے قرب کی وجہ سے اہم تھیں۔

میں ابھی کشتیوں کی غیر حاضری کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ "الاحمد" کی رفتار ایک دم کم ہوتی محسوس ہوئی۔ احمد مستقل میرے برابر آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ فکر مند دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہماری کشتی کی رفتار بالکل ختم ہو گئی، اب وہ لہروں کے ساتھ بہ رہی تھی۔ احمد دور بین لگائے ساحل پر کچھ دیکھ رہا تھا۔ ابھی اس نے دور بین آنکھوں سے ہٹائی بھی نہیں تھی کہ میں نے ساحل کی تنصیبات پر دھوئیں کا مرغولا لپکتے دیکھا۔ لمحے بھر بعد "بوم" کی آواز آئی۔ برج پر سے گن چلائی گئی تھی۔ احمد نے آنکھوں سے دور بین ہٹا لی۔ "داخلہ ممنوع۔" ابھی اسے ہمارا داخلہ ممنوع۔ "خبردار کرنے والے فائر



سرطان کی تشخیص کے بعد طویل ترین زندگی پانے والی مریضہ کیلی فورنیا کی مسز ویندھلا ریڈ میلک تھی۔ وہ ۲۲ر اکتوبر ۱۸۷۶ کو پیدا ہوئی تھی۔ سرطان کے علاج کے سلسلے میں اس کے چار آپریشن ہوئے۔ پہلا آپریشن ۱۹۱۸ میں، دوسرا ۱۹۳۳ میں، تیسرا ۱۹۶۱ میں اور چوتھا ۱۹۶۸ میں۔ سرطان جیسا موذی مرض تو اس کی جان لینے میں کامیاب نہیں ہوا لیکن وہ نمونیے کا مقابلہ نہ کر سکی۔ ایک سو پانچویں سال گرہ کے ۶۷ دن بعد، ۲۸ر دسمبر ۱۹۸۱ء کو نمونیے کے ایک حملے میں اس کا انتقال ہو گیا۔

کے ساتھ ہی احمد نے مجھے اور آلی کو نچلے ڈیک پر پہنچا دیا۔ اسے یقین تھا کہ بحریہ کی کوئی اسپیڈ بوٹ تنصیبات سے چلے گی اور ہماری کشتی کے برابر آ کر جائزہ لے گی۔ آج اوکھا پر کوئی غیر معمولی بات ہے ورنہ بندرگاہ میں داخل ہونے والے کنٹری کرافٹ کو اتنی اہمیت کوئی نہیں دیتا کہ بحریہ کی تنصیبات سے اسے روکنے کے لیے فائر کیا جائے۔ بندرگاہ ہر قسم کی کشتیوں سے خالی تھی۔ اس بات سے احمد اور اس کے ماموں کو بھی تشویش ہوئی۔ میں اور آلی نچلے ڈیک پر اس گول کھڑکی کے برابر جا بیٹھے جسے پورٹ ہول کہا جاتا ہے۔ ہم ساحل کی طرف دیکھنے لگے۔ جیسا کہ ہمیں اور احمد کو توقع تھی، بحریہ کی ایک گن بوٹ تیزی سے نکلی اور ہماری طرف بڑھنے لگی۔ اس پر نصب ہلکی طیارہ شکن توپ دور سے نظر آ رہی تھی۔ احمد کا ماموں نیچے کام میں مصروف خلاصیوں سے کچھ کہتا رہا پھر ہمیں پورٹ ہول کے پاس بنچ پر بیٹھے دیکھ کر وہ ہماری طرف آیا، کہنے لگا، "ممکن ہے، وہ لوگ کرافٹ پر چڑھ آئیں اور تلاشی لیں،" اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہم انھیں ساری بات بتا کر یہاں لے آئیں گے۔ تمھیں ان کے سامنے پیش کرنا ضروری ہو گا کیوں کہ ہمارے پاس اوکھا آنے کا کوئی جواز نہیں ہے، اس کے سوا کہ ہم اوکھا کے ایک بیوپاری اور ماہی گیر کے بیٹے کو سمندر میں بھٹکنے اور ہلاک ہونے سے بچا لائے ہیں اور اب انھیں گھر پہنچانے آئے ہیں۔ مجھے عرب ملاح کی بات سے پریشانی ہوئی لیکن میں اس سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ

میرے اور آئی کے بارے میں بحریہ کے لوگوں کو کچھ نہ بتایا جائے۔ جو کہانی میں نے عربوں کو سنائی تھی' اس کے بعد ایسی بات کہنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

ملاح کے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ نیوی والوں کے کشتی پر چڑھنے سے پہلے آئی کے ساتھ مل کر ایک قابلِ یقین سی کہانی تیار کر لوں تاکہ اُنھیں ہم الگ الگ سنائیں تو بھی دونوں کی کہانیوں میں کوئی فرق نہ ہو۔

میں آئی کے برابر بیٹھا کشتی کی فروخت والی کہانی مزید درست کرنے لگا۔ اتنا وقت مجھے مل گیا کہ میں نے آئی کو تفصیلات یاد کرا دیں۔ ہم نے کہانی میں تھوڑی سے تبدیلی کر لی تھی۔ اب ہم یہ نہیں کہیں گے کہ آئی کے شوہر کو کسٹم والوں نے روکا تھا بلکہ ایک دوسرا ماچھی جھگڑا کرتا ہوا کشتی پر چڑھ آیا تھا جس سے آئی کے شوہر نے قرض لے رکھا تھا اور ادا نہیں کیا تھا۔ ماچھی اور اس کے ساتھی آئی کے شوہر کو کھینچ کھانچ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ آئی کو یہ تبدیلی پسند آئی۔ وہ سمجھ دار عورت تھی' اس نے کہا کہ اگر انھوں نے مجھ سے میرے آدمی کے بارے میں پوچھا تو میں راجستھانی میں ان لوگوں سے ایسی ایسی الجھی ہوئی باتیں کروں گی کہ وہ بھی کیا یاد رکھیں گے۔

بحریہ کی گن بوٹ' الاحمر کے برابر لگ گئی' تحکم آمیز بھاری آواز میں انھوں نے احمد سے سوال و جواب شروع کر دیے۔ ساری بات انگریزی میں ہو رہی تھی۔ احمد پختہ کار آدمی تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر زیادہ پیچیدہ وجہ بیان کی جائے تو لوگ بات کی تہ تک پہنچنے کے لیے جستجو کرنے لگتے ہیں اور اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتے ہیں۔ اس نے بس یہ کہا کہ ہمیں پورٹ اوکھا نہیں آنا تھا مگر راستے میں ایک آدمی کو طبی امداد دینا ضروری ہو گیا تھا اس لیے ہم اپنے راستے سے ہٹ کر اوکھا کی طرف آ گئے۔ وہ کہنے لگا' ہم دوا دارو کر کے مریض کو مسقط تک بھی لے جا سکتے تھے لیکن ہم نے سوچا کہ انجن میں تھوڑا سا کام بھی کرا لیں گے' اوکھا میں ہمارا ایک پرانا مکینک دوست ہے۔ اب بحریہ ہمیں کلیئرنس دے دے تو ہم بندرگاہ میں داخل ہونے سے پہلے اوکھا پورٹ سے باضابطہ اجازت نامہ لے لیتے ہیں۔ نیوی وال پوچھا کہ سورت کی بندرگاہ سے نکلنے کے بعد تمھارا ریڈیو رابطہ ہوا ہے؟ احمد نے کہا' ہم غر ہیں' ریڈیو ہمارے پاس کہاں۔ نیوی والوں نے تمھیں نہیں معلوم کہ چوبیس گھنٹوں کے لیے اوکھا معمول کی سرگرمیوں کے لیے بند کر دیا گیا نے کہا' واللہ نہیں معلوم' بالکل نہیں معلوم والوں نے کہا' اچھا اب معلوم ہو گیا ہے اس لی جاؤ اور طبی ضرورت اپنی ہی دواؤں سے پوری انجن کا کام اپنے پسندیدہ مکینک سے آیندہ مہینے کرانا۔ ہم پندرہ منٹ بعد تمھیں کم سے کم ڈیڑھ دور دیکھنا چاہتے ہیں۔

احمد عربی میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ نیوی والے کہ ہم نے تمھارے ساتھ رعایت کی ہے تو تم بک رہے ہو۔ یہ پورٹ اس وقت فوجی علاقہ ہے' ہم کرافٹ اپنے ضابطے کی خلاف ورزی کے الزام میں بھی کر سکتے ہیں۔ احمد نے مرعوب آواز میں "جو حکم باب" جیسا کوئی فقرہ کہا اور اپنے ملاحوں کو احکام لگا۔

کرافٹ کھلے سمندر کی طرف رُخ کر کے روا گیا۔ میں نے پورٹ ہول سے جھانک کر دیکھا' بحر گن بوٹ اسی طرح رکی ہوئی تھی۔ دو آدمی طیارہ توپ کے پاس اس طرح کھڑے تھے جیسے ہماری طرف کھولنے ہی والے ہیں۔ کرافٹ کی واپسی نے پریشانی میں اضافہ کر دیا۔ اب میرا اور آئی کا کیا ہو گا؟ ہمیں مسقط جانا پڑے گا؟ میں اسی طرح کے سوالوں الجھا ہوا بینچ پر بیٹھا بحریہ کی گن بوٹ دور ہوتی دیکھتا رہا۔ سب جانتے تھے کہ وہ دیر تک ہمیں اپنی دُور سے دیکھتے رہیں گے۔ آخر جب ہم ان سے ڈیڑھ دو دور ہو گئے تو بحریہ کی کشتی مڑی اور خلیج کچھ کی طرف گئی۔

میں ریلنگ کا سہارا لے کر عرشے پر آیا اور اپنے

پر بیٹھ گیا۔ آلی اور اس کا بیٹا کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے تھے۔ وہ باہمت عورت تھی لیکن کچھ دیر پہلے گھر واپسی کی جو اُمّید اسے نظر آئی تھی' وہ پورٹ اوکھا بند ہونے کی وجہ سے اب ختم ہو گئی تھی۔

کچھ دیر بعد احمد اپنے ماموں کے ساتھ آیا اور میرے پاس بیٹھ گیا۔ اسے اوکھا میں داخل نہ ہو سکنے سے الجھن تو ہوئی تھی لیکن وہ کہنے لگا کہ میں بندرگاہ سے اٹھارہ بیس میل اوپر گلف آف کچھ میں ماچھیوں کے پرانے گھاٹ پر کرافٹ لگا کر تمھیں اتار دوں گا' اس وقت تک پانی چڑھنے لگے گا۔ کرافٹ آرام سے خشکی تک پہنچ جائے گا۔

اس نے مجھے تسلّی دی اور کہنے لگا کہ کوئی زیادہ نقصان نہیں ہوا ہے۔ بس آبادی تک جانے کے لیے تمھیں اور عورت کو تھوڑا پیدل چلنا پڑے گا۔ پھر کہنے لگا کہ چوں کہ بحریہ کے لوگ ہماری نقل و حرکت کی نگرانی کر رہے تھے اس لیے ہم چار میل کھلے سمندر میں نکل گئے تھے تاکہ وہ سمجھیں کہ ہم مسقط کے راستے پر لگ گئے ہیں۔ اب موقع دیکھ کر ہم پھر واپس ساحل کی طرف آ گئے ہیں۔ اوکھا سے اٹھارہ میل اوپر خلیج کچھ میں ہم پرانا ماچھی گھاٹ تلاش کریں گے پھر تمھیں اور عورت کو اتار دیں گے۔ یہ کہہ کر اس نے ہمیں آرام کا مشورہ دیا۔

شام ہوتے ہوتے بڑی عمر والے عرب ملاح نے ہمیں آ کر اٹھا دیا' کہنے لگا کہ ہم کچھ کی خلیج میں آ گئے ہیں' ماچھی گھاٹ آ رہا ہے' تم لوگ اُترنے کی تیاری کرو۔ میں پریشانی میں سو نہیں سکا تھا' کچھ غنودہ' کچھ جاگتا ہوا سا کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔ اس خبر نے جیسے مجھے پوری طرح بیدار کر دیا۔ میں نے اپنے بدن میں توانائی کی نئی رو دوڑتی محسوس کی۔

ہم ساحل سے بہ مشکل میل بھر دُور تھے مگر ماچھی گھاٹ ایک نظر دیکھ کر ہی میرا دل ڈوبنے لگا' ایسا اُجاڑ اور دل مسلنے والا ماحول تھا کہ میں نے وحشت زدہ ہو کر بوڑھے ملاح سے پوچھا۔ "کیا تم ہمیں یہاں اُتارو گے؟"

"اور کیا کریں؟"

مجھے یقین تھا کہ یہ آسیب زدہ گھاٹ
استعمال نہیں ہوا۔ ویرانی اور اُجاڑپن کی
پرانی لگ رہی تھی۔ میں نے ملاح سے پوچھا۔
تم یہاں کب آئے تھے؟" کہنے لگا۔ "چار برس
میرے مزید پوچھنے پر اس نے قبول دیا کہ اس
گھاٹ زیادہ آباد نہیں تھا۔ میں نے تفصیل
کہنے لگا کہ چار سال پہلے بھی یہ کشتیوں کا قبر
اب اللہ جانتا ہے کہ اسے دوبارہ آباد کیا گیا
انگریز کے زمانے میں بھی یہ مچھلی بندر تھا۔ کبھی
کشتیاں بھی بنتی ہوں گی اور پورٹ اوکھا بلکہ پو
کی ناکارہ کشتیاں' ڈونگیاں مچھو کے اپنے کریا
دفن کے لیے یا مرمّت کے لیے یہاں لائے جا
گئے۔ برسوں پہلے حکومت نے اسے مچھیروں' ماہی
کے لیے بند کر دیا تھا پھر یہ ہو گیا کہ کشتیوں وا
ناکارہ کشتیاں یہاں چھوڑ چھوڑ کر جانے لگے۔ کشتی
گلی سڑی لکڑی جلانے کے لیے بھی کوئی نہیں لے
آبادی کے قریب ہی جنگل سے لکڑی مل جاتی ہے
پڑی ہے کہ اتنی دُور آئے اور لکڑی لاد کر لے جا
گویا برسوں سے یہاں کشتیوں کے ڈھانچے گلنے
اور معدوم ہو جانے کے لیے چھوڑے جا رہے تھے۔
آنکھیں پھاڑے بوڑھے ملاح سے یہ سب کچھ
تھا۔ ایک آخری سوال میں نے اُس سے یہ کیا کہ
آبادی یہاں سے کتنی دُور ہو گی؟ کہنے لگا کہ اصلی
آبادی تو اوکھا ہی ہے جو چالیس میل دُور ہو گی۔
یہاں سے دو چار میل دُور مچھیروں کا ایک گاؤں
ہے۔ مچھلی گھاٹ کی پرانی بستی تو ظاہر ہے' کبھی کی
چکی ہے' کرافٹ سے اترو گے تو وہاں بس تم دونوں ہی
گے۔ ملاح یہ وحشت اثر خبر سنا کر چلا گیا کہ ہم چند
میں ماچھی گھاٹ پر اتر جائیں گے۔

میں نے ساحل کی طرف کانپتے دل کے ساتھ دیکھ
ماچھی گھاٹ واقعی کشتیوں کا بلکہ اب تو ہماری اُمیدوں
قبرستان تھا۔ احمد المستقلی نے ہم سے بکواس کی تھی

... کوئی انسانی آبادی بہت قریب ہے۔ لگتا
... پیدل چلنا ہو گا، وہ بھی اس صورت میں کہ
... ورنہ بھٹکنے کے لیے سیکڑوں میل
... اور رن آف کچھ کا دلدلی علاقہ تھا۔ کھارا
... تھے اور بھوک پیاس کے

... فوراً بات کرنی چاہیے، وہ ہمیں اس
... اپنی جان نہیں چھڑا سکتا۔ احمد آیا تو
... بات کی۔ وہ کہنے لگا، فاصلے کا مجھے ٹھیک
... کوئی بستی یہاں سے کتنی دُور ہے۔ ممکن
... کہ رہے ہوں۔ پھر اس نے بڑی بے
... جلدی فیصلہ کرلو، یا تو یہاں اُتر جاؤ یا پھر
... مسقط چلو۔ بلکہ وہ الٹا ناراض ہونے لگا کہ
... تمہاری خاطر اپنی جانیں اور کشتی خطرے میں
... ہم تو تمہیں اوکھا پر اتارنے کی نیت سے
... ہمیں کیا خبر تھی کہ بندرگاہ بند ہے اور بحریہ
... متعین کر رہے ہیں۔ اب ہم ایندھن خرچ کر
... آگئے ہیں تو تم بچر بچر کر رہے ہو۔ ارے
... دو چار میل نہ ہوا تو چھ آٹھ میل ہو گا۔
... وقت جھیل کر آبادی تک پہنچ جاؤ گے۔
... ہو۔ ہمیں دیکھو تم لوگوں کی وجہ سے ہم
... سے ہٹ کر ادھر آگئے ہیں۔ سچ پوچھو تو مسقط
... پورا سفر ابھی باقی ہے۔ بندرگاہ سورت سے
... تو ہم بس تم لوگوں کے لیے ایندھن جلاتے
... آئے ہیں۔

... المستقل خاصا چالاک آدمی تھا، اس نے
... کا ذکر نہیں کیا جو میں نے اسے ادا کیا تھا۔ احمد
... ہوئے ایک فقرہ کہا۔ "دس منٹ میں سوچو"
... ادھر؟ خلاص!" وہ تقریباً "ناراض ہو کر نچلے عرشے
... آپا پاس بیٹھی ہماری باتیں سن رہی تھی۔ کچھ
... اس کی سمجھ میں آگئی تھیں اور وہ فکرمند ہو گئی
... آپا باتیں میں نے اسے سمجھا دیں اور پوچھا۔
... اب کیا کریں؟ مسقط جا نہیں سکتے۔ ادھر اترتے ہیں تو



خبر نہیں، کتنا پیدل چلنا پڑے اور نہ جانے کیا ہو جائے، رن کچھ کا علاقہ ہے۔"

مگر رن کچھ تو آپی کا علاقہ تھا۔ آپی خلیج اور رن کچھ کی فضا سے اس طرح مانوس تھی جیسے میں اپنے شہر کی ان جانی گلی میں بھی اجنبیت محسوس نہیں کرتا۔ کہنے لگی۔ "ساب بھٹکیں گا تو پانچ دس کوس بھٹک لیں گا۔ رہیں گا تو اوری رن کچھ میں۔" اس نے سامان سمیٹنا شروع کردیا۔ احمد نے دیکھا کہ ہم سے اب واقعی پیچھا چھوٹنے والا ہے تو وہ ایک دم متواضع ہو گیا۔ اس نے ہمیں دو کمبل دے دیے۔ کہنے لگا کہ تم لوگ ابھی کم زور ہو، ساتھ میں بچہ بھی ہے۔ رات کو ماچھی گھاٹ پر کسی کم پرانی لانچ میں گھس کر سو جانا، سویرے تازہ دم ہو کر نکلنا۔ شام سے پہلے آبادی میں پہنچ جاؤ گے۔ اس نے ہمیں پانی کا ایک مشکیزہ دیا اور بہت سا پکا ہوا کھانا ہمارے حوالے کردیا جو موجودہ حالات میں چار پانچ دن کے لیے کافی تھا۔ اس کے ماموں نے بڑی سی چادر میں اناناس اور ناریل باندھ دیے۔ بچے کے لیے ایک تھرموس فلاسک میں بکری کا گرم دودھ بھر دیا، کہنے لگا کہ صبح تک کے لیے کافی ہو گا۔

صبح بچے کو ماں کے دودھ کے علاوہ ناریل اور انناس دینا' کھجور کا حلوہ کھلانا' شام تک مگن رہے گا۔ تم شام سے پہلے ہی کسی بستی میں پہنچ جاؤ گے اور وہاں سے کوئی سواری تمھیں اوکھا پہنچادے گی۔

سمندر ابھی مد پر تھا۔ ملّاح کنٹری کرافٹ کو خشکی میں کافی اندر تک لے آئے۔ کشتی جیٹی پر لگا دی گئی۔ یہ ایک پرانی جیٹی تھی۔ کٹے پھٹے' سڑے ہوئے تختوں کے رخنوں سے پانی چمکتا دکھائی دیتا تھا۔ ہم دونوں مسافر خلاصیوں کی مدد سے جیٹی پر اُتر گئے۔ احمد مستقلی کے دو آدمیوں نے ہمارا سامان اتار دیا۔

شاید پانی اُترنے لگا تھا اس لیے وہ لوگ تیزی سے ہمیں اور سامان کو چھوڑ کر اپنے کرافٹ پر پہنچ گئے۔ دیکھتے دیکھتے الاحمد جیٹی سے ہٹ کر کھلے پانی میں پہنچ گیا۔ دس پندرہ منٹ میں وہ اتنے فاصلے پر تھا کہ عرشے پر کھڑے ہوئے خلاصی پہچانے نہیں جا رہے تھے' وہ سائے کی طرح نظر آنے لگے۔ آدھے گھنٹے بعد کرافٹ افق کے ہموار خطّے پر ایک نقطہ بن گیا۔ میں اور آلی جیٹی کے گلے سڑے تختوں پر سامان کے ڈھیر کے پاس بیٹھے وہ نقطہ غائب ہوتے دیکھ رہے تھے۔

کرافٹ نظر آنا بند ہو گیا تو ہم اُٹھے۔ ہم نے مڑ کر ماچھی گھاٹ کے پُر ہیبت ویرانے پر نظر ڈالی۔ شام گہری ہو گئی تھی۔ دُور دُور تک مُردہ کشتیوں کے سیاہ ڈھانچے پھیلے پڑے تھے۔ گلی سڑی لکڑی پر اب سمندری چوہوں' آبی کیڑوں اور کیکڑوں کی حکمرانی تھی۔ جزر میں واپس ہوتی ہوئی لہروں سے کشتیوں کے ڈھانچے ہلتے اور شدید مرض میں مبتلا کسی پرانے مریض کی طرح کراہنے لگتے۔ آلی نے عمر کا زیادہ حصّہ کشتیوں میں اور کشتی گھاٹوں پر گزارا تھا پھر بھی اس قبرستان میں اس قدر وحشت زدہ بیٹھی تھی کہ میں اپنا خوف بھول گیا۔ وہ ماں ہے' میں نے سوچا' اس کا خوف اپنی اکیلی جان کے لیے نہیں ہے' آلی اپنے بیٹے کے لیے خوف زدہ ہے' میں نے سامان اُٹھا کر آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا۔ جیٹی کے چرچراتے ہوئے تختوں میں جہاں تہاں بڑے بڑے سوراخ اور درزیں تھیں۔ بعض جگہ تو پورے پورے تختے اکھڑ کر پانی گرے تھے۔ لکڑی کے عارضے نے کیکڑوں اور چوہوں نے جگہ جگہ سے لکڑی سڑا دی تھی یا کتر میں نے آلی سے کہا کہ وہ ابھی وہیں بیٹھی رہے' پھیروں میں سامان کو اور اُسے جیٹی سے لے جا آلی اداسی سے ہنسنے لگی۔ "صاب! یہ پانی لکڑ توان نہیں ہے۔ توں ایک ویری ڈگ سکتا ہیں' م ڈگ سکتی۔" وہ حوصلہ مند عورت ایک ہاتھ سے بچّے کو سنبھالے' دوسرے میں کمبلوں کا بنڈل ا جیٹی پر سنبھل سنبھل کر چلتی ہوئے ٹوٹی سیڑھیو نیچے اتر آئی۔ اب ہم خشکی پر تھے۔ کئی دن پانی پر بھٹکتے رہنے کے بعد میرے پیروں نے سخت زمین کی تو اس خدائی خوار ویرانے میں بھی طمانیت کی ا جسم میں دوڑ گئی۔ میں خشکی کا آدمی تھا۔ پانی پر مو اتنے قریب دیکھ لینے کے بعد میں پھر زمین کی آغوش میں آ گیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ جیٹی سے اُتر مٹّی پر لوٹیں لگانا شروع کر دوں۔ میں زندہ مٹّی سے لپٹ کر رونا چاہتا تھا مگر لگتا تھا ماچھی گھاٹ کی یہاں کی ہر چیز کی طرح موت اور خوف کی زد رہتے اپنی خاصیت بھول چکی ہے۔ وہ سڑے بُرادے کے رنگ کی تھی' کہیں دلیے کی طرح موٹی دھول کی طرح باریک اور ہر صورت میں بے جان تھے' سڑے ہوئے تختے اور شہتیر بارش اور سمندری ہوا کی کھارے اور ساحل کی گندگی میں والے چوہوں اور کیکڑوں نے کھا لیے تھے۔ کھا لکڑی کا مُردہ برادہ برسوں زمین پر گر گر کر زندہ مٹّی بدبودار کفن سے ڈھانپتا رہا تھا۔ یہی کفن مُردہ گھا مٹّی کا اوپری پرت تھا۔ آدھی پانی میں پڑی' آدھی نکلی کشتیوں میں سڑنے اور ٹوٹنے پھوٹنے کا عمل شدت سے ہوا تھا۔ کتنی ہی آدھی' پون' چوتھائی کشتیوں کے ڈھانچے ساحل کی طرف سے آنے ریت نے ڈھک لیے تھے۔ لگتا تھا کہ اور چالیس برس گزر جائیں گے تو مٹّی انھیں پوری طرح ڈھانپ

گی پھر یہ بتانا مشکل ہو گا کہ یہ کشتیاں تھیں کہ چٹانیں مٹّی کے تودے تھے کہ بھوسے کے ڈھیر۔

آلی اپنے بچّے کو سنبھالے اور کمبلوں کا ڈھیر سینے سے لگائے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے ساتھ قبرستان کی وحشت آسا سڑکوں سے گزرتی، کشتیوں کی نئی پرانی قبروں کا جائزہ لے رہی تھی۔ ہم کسی پناہ گاہ کی تلاش میں تھے۔ آگے کا سفر ہم رات کے آرام کے بعد ہی کر سکتے تھے اور رات بھر کے آرام کے لیے ضروری تھا کہ کوئی ایسی لانچ نظر آ جائے جو ذرا صاف ہو، جس کے عرشے پر اتنی جگہ تو ہو کہ ہم تینوں پیر پھیلا کر سو سکیں۔ کوئی اوٹ بھی ہو جس سے ہم سرد سمندری ہوا سے بچ کر پڑے رہیں۔ لگتا تھا کہ ہم اگر ساری رات ماچھی گھاٹ پر گھومتے پھریں گے تو بھی ایسی کوئی پناہ گاہ نہیں مل سکے گی۔ ہماری تلاش کسی ایسے قطعے کے لیے تھی جہاں سب سے آخر میں کشتیاں لائی گئی ہوں۔ کشتیوں کے یہ نئے مُردے شاید اس قابل ہوں کہ ہمیں رات بھر کے لیے پناہ دے سکیں۔ میں نے آلی سے کہا کہ آؤ ایسا کوئی قطعہ ڈھونڈیں۔

آلی ماہی گیروں کی جبلّت کے سہارے آخر یہ اندازہ لگانے میں کام یاب ہو گئی کہ گھاٹ کا سب سے کم استعمال کیا گیا حصّہ کدھر ہو سکتا ہے۔ اُس کے پاس کوئی ایسی دلیل تو نہیں تھی جو وہ اپنے انتخاب کے حق میں پیش کرتی مگر اُس نے ایک طرف ہاتھ اُٹھایا اور ہم دونوں اسی طرف چل پڑے۔ ساحل کی آوازیں اور کشتیوں کے ڈھانچوں کی چرچراہٹ رات کی وحشت بڑھا رہی تھی۔ یہ سب چیزیں زیادہ تکلیف دہ بنانے کے لیے اچانک ہلکی پھوار بھی پڑنے لگی۔ آلی نے بچّے کو کمبل سے ڈھانک دیا۔ میں نے اُس کی بتائی ہوئی سمت میں تیزی سے قدم بڑھانے شروع کر دیے مگر ہم دونوں ابھی پوری طرح اپنی طاقت بحال نہیں کر سکے تھے۔ کتنا بھی تیز چلتے، ہماری رفتار عام صحت مند آدمی جتنی نہ ہوتی۔ پھوار ایک سی رفتار سے پڑ رہی تھی اور میں آلی اور اُس کے بچّے کی طرف سے فکر مند تھا۔ وہ اگر بھیگ جاتے ہیں تو سردیوں کی یہ بارش انھیں زیادہ نقصان پہنچائے گی۔ آلی کشتی پر نمونیے کا ایک جھٹکا برداشت کر چکا ہے۔

میں آلی کو پیچھے آتا چھوڑ کر نسبتہً "ایک ... طرف بڑھا۔ اس لانچ پر میری نظر اچانک پڑی حالانکہ یہ دوسرے کاٹھ کباڑ کی اوٹ میں تھی۔ ... بعد مجھے اس کی وجہ معلوم ہو گئی کہ وہ کیا چیز تھی ... وجہ سے میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لانچ پر ... کشتیوں کے برعکس عربی کے جانے پہچانے خط میں ... کا نام "احمدی" لکھا تھا۔ یہ نام سیاہ مستطیل پر سفید ... سے لکھا گیا تھا اور شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے ... بھی پڑھا جا سکتا تھا۔ کنٹری کرافٹ الاحمر کے بعد ... اگر ہماری پناہ گاہ بن سکے تو اس سے اچھی کیا بات ... پھوار میں ذرا تیزی بھی آ گئی تھی۔ میں نے آلی کی ... دیکھ کر اشارہ کیا اور احمدی لانچ کی طرف بڑھ گیا۔ ... دائیں بائیں پھیلی ہوئی کشتیوں سے شہتیر گر گر کر ... کا راستہ بند کر چکے تھے پھر بھی میں نے سامان زمین ... دیا اور بھیگے ہوئے شہتیروں میں راستہ بناتا ہوا ... کسی طرح احمدی پر پہنچ گیا۔ کشتیوں میں یہ تازہ مُردہ ... پُرانی گلی سڑی کشتیوں سے جو دلدلی مٹّی کی سی ایک ... اٹھتی ہے، لانچ میں وہ ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ عر... خاصا بڑا حصّہ قابلِ استعمال ہموار تختوں کی وجہ سے ... لائق تھا کہ ہم اپنے بستر جما لیتے۔ ہوا کے رخ کوئی ... نہیں تھی لیکن جگہ ایسی تھی کہ ضرورت پڑنے پر ... کر عارضی اوٹ کی جا سکتی تھی۔ سڑے کینوس اور ... کی لی بلی چھت تھی۔ میں نے آلی سے پکار کر کہا ... جگہ اپنے مطلب کی ہے، تم وہیں ٹھیرو، میں تمھیں لے ... رہا ہوں۔ میں نے دو پھیروں میں سامان اور آلی کو لانچ ... پہنچا دیا۔ لانچ ایک طرف جھکی ہوئی تھی، لیکن ... سیدھی نہیں کھڑی تھی۔ جو لوگ اسے یہاں ختم ہو... کے لیے ڈال گئے تھے، انھیں کیا ضرورت پڑی تھی ... اُسے سیدھا رکھنے کی زحمت اٹھاتے۔ ہم دونوں نے ا... حساب سے اپنے بستر بچھائے کہ ہمارے سرہانے ا... طرف رہیں۔ جگہ کم تھی مگر اتنی ضرور تھی کہ ہم

فاصلے سے اپنے بستر بچھا لیے۔ آلی کے لیے کشتی کے کیبن روم میں جگہ تھی ہی نہیں اس لیے ہم قریب قریب لیٹنے پر مجبور تھے۔ اب وہ حالات نہیں تھے۔ اب بھی ہم دو انسان آبادی سے دور سہی مگر ایسے سماجی رشتوں میں بندھے ہوئے تھے جو اجنبی عورت اور مرد کا فاصلے پر رہنا بہتر سمجھتا ہے۔

ہم صحیح وقت پر کسی چھت کے نیچے پہنچ گئے تھے اس لیے کہ پھوار کچھ دیر پہلے ہلکی ہلکی شروع ہوئی تھی، اب وہ بارش بن گئی تھی۔ آلی نے ہموار تختوں پر عرصوں سے پڑا ہوا کمبل آدھا بچھا کر آدھا اوڑھ لیا، بچہ اُس کی گود کے تولیے میں لپٹا ہوا مزے سے کھیل رہا تھا۔ میں نے بھی آدھا کمبل بچھائے اور آدھا شانوں تک ڈالے آلتی پالتی مارے کالی رات میں بارش کو یا کشتیوں کے ڈھانچوں اور اُن کے درمیان دکھائی دینے والی کالی داغ دار مُردہ مٹی پر گرتی دیکھ رہا تھا۔ آسمان کا جو حصہ مجھے اپنے بستر سے نظر آ رہا تھا، وہ بادلوں سے خالی تھا مگر ادھورے چاند کی روشنی نے آسمان کا یہ ٹکڑا اُجال دیا تھا۔ میں نے چاندنی ہمیشہ رومان پرور سمجھی ہے۔ چاندنی کسی بھی منظر کا حسن بڑھا دیتی ہے، یہی ہمارے شاعروں نے لکھا ہے مگر جو منظر مجھے ترچھی کھڑی ہوئی لانچ سے نظر آ رہا تھا اس میں چاند کے ہلکے اُجالے نے کوئی بھی چیز حسین نہیں بنائی تھی بلکہ کچھ اور بگاڑ دی تھی۔ دُور تک بکھری ہوئی لکڑیوں کے ڈھیر اور کشتیوں، ڈونگیوں کے اُوپر تلے پڑے ہوئے ڈھانچے اس ٹھنڈے اُجالے میں کتنی ہیبت ناک دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے اس منظر سے نظریں ہٹا لیں اور آلی سے پوچھا۔ "اب تیری طبیعت کیسی ہے آلی؟"

"میں ٹھیکی ہاں۔"

"چپ چپ کیوں بیٹھی ہے؟"

"بس..." آلی پھر چپ ہو گئی۔

اندھیرے کی وجہ سے میں اُس کے چہرے کے تاثرات نہیں پڑھ سکتا تھا مگر اُس نے سر جھکا لیا تھا اور ٹھنڈی سانس بھری تھی۔ میں نے سوچا، اس کا دھیان بٹانے کے لیے باتیں کرتا رہوں۔

"آلی!"

"آں۔"

"دیکھ، اب تو فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہماری جان بچ گئی، تیرا بیٹا بھی ٹھیک ہے۔ تو بتا رہی تھی کہ تیرا زخم بھی اب صحیح ہو رہا ہے۔ پھر کیوں فکر کرتی ہے۔ اب تو ہم تیرے علاقے سے بہت قریب ہیں، جہاں سے تو کہے گی، میں تجھے سرحد پار کرا دوں گا۔ جتنا خرچ ہو گا، وہ کروں گا۔ اکیلا نہیں چھوڑوں گا تجھے۔"

"میں جانتی ہاں۔"

"پھر چُپ کیوں ہے؟" آلی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے پوچھا "کیا تجھے ساون یاد آ رہا ہے؟" یہ فقرہ میں نے اُس کا موڈ بدلنے، اُسے چھیڑنے کے لیے کہا تھا، مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ پھوٹ پڑے گی۔ اپنے بیٹے کو گود میں بھینچ کر اس نے ہچکیوں کے ساتھ رونا شروع کر دیا۔ میں گھبرا گیا۔ ایسی سخت کوش عورت اور اندر سے اس قدر نرم اور آنسوؤں سے بھری ہوئی؟ میں نے عہد کیا کہ چاہے کچھ ہو جائے، کل میں ہر صورت میں اسے سرحد پار کرانے کی کوشش کروں گا۔ ہم رن کچھ کے علاقے میں پہنچ گئے ہیں، رن آف کچھ کا ایک حصہ ٹھٹھے کے جنوب مشرق تک پہنچتا ہے۔ پاکستانی سرحد میں یہ ایک بار داخل ہو جائے تو رن کے علاقے سے اپنے ساحل کوٹھ

میں اپنے آدمیوں کے پاس پہنچ جانا اس کے لیے مشکل نہ ہوگا۔ اگر کوئی مشکل پیش آئی تو میں اس کے ساتھ کچھ دور پاکستانی سرحد میں بھی جانے کا خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔ میرا کیا ہے، فرار تو ہو ہی رہا ہوں۔ ایک بار جا کر پھر واپس آ جاؤں گا یا ایران کی طرف، خلیج کی طرف کسی بھی طرف نکل جاؤں گا۔

میں اپنے بستر سے اُٹھ کر آلی کے پاس گیا۔ میں نے تسلّی دیتے ہوئے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ طوفان میں گرتے درخت کی طرح میرے سینے سے آ لگی۔ بہت دیر بعد اس کی ہچکیاں بند ہوئیں۔ میں نے چہکتی ہوئی آواز میں اس سے کہا کہ وہ رونا دھونا چھوڑ کر اب ہم دونوں کو کھانا پانی دے۔ "آخر کب تک ہمیں بھوکا رکھے گی۔ کیسی عورت ہے، میرے علاقے کی عورتیں تو ایسی نہیں ہوتیں۔ آلی قمیص کے دامن سے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے مسکرانے لگی۔ باہر اسی طرح بارش ہو رہی تھی۔ آلی نے تولیے میں لپٹے ہوئے اپنے بیٹے کو میری گود میں دیا اور احمد المستغلی کا عطا کیا ہوا کھانا لانچ کے ڈھلوان عرشے پر جمانے لگی۔ سچ بات یہ ہے کہ مجھے ابھی کوئی خاص بھوک نہیں تھی، میں نے صرف آلی کا دھیان بٹانے کے لیے اسے کھانا نکالنے اور کھانا کھانے میں اُلجھا دیا۔ ہاں، یہ ضرور تھا کہ میں کھا پی کر جلد فارغ ہونا چاہتا تھا تاکہ رات کو جلدی سو کر ہم سویرے ہی اُٹھ بیٹھیں اور چل پڑیں۔ ہم دونوں بہت دیر تک آہستہ آہستہ کھاتے رہے۔ آلی اب پھر جی لگا کر کھا رہی تھی، دودھ پلانے والی ماؤں کو جتنا کھانا چاہیے۔ میں یہی کوشش کرتا رہا کہ زیادہ مقوی، زیادہ مزے دار کھانے اُسے ملیں۔ اس نے اپنے بیٹے کو مستغلی کھجوروں کا حلوہ کھلایا، اناس کا رس چُسایا۔ عربوں نے پچھلے چار دنوں میں ہمیں ناریل کا پانی خاصی مقدار میں پلایا تھا اسی نے ہمیں تیزی سے بحال ہونے میں مدد دی تھی مگر اب شاید اس کی خوشبو سے آلی کا بیٹا بیزار ہونے لگا۔ ہزار کوشش کے باوجود آلی اسے ناریل کا پانی پلانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ بچّہ بُرا منہ بناتا اور پانی اگل دیتا۔ اس کی کیفیت دیکھ کر ہم دونوں ہنسنے لگے، آلی بہت دنوں بعد پھر کھل کر ہنس رہی تھی۔ اُس کا بیٹا اسے ہنسا رہا تھا۔

کھانا کھا کر میں اپنے بستر پر آ گیا۔ آلی کمبل اوڑھ کر اپنے بیٹے کو دودھ پلانے لگی۔ میں صبح کے سفر کے بارے میں سوچتا ہوا اور لکڑی کی چرچراہٹ، بارش اور لہروں کی آوازیں، کیڑوں مکوڑوں کی سرسراہٹیں سنتا ہوا نہ معلوم کس وقت سو گیا۔

رات کو کسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اب آس پاس آوازوں کی وہ ریل پیل نہیں ہے جو میرے سوتے وقت تھی۔ کوئی بڑا شور کم ہو گیا تھا۔

مجھے یاد آیا، جب میں سویا تھا تو بارش ہو رہی تھی مگر اب بس لہروں کا دبا دبا شور، کیڑوں مکوڑوں کی آوازیں اور لکڑی کی کراہیں تھیں۔ ٹھیک تو ہے، بارش بند ہو چکی ہے۔

میں نے بیداری کے ابتدائی لمحوں میں محسوس نہیں کیا تھا مگر اب میں نے ڈھلوان عرشے پر ساکت کھڑا ہوا وہ سایہ دیکھ لیا جو اُجلے آسمان کے مقابل مجھے اتنا قریب نظر آ رہا تھا کہ ذرا سا بڑھ کر میں اسے چھو سکتا تھا۔ میں آلی کی طرف سے پریشان ہوا۔ میں نے سر گھما کر اس کے بستر کی طرف دیکھا۔ آلی کا بستر کہیں نہیں تھا۔ میں جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ یہ آلی کھڑی تھی.... آلی وہاں کیوں کھڑی ہے؟ میرے منہ سے کوئی آواز نکلی ہوگی کہ اس نے مڑ کر کہا "شی ی ی۔" وہ بچے کو گود میں لیے، کمبل اوڑھے سامنے کے اندھیرے میں انہماک سے کچھ دیکھ رہی تھی۔

میں کمبل اوڑھ کر آلی کے برابر جا کھڑا ہوا۔ بالکل سامنے کشتیوں کے سیاہ ہیولوں کے درمیان کچھ چمک رہا تھا۔ میں نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ چمک ایک بار خوب بڑھی پھر بند ہو گئی۔ لہروں اور کیڑوں کا شور کاٹتی ہوئی ایک کھردری آواز آئی۔ "وحشت، تیری تو!" پھر کچھ روشنی ہوئی اور بڑھ کر قائم ہو گئی۔ کھردری آواز نے اس بار اطمینان کا اظہار کیا۔ "ہا آں ں ں۔" روشنی بڑھ کر الاؤ بن گئی۔

میں نے لپلپاتے شعلوں کے اُجالے میں بھاری جسم کے ایک آدمی کو آسیب کی طرح روشنی پر حاوی ہوتے دیکھا۔ وہ کسی قسم کا اوور کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ بوتل کے جن کی طرح وہ ابھرتا ہوا اور لہرا کر اٹھتا ہوا دونوں ہاتھ پھیلائے الاؤ کو جیسے اپنی نحوست منتقل کر رہا تھا پھر اس نے ہاتھ سمیٹ لیے اور آسائش کی آواز نکالی۔ "ہا آں ں ں۔"

میں نے سوچا یہ بھی ہماری طرح کا کوئی مسافر ہوگا جو کڑاکے کی سردی اور بارش میں رات گزارنے کے لیے آگ جلا رہا ہے۔ اچھا ہے' دو سے تین بھلے۔ میں اسے متوجہ کرنے کے لیے آگے بڑھنا چاہتا تھا مگر آبی نے میرا بازو چھوا' آہستہ سے کہا۔ "سامنے نہیں جا صاب!"

"کیوں؟"

"ابی دیکھ لے یہ کیا کرتا ہیں۔"

اوور کوٹ والے نے بچوں کی طرح کلکاریاں مارتے ہوئے الاؤ کے گرد چکر لگانے شروع کر دیے تھے۔ اُس کی گردش میں رفتہ رفتہ تیزی آتی جا رہی تھی۔ آبی نے زیرِ لب کہا۔ "دیکھا صاب تو نے؟"

"ہاں... لیکن یہ کر کیا رہا ہے؟"

"آبی تشویش سے بولی۔ "یہ میرے کو چریا لگتا ہیں۔ پاگل ہے نہیں؟"

میں نے کہا۔ "اکیلے میں آدمی کیا نہیں کرتا۔ یہ پاگل نہیں ہوگا' پاگل ہو بھی تو کیا۔ ہمیں رستہ تو بتا ہی دے گا۔"

"دیکھ لے صاب!" آبی بے بسی سے بولی۔ بچہ نیند میں کسمسا رہا تھا۔ آبی اسے کندھے سے لگا کر تھپکنے لگی۔ معاً بچے کے منہ سے ذرا سی آواز نکلی۔ آواز بہت ہلکی تھی پھر بھی الاؤ کا طواف کرتے ہوئے آدمی نے سن لی اور ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ہماری طرف نہیں گھوما بلکہ اس نے ہاتھ جوڑ کر اپنی پیشانی سے لگایا اور ڈنڈوت کرتا ہوا آگ کی طرف متوجہ ہو گیا جیسے آواز ہماری سمت سے نہیں "الاؤ سے آئی ہو۔

"بڑا چریا ہے۔" آبی نے کہا۔

میں نے بڑھ کر اسے آواز دی۔ "اے بھائی!"

الاؤ کی تعظیم کرتا ہوا آدمی ہڑبڑا کر مڑا جیسے میں نے اسے اپنی آواز سے ڈرا دیا ہو۔

"کون ہے؟ کون ہے اودر؟" اس نے ڈپٹ کر گھبراتی میں پوچھا۔ وہ اندھیرے میں ہمارے ہیولے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"مسافر ہیں بھائی!"

"ادھر؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟" اب کے اس نے ہماری زبان میں سوال کیا۔

"ہمیں کشتی سے اتار دیا گیا ہے۔ ویرانے میں ادھر پھینک کے چلا گیا کشتی والا۔"

"کشتی؟ کیسا کشتی؟ کتنے آدمی ہو تم؟" وہ دھیرے دھیرے پیچھے ہٹا اور زمین پر پڑی ہوئی اپنی لاٹھی اٹھالی۔

"گھبراؤ مت بھائی؟ میں ہوں اور ایک عورت ہے... بس ایک گود کا بچہ ہے۔"

"بچہ؟ ہاں؟ تم کہہ رہے ہو بچہ بھی ہے تمہارے ساتھ؟" نہ معلوم کیوں اسے اس پر حیرت ہو رہی تھی کہ ہمارے ساتھ بچہ ہے۔

"ہاں بچہ ہے۔"

"آج چھالے... لڑکا ہے' لڑکی؟"

یہ عجیب سوال تھا مگر میں نے جواب دے دیا کہ لڑکا ہے۔ آبی نے میری طرف دیکھ کر ایسے سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہو کہ دیکھا' میں نہ کہتی تھی کہ یہ پاگل ہے۔

موٹا آدمی یہ سن کر خوش ہوا کہ ہمارے ساتھ جو بچہ ہے' وہ لڑکا ہے۔ اس نے لاٹھی پھینک دی اور اندھیرے میں ہمیں نظروں سے تلاش کرتے ہوئے یوں ہاتھ پھیلا دیے جیسے سہارا دے کر یا بازوؤں میں لے کر ہمیں اوپر سے اُتار لے گا۔ "آؤ۔ آجاؤ۔ یہاں آگ کے پاس آ جاؤ۔"

میں نے ہاتھوں میں سامان اٹھایا اور سنبھل سنبھل کر اپنی پناہ گاہ یعنی ترچھی کھڑی ہوئی لانچ سے اتر کر شہتیروں کے بیچ میں راستہ بناتا ہوا الاؤ تک پہنچ گیا۔ آبی لانچ ہی پر رہی۔ نہ وہ سامان اٹھانا چاہتی تھی نہ الاؤ کے

اور اس پاگل کے قریب اکیلی جانے کو تیار تھی۔ جب میں والی سامان لے کر دوسرے پھیرے میں الاؤ کی طرف چلا تو اس بار آلی بھی میرے ساتھ آگئی۔ اجنبی نے کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔ تم ادھر نکل آؤ میرے پاس.... بچے کو گرم رکھنے کی ضرورت ہے۔"

آلی میری اوٹ میں بیٹھی رہی۔ اس نے اس شخص کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے اسے آگے آنے کا اشارہ بھی کیا مگر اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"ایدر کو جانے کا ہے؟" آدمی نے مجھ سے پوچھا۔

"کہیں بھی۔" مجھے اپنا یہ جواب خود احمقانہ لگا۔ میں نے فوراً کہا۔ "جانا تو آگے ہے پر جہاں ٹرین ملے.... یا بس مل جائے' ایسی کوئی جگہ بتاؤ۔"

"ہا آں ں ں۔" اس نے اطمینان کی آواز نکالی۔ "بتائیں گا' بتائیں گا' ضرور بتائیں گا۔" وہ آلی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

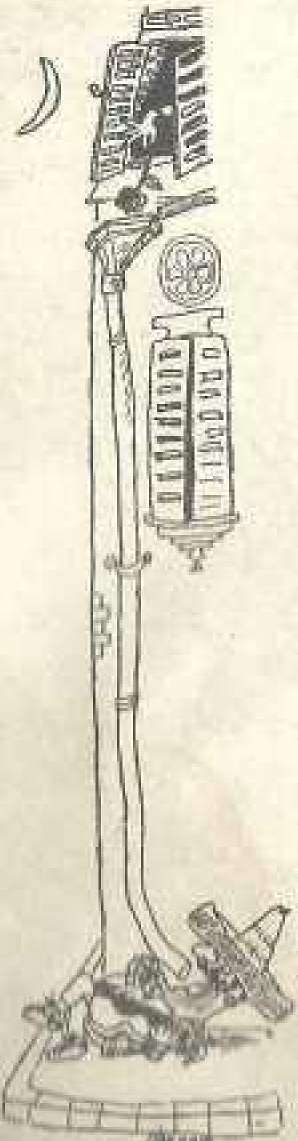
آلی پردہ دار عورت نہیں تھی اور میری کچھ نہیں لگتی تھی مگر مجھے موٹے آدمی کا اُسے اس طرح گھورنا اچھا نہیں لگا' پھر مجھے احساس ہوا کہ یہ آلی کو ایسے نہیں گھور رہا ہے جیسے عموماً مرد گھورتے ہیں۔ شاید وہ آلی کو دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ بس اس کے بچے کو دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "تم یہاں کہاں رہتے ہو؟" اس کے بارے میں یہ جاننا ضروری تھا۔

"ایں؟ ہا آں.... ایدر.... ایدر رہتا ہوں میں۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔

میں ہنسا۔ "یہاں؟ اس شمشان میں؟"

"شمشان؟" اس نے دہرایا۔ یہ کشتیوں کا قبرستان تھا۔ وہ دوسرے ہی لمحے سمجھ گیا کہ میں نے اس جگہ کو شمشان کیوں کہا ہے۔ وہ ہنسنے لگا۔ "میں نواں نگر کا ہوں۔"

"نواں نگر؟" میں نے کبھی کے دیکھے ہوئے نقشے اپنی یادداشت میں دہرائے اور شہروں کے نام یاد کرنے کی کوشش کی۔ مجھے یاد آیا کہ نواں نگر اب جام نگر کہلاتا ہے۔ میں نے کہا۔ "ہوں۔ جام نگر بڑا شہر ہے۔"



"جام نگر اور راج کوٹ' ادھر نزدیک میں یہ دو شہر ہے۔"

"تو تم گجراتی ہو؟"

"ہوں بھی اور نہیں بھی۔ ویسے جام نگر سے گھر چھوڑ کے آگیا' اور کام بہت تھا' ایدر سلایا میں میرا کام ابھی ہوا نہیں۔"

"سلایا؟ کیا سلایا گاؤں؟ یہاں سے قریب ہے؟"

"ہاں' بہت میں بہت ساڑھے چار پانچ میل ہوئیں گا۔"

"کیا کام کرتے ہو؟"

"جانور کا ڈاکٹر ہوں جس کو سلوتری بولتے ہیں'

سلوتری' وہ ہوں۔"

میں جوتے موزے پہن کر سویا تھا۔ اب ان سے چھٹکارا حاصل کر کے پیر تاپنے لگا۔ "کیا نام بتایا' سلایا؟ سلایا میں تمھارا کام کیوں نہیں جما؟ گاؤں میں تو زیادہ کام ہونا چاہیے' جانور زیادہ ہوتے ہیں۔"

بس۔ نہیں جما۔"

"میں نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ جام نگر سے یہاں کیوں آ گیا۔ مجھے کیا' ہو گی کوئی بات۔ آلی کا بیٹا جاگ گیا تھا اور الاؤ کی طرف ہمک رہا تھا۔ سلوتری اسے دیکھ کر بولا۔ "بچہ سندر ہے۔ کتنے سال کا ہوئیں گا؟"

آلی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے کہا۔ "ہاں خوب صورت ہے....."

اس نے ایک دم پوچھا "یہ دونوں' اماں بچہ تمھارا کون ہے؟"

"پڑوسی۔"

وہ بولا۔ "کیسا؟"

وہ اور کچھ بھی جاننا چاہتا تھا چونکہ اسے ناکافی جواب ملا تھا۔

آلی کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا' اسے بیٹے کے بارے میں' اپنے بارے میں اس طرح پوچھنا برا لگ رہا ہے اس لیے میں نے سلوتری کے جواب میں مسکرا کر کہا۔ "اچھا' بہت اچھا پڑوسی ہے۔"

سلوتری سمجھ گیا کہ آگے اسے کچھ نہیں پوچھنا چاہیے۔ میری کلائی کی طرف اشارہ کر کے وہ بولا۔ "دن نکلنے میں گھنٹا ایک سے جیادہ ہوئیں گا؟ کیا؟"

پانچ بجنے والے تھے میں نے کہا۔ "ابھی پانچ بجے ہیں' سمجھو' دو پونے دو گھنٹے باقی ہیں۔"

"تم لوگ ابھی کچھ کھائیں گا؟ میں سلایا سے بہت لے کر آیا تھا۔ بس بنانا وڑا' ہوئیں گا ہاں۔ دیوے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں ہم لوگ کچھ نہیں کھائیں گے۔ تمھیں بھوک ہو تو ہمارے پاس کھانا بھی ہے' انناس اور ناریل بھی ہے۔" میں نے پنیر اور ہری چٹنی کے سینڈوچ اور پھل بڑھا دیے۔ اس نے کھانا وا...
لے کر خوب آواز سے کھانا شروع کر دیا۔ ایک ...
اس نے اٹھا کر اوور کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ "...
کھاؤں گا۔"

آلی نے اسے کھاتے دیکھ کر اور منہ کر...
بنایا۔ اوور کوٹ والا بھی سمجھ گیا ہو گا کہ عورت
شروع ہی سے اسے ناپسند کیا ہے مگر اسے پروا نہیں تھی
وہ انناس کھاتے ہوئے بھی آلی کے بیٹے کو دل ...
دیکھ رہا تھا۔ انناس کھا کر اس نے اوور کوٹ کی آستین
پر اپنے ہاتھ پونچھ لیے اور ڈکار لی۔

آلی نے آخری بار اس کی طرف نفرت سے دیکھا
اوڑھتے ہوئے کمبل میں منہ دے کر خود بھی چھپ گئی ...
اپنے بیٹے کو بھی چھپا لیا۔ اس نے میری پیٹھ سے ...
کے کچھ دیر اونگھنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ موٹے سلوتری
اوور کوٹ کی جیب سے بیڑی کا بنڈل نکالا' میری طرف
بڑھا دیا۔ میں نے سر ہلا کر انکار کیا تو وہ خود ایک بیڑی
کر آگ کے قریب ہو گیا۔ دو تین لمبے کش لے کر اس
نے اچانک مجھ سے سوال کیا۔ "کوئی بیوی بچہ' کوئی
کھاندان' پری وار تو تمھارا بھی ہوئیں گا؟ آں؟"

میں نے کہا۔ "نہیں کوئی خاندان' پری وار نہیں
ہے میرا۔"

"آج چھا؟..." وہ حیرت سے بولا۔

میں نے پوچھا۔ "اور تمھارا؟"

"اپنا بھی کوئی پری وار نہیں ہے۔ ویاہ کیا تھا۔ ...
ایک عورت ہوتی تھی' پڑوسن میں' جیسی یہ تمھارے
ساتھ والی ہے' سندر' سوشیل... بس کچھ دن اس کا ساتھ
رہا۔ اس سے بچہ کوئی نہیں ہوا۔"

میں نے گھبرا کر سر گھمایا کہ اگر آلی نے یہ بات سن
لی ہے تو سلوتری کی خیر نہیں' وہ منہ نوچ لے گی موٹے کا
مگر آلی اپنے کمبل میں غائب تھی۔ میں نے کہا۔ "دیکھو
سلوتری صاحب! میرے ساتھ والی بائی گھر بار والی' ناک
مریادا والی عورت ہے۔ ساون سنگھ' اس کا آدمی' اپنے
باپ بڑا بھاری ویاپاری ہے۔ ہماری تمھاری بات ساون

سنگھ کی اس عورت کے بیچ نہ رکھو تو اچھا ہے۔"

سلوتری نے، سنجیدگی سے سرہلایا۔ "ہاں۔ یہ بات ابی میں نے بوہر نہیں بولی تھی۔ تم کوئی کھیال نہیں کرنا۔ میرا مطلب کچھ اور نہیں تھا۔ آپ لوگ جاتو، آپ کا کام جانے ہم کون۔"

عجیب ہونق آدمی تھا۔ میں نے دعا کی کہ کاش یہ ہمیں کسی ٹھور ٹھکانے پہنچادے اور اس وقت تک سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہے۔ اگر یہ اسی طرح کچھ نہ کچھ کہتا رہا تو آلی اس کی ٹھکائی کردے گی۔ اس بات کا پورا خطرہ تھا۔ اس کا اور اپنا دھیان بٹانے کے لیے میں نے پوچھا۔

"سلایا سے یہاں تک تم کیسے آئے؟"

کہنے لگا۔ "آتا رہتا ہوں۔ میرے کو گھوڑوں کی دوائی کے لیے ایک قنقس لگرتا... سمجھتے ہو؟ قنقس قنقس۔ وہ پیچھے ہوتا ہے، رات میں ہی توڑا جاتا ہے۔ وہ لینے آتا ہوں ادھر بہت ہے۔"

وہ میرا سوال غلط سمجھا تھا، میں نے کیوں آئے ہو نہیں پوچھا تھا بلکہ یہ پوچھا تھا کہ کس طرح آئے ہو، کس ذریعے سے آئے ہو؟ میں نے سوال کی وضاحت کی۔

وہ بولا۔ "آچ چھا۔ میرے پاس موٹر سیکل ہے۔ پرانی وللڈوار ٹو کے جمانے کی ہے پر چلتی فاٹ ہے۔"

اس نے اشارے سے دور جھاڑیوں کی اوٹ میں کھڑی ہوئی دوسری جنگ عظیم کے زمانے کی موٹر سائیکل دکھائی۔

"سلایا سے آگے کوئی بس ملتی ہے؟"

"ہاں۔ دیکھیں گا۔ اُدھر پہنچ جاوے، پھر دیکھیں گا۔" عجیب جواب تھا۔

میں نے کہا۔ "تم سمجھے نہیں۔ جام نگر کو، راج کوٹ کو یا کسی اور جگہ کو سلایا سے کوئی بس تو جاتی ہوگی؟"

"اسی کو بولتا ہوں.... سلایا پہنچ جاوے ہم لوگ پھر دیکھیں گا۔"

میں چڑ گیا۔ "اس میں دیکھنے کا کیا ہے.... کوئی بس اگر جاتی ہے تو وہ چلے گی۔ نہیں جاتی تو نہیں چلے گی۔"

اس نے دھیرے دھیرے انکار میں سرہلانا شروع کیا، کہا کچھ نہیں۔ چند لمحے اسی طرح شاید میری حس... ماتم کرنے کے بعد وہ بولا۔ "تم لوگ کوئی بڑے موٹے... سے آئے ہو... ہاں؟"

میں نے کہا۔ "ہاں، احمد آباد سے۔"

"باپ رے باپ! ابھی تو۔" میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ آلی شاید ٹھیک کہتی تھی کہ یہ آدمی تھوڑا کھسکا ہوا ہے۔ اس نے ایک بار اور دھیرے سے باپ رے باپ کہا پھر بولا۔ "مہانگر میں سب کچھ اپنے ٹیم سے ہوتی ہے۔ احمد آباد کی کیا بات ہے۔ ابی سلایا گاؤں کی سوچو، احمد آباد کی سوچو تو کچ گھمن گھیری کھا جاتا ہے.... کیا۔"

اسے چپ کرانے کے لیے میں نے قصہ مختصر کیا۔ "میں سمجھ رہا ہوں۔ بسوں کے ٹائم میں گڑبڑ ہو جاتی ہوگی۔ چھوٹی جگہ ہے۔"

وہ ہنسا۔ "چھوٹی جگے بڑو بولا۔ سات روج میں دو روج بس آتی ہے بھیا جی! ابی یہ کھبر نہیں کون دو روج۔ بدھ وار اور ترودی وار یا سکروار اور منگل وار.... بس دوئی روج توان گھرسے بس آتی ہے۔ ابی کر کے بولا ہے کی اودر پہنچ جاوے پھر دیکھیں گا کیا۔"

میں چپ رہا۔ وہ بھی تھوڑی دیر چپ رہا پھر پوچھنے لگا۔ "آج کون دن ہے؟"

میں کیا کہہ سکتا تھا، گھڑی بھی میں سادہ پہنے ہوئے تھا، اس میں صرف وقت دیکھا جا سکتا تھا۔ میں نے دھیرے سے کہا۔ "دن؟.... کہیں پہنچ جائیں پھر دیکھیں گے۔" یہ بات میں نے سلوتری کی طرح کہی تھی اور خود ہی ہنس دیا تھا۔ وہ ہونق بے شک تھا مگر مجھے ہنستا دیکھ کر بات کی تہہ تک پہنچ گیا اور ہو ہو ہو کر کے خود بھی ہنسنے لگا۔

آدھے گھنٹے تک ہم میں سے کوئی کچھ نہیں بولا۔ وہ اوور کوٹ کی بغل میں لپٹا آگ کے پاس سرک آیا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد جب میں کافی اونگھ چکا تو اس نے کھنکار کر مجھے بیدار کردیا۔ "نام کیا ہے تمہارا؟"

یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ ندیائے ہوئے ذہن

...بھا دیا۔" راوت۔" میں نے کمبل میں سے
...کر اسے دیکھا۔ "تم سوئے نہیں؟"
"نہیں۔" اس نے اپنا سوال دہرایا۔ "نام کیا
ہے؟"

"راوت... منگل چند راوت۔"

"کام کیا کرتے ہو؟"

"ہوٹل چلاتا ہوں۔" اس وقت مجھے اپنا کراچی کا ہوٹل یاد آ رہا تھا۔

وہ بولا۔ "یہ عورت.... نہیں چھوڑو۔ عورت کا کوئی ... نہیں ہوئیں گا۔ لڑکا کتنے سال کا ہے؟"

اس پر خفا ہونا بے کار تھا۔ ویسے میں بہت تپ گیا تھا۔ میں نے دھیرے سے کہا۔ "ہوگا کوئی دو ڈھائی سال کا۔"

"ہا آں ں ں۔"

صبح ہونے میں کچھ دیر تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ... بھی نیند لینا چاہتی تھی' لے چکی ہے اور بیدار ہوتے ... ہے۔ مجھ سے بھی ہوئی' اب وہ اپنی بیٹھک بدل رہی تھی۔ میں نے دھیرے سے اسے آواز دی تو وہ بولی۔ "ہوں۔"

"تیری نیند پوری کرلی تو نے؟"

"ہوں۔"

"تو ادھر الاؤ کے رخ بیٹھ جا' بیٹے کو ذرا سینک لگنے دے' اب ہوا چلی ہے نا تو سردی بڑھ رہی ہے۔"

کہنے لگی۔ "سردی کی خیر ہے صاب!"

میں نے کہا۔ "نہیں' سردی کی بالکل خیر نہیں ہے۔ تو آجا' ادھر میں ہوا کے رخ بیٹھتا ہوں' تو میری جگہ سنبھال لے' آجا۔"

"تمہارے آگے نہیں بیٹھنا میرے کو' میں ادھر ہی ٹھیک ہاں۔"

میں نے دھیمی آواز میں سمجھایا۔ "ضد نہ کر آتی! یہ برا نہیں ہے۔ تجھ سے کچھ نہیں کہے گا۔ میں نے کہہ دیا ہے اسے' ڈرا دیا ہے۔ کہہ دیا ہے کہ یہ ساون کی عورت ہے۔"

وہ رازداری سے ہنسی۔ "صاب! تو نے الٹا اسے ڈرایا؟ آں؟ میرے کو تو اس سے ڈر لگتا ہے۔"

خبر نہیں' وہ ٹھٹھول کر رہی تھی یا سنجیدہ تھی۔ میں نے جیسے تیسے اسے' اس کے بیٹے کو ہوا کی زد سے ہٹا کر الاؤ کی گرمی کے رخ پہنچا دیا۔

"ہا آں ں ں۔" سلوتری کو بھی یہ بات پسند آئی۔ اس نے اور لکڑی ڈال کر الاؤ کی آگ اونچی کر دی اور آتی کو کافی جگہ دے کر خود دور ہٹ کر بیٹھ گیا۔ میں نے سوچا آدمی برا نہیں ہے۔ آتی کو بے وجہ اس سے چڑ سی ہو گئی ہے۔

صبح ہوئی تو ہمیں پتہ بھی نہ چلا کیوں کہ اس اجاڑ نحوست بھری جگہ چڑیوں کے چہچہے اور بھونروں کی بھن بھن تو کیا سنائی دیتی' لہروں کا شور بھی نہیں تھا۔ دھوپ بھی ڈرتے ڈرتے پھیل رہی تھی۔ الٹی سیدھی' ترچھی ٹیڑھی لڑھکی ہوئی کشتیوں کے بیچ ساحل کے موٹے بچھوؤں اور آبی کیڑوں نے خوراک کی تلاش میں اپنی دوڑ بھاگ اور لپک جھپک شروع کر دی تھی۔ سلوتری ہم سے پہلے اٹھ گیا تھا۔ وہ اپنی موٹر سائیکل میں کچھ کھڑ پڑ کر رہا تھا۔ سامان کا اچھا خاصا بڑا پشتارہ سا اس نے پٹرول کی ٹنکی پر تسمے سے کس دیا تھا۔ میں اٹھ کے پاس گیا تو وہ بولا۔ "یہ ٹنکی پر سیٹ جیسی بنا دی ہے کیا۔" میں نے ہاں میں سر ہلا کر اس "سیٹ جیسی" کی تعریف کی۔

سلوتری نے کہا۔ "عورت کے بیٹے کو ادھر سامنے سیٹ پر بٹھا دیں گا۔ تم دونوں پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ جانا۔" میں نے انکار میں سر ہلایا۔

"لڑکے کی خیر ہے۔ تم نے ٹنکی پر جو سیٹ بنائی ہے' ہمارے دونوں کمبل بھی اس پر باندھ لو۔ ہم دونوں پیچھے بیٹھ جائیں گے۔ بچے کو اس کی ماں سنبھال لے گی۔"

آہستہ آہستہ سر ہلا کر اس نے جیسے بات کا ہر پہلو سمجھ لیا۔ "چلو' یہ بھی ٹھیک ہے۔"

اسی انتظام سے کچھ سامان ساتھ لے کر کچھ وہیں پھینک کر ہم سلوتری کی موٹر سائیکل پر شاید پندرہ میل فی گھنٹے کی رفتار سے چل پڑے۔ کچے کا رستہ اس کا دیکھا

بھلا تھا پھر بھی کتنی ہی بار وہ کسی غلط پٹی پر مڑا اور آگے دلدل' کیچڑ یا چڑھ آنے والے سمندری پانی سے راستہ بند پا کر ہمیں واپس ہونا پڑا۔ سلوتری راستے پر پوری توجہ دیتا ہوا خاموشی سی موٹر سائی کل چلاتا رہا۔ میں ڈر رہا تھا کہ باتونی آدمی ہے' مڑ مڑ کر باتیں کرتا چلے گا تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔

سلایا گاؤں میں ہم کوئی گھنٹے بھر بعد داخل ہوئے۔ صبح کی سرگرمی کب کی شروع ہو چکی ہو گی کیوں کہ لگتا تھا' گاؤں کے لوگ کہیں جا کر لوٹ رہے ہیں یا شاید اطمینان اور بے فکری سے چلتے ہوئے گھروں سے نکلنا ان کے مزاج میں داخل تھا۔

ایک چوک ہی سلایا کا کل بازار تھا۔ یہ چوک چار سڑکوں' گنتی کے مکانوں اور تین دکانوں سے مل کر بنا تھا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ یہاں بہت کم آبادی ہے کیوں کہ جتنے لوگ یہاں رہتے ہوں گے' سب چوک میں آ بیٹھے تھے یا وہاں سے گزر رہے تھے۔

سلوتری کی موٹر سائی کل کا شور اُنھوں نے منٹوں پہلے سن لیا تھا۔ چوک کی تین دکانوں میں سے ایک پر دکان دار نہیں تھا۔ تین گاہک تختے سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ باقی دو دکانوں میں ایک ایک دکان دار بیٹھا تھا۔ سب راہ گیر' دکانوں کے مالک اور گاہک آواز کے رخ مڑ گئے تھے اور سلایا کے چوک میں یک لخت داخل ہوتی ہوئی سڑک پر سلوتری کی پر شور مشین یعنی بانک برآمد ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ سلوتری کی موٹر سائی کل چوک میں داخل ہوئی تو لوگوں نے جو کچھ دیکھا' اسے سمجھنے میں انھیں کچھ وقت لگا۔ سب نے کورس میں کوئی ایک جیسی آواز نکالی۔ وہ ہمیں سلوتری کے ساتھ دیکھ کر حیران ہوئے ہوں گے اور یہ حیرت کی آواز ہو گی کیوں کہ آواز کے تیور سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس سے کسی کی توہین مقصود نہیں' نہ ہی یہ خوشی کی آواز تھی۔ سلوتری نے آواز سن کر بس ایک لفظ کہا۔ "سالے!" وہ سلایا کی آبادی سے خوش نہیں لگتا تھا۔

چوک کے قریب ہی' کیوں کہ چوک سے دُور کچھ نہیں تھا' قریب ہی ایک گودام سا تھا [illegible] ایک تنگ زینہ اوپر جاتا دکھائی دے [illegible] اوپر نہیں گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اوپر [illegible] خانہ اور کھلی چھت ہے۔ چھت پر ایک [illegible] انگیٹھی رکھی تھی گویا چھت کا یہ حصہ [illegible] خانہ تھا۔

"سلوتری نے ہمیں اور سامان کو [illegible] اور چابیوں کا گچھا نکال کے گودام کا پھاٹک [illegible] خالی تھا۔ اس نے موٹر سائی کل کھڑی کی' [illegible] کے تالا لگایا اور زینے کا تالا کھول کر ہمیں [illegible] چڑھنے کی دعوت دی۔ اوپر پہنچ کے اس نے [illegible] پہ پڑی ٹوٹی کُرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود [illegible] دروازے میں لگا ہوا تالا کھولنے لگا۔ تالا کھل [illegible] پوٹلیوں سمیت وہ کمرے میں گیا اور اندر سے [illegible] کر لیا۔ اس طرح ہم تینوں کو اس نے کچھ دیر [illegible] اس دوران میں اندر سے کھڑ پڑ کی آوازیں آ [illegible] دو تین منٹ بعد اس نے دروازہ کھولا۔ میں [illegible] کہ دروازہ بند کر کے وہ کمرے کی حالت درست [illegible] گا مگر کمرہ بے ترتیب اور میلا تھا بس اتنی دیر میں اس [illegible] اپنی دونوں پوٹلیاں کہیں غائب کر دی تھیں اور [illegible] کوٹ اتار دیا تھا۔ کمرے میں دو کھری چارپائیاں [illegible] تھیں۔ ایک دیوار کے ساتھ زنگیائے ہوئے [illegible] الماری کھڑی تھی۔ الماری پر بھاری کنڈا لگا کر [illegible] دیا گیا تھا۔ دوسری دیوار کے ساتھ باکڑا پڑا تھا۔ ایک [illegible] جسامت کے چوکور پتھروں پر موٹا تختہ رکھا تھا۔ [illegible] سلوتری کی تپائی یا باکڑا تھا۔ سرکنڈے سے بنا ہوا [illegible] موڑھا فرش پر لڑھک رہا تھا۔ سلوتری اسے سیدھا [illegible] بیٹھ گیا اور بولا "ابی میں تم لوگ کے ناشتے پانی کا [illegible] سادھن کریں گا' پھر تم بھلے ہی آرام کرنا۔"

آلی نے زور سے انکار میں سر ہلایا اور مجھ سے بولی [illegible] "نہیں صاب! بول دے کھانا پینا کچھ نئیں کرے [illegible] گڈی کا ٹیم پتہ کر دے' بس۔"

میں نے سلوتری سے کہا کہ رات کو جتنا کھانا ہم [illegible]

کھالیا' وہ کافی ہے۔ اس وقت کچھ نہیں کھائیں گے۔ تم تو بس لاری آنے جانے کا وقت معلوم کر دو۔ سلوتری نے کچھ گجرات' کاٹھیاواڑ کی مہمان داری کی روایت کا ذکر کیا۔ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا رہا کہ ہم تو اں نگر میں ہوتے تو صبح سے مہمان داری کرتے۔ یہ سلایا ویسے ہی سالی بے کار جگہ ہے۔ لوگ اچھے نہیں' پر کچھ نہ کچھ جل پان تو کرنا ہی ہو گا۔ پھر اس نے خود ہی تجویز پیش کی کہ وہ چائے وائے بنا دے گا۔ میں نے چائے پر رضامندی ظاہر کر دی اور آلی کی طرف دیکھا' وہ مروت میں خاموش رہی۔ ویسے شاید اسے سلوتری کا دیا ہوا سادہ پانی بھی قبول نہیں تھا۔ ہم دونوں نے ایک ایک کھری چارپائی سنبھال لی۔ آلی نے اپنے بیٹے کو آدھا گود میں' آدھا چارپائی پر لٹا رکھا تھا۔ وہ تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ میں نے ایک کمبل اپنی چارپائی پر پھیلا دیا اور کہا کہ وہ اس پر بچے کو لٹا کے کچھ اوڑھا دے اور خود بھی کچھ دیر پیر پھیلا لے۔ میں اُٹھ کر بینچ پر جا بیٹھا۔

پندرہ بیس منٹ بعد سلوتری دو چھوٹی پیالیوں میں خوب گہری گڑ کی چائے لایا۔ ہم دونوں تھکے ہوئے تھے۔ میں نے شوق سے اور آلی نے آزمائشی سا ایک گھونٹ لیا۔ بہت تیز اور گاڑھی چائے تھی۔ چائے بھی کیا تھی' بس گرما گرم کوئی شربت تھا۔ مجھے سلوتری کے متعلق کوئی خوش فہمی تو نہیں تھی مگر اس نے اتنی گاڑھی' اتنی میٹھی چائے بنا کر مجھے مایوس کیا تھا۔ وہ خود بھی ایک فوجی ٹاپ کا مگ لے کر آگیا اور اپنا موڑھا کھینچ ہمارے سامنے بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ ساتھ ہی وہ مجھے بتاتا رہا کہ کس طرح ہم دونوں کو تھوڑی دیر کے لیے یہاں آرام کرتا چھوڑ کر وہ کسی شخص کھمباتا کے پاس بس کا معلوم کرنے جائے گا کیوں کہ اگر اس نے کھمباتا کے سوا کسی اور سے بس کے بارے میں پوچھا تو ہو سکتا ہے' وہ صحیح نہ بتائے بلکہ بھٹکا دے' یہاں بھٹکانے والے جھوٹ سچ بکواس کرنے والے بہت ہیں۔ ایک کھمباتا ہی سلایا میں ایسا ہے جس سے سلوتری کی صاحب سلامت ہے۔ کھمباتا پارسی بھائی ہے اور کسی سے بھی کوئی غاربازی نہیں کرتا' اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ کہنے لگا' یہاں کے ہندو مسلمان ... ایک دوسرے کو ستاتے رہتے ہیں۔ میں نے سوچا ... مسلسل بولتا رہا تو میں چائے بھی ختم نہیں کر سکوں ... اونگھنے لگوں گا۔ اس کے ایک ہی رفتار سے' ... دھیما کیے بغیر بولنے سے مجھے نیند کے جھونکے آ ... تھے۔ ابھی کچھ چائے باقی تھی کہ میں نے کاہلی سے ... کی طرف ہاتھ لے جا کر پیالی رکھ دی اور بینچ پر' ... کا تکیہ بنا کر لیٹ گیا۔ مجھ پر نیند کا غلبہ ہو گیا۔ مجھے دھندلا سا اندازہ ہو رہا تھا کہ آلی چارپائی پر کھری ... لیٹ رہی ہے' اس نے اپنی پیالی شاید سلوتری ... حوالے کر دی ہے اور سلوتری موڑھے سے جھک کر ... اور آلی کی پیالی فرش پر رکھ رہا ہے۔ اور یکساں آواز ... مسلسل بڑبڑائے جا رہا ہے۔

نیند تھکن دور کرتی ہے اور تازہ دم کر دیتی ہے ... اس نیند نے تو مجھے اور تھکا دیا۔ گھنٹے دو گھنٹے بعد یا ... پندرہ بیس منٹ بعد میں بیدار ہوا تو ایسا معلوم ہو ... میلوں دوڑ کر آ رہا ہوں۔ پیاس کے مارے حلق میں ... پڑ رہے تھے۔ سر بھاری تھا اور متلی ہو رہی تھی۔ ... دیوار کے سہارے سے اس باکڑے یا بینچ پر بیٹھنے لائق ہوا۔ لمحے بھر پہلے سر میں بھاری پن تھا' اب ... نے مغز میں چلتے ہتھوڑے کی صورت اختیار کر ... آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سامنے دیکھنا چاہا تو سب ... دھندلا دھندلا لگا۔ کھاٹ پر بیٹھی ہوئی آلی تک نظر ... آئی۔ مگر آلی سامنے نہیں تھی۔ آلی وہاں نہیں تھی ... اس کا بیٹا تھا۔ میں نے دفعتہً ایک دھاردار آلے ... کاٹتا ہوا خوف سینے میں اُترتا محسوس کیا۔ میں نے بینچ ... اُٹھنا چاہا مگر ہاتھوں' پیروں کی دُکھن اور مغز میں ... ہوئے ہتھوڑوں نے بے بس کر کے مجھے پھر بینچ پر گرا ... میں نے چیخنا چاہا' آلی کو پکارنا' خبردار کرنا چاہا مگر ... نے حلق سے اُتنی آواز بھی نہ نکلنے دی جسے میں خود ہی ... لیتا۔ اُف' یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ ... کہاں ہے اور اُس کا بیٹا؟ سلوتری! ایک لفظ ذہن میں ... بیدار ہوا۔ پھر دوسرا لفظ دشمن! شاید مجھے اور... اور

...نے زہر دیا ہے۔ میں نے پیچ دونوں
...تھام کر اٹھنے کی کوشش کی۔ میں اٹھا اور
...لے کر دو قدم چلا۔ "آ... آلی!" میں نے
...کی کوشش کی۔ اپنی پکار خود مجھے بھی مشکل
...جسم کی دشمن نے پھر مجھے پیچ پر گرا دیا۔
...وقت میں نے ایک آواز سنی۔ وہ انسان کی
...تھی۔ پھر بھی وہ چیخ غیر انسانی نہیں کہی جا
...کسی مرد، کسی بچے اور کسی عورت کی ملی جلی
...ایک کی نہیں تھی یا پھر کسی کی بھی آواز نہیں
...چلتے کسی آرے کی دھار پتھر یا لوہے سے
...اسی طرح کی چیخ پیدا ہوگی... دھات اور
...پکار... پھر کسی نے بے تحاشا خوف سے
...پکارا۔ "صاب! او صاب! نیچے آجا۔ صاب
...صاب!" آلی مجھے نیچے بلا رہی تھی۔ میں نے خود
...اٹھایا اور منہ کے بل فرش پر جا گرا۔ اگر
...بڑھا کر قریب آتا ہوا فرش ہتھیلیوں پر روک نہ
...مٹی کے برتن کی طرح ٹوٹ سکتا تھا۔ آلی پھر
...او صاب رے کہہ کر جیسے بے بسی میں مجھے بلا رہی
...خود کو سمیٹ کر ایک طیش کے عالم میں فرش
...میں کام یاب ہو گیا اور دو قدم چلا بھی۔ دیوار
...سہارے سے میں نے کمرے کی پوری لمبائی طے کر
...تھا، شانوں پر ٹکا ہوا سر پھٹ پڑے گا۔ سر کی ایسی
...ہاتھوں پیروں نے میرا حکم ماننا شروع کر دیا تھا، میں
...سے نکل کر کھلی چھت پر آ گیا۔

...نیچے سے آلی کے بلک بلک کر رونے کی آواز آ
...رہی تھی۔ وہ حرام کی اولاد سلوتری اس کے ساتھ زور
...کر رہا ہے؟ جانور، سالا، کمینہ! میں سیڑھیوں پر
...اور لڑھک کر ایک ساتھ چار چھ زینے گزارتا، پشت
...پہلوؤں پر چوٹیں کھاتا سیڑھیوں پر رک گیا۔ چوٹیں
...کا وقت نہیں تھا۔ شکر کی بات تھی کہ میری
...نہیں ٹوٹی تھی۔ نیچے کہیں آلی چیختے جا رہی تھی۔
...دیوار کے سہارے سے گن گن کر ایک ایک قدم
...شروع کیا۔ نیچے پہنچنا ضروری تھا۔ زینے سے اتر کر



سڑک تھی۔ مگر آواز گودام سے آ رہی تھی۔ گودام کا دروازہ بند تھا۔ بلکہ بند نہیں، صرف بھڑا ہوا تھا۔ میری ٹھوکر سے دروازہ کھل گیا اور دن کا اجالا، دھوپ گودام میں داخل ہو گئی۔

چیخ اندر سے جیسے جست کر کے سڑک پر آئی پھر پورے سالا یا گاؤں میں پھیل گئی۔ سب کو خبر ہو گئی کہ کچھ ہوا ہے مگر وہ منظر دیکھنے والا پہلا آدمی میں ہی تھا۔ آلی اپنے بیٹے کو چھاتی سے لگائے دو زانو بیٹھی تھی۔ اس کا لباس سینے سے ٹخنوں تک چپچپے تازہ لہو سے تر تھا۔ وہ بل بل کر بین کر رہی تھی اور چلائے جا رہی تھی۔ اس کا بیٹا مار دیا گیا؟ میں جھپٹ کر اس کے پاس پہنچا۔ وہ دھوپ بھرے گودام میں چیزیں ایک دم پہچان نہیں پائی، اور کچھ اور گھسٹتی ہوئی مجھ سے دور ہونے لگی۔ وہ سامنے سے الگ تو میں نے اسے دیکھا، سلوتری۔ گودام کے فرش پر پڑا تھا اور پیٹھ کے بل پڑا چھت تکے جا رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ سینے پر تھے جیسے ابھی ابھی اس نے کوئی بری خبر سنی ہو اور سن کر دل تھام لیا ہو۔ پہلی نظر میں اس کے دل کا حصہ ٹھیک ٹھاک لگتا تھا۔ ہاں پیٹ پر کسی ہوئی اس کی تنگ بش شرٹ دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ انسانی کلائی جتنا موٹا ایک ڈنڈا بش شرٹ کے دو بٹنوں کے بیچ میں داخل ہوا تھا جو بش شرٹ کا کپڑا اور اس کی بنیان پھاڑتا ہوا سلوتری کے معدے میں اتر گیا

تھا۔ ڈنڈا ہاتھ بھر باہر نکلا ہوا تھا اور سرخ ہو رہا تھا۔

آلی نے اب مجھے پہچان لیا۔ وہ صاب صاب کہہ کر اُٹھی اور اپنے بیٹے کو لیے ہوئے میرے گلے سے لپٹ گئی۔ بچہ اُلجھ کر رونے لگا۔ اس کا بیٹا ٹھیک تھا۔ وہ بھی ٹھیک تھی۔ میں نے پوچھا۔ "تیرا بیٹا اچھا ہے؟" میری گردن کے گھماؤ میں منہ دیے دیے اُس نے اثبات میں سرہلایا۔ میں نے کہا۔ "چل پھر باہر نکل۔"

وہ سسکی لے کر بولی۔ "صاب رے! میں نے اسے مار دیا۔"

"ہاں، مار دیا تُو نے۔ میں نے دیکھ لیا ہے۔ آ، چل باہر آ۔"

اُسے خود سے بھڑائے ہوئے میں نے قدم قدم گودام کے دروازے کی طرف چلنا شروع کیا۔ آلی نے میرے شانے پر سے سر اُٹھا کر فرش پر پڑی ہوئی لاش دیکھنی چاہی، میں نے گھوم کر اس کا رُخ موڑ دیا۔ "وہ حرامی میرے راجن کو کتل کرنے لایا تھاں۔" راجن اُس کے بیٹے کا نام تھا۔

آلی نے سر گھما کر پھر سلوتری کی طرف دیکھنا چاہا، میں نے پنجہ پھیلا کر اس کے گھنے بالوں والا سر دوبارہ اپنے شانے سے لگا لیا۔ وہ کمزور آواز میں بولی۔ "وہ راجن کو انگار میں ڈالتا تھاں.... بس میں مار دیا۔"

"اچھا کیا تُو نے.... تُو نے اپنے بیٹے کو بچا لیا، اچھا کیا، چل۔ آجا۔ آ میرے ساتھ۔"

آلی نے انکار کیا تو میں نے نوٹ کیا، گودام میں کپڑا اور گوشت جلنے کی بُو پھیلتی جا رہی ہے۔ میں نے سر گھما کر دیکھا، سلوتری آگ پر لیٹا تھا۔ اُس کی اوٹ سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔

ابھی ہم گودام سے نکلے بھی نہ تھے کہ سڑک پر دوڑتے قدموں کی چاپ سنائی دی اور گاؤں کے دو آدمی گودام کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ "باپ رے باپ"۔ ان میں سے ایک نے کہا، وہ مڑا اور دوڑتا ہوا واپس مکانوں کے پیچھے چلا گیا۔ جو کھڑا رہ گیا تھا وہ دوڑ جانے والے سے عمر میں کافی بڑا تھا مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر

اس نے مجھے صرف معلومات حاصل کرنے کے لیے سوال کیا۔ "تو کیا بچے کو مار دیا اس نے؟ بلی دے دی؟" میں نے انکار میں سرہلایا۔ "نہیں! وہ آپ مارا گیا۔"

"ارے! کیسے؟" اس کی آواز میں شاید حیرت سے زیادہ مسرت تھی۔

"پتہ نہیں۔" میں نے کہا۔

وہ لہولہان کپڑوں والی آلی کے پار گودام میں دیکھنے کے لیے اپنی گردن اِدھر اُدھر گھمانے لگا۔ "بچہ ٹھیک ہے؟" اُس نے یہ سوال رسماً کیا تھا، لہجے سے پتہ چل رہا تھا کہ بچے سے زیادہ اسے سلوتری کی باقیات سے دلچسپی ہے۔

آلی کو ساتھ لیے میں ایسے ہی کھڑا رہا۔ ٹھیک سے گودام میں دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ مجھے سامنے سے ہٹانے کے لیے یا شاید انسانی ہمدردی میں وہ کہنے لگا۔ "میا کو ادھر سیڑھی پر بٹھا دو۔ بے چاری کانپ رہی ہے۔" اسے دھوکا ہوا تھا یا وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ آلی بالکل نہیں کانپ رہی تھی۔ میں سامنے سے نہیں ہٹا تو اس نے کہا۔ "ہم کو پتہ تھا، ایک نہ ایک دن تو یہ ہو کیں گا۔"

"کیا؟ کیا ہو گا ایک نہ ایک دن؟" میں آلی اور اس کے بیٹے کو خود سے بھڑائے کھڑا رہا۔

وہ میری بات کے جواب میں بولا۔ "ارے بھئی خبر تھی کہ یہ حرامی کالا جادو کرتا ہے اور نواں نگر سے بھاگ کر آیا ہے.... بولتے ہیں، ادھر نواں نگر میں پولیس اس کے پیچھے پڑ گئی تھی۔"

میں نے ناگواری سے کہا۔ "سب کو خبر تھی تو یہاں سالوں میں پولیس اس کے پیچھے کیوں نہیں پڑی؟"

"پولیس اِدھر کہاں دھری ہے؟" اس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ "پھر یہ بھی ہے کہ اِدھر کوئی چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔ سب اس پاپی سے دُور ہی دُور رہتے تھے۔" تھوڑا رُک کر اُس نے کہا۔ "چلو، اب تو یہ مر ہی گیا۔"

چند منٹ بعد ہو ہو، او او، آں آں۔ جیسی کئی آوازیں سنائی دیں اور بہت سے آدمی مکانوں کے عقب سے نکل نکل کر گودام کے آگے جمع ہونے لگے۔ میں

…وں پر بٹھا دیا تھا اور خود اس کے شانے پر
…لا ہو گیا تھا۔ بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ بھانت
…کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کس نے
…مارا؟" مرد نے مار دیا؟ کچھ کر رہا ہو گا؟ عورت
…'عورت نے نہیں مارا' یہ جو ساتھ ہے' اس
…نہیں عورت نے' کسے؟ اچھا' اسے
…اس لایا تھا سالا' پر اب ہو گا کیا؟" ہجوم میں
…میں شامل ہوتی جا رہی تھیں۔ گلی بھرتی جا رہی

…کی کسی ہوئی ایک بات میرے ذہن سے چپک کر
…"اب کیا ہو گا؟" میں نے سوچا' ہم سلوتری کے
…سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتے۔ اب اوپر نہیں جا سکتے
…نہیں جا سکتے؟ اوپر ہمارا سامان ہے جس کی ہمیں
…وقت ضرورت پڑ سکتی ہے۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر
…اٹھایا اور اُسے لیے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے کو
…ہجوم میں سے کسی نے کہا۔ "اب کیا کریں بھیّا

…دوسرا بولا۔ "پولیس کو خبر کرو۔"
"پولیس یہاں کہاں دھری ہے۔"
"کیوں۔ کیا بس کے ساتھ نہیں آتے پولیس
…"

"او بھیّا! بس کے ساتھ تو آتے ہیں پر آج بس کدھر آئے گی۔"

"کیوں؟ کیا آج شکروار نہیں ہے؟؟"

"شکروار تو ہے پر بس کا دن کدھر ہے۔"

"ہاں' بس تو شنی وار کو..... سنیچر کو....."

"کیا بک بک کیے جا رہے ہو؟ جرا سنو تو' بس آ رہی ہے۔"

ہاں' ہیم تو ہے بس کا۔"

"آ رہی ہے۔ آ رہی ہے۔"

"ہجوم کی بھن بھناہٹ میں لمحے بھر کا وقفہ آیا تو میں نے کسی بڑی گاڑی کے انجن کی آواز سنی۔ پی پی پاں پاں جیسا ہارن بھی بجا۔ کئی آدمی ایک ساتھ چیخے۔ "آ گئی بس' آ گئی۔"

ایک بولا۔ "جاؤ دیکھو' پتہ کرو' پولیس والے آئے ہیں کہ نہیں آئے۔"

"آئیں گے کیسے نہیں۔ بس کے ساتھ آتے ہیں۔"

میں نے دو قدم اور چڑھ کر دلیپ یار کی زینے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور آلی کے شانوں کے گرد اپنی بانہہ کا گھیرا بناتے ہوئے اُسے زینہ چڑھانے لگا۔ اب وہ کانپ رہی تھی۔ میں نے آلی سے اور خود سے کہا۔ "ہو ہو گا' دیکھا جائے گا۔"



باسو دیو کی مریم' برج بھوشان اور گلی کی بھی آسمانی رنگ خالق
ظفر ... ادا سے محمد خان کی طرف سے
ایک آدم زاد کی سرگزشت' ابھی مکمل کر دیا گیا تھا۔
باقی واقعات آئندہ شمارے میں۔

25/ اگست 1911 کو پیدا ہوئے، کیمبرج کالج لندن میں تعلیم حاصل کرنے اور 1945 میں ناول بھی ...
والے برطانوی، 1955/56 میں انجمن مصنفین جرائم کے جریدے ریڈ ہیرنگ کے بانی مدیر، 1969/70 میں اس ...
سربراہ، 1965 میں انجمن مصنفین جرائم کے انعام یافتہ، ہربرٹ ہیرس نے تین ہزار سے زائد کہانیاں اپنے نام سے اور ...
سوا دوسرے ناموں سے تخلیق کی ہیں۔ اختصار میں انتشار ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ احتیاط سے لفظوں کا برتاؤ، چند سطروں میں ...
تعارف، پس منظر اور کرداروں کے خال و خد، خصال و اطوار کی وضاحت اور کہانی کا تجسس آخر تک برقرار رکھنے میں انھیں ...
ہے۔ جرمیات ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ ہربرٹ ہیرس کی ایک مختصر کہانی "شہتیر" آپ گزشتہ شمارے میں پڑھ چکے ہیں ...
ایک نسبتاً کم مختصر کہانی بتنگڑ ملاحظہ کیجیے۔ دیکھیے کس خوبی اور عمدگی سے انھوں نے ایک دل چسپ کہانی کا تانا بانا ...
دیکھیے، گرد و پیش کے مناظر پر ہربرٹ ہیرس کی نظریں کس طرح منڈلاتی رہتی ہیں۔ تخلیق کار کی آنکھ دیوار کے پار ...
ہونی چاہیے، اور کہتے ہیں، کہانیاں تو منظروں میں چھپی ہوتی ہیں پر ایک دل مضطر اور چشم بینا چاہیے اور سوز دروں بھی ...
تو سارے وجود سے ہے۔ مدیر

تین ہزار سے زائد، منفرد اور مختصر کہانیوں کے خالق،
برطانوی قلم کار ہربرٹ ہیرس کی جانب سے
ایک چونکا دینے والی کہانی، اس کے مخالف بھی طاقت ور تھے اور حمایتی بھی زبردست

بتنگڑ

لندن کی ایک خوش گوار صبح تھی۔ مطلع صاف تھا، چمک دار دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ گیارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ ویسٹ ون کے علاقے میں، بیلنگ اینڈ ویل اسٹورز اسٹور کے مردانہ ملبوسات کے شعبے میں ایک نوجوان قدرے دزدیدہ نگاہی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس نے چپکے سے پینتیس شلنگ کی ایک ٹائی اٹھا کر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لی اور اطمینان سے ٹہلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

وہ ریشمی دل کش ٹائی اس لحاظ سے قدرے منفرد کہی جا سکتی ہے کہ اس کی چھاپ بے ترتیب سے شوخ رنگوں پر مشتمل تھی۔ اس قسم کی ٹائیاں ہو نو لو کنونشن کے موقع پر اکثر دیکھنے میں آتی ہیں۔ ایک عام انگریز کے نقطۂ نظر سے یہ ٹائی قطعی نامعقول اور شوخ کہی جا سکتی ہے لیکن والا دی میر پول تیکی کی نگاہ میں یہ ایسے قیامت خیز اور تو بہ شکن حسن کے مانند تھی جسے دیکھ کر کوئی اپنے جذبات قابو میں نہیں رکھ سکتا۔

اس قسم کی ٹائی پورے سلووینیا میں کہیں دست یاب نہیں ہو سکتی تھی۔ خاص طور پر اس وقت سے جب سے نیو لائف پارٹی نے سلووینیا کو "آزادی" عطا کی تھی جیسا کہ کمیونسٹ نجات دہندوں کا دعوا تھا۔

پول تیکی، اسٹور کی مصنوعی دن جیسی روشنی سے موسم بہار کی محفوظ دھوپ اور تازہ ہوا میں باہر آیا تو ... ایک کیم شحیم بھدے سے شخص نے اپنا بھاری ... اس کے دبلے پتلے کندھے پر رکھتے ہوئے اسے اپنی ... متوجہ کر لیا۔ "معاف کیجیے گا جناب! میرے ساتھی ... میں نے چند لمحے قبل آپ کو مردانہ ملبوسات کے شعبے ... دیکھا تھا۔ آپ نے وہاں سے ایک ٹائی اٹھا کر اپنی ... رکھی ہے۔ اس وقت کاؤنٹر پر کوئی سیلز مین نہیں تھا ... جناب برا نہ مانیں تو کیا اس چیز کی رسید دکھانا پسند ... گے؟" برٹن شا کا لہجہ شائستہ اور انداز پر اخلاق تھا ... اس کی آنکھیں ہر قسم کے جذبات سے عاری تھیں ... تک نہیں جھپکا رہا تھا۔

پول تیکی اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے گالوں کی ابھری ہڈیاں اور نمایاں ہو گئیں، دبلے پتلے چہرے کی سانولی ... بھی پھیکی پڑ گئی۔ "میرا خیال ہے، آپ کو غلط فہمی ... ہے۔" پول تیکی دھیمے انداز میں گویا ہوا جیسے بولنے سے ... ایک ایک لفظ چن رہا ہو۔ "وہ کوئی اور شخص ہو گا۔" ... کر وہ کورنش بجا لایا اور جھینپتے ہوئے مسکرا دیا، پھر ... پلٹ کر چل پڑا۔

"پلیز! ایک منٹ جناب!" برٹن شا نے سخت لہجے ... کہا اور پول تیکی کا گوشت سے عاری بازو گرفت میں ...



...لیے اپنی انگلیوں کا حلقہ آگے بڑھایا لیکن اس کی مضبوط ...ں پول نیگی کا ناتواں بازو اپنے شکنجے میں نہ جکڑ سکیں ... دبلے پتلے دراز قامت پول نیگی نے اچانک ایک ...دار جھٹکے سے بازو چھڑا لیا اور دوڑنا بھی شروع کر دیا۔
"...رک جاؤ! رک جاؤ۔" برٹن شا غصے سے چیختا ہوا اس کے ...قب میں لپکا۔
...لوں کا تعاقب کرنا برٹن شا کے فرائض میں شامل تھا ... اگر برٹن شا کو پول نیگی کی انفرادی خصوصیت کا علم ... تو وہ بھی اس کے تعاقب کی زحمت نہ کرتا۔ برٹن شا ... اپنی عمر، جسامت اور بھدے پن کے لحاظ سے کسی طرح پول نیگی کے مقابلے کا نہیں تھا کیوں کہ پول نیگی وہ فرد فرید تھا جو دوڑنے کا ماہر تھا جس سے سلووینیا کی انٹرنیشنل ٹیم آف ایتھلیٹکس کی بے پناہ امیدیں وابستہ تھیں۔ سلووینیا کا دعویٰ تھا کہ ایک دوڑ میں پول نیگی نے ایک میل کا فاصلہ صرف ساڑھے تین منٹ میں طے کیا تھا۔ گو انٹرنیشنل اے چ ایتھلیٹک فیڈریشن نے سلووینیا کے دعوے کی سرکاری تصدیق نہیں کی تھی لیکن غیر سرکاری طور پر پول نیگی کو دنیا کا تیز رفتار ترین شخص قرار دیا جا رہا تھا۔ خاص طور پر مغربی دنیا کے دوڑنے والے نہایت بے تابی کے ساتھ آہنی پردے کے پیچھے سے آنے والے اس دوسرے

"ہاؤنڈ" کی کارکردگی دیکھنے کے تجسّس میں تھے جس کے بارے میں سلووینیا نے بے پناہ تشہیر کی تھی۔ غرض چودہ اسٹون وزنی برٹن شا کے مقابلے میں پولی لیگی کی برتری کے متعلق کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

برٹن شا بری طرح ہانپتے ہوئے میٹروپولیٹن پولیس کے ایک سپاہی کو اپنی روداد سنا رہا تھا۔ اُن کے گرد متجسس راہ گیر اکٹھے ہو گئے تھے۔ "کانسٹیبل! وہ شخص ایسی سُرعت سے دوڑا جیسے بجلی چمکتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی کو اتنی تیز رفتاری سے دوڑتے نہیں دیکھا۔"

چوریوں کے معاملے میں مذکورہ اسٹور کے لیے یہ سال بے حد بُرا ثابت ہوا تھا۔ اسٹور والے حقیقی اور فرضی چوروں، عادی اور خبطی چوروں کے خلاف مسلسل جنگ کرتے چلے آ رہے تھے اور اس کام سے بُری طرح اکتا گئے تھے۔ چوری کی اس تازہ ترین واردات کے بارے میں اسٹور منیجر نے با اختیار افسروں سے گفت و شنید کے بعد یہی نتیجہ اخذ کیا کہ اس نوجوان کو ڈھونڈ نکالنے کا رتی بھر بھی امکان نہیں جو صورت شکل سے غیر ملکی لگ رہا تھا اور خرگوش کی سی برق رفتاری سے دوڑا تھا۔ اسٹور منیجر نے یہ نتیجہ نہایت سکون سے "ڈیلی ایکو" کے نمایندے کے گوش گزار کر دیا۔ نمایندہ خط و خال اور ہٹ دھرمی کے لحاظ سے کوئی سُراغ رساں لگ رہا تھا۔ منیجر نے نوجوان نمایندے کو سب کچھ تفصیل سے بتا دیا تھا، اس کے باوجود اُسے یہ احساس بے چین کیے ہوئے تھا کہ نمایندہ ایک بار پھر آ ٹپکے گا۔ ایسا ہی ہوا۔ وہ پلٹ آیا، البتہ منیجر کو اس کے اتنی جلدی آنے کی توقع نہیں تھی۔ نمایندے کا نام ہولی ویل تھا۔ ہولی ویل کے آنے پر لنچ کے وقفے میں اسٹور منیجر کے کمرے میں سب لوگ جمع ہو گئے۔ اس مختصر سے اجلاس میں اسٹور منیجر اور "ڈیلی ایکو" کے نمایندے ہولی ویل کے علاوہ برٹن شا، اس کا ایک ساتھی اور وہ زیر تربیت سیلزمین بھی شریک تھا جس کا تعلق کھیلوں کے شعبے سے تھا۔ سب نے اپنی اپنی نشستیں سنبھال لیں تو ہولی ویل برٹن شا سے مخاطب ہوا۔

"تمہارے کہنے کے مطابق وہ شخص دیکھنے میں غیر ملکی لگ رہا تھا اور اس کا لب و لہجہ بھی غیر ملکیوں جیسا تھا۔ وہ دوڑنے میں بھی وہ حیرت انگیز طور پر پُھرتیلا ثابت ہوا؟" تمہا آغاز اس تصور سے کرتے ہیں کہ وہ حقیقت میں دکھائی دے رہا ہے، ایک غیر ملکی دوڑنے والا یعنی تھا۔" برٹن شا کے حلق سے ہلکی سی غراہٹ کے آواز نہیں نکلی۔

ہولی ویل نے اپنے بیگ سے بہت سی تصویریں یہ سب آٹھ بائی چھ انچ سائز کے گلوسی پکچر، ایتھ تھے۔ یہ تصویریں سلووینین ایتھلیٹکس نمایندوں کی تھیں۔ ٹیم دو رنرز، ایک ہائی جمپر اور ہیمر تھرو ور پر مشتمل تھی۔ یہ تصاویر ایک روسی طیارے میں ان کے لندن ایئر پورٹ پہنچنے پر اتاری تھیں۔ "ایک نظر یہ چند تصویریں غور سے دیکھ لو۔" ویل نے برٹن شا سے کہا۔

برٹن شا نے قدرے شک کے انداز میں تصو اُٹھا لیں۔ دوسرے ہی لمحے اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑے تصویریں دیکھ رہا تھا۔ تو توقف کے بعد وہ ہیجانی لہجے میں بولا۔ "یہ ہے وہ، یہی

اُس کے ساتھی نے بھی بے تابانہ انداز میں تصو جانب دیکھا اور تصدیقی لہجے میں چیخ پڑا۔ "ہاں، یہی ٹائی اسی نے اُٹھائی تھی۔"

"بہت عمدہ جنٹلمین!" ہولی ویل نے مسکراتے ہو کہا۔ "یہ میرا صرف شک تھا جو بہرحال درست ثابت اب ہم اپنے نوجوان دوست سیلز مین مسٹر ہوپر سے بارے میں بات کرتے ہیں۔" ہوپر ملبوسات کے شعبے آنے سے پہلے کھیلوں کے شعبے میں رہا تھا اور اس نے لیگی کو وہاں دیکھا بھی تھا۔ "ہاں تو ہوپر! اسے دیکھ تمہارے ذہن میں کیا خیال آیا تھا؟"

ہوپر نے کنکار کے سوالیہ نگاہوں سے اسٹور منیجر جانب دیکھا۔ اسٹور منیجر نے غصے سے اثبات میں سر ہلا ہوپر نے بتایا۔ "اس وقت میرا یہی خیال تھا کہ یہ پولی ہے۔ اس کی تصویر "آل اسپورٹس" جریدے میں چھپی تھی۔ میں ابھی اس سے آٹوگراف لینے کے بارے میں ہی رہا تھا کہ یہ اچانک چل دیا جیسے گفتگو کرنے سے کترا

...الد میں نے اسے نہیں دیکھا۔"
... اچھا دوڑنے والا بھی ہے نا؟" منیجر نے
...
... جناب! وہ دنیا کا تیز ترین دوڑنے والا ہے
... لوگوں کا کہنا ہے۔"
... قدرے پھول گیا۔ "یقیناً ایسا ہی ہو گا ورنہ میں
... پکڑ ہی لیا تھا۔"
...۔" منیجر غرّایا۔ "تم بھلا دوڑ سکتے ہو۔"
... میں آپ لوگوں سے معذرت چاہوں گا۔" ہولی
... کر کھڑا ہو گیا' اس نے جلدی جلدی تصویریں
... رکھ لیں۔ "اب میں چلتا ہوں' میں محسوس کر رہا
... اب میں خاصا مصروف رہوں گا۔"
... تک فلیٹ اسٹریٹ کا ہر فرد خاصا مصروف ہو چکا
... اسٹریٹ لندن کے اخبارات کا گڑھ کہلاتا ہے۔
... صبح ہر اخبار کے صفحۂ اول پر ولاڈی میر پول نیکی کی
... شائع ہو گئی۔ دیگر تمام اخبارات نے عزت ہتک کے
... بچنے کے لیے محتاط انداز میں پول نیکی کی گم
... خبر شائع کی تھی۔ البتہ "ڈیلی ایکو" کی کہانی قدرے
... تھی کیوں کہ ہولی ویل یہ ڈرامائی خبر دینے اور اس کا
... انکشاف کرنے میں اپنے معاصروں سے سبقت لے گیا

... کا تیز رفتار ترین شخص غائب ہو گیا۔ اسکاٹ لینڈ
... کے سراغ رساں انسپکٹر ورتھنگ نے کل کئی بار
... کینسنگٹن میں ویلنگ فورڈ ہوٹل کا دورہ کیا جہاں
... نین ایتھلیٹکس ٹیم کے ممبر قیام پزیر ہیں۔ یہ ٹیم
... سٹی اسٹیڈیم میں ہونے والے بین الاقوامی ٹورنامنٹ
... شرکت کے لیے آج کل لندن آئی ہوئی ہے۔ بظاہر
... ورتھنگ کے بار بار ہوٹل آنے کا مقصد ولاڈی میر
... سے گفتگو کرنا تھا جس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ وہ
... کا تیز رفتار ترین شخص ہے اور اس ریشمی ٹائی کے
... میں پولیس کی مدد کر سکتا ہے جو کل صبح بیلنگ اینڈ
... ویل اینڈز اسٹور سے چرائی گئی تھی۔ پول نیکی کل رات
... اپنے ہوٹل نہیں لوٹا تھا' آخری خبریں آنے تک بھی

اس کا کوئی پتہ نہ تھا۔ سلووی نین ٹیم کے دیگر ممبروں کا کہنا
ہے کہ اُنھیں بھی پول نیکی کے بارے میں کچھ علم نہیں۔
اس سلسلے میں سلووی نین سفارت خانے سے رابطہ قائم کیا
گیا تو وہاں سے بھی لاعلمی کا اظہار ہوا۔"

ایتھلیٹ خود کو منظر عام پر لانے میں ناکام رہا تو شام کے
اخبارات کو بڑی بڑی سرخیاں لگانے کا موقع ہاتھ آ گیا۔
ایک اخبار نے موقع غنیمت جانتے ہوئے یہ ناشائستہ سرخی
لگائی۔ "پول نیکی اور ٹائی۔۔۔ دونوں کہاں ہیں؟"

اخبار کے قارئین اتنے نافہم نہیں تھے کہ اس نمایاں
سرخی کا مطلب نہ سمجھ سکتے۔ سلووی نین سفیر کا غصّہ تو
دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ کسی ٹائم بم کی طرح پھٹ پڑا تھا۔
"ڈیلی ایکو" کے مطابق سلووینیا کے سفیر ہز ایکسی لینسی
ڈاکٹر نکولائی اسکریچ خوف نے اس معاملے پر تبصرہ کرتے
ہوئے کہا تھا۔ "سلووینیا کے قومی ہیرو کے خلاف یہ مبہم
الزام مغربی بلاک کی زوال پزیر سامراجی ذہنیت کی ایک اور
غلیظ اختراع ہے۔ وہ اکثر ہمارے خلاف ایسی اختراعات
کرتے رہتے ہیں۔"

برطانوی دفتر خارجہ نے یہ معاملہ کابینہ کی سطح تک لے
جانے کا فیصلہ کر لیا۔ سلووی نین ایتھلیٹک ٹیم اپنے
ہوٹل میں محصور ہو کر رہ گئی' وہ بار بار دھمکی دے رہی تھی
کہ ہم وائٹ سٹی ٹورنامنٹ میں شرکت منسوخ کر دیں گے۔

پول نیکی پر اسرار طور پر ابھی تک غائب تھا۔ ایک ہوقر
روزنامے نے یہاں تک لکھ دیا کہ سلووی نین سفارت
خانے نے پول نیکی کو اپنے تہ خانوں میں چھپا لیا ہے۔

---☆---

جنوبی لندن میں لیم بیتھ کے ایک واجبی سے صحت افزا
علاقے میں ایک چھوٹے سے بے ترتیب کمرے میں ہیری
اسمارٹ نامی ایک شخص دیر سے کسی سوچ میں گم تھا۔ اس
کا ذہن اس طرح گردش کر رہا تھا جیسے کسی گاڑی کا پہیّا
کیچڑ میں دھنس کر ایک ہی جگہ گھومتا رہتا ہے اور مزید
دھنستا چلا جاتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس
تصویر کا کیا کرے جو اس نے بیلنگ اینڈ ویل اینڈز اسٹور
کے باہر اتاری تھی۔ ہیری کی چھوٹی سی آنکھوں میں بے



عورت

۱- عورتیں، مردوں کی نسبت زیادہ بہتر ہوتی ہیں، کوئی حیرت کی بات نہیں کہ مرد انہیں چاہتے ہیں۔

☆ برطانوی مصنف، کنگزلے ایمس

۲- دنیا کی کوئی عورت بدصورت نہیں، اپنی اپنی جگہ ہر عورت حسن کی دیوی ہے۔

☆ فلم اسٹار، برجی بار دوت

۴- ہر عورت کو ایک ایسے مرد کی جستجو رہتی ہے جو اسے تلاش کرلے

☆ فلم اسٹار، چارلی چپلن

۵- جو عورت خود کو ذہین سمجھتی ہے، وہ مردوں کے مساوی حقوق کی طلب گار ہوتی ہے، لیکن جو عورت ذہین ہوتی ہے، وہ ایسا نہیں کرتی۔

☆ فرانسیسی ناول نگار، کولیٹ

۶- دنیا میں صرف دو قسم کی عورتیں ہیں، ایک وہ جو خود پر ضرورت سے زیادہ توجہ دیتی ہیں اور دوسری وہ جو ضرورت سے کم۔

☆ برطانوی مصنف، کیلی فرڈ آلانس

تینی پائی جاتی تھی۔ اس کی باریک مونچھیں ان سیاہ بالوں سے متضاد تھیں جو اس کی گردن اور کانوں کے اطراف پھیلے ہوئے تھے اور گھنے نظر آرہے تھے۔ اس نے ایک ڈریپ جیکٹ پہنا ہوا تھا جس کے شانوں کے پیڈ ابھرے ہوئے تھے۔ اس کا قابل اعتماد کانٹی نینٹل کیمرا ابھی اس کے پاس تھا جو ہیم بیتھ گروہ کا ایک فرد اس کے لیے خاص طور پر سوئزرلینڈ ہیم بیتھ سے اسمگل کر کے لایا تھا۔ یہ ایک حقیقی پوش کیمرا تھا۔ کیمرا ملنے سے قبل ہیری آکس فورڈ اسٹریٹ اور ریجنٹ اسٹریٹ کی فٹ پاتھوں پر سوٹ کیس میں نائلون کے موزے بیچتا تھا۔ کیمرا آنے کے بعد اس نے موزے بیچنا چھوڑ دیا تھا اور چلتا پھرتا فوٹوگرافر بن گیا تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اس میدان میں ڈھیروں پیسہ کمایا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر اگر آپ غیر ملکی سیاح قسم کے لوگوں کو تاڑنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

پول ٹیگی اسٹور کے باہر برنی شا سے گفتگو کے دوران اتنی دیر ضرور کھڑا رہا تھا کہ ہیری کو ان دونوں کی تصویر اتارنے کا موقع مل گیا۔

یہ ایک واضح اور نہایت عمدہ تصویر تھی۔ ہیری کچھ ہی عرصے میں غیر ملکی لوگوں کو فوراً شناخت کرنے میں ... حاصل کرچکا تھا۔ اخبارات میں جو کہانی شائع ہوئی ... اس نے ہیری کے اس شبے کی تصدیق کردی تھی کہ وہ ... پول ٹیگی ہی تھا جس کی اس نے تصویر کھینچی ہے۔

ہیری نے اپنی کھینچی ہوئی تصویر کسی اخبار کے پا... جانے کا خیال دل سے نکال دیا اس لیے کہ بظاہر یہ ... دے رہا تھا کہ فلیٹ اسٹریٹ والوں کے پاس اس ... مین اینجلیٹ کی اچھی خاصی تصویریں پہلے سے موجود ... ہیری اکثر سوچتا تھا کہ تصویروں سے پیسہ حاصل کر... غیر قانونی دھندے میں یہی خرابی ہے کہ تصویریں پہلے بھی موجود ہوتی ہیں۔

ہیری پوری سنجیدگی سے غور و فکر میں ڈوب گیا۔ اگر ... ٹیگی کے خلاف ٹائی کی چوری کا مقدمہ چلایا جا... استغاثے کو یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ پول ٹیگی اس ... اسٹور میں موجود تھا۔ دوسری جانب یہ بات بھی شرط... سکتی ہے کہ پول ٹیگی کی ٹیم کے تمام ساتھی اور ان ... عدالت میں یہ جھوٹی قسم کھانے سے دریغ نہیں کریں ... اس وقت پول ٹیگی کسی اور جگہ تھا۔ یوں بھی یہ کہتا ... کے سب غیر ملکی ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر پولیس ... ٹیگی کو اس الزام میں گرفتار کرتی ہے تو پھر معاملہ پولیس ... کے گلے پڑ جائے گا۔ پولیس پول ٹیگی کے خلاف کچھ ... نہیں کرسکے گی۔ جب تک اس کے پاس کوئی ٹھوس ... نہ ہو جس کی بنیاد پر وہ اسے مقدمے میں جکڑ سکے۔

ہیری کچھ دیر بعد سلووی نین سفارت خانے میں ا... پرائیویٹ ملاقات کے دوران سلووینیا کے سفیر ڈاکٹر ... اسٹریچ ٹوف کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ... ایکسی لینسی! جیسا کہ صورت حال سے ظاہر ہو رہا ہے ... ایک اہم گواہ ثابت ہو سکتا ہوں۔" اس نے سگار کا ... کش لیتے ہوئے کہا جو اسے سفیر موصوف نے عنایت ... تھا۔ وہ اس انداز سے گفتگو کرنے کی کوشش کر رہا تھا ... امور خارجہ کے محکمے کا نائب سیکریٹری ہو۔ "اگر آپ ... لڑکے سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے تو پہلے مرحلے میں ا... روز روز کی تفتیش کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

"...روز؟"

"میرا مطلب پولیس سے ہے۔ ہم پولیس کو روز روز بھی ... کہتے ہیں۔ اور پھر اگر آپ کا لڑکا گھسیٹ کر ... تھانے لے جایا جاتا ہے تو۔"

"...؟"

"میرا مطلب مجسٹریٹ سے ہے۔ میں دراصل یہ کہنا چاہ ... یور ایکسی لینسی کہ میری کھینچی ہوئی تصویر مناسب ... آپ کے لڑکے پول نیگی کے بچاؤ کی راہ بند کر سکتی ... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟ اور اگر ایسا نہ ہوا تو بھی مجھے ... پیدا نہیں ہوگی اس لیے کہ میں بذاتِ خود کسی حد تک ... والوں کا حمایتی ہوں۔ میں نے اسکول میں سو گز کی ... کا انعام بھی جیتا تھا۔"

... کا سفیر اپنی بڑی سی میز پر آگے کی جانب جھک ... اس نے اپنی سفید لمبی انگلیوں کی نفیس پوریں آپس ... میں اور اپنی چھوٹی سی سیاہ داڑھی تھپ تھپانے لگا۔ ... کے چہرے کا کل اثاثہ داڑھی کے یہی بال تھے ورنہ ... کی کھوپڑی بالکل صاف تھی اور بلیرڈ کی گیند کی طرح ... تھی۔ "تم تصویر کے ساتھ نے گیٹیو تو نہیں لائے ... ہو گے؟"

"نہیں تو... ارے... نہیں یور ایکسی لینسی۔" ہیری نے ... انداز میں ایک اچٹتی نگاہ اس شخص پر ڈالی جو ... ہاتھ باندھے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس شخص کا قد چھ ... سے کسی طرح کم نہیں تھا اور وزن بھی کم سے کم ... پونڈ لگ رہا تھا۔ ہیری کو اچانک جھرجھری سی محسوس ... لیکن اس نے فوراً خود پر قابو پالیا اور بہ مشکل تمام ... پر مردہ سی مسکراہٹ بکھیرنے میں کامیاب ہو سکا۔

"... آپ یہ تجویز پیش کر رہے ہیں کہ ممکن ہے آپ کے ... پول نیگی نے گیٹیو کا سودا کرنا چاہیں؟"

"اس کی قیمت بھی اچھی خاصی ہوگی؟ ہیں نا؟" سفیر نے ... دریافت کیا۔ ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر ایک خباثت آمیز ... ناگوار سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ پھر اس نے اپنی بادامی ... آنکھوں کا رُخ کاغذ کاٹنے کے لمبے سے چاقو کی جانب پھیر لیا ... جو اس کی میز پر رکھا تھا۔

عورت

۸۔ جو عورت بدصورت نہیں ہو سکتی، وہ خوب صورت نہیں ہوتی۔
☆ امریکی ادیب، اینا لوس

۹۔ اگر دنیا میں عورتوں کا وجود نہ ہوتا تو دنیا کی تمام دولت بے معنی ہوتی۔ ☆ ارس ٹوٹل اوناسس

۱۰۔ عورتوں کا سب سے بڑا مسئلہ مرد ہوتے ہیں۔
☆ امریکی مصنف، کیتھی سلا چالنڈ

۱۱۔ پیدائش سے 18 سال کی عمر تک لڑکی کو اچھے والدین کی ضرورت ہوتی ہے، 18 سال سے 35 سال تک خوب صورتی کی ضرورت ہوتی ہے، 35 سے 55 سال تک پروقار شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے اور 55 سال کے بعد اسے بہت زیادہ دولت کی ضرورت ہوتی ہے۔
☆ امریکی مغنیہ سوفی ٹکر

کراچی سے سید حسن ہاشمی کا تعاون

ہیری کی نظریں بھی اس کی نگاہوں کا تعاقب کرتی ہوئی کاغذ تراش پر جم گئیں۔ وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "مم... میں... آپ کا مطلب نہیں سمجھا کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں یور ایکسی لینسی! میرا مطلب ہے... کہ یہ تو ہمیشہ میرے گاہک کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ نے گیٹیو خریدنا چاہتا ہے یا نہیں' اور آپ کہہ سکتے ہیں کہ قیمت حالات کے مطابق ہی لگائی جاتی ہے۔"

"ہاں' ہاں... میں سمجھ رہا ہوں۔" ڈاکٹر اسکری خوف نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں اس معاملے پر پوری احتیاط سے غور کرنا چاہتا ہوں اور تم سے خود رابطہ قائم کروں گا۔"

"بے شک' بے شک۔" ہیری نے تصنع آمیز اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا ٹریڈ کارڈ نکال کر سفیر کی جانب بڑھا دیا۔ وہ اب تک ایسے ہزاروں کارڈ لندن آنے والے غیر ملکی سیاحوں میں تقسیم کر چکا تھا۔

ہیری سفارت خانے سے رخصت ہوا تو قطعی ناامید نہیں تھا اس لیے کہ حتمی گفتگو کے وقت سفیر خاصا رضامند لگ رہا تھا۔ سفارت خانے سے صحیح سلامت باہر آنے کے بعد ہیری نے خود کو تسلی دی کہ اگر وہ لوگ چاہتے تو اس کا برین واش کر سکتے تھے یا اسے سچ اگلنے والی دوا پلا سکتے تھے یا ربڑ کے ڈنڈوں سے اس کی تواضع کر سکتے تھے لیکن یہ معاملہ

کسی گڑبڑ کے بغیر خوش اسلوبی سے طے ہو گیا تھا۔ اب اُسے صرف انتظار کی کوفت اُٹھانی تھی کہ سفیر کب اس سے رابطہ قائم کرتا ہے اور کب اس کی محنت کا پھل اس کی جیب میں آتا ہے۔

سفیر سے ملاقات کے چند گھنٹوں بعد ہیری اپنی تنگ و تاریک قیام گاہ لوٹا۔ اُس نے لپک کر مسز ولکوکس کے متعفن مکان کی بیرونی سیڑھیاں عبور کیں اور تیزی سے آمد و رفت کے داخلی دروازے سے اندر داخل ہو گیا' اس دروازے میں کبھی تالا نہیں لگتا تھا۔

پھر اچانک اس کے قدم وہیں جم گئے۔ اس کا کمرہ ہال کے عین مقابل تھا اور مکان مالکہ مسز ولکوکس اس کے کمرے کے باہر کھڑی ہوئی دو اجنبیوں سے گہری گفتگو میں مصروف تھی۔ ہیری کے کانوں میں اس کی آواز آئی۔ "مجھے یقین ہے' مسٹر ہیری کسی بھی لمحے پہنچنے والے ہوں گے۔ اگر آپ لوگ انتظار کرنا چاہتے ہیں تو۔۔۔"

ہیری یہ سنتے ہی گھوم گیا۔ اس کا ارادہ فوراً نکل بھاگنے کا تھا لیکن اب دیر ہو گئی تھی کیونکہ مکان مالکہ نے پلٹ کر اُسے دیکھ لیا تھا' اُس نے وہیں سے آواز دی۔ "ہیری! یہ دو صاحبان تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

یہ کہہ کے وہ چپل گھسیٹتی ہوئی اپنے کوارٹر کی طرف روانہ ہو گئی جو مکان کے اندرونی حصے میں تھا۔

"مسٹر ہیری اسمارٹ؟" اجنبیوں میں سے ایک نے پوچھا۔ وہ ایک قوی الجثہ شخص تھا' اُس کا جبڑا آگے نکلا ہوا تھا اور آنکھیں چھوٹی لیکن تیر کی طرح چبھتی ہوئی تھیں۔ اس کا حلیہ ہول ناک حد تک سادہ لباس والے سُراغ رسانوں جیسا تھا۔ وائٹ ہال ٹاپ نُما ہیٹ' بیلٹ والا اوور کوٹ' روز رسائز بوٹس۔ اس کا ساتھی بھی حلیے اور جسامت کے لحاظ سے اس کا جڑواں لگ رہا تھا۔

"جی ہاں۔" ہیری نے اقرار کیا اور اس طرح مسکرانے لگا جیسے پرانی کاروں کے سیلز مین متوقع گاہک دیکھ کر انھیں خوش آمدید کہتے ہیں۔

جواباً اُن دونوں میں سے کوئی نہیں مسکرایا۔ "میں چیف سُراغ رساں انسپکٹر کلمپنگ ہوں اور یہ سُراغ رساں سارجنٹ میلوری ہیں۔ ہمارا تعلق اسکاٹ لینڈ یارڈ اسپیشل برانچ سے ہے۔"

جہاں تک ہیری کو علم تھا' اسپیشل برانچ ملکی سلامتی معاملات نمٹاتی تھی۔ اس تصوّر کے ساتھ ہی ہیری کو حلق سکڑتا محسوس ہونے لگا۔ ہیری نے سلووینین سفارت خانے جانے سے قبل یہ امکان نظرانداز تھا کہ سفارت خانے والے اس کا دورہ بلیک میل سے کرسکتے ہیں اور ممکن ہے کہ وہ اس بلیک میلنگ کی اطلا اسکاٹ لینڈ یارڈ کو دے دیں۔ اس خیال سے اسے منصوبہ تباہ ہوتا نظر آیا تھا لیکن جب اس نے مزید غور احساس ہوا کہ اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں سکتا اس لیے کہ وہ جس پیشے سے وابستہ ہے' اس بنیاد پر اپنے ایک گاہک سے قانونی سودا کرنے گیا تھا۔ اس میں بھلا ملک سے غدّاری کا کون سا پہلو نکلتا ہے۔

اجنبیوں کی نظریں کسی سلائڈ رولر کے مانند سرتاپا اس جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ ہیری اچانک خوش مزا سے بولا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ اسپیشل برانچ والوں کو جیسے شخص سے کیا سروکار ہو سکتا ہے لیکن بہرحال آپ حضرات اندر تشریف لے آیئے' میں قانون کی مدد کر کے لیے ہر طرح تیار ہوں۔"

دونوں افراد اطمینان سے آہستہ آہستہ ہیری کے کمر میں داخل ہو گئے۔ ان کا انداز سنگ دل شکاریوں کی طر تھا جو اپنے شکار کو اذیت پہنچانے میں جان بوجھ کر تاخیر کرتے ہیں تاکہ اس کی بے بسی سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں۔ جس شخص نے اپنا تعارف انسپکٹر کلمپنگ کی حیثیت سے کرایا تھا' اس کا لہجہ دھیما تھا' وہ ہر لفظ دھیرے دھیرے ادا کر رہا تھا۔ "چند گھنٹے قبل تم سلووینین سفارت خانے گئے تھے اور تم نے وہاں سلووینیا کے سفیر سے گفتگو کی تھی؟"

"آ۔۔۔ ہاں۔۔۔ جی ہاں۔" ہیری نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اقرار کیا۔

سارجنٹ میلوری کی نگاہیں بستر کے قریب بنے ہوئے چھوٹے سے الماری نما کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں جہاں

ہیری نے اپنا ڈیولپنگ ٹینک، انلارجر اور فوٹو گرافی کا دیگر ساز و سامان رکھا ہوا تھا۔ "یہ تمہارا ڈارک روم ہے؟" سارجنٹ نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

ہیری نے شانے اچکا دیے۔ "جی ہاں، میں فوٹو گرافر ہوں اس لیے یہ ڈارک روم بنایا ہوا ہے۔"

"تم کس قسم کی چیزوں کی تصویریں اُتارتے ہو مسٹر ہیری؟" انسپکٹر کلمپنگ نے ایسے سوال کیا جیسے اس کے مشغلے کے بارے میں گفتگو کر رہا ہو۔

"کسی ایسی چیز کی تصویریں نہیں اُتارتا جن سے دریائے ٹیمز میں آگ لگ جائے۔ میں تو صرف راہ گیروں کی تصویریں کھینچتا ہوں۔"

"ہوں۔" میلوری نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ہیری کو جان بوجھ کر نظر انداز کر رہا تھا۔ "بہرحال، یہ ایک اچھی ڈھال ہے۔"

سارجنٹ میلوری کی تائید میں انسپکٹر کلمپنگ نے بھی سر ہلا دیا۔ "تو تم نے کبھی کسی قسم کی دستاویزات کی تصویریں نہیں اُتاریں؟"

"دستاویزات؟" ہیری کا ذہن کسی کنگرو کے مانند قلانچیں بھرنے لگا۔ اسے جاگتے میں ڈراؤنے خواب دکھائی دینے لگے۔ "کیا مطلب؟ دستاویزات؟ میں سمجھا نہیں۔۔۔"

"کیا یہ سچ نہیں کہ تمہارا ایک بھائی ایک ایئر کرافٹ کمپنی میں کام کرتا ہے؟" انسپکٹر کلمپنگ نے ترکی بہ ترکی کہا۔

"یہ بات آپ کو کس نے بتائی؟ یقیناً اس باتونی بڑھیا مسز ولکوکس نے بتائی ہوگی، میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں۔"

"یہ بات رہنے دو کہ ہمیں کس نے کیا بتایا ہے۔ تم بس یہ کہو کہ تمہارا بھائی وہاں کام کرتا ہے یا نہیں؟"

"دیکھیے، میری بات سنیے۔" ہیری نے اپنی انگلی لہرائی جس پر لرزہ طاری تھا۔ "میں اپنے بھائی کو اس معاملے میں ملوث کرنا نہیں چاہتا۔"

"کس معاملے میں؟" انسپکٹر کلمپنگ نے تیزی سے پوچھا۔

ہیری کوئی ایسا جواب دینا چاہ رہا تھا جو قابل گرفت نہ ہو لیکن اسے کوئی مناسب جواب سجھائی نہیں دیا۔ وہ ہکلا... ہوئے بولا۔ "آپ لوگوں کے خیال کے مطابق میں جس... معاملے میں۔۔۔ میں۔۔۔ ملوث ہوں۔"

انسپکٹر کلمپنگ قصداً اس انداز سے گویا ہوا جیسے ا... ایک لفظ ڈرائنگ پن کی نوک سے چن رہا ہو۔ "تو تم ا... بھائی سے بلیو پرنٹس حاصل کرنے کے بعد ان کی تصویر... کر سلووی نین سفارت خانے نہیں لے جاتے؟"

ہیری نے دونوں ہاتھ اس طرح لہرانا شروع کر دیے... اس نے ہاتھوں میں پارسل تھام رکھے ہوں اور انہیں... رکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ "خدا مجھے سنگسار کرے، آ... لوگوں کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں، آپ نے غلط سمجھا ہے۔"

"واقعی مسٹر ہیری؟ تو پھر تم جیسے شخص کا سلووی نین... سے کس قسم کا کام پڑ سکتا ہے؟"

ہیری لاجواب ہو کر ان کی صورتیں تکنے لگا۔ وہ دو... ان آرائشی مجسموں کے مانند اسے گھور رہے تھے... چوراہوں یا عمارتوں کے داخلی دروازوں پر ایستادہ... جاتے ہیں۔ اف خدایا، ہیری سوچ میں پڑ گیا۔ کوئی تس... طلب نے گیٹیو فروخت کرنا ایک الگ بات تھی لیکن... رازوں کا سودا کرنا قطعی مختلف معاملہ ہے جس میں ا... ملوث کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اس جرم کی... بیس سال قید بامشقت سے کم نہیں ہو۔ ابھی تک اس... کی سزا پھانسی قرار نہیں دی گئی ہے پھر بھی اوہ خدا، خدا...

ہیری اپنے بستر پر اس انداز سے بیٹھتا چلا گیا جیسے ٹائر کی... نکلتی ہے۔ اس نے اپنی انگلی سے باریک مونچھوں کا... بنایا اور قدرے شکستہ لہجے میں بولا۔ "بہت اچھا، آپ... ہی چاہتے ہیں تو میں بتاتا ہوں۔ میں وہاں پول ٹیگی سے ملاقات کی کوشش کے لیے گیا تھا۔"

"کیا واقعی؟ اتھلیٹ پول ٹیگی سے؟"

"جی ہاں، یہ بالکل سچ ہے۔ میں نے راہ چلتے اس کی ا... تصویر اتاری تھی۔ میں نے سوچا کہ ممکن ہے، وہ اس تصو... کے چند ایک پرنٹس کا آرڈر دے دے اور۔۔۔ اور۔۔۔ ممکن ہے کہ وہ اس کا نے گیٹیو بھی خریدنا چاہے تاکہ اپنے...

تمہاری اس سے ملاقات نہیں ہوئی؟"
ہیں۔ آخر آپ لوگ بھی تو اُسے ہر جگہ تلاش کرتے
ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟ میں سفارت خانے
اس لیے گیا تھا کہ اخبارات یہ کہہ رہے ہیں' وہ وہیں
ہے۔" ہیری کے ذہن میں خیالات تیزی سے گردش
کر رہے تھے' اس کا سر چکرانے لگا۔ "میرے سفارت خانے
جانے کا بس یہی مقصد تھا' میں بالکل سچ بتا رہا ہوں۔"

دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے سے ایک ساتھ ٹکرائیں جیسے پہلے سے وقت طے کر لیا گیا ہو۔ ان میں سے ایک وحشت چہرے کے ایک گوشے کو تضحیک آمیز انداز میں بل دیتے ہوئے بولا۔ "اوہ مسٹر ہیری! کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ ہم تمہاری من گھڑت داستان ہضم کر لیں گے؟"

کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی پھر ہیری کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ موسلا دھار رونا شروع کر دے گا۔ "یہ قطعی سچ ہے۔ میں نے جو کچھ کہا ہے' یہی حقیقت ہے۔ میں نے پول کی تصویر اتاری تھی۔ اگر میں جھوٹ بول رہا ہوں تو کھڑے کھڑے گر کر مر جاؤں۔" ہیری روہانسا ہو گیا۔

"کیا ہم وہ تصویر دیکھ سکتے ہیں؟" گلمپنگ نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

"ہاں! بے شک! یہ ہے وہ۔" اس نے پول ٹیگی کی تصویر نکال کے ان کی جانب بڑھا دی۔

دونوں تصویر کا غور سے جائزہ لینے لگے پھر میلوری بولا۔ "یہ تصویر تو کسی کی بھی کھینچی ہوئی ہو سکتی ہے۔ ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ یہ تصویر تمھی نے اتاری ہے؟"

"اوہ!" ہیری نے بے بسی سے سر پکڑ لیا۔ "آپ لوگ ثبوت چاہتے ہیں۔ ہے نا؟ اچھا ایک لمحے انتظار کیجیے۔"

ہیری اپنے چھوٹے سے ڈارک روم میں گھس گیا۔ چند سیکنڈ بعد وہ ایک فلم لہراتا ہوا باہر آ گیا۔ "آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ پول ٹیگی کی یہ تصویر میں نے ہی اتاری ہے؟ دیکھیے' یہ ہے وہ نگیٹو جس نے یہ آگ لگائی ہے۔ اب تو میری بات پر یقین کر لیجیے۔"

گلمپنگ نے نگیٹو لے کر روشنی کی جانب کیا اور



اس کا جائزہ لینے کے بعد اپنے ساتھی کی طرف گھوم گیا۔ "ہاں' اس کی مدد سے ہمارے اس دوست کی پوزیشن صاف ہو سکتی ہے۔ کیا خیال ہے سارجنٹ؟"

میلوری نے کندھے اُچکائے جیسے اسے یہ سن کر مایوسی ہوئی ہو۔ "بظاہر تو یہی دکھائی دے رہا ہے سر! لیکن فیصلے کا انحصار چیف پر ہے۔ دیکھیں' وہ ہماری رپورٹ پر کیا سوچتے ہیں۔"

گلمپنگ' ہیری کی جانب گھوم گیا اور غیر یقینی نظروں سے اُسے گھورتے ہوئے بولا۔ "سارجنٹ نے سچ کہا۔ فیصلے کا انحصار ہمارے چیف پر ہے۔ یہ انھیں طے کرنا ہے کہ تم غدار ہو یا ایک گم راہ احمق۔ اگر تم واقعی خوش قسمت ہو تو ہم شاید تمھیں دوبارہ زحمت نہیں دیں گے۔"

وہ دروازے کی جانب چل دیا۔ اس کا ساتھی پہلے ہی باہر نکل چکا تھا۔

گلمپنگ دروازے پر پہنچ کر ایک لمحے کے لیے رکا۔ "ایک گُر کی بات گرہ میں باندھ لو بیٹا! اس طرح سفارت خانوں کے معاملات میں کبھی ملوث ہونے کی کوشش نہ کرنا۔ ہمیں ہر صورت میں پتا چل جاتا ہے۔" وہ چلا گیا۔

کمرے میں بس ایک پرانے الارم کلاک کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی۔ ہیری کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی کھوپڑی جم کر برف کا ڈلا بن گئی ہو پھر اس کے کانوں میں ہوتی دروازہ بند ہونے کی گونج سنائی دی۔ آواز اتنی زوردار

تھی کہ ہیری جو سکتے کی سی کیفیت میں بے حس و حرکت کھڑا تھا، اچھل پڑا جیسے اُسے سوتے میں جھنجوڑ کر بیدار کر دیا گیا ہو۔ وہ کمرے سے نکل کر باہر دوڑا۔ اس نے ایک جھٹکے سے بیرونی دروازہ کھولا اور سیڑھیوں سے گرتے گرتے بچا۔ "ہے۔" اس نے بلند آواز سے پکارا۔ "بیٹے! میری قلم تو دیتے جائیے۔ وہ آپ کے پاس ہے۔"

لیکن سیاہ چمک دار کار تیزی سے دور ہوتی چلی گئی۔ ہیری فٹ پاتھ کے کنارے کھڑا جنوبی مشرقی لندن کی بھول بھلیوں میں غائب ہوتی کار دیکھتا رہ گیا۔ کار میں بیٹھے ہوئے دونوں افراد نے ہیری کی چیخ پکار پر پلٹ کر دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ "غلیظ، لعنتی روزردو!" ہیری دانت پیستے ہوئے بڑبڑایا۔ "ذلیل، کمینے سُراغ رساں۔"

ہیری کا خیال تھا کہ وہ پول نیگی کی تصویر کے نے گیٹیو کا سودا کرتے وقت سلووی نین سفارت خانے والوں سے پانچ سو پاؤنڈ کا مطالبہ کرے گا اور معاملہ سو پاؤنڈ تک بھی آگیا تو سودا طے کرنے سے دریغ نہیں کرے گا۔ کچھ نہ ہاتھ آنے سے تو یہی رقم بہتر تھی لیکن اب، ان لوگوں کی مہربانی سے اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں رہا تھا۔ اس نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں اور خالی سڑک کی جانب رُخ کر کے ہوا میں گھونسا لہرانے لگا۔

☆

کچھ دیر بعد سلووی نین سفارت خانے میں ڈاکٹر اسکریچ خوف نے میز پر رکھی ہوئی اونکس کی بڑی سی ایش ٹرے سے نظریں ہٹاتے ہوئے اطمینان سے اپنی بے داغ کھوپڑی پر ہاتھ پھیرا۔ ایش ٹرے کی تہ میں سیاہ سگار کے بچے کھچے ٹکڑے کے ساتھ راکھ کا ایک چھوٹا سا ڈھیر بھی دکھائی دے رہا تھا، یہ ڈھیر کچھ دیر پہلے تک ہیری کا کھینچا ہوا بہترین شارپ نگیٹیو تھا۔ "خوب، بہت خوب۔ تم لوگوں نے بے حد عمدہ کام دکھایا ہے۔" سفیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس کے پہلو میں کھڑے ہوئے دونوں دراز قامت آدمی بھی مسکرا دیے، وہ شکل اور حلیے سے بالکل انگریز لگ رہے تھے اور اکثر ایسے ہی موقعوں پر کارآمد ثابت ہوتے تھے۔ ان کے چہروں سے وہ درشتی غائب ہو چکی تھی جو ہیری کے رویہ روا اسپیشل برانچ والوں کا کردار ادا کرتے وقت [illegible] تھی۔ البتہ وقت پڑنے پر وہ دوبارہ یہی کیفیت خود پر طاری کر سکتے تھے۔

"اور اب۔" ڈاکٹر اسکریچ خوف داڑھی کھجاتے ہوئے بولا۔ "ان عیاش، جھوٹے مغربی خنزیروں کے پاس ایسا کوئی ثبوت باقی نہیں رہا جس سے وہ یہ ثابت کر سکیں کہ ہمارا عظیم کامریڈ پول نیگی ان کے متعفن سرمایہ دارانہ اسٹور کے آس پاس بھی موجود تھا۔" اس کی آنکھوں میں فتح مندی کی چمک ابھر آئی۔ "اب ہم اپنے کامریڈ پول نیگی کو ان کی کسی بھی ضمیر فروش عدالت میں مقدمے کا سامنا کرنے کی اجازت دے سکتے ہیں تاکہ ساری دنیا میں ان کے قانون کی تضحیک ہو سکے۔"

☑ چند گھنٹوں بعد برطانوی دفتر خارجہ میں موجود سر لینگٹن ریڈ پول نے اپنے پرائیویٹ سیکریٹری کو اپنے کمرے میں طلب کیا۔ "کیا وہ لڑکا پولانس، یا جو کچھ بھی اس کا نام ہے، ابھی تک تمہارے پاس ہے؟"

"پول نیگی! سر! جی ہاں، سر!"

"کیا وہ بدستور سیاسی پناہ کا مطالبہ کر رہا ہے؟"

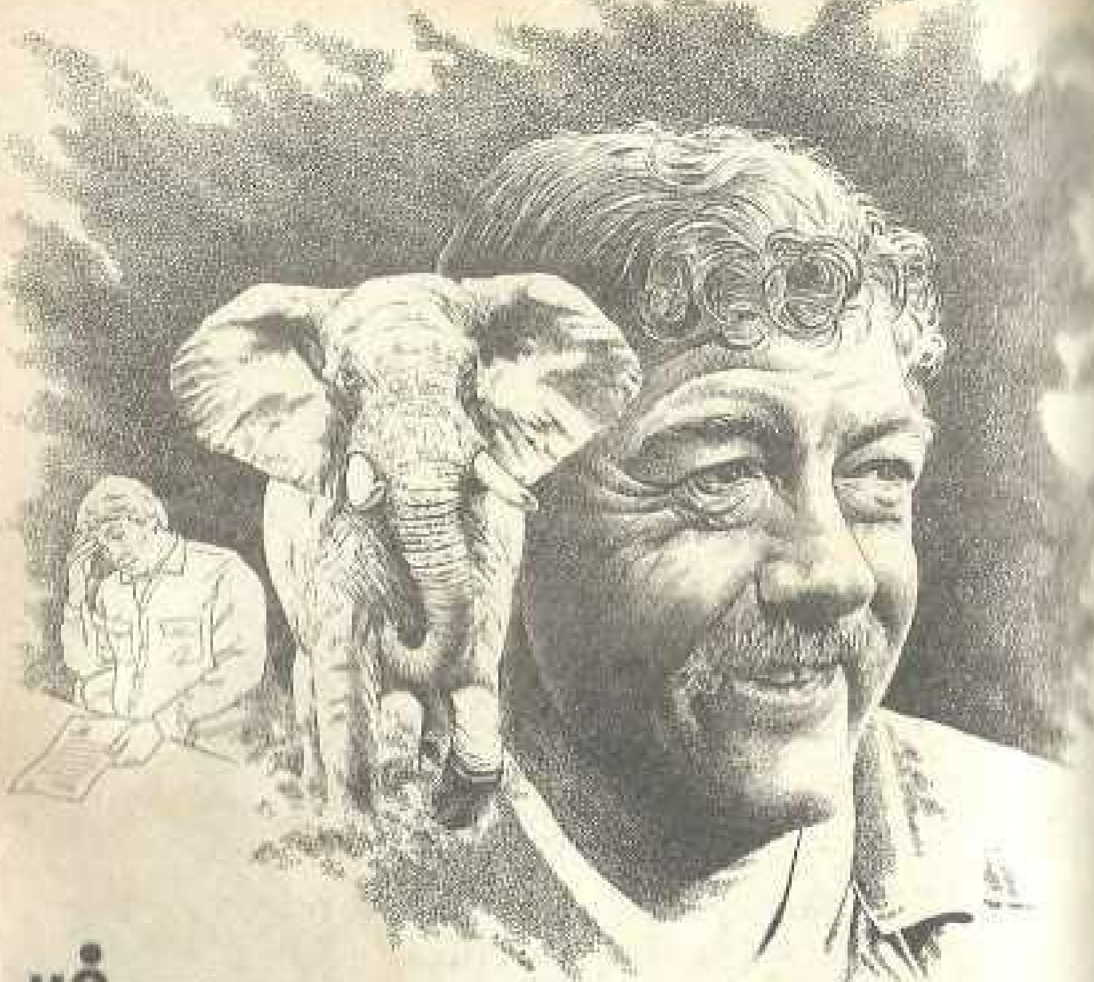
"جی سر! اس کا کہنا ہے کہ اس کے ہم وطنوں نے اُسے شدید ایذا پہنچائی ہے۔"

"کس نوعیت کی ایذا؟"

"جہاں تک میں اس کی بات سمجھ پایا ہوں جناب! ان لوگوں نے نہ صرف اس کی دل پسند نائی تلف کر دی بلکہ اُسے یہ منظر دیکھنے پر بھی مجبور کیا۔"

"خنزیر۔" سر لینگٹن نے دانت پیسے۔ "یہ اشتراکی ہمیشہ سے بے حس اور جذبات سے عاری ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم نے اس بے چارے لڑکے کو گرما گرم چائے ضرور پیش کی ہوگی۔"





سفر ہاتھو

برطانیہ کے ایک فوجی سیاسی مبصر اور لکھاری کی
ایڈونچر سے [illegible]
اس واقعے کے [illegible]
ایک مجرم کا قصہ اپنے ہم پیشگان کی طرح وہ ایک [illegible]
ترجمہ: [illegible]

شمالی تھائی لینڈ کے علاقے چیانگ مائی کا موسم خاصا گرم تھا گرم و مرطوب۔ سیام میں دو ہی موسم ہوتے تھے گرم و خشک اور گرم و مرطوب۔ میجر ٹونی رچرڈسن ملٹری کراس اب گرمی کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کی بیش تر زندگی قدیم انڈین آرمی میں گزری تھی۔ اس کی رجمنٹ نارتھ ویسٹ فرنٹیئر رائفلز تھی جس کا ڈپو پشاور میں تھا۔

جاپانیوں کے تسلط سے برما آزاد کرانے کے چند ماہ بعد ایشیا اور افریقا کے بیشتر حصوں میں بھی انگلش عظیم ختم ہو چکی تھی اس لیے نارتھ ویسٹ فرنٹیئر رائفلز کے عمر رسیدہ افسروں میں سے چند ایک جنھیں معیاری طور پر رکھا گیا تھا، منڈالے میں فوجی خدمت سے سبک دوش کر دیے گئے تھے۔ میجر ٹونی رچرڈسن بھی انھی میں سے ایک تھا۔ اس نے اپنی پنشن وصول کی اور سیام کے جنوبی علاقے میں منتقل ہو گیا۔ یہاں اس نے ٹیک لکڑی کی برآمد کے کاروبار میں

شمولیت اختیار کرلی۔

اور اب تریپن سال کی عمر میں وہ ایک سفید فام شکاری کی حیثیت سے خاصا مقبول ہو چکا تھا۔ یہ پیشہ نہ صرف اُس کی پسند کے مطابق تھا بلکہ قابلِ تحسین سمجھا جاتا تھا۔ دراز قامت، دُبلا پتلا، سنولائی رنگت والا میجر ٹونی ایک وجیہ آدمی تھا۔ اُس کی ناک خم دار اور آنکھیں سیاہ تھیں جو اس کے سنہرے بالوں اور مونچھوں کی رنگت سے حیرت انگیز طور پر متضاد تھیں۔

اپنے دور میں میجر ٹونی کا شمار ہاکی کے باصلاحیت کھلاڑیوں میں ہوتا تھا۔ ہاکی، قدیم انڈین آرمی کا مقبول کھیل تھا اور میجر ٹونی اپنی رجمنٹ کی جانب سے ہاکی کھیلتا تھا۔ بیش تر فوجیوں کے برعکس وہ نہ شراب پیتا تھا، نہ شکار کرتا تھا۔ وہ نہتے اور بے کس جنگلی جانوروں کے خلاف آتشی اسلحہ کے استعمال کا شدید مخالف تھا۔ ایک شکاری ہونے کے باوجود اس نے کبھی کوئی معصوم جانور ہلاک نہیں کیا تھا البتہ وہ جنگلی جانور جال سے زندہ پکڑ کر غیر ملکی چڑیا گھروں کے ہاتھ فروخت کرتا تھا یا اُن امریکیوں کے لیے رہنما کا کام کرتا تھا جو جنگلی جانوروں کی فلم بنانے وہاں آتے تھے۔ یہ امریکی جدید ساخت کے مووی کیمروں اور ہائی پاور ٹیلی اسکوپک لینزز سے لیس ہوتے تھے۔

شمالی سیام کے ایک ممتاز سفید فام شکاری کی حیثیت سے میجر ٹونی نے حال ہی میں اپنی تحویل میں آیا ہوا ایک سفید ہاتھی فروخت کرنے کے لیے پوتا شنک اینڈ کمپنی سے رابطہ کیا تھا جس کا شمار جانوروں کے معروف امریکی تاجروں میں ہوتا تھا۔ کمپنی کے دفاتر فلاڈیلفیا اور پین سلوانیا میں تھے۔

☆...☆...☆

کمپنی کا مالک جون پوتا شنک فلاڈیلفیا کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ وہ معمول سے زیادہ پُرجوش معلوم ہو رہا تھا۔ اسے جانوروں کا کاروبار اپنے آں جہانی چچا آئزک پوتا شنک سے ورثے میں ملا تھا۔ آئزک پوتا شنک نے کاروبار کو وسعت دینے کے لیے سخت محنت کی تھی، وہ ایک دور اندیش آدمی تھا، اُس کی محنت رنگ لائی تھی اور اس کا شمار جنگلی جانوروں کے بڑے امریکی درآمد کنندگان میں ہو... وہ درآمد کیے ہوئے ہر قسم کے جانور چڑیا گھروں اور ... والوں کے ہاتھ فروخت کردیتا۔ حال ہی میں کئی ... اور حیاتیاتی تجربہ گاہوں کے لیے بھی جانور درآمد ... کرنے شروع کردیے تھے۔ خاص طور پر چھوٹی دم وا... بھورے ہندوستانی بندر کی بے حد مانگ تھی جس ... تیار کیا جاتا تھا۔

جون پوتا شنک جسمی طور پر میجر ٹونی کی ضد تھا۔ اس ... عمر صرف پچاس برس تھی لیکن اس کا جسم فربہ تھا ... کھوپڑی بالوں سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ وہ بے تحاشا ... نوشی کرتا تھا، شاید اسی لیے اس میں خوش امیدی کا ... کچھ زیادہ پایا جاتا تھا جب کہ کاروباری حالات درست ... تھے۔ ۱۹۴۷ء میں جانوروں کی تجارت کا کام واقعی بہت ... جا رہا تھا۔ جنگِ عظیم ختم ہو چکی تھی لیکن اس کے اثرات باقی تھے، کاروبار کی بحالی نہایت سست تھی۔

جنگ کی وجہ سے امریکا میں جانوروں کی درآمد کا سلسلہ منقطع رہا تھا مگر اب وہ پھر زور پکڑ گیا تھا۔ ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکا سے جنگلی جانوروں کی ایک بڑی تعداد امریکی مارکیٹ میں آنا شروع ہو گئی تھی۔ پوتا شنک اینڈ کمپنی میں بھی جنگلی جانور ضرورت سے زیادہ جمع ہو چکے تھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو جون پوتا شنک چیانگ مائی کے سفید فام شکاری میجر ٹونی کی پیش کش مسترد کردیتا۔ سال گزشتہ میجر ٹونی کے ساتھ اُس کے کاروباری معاملات بہت بے ربط رہے تھے۔ اُس نے چند ہرن اور اژدہوں کی ایک جوڑی کے سوا کوئی سودا نہیں کیا تھا لیکن اس مرتبہ میجر نے اسے واقعی ایک خاص جنگلی جانور بیچنے کی پیش کش کی تھی، اور وہ خاص جانور سفید ہاتھی تھا۔ میجر ٹونی کا خط ایک عام سے لائن دار کاغذ پر تحریر تھا جو کسی سستی اسکول کاپی سے پھاڑا گیا تھا۔ خط کی خاص خاص باتیں یہ تھیں۔

"جیسا کہ آپ جانتے ہیں، سفید ہاتھی ایک کم یاب جانور ہے، حتیٰ کہ تھائی لینڈ میں بھی بہت کم پایا جاتا ہے۔ یہ درندہ جو میری تحویل میں ہے، ایک نر ہے اور مکمل جوان ہو چکا ہے۔ یہ بے عیب ہے اور اس کے دانت بہت دل کش اور

میں نے اسے پہلی ملنے والی کشتی سے بینکاک
انتظام کر لیا ہے تاکہ وہاں سے فوراً بحری جہاز کے
ذریعے امریکا بھیجا جا سکے۔ اگر آپ اس کی خریداری کا
ہیں تو میرے اندازے کے مطابق یہ بیش قیمت
راستے سے تین ماہ میں فلاڈیلفیا پہنچ جائے
خاص طور پر یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ
سفید ہاتھیوں کی ملکیت کا حق صرف شاہی
حاصل ہے لہٰذا یہ بات قطعی خارج از امکان ہے
جانور کا برآمدی اجازت نامہ سفید ہاتھی کے طور
سکیں۔ چناں چہ میں یہی تجویز پیش کر سکتا ہوں
طور پر اس نادر ہاتھی کا بھیس بدل دیا جائے اور
عام بھورے ہاتھی کے روپ میں پیش کیا جائے۔
اور مجھے بینکاک کے کسٹم گودام میں تعائی
اچھی خاصی رقم کا نذرانہ پیش کرنا پڑے گا تاکہ
بھورے ہاتھی کا بہ غور جائزہ لینے سے گریز کریں۔
خاص طور پر میں یہ بھی واضح کرتا چلوں کہ اگر آپ یہ
جانور خرید لیں تو اپنے فیل بانوں کو یہ بات ضرور
کہ وہ اس نادر ہاتھی کا بھورا رنگ اتارتے وقت
احتیاط سے کام لیں اس لیے کہ سفید ہاتھی اپنی جلد
معاملے میں خاصا حساس ہوتا ہے۔ سفید جلد بے حد
اور ملائم ہوتی ہے۔ فیل بانوں کو رنگ اتارتے وقت
سادہ گرم پانی استعمال کرنا ہو گا اور وہ کسی طرح
بالوں کا بنا ہوا رگڑنے والا برش استعمال میں نہیں لائیں
گے۔"

جون پوٹا شنک نے یہ بے مثل پیش کش قبول کرتے ہوئے میجر ٹونی کو رضامندی کا تار دے دیا۔

ہاتھی فلاڈیلفیا پہنچنے میں میجر کے وعدے سے کہیں زیادہ وقت لگ گیا۔ اس تاخیر پر میجر نے تحریری معذرت طلب کی۔ تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ اس نے جس بحری جہاز میں ہاتھی بک کرایا تھا' اس کی بینکاک سے روانگی کی تاریخ نجومی کی نظر میں منحوس تھی۔ جوتشی نے زائچہ نکال کر بتایا تھا کہ ایک طویل سفر پر روانگی کے لحاظ سے یہ خطرناک تاریخ ہے۔ ہاتھی دوسرے جہاز سے روانہ کرنے کے لیے مزید ایک ماہ انتظار کرنا پڑا' اس سے پہلے کوئی بحری جہاز امریکا نہیں جا رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سفید ہاتھی کی حتمی قیمت بہت زیادہ ہو گئی۔ سفید ہاتھی پکڑنے کی لاگت' اسے دریا کے راستے چیانگ مائی سے بینکاک پہنچانے کے اخراجات' ایک ماہ تاخیر کی بنا پر شہر میں اس کی دیکھ بھال کا خرچ' کسٹم والوں کی بھاری رشوت' بینکاک سے فلاڈیلفیا کے بحری سفر کے اخراجات' آخر میں میجر ٹونی اور پوٹا شنک کمپنی کے متوقع منافعے۔ یہ تمام باتیں مدِ نظر رکھتے ہوئے جون پوٹا شنک نے سفید ہاتھی کی جو قیمت لگائی' وہ امریکا میں شاید ہی کوئی دینے پر رضامند ہو سکتا تھا۔ جون پوٹا شنک نے تمام چھوٹے بڑے سرکسوں اور شمالی و جنوبی امریکا کے بیش تر چڑیا گھروں کو سفید ہاتھی فروخت کرنے کی کوشش کی لیکن قیمت زیادہ ہونے کے باعث کسی نے خریداری میں دل چسپی ظاہر نہیں کی۔ یہاں تک کہ جون جیسا پُرامید شخص بھی مایوس ہو گیا۔

ہاتھی فلاڈیلفیا کی بندرگاہ کے قریب کمپنی کے اصطبل میں رکھا گیا تھا' اس کے کھانے پینے کے اخراجات اس کی قیمت سے زیادہ ہو رہے تھے۔ جون پوٹا شنک کے لیے یہ سفید ہاتھی حقیقت میں سفید ہاتھی ثابت ہوا۔

ایک روز جون اپنے دفتر میں میز پر ٹانگیں پھیلائے "دی فلاڈیلفیا انکوائرر" نامی اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کے منہ میں ایک سستا سا سگار دبا تھا لیکن اسے جون نے سلگایا نہیں تھا۔ دفتر کی کھڑکی اور دروازے پر خس کی ٹٹیاں لگی تھیں۔ یہ دفتر براڈ اسٹریٹ کی ایک پرانی عمارت کی دوسری منزل پر تھا۔ نچلی منزل پر تجہیز و تکفین کا ایک ادارہ تھا اور عمارت کے دونوں جانب استعمال شدہ گاڑیوں کے گیرج تھے۔ اخبار کے اندرونی صفحات پر ایک چھوٹی سی خبر پڑھ کے جون چونک گیا۔ "ہز میجسٹی دی کنگ آف ڈنمارک نے یورپ میں اتحادی فورسز کے مشہور و معروف برطانوی کمانڈر فیلڈ مارشل وسکاؤنٹ منٹگمری آف الامین کو آرڈر آف دی وائٹ ایلیفینٹ کے خطاب سے نوازا ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈنمارک میں سفید ہاتھی کی نسبت سے اعلا ترین اعزاز دیا جاتا ہے' جون پوٹا شنک نے

سوچا' اس سے تو بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کوپن ہیگن کا چڑیا گھر یہ بے مثل سفید ہاتھی ایک مشہور قومی کشش کے طور پر حاصل کرنے کے لیے خاص دل چسپی کا مظاہرہ کرے گا۔ اُس نے فوراً اپنی ملازمہ کو آواز دی' یہ اس کا اکلوتا عملہ تھا کیوں کہ وہ ایک سے زیادہ فرد رکھنے کے مصارف برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ملازمہ ٹیلی فون آپریٹر' سیکریٹری' استقبالیہ کلرک' ٹائپسٹ اور اکاؤنٹنٹ ہونے کے ساتھ ساتھ قطعی غیر دل کش بھی تھی۔ "مس بلاسٹین! ایک خط لکھو۔" وہ خط کا املا دینے لگا۔

"ناظم' زولوجیکل گارڈنز'

کوپن ہیگن۔

مجھے آپ کو ایک بے مثل البینو ہاتھی کی پیش کش کرتے ہوئے بے حد مسرت ہو رہی ہے۔ یہ ہاتھی حال ہی میں چیانگ مائی کے مشہور و معروف سفید فام شکاری میجر ٹونی رچرڈسن ملٹری کراس نے شمالی تھائی لینڈ سے پکڑا ہے۔ یہ جانور سیام سے باہر لانے میں بے انتہا مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ وہاں تمام سفید ہاتھی شاہی ملکیت مانے جاتے ہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ یہ نادر جانور اب فلاڈیلفیا میں ہے اور بہترین حالت میں ہے۔ میں یہ بے مثل ہاتھی صرف آپ کے لیے خاص رعایتی قیمت دس ہزار ڈالر میں' بحری جہاز کے ذریعے روانہ کرنے کو تیار ہوں۔ اس قیمت میں' بحری سفر کے اخراجات شامل ہیں۔"

جون نے خط فوراً ڈنمارک پوسٹ کرا دیا۔

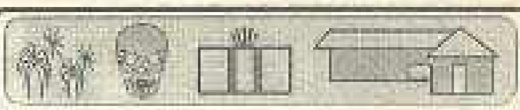
ڈنمارک کے لوگ بے حد چالاک تاجر ہوتے ہیں۔ سفید ہاتھی کی مناسبت سے ان کے ملک میں ایک اعلا سرکاری اعزاز مخصوص تھا' اس کے پیش نظر ایک سفید ہاتھی پر دس ہزار ڈالر کی رقم خرچ کرنا کوئی کھانے کا سودا نہیں تھا لیکن کوپن ہیگن چڑیا گھر کے ناظم نے جوابی ٹیلی گرام میں سفید ہاتھی کی خریداری میں دل چسپی تو ظاہر کی مگر ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ قیمت بہت زیادہ ہے' اس کے علاوہ ڈنمارک میں سفید ہاتھیوں کی درآمد پر کسٹم ڈیوٹی بھی مانع

جون پوٹاشنک نے کسٹم کا مسئلہ حل کرنے کے جواباً یہ تجویز پیش کی کہ وہ ہاتھی روانہ کرنے سے قبل بھورا رنگ کروا دے گا لیکن قیمت ہرگز کم نہیں کر بعد میں ٹیلی گرام کے ذریعے مختصر سی تکرار کے سا سات ہزار ڈالر میں سفید ہاتھی فروخت کرنے پر رضا گیا۔

چڑیا گھر والوں نے اسے ہدایات دیں کہ ہاتھی ہوا سے کوپن ہیگن روانہ کر دیا جائے تاکہ بروقت پہنچ جا کوپن ہیگن کے مشہور چڑیا گھر کے قیام کی صد تقریبات کا آغاز ہونے والا تھا' اس موقع پر چڑیا گھ سفید ہاتھی کا تعارف ایک دل چسپ اور دل خوش واقعہ ہوتا۔

میجر ٹونی کے سفید ہاتھی کو فلاڈیلفیا میں مزید بھورا گیا۔ پھر اسے سرکس والوں کے لیے ہاتھیوں کی منتقلی خاص ادارے کے ذریعے نیویارک' نیو جرسی میں ایس فریٹ ڈپو پہنچا دیا گیا۔ ایس او بی ایئر لائن کو جانوروں نقل و حمل میں خصوصیت حاصل تھی۔ نیویارک ائیر پر اس ایئر لائن کا جانوروں کے لیے مخصوص ایک بھی تھا جو جانوروں کے لیے عشرت گاہ کے مانند تھا۔ یہ لائن ہر قسم کے جانوروں کی دیکھ بھال کے لیے خاص تربیت یافتہ ایئر ہوسٹس بھی مہیا کرتی تھی' چاہے جانو کی کھیپ کیڑوں مکوڑوں' پرندوں' درندوں یا آبی جانو اور مچھلیوں پر مشتمل ہو' البتہ ہاتھیوں کی نقل و حمل قدرے دشواری پیش آتی تھی۔ ایک تو نہ صرف ان کا بہت زیادہ ہوتا تھا بلکہ ان کا مزاج سمجھنا بھی مشکل تھا۔ ہاتھی قدرے نروس ٹائپ کا جانور ہوتا ہے۔ چوپایوں کی طرح وہ بھی اندھیری جگہ داخل ہونے سے ہے۔ لہٰذا جہاز کے اندرونی حصے میں نہ صرف ہلکا اسپرے کیا جاتا ہے بلکہ تیز روشنی کا بھی انتظام کرنا پڑتا ہے۔ کہیں ہاتھی کو نہایت طاقت ور لفٹ ٹرک سے جہاز داخل ہونے کی ترغیب ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ ہاتھی صرف پرانے فیشن کے پنکھوں والے ہوائی جہاز میں سفر کرنا پسند کرتا ہے۔ اگر اسے جد



خانہ آبادی / بربادی

۱- میں نے شادی کے متعلق بارہا غور کیا، لیکن پھر دوبارہ غور کیا۔
○ برطانوی ڈراما نگار، گوئنل کوارڈ

۲- کہا جاتا ہے کہ تعلق کے لیے کچھ دو، کچھ لو ضروری ہے۔ لیکن شادی کچھ دو، کچھ دو، کچھ دو اور کچھ دو کا نام ہے، یہاں تک کہ آپ قبر کی زینت بن جائیں اور پھر بھی یہ کہا جائے کہ اسے جتلا دینا چاہیے، اتنا اس نے نہیں دیا۔
○ برطانوی مصنف، کوئنٹن کرسپ

۳- میں شادی سے اخراجات کے سوا کوئی اور امید نہیں رکھتا۔
○ اداکارہ جوڈی گارلینڈ کے شوہر کا تجربہ

۴- شوہر آگ کی طرح ہوتا ہے، اگر توجہ نہ دی جائے تو کاہل سے پھر ہو جاتا ہے۔
○ ہنگری کی اداکارہ، زازا گابور

۵- میں وفادار نہیں ہوں لیکن جملق ضرور ہوں۔
○ جرمن ناول نگار، جی گراس

۶- کوئی شخص فر کا کوٹ اپنی بیوی کو گرمی سے بچانے کے لیے نہیں، اسے خوش رکھنے کے لیے خرید کر دیتا ہے۔
○ برطانوی اداکار، سرسی مورچکس

۷- شادی، نفرت پر عادت کی فتح کا نام ہے۔
○ امریکی پبلسٹ آسکر لی والنٹ

۸- شادی چار حصوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ رومان پھر شادی، پھر بچے، چوتھا اور آخری مرحلہ طلاق، اس کے بغیر آپ عورت کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔
○ امریکی مصنف، نارمن میلر

۹- ایک خوش گوار شادی، ایک طویل گفتگو کی طرح ہے، جو ہمیشہ مختصر محسوس ہوتی ہے۔
○ فرانسیسی ادیب، اینڈرے ماریو

طیارے میں لے جایا جائے تو انجن کے شور سے وہ ہڑبڑا جاتا ہے اور افراتفری پھیلا دیتا ہے۔ پنکھے والے جہاز کے پروں کی آواز اسے بھلی لگتی ہے لیکن اگر پنکھے والے جہاز میں نمایاں انجن لگا ہو اور ہاتھی کو اس کا احساس ہو جائے تو بھی وہ ہلچل پیدا کر سکتا ہے۔ ہاں، اگر دو ہاتھی ہم سفر ہوں تو ایک دوسرے کی صحبت میں ان کا اعصابی تناؤ کم ہو جاتا ہے اور انھیں دورانِ سفر گھبراہٹ بھی نہیں ہوتی۔ ایسے ہوائی جہازوں کی تعداد بہت کم تھی جو ایک سے زیادہ ہاتھیوں کی باربرداری کر سکیں۔

ہاتھی کے ساتھ اس کے نگراں یا فیل بان کو اس کے ساتھ پنجرے میں رکھنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہوتا اس لیے کہ دورانِ پرواز اگر ہاتھی پھسل جائے تو فیل بان کے کچلے جانے کا خطرہ رہتا ہے۔ ایس اوبی ایئرلائن کے مویشیوں کے ماہرین نے ہاتھی کو دورانِ سفر انجیکشن لگانے کا مشورہ بھی رد کر دیا کیوں کہ یہ تجربہ بھی ناکام ثابت ہو چکا ہے۔ وہ ہاتھی کے ہم راہ دیگر بے حس اور قابلِ مصرف جانور ہم سفر بنانے کی تجویز پیش کرتے ہیں جیسے سور، گدھے اور بھیڑیں، لیکن دوران سفر ان جانوروں کی موجودی ہاتھی کو مزید مضطرب کر دیتی تھی۔

آخر کسی نے یہ مشورہ دیا کہ ہاتھی کے ہم راہ پالتو مرغی بھیجنے کا تجربہ کیا جائے۔ یہ ایک انوکھی تجویز تھی اور حیرت انگیز طور پر کامیاب ثابت ہوئی۔ مرغی ہاتھی کے سر پر بٹھائی گئی تو وہ بار بار اپنے پنجوں سے اس کا سر کھجاتی رہی۔ اس طرح یہ دیو قامت جانور بہت خوش رہا جیسے کسی کی ٹھوڑی گدگدائی جاتی ہے اور وہ کلکاریاں مارتا ہے۔ مرغی کو دورانِ سفر ہاتھی کے سر پر مستقل بیٹھنے کی ترغیب دلانے کی خاطر ہاتھی پر اڑھائے گئے کمبل میں سر کے عقب کی جانب ایک سوراخ بنایا گیا اور جہاز کی روانگی سے قبل اس میں دانہ بکھیر دیا گیا۔ پھر مرغی اس مقام پر بٹھا دی گئی اور وہ دورانِ سفر ہاتھی کو محظوظ کرتی رہی۔ اس طرح پوما شک کا سفید ہاتھی جسے ایک بار پھر مزید بھورا کر دیا گیا تھا، حفاظت سے کوپن ہیگن پہنچ گیا۔ اسے ایک بڑے ٹرانسپورٹر کے ذریعے فوراً ہوائی اڈے سے چڑیا گھر لے جایا گیا۔

ہاتھی کا مزاج اعتدال پر آ گیا اور وہ ماحول سے مانوس ہو گیا تو اس کا بھورا رنگ اتارنے کی خاطر اسے اچھی طرح نہلایا گیا۔ اس کا بھورا رنگ آسانی سے اتر گیا۔ لیکن ڈنمارک کے باشندے کچھ زیادہ ہی صفائی پسند واقع ہوئے ہیں، ہر کام پوری توجہ اور احتیاط سے سرانجام دیتے ہیں۔

[illegible] معاملے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے [illegible] ان نے اصطبل کے ملازمین کو [illegible] دی کہ وہ ہاتھی کو نہلانے کے بعد اس [illegible] رگڑ رگڑ کر صاف کریں تاکہ کسی قسم کا [illegible] اور وہ چمکنے لگے۔

[illegible] ہاتھی کے سر کا اوپری حصّہ سب سے پہلے [illegible] صفائی کے لیے ہائڈروجن پر آکسائیڈ اور [illegible] کوپن [illegible] کنگھی استعمال کر رہے تھے۔ اس [illegible] ہاتھی پر سے سفید وارنش اُترتے دیکھا۔ [illegible] رگڑ کر صاف کی گئی تو اندر سے جو ہاتھی [illegible] عام سا بھورا ہاتھی تھا جو چڑیا گھروں اور جنگلوں [illegible] جاتا ہے۔ یہ کوپن ہیگن کے چڑیا گھر کے ساتھ [illegible] ہوا تھا۔

[illegible] ناظم کا غیظ و غضب کے مارے برا حال ہو [illegible] کوپن ہیگن کی دیواریں بڑے بڑے پوسٹروں [illegible] تھیں جن میں چڑیا گھر کے قیام کی صد سالہ [illegible] کے موقع پر دیگر دل چسپیوں کے ساتھ ایک نئے [illegible] ہاتھی کی نوید بھی سنائی گئی تھی۔ ناظم نے فوراً [illegible] شنک اینڈ کمپنی کے نام غصّے سے بھرا ہوا ٹیلی گرام [illegible] کیا جس میں نہ صرف سفید ہاتھی کی ادا شدہ قیمت [illegible] ہزار ڈالر کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا تھا بلکہ ہوائی سفر [illegible] پانچ سو ڈالر کے اخراجات کے علاوہ اپنی متوقع بدنامی کا [illegible] بھی طلب کیا تھا۔ دعوے کی کل رقم پچیس ہزار ڈالر

تھی۔

اتنی بڑی رقم کی ادائی کا مطالبہ جون پوٹا شنک کی مکمل تباہی تھا لیکن اس نے جواباً یہ نکتہ اٹھایا کہ یہی دھوکا اس کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ اس نے اپنی صفائی کے طور پر کوپن ہیگن چڑیا گھر کے برہم ناظم کو اُس خط و کتابت کی نقلیں روانہ کر دیں جو اس کے اور سفید فام شکاری میجر ٹونی رچرڈسن طلری کراس کے مابین ہوئی تھی۔ اس خط و کتابت سے یہ بات ثابت ہو جاتی تھی کہ جو ہاتھی اب بھورے ہاتھی کے طور پر پہچانا گیا ہے، وہ امریکا میں سفید ہاتھی ہی کے طور پر وارد ہوا تھا۔ جون پوٹا شنک نے چڑیا گھر کے ناظم کے نام ٹیلی گرام میں یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ اس معاملے میں فوراً میجر ٹونی سے رابطہ قائم کرے گا۔

اس نے ایک رجسٹری خط میں اس دھوکا دہی کی مکمل تفصیل بیان کرتے ہوئے میجر کو اس کا مورد الزام ٹھیرایا۔ پوٹا شنک اینڈ کمپنی نے عام سے بھورے ہاتھی کی جو قیمت ادا کی تھی، وہ اس کی اصل قیمت سے دس گنا زیادہ تھی۔ سفید فام شکاری نے بقول خود جو رقم تھائی کسٹم کے آدمیوں کو دی تھی، اگر وہ ہاتھی کی قیمت میں شامل کر لی جائے تو بھی ادا شدہ قیمت اصل قیمت سے لگ بھگ دس گنا ہی بنتی تھی۔

جون پوٹا شنک نے میجر ٹونی سے تیس ہزار ڈالر ہرجانے کا مطالبہ کیا تھا۔ اس میں سے پچیس ہزار ڈالر کی رقم اسے کوپن ہیگن کے چڑیا گھر کو ادا کرنی تھی، باقی پانچ ہزار ڈالر

اس نقصان کی تلافی تھے جو اس کی کاروباری ساکھ کو پہنچا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اس کی کاروباری ساکھ اتنی بلند کبھی نہیں رہی تھی۔

بدقسمتی سے میجر کے نام لکھا گیا خط بینکاک میں تھائی سنسر کی زد پر آگیا۔ اس وقت تھائی لینڈ ایک ظالمانہ پولیس اسٹیٹ بن چکا تھا جہاں ڈاک سے آنے جانے والا ہر دسواں خط کھولا جاتا تھا۔ چونکہ خط میں کسٹم کے عملے کو رشوت دینے کا ذکر بھی تھا اس لیے اس معاملے کی تحقیق کا حکم دے دیا گیا۔ تھائی حکومت ایسے معاملات میں حد سے زیادہ سختی برتتی تھی۔ تحقیق کے نتیجے میں میجر ٹونی کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا گیا۔ اسے ہتھ کڑی لگا کر چیانگ مائی سے بینکاک لایا گیا اور جیل میں بند کر دیا گیا۔

فلاڈلفیا اور کوپن ہیگن سے اضافی شواہد اور ثبوت اکٹھے کرنے میں خاصا وقت درکار تھا لہٰذا اس دوران میجر کو جیل کی ایک خصوصی کوٹھری میں رکھا گیا' اسے بستر اور چادریں فراہم کرنے کے علاوہ یورپین کھانا بھی مہیا کیا جاتا رہا۔

چند ہفتوں بعد برطانوی کونسلیٹ جنرل کے ایک کلرک کو اس سے ملاقات کی اجازت دے دی گئی۔ یہ ملاقات سلاخوں کے پیچھے ہوئی۔ کلرک نے اس سے دریافت کیا کہ اسے کسی قسم کی شکایت تو نہیں؟ میجر نے جواباً صرف یہ کہا کہ اسے شیونگ کے سامان کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے لیکن مروّجہ قوانین کی رُو سے قیدیوں کو شیونگ کا سامان رکھنے کی اجازت نہیں تھی' مبادا کوئی خودکشی کرلے چنانچہ جیل کے حکام نے اس کی درخواست رد کر دی۔ البتہ اس کے ساتھ خصوصیت کا اظہار اس طرح کر دیا گیا کہ ہفتے میں ایک بار جیلر کے ذاتی حجام کے ذریعے شیو کا انتظام ہو گیا۔

اسیری کے دوسرے ماہ کی ابتدا میں میجر سے تفتیش شروع ہو گئی۔ پوچھ گچھ بذاتِ خود پولیس کرنل چونگ کر رہا تھا جس نے ایک نہایت دیدہ زیب استری شدہ سفید وردی پہن رکھی تھی اور شانوں پر اعزازی نشانات سجائے ہوئے تھے۔ وہ ایک بھیم تجسم آدمی تھا۔ اس کی انگریزی بھی عمدہ تھی۔ وہ دھیرے دھیرے مصنوعی سفید ہاتھی کے ... کرنے کے ساتھ ان کی توثیق بھی کرتا جا رہا تھا۔ میجر ... پولیس کرنل کے ساتھ بھرپور تعاون کر رہا تھا۔

ایک روز صبح پولیس کرنل چونگ تفتیش کے لیے ... اس نے میجر ٹونی کی شکل میں کچھ تبدیلی محسوس کی ... کا سبب سمجھ میں نہیں آیا۔ "ایک منٹ ٹھہر جاؤ۔" ... اپنی نشست سے اٹھا اور میجر کے نزدیک جا کر غور ... کے سر کا جائزہ لینے لگا۔ وہ میجر کے بال اس طرح ... جیسے جوئیں تلاش کی جاتی ہیں۔ "کیا تم نے محسوس ... کہ تمہارے بالوں کی جڑیں خاکستری ہو رہی ہیں؟"

"نہیں' میں نے محسوس نہیں کیا۔ مجھے آئینہ رکھنے ... اجازت ہی نہیں ہے۔"

"اچھا' یہ میرا آئینہ لو اور غور سے دیکھو۔" کرنل اپنی جیب سے چمڑے کا ایک بٹوا سا نکالا اور اس میں پالش کیا ہوا اسٹیل کا ایک چھوٹا آئینہ کھینچ کر میجر کی جانب بڑھا دیا۔

میجر نے ایک نظر اپنے بالوں کا جائزہ لیا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

کرنل نے میجر کی کیس فائل کے ورق پلٹنے شروع کر دیے۔ ایک جگہ ایک موٹا سا لفافہ رکھا تھا۔ کرنل نے لفافے سے میجر ٹونی رچرڈسن' ملٹری کراس کا پاسپورٹ نکال لیا اور بولا۔ "کیا تم نے کبھی اپنے بالوں میں خضاب لگایا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"کیوں؟"

میجر نے جواباً طویل خاموشی اختیار کی۔

"جواب دو۔" کرنل نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "تم اپنے بالوں میں خضاب کیوں لگاتے تھے؟"

"اگر تم واقعی جاننا چاہتے ہو تو میں بتاتا ہوں۔" میجر نے کہا۔ "میرا ایک کمانڈنگ افسر تھا' میں اس کا بے حد مداح تھا۔ اس کے بال سنہرے مائل زرد تھے۔ میں اپنے بال اس کے بالوں سے میچ کر کے رنگتا تھا۔"

"مجھے ایسی فضول باتوں سے بہلانے کی کوشش مت کرو۔ یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟"

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

"تم کون ہو؟ بولو۔ اگر تم نے جواب نہیں دیا تو تمہارا بہت برا حشر ہو سکتا ہے۔" کرنل نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

میجر نے زبان کھولی۔ "میں ایمان داری سے سچ سچ بتائے دیتا ہوں۔ میں حقیقت میں ٹونی رچرڈسن نہیں ہوں' میں برطانوی بھی نہیں ہوں اور نہ میجر ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں انڈیا کی برٹش آرمی میں شامل تھا۔ یہ چند سال پہلے کی بات ہے۔"

"نارتھ ویسٹ فرنٹیئر رائفلز میں جیسا کہ تمہارے پاس پورٹ میں لکھا ہوا ہے؟"

"ہاں۔"

"تمہارا اصل عہدہ کیا تھا؟"

"میں ایک رائفل بردار سپاہی تھا۔"

"رائفل بردار سپاہی؟" کرنل نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔

"ہاں' رائفل بردار سپاہی۔"

"پھر تو تم ہندوستانی ہوئے۔"

"میرا تعلق پاکستان سے ہے۔"

"تمہارا اصل نام کیا ہے؟"

"نعمت حیات' یور ایکسی لینسی!"

"یہ میجر ٹونی رچرڈسن ملٹری کراس کون ہے؟"

"وہ ہماری بٹالین کا سیکنڈ ان کمانڈ تھا۔ جیسا کہ آپ سمجھ گئے ہوں گے' میں اس کا اردلی تھا۔ میں نے نارتھ ویسٹ فرنٹیئر رائفلز میں بیس سال خدمت انجام دی تھی۔"

"تو اب تم تھائی لینڈ میں کیوں ہو؟"

"یہ ایک طویل داستان ہے۔ میں عام طور پر سگریٹ نہیں پیتا لیکن اس وقت مجھے سگریٹ کی خواہش ہو رہی ہے۔ کیا یور ایکسی لینسی مجھے ایک سگریٹ عنایت کریں گے؟"

کرنل نے اپنی سفید چمک دار وردی کی جیب سے ایک سنہرا سگریٹ کیس نکالا اور اسے کھول کر "میجر" کی جانب بڑھا دیا پھر اپنے سنہرے لائٹر سے اس کا سگریٹ سلگا داستان سننے کے لیے اطمینان سے بیٹھ گیا۔

"میجر ٹونی رچرڈسن کی ناک خم دار تھی اور قد لمبا تھا یہی حلیہ میرا بھی تھا۔ ہمارے درمیان واضح فرق بالوں کی رنگت کا تھا۔ اس کے بال سنہرے مائل زرد میرے سیاہ تھے اور ان کی رنگت خاکستری ہوتی جا تھی۔ میں نے ان میں خضاب لگانے کا فیصلہ کیا تاکہ میری عمر کا مذاق اڑانا نہ شروع کریں۔ میں نے ان سنہرا خضاب لگایا جو میجر کے بالوں کا رنگ تھا۔ ہم دو ہاکی کھیلتے تھے اور اچھے کھلاڑی سمجھے جاتے تھے۔ میں ہم دونوں رجمنٹ کی ٹیم میں شامل تھے لیکن میرا میجر کے مقابلے میں زیادہ نکھر گیا تھا۔ دراز قد ہونے باعث میں مخالف ٹیم کا دفاع توڑتا ہوا ڈی میں داخل ہو تھا اور گول پر گول کرتا رہتا تھا۔ چونکہ میں کسی سرکش کے مانند سب کو دھکیلتا ہوا مخالف ٹیم کی ڈی میں جا گھ اور میرے چارج کرنے کا انداز مشہور ہو چکا تھا اس لوگ مجھے دی ایلیفینٹ یعنی ہاتھی کے نام سے پکار تھے۔ پھر جب میں نے اپنے بال میجر کے بالوں کی طرح ر شروع کر دیے تو لوگوں نے مجھے دی وائٹ ایلیفینٹ نام سے پکارنا شروع کر دیا۔"

"ہاں' یہ ایک دل چسپ قصہ ہے لیکن میں تو یہ جا چاہتا ہوں کہ تم تھائی لینڈ میں کیوں ہو؟" کرنل نے سوال دہرایا۔

"ہماری رجمنٹ کو برما میں جاپانیوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کا حکم ملا تھا۔ ہم چودھویں انڈین ڈائیل' ڈی اوڑن کا حصہ تھے' یہ ہماری رجمنٹ تھی جس نے منڈا پر دوبارہ قبضہ کرنے میں مدد دی تھی۔"

"جنگ کے خاتمے پر تم انڈیا واپس کیوں نہیں گئے؟"

"ہمارے میس میں انڈیا کی تقسیم اور آزادی کی باتیں سرگرمی سے ہوتی تھیں۔ مجھے علم تھا کہ پاکستانی افسران کے ماتحت رجمنٹ میں رہ کر میرا کوئی خاص مستقبل نہیں ہوگا۔ میجر رچرڈسن کے ساتھ معاملہ کچھ اور تھا' وہ ایک انگریز اور حقیقی جنٹلمین تھا لیکن میں پاکستان جا کر ایک بار پھر سے

...نہیں چاہتا تھا' سو میں نے بھگوڑا بننے کا فیصلہ کیا۔ ...کی وردیوں میں سے ایک وردی اور اس کا پاس ...ساتھ لیا اور چپکے سے سرحد پار کر کے تھائی لینڈ ...

"...سی جگہ؟" کرنل چونگ نے جاننا چاہا۔

"...واقعی علم نہیں۔ وہ جنگل کا کوئی مقام تھا جہاں میں ...عبور کی تھی۔"

"...بار تھائی لینڈ میں قدم رکھنے کے بعد تم نے کیا ..."

"...چلتا رہا' چلتا رہا حتیٰ کہ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں ...تھے۔ لوگ گھروں سے باہر گئے ہوئے تھے اس ...نے چند تھائی لباس "مستعار" لیے اور ایک بار پھر ...چلتے چلتے میں جنگل میں ایک ایسے مقام پر آ گیا ...ایکس پورٹ کمپنی آف تھائی لینڈ کا لاگنگ کیمپ ...تھا۔ مجھے ٹیک ڈھونے کا کام مل گیا۔ کسی نے مجھ سے ...سوال نہیں کیا۔ اس طرح مجھے زندگی میں پہلی بار ...کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ ان لوگوں کے ...اور لٹھے ڈھونے کے لیے بہت سے ہاتھی تھے۔ ...بار' بوڑھے یا مرجانے والے ہاتھیوں کی جگہ نئے ...ہوتے رہتے تھے۔ اس طرح میری ملاقات ہاتھیوں ...ڈیلروں سے ہوئی' میں ان کے پاس ہاتھی قابو میں ...والے فرد کی حیثیت سے چلا گیا۔ وہ ڈیلر مزید ہاتھی ...کے لیے سفاری مہمات بھی ترتیب دیتے تھے۔ چند ...مہمات میں امریکی سیاح بھی شامل ہوتے تھے جو ...سے لیس ہو کر آتے۔ وہ ہمارے ساتھ مہم میں ...کی اجازت کے لیے ڈیلروں کو بھاری رقم ادا کرتے ...میں نے دیکھا کہ اس کام میں خوب پیسہ ملتا ہے چناں ...میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ میں انگریزی لکھ ...تھا اس لیے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ میں نے ...نام تبدیل کر کے میجر ٹونی رچرڈسن ملٹری کراس رکھ لیا ...ار جانوروں کے ڈیلروں کو جانور سپلائی کرنے ...

"...اینڈ کمپنی سے پہلی بار تمھارا رابطہ کس طرح ہوا؟"

"میں پہلے جہاں ملازمت کرتا تھا' وہاں پوٹاشک اینڈ کمپنی سے خط و کتابت ہوتی رہتی تھی' میں نے بھی یہ سلسلہ جاری رکھا۔"

"اچھا نعمت حیات! تمھیں اس بات کا تو یقیناً احساس ہو گیا ہو گا کہ تم تھائی لینڈ کے ہر قانون کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے ہو' اس ملک میں غیر قانونی داخلہ' پرمٹ کے بغیر کاروبار' کسی دوسرے کی وردی اور پاس پورٹ کی غیر قانونی تحویل' شخصی تلبیس' کسٹم کے اہل کاروں کو رشوت دینا' فراڈ اور ایک سفید ہاتھی کی غیر قانونی برآمد کا جرم؟"

"لیکن وہ ہاتھی حقیقت میں سفید نہیں تھا یور ایکسی لینسی!" نعمت حیات نے صدائے احتجاج بلند کی۔

"ہاں! میں تمھاری یہ بات تسلیم کیے لیتا ہوں۔"

☆☆☆

بینکاک کی عدالت نے نعمت حیات پر دس لاکھ جرمانہ کیا اور اسے ملک بدر کر کے پاکستان بھیجنے کے احکام جاری کر دیے۔

کراچی پہنچنے پر نعمت حیات کو ایک بار پھر حراست میں لے لیا گیا۔ اس مرتبہ یہ کارروائی پاکستانی پولیس نے کی۔ ایک فوجی بھگوڑا ہونے کی حیثیت سے اُسے ملٹری کے حفاظتی دستے کی نگرانی میں اُس کی رجمنٹ کے ڈپو واقع پشاور پہنچا دیا گیا۔

وہ اپنی رجمنٹ سے دو سال سے زیادہ غائب رہا تھا لیکن گارڈ سارجنٹ نے اُسے ایک جھلک میں پہچان لیا۔ اس کی خم دار ناک اور لمبا قد اس کی شناخت تھا۔ "او خدایا۔ کیا تم وہی سفید ہاتھی نہیں ہو جو ہاکی کھیلتا تھا؟" گارڈ سارجنٹ نے کہا۔ "لیکن تم نے یہ اپنے بالوں کا کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ یہ تو تقریباً سنہرے مائل زرد تھے' اب یہ خاکستری کیوں نظر آ رہے ہیں؟"



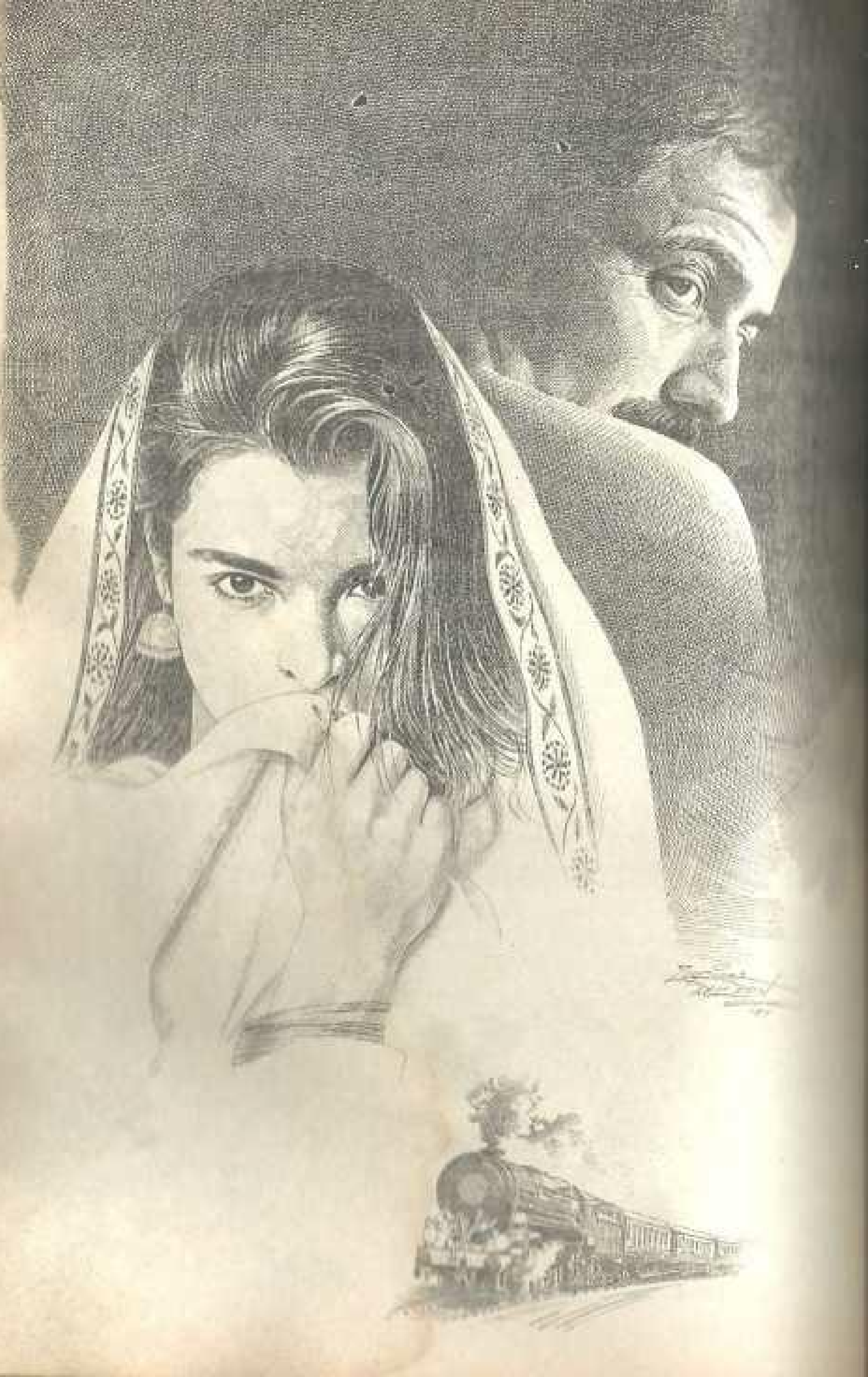
بابر زمان خان کی آپ بیتی، جگ بیتی

ایک خاک بسر، آشفتہ سر نوجوان کا فسانۂ زندگی

امنگوں، حوصلوں، آنسوؤں اور آہوں کی داستان

شہر گیا کے ہونہار لڑکے بابر زماں خان نے بدھ مت کے سالانہ میلے میں ایک بوڑھے شخص کے ساتھ حسن و جمال میں یکتا و یگانہ ایک نو عمر لڑکی دیکھی۔ پری پیکر کی صورت بابر کی آنکھوں میں نقش ہو گئی۔ دوسرے دن بابر اس کے قدم بدھ گیا کی طرف اٹھ گئے۔ تعاقب کرتے کرتے وہ ان کی قیام گاہ تک پہنچا۔ بابر کو متعارف ہونے میں مشکل پیش آئی مگر اپنی شائستگی کے باعث ان کا قرب حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لڑکی کا نام کورا تھا۔ بوڑھا بھکشو ایک جہاں دیدہ عالم شخص تھا۔ رفتہ رفتہ کورا اور بابر ایسے گھل مل گئے جیسے ان میں کبھی کوئی دوری ہی نہ تھی۔ انھیں بھی بابر سے خاصا مانوس ہو گیا۔ بھکشو کا باپ تبت کے جانگ قبیلے کا سردار تھا۔ باپ کی موت کے بعد چچا نے سرداری غصب کر لی۔ وہ کورا کو راستے سے ہٹانا چاہتا تھا کہ کورا کا کفیل بڑا کر اسے محل سے نکال لایا۔ قبیلے کے کچھ خفیہ نقشے اور متبرک دستاویزیں بھی وہ ساتھ لے آیا تھا۔ چچا کے آدمی ہر طرف کورا کو تلاش کر رہے تھے، زیادہ انھیں متبرک دستاویزوں کی جستجو تھی۔ کچھ ایسا ہوا کہ کالج جانے کے بجائے جیسے ہی موقع ملتا بابر بدھ گیا کا رخ کرتا۔ ایک روز وہ بہ اصرار بوڑھے اور کورا کو اپنے گھر لے آیا۔ بابر کے والد صفدر زماں خان کا شمار شہر کے شرفا میں ہوتا تھا۔ وہ ایک عمر رسیدہ تھے۔ ماں باپ، بابر کے علاوہ دو چھوٹے بھائی اور چار چھوٹی بہنیں شمیمہ، فرخ، قریال اور [illegible]۔ سبھی نے ان دونوں کی خوش دلی سے پذیرائی کی۔ بابر کی ماں اور بہنیں تو کورا کے حسن جہاں تاب سے متاثر ہوئیں، انھوں نے حسن سلوک کے طور پر انھیں قیمتی تحائف پیش کیے۔ اس واقعے کے چند روز بعد ایک رات کورا اچانک بابر کے گھر پہنچ گئی۔ شکستہ لباس۔ اس نے بتایا کہ جانگ قبیلے کے سرکش لوگوں نے آخر انھیں تلاش کر لیا، بوڑھا انھیں مزاحمت کرتے ہوئے مارا گیا۔ کورا پیچھے سے میلے کے ہجوم میں گم ہو کے چھپتی چھپاتی یہاں تک پہنچ گئی۔ وہ نوادرات اور متبرک کاغذات بھی بچا لائی تھی۔ بابر کے والد پولیس کو مطلع کرنا چاہتے تھے، بابر کو یہ گوارا نہ ہوا۔ والد کے [illegible] بابر کورا کو ساتھ لے کر چپکے سے گھر سے نکل گیا۔ دونوں چھپتے چھپاتے کلکتے جانے والی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ایک نوخیز لڑکی ساتھ تھی۔ دونوں کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ انھوں نے کتنا بڑا قدم اٹھایا ہے۔ اتفاق سے ڈبے میں مراد آباد سے تعلق رکھنے والے ایک مولوی محمد شفیق سے ملاقات ہو گئی۔ بابر کی اضطرابی کیفیت مولوی صاحب نے سمجھ لی۔ مجرد گوشہ گیر مولوی صاحب درس و تدریس کے علاوہ [illegible] کرتے تھے۔ کلکتے پہنچ کر وہ انھیں اپنے حجرے میں لے گئے۔ بابر نے انھیں کچھ اور ہی کہانی سنائی تھی۔ اسے خوف تھا کہ سچ کب تک چھپ سکتا ہے۔ ایک روز وہ وہاں سے بھی فرار ہو گئے۔ ہوٹل میں ٹھہر کے بابر نے ملازمت ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ کلکتے جیسے شہر میں ایک نوعمر اجنبی کو اتنی جلد ملازمت اور چھپانے کی جگہ ملنی آسان نہیں تھی۔ کورا کے ساتھ ہونے کی وجہ سے طرح طرح کی نگاہیں الگ برداشت کرنا پڑتی تھیں۔ وہ گھر سے کچھ رقم اور چاقو لائے تھے، صرف چاقو باقی رہ گیا۔ دربدر ٹھوکریں کھانے کے بعد انھیں دوبارہ مولوی صاحب کے حجرے ہی میں پناہ ملی۔ بابر نے اس بار پھر کچھ جھوٹ کچھ سچ دوسری داستان انھیں سنائی۔ مولوی صاحب کا ارادہ تھا کہ اپنے کاموں سے فارغ ہو کے چند دن بعد وہ انھیں اپنے آبائی شہر لے جائیں گے لیکن اس کا موقع نہ ملا۔ ایک شام وہ ان کی دل بستگی کے لیے دریا کی سیر کرانے لے گئے تھے کہ چند مسلح آدمیوں نے حملہ کر دیا۔ بدقماشوں کو کورا مطلوب تھی۔ حملہ آوروں سے گتھم گتھا ہو جانے کی وجہ سے مولوی صاحب کورا کو دور رکھنے اور بھاگ جانے میں کامیاب رہے۔ ادھر یہ قتل کے جرم میں بابر کو سات سال کی سزا ہو گئی۔ مولوی صاحب نے پھر اس سے کوئی رابطہ کیا نہ اس نے [illegible]۔ کلکتے کا نامی گرامی استاد جمیل بابر کی سرکش معصومیت اور اس کے چہرے پر ہوئے دم خم سے ایسا متاثر ہوا کہ ایک طرح سے وہ بابر کا محافظ اور نگراں بن گیا۔ جیل میں استاد جمیل اور اس کے شاگردوں کی آمد و رفت ایک معمول تھی۔ جمیل رہا ہو تو جیل میں اس کے اڈے کے کارندے بابر کا بہت خیال رکھتے۔ انھوں نے چاقو زنی کے کرتب، علم الاعمی کے گر اور جسمی داؤ پیچ اسے سکھائے۔ [illegible] کی تحریک پر بابر نے تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور امتیازی نمبروں سے ایم اے کر لیا۔

آخر قید پوری ہوئی۔ بابر نے سات سال کے روز و شب گن گن کے کاٹے تھے۔ رہا ہو کر وہ اپنے مشفق و محسن جمیل کے اڈے پہنچا چاہتا تھا۔ کورا کی تلاش میں نکل گیا۔ کلکتے کے مدرسے میں مولوی شفیق سات سال سے نہیں پلٹے تھے۔ مولوی صاحب کے آبائی شہر میں بھی کسی کو ان کا کوئی علم نہ تھا، صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ حیدرآباد میں ان کی ایک بہن رہتی ہے۔ حیدرآباد میں بھی بابر کو ناکامی ہوئی۔ ہر طرف سے مایوس ہو کے بابر نے اپنے شہر گیا کا رخ کیا، جہاں اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ سات سال کتنی بڑی مدت ہوتی ہے۔ وہیں اسے بتایا گیا کہ اس کی ماں بیٹے کے غم میں گھل گھل کے مر گئی۔ عرصہ ہوا باپ [illegible] اور بچوں کو ساتھ لے کے شہر سے چلے گئے ہیں۔ کسی کو ان کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ اب کلکتہ ہی بابر کی منزل ہو سکتی تھی جہاں جمیل اس



بہت پریشان تھا۔ ریل کے ڈبے میں اسے ایک شناسا عورت نظر آئی۔ سات سال پہلے کلکتے کے ہوٹل میں اس عورت نے کورا کو اس سے جدا کرنے کے لیے پھسلایا تھا۔ بابر نے اس کی نگاہیں پہچان کے وہ ہوٹل ہی چھوڑ دیا تھا۔ عورت اسے پہچان نہ سکی۔ اب اس کے ساتھ ایک سراسیمہ اور نہایت معصوم لڑکی تھی۔ بابر کا شبہ درست نکلا۔ لونیز عورت نائکہ تھی اور کسی اچھے ارادے سے لڑکی کو کلکتے نہیں لے جا رہی تھی۔ لڑکی کا نام زریں تھا۔ وہ ایک صاحب ثروت اور بے آسرا لڑکی تھی۔ رشتے داروں کے ستم سے تنگ آکر بظاہر اس نرم و شفیق عورت کی پناہ میں اسے عافیت نظر آئی کہ گھر ترک کر لیا۔ بابر نے جان جوکھوں میں ڈال کر زریں کو اس ڈائن کے چنگل سے چھڑا لیا اور مشعل کے اڈے لے آیا۔ بابر کی آمد سے اڈے پر بہار آگئی۔ کئی دن جاتا رہا۔ زریں ایک معزز خاتون کے ساتھ ٹھہرا دی گئی۔ مشعل نے اسے ایک بیٹی کے مانند شفقت دی۔ خود زریں بھی ہمہ صفت تھی۔ ذرا سا موقع ہو ہر نکلے۔ سیرت بھی ویسی ہی حسین تھی۔ اڈے پر بھی مشعل کے لاڈلے بابر کی خاطر میں لگے رہتے تھے مگر بابر کے ہاں تو ویرانی جڑ پکڑ گئی تھی۔ وہ دو کورا کی آنکھیں کھوجتا رہتا تھا۔ زریں کی چاہت کے مشعل نے اڈے کے چند خاص آدمیوں کو بابر اور زریں کے ساتھ فیض آباد روانہ کیا۔ وہاں کے جاسوں اور اس کے ساتھیوں کی اعانت سے زریں کی وسیع و عریض حویلی اور جاگیر اس کے ستم شعار اعزا کے پنجے سے چھڑا لی گئی۔ وقت جیسے تیغ مشعل تھا وہی زریں اب چراغ خانہ بن گئی۔ زریں نے ممنونیت کے اظہار کے طور پر اپنی ساری جائداد بابر کے نام لکھ دی اور بابر کے مسلسل انکار کے باوجود اس فیصلے پر نظر ثانی بھی نہیں کی۔ زریں کی خوش اطواری پاکیزہ نفسی نے اڈے کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ کوئی بھی اس کے سامنے نگاہ نہیں اٹھاتا تھا۔ اس کی خدمت اور تعمیل کے لیے بے تاب رہتے تھے۔ بابر ابھی فیض آباد ٹھہرا ہوا تھا۔ ان دنوں شہر میں نیلم جان نامی مغنیہ کی بڑی دھوم تھی۔ ایک شام اسے نیلم جان کے بالاخانے لے گیا۔ محفل آرائی کے لیے جب نیلم جان اندر سے برآمد ہوئی تو بابر کو سکتہ سا ہو گیا۔ دوسری طرف نیلم جان کی حالت بھی وہ ایک کسی بھماکے کی طرح وہ کھڑکی کی طرف لپکی اور دیکھتے دیکھتے سڑک پر کود گئی۔ بابر دیوانہ وار زینے کی جانب دوڑ پڑا۔ چند ہی لمحوں میں نیلم جان نے اس کے زانوؤں پر دم توڑ دیا۔ یہ اس کی بہن فہمیدہ تھی جس کی تلاش بابر اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا۔ تار ملتے ہی مشعل بھی کلکتے سے آگیا۔ سبھی بابر کی ہوش میں مصروف تھے مگر اس کی دیوانگی بڑھتی ہی گئی اور ایک رات سب کو سوتا چھوڑ کے وہ حویلی سے نکل کھڑا ہوا۔ اسے فہمیدہ کو نیلم جان بنانے والی کا سراغ لگانا تھا۔ تلاش بسیار کے بعد وہ اسے آگرے میں کہیں مل پائی۔ چمپا بائی سے معلوم ہوا کہ فہمیدہ کو بمبئی سے لایا گیا تھا۔ بابر کے تیور ٹھیک نہیں تھے۔ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ بابر کی منشا کے مطابق اس کے ساتھ بمبئی کا سفر کرے۔ چمپا بائی پر نگاہ رکھنے کے لیے فرسٹ کلاس میں سفر کر رہا تھا۔ دوران رات کو ایک اہم سفر پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ عین وقت پر بابر حملہ آور پر حاوی ہو گیا۔ وہ بمبئی میں تعینات ایک بہت بڑا پولیس افسر راج کرشنا تھا۔ کرشن کا التفات فراواں تھا۔ بمبئی پہنچ کے چمپا بائی کی نشان دہی پر بابر نے اپنے خاندان کی تلاش شروع کردی تھی اور آخر وہ اس عمارت تک پہنچ گیا جہاں باپ اور بہن بھائیوں کا قیام رہا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر مولوی اکرم نے اسے بتایا کہ فہمیدہ کی گمشدگی کے بعد اس کے باپ پھر یہاں نہ رہ سکے۔ قریبی ہونے کے باوجود انھوں نے اپنا پتہ مولوی اکرم کو بھی نہیں بتایا تھا۔ مولوی اکرم کا کہنا تھا کہ ان کے سوا بابر کے باپ کا کسی سے ملنا جلنا نہیں تھا۔ بیشتر وہ گھر میں رہتے۔ کتابوں کا ڈھیر لگا ہے۔ جب دیکھو، کسی نامعلوم زبان میں کچھ کاغذات پر جھکے خاکے کھینچ رہے ہیں۔ مولوی اکرم کے استفسار پر مسکرا کے کہتے کہ ان میں ایک گم شدہ دفینہ ہے۔ یہ وہی کاغذات ہو سکتے تھے جو کورا اپنے ساتھ لائی تھی۔ بابر کی ہمت جواب دے گئی۔ کوئی گھر نہ پناہ، حال، پر نہ کھانے کا ہوش نہ کپڑوں کا۔ اسی درماندگی اور دیوانگی کے عالم میں ایک دن کرشنا نے اسے دیکھ لیا اور زبردستی اپنے بنگلے لے آیا۔ کرشنا نے بھائی کی طرح خبر گیری کی۔ بابر نے اپنے بارے میں صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ اپنے بچھڑے ہوئے گھر والوں کی بازیابی کے لیے سرگرداں ہے۔ ایک پولیس افسر کے سامنے اعتراف کرنے میں اسے جھجک ہوئی کہ وہ ایک سزا یافتہ ہے اور اس نے جیل میں ایم اے کیا ہے۔ کرشنا نے اس کی ذہانت دیکھ کے ایک منصب کا انتظام کیا۔



[illegible] ڈھارے کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ چمپا بائی بھی وہیں موجود تھی۔ کچھ اپنی ندامت، کچھ بابر کی شائستگی سے وہ [illegible]
گئی اور چمپا بائی سے نیک نفس چمپا بیگم بن گئی۔ فرض شناس کرشنا کے گھر آئے دن پولیس افسروں کی خفیہ میٹنگیں ہونے لگی تھیں اور [illegible]
تھی کہ کرشنا ان دنوں کس کش مکش سے دوچار ہے۔ ایک روز بابر کسی کو کچھ بتائے بغیر گھر سے چلا گیا اور وہاں کالکے بدنام زمانہ مستانہ [illegible]
اس کی زور آزمائی دیکھ کے مستانہ نے اسے اپنے باڑے سے وابستہ کر لیا۔ وہ ہفتوں تک بار علاقے کے کالے مقامات اور آدمیوں کی معلومات [illegible]
[illegible] سے فرار ہو گیا۔ اُسی رات اس کی نشان دہی پر پولیس نے سارا علاقہ گھیرے میں لے لیا۔ مستانہ شاہ دتوں اور ساتھیوں سمیت [illegible]
اور کرشنا پر پے در پے حملے ہوئے اور آخر بابر کی سپر بھی کام نہ آئی۔ کرشنا اپنی تمام جائیداد نقدی وغیرہ بابر کے نام کر گیا تھا مگر بابر [illegible]
[illegible] تک رسائی کے لیے اسے کسی مستقل باڑے کی ضرورت تھی۔ مختصر عرصے میں چاقو آزمائی کے بل پر اُس نے کئی باڑے حاصل کر لیے۔ شہر کے [illegible]
[illegible] بیٹھ گئی۔ بابر کی دیوانگی سے خوف زدہ ہو کے چمپا بیگم نے کلکتے میں بھمل کو مطلع کر دیا۔ بھمل بابر کے لیے پہلے ہی مضطرب تھا۔ فوراً ہی [illegible]
[illegible] سے رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی مگر بھمل نے مزید باڑے حاصل کرنے کے بجائے بمبئی کے ایک بڑے دادا بیرو کے پاس جا کے مدد [illegible]
ایک خوش وضع اور بہادر شخص تھا۔ اس نے خندہ پیشانی سے اپنا باڑا بھمل کے حوالے کر دیا۔ پھر بھمل کو کرشنا کے قاتلوں تک پہنچنے میں [illegible]
[illegible] کی آگ بجھی تو اس نے کورا کی تلاش میں نکل جانا چاہا۔ بھمل اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ دونوں ساتھ ہی سفر پر روانہ ہوئے اور شہر شہر [illegible]
صاحب ملے نہ بابر کے والد۔ البتہ حیدر آباد میں بابر کو اپنا چھوٹا بھائی جہاں گیر مل گیا۔ وہ میرٹھ کی [illegible] میں اپنے گھر والوں سے بچھڑ گیا تھا اور
[illegible] کے ہاں پہنچ گیا تھا کہ حیدر آباد کی مشہور مغنیہ خانم کی نظر کو بھا گیا۔ وہ اسے جاگیردار سے مانگ لائی اور بیٹے کی طرح نگہداشت کر رہی
تھی۔ اس کی بزم آرائی ایک بڑے رئیس عالم تاب تک محدود تھی۔ بھمل نے جہاں گیر کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا تو خانم [illegible]
عالم تاب کی شدید مزاحمت کے باوجود جہاں گیر کی خاطر وہ بازار چھوڑ کے ان کے ساتھ فیض آباد چلی گئی۔ خانم کی زیرِ تربیت [illegible]
[illegible] آئی تھی۔ زرین کی حویلی آباد ہو گئی۔ چند روز فیض آباد ٹھہر کے وہ پھر در در کی خاک چھانتے نکل کھڑے ہوئے اور جیسلمیر شہر میں [illegible]
شفیق کا کچھ سراغ ملا۔ وہ جیسلمیر میں ایک شخص منیر علی کے پڑوسی رہ چکے تھے۔ منیر علی نے انھیں بتایا کہ جیسلمیر کے رنگیلے اور سرکش [illegible]
[illegible] کورا کے حسن وجمال کی خوشبو پہنچ گئی تھی۔ اس کا پیغام مسترد کر دینے کی گستاخی مولوی صاحب کو راس نہیں آئی۔ ایک رات [illegible]
[illegible] ہو گئے۔ منیر علی کا مہمان ہونے کی وجہ سے بھمل اور بابر کے لیے براہِ راست رانا مہتاب کی مزاج پرسی کو جانا مناسب نہیں تھا۔ بھمل نے [illegible]
[illegible] گم شدہ گلی کی بازیابی کے لیے رانا مہتاب کی حویلی روانہ کیا۔ معلوم ہوا کہ رانا مہتاب کے ایک ملازم نے کورا اور مولوی صاحب کی [illegible]
[illegible] اپنے آقا کا ہاتھ دراز ہونے سے پہلے انھیں فرار کرا دیا تھا۔ بیرو کو حویلی سے خالی ہاتھ لوٹنا اچھا نہیں لگا۔ [illegible]
[illegible] کے بعد منیر علی کا اب جیسلمیر میں عزت وعافیت سے رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ ضرور انتقام کا نشانہ بنتے۔ بھمل انھیں [illegible]
[illegible] آیا۔ کرشنا نے اپنی زندگی میں سارے ہندوستان کی پولیس کو ایک خط روانہ کیا تھا کہ بابر کے والد کے حلیے کا کوئی شخص نظر آئے [illegible]
[illegible] کرشنا کے دستِ راست ایس پی شکلا کا خط ملا کہ بابر کے والد جیسا ایک شخص آسام میں دیکھا گیا ہے۔ بھمل اور بابر [illegible]
[illegible] کے چند منتخب آدمی طلب کر لیے۔ یہاں اس نے چیدہ چیدہ آدمیوں کا ایک گروہ [illegible]
[illegible] حالات، دشوار گزار راستے عبور کرتے ہوئے وہ تبت پہنچ گئے [illegible]
[illegible] کی خانقاہ میں موجود تھے۔ انھوں نے کورا کے [illegible]
[illegible] فلذات میں صدیوں پرانے دفینوں کے نقشے بھی تھے۔ [illegible]



پاس پہنچ گیا۔ اپنے بیٹے بابر کو دیکھ کے ان کی کمر سیدھی ہو گئی۔ ہم وہ دونوں خزانے کے بغیر واپس جانے پر رضامند نہیں تھے۔ سب نے مل کر ساتھ دیا۔ چند روز میں کھود ڈالے جن کے لیے اکیلے صفدر زماں کو جانے کتنی مدت لگ جاتی۔ واپسی کے سفر میں ان کے پاس زر و جواہر سے بھرے صندوق تھے۔ آسان نہیں تھا۔ جانگ قبیلے کے لوگ راستے کی دیوار بن گئے۔ وہ ان سے لڑتے بھڑتے، سنگلاخ پہاڑی راستے عبور کرتے ہوئے ہندوستان کی سرحد ہو گئے۔ اس سفر میں کئی آدمی کام آ گئے۔ کلکتے میں دو ایک روز قیام کے بعد وہ سب فیض آباد آ گئے۔ زریں کی حویلی میں میلا سا لگ گیا۔ بابر کے والد بے حد امیر خوشی مستزاد تھی کہ زریں کی حویلی میں ان کا دوسرا بیٹا جہانگیر بھی موجود ہے۔ ایک اور شخص سے ملنے کی سرشاری الگ تھی۔ زریں بیٹیوں کی طرح ان سے ملی تھی۔ بابر کو اپنے بچھڑے ہوئے بھائی بہنوں سے ملنے کے لیے جلد سے جلد بمبئی پہنچنے کی بے چینی تھی۔ بمبئی میں اپنے کے پاس بابر کے والد اپنے بچوں کو چھوڑ آئے تھے۔ مشعل فیض آباد میں رک گیا۔ خزانے سے لدے ہوئے صندوق زریں کی حویلی کے تہہ خانے میں وہ بمبئی روانہ ہوئے۔ راستے میں مراد آباد پڑتا تھا۔ بابر سے نہ رہا گیا۔ ممکن ہے اس دوران مولوی صاحب اپنے شہر واپس آ گئے ہوں اور مراد آباد مصوّمت ہی ہوا۔ مسافر خانے میں درج تھا کہ کسی پردہ نشین خاتون کے ہم راہ مولوی صاحب اپنے شہر واپس آ گئے تھے اور اپنے مستقل پتے کے طور پر لکھوایا تھا۔ بابر کی عاجزی پر بیرو تیار ہو گیا اور وہ بمبئی کے بجائے حیدرآباد پہنچ گئے۔ وہ ثروت یار ہائی نواب کا گھر تھا۔ نواب نے بتایا کہ مولوی صاحب کے لیے دوبارہ حیدرآباد آنے کو کہہ گئے تھے لیکن ابھی تک ان کا انتظار ہے۔ بابر دل گرفتہ وہاں سے لوٹا۔ اب انھیں بمبئی روانہ ہو جانا چاہیے تھا لیکن نشن نے پیر پکڑ لیے۔ وہ نواب کے گھر سے واپس آ رہے تھے کہ چند نقاب پوشوں نے راستہ روک لیا۔ مزاحمت کا نتیجہ یہ نکلا کہ بابر اور بیرو کو الٹا حوالات گیا۔ حوالات میں موجود ایک اجنبی نے ان کی روداد اور فریاد سن کے انسپکٹر سے نرم دلی کی درخواست کی اور ذاتی ضمانت پر انھیں آزاد کروا انھیں اپنے گھر چلنے کی دعوت دی تو بار احسان میں وہ اس کی خواہش رد نہ کر سکے مگر اجنبی انھیں ایک اور زنداں میں لے گیا۔ وہاں جا کے ان کی آنکھیں نقشوں سے نہ جھپیں۔ حوالات میں اجنبی کی ضمانت، سب کچھ خانم کے پرستار نواب عالم تاب کے بڑے بھائی جہاں تاب کے اشارے پر ہوا ہے۔ خانم کا راز سے سامنے جا سکا تھا۔ وہ بستر سے لگ گیا تھا اور ایک ہی مسیحا سے مداوا ممکن تھا۔ بڑے بھائی نے خانم کے لیے سارا ہندوستان چھنوایا تھا۔ بابر اور بیرو جانے پر اس نے خانم کا پتہ اگلوانے کے لیے ان دونوں کو نہ صرف بھوکے پیاسے رکھا بلکہ مظالم بھی توڑے۔ بابر اور بیرو نے اپنی زبان بند رکھی۔ یہاں رات عالم تاب کی پری تمثال بیوی گیتی آرا اور بخت مقتدر بن پر جس ساری روایتیں توڑ کے چپکے سے زنداں میں آئیں اور عالم تاب کی زندگی کے واسطے اور بیرو نے انھیں احترام سے رخصت کیا۔ گیارہ دن حویلی کے پنجرے میں پھڑپھڑانے کے بعد ایک شب انھیں فرار کا موقع مل گیا۔ انھوں نے نواب اپنی آمد کی کے بجائے مجلس میں بلوایا اور بابا کا ایک بیرو چل لیا۔ اے واحال بنائے ہوئے وہ حویلی کی اونچی دیواروں سے نکل آئے۔ انھیں سیدھے ہوٹل تھا لیکن بیرو نے بابا رخس کے اڈے کا رخ کیا اور وہاں مشعل کو چوکی پر دیکھ کے ششدر رہ گیا۔ دراصل بابر کے والد نے بابر اور بیرو کی گم شدگی کے دوران مشعل کو تار دے دیا تھا اور اپنے طور پر خود بھی دوڑ دھوپ میں لگ گئے تھے۔ منظم اقدام کے طور پر انھوں نے ایک بار سوچ نواب حشمت جنگ تک رسائی اور ایک نادر ہیرا اس کی نذر کر دیا۔ نواب نے پوچھ گچھ کیا۔ اس پر مزید اعتبار قائم کرنے کے لیے اس کے توسط سے ایک عالی شان کوٹھی کا سودا بھی بابر کے والد تار ملتے ہی مشعل پہلی گاڑی سے حیدرآباد پہنچ گیا۔ اس نے بابر کے والد کو ہوٹل میں ٹھہرے رہنے دیا اور اپنے انداز سے بابر اور بیرو کی تلاش شروع تھانوں کی خاک چھانتا ہوا وہ اڈے تک پہنچا۔ وہاں سے بروقت اسے جہاں تاب کی حویلی کا اشارہ ملا۔ حویلی پہنچ کے کسی تمہید کے بغیر اس نے بابر اور بیرو کی رہائی کا نواب انکار کرتا رہا مگر خانم کا پتہ جاننے کے لیے وہ مصر تھا۔ اس نے اپنے مجبور بھائی کی زندہ لاش بھی مشعل کو دکھائی۔ مشعل نے خانم کو حیدرآباد بلوانے کا کہا کہ بہتر ہے نواب اس کے آدمیوں کو رہا کر دے اور یہ اقدام خانم کی آمد سے مشروط نہ کرے۔ مشعل نے خانم کو تار دیا تھا۔ وہ دوسرے دن حیدرآباد کہ بابر اور بیرو نے حویلی کے زنداں سے نجات حاصل کر لی۔ ان کی رہائی کے باوجود مشعل نے خانم کو جہاں تاب کی حویلی میں پہنچا دیا۔ خانم کی آمد



تھی مگر کسی کو کیا معلوم تھا کہ نواب عالم تاب کی سانس تو بس اپنے محبوب کے ایک جلوے کے لیے اٹکی ہوئی تھی۔ وہ سکون سے [illegible] سوم تک وہ سب حویلی میں ٹھہرے رہے اور چوتھے دن بابر کے والد کی نو خرید حویلی میں منتقل ہو گئے۔ دوسرے دن انھیں [illegible] آخری رات ان پر قیامت کی طرح گزری۔ بابر کے والد کی طرف سے نواب حشمت جنگ کو نذر کیے جانے والے ہیرے کی اطلاع نے نوابوں میں کھلبلی مچا دی۔ بچھوؤں کے دیوانوں کو شبہ تھا کہ صفدر زماں کے پاس مزید نایاب ہیرے نہیں ہوں گے۔ انھوں نے طرح طرح [illegible] اور کوئی صورت نہ بنی تو اس رات مسلح حملہ آوروں کی ایک بڑی نفری صفدر زماں کی حویلی میں شب خون مارنے کے لیے داخل ہوئی۔ حملہ [illegible] بے بس کر دیا۔ وہ صفدر زماں پر تشدد کرتے رہے۔ سب کا خون کھول رہا تھا اور سب تماشائی بنے دیکھتے رہے۔ ذرا سی غلطی سے کوئی [illegible] آگے بڑھا اور ہیرے ظاہر کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ یہ دیکھ کے مشعل پیرو سے الجھ پڑا۔ نقب زنوں کی توجہ بٹ گئی۔ ادھر مشعل کا [illegible] ہیروں کی نشان دہی کے لیے چند حملہ آوروں کو اپنے ساتھ لے گیا۔ مشعل اور پیرو بس کسی موقع کے منتظر تھے۔ انھیں پانسا پلٹنے میں دیر نہیں [illegible] کی قبریں وہیں بنا سکتے تھے لیکن اجنبی سرزمین میں مزید کسی رخنہ اندازی کے اندیشے میں انھوں نے ان سب کو غیر مسلح کر کے جانے دیا۔ حملہ [illegible] اعلان کر دیا تھا۔ جاتے جاتے بابر اور پیرو نواب ثروت سے ایک بار پھر مل آئے تھے۔ نواب نے بتا کے اور [illegible] مولوی شفیق گزشتہ [illegible] آئے تھے۔ نواب نے ان سے پیرو اور بابر کی آمد کا ذکر کیا تھا۔ حاصل یہ ہوا کہ مولوی صاحب کسی سے کچھ کہے سنے بغیر کہیں چلے گئے۔ [illegible] خراب ہو گئی تھی۔ اسے جولین کے گھر بھیج دیا گیا۔ پھر یہ قافلہ ایک [illegible] مکان کے سامنے ٹھہرا۔ دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے بابر کا دل [illegible] ہوئے بھائی بہن مولوی اکرم ایک بزرگ کی نگرانی میں وہاں رہتے تھے۔ وہ منظر سب کے لیے دیدنی تھا۔ فرخ نہال تھا۔ [illegible] تھیں اور آنسو بہاتی تھیں۔ چھوٹے بھائی اکبر کا بھی یہی حال تھا۔ اس طرف جولین کے گھر کلکتے سنبھل نہیں پا رہا تھا۔ اسے اسپتال [illegible] ہو کر [illegible] گئیں۔ کلکتے سب کو روتا چھوڑ کے چلا گیا۔ مشعل کے لیے تو وہ اولاد کے مانند تھا۔ بمبئی میں پیرو کے غیاب میں [illegible] پاڑے پر بھتا بھیجنے والے تین سرکش داداؤں نے بھتا بند کر دیا تھا۔ ان میں قابے کا دادا جارجی شوریدہ سری میں پیش پیش تھا۔ اس نے [illegible] اور [illegible] کا خفیہ اڈا کھول لیا تھا۔ اڈے سے روپے کی بارش ہونے لگی تھی۔ پیرو اسے زندہ نہ چھوڑتا لیکن جارجی کی بیوی ماری [illegible] سارا ماری کی پرورش بھی پیرو ہی نے کی تھی۔ [illegible] اور راجن کے بعد جارجی بھی پیرو کے پیروں سے لپٹ گیا اور شرمندگی میں مستقل [illegible] کر دیا مگر اس کے سینے میں بڑی آگ بھری تھی۔ چند دن بعد پیرو بھی اپنے پاڑے میں جم کے بیٹھنے لگا تھا۔ اس کی بیوی رانی اور بیٹی [illegible] بھول نہ سکتی تھیں۔ جولین اور بابر کے گھر بھی ان کی خوب آمدورفت ہو گئی تھی۔ سب مل بیٹھتے تو ایک بڑا سا کنبہ بن جاتا۔ اس [illegible] اضافہ ہوا۔ ڈاکٹر کیلاش اور اس کی ذہین شعلہ صفت اور گل اندام بہن رما کا۔ جس اسپتال میں کلکتے زیر علاج تھا وہیں کیلاش [illegible] دیکھتے دیکھتے کیلاش اور رما گھر کے فرد بن گئے۔ اس رات کلکتے کے چہلم پر سب جولین کے گھر تھے۔ پیرو جلدی واپس چلا گیا۔ اس کے ساتھ اس [illegible] ماچی بھی تھا۔ وہ دونوں جولین کے گھر سے کچھ دور گئے تھے کہ انھیں گولی مار دی گئی۔ پیرو بمبئی کا سب سے بڑا دادا تھا۔ [illegible] اسپتال سے لاشیں لے کر مشعل امام کے پاڑے پہنچا تو علاقے میں کہرام مچ گیا۔ [illegible] کے پاڑے پر ایک ہجوم آہ و بکا کر رہا تھا۔ پیرو کے جاں نثار آگ پر لوٹ رہے تھے۔ [illegible] ماری نے صبح سویرے تھانے آ کے اپنے شوہر جارجی اور اس کے ساتھی کے قتل کا اعتراف کیا [illegible] جارجی کا نام سن کر پاڑے پر سناٹا چھا گیا۔ ایک رات پہلے ہی [illegible] جارجی ان کے درمیان [illegible] پیرو کی موت کے [illegible] کی بستی میں بابر کے والد کی خریدی ہوئی گل جیسی کوٹھی میں منتقل ہو گئے [illegible] اور رانی کا غم بھی کچھ کم ہوا [illegible] کیلاش اور رما [illegible]



سب کے تیوروں سے اسے اپنی ہرزہ سرائی کی بے تاثیری کا جلد ہی احساس ہو گیا۔ پہلے اس نے معافی مانگنی چاہی، پھر ہذیان بکنے لگا اور آخر سلمیٰ پر چاقو کی ... کچھ اندازہ نہیں تھا کہ سامنے کون لوگ ہیں۔ ارشاد علی ان کے آگے کتنی دیر ٹھہر سکتا تھا۔ اسے انتظار گاہ میں نیم جاں کر کے وہ دلّی جانے والی گاڑی میں ... ہو گئے۔ خدشہ تھا کہ ہوش میں آنے پر ارشاد علی کوئی پاگل پن نہ کرے۔ وہ پولیس کو خبردار کر سکتا تھا۔ باقی سفر میں انھوں نے بہت احتیاط برتی۔ سامان ... الگ سفر کیا۔ ... ہوا اور بہ سلامت دلّی آ گئے اور مراد آباد آ کے اسٹیشن کے عین مقابل اسلامیہ مسافر خانے میں ٹھہر گئے۔ گزشتہ تین ماہ ... مسافروں کی فہرست میں مولوی صاحب کا نام کہیں درج نہیں تھا۔ گویا مولوی صاحب نے حیدرآباد سے اچانک اپنی روانگی کے لیے کسی اور شہر کا قصد کیا ... اور سلمیٰ کو مسافر خانے میں چھوڑ کے پورے ... بھل اور بابر مراد آباد کے اطراف کی بستیوں میں دور دور مولوی صاحب کو ڈھونڈتے رہے ... معلوم ہوا تھا کہ گزشتہ چھ ماہ میں مولوی صاحب تین بار مراد آباد آئے ہیں۔ ایک مرتبہ کسی حاجی محمد یوسف سے زیورات پر مشتمل اپنی والدہ کی امانت بھی ... نے واپس لی تھی۔ گزشتہ دس سال میں وہ چند مرتبہ وہاں آئے تھے اور چیدہ چیدہ لوگوں سے ملاقات کی تھی۔ ایک مختصر مکان، دو دکانیں اور ایک قطعہ اراضی ... انھوں نے فروخت کیا تھا۔ اپنے ساتھ موجود کورا کو انھوں نے اپنی منہ بولی بیٹی بتایا تھا۔ وہ ہمیشہ مسافر خانے میں ٹھہرتے تھے اور ہر سفر میں انھیں بہت ... تھی۔ مراد آباد آمد کے تیرہ دن بعد اطراف کی بستیوں کی خاک چھانتے ہوئے بھل اور بابر گریا سادات آ گئے اور ایک اوسط درجے کی حویلی کے دروازے ... دی۔ حویلی کے مالک حافظ عبدالخالق کے بارے میں انھیں معلوم ہوا تھا کہ وہ اور مولوی صاحب کبھی مراد آباد میں ساتھ پڑھاتے تھے۔ دونوں میں گہری ... بعد کو حافظ صاحب درس و تدریس ترک کر کے مستقلاً اپنی زمینوں پر آ گئے۔ حافظ صاحب کی عدم موجودگی میں ان کے چھوٹے بھائی نے بیٹھک کھلوا دی ... رسم و راہ استوار ہونے پر بھل کو اندازہ ہو گیا کہ اتنی دوڑ دھوپ کے بعد وہ ایک صحیح جگہ آ گئے ہیں۔ چھوٹے بھائی عبدالمتین نے تذبذب سے اقرار کر لیا ... روز پہلے مولوی شفیق گریا سادات آئے تھے۔ اس سے مزید کچھ حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔ رات کے کھانے کے دوران حافظ عبدالخالق واپس آئے اور ... کی رسمی باتوں کے بعد بھل نے دبی زبان میں اپنی آمد کا مقصد بتایا تو حافظ صاحب کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور انھوں نے بہ شدت، دو ٹوک لفظوں میں ... صاحب کے بارے میں کچھ جاننے سے انکار کر دیا۔ بھل نے انھیں قائل کرنے اور ان کا پتہ دریافت کرنے کی بہت کوشش کی اور تلخی بڑھتی گئی۔ کوئی اور ... دیکھ کے بھل نے چاقو نکال لیا اور بابر کا ہاتھ اپنے پنجے میں جکڑ کے کہنی اور ہتھیلی کے درمیان سات انچ کے قریب لکیر کھینچ کے کھال کھول دی۔ حافظ صاحب ... سفید پڑ گئے۔ بابر نے ... اپنے ہاتھ کی کلائی پر بھل نے چاقو سے بابر جیسی دھاری ڈال دی۔ دونوں کا خون چھلکتے چھلکتے بہنے لگا۔ حافظ صاحب ... لگے۔ سارا گھر جاگ گیا۔ کوئی ملازم ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر بھی ایک جیسے زخم پر بہت حیران ہوا، گڑبڑ بھی۔ اس نے وحشت زدہ انداز میں مرہم پٹی کی۔ ڈاکٹر ... کے بعد حافظ صاحب نے سب کو بیٹھک سے نکال دیا۔ گھر کے سارے افراد چلے گئے تو حافظ صاحب کی جلتی بجھتی نظریں بابر پر مرکوز ہو گئیں۔ انھوں نے ... وحشت ناک آواز میں بابر سے پوچھا "تو ... تمھی نرجس بانو کو مولوی شفیق کے پاس لائے تھے؟" نرجس بانو سے ان کی مراد کورا ہی تھی۔ بابر کی رگوں میں خون رک گیا۔

اُس وقت ڈیڑھ سے اوپر ہو چکا تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دور کہیں سے کتّے کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ صحن کی جانب بھی اندھیرا ہو گیا تھا لیکن سبھی جاگ رہے ہوں گے اور بیٹھک سے ابھرنے والی کسی آہٹ کے منتظر ہوں گے۔ اُن کا مالک چاقو بردار اجنبیوں کے ساتھ تنہا بیٹھا تھا۔ میری کلائی میں ہلکی ہلکی کسک ہونے لگی تھی۔ بھل حقہ گڑگڑاتا اور پان چباتا رہا۔

بہت دیر میں کہیں حافظ صاحب کے جسم میں جنبش ہوئی، جیسے اُنھوں نے کوئی فیصلہ کر لیا ہو اور کسی نتیجے پر پہنچ گئے ہوں۔ ایک لہر ان کے سراپا میں اُٹھی۔ اُنھوں نے سر اٹھایا اور ان کی جلتی بجھتی نظریں مجھ پر مرکوز ہو گئیں اور ان کے چہرے پر اندرونی خلفشار کی درشتی ہویدا ہوئی۔ "تو ... تو نرجس بانو کو تمھی مولوی شفیق کے پاس لائے تھے؟"

میری رگوں میں خون رک گیا۔ نرجس بانو سے ان کی مراد کورا ہی تھی۔ "جی، جی ہاں۔" میں نے اضطراری انداز میں سر ہلایا۔

"اور تمھی کو سزا ہوئی تھی، دو آدمیوں کے خون کے ... میں؟" حافظ صاحب بے ربطی سے بولے۔

میں نے اکھڑی ہوئی سانسوں سے کہا۔ "لیکن ... میں نے دانستہ تو ایسا نہیں کیا تھا۔"

"معلوم ہے، لڑکی کو بدمعاشوں کے چنگل سے بچانے کے لیے تم یہ انتہا درجے کا قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔"

حافظ صاحب کو بہت کچھ معلوم تھا۔ میں نے اپنی وحشت پر قابو پانے کی کوشش کی۔ "میں کیا کر سکتا تھا۔" میں نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ "ہمیں مولوی صاحب دریا کی سیر کرانے لے گئے تھے۔ غنڈوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ان ...

...ی تھے۔ میرا کوئی دماغ خراب نہیں ہوا تھا۔
...ل بھی ہوتا تو یہی کرتا۔ سب تسلیم کرتے تھے۔
...ے سات سال کی سزا سنادی۔"

...مولوی شفیق اس وقت موجود نہ ہوتے تو لڑکی کا کیا
...تم تو گرفتار ہو گئے تھے۔"

...ں میں ان غنڈوں کو ختم نہ کرتا تو وہ ہم پر حاوی آ
...جانے کب سے وہ ہمارا تعاقب کر رہے تھے۔ وہ
...لے مولوی صاحب کا اور میرا خون بھی کر سکتے

...میں کچھ اور کہہ رہا ہوں۔" حافظ صاحب کا انداز
...ونے لگے۔ "جو نہیں ہوا اس کی ہولناکی تصور کی
...جو کچھ پیش آیا ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے۔
...شفیق اس وقت لڑکی کے لیے فرشتۂ رحمت ثابت
...ہوئے۔ تمھارے علم میں ہوگا وہ ایک مجرّد آدمی تھے
...باقاعدہ گھر نہیں تھا گھر میں کوئی عورت نہیں تھی۔
...ان لڑکی کی ذمے داری اچانک اُن پر آن پڑی تھی
...ی کیسی چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ اس شہ
...نگاہوں سے بچائے رکھنا مولوی شفیق کے لیے کوئی
...نہیں تھا تم تو ایک مرتبہ پیر بن کے راستے سے ہٹ
...مولوی شفیق کے ساتھ تو وہ ہر دم موجود تھی۔ اس کے
...مولوی شفیق صاحب کی زندگی کا رخ ہی بدل گیا۔ وہ اسے
...بچائے پھرتے رہے نہ ان کا کاروبار رہا نہ گھر
...کی دیکھ داشت اُس کی تربیت ہی ان کا مقصود بن گئی۔
...نے نرجس بانو کے لیے سبھی کچھ ترک کر دیا۔ اسے
...جان سے زیادہ عزیز رکھا۔ اُنھوں نے لڑکی پر کوئی آنچ
...نہیں آنے دی۔"

"ظاہر ہے۔" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "ان کا
...احسان ہے۔"

"صرف احسان نہیں۔" حافظ صاحب بے چینی سے
... "میری بات توجّہ سے سنو عزیز من! تمھیں
...موت کی سزا بھی ہو سکتی تھی۔ ہو سکتی تھی نا؟"
...کی صورت دیکھا کیا مجھ سے کچھ کہا نہیں جا سکا۔
"سات سال کے بجائے تمھیں عمر قید بھی ہو سکتی تھی۔

یہ بھی ممکن تھا کہ سزا بھگتنے کے بعد تمھاری توجہ لڑکی کی طرف سے ہٹ جاتی اور تم ایک پرانی تکلیف دہ داستان سمجھ کر سب کچھ بھلا دیتے۔ اس مدت میں...."

"میں میں اُسے بھلا دیتا! آپ کہہ کیا رہے ہیں آپ؟" میں نے حافظ صاحب کو آگے کوئی بے ہودہ سوال نہیں کرنے دیا۔ "اس کے لیے میں نے گھر بھائی بہنیں ماں باپ..... اس کی وجہ سے میں نے سات سال....." میری آواز ہی نے ساتھ نہیں دیا۔

"مقصد یہ ہے برادرم!" حافظ صاحب نے گھبرائے ہوئے لہجے میں وضاحت کی۔ "کچھ بھی ممکن تھا۔ اس عرصے میں مولوی شفیق کو بھی کوئی حادثہ پیش آ سکتا تھا تمھیں بھی۔ درمیان میں ایک زمانہ ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مولوی شفیق کسی معقول جگہ نرجس بانو کی شادی کر دیتے۔ ہر لڑکی کو بہرحال ایک نہ ایک دن اپنا گھر بسانا ہوتا ہے اور اس چاند جیسی لڑکی کے لیے رشتوں کی کیا کمی تھی۔ جیل جانے کے بعد تم عملاً نرجس بانو سے دست بردار ہو گئے تھے۔ تم زنداں میں بس اس کی سلامتی کے لیے دعائیں ہی کر سکتے تھے۔ وہ تم نے ضرور کی ہوں گی۔"

"آپ، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔

حافظ صاحب نے ہاتھ اُٹھا کے مجھے تحمّل کی تلقین کی اور تندی سے بولے۔ "میں کہنا چاہتا ہوں کہ سزا ہو جانے کے بعد تمھارا اس پر کوئی اختیار نہیں رہا تھا۔ بعد میں سب کچھ مولوی شفیق ہی کو نرجس بانو کے لیے سوچنا اور کرنا تھا۔"

"انھوں نے بہت کچھ کیا۔ کوئی بھی شاید اتنا ایثار نہ کرتا۔ میں آپ کو کیا بتاؤں جیل سے آزاد ہونے کے بعد میں نے جگہ جگہ ان کی تلاش کی۔ تلاش کیا۔" "ان ساری جگہوں پر جہاں ان کے ملنے کا امکان تھا۔ وہ کہیں نہیں ملے۔ ان خدشات کا آپ ذکر کر رہے ہیں خوش قسمتی سے وہ پیش نہیں آئے یا اتفاق سے وہ سب کچھ نہیں ہوا" آپ کے بقول جن کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ سات سال کے عرصے میں ہم تینوں موجود ہیں۔ جیل سے نکلنے کے بعد میں نے مولوی صاحب کی تلاش اس لیے کی تھی کہ ان کا سہارا بن سکوں

اُنھیں باور کراسکوں کہ اب برا وقت ختم ہوگیا ہے۔ اب وہ اطمینان سے بیٹھیں، میں ان کے مصائب کی تلافی کے لیے آگیا ہوں۔ جس طرح میں نے اُنھیں تلاش کیا تھا، اُنھوں نے مجھے کیوں نہیں کیا؟ اُنھوں نے ایک دفعہ بھی پلٹ کر میری خبر نہیں لی کہ مجھ پر کیا گزری، میں کس حال میں ہوں۔ میں نے کون سا گناہ کیا تھا، ایک طرح سے تو میں نے مولوی صاحب کی جان بھی بچائی تھی۔ وہ تو چشم دید گواہ تھے۔ آپ کے کہنے کے مطابق وہ تو بہت صادق، بہت امین آدمی ہیں۔"

"اس میں کوئی شک نہیں۔" حافظ صاحب نے بہ ظاہر مشفقانہ انداز میں کہا۔ "ذرا سوچو، جس لڑکی کے لیے مولوی صاحب نے اتنا وقت برباد کیا ہے، جس کی عزت و عصمت، جس کی خوشی و خوشنودی کے لیے اُنھوں نے اپنے آپ کو بھلا دیا، اس سے اُن کی وابستگی کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ وہ اس کے لیے جو بہتر سمجھتے ہیں، اُنھیں وہی کرنا چاہیے۔ اُنھیں لڑکی کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔ وہ تمھارے گواہ دار تو نہیں تھے۔ کوئی کاغذ پتا بھی تمھارے ان کے درمیان طے نہیں ہوا تھا۔"

"کاغذ پتے کی کیا بات ہے۔" مجھ سے مزید برداشت نہیں ہو رہا تھا، میں نے برہمی سے کہا۔ "کاغذ پتا بھی ہو سکتا تھا۔ اس وقت نہیں تو بعد میں، مگر اُنھوں نے اس کا موقع ہی کہاں دیا۔ جیل جانے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میری موت ہوگئی ہے۔۔۔ اور جیل سے کسی وظیفے، روزینے کا بھی بندوبست ہو سکتا تھا۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اگر کچھ لوگ راستے کا پتھر بن جاتے ہیں تو سایہ دار لوگ بھی راستے میں ملتے ہیں۔ جیل میں مجھے ایسے مہربان مل گئے تھے جو سارا انتظام کر دیتے۔ وہ اس کی حفاظت بھی مولوی صاحب سے بہتر کر سکتے تھے مگر مولوی صاحب کو کبھی میری یاد نہیں آئی۔ اُنھوں نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ میں اس سے الگ نہیں ہوں۔ جیل آنے سے اُنھیں کوئی روکتا تو نہیں اور وہاں جا کے وہ مجرم تو نہیں بن جاتے، ناپاک تو نہیں ہو جاتے۔"

"تم نے عدالت میں لڑکی اور مولوی شفیق کے ذکر سے غالباً اجتناب کیا تھا۔ جہاں تک مجھے بتایا گیا ہے، اس رات چند ایک بدمعاش فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ایسی صورت میں مولوی صاحب کو فوراً "کھسکنے" سے ... چاہیے تھا۔"

"مگر بعد میں سہی۔" میں نے بھری ہوئی آواز ...

"ایک سال، دو سال بعد۔۔۔"

"یہ معلوم ہونے کے بعد کہ تمھیں کتنی لمبی ... ہے، ان کے جیل آنے سے کیا حاصل تھا۔ ... نہیں مل سکتی تھی۔ اس اشک شوئی سے تمھیں اور ... ہوتی۔ میں نہیں کہہ سکتا لیکن شاید پھر مولوی شفیق ... کی طرف جانا بھی نہیں ہوا۔ شروع کے دنوں میں ... کش مکش کا اندازہ کر سکتے ہو۔ پھر شاید اُنھیں روز ... گردش سے مہلت ہی نہیں ملی، یا ہو سکتا ہے بھی ... نے تم سے نہ ملنے کا کوئی فیصلہ ہی کر لیا ہو۔ ممکن ... یہ اندیشہ ہو کہ اس رات ناکام ہو جانے والے ... مسلسل تمھارے سلسلوں کی تاک میں ہوں گے۔ ... تم سے ملنے کون کون آتا ہے، تمھارا کن لوگوں ... ہے، تمھارے جیل جانے کے بعد لڑکی پھر کہاں چلی ...

حافظ صاحب کو اپنی کٹ حجتی کا کچھ احساس ... نرمی سے بولے۔ "دیکھو بھائی! مولوی شفیق شروع ... لاابالی، کسی جگہ جم کے نہ رہنے والے، کسی حد تک ... اپنے خول میں مست شخص تھے۔ ہم لوگ اُنھیں ... سمجھاتے تھے۔ نرجس بانو کے بعد میں نے اُن میں ... تبدیلیاں دیکھیں۔ پہلی بار وہ سنجیدہ اور فکر مند ... آئے۔ میں آپ کو یہی جتانے کی کوشش کر رہا ہوں ... بانو کی اُنھوں نے دل و جان سے حفاظت بلکہ خد... پرورش کی ہے۔ لڑکی نے اپنے شعور کی عمر اُن ... گزاری ہے۔ اُنھوں نے استطاعت سے زیادہ اس ... رکھا ہے، اسے علم کے زیور سے آراستہ کیا ہے، اس ... تربیت کی ہے۔ اُسے اُنھوں نے پھولوں میں رکھا ہے ...

"مگر اسے اُن سے کون چھین رہا ہے۔" میں ... آواز میں کہا۔ "میرے مل جانے سے مراد یہ کہاں ... مولوی صاحب کا باب ختم ہو گیا اور وہ اس سے ... ہو گئے۔ اس طرح وہ اُن سے دور تو نہیں ہو جائے گی۔"

حافظ صاحب مجھے گھورنے لگے اور جز بز ہو کے ...

نہیں چاہیے۔ لیکن شاید مولوی شفیق اس طرح
۔ نرجس بانو تو اُن کے لیے بچی کے مانند ہے' بیٹی
زیادہ۔ ہر باپ اپنی اولاد کے بُرے بھلے میں امتیاز کا
ہے۔ تمھارے ساتھ وہ رہی بھی کتنے دن ہے
دن' ممکن ہے' کچھ زیادہ۔ لیکن مولوی صاحب کی
کی رفاقت کو ایک جُگ ہو رہا ہے' اور یوں دیکھو تو
سے۔ بہ باطن تمھارا تعلق بھی اتنی ہی دور کا ہے
صاحب کا۔ وہ کوئی تمھاری سگی' ذات برادری
نہیں ہے۔ تمھارے اور اس کے مابین خون کا تو
نہیں ہے۔"

میرا سر گھومنے لگا تھا۔ حافظ صاحب جانے کیسی باتیں کر
۔ جی میں آتا تھا اُن کی زبان کھینچ لوں۔ دوسرا کتنی
سے فیصلہ صادر کرتا ہے۔ اُنھیں کچھ احساس نہیں
مسلسل اپنے مخاطب کی توہین کر رہے ہیں۔ وہ تو جیسے
کوئی بدلا لے رہے تھے یا مجھے آزار پہنچانے کی اُنھوں
ان لی تھی۔ جانے وہ مجھے کیا سمجھ رہے تھے۔ اس پر
اتفاق کے لیے اب مجھے دلیلیں دینے کی ضرورت
تھی۔ میں ان سے کیا کہتا کہ میرا وجود بجائے خود ایک
ہے۔ مولوی صاحب نے اتنا وقت اس کے ساتھ کہاں
ارا ہے جتنا میں نے بتایا ہے۔ میرا تو کوئی لمحہ اس کے
کے سوا نہیں گزرا۔ جیل سے باہر آ کے بھی میں نے
کی زندگی گزاری ہے۔ وہ مسلسل میرے ساتھ رہی ہے'
میں مسلسل اس کے ساتھ رہا ہوں۔ جس پر جس طرح گزرا
اسے بھی تو وقت کی پیمائش میں شمار کرنا چاہیے۔ کبھی
لمحہ ایک جُگ سے بڑا ہوتا ہے۔ کوئی کسی کے خون میں
شامل ہو جاتا ہے۔ اُنھیں کچھ علم نہیں تھا کہ آدمی' آدمی کی
آنکھوں میں روشن رہتا ہے۔ کوئی بچے میں ایسا جاگزیں
ہو جاتا ہے کہ ایک دوسرے کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ حافظ
صاحب بہت پتھر آدمی معلوم ہوتے تھے۔ اُنھیں کبھی کسی
سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ وہ پڑھے لکھے آدمی ہوں گے لیکن
لفظوں کے درمیان کا پڑھنا اُنھیں نہیں آتا تھا۔ لگتا تھا وہ
اس زاد کے سامنے بیٹھے رہے ہیں' وہ حضوری کو قربت
سمجھتے تھے۔ اُن سے شاید کبھی کوئی جُدا نہیں ہوا تھا۔ اس
...

دھوپ کا اُنھیں کوئی تجربہ نہیں تھا جو سورج کے طلوع و
غروب کی پابند نہیں ہوتی۔ اُنھیں وہ زبان ہی نہیں آتی تھی جو
صوت و صورت سے ماورا ہے۔ ایسے آدمی سے مزید بات
کرنا بے کار ہی تھا۔ میں نے شکستہ آواز میں کہا۔ "میں آپ
کو بتاؤں' مولوی صاحب اس کے لیے اچھا نہیں کر رہے۔ وہ
اس سے کیسا ہی سلوک کر لیں لیکن وہ اچھا نہیں کر رہے' وہ
کیا سمجھتے ہیں۔ اس طرح وہ خوش رہ سکے گی؟ مجھے دُور رکھ
کے وہ اسے خوش رکھ سکیں گے؟"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔" حافظ صاحب ناراضی سے
بولے۔ "تم اس کی خوشی و ناخوشی کے بارے میں کس قدر
اور کیا جانتے ہو؟"

"میں جانتا ہوں' اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"یہ تمھاری عمر بول رہی ہے۔"

"آپ کو کیا معلوم' مولوی صاحب نے اسے کس
آسرے میں زندہ رکھا ہے' جس دن اُس کی اُمید ٹوٹے گی' وہ
نہیں رہے گی۔"

حافظ صاحب سر جھٹکنے لگے اور بتّھل کی جانب دیکھتے
ہوئے برہم آواز میں بولے۔ "آپ تو میری بات سمجھ رہے
ہیں؟"

"پر آپ نہیں سمجھ رہے ہو۔" بتّھل نے بھڑک کے
کہا۔

حافظ صاحب کا چہرہ لال ہونے لگا۔ "میرے سمجھنے یا نہ
سمجھنے سے کیا ہوتا ہے جناب!" وہ بے رخی سے بولے۔ "میں
تو مولوی صاحب کے معاملات کی وضاحت کر رہا ہوں' وکالت
نہیں۔"

"آپ جو بھی انا سید حاکرو صاحب!" بتّھل نے اکڑی
ہوئی آواز میں کہا۔ "اپنے کو بولو' مولوی صاحب کو سامنے
آنے میں کیا لاج آتی ہے؟"

"جی' جی۔" پہلے تو حافظ صاحب نے سہلا کے تائید کی
پھر اُن کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ظاہر ہے'
وہ اس کی ضرورت نہیں سمجھتے یا مناسب خیال نہیں کرتے۔
میں بھی یہی کہتا ہوں' آپ مانیں یا نہ مانیں' احق بھی یہی ہے
کہ اُنھیں لڑکی کے سلسلے میں کوئی بھی قدم اٹھانے اور اچھا

برا سمجھنے کا اختیار ہے۔ زندگی دینے والا تو خدا ہے لیکن سبب بھی وہی پیدا کرتا ہے۔ مولوی صاحب کی ذات نرجس بانو کے لیے ہی زندگی کا سبب بنی ہے۔"

"ساری تو بکاری گھما پھیری چھوڑو صاحب! ہم آپ کو زیادہ نہیں بولتے۔ ہم لڑکی کا دھیان چھوڑ دیں گے اگر لڑکی منع بول دے۔ ہمارے سامنے نہیں تو اپنے کو آپ پر بھروسا ہے' آپ لڑکی سے خود پوچھو' وہ مولوی صاحب کے پاس رہنے کو چاہتی ہے یا اپنے لاڈلے کے پاس یا دونوں کے؟"

حافظ صاحب کوئی جواب نہیں دے سکے اور داڑھی کے بال نوچنے لگے پھر لمحوں کے تذبذب کے بعد بولے۔

"میں سمجھتا ہوں' یہ ایک معقول بات ہے۔"

"اپنے کو اس گھن چکر سے نکالو صاحب! ہم آپ کو زبان دیتے ہیں' ہم ایسے ہی لوٹ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" حافظ صاحب نے گہری سانس لی۔ "ایسا ممکن ہے' بشرطیکہ مولوی شفیق صاحب اس طرف آجائیں۔"

"ہم آپ سے اب نہیں پوچھیں گے کہ ابھی وہ کدھری ہیں' سارا ہم آپ پہ چھوڑتے ہیں۔ آپ خدا والے آدمی ہو۔"

"میں کیا' میری بساط کیا۔" حافظ صاحب کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "میں اس کا نہایت عاجز بندہ ہوں' خدا مجھے معاف کرے۔ آپ مجھ پر بڑی ذمے داری ڈال رہے ہیں۔ فرض کیجیے' بابر میاں سے نرجس بانو کی ذہنی و قلبی وابستگی کا کوئی شبہ ہی مولوی صاحب کے اجتناب کا باعث ہو اور وہ اپنی دانست میں نرجس بانو کا یہ فعل' یہ اقدام' نادانی' نا سمجھی پر محمول کرتے ہوں' اور قلب ماہیت کی توقع رکھتے ہوں' کیوں کہ وقت بڑے بڑے زخم مندمل کر دیتا ہے۔ کسی نہ کسی دن نرجس بانو کی آس پر اوس پڑ جائے گی۔ اس صورت حال میں آپ ہی فرمائیے' وہ مجھے کیا' کسی کو بھی لڑکی کا عندیہ جاننے کا موقع نہیں دیں گے اور اگر انھوں نے یہ موقع فراہم بھی کر دیا یا میں اپنے طور پر نرجس بانو سے سلسلہ جنبانی میں کام یاب بھی ہو گیا اور اس کی جانب سے واقعی مجھے کوئی ایسا اشارہ بھی مل گیا جس کی بابت آپ یقین کا اظہار کر رہے ہیں تو اس طرح نرجس بانو سے مولوی شفیق کی دست
مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب یہ کہاں ہو
نرجس بانو سے بری الذمہ ہو جائیں گے یا میں انھیں
پاؤں گا۔ نتیجہ تو وہی رہا۔ سمجھ رہے ہیں آپ؟ مولوی
ایک ضدی شخص ہیں۔ پھر میں آپ سے کیا کہہ سکوں
آپ کے لیے کیا کر سکوں گا؟"

"آپ پھر الگ ہو جانا' ہم اُن کو دیکھ لیں گے۔
کے آپ کو اُن کے ٹھکانے کے بارے میں بولنے میں
اپا رجی نہیں ہوگی' ایسا بل نہیں کھاؤ گے آپ۔ پھر آپ
سے بول دینا چاہیے صاحب!"

"میرے لیے پھر بھی یہ ایک مشکل مرحلہ ہوگا۔"

"سمجھتے ہیں صاحب! بہت کٹھن ہوگا' پر آپ ایک
تھوڑا دبا کے دو آدمی کو بچاؤ گے' ایک لڑکی کو' دو
لاڈلے کو۔ ہم آپ کو بولتے ہیں' لڑکی بھی ایسے زیادہ
تک نہیں کھنچے گی' اور یہ شکرا بھی' آپ اس کو دیکھ ر
نا! اس کے پر کٹے ہوئے ہیں۔ ایک دم آدھا ہے۔ یہ
بھی نہیں رہے گا جس دن۔ جس دن..." مشکل کی
بھاری ہونے لگی۔ ایک لمحے ٹھہر کے اس نے کہا۔ "او
کیا بولیں آپ کو' کڑی سے کڑی مل کے بڑا تڑپا ہوا
بیچ میں ایک دو نہیں' بہت لوگ' بہت گھر تلپٹ ہوئے
اور جیل' کوئلے کی کان نہیں ہوتی صاحب کہ ہر کوئی اُدھر
سے کالا ہی ہو کے نکلے۔ اُدھری اس نے اوپر کے درجے
پڑھائی کی ہے۔"

"اچھا۔" حافظ صاحب کی آنکھوں میں حیرت
آئی۔ "میں یہی سوچ رہا تھا بلکہ پوچھنے والا ہی تھا' گفتگو
سے اندازہ ہو رہا تھا۔ کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے میاں
آپ نے؟"

میں نے جھجکتے ہوئے بتایا کہ میں نے ایم اے کیا ہے۔

"خوب' خوب' ماشاءاللہ۔ یہ تو آپ نے کمال کر دیا۔
یقین نہیں آتا۔ سچ ہے' علم کے حصول کی خواہش ہو تو
کھلتے جاتے ہیں۔"

"اُدھری جیل سے چھوٹ کے اس کو اپنے اڈے پ
چاہیے تھا' پر یہ کسی کو بولے بنا سیدھا مولوی صاحب

پاس تو بہت بعد میں کوٹا۔" بسمل نے
بتایا کہ سمتوں سمتوں بے شمار بستیوں کی
آخر جیسلمیر شہر میں ہم نے وہ محلہ اور وہ
مولوی صاحب نے کچھ عرصے قبل قیام
صاحب وہاں سے جا چکے تھے۔ بسمل نے
صاحب کے پڑوسی منیر علی اور رانا ماہ تاب
کی اور کہا کہ بہت دنوں بعد ہمیں مراد
کے روز نامچے سے معلوم ہوا کہ مولوی
کے خانے میں حیدر آباد دکن کا پتہ لکھوایا
آباد کا رخ کیا مگر مولوی صاحب وہاں سے
نکل چکے تھے۔ اب بھی ہم حیدر آباد سے

آباد سے آ رہے ہیں؟" حافظ صاحب بوکھلا

بہ شدومد ایک بار پھر اپنے عزم کی تجدید کی کہ
مولوی صاحب کے گریبان پر جا کے ختم ہوتی
حافظ صاحب کو بتایا کہ حیدر آباد میں مولوی
ثروت یار کے ہاں مہمان ہوئے تھے۔ ہماری
نواب نے وعدہ کیا تھا کہ جیسے ہی حیدر آباد میں
کی واپسی ہوئی، وہ ہمیں خط کے ذریعے مطلع
مولوی صاحب کے حیدر آباد آنے پر اپنا وعدہ
لفظوں میں ہمیں خط لکھنے سے پہلے اس نے
مولوی صاحب کے سامنے ہمارا ذکر چھیڑ
ہمارے بارے میں مولوی صاحب کی رائے
وہ ہم سے کیے ہوئے وعدے کی تکمیل کو
ہم نے مولوی صاحب کو جالیا ہوتا۔ نواب کے
زبانی ہماری آمد کا احوال سن کے مولوی صاحب
اور دوسرے دن کسی کو مطلع کیے بغیر وہاں سے
ان کے یوں چلے جانے سے نواب بہت دل برداشتہ
دن پہلے اس کی والدہ نے مولوی صاحب سے کورا
کی ہو جانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ نواب کو
کہ ورنہ خاندانی ربط و ارتباط کے پس منظر میں
کا انکار کا حوصلہ مولوی صاحب کو نہیں ہوا اسی

لیے انھوں نے چپ چاپ نواب کے گھر سے چلے جانا مناسب سمجھا۔ نواب کو دوبارہ مولوی صاحب کی حیدر آباد آمد کا یقین نہیں تھا مگر اس کی توقع کے خلاف اور اس کی آرزو کے عین مطابق مولوی صاحب دوبارہ حیدر آباد پہنچ گئے' اس بار نواب نے ایفائے وعدہ کیا اور ہمیں خط لکھ کے ہمیں حیدر آباد میں مولوی صاحب کی موجودگی کی اطلاع سے شاد کام کیا۔

"یعنی' یعنی نواب ثروت نے بذاتِ خود آپ کو حیدر آباد آنے کی دعوت دی؟" حافظ صاحب مضطرب لہجے میں بولے۔

بسمل نے اقرار میں سر جھکا لیا اور نواب ثروت کے ہاں پیش آنے والے واقعات خاصی تفصیل سے بیان کیے۔ حافظ صاحب مبہوت ہو کے سنتے رہے۔ ان کی پلکیں ساکت ہو گئی تھیں۔ جب بسمل نے نواب کی موت کی خبر سنائی تو ان کی حالت اور غیر ہو گئی۔ "کیا' کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ نواب ثروت کا انتقال ہو گیا؟"

جواب میں بسمل سرد آہ ہی بھر سکتا تھا۔ "اور' اور مولوی شفیق۔۔۔؟"

بسمل نے انھیں بتایا کہ نواب ثروت کے ایک رازدار خدمت گار کو اپنے آقا کے انتقال سے ایک روز پہلے خیال آیا کہ آقا کے حادثے اور جاں بہ لبی کی کیفیت کی اطلاع مولوی صاحب کے گوش گزار بھی کرنی چاہیے' اسی کو مولوی صاحب کا گھر معلوم تھا۔ خدمت گار کے رخصت ہوتے ہی مولوی صاحب نے رختِ سفر باندھ لیا۔ انھوں نے اپنے محسن نواب ثروت کی عیادت کرنے میں بھی وقت ضائع نہیں کیا۔ دوسرے دن رات کو ہم ان کے گھر پہنچے تو ایک روز پہلے وہ وہاں سے جا چکے تھے۔

"جا چکے تھے! کہاں کہاں؟" حافظ صاحب بدحواسی سے بولے۔

"یہی جاننے کے لیے ہم ادھر آئے ہیں۔"

"مگر وہ یہاں تو نہیں آئے۔"

"آئے نہیں تو آ جائیں گے صاحب!"

ایک عالمِ ہیجان کے بعد حافظ صاحب کے دست و بازو کر

سے گئے۔ وہ تو بُت بن گئے تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر بسمل کی جزئیات بیانی کی وجہ اب کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ کچھ دیر بسمل حقے سے شغل کرتا رہا پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "ہم تو ہاتھ پاؤں مار ہی رہے ہیں۔ گھیرا گھٹ رہا ہے' کسی دن پٹی بھی کھل جائے گی۔ اب نہیں تو آگے' سال بھر میں' اور زیادہ بھی' ایک دن کسی کونے میں تو مولوی صاحب کو ہاتھ لگنا ہی ہے۔ پھر کیا ہو گا صاحب؟"

"وہ یہاں آئے تو میں ان سے بات کروں گا۔ آپ اطمینان رکھیے' میں ضرور اُن سے بات کروں گا۔" حافظ صاحب کی زبان بہک رہی تھی۔ "بے شک وہ بیس پچیس روز پہلے یہاں آئے تھے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ وہ مجھے بھی حیدر آباد ہی کا بتا کے گئے تھے اور یہ بھی کہتے تھے کہ حیدر آباد میں مستقل سکونت کے لیے نواب ثروت یار نے بہت اصرار کیا ہے' ہر طرح کی اعانت کا یقین دلایا ہے۔ گومگو کی حالت تھی۔ کہتے تھے کہ حیدر آباد جا کے صورتِ حال کا جائزہ لیں گے اور جیسا کچھ بھی ہوا' بذریعۂ خط مجھے آگاہ کریں گے۔ ابھی تک اُن کا کوئی خط نہیں آیا ہے۔ اُنھوں نے نواب ثروت یار کے بارے میں بہت کچھ بتایا لیکن نرجس بانو سے نواب کی دل چسپی کی بات مجھ سے مخفی رکھی۔ اس کا سبب غالباً" یہی ہو گا کہ میں نے بھی ایک مرتبہ اشارۃً اپنے بیٹے عبدالحمید کے لیے اُن سے بات کی تھی۔ ابھی ابھی جس بچے کو آپ نے دیکھا ہے' جو یہاں بیٹھا ہوا تھا' اسی کے لیے۔ ہمارے ہاں عموماً" اپنی برادری میں شادیاں ہوتی ہیں لیکن مولوی صاحب کی پریشانی دیکھ کے میں نے زبان کھولی تھی۔ دوسرے' سچی بات یہ ہے کہ نرجس بانو مجھے پسند بھی بہت ہے۔ کون اُسے اپنے گھر کی زینت بنانا نہیں چاہے گا۔ مولوی صاحب نے انکار کیا نہ اقرار' چپ ہو گئے پھر کچھ سوچ کے بولے۔ "دیکھو حافظ! دوبارہ مت کہنا۔ جب کوئی صورت بنی تو میں خود تمھیں اشارہ کروں گا۔ اگر تمھیں عبدالحمید کی شادی کی بہت جلدی ہے تو انتظار بھی مت کرنا' جہاں موزوں رشتہ ملے' بسم اللہ کر دینا۔ صورت بنے اور سازگار حالات کی بات میری فہم سے بالاتر تھی۔ میرے ان کے درمیان کسی قسم کا تکلف نہیں ہے۔ عبدالحمید اُن کے لیے اولاد کے مانند ہے۔ میں کوئی سوال کر کے انھیں کش مکش میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ کئی بار میں نے ترغیب دی' مجھلے ماموں آپ کب تک خانہ بدوشی میں گزارو گے۔ اس دربدری کی ضرورت کیا ہے۔ میرا تمھارا معاملہ غیروں کا نہیں۔ نگریا سادات شریفوں کی بستی ہے' بہت پُر سکون ہے۔ پہلو میں ریاست رام پور ہے۔ بیس میل پرے تمھارا مراد آباد ہے۔ نینی تال اور بھی نزدیک ہیں۔ دلّی بھی ایسی دور نہیں۔ یہاں رہو' زمینوں کا کام سنبھالو' اللہ برکت دے گا۔ مولوی صاحب ہر بار پورے غور و خوض سے مشورے سنے' تائید بھی کی لیکن عمل نہیں کیا۔ ہفتوں' مہینوں یہاں قیام کیا۔ یہاں سب کی بے حد عزت کرتے ہیں۔ بچے چھوٹے ابا کہہ کر پکارتے ہیں۔ بڑے القاب و آداب سے مخاطب ہوتے ہیں۔ ایک بار تو عرصے تک رہے' زمینوں پر میرے ساتھ ذوق و شوق سے جانے لگے لیکن پھر دل اکھڑ گیا۔ مجھے ان کی مالی حالت کا علم ہے۔ مجھے کہنا نہیں چاہیے' محض عرضِ حال مراد ہے۔ متعدد دفعہ اُنھوں نے کھل کے کہہ بھی دیا۔ اُنھیں کہنا ہی چاہیے تھا۔ خدا گواہ ہے' میں نے حکم کی تعمیل کی۔ ایک مرتبہ جیسلمیر سے بھی پریشانی کا خط لکھا تھا۔ مجھے معلوم ہے اُنھوں نے اپنا سب کچھ بیچ دیا ہے۔ شاید اب کچھ بھی نہیں بچا۔ شروع شروع میں تو اُنھیں بہت ٹوکتا تھا۔ بعد میں اس خیال سے یہ پند و نصائح کم کر دیے کہ کہیں ناگوارِ خاطر ہو جائے۔ تنگی میں آدمی اور حساس ہو جاتا ہے۔ ایک ایک دن لازماً" انھیں اپنی روش بدلنی پڑے گی لیکن میرا اندازہ اب تک غلط ہی ثابت ہوا ہے۔ جانے کس اُدھیڑ بُن میں ہیں۔ پہلے تبت کے لوگوں کی طرف سے فکرمند تھے۔ اسی لیے ابتدا ہی سے نرجس بانو کو برقع پہنا دیا تھا۔ برقعے میں وہ خاصی محفوظ ہو گئی تھی۔ اب تو بہت وقت گزر گیا۔ تبت میں لڑکی کے قبیلے کے لوگ کب کے نا امید ہو چکے ہوں گے۔ اب اس جانب سے بھی بظاہر اُنھیں کوئی ایسی فکر لاحق نہیں ہونی چاہیے۔ گزشتہ مرتبہ اُنھوں نے کسی ایسے اندیشے کا ذکر بھی نہیں کیا۔"

"آپ کی مرضی ہو تو کچھ بولیں صاحب؟" حافظ صاحب کے چپ ہوتے ہی بسمل نے کہا۔

"ضرور، کیا بات ہے؟" حافظ صاحب چونک

...ہو کچھ دھن دولت انھوں نے کھویا ہے، جو
...ہم اس کا دس گنا، بیس گنا یا جتنا وہ بولیں، ان کو
...سا نہیں تو ہم پہلے بھی دینے کو تیار ہیں۔ ہم آپ
...کو دیتے ہیں۔"

...جی۔" حافظ صاحب کی زبان لکنت کرنے لگی۔
...ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"
...نے ہاتھ اٹھا کے انھیں مزید کچھ کہنے سے روک
...لڑکی کا سودا مت سمجھو صاحب! اپنے کو پتہ ہے،
...کی بولی نہیں لگائی ہے۔ اپنا مطلب ہے، ہم کسی
...نہیں ہیں۔"
...ابھی کچھ عرض کروں۔" حافظ صاحب سنجیدہ لہجے
..."مولوی شفیق کو پیسے سے کبھی کوئی رغبت نہیں
...ان کے پاس بہت کچھ ہوتا، کیا نہیں تھا۔ خاندانی
...چاہتے تو دس کاروبار کر سکتے تھے مگر مزاج ہی
...فقیرانہ ہے۔"
...آپ اُن سے بات کر کے دیکھ لو، ہم پہلے آپ کو بول
...لڑکی ان سے الگ نہیں ہو جائے گی۔ بٹیا اپنے گھر
...کے ماں باپ سے دور نہیں ہو جاتی۔ ہم نے آپ کو بھی
...سارا لڑکی پر ہے۔ وہ منع بول دے گی تو ہم لوٹ
...دیکھیں گے۔ روپیہ پیسہ بھی واپس نہیں لیں گے،
...اپنی طرف سے لڑکی کو کچھ دینا ہے، یہی جان لینا۔"
...کہتے ہوئے بسمل نے خاص دان سے گلوری اٹھائی
...حافظ صاحب سے سواری کا انتظام کرنے کو کہا۔
..."جی جناب!" حافظ صاحب بے قرار ہو گئے۔ "جا رہے
...آپ؟"

..."ہاں بولنے کو اور کچھ نہیں ہے۔" بسمل نے بجھی
...آواز میں کہا۔ "اپنا پتہ رکھ لو، کبھی دل نے ساتھ دیا تو
...آئے گا اور کبھی من کرے تو اُدھری بمبئی کا چکر بھی لگانا
...آنکھوں دیکھا، کانوں سنے سے اچھا بھی ہوتا ہے نا؟"

...حافظ صاحب سے ممنونیت کے چند رسمی الفاظ۔ مشکل



ادا ہوئے، انکسار سے بولے۔ "کیا عرض کروں، کچھ منہ نہیں پڑتا۔ سچ تو یہ ہے، اب جی نہیں چاہتا کہ آپ ایسے چلے جائیں، بہرحال خاطر جمع رکھیے، مولوی صاحب یہاں نہ آئے، کسی جگہ سے اُن کا خط آیا تو میں انھیں بلا لوں گا یا خود اُن کے پاس چلا جاؤں گا۔"

"بہت ٹائم لے لیا آپ کا صاحب! پوری رات کالی کر دی۔ دیکھو ابھی اِدھری آئے تو ساتھ نکل چلیں گے۔ بولتے ہیں، اُدھری رام نگر کے پاس شکار خود شکاری کے پاس آتا ہے۔"

"وہاں کی کیا بات ہے۔ وہ علاقہ تو شکاریوں کا مرکز ہے۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گا جناب! وہاں کے گھوڑ بگھاٹ کا افسر اچھا واقف کار ہے، بہت خیال کرتا ہے۔"

بسمل نے گھڑی کی طرف نظر کی تو حافظ صاحب فوراً اٹھ گئے، اور انھوں نے صحن کی جانب رُخ کر کے صدا لگائی۔ میرا اندازہ صحیح نکلا، ملازم جاگ رہے تھے۔ حافظ صاحب کو باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑی، پہلی صدا پر تیز قدموں سے ایک آدمی اندر آ گیا۔ حافظ صاحب نے اسے گھوڑا گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔

"یہیں نہ ایک ایک فنجان قہوہ اور ہو جائے، اتنی دیر میں گاڑی تیار ہوتی ہے، کچھ گلوریاں بھی ساتھ لیتے جائیے۔" حافظ صاحب نے تکلف آمیز لہجے میں کہا۔

گھر کے لوگوں کو جگانے کا یہ کوئی وقت نہیں تھا' اچھا ہوا کہ بابل نے منع کر دیا۔ حافظ صاحب کی ہدایت پر ملازم اندر سے کاغذ قلم لے آیا۔ مراد آباد آنے سے اب تک بے شمار لوگوں کو ہم اپنا پتہ دے چکے تھے۔ میں نے روانی سے ابا جان کا پتہ لکھ کے کاغذ حافظ صاحب کے حوالے کر دیا۔

جب تک ملازم نے گھوڑا گاڑی تیار ہو جانے کی اطلاع نہیں دی' بابل دم توڑتا ہوا حقہ نچوڑتا رہا۔ ریل گاڑی کی روانگی میں ابھی وقت تھا۔ حافظ صاحب کچھ دیر اور ٹھہر جانے کے لیے اصرار کر رہے تھے مگر بابل مونڈھے سے اٹھ گیا۔ بیٹھک کے دروازے سے مجھے ملازموں کے ساتھ حافظ صاحب کے بھائی عبدالمتین اور بیٹا عبدالحمید بھی باہر کھڑے نظر آئے۔ سبھی مستعد تھے۔

دروازے سے باہر نکلتے نکلتے بابل ٹھہر گیا اور حافظ صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے معنی خیز لہجے میں بولا۔ "اب تک سوانگ چلے گا۔ کبھی ٹائم ملے تو دھیان دینا صاحب! مولوی صاحب کا بس کتنا ہے۔ کسی ایک جگہ پاؤں نہ ٹکانے کی وجہ لڑکی کی کہانیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ لگام کس کے ہاتھ میں ہے اور رستے کون دکھا رہا ہے؟"

حافظ صاحب کوئی جواب نہ دے سکے تھے کہ بابل نے ان سے کہا۔ "ادھری تہت کے پاگل' ادھری ہم جنگلی لوگ' پھر لڑکی کی ناک میں پھیری لگانے والے اٹھائی گیرے' حرام کے جنے' پر اس سے آگے بھی تو کوئی بات ہو سکتی ہے۔ لڑکی کو بھی کوئی جواب دینا ہو تا ہے۔ مولوی صاحب کو' سامنے مٹی کی مورتی نہیں ہے۔ آگے کا فیصلہ ایک ابھی کو نہیں کرنا' اپنے لاڈلے کی طرح ادھری وہ بھی بہت بڑکتی ہو گی۔"

حافظ صاحب گم سم کھڑے تھے۔ بابل بیٹھک کا چبوترا پھلانگ کے گلی میں آ گیا۔

اسٹیشن پر گنتی کے چند مسافر تھے۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ گاڑی کے انتظار میں ڈیڑھ گھنٹے تک ہم پلیٹ فارم کی بنچ پر بیٹھے رہے۔

صبح ٹھیک چھ بجے گاڑی مراد آباد پہنچ گئی۔ جمو اور زورا کی بے کلی سے ایسا لگتا تھا' جیسے ہمیں ان سے بچھڑے زمانہ گزر گیا ہو۔ بچوں کی طرح اچھلنے کودنے لگے اور بابل سے بولا۔ "اب کے اپنے کو بھی ساتھ لے جانا استاد! یہاں پڑے پڑے سالے ہاتھ پاؤں اکڑ جائیں گے۔"

"اب چھٹی ہو گئی رے سب کی۔" بابل نے ... ہوئی آواز میں اسے مژدہ سنایا۔ کرتے کی آستینوں ... اور بابل کی کلائیاں چھپ گئی تھیں لیکن زورا ... نظروں سے تادیر نہ چھپا رہا سکا۔ میرا تو کچھ نہیں ... استاد کی کلائی پر پٹی دیکھ کر انھیں متجسس ہو ہی جانا تھا۔ وہ طرح طرح کے سوال کرنے لگے۔ "کچھ نہیں ... ایسے ہی چاقو کی دھار دیکھ رہے تھے۔" اس جواب ... کی تسلی نہیں ہوئی مگر بابل کی تیوری چڑھی ہوئی ... دونوں کو چپ ہو جانا پڑا۔

... سب نے ساتھ ہی ناشتہ کیا۔ گھنٹے بھر کے قریب ... خانے میں ٹھہر کے بابل شہر کی جانب چل پڑا۔ ابھی ... تھے۔ تاجر محمد یونس اور مولوی صاحب کے دو ایک ... شناساؤں کو دیکھ لینا کافی تھا۔ ہماری عدم موجودگی کے ... مولوی صاحب نے مراد آباد کا رخ کیا ہو تا تو ان لوگوں ... ضرور ملے ہوتے۔

جمو اور زورا نے ٹکٹ پہلے سے خرید رکھے تھے۔ ... گیارہ بجے ہم ہاوڑا ایکس پریس میں بیٹھ گئے۔ مسافر خانے کے منیجر عبدالباسط کا عجب حال تھا' آنکھیں بھری ہوئی ... تھمایا ہوا۔ بار بار مجھے اور بابل کو' زورا اور جمو کو گلے لگاتا۔ گاڑی حرکت میں آنے تک وہ ڈبے سے نہیں اترا۔

گاڑی پھر اس سمت جا رہی تھی جہاں سے صبح ہماری واپسی ہوئی تھی۔ آدھ گھنٹے میں رام پور شہر آ گیا' پھر آدھ گھنٹے سے کم وقت میں گزر گیا سادات۔ ڈبے میں ہمارے سوا کوئی مسافر نہیں تھا۔ جمو اور زورا مسلسل چہک رہے تھے۔ پورے دو ہفتے بعد انھیں مسافر خانے کے زندان سے نجات ملی تھی۔ سلطی بھی پھول کی طرح کھلی ہوئی تھی۔ رخساروں کا گلابی رنگ جیسے چھلک چھلک جائے۔ لگتا تھا' زورا اور جمو بس ایک ہی کام کرتے رہے ہیں' اسے دھوپ' دھول اور دھوئیں سے بچائے رکھنا۔ جنگلوں' موسم اور غذاؤں سے ایسا

آدمی ہی آدمی کے لیے بہار اور خزاں ہوتے
صحرا' آدمی ہی گلستان۔ عبدالباسط دو دن کے
تال بھی لے گیا تھا۔ کل ہی شام وہ واپس
اور کہتا تھا' کسی کا وہاں سے آنے کو جی نہیں
کسی وقت بھی انھیں ہماری مراد آباد واپسی کا
تھا۔ وہ نینی تال کے نظاروں کا احوال لہک لہک
بھل بھی دل جمعی سے سنتا رہا۔

گاڑی بریلی پہنچ گئی۔ دوپہر کے کھانے کا وقت
کرنے کے باوجود عبدالباسط نے بہت سا سامان
تھا۔ صبح نو بجے مسافر خانے آکے ہی اُسے میری
آمد کا علم ہوا تھا۔ دو گھنٹے بعد ہماری روانگی تھی۔
کھانے پینے کا انتظام کرنا ممکن نہیں تھا' اس نے
کے باورچی صدیق سے جلدی جلدی مرچ قیمہ۔
پراٹھے' دلی طرز کی کچوریاں' انڈے کا حلوہ اور
ٹوکری بھری ہوئی تھی۔ عبدالباسط کو گھر سے کچھ
وقت مل جاتا تو شاید سارا باورچی خانہ ساتھ کر دیتا۔
نے عجلت میں نہایت لذیذ قیمہ تیار کیا تھا۔ سب نے
کھایا۔

کے سامنے میں نے اظہار نہیں کیا لیکن میری کلائی
ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ بریلی گزر جانے کے بعد میں
برتھ پر آکے لیٹ گیا اور آنکھیں بند کرنے کی کوشش
لیٹتے ہی درد سارے جسم میں پھیل گیا۔ دیر تک کروٹیں
رہا۔ درد ناقابلِ برداشت ہو گیا تو میں نے پٹی کھول دی۔
کے اردگرد سوجن ہو گئی تھی۔ مرہم لگانے کے بعد بھی
خون رستا رہا تھا۔ ڈاکٹر پنت کی گولیاں جیب میں پڑی
چار قسم کی گولیاں تھیں۔ زورا کو آواز دے کر میں نے
منگا اور وقفے وقفے سے چاروں گولیاں نگل لیں۔ ڈاکٹر
نسخہ بھی لکھا تھا مگر مراد آباد میں دوائیں خریدنے کا خیال
نہیں رہا۔ زورا سے پانی مانگنا غضب ہو گیا۔ گلاس واپس
وقت اس کی نظر میری کلائی پر پڑ گئی اور وہ غل مچانے لگا۔
اور سلمیٰ بھی بے قرار ہو گئے۔ مرہم اور خون میں سنی
کلائی کچھ اور وحشت خیز ہو گئی تھی۔ سلمیٰ کی تو چیخ نکل
گئی۔ انھوں نے مجھے نیچے اُترنے پر مجبور کر دیا۔ جمو نے پرانی
پٹی سے کلائی صاف کی۔ سلمیٰ نے سامان سے کپڑا نکال کے نئی
پٹی تیار کی۔ خون اب نہیں بہہ رہا تھا مگر انھوں نے ریشمی کپڑا
جلا کے زخم پر راکھ چھڑکنے کا ٹوٹکا آزمایا۔ مسافر خانے میں
وقت گزاری کے لیے سلمیٰ اپنے لیے جوڑے سیتی رہی تھی۔
اس کے پاس قینچی بھی تھی۔ ان تینوں نے از سرِ نو میری کلائی
پر پٹی باندھ دی۔ بھل اپنی جگہ سے نہیں اٹھا۔ جمو اور زورا
نے پہلی ہی نظر میں زخم کی نوعیت بھانپ لی ہوگی۔ زخموں کی
ویسے بھی انھیں اچھی پہچان تھی۔ چاقو کی لبی مشتواں لکیر نے
کسی جگہ ہلکی نہ گہری' زخم جیسے تراشا گیا ہو۔ ایسی ہی ایک پٹی
بھل کی کلائی پر بندھی تھی۔ یہ یکسانی جمو اور زورا کے لیے
کسی پہیلی سے کم نہ ہوگی۔ سلمیٰ کی وجہ سے وہ زیادہ کھل
نہیں سکتے تھے۔ ادھر بھل نے انھیں پہلے ہی جھڑک دیا تھا۔
انھیں اپنے اضطراب کا اظہار موخر کرنے میں بہت مشکل ہو
رہی ہوگی۔ ڈاکٹر پنت کی گولیوں کا اثر تھا یا زخم کی صفائی اور
نئی پٹی کا کرشمہ' رفتہ رفتہ جلن کم ہوتی گئی۔ گولیوں میں الجھا
کوئی کوئی خواب آور بھی تھی۔ کچھ ہی دیر میں سر بھاری
ہونے لگا۔ میں دوبارہ اوپر کی برتھ پر چلا آیا۔ پھر کون کون سے
اسٹیشن آئے' کہاں کہاں گاڑی ٹھہری' مجھے کچھ خبر ہی نہیں
رہی۔ سورج تقریباً غروب ہو چکا تھا جب انھوں نے مجھے
جگایا اور بتایا کہ لکھنؤ شہر آ گیا ہے۔
اودھ ایکسپریس فیض آباد نہیں جاتی تھی۔ جمو کو فیض
آباد جانے والی گاڑیوں کا علم تھا۔ فیض آباد تو خیر اس کا آبائی
شہر تھا' لکھنؤ کے گلی کوچوں سے بھی اس کی واقفیت کم نہیں



تھی۔ بنجل کے دوست لکھنؤ کے دادا کبن خاں مرحوم سے اس کے اور بڑے بھائی جامو کے خاص مراسم تھے۔ کبن خاں کی موت بھی ہماری، بلکہ میری وجہ سے ہوئی تھی۔ نہ ہم ابّا جان کی تلاش میں تبت کا رخ کرتے، نہ بنجل کو اڈا سنبھالنے کے لیے اسے کلکتے بلانا پڑتا۔ بنجل کی موجودگی میں کلکتے کے اڈے پر قبضہ جمانے کا سودا رتنا کے دماغ میں کبھی نہیں سما سکتا تھا۔ زیادہ دنوں کی بات نہیں تھی۔ لکھنؤ شہر آکے بنجل کو کبن خاں بہت ستا رہا ہوگا۔ مجھے یاد تھا، ایک روز رات کو وہ فیض آباد کے اڈے پر گرجتا برستا آیا تھا کہ جامو کے چھوٹے بھائی جمو نے روشن نامی طوائف لکھنؤ سے اغوا کرلی ہے۔ زرّیں کی حویلی اس کی خالہ کے ناجائز قبضے سے واگزار کرانے کے لیے بنجل نے کبن خاں ہی کو خط لکھا تھا۔ رتنا نے شب خون مارا تھا ورنہ کبن خاں اس آسانی سے پسپا ہونے والا نہیں تھا۔

اسٹیشن سے باہر آکے ہم تانگے میں سوار ہوگئے۔ رات کے وقت لکھنؤ کی رونق ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ آسمان صاف تھا۔ ہوا میں گرمی کی ہلکی ہلکی آمیزش تھی۔ قمقمے روشن ہو گئے تھے اور سڑکوں پر خوب چہل پہل تھی۔ حضرت گنج کا علاقہ تو دیکھنے کی چیز ہے۔ جمو ہمیں جدید طرز سے آراستہ ایک چمکتے دمکتے ہوٹل میں لے آیا۔ پردہ نشین خواتین کے ساتھ بیٹھنے کے لیے ہوٹل میں کیبن بھی بنے ہوئے تھے۔ بنجل اور سلمٰی کو وہاں بٹھا کے جمو اور ذورا فوراً" باہر آگئے۔ میں انھیں مسلسل یقین دلاتا رہا کہ اب مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے، وہ نہیں مانے اور ہوٹل سے کچھ فاصلے پر ڈاکٹر سری واستو کے مطب میں آکے ہی انھوں نے دم لیا۔ مطب میں مریضوں کی بھیڑ تھی مگر جانے جمو نے کیا جادو پر کیسا جادو کیا کہ ڈاکٹر کے روبرو ہونے میں ہمیں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ کوئی ایسی تشویش کی بات نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے سوئی لگا کے اور نئی پٹی باندھ کے ہمیں جلد ہی رخصت کردیا۔ گویا سلوات کے ڈاکٹر پنت کے نسخے میں اس نے بس ایک دوا کا اضافہ کیا۔ ڈاکٹر کے تجسس پر جمو مجھ سے پہلے بول پڑا۔ وہ شیشے اور ٹین لگ جانے ہی کا کوئی عذر کرسکتا تھا۔ ڈاکٹر کو اس نے مطمئن کردیا لیکن مطب سے نکلتے ہی اس نے اور ذورا نے مجھے ٹہوکے مار... کردیے۔ میں انھیں کیا بتاتا لیکن ادھر ادھر کے ... ان کی تشفی نہ ہوتی۔ میں نے مختصراً" اصل بات ... دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ انھوں ... مزید حجت بھی نہیں کی کیوں کہ مجھ پر انھیں اپنے ... زیادہ اعتبار تھا۔

آدھ گھنٹے کے اندر اندر ہم ہوٹل واپس پہنچ گئے... کو بھوک نہیں تھی لیکن یوں کرسیاں توڑ کے ہوٹل ... جانا وضع کے خلاف تھا۔ بیرے سے صرف چائے ... گیا تھا۔ وہ کیک، پیسٹریاں، نمکین بسکٹ اور سموسے ... لایا۔ چائے ختم کرتے ہی ہم باہر نکل آئے۔

جمو کی معلومات کے مطابق ساڑھے دس بجے ... قریب کوئی گاڑی فیض آباد کی طرف جاتی تھی۔ جمو کی ... تھی کہ کیوں نہ رات لکھنؤ میں گزار کے صبح نو بجے کی ... سے سوار ہوا جائے۔ رات کی گاڑی سے فیض آباد ... ڈھائی تین بج سکتے ہیں۔ اس وقت حویلی کے مکینوں ... آرام کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ بنجل تذبذب میں پڑ ... رات کسی ہوٹل میں گزارنی پڑتی۔ مراد آباد کے مسافر ... کی بات اور تھی۔ ہوٹل کے کمرے میں اکیلی سلمٰی ... اچھا نہیں لگتا تھا شاید اسی لیے بنجل نے جمو کا مشورہ ... کردیا۔ گاڑی کی روانگی میں خاصا وقت تھا۔ جمو نے ... والے کو روکے رکھا تھا۔ اس دوران ہم سلمٰی کو شہر کی ... اوپری جھلک دکھا سکتے تھے۔ گومتی پر جانے کا وقت نہیں ... بنجل نے کوچوان کو سیدھے اسٹیشن چلنے کا حکم صادر ...

ابھی اسٹیشن دور تھا کہ تانگے کو رک جانا پڑا۔ ... راستہ بند تھا۔ بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ شور غل بھی بہت تھا۔ ... اور ذورا حادثے کی نوعیت جاننے کے لیے تانگے سے ا... چاہتے تھے، بنجل نے روک دیا۔ اتنی دیر میں ہمارے ... بھی مختلف گاڑیاں کھڑی ہوگئی تھیں۔ واپسی کا راستہ بند ... تھا۔ سپاہی بھی اُڑتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے تھے اور سیٹیاں ... بجنے لگی تھیں۔ سپاہیوں کی دخل اندازی سے بھگدڑ ... جمو کے پوچھنے پر انتشار کی حالت میں بھاگتے ہوئے ایک ... گیر سے صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ دو آدمیوں کو چھرا گھونپ ...

تماشائیوں کو ہٹانے کے لیے پولیس کو لاٹھی چلانی
لے ایک شخص لوگوں کی بھیڑ کاٹتا گرتا پڑتا
کے بائیں حصّے سے ٹکرایا۔ وہ آگے جانا چاہتا
نظر جمو پر پڑ گئی اور اس نے سرخوشی کے عالم
گیا۔ جمو بھی اسے دیکھ کے چیخ پڑا۔ "ارے آغا

تانگے کے بم تھام کے ٹھہر گیا۔ "جمو استاد اقسم
رہا ہوں۔" وہ دیوانہ واری سے بولا اور اس کی
سے بتّھل بھی روپوش نہ رہ سکا۔ "ہائیں
بتّھل اپنے آقا بھی ہیں غلام واری۔"
نے اسے پہلے بھی دیکھا تھا۔ پینتیس سے چالیس
عمر لمبے قد چھریرے جسم اور سانولی رنگت کا
کبّن خاں کے اڈّے کا خاص آدمی تھا۔ بازار کا علاقہ
اس تھا۔ چاقو پر اس کی گرفت کا مجھے کوئی اندازہ
اس نے بتّھل کے پیر چھو کے ماتھے پر ہاتھ لگائے۔
نصیب، زہے نصیب، آج تو اس نگری کے دن پھر

ہے ہریالے بنے بہت مستی میں دکھائی دیتا ہے۔"
نے تانگے میں بیٹھے بیٹھے صدا لگائی۔
مستی تو آقا آپ کے دیدار سے ہو گئی۔ ہائے کتنے
سرکار کو اس گاؤں کا خیال آیا۔ کبّن خاں کیا گئے
ہی لکھنؤ سے کنارہ کر لیا۔" آغا پایا ہاتھ لہرا کے بولا۔

"اب کون ہے رے ادھری؟" بتّھل نے بلند آواز
سے پوچھا۔
"کون ہوتا عالم پناہ! کبّن خاں کے جانے کے بعد سب
لُٹ لُٹا گیا۔ وہی اپنے استاد، خدا عمر اور دراز کرے اور بلاؤں
سے محفوظ رکھے، وہی شمشاد استاد ذری اڈّے کا بھرم رکھے
ہوئے ہیں۔"
استاد شمشاد خاں، کبّن خاں کا استاد تھا۔ کبّن خاں کے
رخصت ہو جانے کے بعد اسے مجبوراً اڈّے کی چوکی پر بیٹھنا
پڑا ورنہ وہ کب کا گوشہ نشین ہو چکا تھا۔
"ابھی تک وہی گدھا چلا رہا ہے۔" بتّھل نے تعجب
سے کہا۔ "اب تو دن بہت ہو گئے۔"
"اس انوکھے لاڈلے بنّے خاں کی نوک پلک سنوار رہے
ہیں۔ کاٹا، چھانٹی پوری نہیں ہو پاتی۔ کہنے کو بنّے خاں ہی
اڈّے کے بادشاہ سلامت ہیں مگر بس دیکھنے کے۔ کبّن خاں
جانی کا رنگ جمانے کو بہت نرت بھاؤ دکھانا پڑے گا۔ یہ لکھنؤ
ہے، یہاں ایک سے ایک سورما خاندانی پڑا ہوا ہے۔ میں تو
کہتا ہوں، کچھ دن کے لیے آقا ہی راج سنگھاسن پر بیٹھ جاتے
تو سارے دلدّر دور ہو جاتے۔ کلف لگے کپڑوں سے تو آقا
نہیں چلتا۔" آغا پایا کی آواز شور میں دب جاتی تھی۔ بتّھل کا
تیور دیکھ کر جمو نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا کہ "سو سب
استاد شمشاد خاں کے پاس حاضری ممکن نہیں، ہمیں جلد سے
جلد فیض آباد پہنچنا ہے۔ وہ تو گاڑی بدلنے میں کچھ وقت لگا

اور لکھنؤ میں کچھ ضروری کام بھی تھا ورنہ شہر کی طرف آتے ہی نہیں۔ استاد شمشاد خاں کو سلام کہنا اور کہنا کہ شاید لکھنؤ جلد ہی آنا ہو۔

"واہ سرکار!" آغا پیا شکایتی لہجے میں بولا۔ "استاد کو خبر ہو گئی تو کیسے حیران و پریشان ہوں گے کہ اپنے دل دار اتنے قریب آ کے ملے بغیر چلے گئے۔"

"آئیں گے رے جلدی۔ کوئی مجبوری ہے۔ جیسا استاد جمرو نے بولا ہے' ایسا ہی استاد شمشاد کو جا کے بول دینا۔" بھل نے الجھ کے کہا۔

"جان کی امان پاؤں تو زبان کھولوں۔" آغا پیا ہاتھ جوڑ کے بولا۔ "استاد شمشاد کو بہت ملال ہوگا' مگر میں ٹل آ جائے گا۔"

پیچھے کی گاڑیوں نے واپس ہونا شروع کر دیا تھا اس لیے کچھ گنجائش ہو گئی اور ہمارے تانگے کو بھی واپس ہونے کی جگہ مل گئی۔ جمرو اور زوار تانگے سے اُتر گئے تھے۔ آغا پیا دور تک ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ پولیس کی نفری میں اضافہ ہو گیا تھا۔ آغا پیا کی زبانی معلوم ہوا کہ بازار میں ان دنوں کسی چاندنی بانو نامی دوشیزہ کا طوطی بولتا ہے۔ حسن و جمال میں یکتا' رقص کے فن میں بے مثل ہے۔ آواز بھی خوب پائی ہے۔ خان پور کا کوئی سرکش نوجوان جنون کی حد تک چاندنی بانو کا طلب گار تھا اور ساری آبائی دولت اپنے مقصود پر نچھاور کر چکا تھا۔ چاندنی بانو کی نگران تارا بیگم نے نوجوان سے ساری شرطیں پوری کرا لینے کے باوجود وعدہ وفا نہیں کیا اور مزید ستم یہ کیا کہ بالا خانے پر کرائے کے ایک شوریدہ پشت' بازار کے معاملات کے مشتاق اور ایسی صورتِ حال سے نمٹنے کے ماہر ہیرا لال سے مدد چاہی۔ ہیرا لال' چاندنی بانو اور نوجوان کے درمیان دیوار بن گیا اور اس نے بھرے بازار میں نوجوان کو ذلیل و خوار کیا۔ نوجوان بہت دنوں سے ہیرا لال کی تاک میں تھا۔ وہ اڈے پر استاد شمشاد خاں کے پاس بھی دُہائیاں دیتا ہوا گیا تھا۔ شمشاد خاں نے بازار کے معاملات میں اس قسم کی مداخلت سے صاف انکار کر دیا تھا۔ آج نوجوان اور ہیرا لال کی مڈبھیڑ ہو گئی اور نوجوان نے ... ہیرا لال ... پیٹ میں چھرا گھونپ دیا۔ زخمی ہیرا لال ابھی نہتا نہیں تھا۔

لڑکھڑاتے' ڈگمگاتے ہوئے اسے چاقو نکالنے اور اوچھا ترچھا وار کرنے کا موقع مل گیا۔ دونوں خون ... لت پت ہو کے بے ہوش ہو گئے۔ وہی پرانی کہانی تھی۔ ... ہی جان سکا تھا کہ پولیس آ گئی اور اس نے واردات ... سے بھاگ نکلنے میں عافیت جانی۔

بہت وعدے وعید اور اصرار و تکرار کے بعد آغا ... سے جدا ہوا۔ اسٹیشن پہنچ کے معلوم ہوا کہ گاڑی کی ... میں ابھی سوا گھنٹا باقی ہے۔ جمرو ٹکٹ خریدنے چلا ... چاروں انتظار گاہ میں آ گئے۔ منہ ہاتھ دھونے اور ... کے تازہ دم ہونے میں آدھ گھنٹے کے قریب وقت ... نکل گیا۔ آغا پیا نے پانوں کا بڑا ساتھ کر دیا تھا۔ ... خوشبودار پان تھے۔ جمرو بھی واپس آ گیا تھا۔ اپنے بڑے ... جامو کے کلکتے چلے جانے کے بعد جمرو ہی فیض آباد کے ا... کا نگراں تھا۔ دونوں بھائی چاقو کے ہنر میں طاق تھے۔ ... میں بھی ان کا شہرہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آغا پیا جمرو کو ... مچلنے' پھڑکنے لگا تھا۔ میرے اور بھل کے ساتھ جمرو نے ... روز و شب کا بہت خون کیا تھا۔ کوئی کب تک کسی کے لیے وقت نثار کر سکتا ہے۔ در و دیوار آدمی کی عادت بن جا... ہیں۔ ہر شخص کا جی وہیں لگتا ہے جہاں اس کی پذیرائی ہو' جہاں لوگ اس کی آہٹیں پہچانتے ہوں۔ حلقہ بھی گھر ... مانند ہوتا ہے' بار بار نہیں بنایا جا سکتا۔ جمرو تو فیض آباد ... اڈے کا حاکم تھا۔ گھر جانے' اپنے ٹھکانے پر واپس جا... ایک اضطراری مسرت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اس کی رفتار و گفتار میں عجب بے تابی سی نظر آتی تھی۔

گاڑی کی روانگی میں پندرہ بیس منٹ رہ گئے تھے کہ بھل نے اُٹھ جانے کا اعلان کر دیا۔ قلی نے سامان اٹھا... تھا۔ سلمیٰ بھی برقع اوڑھ کے تیار ہو گئی تھی۔ ہم باہر نکلا ... چاہتے تھے کہ اچانک دروازے پر شور ہوا اور اسی لمحے دروازہ کھول کے کئی آدمی دَراتے اندر آ گئے۔ سب سے آگے استاد شمشاد خاں تھا۔ بھرا ہوا جسم' میانہ قد' چمکتی ہوئی گندم گوں رنگت' چکن کے سفید کرتے اور پاجامے پر بھورے رنگ کی واسکٹ' سر پہ ٹوپی' ایک ہاتھ میں چاندی کا ... میں مختلف پتھروں کی مالا' کانوں میں سنہری دُریا۔ اس ...

رسیدگی میں جوانوں کی سی آن بان تھی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں جیسے قمقمے روشن تھے۔ "بھل بھائی! بھل بھائی!" وہ سر جھٹکتے اور ہاتھ پھیلائے ہوئے آیا اور بھل سے لپٹ گیا۔ "اب آخری وقت میں یہ دن بھی دیکھنا ہو گا۔ یہ انصاف نہیں ہے۔" وہ بھل کو جھنجوڑتے ہوئے بولا۔ "بھلا دیا اپنے دیوانے کو۔"

بھل نے بھی اسے جکڑ لیا "آغا پا نے چھنال پنا کیا نا' سارا بول دیا تھا اٹھائی گیرے کو۔" بھل نے شمشاد خاں کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔ "کیوں چلے آئے تم؟"

"کیسے نہیں آتا۔ لکھنؤ پہ استاد بھل آئے اور شمشاد خاں چوکی پر ایڈتا رہے۔ پیا تو سور کی اولاد چاندی کے پورے سو کا حق دار ہے۔"

"بٹیا بولیں شمشاد خاں! ضرور آتے یہ۔۔۔" بھل نے سلمٰی کی جانب دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ "بٹیا کو فیض آباد پہنچا کے ہی ٹھیک سے دم آتا۔"

"بٹیا سر آنکھوں پہ۔" شمشاد خاں سینے پر ہاتھ مار کے بولا۔ "بٹیا شمشاد خاں کی نہیں ہے کیا؟"

"بہت چکر کاٹ کے آرہے ہیں بھیا!" بھل نے بوجھل آواز میں کہا۔

"پر گھر آرہے ہو۔ لکھنؤ میں شمشاد خاں زندہ ہے بھیا صاحب' مرا نہیں ہے۔ اپنے کو تو ایسے ہی تمہارا انتظار تھا۔" شمشاد خاں نے اپنے ساتھ آنے والے اڈے کے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ سامان اٹھا کے تانگے میں رکھیں۔ بھل کا ہاتھ پکڑ کے شمشاد خاں انتظار گاہ سے باہر آگیا۔ بھل نے اسے سمجھانا چاہا' وہ جلد ہی دوبارہ لکھنؤ آنے کا وعدہ کرتا رہا مگر شمشاد خاں نے ایک نہ سنی۔ اس کی چتون سے اندازہ ہو گیا تھا کہ کچھ کہنا سننا لاحاصل ہے۔ کسی کو بھی اتنے اصرار کے بعد انکار کی مجال نہ ہوتی۔

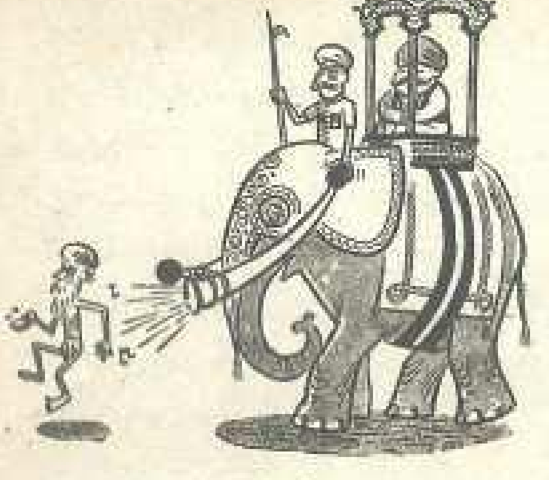
اڈے سے کچھ فاصلے پر شمشاد خاں کے رشتے کے بھائی عزیز خاں کا گھر تھا۔ اڈے جانے سے پہلے شمشاد خاں نے سلمٰی کو وہاں پہنچایا اور بھائی کو تاکید کی کہ زنان خانے میں سلمٰی سے شہ زادیوں کا سلوک کیا جائے' شمشاد خاں نے محض اس تاکید و انتباہ پر اکتفا نہیں کی' زنان خانے تک سلمٰی کو خود پہنچا کے آیا۔

ہم اڈے آگئے۔ یہ پرانی طرز کی ایک [illegible] تھی۔ اتنی بڑی بھی نہیں مگر صاف ستھری تھی۔ [illegible] حال ہی میں روغن کیا گیا تھا۔ دالان میں دیوار کے [illegible] رکھا تھا۔ صحن اور دالان میں تخت کے آس پاس [illegible] بچھی ہوئی تھیں۔ تخت کے وسط میں بھل کو بٹھا[illegible] سے خاصے لوگ موجود تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی تعد[illegible] گئی۔ جو آتا' پہلے بھل کو پھر شمشاد خاں کو سلام [illegible] بھل کے پیر چھوتا' کوئی ہاتھ چومتا۔ آغا پا بھی [illegible] جھکائے ہاتھ باندھے بھل کے سامنے اکڑا ہوا [illegible] مسکرانے کے سوا کیا کرسکتا تھا۔ آغا موتیا کے ہار [illegible] سب کے گلوں میں اس نے ہار ڈالے۔ دیکھتے دیکھتے [illegible] صحن بھر گئے۔ دالان میں ستون کے ساتھ سماوار اور [illegible] پیالیاں رکھ دی گئی تھیں۔ بھل کے لیے بہ طور خاص [illegible] کی ہوئی فرشی' منقش نیچے اور چلم اور زر تار [illegible] بھی بندوبست کروایا گیا تھا۔ بہت سے لوگ کسی نہ کسی [illegible] معروف تھے اور شمشاد خاں کے احکام ختم نہیں [illegible] تھے۔ پھر کہیں سے ککن خاں کا جانشین جواں سال [illegible] بھی آگیا۔ نکلتا ہوا قد' بادامی رنگت' کانوں میں مختصر [illegible] بال' ہاتھوں میں کڑا' سفید براق لباس اور کالی واسکٹ[illegible] ایک جامہ زیب نوجوان تھا۔ اڈے کا آدمی معلوم [illegible] ہوتا تھا۔ ببّے خاں نے جھک کے سلام کیا' بھل کے [illegible] چھوئے' ہاتھ کو بوسہ دیا۔ بھل نے اسے پاس ہی [illegible] تھوڑی دیر میں دسترخوان سجا دیے گئے۔ جانے کس [illegible] اتنی جلد اتنے لوگوں کے لیے انھوں نے کھانے کا انتظ[illegible] تھا۔ بریانی' ہلکے شوربے کا سالن' لوکی کا رائتہ اور [illegible] شمشاد خاں نے اسٹیشن جانے سے پہلے ہی کھانے کی [illegible] حکم دیا ہو گا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ہمیں اڈے لے کر [illegible] گا' ورنہ اتنے کم وقت میں تو یہ اہتمام ممکن نہیں تھا۔ [illegible] ختم ہوتے ہوتے بارہ بج گئے اور پھر جیسے ہی دسترخوان اٹھا[illegible] گئے' صحن کے کسی گوشے سے یکایک زرق برق لباسوں [illegible] ملبوس' سولہ سنگھار کیے ہوئے بھنڈ لیے سازوسامان کے [illegible] نکل آئے۔ ان میں اور ناچنے گانے والی عورتوں میں [illegible]

آمیز ناز و ادا کا۔ پہلی نظر میں تو کوئی بھی دھوکا کھا جاتا۔ انھیں اپنے درمیان دیکھ کے بام و در شور سے گونج اٹھے۔ مستانہ وار صدائیں، سیٹیاں اور آہیں۔ تخت کے پہلے انھوں نے کورنش بجالانے کے انداز میں تعظیم کی۔ بنّھل نے جیب میں ہاتھ ڈال کے انھیں کچھ نذر کی پھر وہ بنّے خاں کے سامنے آ و گئے۔ ایک نے گھونگٹ نکال کے ور مالا کی طرح گیندے کا ہار بنّے خاں کی گردن میں ڈال دیا، ایک نے بڑھ کے بدن لچکاتے بلائیں لیں۔ جب تک بنّے خاں نے ان کی حسبِ دل پذیرائی نہیں گزاری، وہ وہیں کھڑے اٹ کھیلیاں کرتے رہے۔ ان میں ایک سے بڑھ کے ایک تھا۔ سُرتال کے پکّے، رقص کا اچھا ملکہ تھا، نقّال بھی کمال کے تھے۔ ان کی ادائیں، ناز نخرے، چٹک مٹک اور ٹھسکوں نے سبھی کو ہنساتے ہنساتے لوٹ پوٹ کر دیا۔ ڈیڑھ بجے کے قریب جب محفل شباب پر تھی، شمشاد خاں نے ہاتھ اٹھا کے انھیں رخصت کر دیا۔

اڈے پر چند ہی آدمی رہ گئے۔ بنّھل، شمشاد خاں کے پاس بیٹھا رہا۔ مجھے زورا اور جمّو کو بنّے خاں پہلی منزل کے ایک کمرے میں لے آیا۔ کمرہ سجا ہوا تھا۔ صاف بستروں کے علاوہ ضرورت کی ہر چیز وہاں موجود تھی۔ بنّھل کے لیے کسی اور جگہ انتظام کیا گیا تھا۔ آدھی رات تو ایسے ہی گزر گئی تھی۔ صبح کی گاڑی سے روانگی کا اب کوئی امکان نہیں تھا۔ نیند کے لیے فراغت بھی شرط ہے، فراغت کی بے حسی جبری بھی تو ہوتی ہے۔ ہم تینوں کو جلد ہی نیند نے آلیا۔

صبح ناشتے کے بعد اڈے کے آدمیوں کے سامنے شمشاد خاں نے بلند آواز میں اعلان کیا کہ وہ اڈے پر نادر بیٹھنا نہیں چاہتا، اسے اب آزاد کیا جائے۔ بنّے خاں کی رگوں میں اس کا خون رواں ہے، حوصلہ مند، جُز بیں اور معاملہ فہم ہے۔ جہاں تک بن پڑا ہے، بنّے خاں کی تربیت دل و جان سے کی گئی ہے، شاید اب کوئی کسر نہیں رہ گئی۔ باقی تجربہ خود بڑا معلم ہے۔ شمشاد خاں نے کہا، آرزو تھی کہ بنّن خاں مرحوم کے جانشین بنّے خاں کو چوکی پہ بٹھانے کی رسم [illegible]



ادائی کے موقع پر استاد بنّھل بھی موجود ہو۔ کل جمعے کا دن ہے۔ اس دن کی ریت ہے، استاد بنّھل سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ کل اپنے ہاتھوں بنّے خاں کو اڈّا سپرد کرنے کی رسم ادا کرے۔

چاروں طرف سے مسرت کے اظہار میں اٹھنے والے نعرے بنّے خاں کی ہردل عزیزی کے غمّاز تھے۔ گویا اب کل تک بھی فیض آباد روانہ ہونے کی صورت نہیں تھی۔

اڈّے سے اٹھ کے ہم سلمیٰ کی خیر خبر لینے شمشاد خاں کے بھائی کے گھر چلے آئے۔ رہبری کے لیے شمشاد خاں نے ایک آدمی ہمارے ساتھ کر دیا تھا۔ مراد آباد کے مسافر خانے میں قیام کے دوران سلمیٰ کو جمو اور زورا سے مانوس ہو جانا چاہیے تھا۔ انھیں دیکھ کے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ سلمیٰ نے بتایا کہ میزبانوں نے تو حد کر دی۔ اس قدر تکلف اور تواضع کہ گھبراہٹ ہونے لگی ہے۔ میزبان خواتین کے ساتھ سلمیٰ لکھنؤ کے خاص مقامات اور بازاروں کی سیر کے لیے جانے والی تھی۔ وہ حیدرآباد کے محل دو محلوں کے آداب سے واقف تھی سوائے لکھنؤ کے اوسط درجے کے ایک خاندان کے سامنے نشست و برخاست میں دشواری پیش نہیں آرہی ہوگی۔ سائبان، ریشم، پھول، چند نرم و لطیف لفظ اور ایک نگاہِ لطف بھی آدمی کے لیے غذا کے مانند ہیں۔ زندگی بڑھتی نہیں تو آسان ضرور ہو جاتی ہے۔ جمو اور زورا نے خدا حافظ کہتے ہوئے سلمیٰ کے سر پہ ہاتھ رکھا تو اس کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔

بھول کوٹھا کے ہم تینوں اڈے سے نکل گئے اور حضرت شاہ مینا کے مزار، بھول بھلیاں اور چھتر منزل ہوتے ہوئے دریائے گومتی کی طرف چلے آئے۔ دوپہر کا کھانا بھی ہم نے امین آباد کے ایک معمولی ہوٹل میں کھایا۔ کھانا البتہ معمولی نہیں تھا۔ کبھی پیدل، کبھی تانگے پر بے سروپا گھومتے گھامتے شام کو جمو پھر مجھے ڈاکٹر سری واستو کے مطب میں لے آیا۔ مجھے اب ایسی کوئی تکلیف نہیں تھی تاہم جمو کی خواہش پر ڈاکٹر نے پٹی کی تجدید کر دی۔ سورج ڈوبے وقت کہیں ہماری واپسی ممکن ہو سکی۔

☒ اڈے پر گزشتہ رات سے زیادہ گہما گہمی تھی۔ فرش دھویا جا رہا تھا، جھنڈیاں لگائی جا رہی تھیں۔ دیواروں، منڈیروں اور طاقوں پر ترتیب سے چراغ رکھے جا رہے تھے۔ گلی میں صدقے کے لیے بندھے ہوئے کالے بکرے شور مچا رہے تھے۔ رات کے کھانے پر بھی کچھ کم اہتمام نہیں تھا۔

شمشاد خاں کے مشورے پر رات کے کھانے سے پہلے ہم نے کپڑے بدل لیے تھے۔ جمو کا خیال تھا کہ آج مجرے کی محفل ضرور آراستہ کی جائے گی لیکن کھانا ختم ہوتے ہی شمشاد خاں چوکی سے اٹھ گیا۔ باہر تانگے تیار کھڑے تھے۔ کچھ ہی دور جا کے ہمیں شمشاد خاں کے ارادے کا اندازہ ہو گیا۔ بازار کے سرے پر سب تانگوں سے اتر گئے۔

بازار میں دنیا ہی دوسری تھی، کسی میلے کا سا منظر۔ روشنی، پھول، رنگ برنگے زرق برق ملبوسات، جھروکوں، جالیوں، دروازوں اور چلمنوں سے تانیں امڈ رہی تھیں۔ ہوا میں جیسے راگ گھلے ہوئے ہوں۔ یوں بھی شمشاد خاں کی آمد سے بازار میں ہل چل سی مچ گئی تھی۔ کسی طرف سے گجرے، کسی جانب سے عطر کی پھریریوں کی نذر، کوئی گلوریاں طشتری میں لیے لپکا چلا آ رہا ہے۔ کشمیری چائے کے کسی خاص دکان دار نے شمشاد خاں سے کچھ دیر ٹھہر جانے کی التجا کی۔ شمشاد خاں سلام کا جواب دیتا، سنی اَن سنی کرتا اور لوگوں سے سرسری طور پر حال احوال پوچھتا ہوا تیز قدموں سے بڑھتا رہا اور بازار کے وسط میں واقع ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے آ کے ٹھہر گیا۔ بنّے خاں نے کنی مار کے سرگوشی میں جمو کو بتایا کہ یہ چاندنی بانو کا بالا خانہ ہے۔ آج کل اسی کی ہے۔ ”ایمان سے جمو استاد، انگارے کی چیز ہے۔“ آواز بھڑک رہی تھی، بھنک رہی تھی۔

”مطلب ہے، زیادہ دنوں کی بات نہیں ہے۔“ جمو نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

”کیوں جمو بھائی؟“ بنّے خاں پلکیں جھپکانے لگا۔

”یہ راج پاٹ زیادہ راس نہیں آتا۔ تارا بیگم کی پنجرا جلدی خالی ہو جاتا ہے۔“

”اب کے باہر سے نہیں، تارا بیگم کی اپنی پالی بلبل ہے۔ تارا بیگم نے چپکے چپکے پروان چڑھایا ہے، خوب مانجھ کے ایک دم سے محفل میں اتارا۔ پورے لکھنؤ میں دھوم ہے۔“

”تارا بیگم کی اپنی بیٹی ہے کیا؟“

”یہی سمجھ لو، بچپن سے اُسی کے پاس ہے۔ بیٹی ہے، جھوٹ سچ خدا جانے۔“

بالائی منزل کے ریشمی پردوں میں سرسراہٹ ہوئی، کسی نے جھانک کے دیکھا۔ شمشاد خاں نے اڈے کا آدمی اپنی آمد کی اطلاع دینے اوپر بھیج دیا تھا۔ دو سر لیے دو سازندے، ایک تنومند شخص کے ساتھ نیچے اُنھی کی جلو میں ہم نے سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ اوپر دروازے پر گوٹا کناری کے غرارے، جمپر اور گلابی دوپٹے میں زیورات سے لدی پھندی، ایک اُدھیڑ خوش جمال ہمارے استقبال کے لیے مضطرب کھڑی تھی۔ یہ تارا بیگم ہو سکتی تھی۔ زیادہ وقت نہیں گزرا ہو گا، وہ خود بھی بازار کی منتخب عورتوں میں سے ایک ہو گی۔ سر خم کر کے اُس نے شمشاد خاں کو اور ہم سب کو باری باری آداب کیا اور آواز میں بولی۔ ”بندی تو سمجھ رہی تھی، اب کیا آنا ہو گا، تو شاید قاصد ہی آئے۔“

”بس کیا بتائیں، طلائے عالم، نکلتے نکلتے دیر ہو گئی۔“ شمشاد خاں نے لہک کے کہا۔

”خاں صاحب کو معلوم ہو گا کہ بندی جمعرات کو محفل نہیں سجاتی۔ کبھی کبھار ہی ایسا ہوا ہے کہ جمعرات کو...“

”اپنے کو معلوم ہے۔“ شمشاد خاں نے اس کی

کاٹ کے کہا۔ "کیا کریں' اُدھر کلکتے کے بادشاہ' اپنے جانِ جگر استاد بھل کو واپس جانے کی جلدی ہے۔"

"اخاہ! آپ ہی ہیں استاد بھل!" تارا بیگم چہکتی آواز اور چمکتی آنکھوں سے بولی "بہت نام سنا تھا سرکار کا" آج دیدار بھی ہو گئے"۔ تارا بیگم نے شائستگی سے بھل کو دوبارہ آداب کیا اور ٹھنک کے بولی۔ "زہے نصیب' بندی کے بخت جاگے' استاد بھل نے غریب خانے کا رُخ کیا۔ کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں"۔

بھل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک لہر آ کے گزر گئی۔

"بندی ضرور حاضر ہوتی خاں صاحب!" تارا بیگم معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔ "لیکن خدا گواہ ہے' کسی سے پوچھ لیجیے' زمانہ ہو گیا' بندی نے باہر کی محفل آرائی کا سلسلہ ترک کیا ہوا ہے۔ پچھلے دنوں نواب صاحب منوّر عباس کے یہاں کوئی بڑا فرنگی افسر آیا تھا۔ نواب صاحب سے برسوں کے مراسم ہیں' بہت خیال کرتے ہیں ناچیز کا۔ بندی نے دست بستہ معافی مانگ لی۔ نواب صاحب کی عالی ظرفی ہے' نہ صرف بندی کی التجا قبول کی بلکہ فرنگی افسر کے ساتھ بہ نفسِ نفیس تشریف لائے۔ انھوں نے کم ترین کا مان رکھا' بڑی عزت دی۔"

"اپنے کو کوئی گلہ نہیں ہے تارا بیگم!" شمشاد خاں نے بے پروائی سے کہا۔ "بہت چرچا ہوا تھا تمھارے انکار کا' ہم نے بھی سنا تھا۔"

"لوگوں نے بتنگڑ بنا دیا' بات ذری سی تھی۔"

"پر نواب صاحب کی بات اور ہے' ہم تو فقیر لوگ ہیں۔"

"سبحان اللہ۔" تارا بیگم کھِل کھِلا پڑی۔ "پھر ہم لوگ کہاں جائیں گے' معلوم ہوتا ہے' آپ پر تو وقت ہی نہیں گزرا۔ وہی سج دھج' وہی آن بان' کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ ماشاءاللہ وہی شوخی اور زندہ دلی ہے۔"

"اور تمھارا اپنے لیے کیا خیال ہے؟" شمشاد خاں نے شگفتگی سے کہا۔ "وقت کو تو تم نے پنجے میں دبا رکھا ہے۔"

تارا بیگم کے رخساروں پر لالی دوڑ گئی۔ "آپ کا ... ہے خاں صاحب! داستاں ختم ہوئی۔ بس آپ کا ... ہے۔"

"اپنے پاس تو نظر ہے' باقی تو سارا تمھارا ... ہے۔"

"کیا خوب! ذرّہ نوازی ہے آپ کی۔ اس دل جلی جی کو بہت دلاسا ہوتا ہے لیکن۔" وہ کھِل کھِلا کے بولی۔ "... کتنی رعایت دیتا ہے۔"

ہم ایک مختصر آراستہ و پیراستہ ڈیوڑھی جیسی گزرگاہ ... کھڑے تھے۔ شمشاد خاں کے ٹوکنے پر تارا بیگم ... ہو گئی۔ اس نے آگے بڑھ کے اور ہاتھ پھیلا کے ہمیں ... آنے کی دعوت دی۔ ہم ہال کی طرز کے جگمگاتے ہوئے کشادہ بیضوی کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے کے ... اطراف محرابیں بنی تھیں اور درمیان میں ریشمی ... سرسرا رہے تھے۔ محرابوں کے پار ایک طرف بڑی ... دوسری جانب کچھ فاصلے پر بے شمار طاقوں سے مزیّن ... دیوار۔ محرابوں سے دیوار تک کی فصل راہداری کے ... ہو گی۔ دیوار میں قریب قریب' متعدد کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ چھت' ستون اور دیواروں ... کاری بہت مہارت سے کی گئی تھی۔ رنگ برنگے نقش ... میں جڑے ہوئے شیشے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے شیش محل کا گمان ہوتا تھا۔ چھت کے وسط میں ایک ... فانوس کے علاوہ جا بجا چھوٹے فانوس روشن تھے۔ سا... تزئین و آرائش شاہانہ تھی۔ نواب راجے ہی یہاں ... ہوں گے۔ بھل اور شمشاد خاں سازندوں کے مقابل ... نشست پر پہلو بہ پہلو بیٹھ گئے۔ میں' زورا' جمو' تینے خاں ا... اڈے کے تین اور آدمی ان کے دائیں بائیں۔ کوئی سا... مدھم سُروں میں ستار سے چھیڑ خانی کر رہا تھا۔ خاص دان ا... پیچوان تیار تھے۔ سازندوں نے کچھ ہی دیر میں ساز سنبھال لیے۔ تارا بیگم مہمانوں کے انداز میں' بھل داور شمشاد ... کے قریب بیٹھ گئی۔

یکا یک بائیں جانب سے تسلیمات کرتی' چھم چھم ... ہوئی تیکھے خال و خد' گندمی رنگت کی ایک نوجوان ...

ے میں آ کے سازوں پر رقص شروع کر دیا۔
"یہی چاندنی بانو ہے کیا؟ کل اسی پر خون ہوا تھا؟"
تابی سے پوچھا۔
"نہیں جمو بھائی!" بنّے خاں نے زیر لبی سے کہا۔ "یہ تو
گھونٹ بھی نہیں ہے۔ یہ تو ذری محفل گرمانے کا
ہے۔"
"یہ بھی بہت پنا خا ہے بنّے میاں۔"
"بھول گئے، تارا بیگم کا بالا خانہ ہے۔ کوئی ایسی ویسی تو
ٹھہر بھی نہیں سکتی۔ تصویر کی طرح بناتی ہے تارا۔ ایک
رکھ ہے۔"
لڑکی نے اپنا سراپا سازوں سے ہم آہنگ کرنے کی اچھی
کی تھی۔ رفتہ رفتہ جیسے اُس کے پاؤں، اُس کے ہاتھ،
اس کا سارا بدن ہی سازوں کے اشاروں کا معمول بن گیا۔ وہ
سازوں کا کوئی حصّہ بن گئی یا ساز اس کے سراپا میں مدغم
ہو گئے۔ سب گم صم سے تھے۔ لڑکی کو آئے کچھ زیادہ دیر نہیں
ہوئی تھی کہ تارا بیگم نے ہاتھ اُٹھا دیا۔ لڑکی نے نہیں دیکھا
لیکن سازندوں نے ساز مدھم کر دیے تھے اور طبلہ نواز نے
طبلے سے ہاتھ اُٹھا لیے تھے۔ لڑکی کے پیروں میں بھی پھر کوئی
زنجیری پڑ گئی۔
"کیا غضب کر دیا، کیوں روک دیا؟" شمشاد خاں نے
سوالی لہجے میں کہا۔
"جلدی بہکنے لگتی ہے۔" تارا بیگم اٹھلا کے بولی۔
"ابھی نو آموز ہے۔"
"کس سے سیکھوا رہی ہو؟" شمشاد خاں نے اشتیاق
سے پوچھا "کوئی بڑا گنی لگتا ہے۔"

"شکر ہے، بار خاطر نہ ہوا۔ بندی تو ڈر رہی تھی۔" تارا
بیگم مسکرا کے بولی۔ "بڑودان کے گرو دیو جوشی بابو کا نام شاید
سنا ہو، وہ تو اب چار دیواری سے باہر نہیں نکلتے۔ کچھ عرصے
کے لیے ان کے پاس بھیجا تھا، بڑی منت کی، تب مانے۔ وہاں
جا کے تو یہ دیوانی ہو گئی ہے گی۔"
"لگتا ہے، نرت کے لیے بنی ہے۔"
"ابھی کیا دیکھا ہے آپ نے، غضب ڈھانے والی تو اب
آیا چاہتی ہے۔"
"اُسی کے لیے تو اپنے ببّن بھائی کو کھینچ کے لائے
ہیں۔"
"استاد تو زمانہ دیکھے ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے اسے
حاضر کرتے ہوئے، سچ پوچھیے تو دل دھڑکتا ہے۔ خدا لاج
رکھے، میری التجا ہے، کوئی کوتاہی ہو تو بچی سمجھ کے درگزر کر
دیجیے گا۔ ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں اسے محفل میں
آئے۔"
"پر دیر کیا ہے تارا بیگم، جلوہ کراؤ۔"
"کیا خاں صاحب، اب ایسی بھی کیا بے صبری۔ ذری دم
لیجیے، کچھ چائے وغیرہ نوش کیجیے، آئے، زمانے بعد تو آپ نے
غریب خانے کا رخ کیا ہے۔"
"وہ تو آنا بھی اپنے بھائی اُم استاد ببّن کی وجہ سے ہو گیا۔
کپتن کے جانے کے بعد اب کہیں آنے جانے کو جی نہیں
کرتا۔"
"آپ نے کپتن خاں کا کیا ذکر چھیڑ دیا؟" تارا بیگم
فسردگی سے بولی۔ "آپ کے دکھ کا اندازہ ہے خاں صاحب،
آپ ہی کا تو شاہد ہوا ہیرا تھا۔ یہاں بھی کوئی محفل ہوا تھا۔

کسی کو یقین ہی نہیں آتا تھا۔ ایسا جوان جہان، کڑیل، دل والا آدمی، یہ عمر ایسی تو نہ تھی۔ کبھی کبھی یہاں آتے تھے، اور کیا اعلا مذاق پایا تھا، اتنے شعر یاد تھے کہ الاماں۔ ہر موقع پر ایک شعر حاضر۔ ہائے کیسا بانکا شخص تھا۔ ان جیسا شاید ہی لکھنؤ والوں کو کوئی ملے۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو چوکی پر واپس آگئے۔"

"پر دل کا کیا کریں، نہیں لگتا تارا بیگم!"

"کیوں کر لگے گا، مگر خاں صاحب! آپ چلے گئے تو جانے کیسی لوٹ مار مچے۔ جب تک ککن خاں کی جگہ لینے کے قابل کوئی نہ مل جائے، میری تو یہی بنتی ہے کہ آپ ہی بیٹھے رہیں۔"

"نہیں تارا بیگم! بنے خاں کو کل چوکی پر بٹھا رہے ہیں۔ بتھل بھائی کو اسی لیے روکا ہے۔ بنے کو ککن بھی بہت سمجھتا تھا۔ اپنا تو یہ آخری دن ہے۔"

"ایسا کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" تارا بیگم تعجب سے بولی۔

"ہاں تارا بیگم، کل اپنی چھٹی ہو جائے گی، بنے خاں کو ساتھ لایا ہوں۔ تم نے پہچانا نہیں؟"

تارا بیگم پلکیں پٹ پٹانے لگی اور اس کی منتظر نگاہیں آخر بنے خاں پر آکے ٹھہر گئیں۔

"ارے واقعی! یہ تو سامنے ہی بیٹھے ہیں، کیسے الگ الگ۔ اب تو شاید اپنے ہوش و حواس بھی گئے۔ بندی نے آپ کے اور استاد بتھل کے سوا کسی اور پر غور ہی نہیں کیا۔ بنے خاں، ککن خاں مرحوم کے ساتھ کئی بار آچکے ہیں۔ ماشاءاللہ اب تو کچھ اور ہی تیور ہیں۔ شہزادوں کی طرح۔"

جمو نے بنے خاں کو کہنی ماری تو بنے خاں کا جسم اکڑ سا گیا۔ اتنی دیر میں دو کم سن لڑکیاں ہاتھوں میں طشت اُٹھائے کمرے میں داخل ہوئیں۔ انھوں نے ہمیں سلام کیا اور ہمارے سامنے طشت رکھ کے فوراً واپس چلی گئیں۔ مٹھائیاں، خشک میوے، پھل، بھنا ہوا دھنیا، الائچی دانے اور نفیس قسم کے برتنوں میں چائے۔

"یہ کیا، یہ کیا ہے؟" شمشاد خاں جھجکتے ہوئے بولا۔

"کچھ بھی نہیں، بندی تو کچھ کر ہی نہ سکی۔ ہر جمعرات کی شام زیارت کے لیے جاتی ہوں۔ برسوں کا معمول ہے۔ آج وہاں کچھ دیر ہو گئی۔ مہلت ہی نہیں ملی کسی اہتمام کی۔ بانو کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ حکیم بھورے میاں نے آدمی بھیجا، اُنھی کی دوا بانو کے لیے شافی ہوتی ہے۔ تھی، بندی نے کہا، بٹیا آج تو خود کو سنبھالے رکھنا۔ مہمان آنے والے ہیں۔"

"اب کیسی ہے وہ؟" شمشاد خاں نے تشویش سے پوچھا۔

"اللہ کا کرم ہے، طبیعت بحال ہے۔"

"کوئی ایسی بات ہے تو اسے مت بلاؤ۔"

"نہیں خاں صاحب! اتنا تو مجھے بھی خیال ہے۔"

"تمھیں نہیں ہوگا تو اور کس کو ہوگا۔"

"کیا بتاؤں، کیسے کیسے جتن کیے، کتنی آرزوؤں، منتوں کے بعد یہ دن آئے ہیں کہ بانو کسی لائق ہوئی ہے۔ ... سے بانو پر محنت کی ہے، اپنے اوپر بھی شاید اتنی نہیں کی۔ ... سا ایسا استاد ہے جس کے در پہ جا کے بھیک نہیں مانگی۔ کہاں نہ گئی۔ کوئی ایسے ہی تو نہیں بن جاتا صاحب!" تارا بیگم کی آواز بھرانے لگی۔

"ہاں تارا بیگم، بالکل آدھے آدھے کی بات ہے۔ آدھا اپنا ہوتا، آدھا دوسروں کا۔ جتنا آدمی اپنے کام آتا ہے، دوسروں کی بھی اس کو ضرورت پڑتی ہے۔"

"بجا کہتے ہیں۔" تارا بیگم سرہلا کے بولی۔ "بے شک ... میں خود بڑی صلاحیت تھی، میرا کام تو اُجالنا، اُبھار کرنا ہی ہے۔ میں ہر لڑکی کو بانو نہیں بنا سکتی، اس لیے کہ ہر لڑکی بانو نہیں ہوتی لیکن اب احساس ہوتا ہے، بانو کو اتنا وقت نہ دیتی، اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتی تو زیادہ اچھا ہوتا۔"

"کیوں تارا بیگم؟" شمشاد خاں نے اُلجھ کے کہا۔ "پچھتاوا کیسا؟ بانو تو اب تمھارے لیے حکومت ہے۔ تمھارے خرچ کیے ہوئے وقت کا ایک ایک پل اور لُٹائے ہوئے پیسے کی ایک ایک پائی، ہزار کے حساب سے واپس آئے گی۔ دیکھنا، بانو لاکھی ثابت ہوگی۔"

"دولت سنگھ بھی تو ساتھ لائے۔"

"کیا مطلب، کوئی دکھ ہے تمھیں؟"

"نہیں، سب شکر ہے مولا کا۔"

"بولو بولو تارا بیگم! کیا بات ہے؟"
"کچھ نہیں خاں صاحب!" تارا بیگم آہ بھر کے بولی۔
"بس دعا کیجئے' خدا بانو کو سلامت رکھے' اسے بلاؤں سے محفوظ رکھے۔ وہی تو اب تعبیر' وہی تو اب ایک امید ہے۔ نہ بانو کسی کو بار بار ملتی ہے نہ زندگی اتنی۔۔۔۔" تارا بیگم جانے کیا کہنا چاہتی تھی کہ اس کی آواز حلق میں گھٹ گئی۔
"ہم کو بتاؤ تارا بیگم!" شمشاد خاں بے قرار ہو گیا۔
"کیا بتاؤں خاں صاحب!" تارا بیگم یاسیت سے بولی' اس نے سامنے رکھی ہوئی نوع بہ نوع چیزوں کی طرف ہماری توجہ مبذول کرانی چاہی اور طشتری اٹھا کے پہلے بنفل کی طرف پھر شمشاد خاں کی طرف بڑھائی۔
"کوئی پریشانی ہے تارا بیگم؟ جی میں اٹکاؤ رہے گا۔" شمشاد خاں نے اصرار کیا۔
"بندی کو ڈر ہے' زبان بہک نہ جائے۔"
"نہیں نہیں' کھل کے بولو۔"
"آپ نے کل کی بابت کچھ نہیں سنا؟" تارا بیگم کی آواز میں شکوہ نمایاں تھا۔ "ہم پر تو قیامت گزر گئی۔"
"کل کی بابت؟" شمشاد خاں سٹ پٹا کے بولا۔ "اچ چھا' اچ چھا' وہی کل جو پھرے کل آئے تھے بیچ میدان میں۔ اسی کی طرف اشارہ ہے نا تمہارا؟"
"جینا اجیرن کر دیا تھا اس مجنوں زادے نے۔"
"یہ تو ہوتا رہتا ہے تارا بیگم! کوئی نئی بات تو نہیں ہے' سمجھو تو ایک طرح دھوم مچ گئی ہے شہر میں چاندنی بانو کی۔"
"خاک! آپ اسے دھوم بتا کہتے ہیں۔ اپنی تو جان پر بن گئی' کس عذاب میں وقت گزارا ہے' ہمی جانتے ہیں' ہر وقت ایک دھڑکا۔ در و دیوار سے خوف آنے لگا تھا' ایک تو بازار کے اپنوں میں بانو کی اٹھان سے کچھ کم سانپ نہیں لوٹے ہیں' اودھر یہ مجنوں' یہ فرہاد۔ کتنے غلافوں میں چھپائے رکھوں یہ بلا۔ جب سے محفل میں آنا شروع کیا ہے' جنگل میں آگ لگ گئی ہے۔ نوابوں' نواب زادوں کو کوئی بھگت لے' بھگت ہی رہی ہوں۔ ایک سے ایک دعوے دار' ہمارے اشرفیوں کے بھرے لے چلا آ رہا ہے اور گل بکاؤلی سنا رہا ہے۔ ٹھیک ہے' لیکن یہ گل کے ٹوٹے ہمارا! خبر ہے

خاں صاحب' وہ بنیا زادہ کیسی کیسی دھمکیاں دیتا تھا... ایک دن سارے بالا خانے کو دیا سلائی دکھا دوں گا' پھونک دوں گا' سیندور رکھوا دوں گا۔ ایک مرتبہ تو اس نے مجھ پر بھی ہاتھ اٹھا دیا۔ ایسی ذلت کبھی نہیں ہوئی تھی۔ کیا امیدیں لگائی تھیں اس بانو سے کہ اب پچنت ہو گی مگر یہ بد نظر' شہدے' رسفلے۔ یہ مجھے چھین لینے دیں اس بچی کو۔ آپ کے پاس قاصد بھیجا تھا' آپ نے خبر نہیں لی۔"
"تمہارے سر کی قسم' اپنے پاس کوئی سور کا نہیں پہنچا۔ اپنے کو کچھ بھی معلوم..."
"آغا پیا سے کہلوایا تھا' اس سے پوچھئے گا۔"
"اس حرام زادے نے کچھ نہیں بتایا۔"
"شبہ تھا' ایسا ہی ہوا ہو گا' بھلا آپ کو معلوم ہو اور آ کے نہ پوچھیں' یہ اندھیر تو کبھی نہیں ہوا تھا۔"
"آغا کو تو میں دیکھ لوں گا' بہت مستی کرنے لگا ہے۔"
"اس نے سوچا ہو گا کہ اتنی سی بات آپ کو کیا بتائے' اسے کیا خبر کہ بندی کس عالم سے دوچار ہے۔"
"پر آغا کو کہنا چاہیے تھا۔"
"یہ اس کی شکایت نہیں ہے' بندی میں اتنا حوصلہ نہیں۔ اسے میری طرف سے بدگمان نہ کر دیجئے گا' غلام تھانے دار ہے وہ۔"
"نمبر ایک حرامی ہے وہ' تم فکر نہ کرو۔ بنے خاں کو بولے ہیں کہ ادھر کی طرف ایک آدمی اور بڑھا دے۔ اب ذرا کوئی بات ہو' تم سیدھے بنے خاں کے پاس آدمی بھیجو' لیکن تارا بیگم!" شمشاد خاں نے آنکھیں چڑھا کے کہا۔ "یہ عمر ہی کل کھیلنے کی ہے۔ چھن چھنا چھن' تاک دھنا دھن' راگ رنگ' شاعری' عاشقی۔ اب عاشقی پر تو ہم پہرا نہیں بٹھا سکتے' بٹھانا بھی نہیں چاہیے۔ کسی زمانے میں ہم نے بھی بہت وقت خراب کیا ہے۔"
"اپنے اپنے وقت پر سب رنگ کھیلتے ہیں لیکن ایسا تو نہیں ہوتا۔"
"سوچ لو بیگم صاحب! ہم نے تانگ اڑانی شروع کر دی تو پنچھی اڑ بھی سکتے ہیں' بازار کے دوسرے لوگوں سے بھی پوچھ دیکھو سب لگ..."

ہم پھر آگا پیچھا؟ اللہ سیدھا دیکھ کے آدمی بالا خانے کی طرف بڑھا کریں گے۔ بولو ٹھیک ہے؟"

"ایسا بھی نہیں خاں صاحب! بندی تو تیجوں لفنگوں کی بات کرتی ہے' بالا خانے میں آ کے جو بے لگام ہو جاتے ہیں' گالیاں گفتاریاں' دھمکیاں' توبہ توبہ۔"

"پر فرق کرنا آسان نہیں تارا بیگم! بعد میں پھر تم ہی کو اٹھانی پڑے گی کون خرمستا زیادہ مستی میں ہے' کس کے سینگ نکلے ہوئے ہیں۔"

"خدا آپ کا بھلا کرے' یہی تو بندی کہہ رہی ہے۔" تارا بیگم ہنس کے بولی۔ "ہر ایک کے لیے نہیں' سانڈوں کے لیے التجا کرتی ہوں۔"

بھل انہماک سے ان دونوں کی نوک جھونک سن رہا تھا اور خشک میوے کے دانے ٹونگ رہا تھا۔ بائیں جانب سے دونوں بچیاں پھر کمرے میں وارد ہوئیں۔ اس بار وہ بھاپ اڑاتے آلو کے کباب اور پاپڑ کی قابیں لائی تھیں۔ تارا بیگم نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کے خود کو ملامت کی کہ اپنی باتوں میں اسے ہماری تواضع کا خیال نہیں رہا۔ بھل کے منع کرنے کے باوجود اس نے طشتری میں مٹھائی کے دانوں کا اضافہ کر دیا۔

پھر وہ ان کے پاس سے ہٹ کے ہمارے سامنے آ کے بیٹھ گئی۔ اس کے آنے سے ہمارے گرد خوشبو کا ایک حصار سا کھنچ گیا۔ خوشبو میں بھی کیسا سحر یا نشہ سا ہوتا ہے۔ ہم تو ہاروں ست گئے۔ اتنے قریب سے اسے دیکھنے کا موقع اب ملا تھا۔ اس کے ہاتھ بہت نرم و نازک تھے' انگلیاں لمبی لمبی' آنکھیں چمکیلی اور گہری۔ فانوسوں کی روشنی میں سرخی اور غازے کی جھلک = اور تاب دار ہو گئی تھی۔ عمر میں کمی اور حسن میں افزونی کے اس فریب سے' دیکھنے اور دکھانے والے دونوں' اچھی طرح واقف ہوتے ہیں پھر بھی یہ اچھا لگتا ہے۔ تارا بیگم کی آنکھیں پہلے مجھ پر' پھر جمرو اور زور دار جھلکتی ہوئی بنّے خاں پر ٹھہر گئیں "مبارک ہو خاں صاحب! تخت پر بیٹھ کے ہم خاک نشینوں کو بھول نہ جایئے گا۔"

بنّے خاں کسی قدر کسمسا کے اور مسکرا کے رہ گیا۔

"اجازت ہو تو بندی کچھ عرض کرے؟" بنّے خاں نے بڑا کے جیسے آنکھیں کھول دیں۔ تارا بیگم طرح داری سے

زمیں جنبد.....

اُسے نیند نہ آنے کی شکایت ہے' وہ ہر چند روز بعد جاگ جاتا ہے۔

وہ ایک کتاب لایا جس کا نام تھا "سستی کیسے دور کی جائے" یہ کتاب اُسے اس کی بیوی نے پڑھ کے سنائی۔ اُس کی بیوی یہ نہیں بتا سکتی کہ وہ کتنا اونچا ہے اس لیے کہ اُسے اس نے مدت سے کھڑے ہوتے نہیں دیکھا۔ اسے نہیں معلوم کہ اس کی سات سالہ خارش کھجانے سے ٹھیک ہو سکتی ہے' اُس نے کبھی کھجایا نہیں۔

کسی کاہل کی طرف سے جس نے اپنا نام نہیں لکھا

بولی "جب اُدھر کے ہنگاموں سے جی گھبرا جایا کرے تو کبھی کبھی اس طرف کا رُخ کر لیا کیجیے۔ تازہ ہوا کا احساس ہو گا۔"

"کبھی کبھی کیوں تارا بیگم؟" جمرو نے چہک کے کہا۔

تارا بیگم کا چہرہ اور لال ہو گیا۔ اس نے اشتیاق نگاہوں سے جمرو کو دیکھا اور سینے پر ہاتھ رکھ کے بولی۔ "کیوں نہیں' بسرو چشم' بسرو چشم لیکن بندی جانتی ہے' چوکی پر بیٹھنے کے بعد خاں صاحب کو کہاں موقع ملے گا۔ کلن خاں مرحوم کا بھی یہی حال تھا۔ مہینوں گزر جاتے تھے صورت دیکھے ہوئے۔ الفت کو نخاس سے لے جانے کے بعد تو انھوں نے اس طرف آنا ہی بند کر دیا تھا۔"

"یہ' یہ الفت کا کیا چکر تھا؟" جمرو نے اٹھلاتے ہوئے پوچھا۔

تارا بیگم نے گہری سانس کھینچی۔ "رہنا ہوا ویرانے سے کیا حاصل' جب کریدتا ہوا دل بھی دکھتا ہو۔"

"کچھ خبر ملی الفت کی؟"

"کسے معلوم' خدا ہی بہتر جانتا ہے۔" تارا بیگم سرد آہ بھر کے بولی۔ "کہاں چلی گئی بدنصیب۔ خدا گواہ ہے' بندی نے کلن خاں کو اشاروں کنایوں میں خبردار کیا تھا۔ الفت کو بھی سمجھایا تھا لیکن دونوں پر جنون سوار تھا۔ بازار کی عورت سے بیاہ ایسا آسان نہیں ہے میاں! بالا خانے پر بیٹھ کے عورت چاہے کتنی گھر گرہستی کی آرزو کرے لیکن اپنا گھر' اپنی چار دیواری اُسے ملتی کہاں ہے۔ جاتی تو یہاں سے اکیلی

ایک مرد کے ساتھ ہے مگر صرف ایک شخص سے تو واسطہ نہیں رہتا۔ سینہ چھلنی کر دیتے ہیں آس پاس والے۔ دیکھ لیجیے' ڈیڑھ دو سال ہی بات چلی' وہ بھی جانے کس طرح۔ کبّن خاں بے چارے نے تو دہرا صدمہ سہا۔ ایک بیوی کا' دوسرا بیٹے کا۔"

"پر اس میں کبّن خاں کا کیا دوش تھا۔" جمو نے تیزی سے کہا۔ "کبّن نے الفت کے لیے کچھ کمی لڑی تھی۔ اس نے کیا نہیں کیا تھا۔"

"بندی کو معلوم ہے۔ بالا خانے سے کسی عورت کو گھر لے جانے والے مرد کا ایثار بے شک بڑا ہوتا ہے۔ عورت تو عزت کی بھلائی کی جستجو میں بالا خانے سے جاتی ہے۔ الفت نے اتنی قربانی نہیں دی جتنی کبّن خاں نے دی تھی مگر آدمی کو تین اور طرف بھی دیکھنا چاہیے۔ بالا خانے کی عورت کے طور طریقے' رہن سہن' سوچ فکر سبھی کچھ گھر کی عورت سے الگ ہوتا ہے۔ بندی پوچھتی ہے۔" تارا بیگم کی آواز کرکرا سی گئی۔ "جوانی اور عاشقی کا ساتھ اس قدر کیوں ہے صاحب! جوانی کا طوفان ختم ہو جانے پر عاشقی بھی پھیکی پڑ جاتی ہے۔ مرد کا کچھ نہیں جاتا مگر بالا خانے کی عورت کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔"

"پر الفت کو کون سی تکلیف تھی۔" جمو نے تلخی سے کہا۔ "اس کو کبّن خاں نے نکالا ہے کیا؟"

"بندی کب کہتی ہے۔ اصل بات تو الفت ہی جانتی ہے۔ کچھ تو ہو گا جو کم بخت دودھ پیتے بچے کو لے کر چلتی بنی۔ کنویں میں ڈوب گئی یا کوستی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ کوئی عورت ایسے ہی تو گھر بار نہیں چھوڑ دیتی۔"

"بالا خانے کی دس عورتوں کو ہم بھی جانتے ہیں مہارانی!" جمو نے منہ بگاڑ کے کہا۔ "گھر جا کے انھوں نے پھر بالا خانے کی طرف نہیں دیکھا۔"

"بندی بھی واقف ہے۔" تارا بیگم کے نتھنے پھول گئے۔ "پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں۔"

"الفت نے کبّن کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ اسی واسطے کبّن نے اس کا پیچھا نہیں کیا۔ نہیں تو ڈھونڈ نکالنا کبّن کے لیے کیا مشکل تھا۔"

"ہاں۔" تارا بیگم اداسی سے بولی۔ "ٹوٹ گیا ہو گا۔ انھی نے اچھا کیا جو الفت چھوڑ دیا۔ یہی تو بندی کہتی ہے۔ بالا خانے ہی ٹھیک رہتی ہے۔ وہ گھروں سے نہیں چھیڑنا چاہیے۔"

"نہیں تارا بیگم! میں نہیں مانتا۔" کہا۔ "بالا خانے کی عورت کے چار ہاتھ ہیں کیا؟ اس کا من نہیں ہوتا کیا؟ وہ بھی والے کسی پاگل دیوانے کے لیے بے کل ہو

"ہو سکتی ہے' کیوں نہیں' لیکن دل کے دماغ بھی دیا ہے۔ دل کا چلا جانا دماغ کا چلا جانا چاہیے۔"

"ایک بات پوچھوں تارا بیگم؟" جمو نے

"اندازہ ہے' کیا پوچھیں گے آپ' بندی نے پیچھے رکھا ہے' اور ٹھیک ہی کیا ہے۔ کوئی ملال بھی

"اچھا ہے' پر ادھر بھی کے ساتھ تو ایسا نہیں گا۔"

"سب کی بات میں نہیں کرتی۔ میں تو پہلے ہی سے کہتی تھی۔ اب بھی میرا یہی کہنا ہے۔ بالا خانہ طرح ہوتا ہے۔ یہ تو گزرگاہ ہے' اسے سرائے کی یہ تو سیر و تفریح کی جگہ ہے۔ جو گھروں میں نہیں ملتا' یہاں بندوبست کرتے ہیں۔ یہ گھروں کی چیز نہیں ہے۔ میں خوش صورت لڑکیوں کی کمی تو نہیں ہوتی کہ لوگ خانے کی لڑکیوں کے والہ و شیدا ہوتے ہیں' پھر دونوں سے گزرتے ہیں۔ ساری پسندیدہ چیزیں ملکیت میں تو جاتیں۔ گلستاں کے پھول اپنی شاخوں ہی پر بھلے لگتے توڑ لیے جائیں تو گلستاں کا کیا حشر ہو۔"

"پر من کی بھی کوئی بات ہوتی ہے تارا بیگم! سارا آدمی کے بس میں نہیں۔ تم بھی تو ادھر آدمی پر جادو ہو۔"

"پر کوئی فریب تو نہیں۔ واپسی کے لیے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ شمعیں بجھا دی جاتی ہیں۔ جو کچھ ہے' عیاں ہے' کچھ ڈھکا چھپا تو نہیں ہے۔ بالا خانے بازار میں ہوتے ہیں

شرفا کی بستیوں میں نہیں۔"

"وہ اپنی شرتی بیتا یاد ہے؟ وہ کسی شاعر کا شعر گاتی تھی، عشق پر نہیں زور کیا تھا وف۔۔۔؟ پورا یاد نہیں آ رہا۔"

"عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب۔" تارا بیگم کھل کھلا کے بولی۔ "جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے۔ غالب کا شعر ہے۔"

"ہاں ہاں وہی، کسی کا بھی ہو، گاتی اچھا تھی۔" جمو نے اُچک کے کہا۔ "کیا بولتی ہو پھر؟"

"عشق اپنی جگہ ہے، پر ملکیت تو شرط نہیں، کیا عشق کے لیے لازم ہے کہ محبوب ملکیت میں آئے؟ میرے کہنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ آدمی کو دور کا بھی دیکھنا چاہیے۔ آدمی کو ایسا بےگانہ نہیں ہو جانا چاہیے۔"

مجھ سے چپ نہ رہا گیا۔ "آپ کا کلام بھی خوب ہے۔" میں اپنے لہجے کی برشتگی دور نہ کر سکا، میں نے تارا بیگم سے کہا۔ "دل جوئی بھی، دل شکنی بھی۔ اقرار و انکار، آمادگی و بیزاری، دروازہ کھلا رکھنا، دروازہ بند کر دینا، تماشاگاہ کا وقت مقرر ہے لیکن تماشے کا اثر تو دروازے بند ہو جانے پر بھی طاری رہ سکتا ہے۔ اکثر و بیشتر ہوش مند ہی تو آتے ہیں جو آپ کے بقول عواقب پر نظر رکھتے ہیں لیکن کبھی کوئی اپنا اختیار کھو بھی تو سکتا ہے۔ اس کا کیا ہے؟"

تارا بیگم کے سراپا میں موج سی اُٹھی۔ "آپ، آپ سے تعارف ہی نہیں ہوا بنّے خاں صاحب!" وہ تجسس آمیز لہجے میں بولی۔

بنّے خاں کے بجائے جمو نے جواب دیا۔ "یہ اپنا لالا ہے، سمجھو استاد بسمل کا بھائی، بیٹا، جو بھی سمجھو۔"

"یہ بھی کسی چوکی پر بیٹھتے ہیں؟"

"اس کے پاس بہت سی چوکیاں ہیں۔"

"گلا بالکل نہیں ہے۔"

"کیوں؟ گانے والے کی آنکھیں پیچھے کی طرف ہوتی ہیں؟" جمو نے جلی کٹی سی آواز میں کہا۔

"نہیں، خدا نہ کرے۔" تارا بیگم بے ربطی سے بولی، پھر سنبھل کے کہنے لگی۔ "مگر ان کی آنکھیں۔۔۔ ان آنکھوں میں تو بڑی آگ لگ رہی ہے۔"

"وہ تو ہے۔" جمو نے جھجکتے ہوئے تائید کی اور ...

"پر خود کو جلاتی ہیں۔"

تارا بیگم کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ "ماشاءاللہ ... یافتہ معلوم ہوتے ہیں۔"

جمو کے کچھ کہنے سے پہلے میں نے کہا۔ "صرف شا... حد تک۔"

"میں اسے کسر نفسی کہوں گی۔"

"من آنم کہ من دانم۔ میری سمجھ میں تو آپ کی ... نہیں آ رہیں۔"

"یہ وقت گزرنے کی بات ہے۔" تارا بیگم شائستگی ... بولی۔ "اور ہو سکتا ہے، میری ہی فہم کی کوتاہی ہو۔"

"موجود وقت بھی تو کوئی فریب نہیں ہوتا۔ وہ بھی ا... حقیقت ہے۔"

"جی جی۔" تارا بیگم سر ہلا کے بولی۔ "وہ بھی، بے شک، ... بھی ایک حقیقت ہے۔ آپ نے کتنی سچی اور اچھی بات ک... ہے۔"

پہلو سے شمشاد خاں کی دھمکتی آواز نے اسے متوجہ کر دیا۔ "کیا بات ہے تارا بیگم! اور کب تک امتحان لو گی؟"

تارا بیگم مجھ سے معذرت کر کے جلد ہی ہمارے پا... سے اُٹھ گئی۔ "واقعی خاں صاحب! توبہ، بندی تو جانے کہاں کھو گئی۔ اِس طرف آنے پر کچھ اور باتیں چھڑ گئیں۔"

تارا بیگم کے اشارے پر محرابوں کے پاس مؤدب کھڑی ہوئی بچیوں نے ہمارے سامنے سے کچھ سامان کم کر دیا۔ تا... بیگم چند لمحوں بعد واپس آنے کا کہہ کے اندر چلی گئی۔ سازندوں نے آہستہ آہستہ ساز تیز کر دیے تھے۔ طبلہ ان میں سب سے نمایاں تھا۔ زورا تو باقاعدہ تھرکنے لگا۔ پانچ سات منٹ بعد محرابوں کے پار ایک دروازے سے تارا بیگم نمودار ہوئی۔ اس کے عقب میں چوڑی دار سفید پاجامے، گھیردار گلابی کرتے اور ہرے دوپٹے میں ملبوس نوجوان لڑکی چاندنی بانو کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ نکلتا ہوا قد، کتابی صورت، ترشا ہوا سراپا، ترشے ہوئے نقش و نگار، بڑی بڑی شربتی آنکھیں۔ لمبے سیاہ بال، رخسار شعلوں کی طرح دہک رہے تھے۔ کسی دلہن کی طرح سجی بنی۔ کانوں میں ہیرے

بھکے' ناک میں لال ڈوری کے ذریعے کان تک
ہوئی تھی۔ کلائیوں میں طلائی چوڑیاں' گلے میں گی
ہار' پیروں میں پازیب۔ صرف جھومر کی کمی تھی۔ وہ
کرتی فرش کے وسط میں آ کے کھڑی ہو گئی۔ سب
نگاہیں اسی پر مرکوز تھیں۔ سازندوں نے ساز بند کر دیے
کمرے میں سکوت چھا گیا۔ چاندنی بانو کے سرخ ہونٹوں پر
مسکراہٹ رقصاں تھی۔ اس نے خمیدہ سر سے پہلے
شمشاد خاں اور بھُمل کی جانب' پھر ہماری طرف رُخ کر کے
کیا اور فرش پر خاص انداز سے بیٹھ گئی' اس طرح کہ
لہنگے کے گھیر نے دائرہ بنا دیا۔

"واہ تارا بیگم! واہ۔" شمشاد خاں نے بے ساختہ صدا
بلند کی۔ "یہ تو موتی کی طرح ہے۔ روز اس کی نظر اتارتی
رہو۔"

چاندنی بانو نے شرم سے سر جھکا لیا۔ تارا بیگم نے
مخصوص انداز میں دونوں ہاتھ کانوں پر گھما کے انگلیاں
چٹخائیں اور چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "کوئی کَل نہیں
شمشاد خاں صاحب!"

"جی ہم نے کم سنا تھا۔"

"عنایت ہے آپ کی۔" تارا بیگم دلکش آواز میں بولی۔

بنّے خاں اور جمو کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ زورا کو
جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ ہمارے ساتھ آنے والے اور
دوسرے لوگوں آدمی بھی دم بہ خود ہو گئے۔ جمو کو جیسے سب سے
پہلے ہوش آیا اور اس نے بنّے خاں کی آنکھوں کے آگے
انگلیاں نچاتے ہوئے کہا۔ "سنبھل کے نوشہ!"

بنّے خاں سٹ پٹا سا گیا اور مضطرب نگاہوں سے اِدھر اُدھر
دیکھنے لگا۔ دونوں نوعمر لڑکیاں گھنگرو لے آئیں۔ چاندنی نے
لہنگے میں چھپے ہوئے پیر نکال کے ان کے سامنے کر دیے۔
انہوں نے پازیب اُتار کے پیروں میں گھنگرو باندھ دیے۔
اس کے ساتھ سازندوں نے ساز بجانا شروع کر دیے۔ تارا بیگم
جا کر شمشاد خاں اور بھُمل کے قریب بیٹھ گئی اور چاندنی بانو
کی سوالیہ نظروں کے جواب میں اس نے شمشاد خاں سے
اجازت طلب کی۔

"ضرور ضرور' ہم تو کب سے اس گھڑی کو ترس رہے



ہیں۔" شمشاد خاں نے خسروانہ لہجے میں کہا۔

تارا بیگم ہاتھ جوڑ کے عاجزی سے بولی۔ "کوئی خامی ہو تو
بچّی سمجھ کے نظر انداز کر دیجیے گا۔"

"ہم کو معلوم ہے' بالکل نہیں ہو گی۔ اوپر والے نے
اس کو بنانے میں پورا وقت لیا ہے۔ یہ تو اوپر سے نیچے تک
سُر میں ہے۔"

"دیکھیے۔" تارا بیگم اضطراری آواز میں بولی۔ "بندی
کے پاس جو کچھ تھا سب اِس کے سُپرد کر دیا ہے۔"

چاندنی بانو نے سازندوں کی جانب کن انکھیوں سے دیکھ
کے گنگنانا شروع کیا۔ بنّے خاں اور جمو سیدھے ہو کے بیٹھ
گئے۔ اُس کی گنگناہٹ سے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ خوش ادا
ہے' قدرت نے آواز کی عطا میں بھی خوب فیاضی کی ہے۔
چاندنی نے سودا کی غزل سے آغاز کیا۔

ہوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

مجھے نصیب میاں یاد آ رہے تھے۔ کہتے تھے 'سب سے
پہلی شرط تو کسی کا شعر میں ہونا ہے۔ ایسا لگتا جیسے کمرے میں ہر
سُو گھنٹیاں بجنے لگی ہوں اور روشنی بھی مترنم ہو گئی ہو' ہوا
بھی چاندنی کے ساتھ گا رہی ہو۔ اُس کی ادائی' زیر و بم' ایک
سوز و گداز' سازوں سے ہم آہنگی' مُرکی' بہلاوا۔ لگتا تھا چاندنی
کا بدن پگھل رہا ہو اور اس کے مرتعش ہونٹوں سے ترنم کی
کرنیں پھوٹ رہی ہوں۔ آواز کے بھی کیسے کیسے روپ
ہوتے ہیں۔ فنکار کا انہماک' اس کی شمولیت لازم ہے۔
چاندنی آپ اپنی اسیر معلوم ہوتی تھی۔ مصوّر اپنے شاہکار میں
خود بھی تو گم ہو جاتا ہے۔

ادھر اس نے غزل سرائی ختم کی اُدھر شمشاد خاں اُٹھ گیا۔ اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کے چاندنی بانو گھبرا سی گئی' اُس کی غزالیں آنکھوں میں وحشت اُمڈ آئی۔ شمشاد خاں نے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور اپنے گلے سے سونے کی زنجیر اتار کے چاندنی بانو کے گلے میں ڈال دی۔ چاندنی بانو نے جُھک کے اسے سلام کیا۔

"اسے چُھپا کے رکھو تارا بیگم! اسے چُھپا کے رکھو۔" شمشاد خاں بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"ہاں خاں صاحب!" تارا بیگم کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ "ہے تو یہی بات۔"

"بتاتا ہوں تم کو۔" شمشاد خاں تمسخی لہجے میں بولا۔ "ڈاکا پڑ جائے گا۔"

"اسی لیے کہتی تھی' آپ کیسے رکھوالے ہو۔"

"جتنی جلدی مول تول کرلو' اچھا ہوگا ورنہ دیر نہ ہو جائے' دیر ہو جائے گی۔"

تارا بیگم کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں' وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ چاندنی بیگم نے داغ کی غزل شروع کر دی تھی۔

بھنویں تنتی ہیں' خنجر ہاتھ میں ہے' تن کے بیٹھے ہیں۔

سب گُنگ بیٹھے رہے۔ نعرۂ تحسین و آفریں بلند کرتے ہوئے شاید سب کو چاندنی بانو کے منتشر ہو جانے کا خدشہ تھا یا یہ اُس کی آواز کا سحر تھا جس نے سب کو جکڑ سا رکھا تھا۔ چاندنی بانو کو راگوں کی باقاعدہ تربیت دی گئی تھی۔ جب وہ تان اُٹھاتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ بس اب ٹوٹا' اب ٹوٹا' جیسے بدن کا شیشہ ٹوٹ جائے گا' چاندنی کرچیوں کی طرح فرش پر بکھر جائے گی۔ نصیب میاں کہتے تھے "آواز کی پہلی خوبی لحن ہے تو دوسری قابو یافتگی۔ کھینچو تو کھینچی چلی جائے' سمیٹو تو سمٹی چلی جائے۔ اٹھے تو آسمان سے جا لگے' اترے تو پاتال جا چھوئے۔" نصیب میاں کو سُر کی بڑی پہچان تھی۔ کلکتے کے اڈے پر جب کوئی سُر سے اُترتا تھا تو اُن کا منہ بگڑ جاتا تھا' وہ کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے یا اُٹھ کر چپکے سے باہر چلے جاتے۔ رقص و سُرود کے بارے میں مجھے جتنی شُد بد تھی' اس کا بیشتر نصیب میاں کا بتایا ہوا تھا۔ کبھی کبھی' طبیعت کی روانی کے وقت وہ بہت سی باتیں اور یادیں سناتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ آواز کا راست دل سے ہے۔ آواز کی کمان سے نکلا ہوا تیر پر جا کے لگے' بات تو تب ہے۔ مگر گردشِ وقت سے گرد بنتا ہے اور یہ مبالغہ نہیں کہ ٹھہرا ہوا پانی [illegible] ہے۔

تیسری غزل کے اختتام پر چاندنی بانو فرش سے [illegible] اور اُس نے ستار کی سنگت پر ناچنا شروع کر دیا۔ طبلہ [illegible] دینے لگا۔ چاندنی بانو نے جیسے خود کو تال کے سپرد کر دیا۔ اس کا اپنا کوئی ارادہ نہ رہا۔ یہاں تک کہ صرف ناچ نظر [illegible] ناچنے والی اوجھل سی ہو گئی۔ طبلچی درمیان درمیان میں لگا کے رقص کی شدت اور بڑھا دیتا۔ رقص کی یہ [illegible] حرکات و سکنات کسی جبلی تحریک' تائید و تسکین [illegible] کے بغیر ممکن نہیں۔ چاندنی پھولوں کی طرح لطیف [illegible] طرح نرم و نازک تھی۔ اتنی توانائی جانے کہاں سے [illegible] آگئی تھی۔ رقص کے دوران اس کا رنگ اور نکھر [illegible] اور خون رنگ ہو گیا تھا۔ بمبئی میں کرشنا جی کے ساتھ ایک بار جنوبی ہندوستان کی کسی رقاصہ کا ایسا ہی ایک بھارت ناٹیم دیکھا تھا۔ وہ اپنے فن کی ماہر تھی۔ اس [illegible] انگ انگ پھڑکتا' تھرکتا تھا۔ لگتا تھا بس آخری رقص [illegible] رقص کرتے کرتے بس فنا ہو جانے کی آرزو ہو۔ چاندنی [illegible] طور اس سے کم نہیں تھی۔ اس کے اعضا ستار نواز [illegible] اور طبلے کی تھاپ سے بندھے ہوئے تھے۔ سبھی کا عالم [illegible] تھا۔ کہیں پلک جھپکنے میں کچھ کھو نہ جائے' سبھی [illegible] برق اندام چاندنی کو دیکھ رہے تھے۔ پھر ستار نواز [illegible] راگ الاپنا شروع کر دیا۔

برکھا میں گوری ابھاگن
رتیاں بتائے جل جل کے

گیت کے بولوں پر چاندنی یاس و الم کی تصویر [illegible] کبھی لہروں کی طرح اس کا بدن امڈنے لگتا' کبھی [illegible] طرح بھڑکنے لگتا' جمرو اور زورا کا بس نہیں چل [illegible] چاندنی کے ساتھ رقص میں شامل ہو جائیں۔ میرا [illegible] دھڑک رہا تھا۔ اچھا ہوا کہ ستار نواز نے [illegible] اپنی آمد کا تمام کر دی اور چاندنی کو قرار آگیا۔

...خاں سر جھٹکنے لگا۔ داد و تحسین کے جواب میں
...بار آداب کرتی۔ رقص ختم کرتے ہی چاندنی
...طرح غائب ہو گئی۔ کمرے میں سناٹا ہو گیا۔
...بیگم؟" شمشاد خاں بدحواسی سے بولا۔ "یہ کیا؟
...یں؟"

...لے۔" تارا بیگم نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے
...سائیں۔ "ذری دم تو لینے دیجیے سرکار۔"
...خاں نے اطمینان کی سانس لی' پھر بے چینی سے
...ہم سے کسی اور کو نہ دیکھا جائے گا۔"
...امراؤ آئے گی۔" تارا بیگم مسکرا کے بولی۔ "بس
...والی ہے۔"
...ہم بھی کوئی نواب ہوتے۔" شمشاد خاں نے
...کہا۔
...سے کیا کم ہیں خاں صاحب!"
...ٹھیک کہتی ہو۔" شمشاد نے زہر خند سے کہا۔ "پر
...کے لیے کوئی جاگیر نہیں ہے پاس۔"
...کے دو لفظ ہی بندی کے لیے جاگیر کے مانند ہیں۔
...والے تو صبح و شام یہاں آتے ہیں۔"
...خاں ابھی تک بت بنا ہوا تھا۔ جمرو نے اس کے بازو میں چٹکی بھری تو وہ اچھل پڑا۔ "کیا ہے نوشہ! اب بچے کو آیا سا جنا۔"

"جمرو بھائی!" بتّے خاں کی آواز سنسنا رہی تھی۔ "تم نے تم نے دیکھا؟"

"نیا نہیں ہے جانی!" جمرو نے بہ ظاہر بے اعتنائی کا اظہار کر کے بتّے خاں کی شدّت کم کرنے کی کوشش کی۔

"اپنے لیے بالکل نیا ہے۔" بتّے خاں تھتھاتی آواز میں بولا۔

"پرانا بھی ہو جائے گا۔" جمرو نے بتّے خاں کی ران پر تھپکی دی۔ "ابھی وہ ایک دانت کی کسر ہے۔"

"کیسی ہے وہ؟" بتّے خاں نے بچّوں کی سی سادگی سے پوچھا۔ "شہزادی ہے بالکل۔"

"اچھی ہے۔" جمرو نے سرسری انداز سے کہا۔ "اپنے کو ہاتھ لگنے والی چیز اچھی لگتی ہے۔"

"ہاں ہاں۔" بتّے خاں کی آنکھیں بجھ گئیں۔ "ایمان سے بولو جمرو بھائی! اس کے ملنے کے بعد کسی اور چیز کی کیا ضرورت' پھر اور کیا چاہیے۔ آدمی اسی کو دیکھا کرے۔"

بتّے خاں بہت اضطراب میں معلوم ہوتا تھا' کہنے لگا۔ "کیوں' غلط کہتا ہوں کیا؟"

"ٹھیک ہی بولتا ہے بھائی جان!" جمرو نے بوجھل آواز میں کہا۔ "پر دنیا میں کتائی نہیں ہے۔ ایک کے اوپر ایک پڑا ہے۔"

بنّے خاں کہیں کھو سا گیا۔

"یہ بلبلیں اڈّے کے آدمی کو راس نہیں آتیں۔" جمرو نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔

"پر اس کے ملنے کے بعد اڈّے کی کیا ضرورت ہے۔" بنّے خاں بھڑک کے بولا۔

"اڈّے پر ویسے بھی رہنے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

وہ دونوں مجھے گھورنے لگے اور بنّے خاں سر ہلا کے بولا۔

"ہاں لاڈلے بھائی' پھر اڈّا کیا بیچتا ہے سالا۔"

"میں تو چاندنی کے بغیر بھی کہہ رہا ہوں۔" میں نے وضاحت کی۔

"اڈّے سے نکلنا بہت مشکل ہے لاڈلے بھائی!" بنّے خاں پژمردگی سے بولا۔

"کیا مشکل ہے۔" میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ ارادہ ہو تو اڈّا چھوڑ دینا کیا دشوار ہے۔ دفعتہً سامنے سے بجلی سی چمکی۔ چاندنی بانو دوبارہ نمودار ہوئی۔ اس نے اتنی جلد لباس تبدیل کر لیا تھا۔ چہرہ گل نار ہو رہا تھا۔ جھمکیوں کی جگہ اب کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں پڑی تھیں' ناک میں لونگ آویزاں تھی۔ فرش پر ایک خاص انداز سے بیٹھ کر اس نے مسکراتی نظروں سے سر گھما کے دیکھا اور جیسے ہی ساز بلند ہوئے' وہ نغمہ سرا ہو گئی۔ ہم لوگوں سے اب وہ اتنی دور نہیں بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ رقص کناں تھے۔ لہراتے ہاتھ' تھرکتی انگلیاں اور بل کھاتی پلکیں شعروں کا مفہوم اور سازوں کا زیر و بم اور اُجاگر کر رہی تھیں۔ لگتا تھا' چاندنی بانو کو اساتذہ کا کلام خوب یاد ہے۔ اس نے یکے بعد دیگرے ولی دکنی' میر' غالب اور آتش کی غزلیں سنائیں۔ شمشاد خاں مسلسل جھوم رہا تھا۔ بھمل کا اشتیاق بھی دیدنی تھا۔ جمرو اور زورا کے دست و بازو بار بار پھڑک اٹھتے۔ بنّے خاں کا حال البتہ مختلف تھا۔ وہ تو جیسے پتھر بن گیا تھا۔ آواز میں بھی کیسا نشہ ہوتا ہے' آدمی اپنے آپ میں نہیں رہتا۔ سب خود سے بے گانے ہو گئے تھے۔

شمشاد خاں نے کچھ کہا ہو گا کہ تارا بیگم کے اشا... چاندنی بانو بھمل اور شمشاد خاں کے سامنے آ کے ... بھمل نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکال کے چپکے ... خاں کی طرف کھسکا دی۔ شمشاد خاں کو بھمل کی جا... اس خسروی کی توقع نہیں تھی۔ ایک ثانیے کے لیے ا... حیرت طاری ہوئی لیکن پھر اس نے گڈی کھول کے سا... نوٹ چاندنی بانو پر نچھاور کر دیے۔ جمرو بھی خالی نہیں ... چاندنی کو پاس بلانے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ وہ بھی ... سامنے رکھے۔ یہی ہوا۔ تارا بیگم نے کن انکھیوں سے ... کو ہدایت کی اور شمشاد خاں کی طرف سے اٹھ کے چاند... ہمارے پاس آ گئی۔ اتنے قریب سے اس کی تجلّی کا منظر ... اور تھا' رخساروں سے کرنیں سی پھوٹ رہی تھیں۔ چا... جل رہا ہو۔ جمرو نے اور اضافہ کیا۔ نوٹوں کی گڈی چاند... سر پہ گھما کے پرے بیٹھے ہوئے سازندوں کی جانب ... دی۔ فرش پر پرزے ہی پرزے بکھر گئے۔ چاندنی نے اس ... دستا کے جواب میں اسے آداب کیا اور غزل مکمل ہو... ہمارے پاس سے اٹھ کے جانے لگی' جمرو نے اسے روک... اور وارفتہ لہجے میں بولا۔ "آپ تو کمال کرتی ہو۔ اتنا ... آپ نے کدھر سے سیکھ لیا؟"

چاندنی بانو کا سراپا دوہرا ہو گیا۔ "کنیز کو کیا آتا ہے۔" اس نے کھنکتی ہوئی آواز میں جھجکتے جھجکتے کہا۔

"آپ کو کیا معلوم' کیا نہیں آتا آپ کو' تیر چلانا' ... گرانا۔" جمرو مچل کے بولا۔ "تھوڑا سننے اور دیکھنے والے ... بھی دھیان کیا کرو۔ آپ تو بہت امتحان لیتی ہو۔"

چاندنی بانو کا چہرہ اور سرخ ہو گیا۔

"ابھی ایک بات پوچھئے؟" زورا نے اِدھر اُدھر دیکھ ... رازدارانہ انداز میں کہا۔

چاندنی بانو کی آنکھوں میں بے چینی ہویدا ہوئی۔

"ابھی آپ کو' آپ کو یہ سارا کیسا لگتا ہے؟" زورا نے ... سرگوشی میں پوچھا۔ "اپن کا مطلب ہے یہ سارا۔۔۔"

زورا کی مراد محفل آرائی سے تھی۔ چاندنی بانو بھی ... گئی مگر اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ مضطرب ہو کے ...

...وے لوگ کے آگے گانا گانے کا۔" جمرو
...سے پہلے ہی زورا کو خیال آ گیا کہ وہ بلاغت
...ہے۔ اس نے لجاحت سے کہا۔ "ابھی آپ کو
...میں ہونے کا تھا۔ پتہ ہے 'ابھی ایدر کا سرات
...تھا۔" زورا نے سانس لینے کے لیے تامل کیا
...چہرے پر نظریں جما کے کہنے لگا۔ "ماں قسم '
...آپ کے مل جانے پر اور کیا چاہیے' آپ مل
..."

...دن لد گیا۔ بنے خاں مبہوت بیٹھا تھا۔ دونوں کی
...گئیں اور دونوں ہی شاید ایک دوسرے کی تاب

...بھی ایک بات پوچھیں راج کماری!" جمرو نے
...میں کہا۔ "ہو سکے تو جواب دینا۔"
...گھبرا سی گئی۔
...ہیں' مرد کا بھی تو کوئی مول ہوتا ہے۔"
...کی آنکھیں جلنے بجھنے لگیں۔ اس کے لیے
...آسان نہیں تھا۔ کھوئی کھوئی نظروں سے جمرو کو
...سے اٹکتی زبان میں بولی۔ "لیکن لکھے ہوئے کو
...ہے۔"

...نے اسے زیادہ دیر ہمارے پاس نہیں بیٹھنے دیا۔
...پر چاندنی بڑبڑا گئی اور ہم سے معذرت کر کے
...گئی۔ تارا بیگم نے اسے اندر جا کے آرام کا
...چاندنی نے حکم کی طرح مشورے کی تعمیل کی۔
...نے ساز ایک طرف کر دیے۔ کمرے میں خاموشی
...شمشاد خاں نے بھی وقت نہیں لگایا اور رخصت کی
...کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ تارا بیگم نے کچھ دیر کے لیے
...اور روکنا چاہا' دوبارہ جلد آنے کی درخواست کی اور
...کا اظہار بھی کیا کہ وہ حسب خواہش شمشاد خاں اور
...معزز مہمانوں کی مدارات نہ کر سکی۔ وہ ہمیں
...تک رخصت کرنے آئی۔ سازندے بھی گلی کے نکڑ
...ساتھ رہے۔
...میں اب اتنی چہل پہل نہیں تھی۔ پہلے کی طرح

فکر نما

ظہیر اختر بیدری

نیوڈری قوم بھارت کے صوبے کیرالہ میں آباد ہے۔ اس قوم میں آج بھی شادی کا رواج نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پانڈو دور میں اگنی دیوتا نیلا راجا کی پری پیکر بیٹی پر عاشق ہو گیا تھا اور ان دونوں میں تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ اگنی دیوتا نیلا راجا کی بیٹی کے پاس برہمن کے روپ میں آتا تھا۔ ایک دن محل کے پہرے داروں نے اسے پکڑ کے راجا کے سامنے پیش کر دیا۔ راجا نے برہمن کے لیے سخت سزا تجویز کی۔ سزا سن کر اگنی دیوتا اصل روپ میں ظاہر ہو گیا۔ بادشاہ اور درباریوں نے اس سے معافی مانگی۔ اگنی دیوتا نے خوش ہو کر ریاست میں بستی کی عام عورتوں کو شادی کی رسم سے آزاد کر دیا۔ تاریخ جنوبی ہند

راستے میں اور کئی لوگوں نے شمشاد خاں کو اپنے اپنے بالا خانوں کی محفل میں شرکت کی دعوت دی۔ دکان دار بھی ہار پھول' چائے' مٹھائی اور پان وغیرہ سے تواضع کے لیے اصرار کرتے رہے۔ شمشاد خاں کہیں نہیں ٹھہرا۔ ہم آہستہ قدموں سے دور نکل آئے۔ بنے خاں بالکل گم صم تھا۔ جمرو نے ازراہِ لطف پچکارنے کے انداز میں اس سے کہا۔ "ادھر لکھنؤ میں ہی ٹھکانا ہے دولہا! کل ہی کی تو بات ہے' کون روکے گا بادشاہ سلامت کو۔ گدی سنبھالنے کے بعد آنکھیں سینکنے کو پھیرے لگاتے رہنا۔ بولتے ہیں' حسینوں کا دیدار بھی ثواب کا کام ہوا کرتا ہے۔"

بنے خاں سر جھکائے چلتا رہا۔ میں اس کے قریب تھا۔ اس نے کوئی توجہ نہیں کی تو جمرو نے مجھے مخاطب کیا۔ "کالا ہے' زرچھاڑ گیا ہے۔ پہلے ہی نگے میں بھٹکا ہوا لگتا رہتا ہے۔"

"ہاں بنے بھائی!" میں نے مڑ کے بنے خاں کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ جل رہا تھا اور آنکھیں ابلی ابلی تھیں۔ میں نے اس کا ہاتھ سینے پر لگاتے ہوئے کہا۔ "پیارے صاحب! کیا حال ہے؟"

میری اس سے ایسی بے تکلفی نہیں تھی' جانے اسے کیا ہوا' بے اختیار مجھ سے چمٹنے کے لیے امڈ پڑا۔ میں نے بھی اپنے بازو پھیلا دیے۔ آنکھوں کی طرح سینے کی بھی کوئی زبان ہوتی ہے۔ مجھے ایسا لگا جیسے اسے کسی پناہ کی ضرورت ہے'

جیسے اس کا وجود مجھ میں پیوست ہو جائے، مجھ میں چھپ جانے کے لیے بے قرار ہو۔ میں نے اسے زور سے جکڑ لیا۔ چند لمحے مجھ پر کشاکش کے گزرے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے لیے کیا کروں، جی چاہتا تھا کہ اس کی نشاطِ خاطر کے لیے احکام صادر کروں۔ اسے کوئی یقین دلاؤں مگر جلد ہی مجھے اپنی توفیق و استطاعت کا احساس ہو گیا۔ اس کے لیے اپنی اس ہمہ جائی و ہمہ دلی کے باوجود میرے بس میں کیا تھا۔ میں نے اپنے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی کی اور کسی موہوم عزم کی تلقین کے لیے اس کی کمر تھپکی دی۔ شمشاد خاں اور بھمل ہم سے آگے چلے گئے تھے۔ ہم نے بھی رفتار تیز کر دی۔

چند قدم بعد ہی میرے پیر اکھڑنے لگے۔ میں نے بدحواسی سے زورا اور جمو کو ٹھہر جانے کے لیے کہا۔ بنّے خاں بھی رک گیا۔

"ٹھیک تو ہے؟" جمو پریشان ہو گیا۔

"ہاں اب ٹھیک ہے۔" میں نے زورا سے کہا کہ وہ آگے جا کے بھمل اور شمشاد خاں سے کہہ آئے کہ ہم کچھ دیر میں آگے، واپس آئیں گے۔

ایک لمحے کے پیش و پس کے بعد زورا لپکتا ہوا آگے چلا گیا۔ "کیا وچار ہے مہاراج!" جمو معنی خیزی سے بولا۔

"واپس چلتے ہیں جمو بھائی!"

"واپس اب کدھر کو بھیا جی؟"

"وہیں تارا بیگم کے ہاں۔"

جمو سیدھا ہو گیا اور اس نے میری کلائی پر ہاتھ ڈال کے نبض ٹٹولنا چاہا۔ "اُدھر اب کیا رکھا ہے میرے باپ۔"

جمو کی بھنویں کھنچ گئیں۔ اتنی دیر میں زورا آ گیا۔ "دیکھتے ہیں جمو بھائی!" میں نے اس کی منت کی۔ "آؤ جلدی سے۔ ابھی سوئی نہیں ہو گی وہ تارا بیگم۔"

"ہے ہا لے۔" جمو جز بز ہو کے بولا۔ "اُدھر اُدھر کیا۔۔۔"

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ مار کے اُسے دھکیلا تو وہ چپ ہو گیا اور کندھے اُچکا کے ہونٹ سکیڑتا ہوا چل پڑا۔

چند ہی منٹوں میں ہم بالا خانے کی گلی میں داخل ہو گئے۔ روشنیاں گل ہو چکی تھیں۔ زینے کا نچلا دروازہ بھی بند تھا۔ زورا کے کنڈی کھٹ کھٹانے پر اوپر کا دروازہ کھلا ... قدموں سے کسی کے سیڑھیاں اُترنے کی آواز ... تھا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے پوچھا۔ "کون ..."

"ہم ہیں استاد شمشاد خاں کے مہمان، ابھی ابھی ... سے گئے تھے۔ تارا بیگم سے کہو، ان سے کچھ ... کرنی ہے۔" میں نے ٹھہر ٹھہر کے کہا۔

دروازے کا ایک پٹ کھول کے اور سر نکال کے ... پہلے ہمارے بارے میں تسلی کی۔ وہ مختص ساز... شامل تھا۔ "کیا بات ہے حضور؟" گھبرائے ہوئے ... اس نے پوچھا۔

"جا کے تارا بیگم سے کہو، زیادہ وقت نہیں لیں ..." میں نے نسبتاً بلند آواز میں کہا۔

تارا بیگم بھی زینے کے اُوپر دروازے پر آ گئی ... نے متردد لہجے میں پوچھا۔ "کیا استاد شمشاد خاں ہیں ... ہے؟"

"نہیں آپا، استاد نہیں ہیں۔ بنّے خاں صاحب ا... مہمان تشریف لائے ہیں۔" سازندے نے ... میں جواب دیا۔

تارا بیگم نے کسی قدر تذبذب کے بعد سازندے ... کہ وہ ہمیں بہ عزت اوپر لے آئے۔

کمرے کی روشنیاں جلا دی گئیں۔ ہم فرش پر ... قالین کی ایک جانب بیٹھ گئے۔ تارا بیگم وہاں نہیں ... اسے باہر آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس دوران ... لباس تبدیل کر لیا تھا۔ غرارے اور کُرتے پر سفید ... سے اوڑھے ہوئے تھی، ہونٹوں پر گلابی سرخی سی تھی ...

"آپ کو زحمت ہوئی۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے ... "یقین تھا، ابھی آپ سو نہیں گئی ہوں گی۔"

"بندی کو نیند کتنی آتی ہے۔" اس نے یاسیت ... تجسس سے بولی۔ "آپ فرمایئے، زحمت تو آپ کو ہوئی ... کیا حکم ہے؟" اور میرے کچھ کہنے سے پہلے اس نے ...

"کیا پیجئے گا، چائے، قہوہ، شربت؟"

"کچھ نہیں، آپ اطمینان سے بیٹھ جایئے۔"

"یہ کیا ہوا، قہوہ بننے میں کیا وقت لگے گا۔"

ال نہیں ہے۔ بس آپ سے ایک بات کر کے چل

قریب بیٹھ گئی۔ جمو، زورا اور بنّے خاں کی
یں مجھ پر منڈلا رہی تھیں۔ "بیگم صاحب!" میں
لی آواز میں کہا۔ "جو بات ہم کہیں، سوچ سمجھ
دیجیے گا۔"
رکے "ایسی کیا بات ہے سرکار؟"
ا کرنے آئے ہیں۔" میں نے کسی لمبی تمہید سے
اور اپنی آواز دھیمی رکھنے کی کوشش کی۔ "چاندنی
ہمیں اس کی قیمت بتائیے۔"
بیگم کا عجب حال ہوا۔ سناٹا جیسے طاری ہو جائے،
پھیل گئیں، چہرے پر شکنیں پڑ گئیں۔ "کیا، کیا فرما
آپ؟" اس کی آواز بدل گئی تھی اور ہونٹ پھڑک

کیجیے، ہمیں زیادہ بات نہیں آتی۔ لاگ لپیٹ تو بالکل
بھی قیمت آپ نے چاندنی بانو کی مقرر کی ہو، ہمیں
؟"
آپ، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" تارا بیگم گھٹی
آواز میں بولی۔ "معاف کیجیے، آپ ہوش و حواس میں تو
"؟

"ہم بالا خانے پر آئے ہیں بیگم صاحب! کچھ نا وقت ضرور
مناسب نہیں۔ کوئی نئی بات تو نہیں ہے جو آپ اس
حیران پریشان ہو رہی ہیں۔"
"مگر مگر۔" اس سے کچھ اور نہ کہا گیا۔
"ہم سودا کرنے آئے ہیں، سودے بازی کرنے نہیں۔
اطمینان رکھیے۔" میں نے تحمل سے کہا۔ "ہم کمی بیشی کے
ایک حرف نہیں کہیں گے۔"
"مگر مگر" تارا بیگم بے بسی کے انداز میں بولی۔ "بندی
نے اس بارے میں کبھی نہیں سوچا۔"
"لیکن کبھی نہ کبھی تو چاندنی بانو کو آپ سے جدا ہونا
ہے۔ کبھی نہ کبھی وقت یہ مرحلہ آ سکتا ہے، تو آج ہی کیوں
نہیں، اور ابھی کیوں نہیں۔ کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ عمل
ازوقت گاہک خود چل کے منہ مانگی قیمت ادا کرنے آ گئے



ہیں۔"
"آپ کو کیا معلوم، بانو تو میرا سرمایہ، میری جائداد، میری
زندگی ہے۔ اسے کسی لائق بنانے کے لیے نہ دن کو دن سمجھا
ہے نہ رات کو رات۔ اس کے بغیر تو زندگی اجیرن ہو جائے
گی۔"
"لیکن لڑکیاں تو ہر گھر سے ایک دن رخصت ہو جاتی ہیں۔
کیا آپ یہ نہیں چاہیں گی کہ چاندنی بانو اپنے گھر میں عزت
اور سکون کی زندگی بسر کرے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، یہ
زندگی نہ آپ کو پسند ہو گی نہ بانو کو۔ اسے اگر کوئی موقع مل
رہا ہے تو آپ کو رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ اس میں آپ کا
کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔ بانو سے آئندہ جتنا فائدے کی
آپ کو امید ہے، اسے آپ ابھی سے وصول کر کے، ضرب
تقسیم کر کے۔ آپ کا کوئی گھاٹا نہیں ہونے دیں گے ہم۔"
تارا بیگم جلتی بجھتی آنکھوں سے مجھے گھورتی رہی پھر گرفتہ
آواز میں بولی۔ "آپ نے کیسی الجھن میں ڈال دیا ہے۔ سچ
یہی ہے کہ بندی نے اس بارے میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا
ہے تو جواب بھی کیا دے سکتی ہے۔"
"بیگم صاحب!" میرے لہجے میں تندی آ گئی۔ "بہتر ہے جو
بھی بات ہو، آپ تحمل سے کریں، ہر قسم کے اندیشے سے بے
نیاز ہو کے۔"

"میں کیا کہوں۔" تارا بیگم حواس باختہ سی ہو گئی اور کہنے لگی۔ "اچھا ہو گا' بندی کو سوچنے کی کچھ مہلت دیجیے۔"

"کیا سوچنے کی مہلت۔" میں نے ترشی سے کہا۔ "ہمارے پاس اور کوئی وقت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے' اس طرح آپ ایک اچھا طلب گار کھو دیں۔"

"جی' جی ہاں' ہو سکتا ہے لیکن صرف قیمت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی جناب!" تارا بیگم بے اعتنائی سے بولی "اِدھر اُدھر بھی تو کچھ سوچنا دیکھنا پڑتا ہے۔ پھر بانو سے بھی مشورہ کرنا ضروری ہے۔"

"بے شک' اس سے مشورہ کر لیجیے لیکن اِدھر اُدھر دیکھنے اور سوچنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟ کسی راجے نواب کا تو انتظار نہیں ہے آپ کو؟"

"اب آپ سے کیا کہوں۔" تارا بیگم نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اشارے تو کئی نوابوں نے کیے ہیں مگر صرف سونے چاندی کی بات نہیں ہوتی۔"

"نوابوں کے حال سے تو آپ ہم سے زیادہ واقف ہوں گی۔ بانو کو محل ضرور مل جائے گا' قالیچے' فانوس' باندیاں' شان و شوکت' پر وہ بھی آرایش کی کوئی چیز بن جائے گی۔ بیگم تو شاید وہ نہ بن سکے۔ ہم آپ کو صاف بتا دیں' ہم اُسے کسی محل حویلی وغیرہ میں نہیں لے جائیں گے' بس ایک عام سے گھر میں' مگر وہ گھر چاندنی بانو کا اپنا گھر ہو گا' اس کی حکم رانی ہو گی وہاں۔"

تارا بیگم پوری طرح متوجہ تھی' منتشر لہجے میں بولی۔ "لیکن' لیکن آپ نے ابھی تک یہ نہیں فرمایا' آپ میں سے کون' کون بانو کا طلب گار ہے؟"

"کوئی بھی! اسے افشا کرنے کی ضرورت تو نہیں ہے' بہ ہر حال ٹھیک ہے۔ آپ کی تسلی کے لیے کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ ہم بتے خاں کے لیے چاندنی بانو کو مانگ رہے ہیں۔"

بتے خاں نے آنکھیں بھینچ لیں اور زور سے میرا بازو پکڑ کر سر جھٹکنے لگا۔ میں نے اس کی پنڈلی دبا کے خاموش رہنے کی تلقین کی۔

"بتے خاں! استاد بتے خاں!" تارا بیگم حیرت سے بولی۔ "لیکن' لیکن یہ تو..."

تارا بیگم کے مزید کچھ کہنے سے پہلے میں نے جلدی کہا۔ "بانو کے آجانے کے بعد بتے خاں کا آ نہیں رہے گا۔"

تارا بیگم کی اُلجھی اُلجھی نظریں بتے خاں پر تھیں۔

"اور کوئی پیچیدگی ہو تو بتایئے؟" اپنے لہجے میں مجھے خود گراں گزری' سو میں نے توقف کیا اور نرمی "بانو کی آیندہ زندگی کے لیے بہ طورِ مہر بتے خاں ایک جائداد بھی لکھ سکتے ہیں جس کی معقول آمدنی مستقل تحویل میں اور تصرف میں رہے۔ اور کوئی بات؟" میں تارا بیگم سے پوچھا۔

"اللہ' یہ کیسی آزمایش ہے" تارا بیگم ناتوانی سے "مجھے معلوم ہوتا ہے' آپ بندی کا امتحان لے رہے بندی نے بہت دُکھ جھیلے ہیں سرکار!"

"ہمیں بھی اندازہ ہے لیکن یہ سمجھیے' اب دُکھوں جانے کا وقت آگیا ہے' سارے امتحان ختم ہوا چاہتے جانتے ہیں' آپ کا تردد بہت فطری ہے۔ ہمارا معا درخواست' کچھ بھی کہیے بہت اچانک ہے' اور ہمیں اس بھی احساس ہے کہ ہم کسی راج سنگھاسن سے نہیں' اُ چوکی سے اُتر کے آئے ہیں۔ نوابوں کو آپ نے آزما لیا' اب کچھ گلی کوچے والوں کا بھی تجربہ کر لیجیے۔ ہم رعایت کے لیے آپ سے نہیں کہہ رہے' بیگم صاحبہ! آپ قیمت بتایئے؟"

تارا بیگم کی آنکھوں سے وحشت جھلکنے لگی۔ ایسا لگ تھا جیسے اسے میری بات پر یقین نہ ہو۔ کہنے لگی "آپ کا جتنا شاہانہ ہے اتنا بے رحمانہ بھی۔"

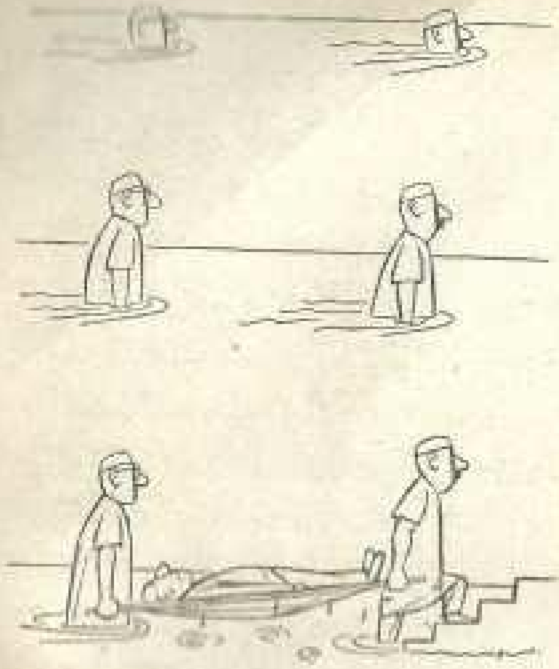
"صاف گوئی کو آپ بے رحمی سمجھتی ہیں تو جس طر آپ بتائیں' ہم اسی طرح بات کریں۔ ہمیں ہر حال میں چاندنی بانو کو یہاں سے لے جانا ہے' اور آپ کا حق ہے کہ آپ ہر طرح اطمینان کر لیں۔"

"کیا اطمینان اور کیسا اطمینان' میاں! تقدیر کے آگے ساری ضمانتیں دھری رہ جاتی ہیں۔" تارا بیگم کے لہجے میں بیزاری بھی تھی' بے رخی بھی۔ "عورتیں غریب تو تقد

ہی بیٹی ہوتی ہیں اور کیا آقا کیا غلام۔ کیا
مرد تو سبھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اپنا تو یہی
دریا میں طغیانی آتی ہے اور گزر جاتی ہے۔
سمندر بھی کل اتر سکتا ہے۔"
بانو کی تقدیر پر چھوڑ دیجیے۔ آدمی اپنی جیسی کرتا
والے کل کے بارے میں نہ آپ کچھ کہہ سکتی ہیں
بالا خانے پر چاندنی کو بٹھانے کے لیے آپ کل
سے کیا کہہ سکتی ہیں۔ جس حد تک ہمارے
ہے' بانو کو تحفظ کے لیے ہم آپ سے کہہ ہی چکے

بیگم کش مکش میں پڑ گئی۔ دیر ہو گئی' وہ کچھ نہ بولی تو
اکڑی ہوئی آواز میں کہا۔ "اتنا سوچنے کو کیا ہے تارا
کا کب کدھر آتے ہیں۔ سمجھو' قسمت کی بات
کیا الجھن ہے۔ سارا کچھ ہم نے تم پر رکھا ہے' کتنا
کو' کھل کے بولو۔"
بولوں۔" تارا بیگم ہچکچاتی لہجے میں بولی۔ "آپ ہی
"

تمہاری ہے' ہم تو گاہک ہیں۔"
کا دماغ ٹھکانے پر نہیں ہے۔"
ہیں؟ ہم نے تو کھلی چھوٹ دی ہے تم کو۔" جمرو نے
سے کہا۔ "بے فکری سے زبان کھولو۔"
بیگم کے ہونٹ لرزنے لگے۔
ہی کچھ بولیں' پچاس ہزار' ایک لاکھ!"
لاکھ۔" میں نے بہ عجلت اضافہ کیا۔
بیگم نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔
کیا' کیا ہو رہا ہے' نہیں نہیں۔" بتے خاں ہذیانی انداز
بولا اور اٹھ جانے کے لیے مجھے جھنجھوڑنے لگا۔ میں نے
کے اشارے سے کسی رمز و کنایہ کا تاثر دیا اور بتے خاں
چپ چاپ بیٹھے رہنے کو کہا۔ سب کچھ صاف تھا۔ بتے
جیسا شخص اس طرح کیسے مان جاتا۔ وہ بگڑنے لگا اور
بجائے اس نے جمرو سے تلخ و تند لہجے میں واپس چلنے
لیے اصرار کیا۔ جمرو نے توجہ نہیں دی اور اپنی جگہ بیٹھا
رہا تو بتے خاں خود اٹھ گیا۔ جمرو نے اس کی کلائی پر پنجہ
لگ



ڈال کے ایک جھٹکے سے اُسے بٹھا لیا۔ اس سے پہلے کہ بتے
خاں زیادہ مچلے اور پھیلے' جمرو نے اکڑی ہوئی آواز میں کہا۔
"تارا بیگم! کیا وچار ہے؟ اتنے دھن سے' اپنی بانو تو دکان
بڑھا کے دانے کھاوے' باقی پھر ہریالی ہے۔"
تارا بیگم نے جھرجھری سی لی۔
"اب کیا ہے؟" جمرو نے ترخ کے کہا۔
"کچھ نہیں' کچھ بھی نہیں۔" تارا بیگم ہڑبڑا کر بولی۔
کل دو خون ہو گئے ہیں' آگے دو چار اور بھی ہو سکتے
ہیں۔" جمرو نے منہ بگاڑ کے کہا۔ "کیا سمجھی ہو' کل سے شہر
میں بلوا ہوا ہے۔ سارے میں آگ لگی ہے۔"
"معلوم ہے۔" تارا بیگم ہانپتی سی بولی۔
"معلوم ہے تو پھر۔۔۔؟"
"بانو سے بھی کچھ پوچھنا ہو گا۔"
"اس سے پوچھ کے بالا خانے پر بٹھایا ہے کیا؟"
"وہ میری بیٹی ہے۔"
"پھر ماں کی طرح سوچو' اپنا تو دھن بھی ہزاروں میں ایک
ہے۔" جمرو نے بتے خاں کی ران پر ہاتھ مار کے کہا۔ "پورا
اصیل ہے۔"
"جانتی ہوں خدا نظر بد سے بچائے۔" تارا بیگم کے لہجے
میں مصنوعی شیدائیت تھی۔ "ہزاروں میں کیا' لاکھوں میں

کیجیے۔"

"پھر دیر کس بات کی ہے؟"

"اب ایسا تو نہیں ہوتا صاحب!"

"ہم لوگ اتنا نہیں سوچتے۔"

"لیکن یہ تو زندگی بھر کا معاملہ ہے۔"

"سوچ لو' لکشمی بار بار گھر نہیں آتی۔"

"کچھ وقت تو دیجیے۔"

"پھر وقت نکل نہ جائے۔"

میں نے جمو کو روکا اور تارا بیگم سے پوچھا۔ "کتنا وقت لیں گی آپ؟"

"بندی اس وقت کیا کہہ سکتی ہے۔"

"ہمیں کل یہاں سے چلے جانا ہے۔"

"اور کل کا بھاؤ پھر کل ہی دیکھیں گے" جمو نے بھڑک کے کہا۔

"بندی ایک بات پوچھنے کی جسارت کرے۔" تارا بیگم اٹک اٹک کے بولی۔ "آپ کے خیال میں بندی کو بانو پر کتنا اختیار ہے؟"

"کیا مطلب؟" جمو نے چونک کے کہا۔

"میرا مطلب ہے' کتنا اختیار ہونا چاہیے۔" تارا بیگم نے وضاحت کی اور تیورا کے بولی۔ "بندی کو انکار کا اختیار ہے نا؟"

"کیا گھما پھرا کے بولتی ہو بیگم! پھر تم سے اتنا سر مارنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"ہاں' آپ انکار کر سکتی ہیں۔" میں نے جمو سے صبر و ضبط کی التجا کی اور تارا بیگم سے کہا۔ "انکار کا کوئی جواز تو ہوگا؟"

"بتانا ضروری تو نہیں ہے سرکار!"

"لیکن وجہ جانے بغیر شاید ہم یہاں سے نہ جائیں۔" میں نے درشتی سے کہا

"کیا اتنا کافی نہیں کہ بندی ابھی بانو کو خود سے جدا کرنا نہیں چاہتی۔"

"ہاں۔" مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور میں نے جز بز ہو کے کہا۔ "ٹھیک ہے' پھر ہم آپ کو مجبور نہیں کریں گے۔"

"نہیں تارا بیگم! ایسے نہیں' بالکل نہیں۔" جمو جھنجھلا

آواز میں بولا۔ "ہم جائیں گے' پھر کوئی اور بات ہے' لوگ سے سودا کرنا نہیں چاہتیں۔ تم کو بول دیویں' کسی طرح سے بھی ہم آ سکتے تھے۔ پھر بولی نہیں لگاتے' اور بھی ہم کو آتے ہیں' سمجھیں!"

"جس لہجے میں آپ نے بات کی ہے' بس اسی رکھیے استاد!" تارا بیگم کی آواز میں بڑی ہی لرزش تھی۔

"تم بھی صاف بات نہیں کر رہی ہو' اس واسطے ایسا ہیں۔" جمو نے بھڑک کے کہا۔ "من میں کوئی تنکا ہو تو نکال دو بیگم! ایک بات پہ دھیان رکھنا۔ جو اتنی بڑی ڈھیری رہا ہے' وہ اس چیز کو بھی تم سے زیادہ سنبھال کے رکھے گا۔"

تارا بیگم سنتی رہی۔ ادھر ببّے خاں مسلسل پیچ و تاب رہا تھا۔ "شہزادے بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں؟" تارا بیگم آمیز لہجے میں ببّے خاں کی طرف اشارہ کیا۔

"میں' میں کیا۔" ببّے خاں بوکھلائے ہوئے انداز میں پھیلا کے رہ گیا اور خالی خالی نظروں سے میری اور شکلیں دیکھنے لگا۔

"استاد ببّے کے بولنے کو اب کیا دھرا ہے بیگم!" جمو زہریلی آواز میں کہا۔ "بولی بڑھوانے کا خیال ہو تو صاف دیو۔ تم کو ہم سے زیادہ پتہ ہے کہ اب نیلامی کا زمانہ نہیں اور لکھنؤ کے راجوں نوابوں میں کتنا دم درود ہے۔ کوئی دادا کی جاگیر کے پیچھے پڑا ہے تو نکل لو۔ مل جائے تو ایک اس حاتم کی اولاد کا دیدار اپنے کو ضرور کروا دینا۔"

تارا بیگم بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔

جمو کے اشارے پر ہم سب اُٹھ گئے۔

تارا بیگم کو ہمارے اس طرح اُٹھ جانے کی توقع نہیں تھی۔ وہ بے تاب ہو گئی۔ "آپ' آپ جا رہے ہیں؟"

"جانا ہی ٹھیک ہے۔" دروازے کی طرف جاتے جاتے جمو نے لوٹ کے کہا۔ "اپنا جلدی گھوم جاتا ہے۔"

"ٹھیک' لیکن یہ کیا... نہ شربت نہ قہوہ' نہ... کم سے کم ایک گلوری تو!"

"آئیں گے پھر' دیکھو شاید جلدی۔" جمو نے

ہنستے ہوئے کہا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

زینے سے اُترتے ہی بنّے خاں ہم دونوں سے چمٹ گیا۔ اس کی سانسیں اکھڑی ہوئی تھیں۔ بری طرح وہ اپنا سر میرے شانے سے رگڑنے لگا۔ اور تارا بیگم کے بالا خانے کے جھروکوں، چلمنوں سے ہم اوجھل نہیں ہوئے تھے۔ جمو نے کسی طرح بنّے کو سنبھالا اور اس کا بازو پکڑ کے تقریباً" کھینچ کر بالا خانے سے دُور لے گیا۔ چند قدموں کا فاصلہ طے کر کے ہم گلی سے نکل آئے۔ روشنیاں اور کم ہو گئی تھیں۔ کسی کسی بالا خانے پر ابھی تک محفل جمی ہوئی تھی۔ اکا دکا میں ابھی کھلی تھیں۔ بازار سے نکلتے ہی پان کی پہلی دکان پر زورا ٹھہر گیا اور تب سب کی نظریں بے اختیار بنّے خاں کے چہرے پر جا ٹھہریں۔ دکان کی تیز روشنی میں اس کے چہرے کی آگ اور نمایاں ہو گئی۔ زورا اُسے گدگدانے لگا۔ بنّے خاں کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں، ہونٹ سسک رہے تھے۔ زورا نے جانے کیا کہا تھا کہ بنّے خاں بے تحاشا میرے سینے سے لگ کے ہڑکنے لگا۔ یہ محض ممنونیت کا اظہار نہیں تھا۔ آدمی اپنے احوال سے خود بھی واقف نہیں ہوتا۔ بنّے خاں کی وحشت یقیناً کسی گزشتنی کا غبار تھی۔ ہر آدمی فسانے چھپائے پھرتا ہے، کبھی ایک تنکا، ہوا کا ایک جھونکا آبگینے کے لیے گراں ہو جاتا ہے۔ پان والا بھی گنگ ہو گیا تھا۔ جمو اور زورا بنّے خاں کو تھپکنے، تسلیاں دینے لگے۔ بہت مشکل سے انھوں نے اسے قابو میں کیا۔ تانگا قریب ہی کھڑا تھا۔ گوریاں ساتھ لے کے ہم نے تیزی سے تانگے کا رخ کیا۔

اڈّے پر رت جگے کا منظر تھا۔ رنگ برنگی جھنڈیوں سے ساری گلی سجی ہوئی تھی۔ اڈّے کی عمارت کی دیواروں اور منڈیروں پر چراغ روشن تھے۔ عمارت کے باہر اور اندر خاصی تعداد میں لوگ انتظامات میں مصروف تھے۔ "دیکھا استاد!" جمو نے بنّے خاں کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "ایسا میلا تو اپنے استاد مجھّل کے واں بھی نہیں ہوتا۔"

بنّے خاں نے کوئی جواب نہیں دیا تو جمو نے پکارتے ہوئے کہا۔ "بس ابھی سارا بھول کے راجا بن کے گدی پر بیٹھو۔ بعد کو اُدھر کو دیکھیں گے۔ سنا ہے، مکھن خاں کے بعد

اُطلبوا العلم ولو کان بالصین

چین کا قدیم معاشرہ مساوات کے اصول پر مبنی تھا کوئی شخص اپنے پیشے کے باعث حقارت سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ حکومتی عہدوں کے لیے مقابلے کے امتحان ہوتے تھے جن میں ہر شخص شریک ہو سکتا تھا۔ چین میں اہلِ علم کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ اہلِ علم کے بعد کسانوں کا درجہ تھا اور اُن کے بعد کاری گروں کا۔ سب سے ادنا مقام تاجروں کا تھا کیوں کہ یہ لوگ دوسروں کی محنت مشقت سے بنائی ہوئی چیزوں کا محض تبادلہ کر کے دولت کماتے ہیں۔

اڈّے پر بہت الٹا سیدھا ہوا ہے۔ کئی حرام کے جنے مستانے لگے ہیں۔"

بنّے خاں کی خاموشی پر جمو نے اسے کُہنی ماری۔ "ایسا کیا استاد! بولتی سسری کیوں بند ہو گئی؟ اب اُدھر سے لوٹ آؤ بھیا جی! دیکھنا، بیگم کو آج نہیں تو کل بلانا ہے۔ اُدھر کی بات ایک دم پکی سمجھو۔"

بہ وقتِ تمام بنّے خاں نے پژمردگی سے کہا۔ "نہیں جمو بھائی! وہ تو اچھا ہی ہوا، اس نے منع کر دیا۔ میں تو... میں تو..." اس کی آواز حلق میں پھنسنے لگی۔ کہنے لگا۔ "بس اتنا اتنا بہت ہے۔"

بنّے خاں نے ایک نظر میری طرف دیکھا، کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکا، سر جھکائے ہوئے آگے چوکی کی طرف چلا گیا۔ شمشاد خاں اور مجھّل اڈّے کے کئی آدمیوں کے ہجوم میں چوکی پر بیٹھے تھے۔ کچھ وقت اُن کے ساتھ گزار کے ہم اوپر چلے آئے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی زورا اور جمو نے مجھے دبوچ لیا اور میرے ہاتھ اور پیشانی چومنے لگے۔ وہ دونوں اس خلوت کے منتظر تھے۔ مجھے ان کی دیوانگی کا سبب معلوم تھا۔ ان کی شدت کم کرنے کے لیے یہی مناسب تھا کہ میں اُن سے کسی ندامت اور انکسار کا اظہار نہ کروں۔ یہی ہوا۔ جلد ہی اُنھیں قرار آ گیا۔ ان سے نجات ملی تھی کہ کچھ ہی دیر میں بنّے خاں کمرے میں آ گیا۔ دیوانگی کے آثار ابھی تک اس کے چہرے پر ابھرے ہوئے تھے، میرے پاؤں پکڑ کے کہنے لگا کہ تارا بیگم کی طرف سے اقرار میں جواب آئے تو میں بے دریغ مسترد کر دوں۔ میں نے پوچھا۔ "آخر کیوں؟"

گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔ "یہ میری مرضی ہے۔"

میں نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم زبان دے کے آئے ہیں۔ بنّے خاں کو یاد تھا کہ جمو نے تارا بیگم پر اچھی طرح واضح کر دیا تھا' آج کی بولی آج پر ہے۔ کل کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ میں نے کہا' اگر تارا بیگم مان جاتی ہے تو آج اور کل سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ بات تو اصل میں جمو نے بیگم پر زور ڈالنے کے لیے کہی تھی۔ میں نے اُس سے کہا کہ آدمی کی قیمت ہر رقم سے زیادہ ہوتی ہے۔ آدمی کا تو کوئی مول ہی نہیں ہوتا' اور وہ تو چاندنی بانو ہے۔ اس رقم سے کوئی مصور یا بت تراش چاندنی بانو کا پیکر نہیں تراش سکتا۔ بنّے خاں سنتا رہا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ کیا اسے محض رقم کی فکر ہے؟ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کے بتائے کیا چاندنی اسے مطلوب نہیں؟ یہ محض اتفاق ہے کہ اس کے بجائے میں بولی لگانے پر قادر ہوں۔ میں نے طرح طرح سے بنّے خاں کا تکدر دور کرنے' اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس رقم کے چلے جانے سے میں قلاش نہیں ہو جاؤں گا اور مجھے یوں بھی روپے پیسے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ بنّے خاں نے بہت پہلو بدلے' انگلیاں توڑتا' ہونٹ چباتا رہا۔ اِدھر جمو اور زورا نے دلیلیں تراشنی شروع کر دی تھیں۔ بنّے خاں شش و پنج کی حالت میں واپس چلا گیا۔

صبح سب کی آنکھ دیر سے کھلی۔ ناشتے ہی کا وقت ملا' پھر بنّے خاں کے چوکی پر بیٹھنے کی رسم ادائی کا سے آ پہنچا۔ ہم تینوں نیچے آئے۔ عمارت میں تِل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ ہر شو شور گونج رہا تھا۔ سامنے چوکی کے ایک طرف مٹھائی اور پھولوں کی ٹوکریاں رکھی تھیں۔ لوبان اور اگربتیوں کی خوشبو ساری عمارت میں بسی ہوئی تھی۔ چوکی پر شمشاد خاں اور بنّھل کے درمیان چکن کے سفید کرتے' پاجامے' عنابی واسکٹ میں ملبوس بنّے خاں' سر پہ گیروے رنگ کا صافہ باندھے بیٹھا تھا' گلے میں سونے کی زنجیر' کان میں دُریا' ہاتھ میں چاندی کا کڑا' کمر کے گرد منقش چرمی پٹی' برات کے دُولھا جیسا' صرف شیروانی کی کسر تھی۔ چہرے پر ابھی تک شک جھلک رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کے کچھ مضطرب ہو گیا۔ ہمارے پہنچنے کی دیر تھی کہ شمشاد خاں نے بنّھل سے جلدی کی درخواست کی۔ سورج خوب چڑھ چکا تھا' زوال کے بعد لکھنؤ میں چوکی نشینی کی رسم معیوب سمجھی جاتی تھی۔

بنّھل کے سامنے رکھی ہوئی کوری ہانڈی میں دودھ بھرا تھا' ہانڈی کے اطراف دو عدد کلھڑ رکھے تھے۔ ہانڈی سے دودھ لوٹ کے بنّھل کو پہلے شمشاد خاں کی طرف کلھڑ بڑھانا تھا' پھر شاید ایک گھونٹ بھر کے بنّے خاں کے سپرد کر دینا تھا۔ ایک دو گھونٹ پی کے بنّے خاں کو کلھڑ کا دودھ ہانڈی میں لوٹ دینا تھا' پھر ہانڈی کا دودھ مختلف جگہوں پر رکھے ہوئے شربت سے بھرے بڑے بڑے برتنوں میں شامل کیا جانا تھا۔ یہ شربت سارے مجمع میں تقسیم ہونا تھا لیکن شربت کی تقسیم سے پہلے بنّے خاں کو اپنا چاقو شمشاد خاں کے پیروں پر رکھنا تھا' جواب میں شمشاد خاں کو اپنا چاقو بنّے خاں کے حوالے کرنا تھا۔ سلگتے ہوئے لوبان کے برتن میں لوہے کی ایک سلاخ بھی نظر آ رہی تھی۔ ممکن تھا کہ اس جلتی ہوئی سلاخ سے بنّے خاں کے بازو یا گردن پر داغ ڈالا جائے۔ شمشاد خاں اور بنّھل کو اپنے خون سے بنّے خاں کو تلک لگانے کی رسم بھی انجام دینی تھی۔ اس کے جواب میں بنّے خاں کو کوئی رگ کھول کے اپنا خون لوبان کے برتن میں ٹپکانا تھا۔ مختلف جگہوں پر چوکی سنبھالنے کی اپنی اپنی رسمیں ہوتی تھیں۔ بکروں کا صدقہ' لنگر' امام ضامن وغیرہ۔ کسی جگہ آئے ہر آدمی کی طرف سے چوکی کے دادا کی خدمت میں نقدی کے علاوہ خون کی نذر بھی پیش کی جاتی تھی۔ لکھنؤ کی بات تو ویسے بھی جداگانہ تھی۔ مجھے کچھ زیادہ علم نہیں تھا کہ یہاں اور کیا کیا رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔

عمارت میں خاموشی چھا گئی تھی۔ بنّھل نے ہانڈی سے دودھ لوٹ کے کلھڑ شمشاد خاں کی طرف بڑھایا' شمشاد خاں نے ایک گھونٹ بھر کے بنّھل کو واپس کر دیا۔ بنّھل نے بھی گھونٹ بھر دودھ پیا اور کلھڑ بنّے خاں کے سپرد کیا ہی چاہتا تھا کہ اس کا ہاتھ ٹھہر گیا۔ اسی دم دائیں طرف' چوکی سے کوئی دس قدم کے فاصلے پر ایک پست قد' چیچک کے بھرے چہرے کے آدمی نے کھڑے ہو کے بلند آواز میں بنّھل اور شمشاد خاں کو مخاطب کیا اور انھیں یاد دلایا کہ وہ ایک اہم رسم کی ادائی سے

سے گا۔

کوتاہی کر رہے ہیں۔ انھیں عمارت میں موجود لوگوں سے پوچھنا چاہیے کہ کوئی دوسرا تو اڈّے کی چوکی کا طلب گار نہیں ہے؟

یکایک ہر طرف شور مچنے لگا۔ شمشاد خاں بھڑک اُٹھا۔ "وہی ہی کیا! ایسی بات کرتا ہے خنزیر کی اولاد! آیا تو' تُو چوکی پر آنا چاہتا ہے؟ تجھ کو۔ تجھ کو۔۔۔" شمشاد خاں کے جملے پر عمارت میں قہقہے گونجنے لگے۔

وہ شخص نہیں بیٹھا، کسی قدر کھسیا کر بولا۔ "میں تو ریت کی بات کرتا ہوں استاد!"

شمشاد خاں کی گالی گلتاری عمارت میں اُٹھنے والے شور میں گم ہو گئی۔

بھل نے ہاتھ اُٹھا کے سب کو خاموش کیا اور اُونچی آواز میں کہا۔ "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ ابھی کوئی بنّے خاں کی جگہ اڈّے کی چوکی واسطے اپنے آپ کو آگے کرتا ہے تو بول دے۔"

شمشاد خاں کی ناراضی اس لمحے پراگندگی اور حیرانی سے دوچار ہوئی جب ٹوکنے والے آدمی کے قریب بیٹھا ہوا سانولی رنگت، اوسط قد، کُل دست و بازو کا ایک پختہ کار نوجوان کھڑا ہوا۔ سب کی نگاہیں اس کی طرف اُٹھ گئیں، عمارت میں سنّاٹا ہو گیا۔ "تُو؟ تو اپنا رجّن!" شمشاد خاں پھیلی ہوئی آنکھوں سے بولا "کیا بات ہے؟ اب تجھ کو بھی مستی سوجھی ہے؟"

بھل نے مسکراتے ہوئے شمشاد خاں کو تسلی سے بیٹھے رہنے کو کہا اور رجّن نامی نوجوان سے پوچھا۔ "تو ادھر ہی بیٹھنا چاہتا ہے رے؟"

رجّن نے کچھ کہنے کے بجائے سر ہلانے پر اکتفا کی۔ اس کا سینہ آگے کو نکلا ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں گہری چمک تھی۔

"ٹھیک ہے۔" چند لمحوں کے سکوت کے بعد بھل نے آہستگی سے کہا اور بنّے خاں کو اُٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

"اچھی طرح سوچ لے رجّن! بولتا ہوں، اندر جا کے ایک بار شیشہ دیکھ لے۔" شمشاد خاں کی آواز میں بہت تلخی تھی۔ "تو مسخری بہت مہنگی پڑے گی تجھ کو ایمان سے۔۔"

رجّن نے شمشاد خاں کی بات سُنی ان سُنی کر دی۔ شمشاد خاں سے برداشت نہیں ہوا، مشتعل ہو کے بولا۔ "سالا... منہ سوکھ گیا تھا تیرا، آیا نشہ کر کے آیا ہے۔"

بھل نے آنکھوں آنکھوں میں شمشاد خاں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اب اس غیظ و غضب سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

رجّن سر اُٹھائے، سینہ پھلائے کھڑا رہا۔

بھل کے حکم پر چوکی کے سامنے کا حصّہ خالی کر دیا گیا۔ جگہ پہلے ہی تنگ تھی۔ لوگوں کے پیچھے ہٹنے سے ابتری سی ہو گئی لیکن جلد ہی سکون ہو گیا۔ بنّے خاں نے صافہ اتار دیا اور کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اپنا چاقو اُچھالتا ہوا خالی ہونے والے دائرے میں آ گیا، دوسری جانب سے رجّن بھی آ کے بنّے خاں کے مقابل کھڑا ہو گیا۔

عمارت میں سبھی کی سانسیں جیسے رک گئی تھیں۔ شمشاد خاں چوکی کے کنارے پر آ گیا۔ وہ مسلسل زیرِ لب پھنکار رہا تھا۔ بھل بھی اپنی جگہ سے اُٹھ کے شمشاد خاں کے برابر آ گیا۔

بنّے خاں کی تقلید میں رجّن نے بھی اپنا چاقو بھل کے آگے کر دیا۔ بھل نے دونوں چاقو ایک نظر دیکھے اور پہلے رجّن کی طرف پھر بنّے خاں کی طرف اُچھال دیے۔ دونوں نے چابک دستی سے چاقو اُچک لیے۔

"بولتا ہوں مان جا، گیدڑ والی بات نہ ہو جائے سالے۔" شمشاد خاں نے دہاڑتے ہوئے رجّن کو تنبیہ کی۔

رجّن کی بے اعتنائی پر شمشاد خاں تلملا کے رہ گیا۔

بنّے خاں اور رجّن نے روایتی انداز میں دائرے کا ایک چکر پورا کیا اور دونوں نے ٹھہر کے خوں بار نظروں سے ایک دوسرے کا جائزہ لیا۔ رجّن ہاتھ ملانا چاہتا تھا لیکن بنّے خاں نے توجّہ نہیں دی اور چاقو لہراتا ہوا دو قدم آگے بڑھ گیا۔ اس کی چُستی سے میری طرح جمو اور زورا کو بھی اطمینان ہوا ہو گا۔ رجّن نے بنّے خاں کے مقابلے میں احتیاط کا ثبوت دیا بلکہ کسی حد تک جھجک کا۔ بنّے خاں آہستہ آہستہ فاصلہ کم کرتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا اور اس نے آناً فاناً ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں چاقو بدل کے اپنی برتری کی دھاک بٹھانا چاہی۔ رجّن اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں کے نرغے

جا کے دوسری طرف ہو گیا۔ بتے خاں نے بھی پیش
رکھی اور دوبارہ گھیرا تنگ کرنے میں کامیاب ہو
تا بابا" یہی چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ بتے خاں
اس کے پیچھے ہٹنے کے لیے کوئی جگہ نہ چھوڑے اور
نکلنے کی کوئی گنجائش نہ رہے' اس نے اپنی گزشتہ
کی اور پھرتی سے اُچھل کے بتے خاں سے مڈبھیڑ
ان لی۔

دونوں کے درمیان بہت کم فاصلہ رہ گیا تھا۔ بتے خاں نے اندازہ لگایا تھا' اس کا خیال تھا کہ رحمن کو وہ اور پیچھے ہجوم کی طرف لے جائے گا۔ رحمن کے اس اچانک اقدام کا نتیجہ خاں کے لیے مہلک ہو سکتا تھا۔ وہ اتنی جلد اُلٹے قدموں نہیں ہو سکتا تھا حالانکہ اس کے عقب میں دائرہ خالی پڑا تھا۔ اس بتے خاں کا دماغ یک سو تھا' یکایک وہ بیٹھ گیا۔ اب بڑی تن دہی سے کام لینا تھا' اُس کے ہاتھ رحمن کی ٹانگوں کی طرف بڑھے' ٹانگیں گرفت میں آجانے کی صورت میں رحمن کا توازن بگڑ جانا لازم تھا۔ اسے مجمع کی جانب پیٹھ کے ل کرنا چاہیے تھا مگر رحمن کو جیسے اس اندیشے کا احساس تھا۔ اس نے حواس مجتمع رکھے اور جست کے انداز میں بیٹھے ہوئے بتے خاں کا جسم پھلانگ لیا۔ اپنی جھونک میں وہ گرتے گرتے بچا اور آگے ہی بڑھتا گیا۔ اگر کہیں رک کے اور پلٹ کے بتے خاں پر وار کرنے کا ارادہ اُس کے سر میں سماجاتا تو اُسے مہلت نہ ملتی کیوں کہ اس اثنا میں بتے خاں کھڑا ہو چکا تھا اور اس کا رُخ رحمن کی جانب تھا۔

بتے خاں نے بس ایک لمحے کا توقف کیا ہو گا کہ بجلی کے مانند پھر اسی طرف بڑھا۔ رحمن بھی پر تول چکا تھا۔ دائرہ اتنا بڑا نہیں تھا۔ دونوں کو دوبدو ہونے میں چشم زدن کا عرصہ لگا لیکن قریب آ کے کوئی داؤ آزمانے کے بجائے رحمن پھر جھکائی دے کے نکل گیا۔ کئی بار اس نے یہی کیا' سامنے ہو کر ایک دم کسی جانب نکل جاتا۔ اس صورت حال سے دیکھنے والوں کا تاثر یہی ہونا چاہیے تھا کہ رحمن پر اپنی کم تری کا کوئی احساس غالب ہے' اس نے ناتوانی میں بتے خاں سے مجو آزمائی کا ورا کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے' بعض لوگ اسے بتے خاں اور رحمن کی اولی بدلی یعنی ملی بھگت بھی سمجھ رہے ہوں۔ یہ بدگمانی بے جا سب لگ۔

حال زیادہ دیر قائم رہنے والی نہیں تھی۔ ابھی تک یہی کہا جا سکتا تھا کہ رحمن سامنے کے زور سے پہلو تہی کر رہا ہے اور کسی ایک موقع کی تلاش میں ہے اور بتے خاں کو مشتعل کر کے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے یا اسے بتے خاں کی کسی کم زوری کا علم ہے۔ اسے اپنی استقامت کی کوئی خوش فہمی ہے اور وہ بتے خاں کو پہلے خوب تھکا دینا چاہتا ہے۔ اس طوالت سے رحمن کو ایک اور فائدہ بھی تھا کہ چشم دید گواں شاہد رہیں' اس نے یہ معرکہ کسی فریب سے سر نہیں کیا ہے' مقابلہ تو اس ناتواں نے خوب کیا ہے۔ اس طوالت میں بتے خاں کی توہین کا پہلو بھی مضمر تھا۔

عمارت میں گاہے گاہے بے چینی کی گھن گھناہٹ ہوتی اور خاموشی چھا جاتی۔ بتے خاں کی پیشانی پر رحمن کی اس آنکھ مچولی سے شکنیں پڑنے لگی تھیں۔ اسے بھی رحمن کے کس بل سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے تھا۔ دونوں ایک ہی اڈے سے وابستہ تھے' عمر میں بھی کوئی ایسا فرق نہیں تھا۔ کپتن خاں اور شمشاد خاں کی تربیت سے رحمن نے بھی استفادہ کیا ہو گا۔ یہ کلیہ بتے خاں کو اچھی طرح ذہن نشین ہو گا کہ تاباشت کار مقابل پر ذرا سی رعایت واجب نہیں اور دو فریقوں میں ایک کو فتح ہوتی ہے' دوسرے کو شکست۔ دونوں کے پاس چاقو تھا۔ اختیار سمیت زور اور سادے زور میں فرق ہے۔ اختیار کبھی کبھی بہک بھی جاتا ہے۔ ذرا سی کوتاہی ہو جائے تو اس کا ضروری نہیں کہ ازالے کا وقت مل جائے۔

رحمن کی پھرتی کسی طور پر بتے خاں سے کم نہیں تھی۔ وہ بتے خاں کو ادھر سے اُدھر گھماتا رہا۔ بتے خاں نے ہر بار ہوش مندی کی۔ اُسے معلوم ہو گا کہ حریف کسی بھی لمحے ارادہ بدل سکتا ہے' اور یہی ہوا۔ رحمن نے سامنے آ کے کسی طرف نکل جانے کا تماشا نہیں کیا بلکہ نکل دے کے بتے خاں کے چاقو والے ہاتھ کی کلائی پر پنجہ ڈالنے کی کوشش کی۔ وہ اچانک جھپٹ پڑا تھا۔ بتے خاں نے زیادہ مزاحمت نہیں کی اور اپنی کلائی رحمن کے پنجے میں آسانی سے تھما دی' جیسے جان بوجھ کے۔ رحمن کو اندازہ تھا کہ جواباً بتے خاں اس کے چاقو والے ہاتھ پر پنجہ ڈالنے کے لیے مضطرب ہو گا۔ چناں چہ جسم زچھا کر کے اس نے اپنا چاقو والا ہاتھ دوسری طرف پھیلا

لیا۔ ایک ہاتھ مخالف سمت پھیلا کے دوسرے ہاتھ سے مقابل کا چاقو والا ہاتھ قبضے میں رکھنے کے لیے بڑی مشاقی اور زور کی ضرورت پڑتی ہے۔ رجّن کے پنجے میں جیسے ہی بنّے خاں کی کلائی آئی' وہ کلائی کو جھٹکا دینے کے لیے زمین سے اچھل گیا' دوسری جانب بنّے خاں نے اُسی وقت اپنا دوسرا ہاتھ رجّن کے قریب کیا۔ یہ ایک اضطراری اقدام بھی تھا لیکن اس کا ارادہ رجّن کے چاقو والے ہاتھ پر قبضہ کرنے کا نہیں تھا۔ رجّن کا پھیلا ہوا ہاتھ اس کی پہنچ سے دور تھا۔ اس کے لیے اسے تیزی سے گھوم جانا چاہیے تھا۔ وہ یہ بھی کر سکتا تھا کہ اپنا ہاتھ رجّن کے پنجے سے چھڑانے کی کوشش میں کھینچا تانی جاری رکھے اور ساتھ ہی چکّر کھانے شروع کر دے۔ فریق وہیں گھبرا جاتا ہے جب جواب اس کی توقع کے برعکس ہو۔ رجّن اِدھر بنّے خاں کی کھینچا تانی سے اس کی کلائی پر اپنے پنجے کی گرفت اور مضبوط کرتا' اُدھر اپنا چاقو والا ہاتھ بنّے خاں کی دست رس سے بچانے کے لیے بنّے خاں کے ساتھ گھومتا رہتا اور یا تو کسی ناگہانی کے اندیشے میں بنّے خاں کا ہاتھ آزاد کر دیتا' یا دوسرے تیسرے چکّر میں اچانک ٹھیر کے اپنا چاقو والا ہاتھ آگے کر دیتا دوسرے لفظوں میں گھومتے گھومتے وفعتہً بنّے خاں سے بھڑ جاتا۔ بنّے خاں نے کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا۔ اس نے گھوم کے رجّن کا چاقو والا ہاتھ قبضے میں لینے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنی جگہ کھڑے کھڑے رجّن کی ٹھوڑی کو نشانہ بنایا۔ رجّن سے ایک لمحے کی تاخیر ہو گئی۔ اس کے اچھلتے ہی بنّے خاں نے اس کی ٹھوڑی پر ضرب لگائی۔ عجلت میں ضرب پھسلتی ہوئی گئی۔ رجّن نے بنّے خاں کا ارادہ بھانپ کے فوراً ہی اس کی کلائی چھوڑ دی اور بنّے خاں کے سامنے اپنا چاقو والا ہاتھ لہرایا۔ بنّے خاں کو اس اقدام کی وجہ سے قدم بھر پیچھے ہٹنا پڑا۔ ضرب سے رجّن کا توازن بگڑ سکتا تھا لیکن وہ فاصلہ کرنے میں کام یاب ہو گیا۔ دونوں دوبارہ دور جا کھڑے ہوئے۔

بنّے خاں نے اب اتنی جلدی نہیں کی۔ ابتدا میں تیزی کا مطلب مقابل کو دباؤ میں رکھنا ہوتا ہے۔ بنّے خاں کی سرخ روئی اسی میں تھی کہ وہ جلد از جلد یہ معاملہ نمٹا دے۔ رجّن کو اتنی نہیں ہوگی جتنی بنّے خاں کو اپنی عزت کی فکر ہوگی۔ ابتدا میں تیزی کا سبب غم و غصّہ بھی ہوگا۔ عین وقت رخنہ اندازی بڑی نازیبا تھی۔ شمشاد خاں اور اڈّے کے لوگوں کے سان و گمان میں نہ ہوگا کہ ان کے ایک آدمی اس طرح چوکی کی دعوے داری کے لیے ہو گا۔ اڈّوں پر عموماً ایسا ہوتا نہیں۔ دو دن سے انتظار رہے تھے۔ لوگ ہمارے آنے سے پہلے بھی یہی اور دیکھ رہے تھے کہ شمشاد خاں' کبّن خاں مرحوم کی جا کے لیے بنّے خاں کو تیّار کر رہا ہے۔ تیّاری صرف بَل کی ہوتی۔ بَل بے شک بہت بنیادی چیز ہے لیکن اصل بَل کا ہوتا ہے۔ دماغ متناسب نہ ہو تو دست و بازو کی طاقت بھی آدمی کو کھرا ہونا چاہیے۔ لوگوں کو قابو میں رکھنے وقت پر مناسب فیصلے کرنے اور اڈّے پر بَل اور ہتھیار کی تربیّت کا کام آسان نہیں ہوتا۔ اثر و رسوخ' سب کا رکھنے والے اور تجربے والے استاد کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ کبّن خاں کے بعد شمشاد خاں اسی لیے اڈّے پر بیٹھا تھا۔ اب اگر اڈّے کے برگزیدہ اُستاد کی خواہش یہی تھی اور بات طے ہو چکی تھی تو اڈّے کے تمام لوگوں کو اس کا احترام کرنا چاہیے تھا۔ کم سے کم کچھ عرصے کے لیے بنّے خاں کے جوہر آزمانے میں کوئی ہرج نہیں تھا۔ نااہل اُستاد ویسے بھی کتنی دیر تک برقرار رہ سکتا ہے۔

اڈّے کے کئی آدمی بَل میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کے ہو سکتے ہیں مگر چوکی پر سبھی تو نہیں بیٹھ سکتے۔ باقی یک سال زور والے ایک مرتبہ کسی کو چوکی پر بٹھا کے اسی کو واجب عزت سمجھتے ہیں۔ آج کا ناپختہ کار آدمی محنت اور جستجو اور زور آزمائی کی مسلسل مشق سے کل کسی لائق ہو سکتا ہے تو گویا اسے بیٹھ چلا کے چوکی کا دعوے دار ہو جانا چاہیے۔ ممکن ہے' اڈّے کے چند لوگ بنّے خاں کو ناپسند کرتے ہوں اور اس کی جگہ رجّن کو چوکی پر دیکھنے کے طلب گار ہوں لیکن ظاہر ہے' انھیں اس خواہش کے اظہار کے لیے کسی نے روکا تو نہیں ہوگا۔ اُن کی خاموشی رضامندی کے مترادف تھی۔ رجّن اور اس کے چند ہم نواؤں کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے تھی کہ اڈّے کے بیش تر آدمی ذہنی طور پر بنّے خاں کو چوکی کا مختار سمجھ چکے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو چوکی نشینی کی

میلا ٹھیلا اور دھوم دھڑکا نظر نہ آتا۔ رجّن کو
فکر کرنی چاہیے تھی۔ بتّے خاں کو زیر کرنے کی
میں وہ اڈّے کا دادا تو بن جائے گا لیکن اتنے آدمیوں
کی موجودگی کے ماحول میں وہ چوکی پر کس طرح اطمینان
سے بیٹھ سکتا ہے۔

خاں کی آنکھوں میں شعلے بھرے تھے۔ اتنی دیر
نے اپنی چابک دستی اور چستی کا مظاہرہ خوب کیا تھا۔
طریق بڑی حد تک دفاعی مگر سوجھ بوجھ کی علامت
خاں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ رجّن کے لیے
کا کوئی فیصلہ کیوں کر سنائے۔ مجمع چھتّے کی طرح
میں دبائے ساکت بیٹھا تھا۔ دائرے میں بتّے خاں اور
ایک دوسرے کو زچ کرنے کے لیے مختلف داؤ آزما
رہے تھے اور کسی کو اب تک کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔
دونوں بہت محتاط تھے۔ احتیاط تو ایک لازمہ ہے مگر حد سے
زیادہ کوئی چیز بھی شاید اچھی نہیں ہوتی، عمارت میں بیٹھے
لوگوں کی بے چینی بڑھنے لگی تھی۔ حمو اور زورا کے
چہرے بھی جیسے سُوج گئے تھے۔ بتّے خاں نے پھر جرأت کی۔
اکھاڑے کے وسط میں بُت کے مانند کھڑا ہو گیا۔

عمارت میں ایک غلغلہ بلند ہوا۔ دوسری جانب رجّن کے
تھرکتے ہوئے پاؤں بھی رک گئے۔ اس نے چند لمحے
خاموشی سے بتّے خاں کے تیور کا جائزہ لیا۔ یہ ایک نہایت
مشکل مرحلہ تھا۔ اُسے جلد از جلد کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ بتّے
خاں کے دونوں ہاتھ بھی دست برداری کے انداز میں لٹکے
ہوئے تھے۔ رجّن موقع سے فائدہ اُٹھا کے ایک ہی جست میں
بتّے خاں کے سر پہ پہنچ سکتا تھا۔ اس نے توقف کیا اور تحمل
سے ایک قدم بڑھا پھر آہستہ آہستہ دبے پاؤں اس نے اپنے
اور بتّے خاں کے درمیان کا مختصر فاصلہ طے کیا۔ بتّے خاں نے
اسے پاس آنے دیا۔ قریب آ کے گز بھر کی دُوری پر رجّن ٹھہر
گیا۔ دونوں لمحوں تک ایک دوسرے سے آنکھیں چار کیے
بے حرکت کھڑے رہے۔ کسی ایک کو پہل کرنی تھی۔ معاً
بتّے خاں نے جنبش کی اور اپنا چاقو والا ہاتھ رجّن کی طرف
پھیلا دیا۔ بتّے خاں کے ہاتھ اٹھانے میں لپک نہیں تھی۔
رجّن فوراً نہیں سمجھ پایا کہ بتّے خاں کی جانب سے اپنا ہاتھ



گرفت میں دینے کی پیش کش رضا کارانہ ہے۔ اس نے بجا
طور پر اسے بتّے خاں کا کوئی حیلہ سمجھ کے خود کو بچاتے ہوئے
اپنا چاقو والا ہاتھ بتّے خاں پر جھپٹایا۔ بتّے خاں ہر طرح تیار
تھا۔ اپنا جسم دور رکھ کے وہ آہستگی سے کسی قدر پیچھا ہو
گیا اور اس نے سبھی کو حیران کر دیا جب اچانک فرش پر گر
کے اس نے پوری طاقت سے رجّن کے پیر اپنے پیروں سے
نشانہ بنائے۔ رجّن نے بھی ابتدا میں اسی قسم کا سلوک کیا
تھا۔ رجّن کے پیر فرش سے اکھڑ گئے اور وہ متزلزل ہو گیا۔
ایسی حالت میں اکھاڑے کے کسی بھی آدمی کا ردِ عمل یہی ہوتا کہ
پہلے تو وہ زمین پر قدم جمانے کی تگ و دو کرے اور جسم کا
زاویہ بدل کے ممکن ہو تو جواب میں فرش پر گرتے ہوئے
مقابل پر چاقو تان لے۔ بتّے خاں نے کچھ سوچ کے ہی یہ خطرہ
مول لیا تھا۔ گرنے کے بعد اس نے فوراً اُٹھ جانے کے لیے

خود کو آمادہ کر رکھا تھا۔ رجّن نے قدم ڈگمگا جانے کی بدحواسی میں جیسے ہی چاقو والا ہاتھ بنّے خاں کے جسم پر جھکایا، بنّے خاں نے جھٹ کروٹ بدل لی اور نشانے سے ہٹ کے اتنی تیزی سے اُٹھا کہ رجّن کی کلائی اس کے پنجے میں تھی۔

عمارت میں پھر شور بلند ہوا۔ سبھی نتیجے کے منتظر تھے اور گنتی کے چند لوگوں کو چھوڑ کے سبھی بنّے خاں کی کامیابی کے متمنی تھے۔ لگتا تھا، بنّے خاں کی نگاہیں رجّن کے چاقو کی نوک سے بندھی ہوئی ہیں۔ اُس نے پہلے کروٹ بدل کے اپنا رُخ بدلا اور سامنے کے بجائے بائیں جانب سے پنجہ ڈالا۔ بنّے خاں نے صرف ایک کروٹ پر اکتفا کی، دوسری اُس کے لیے مہلک بھی ہو سکتی تھی۔ یہ وقت رجّن کے لیے سخت آزمائش کا تھا۔ اسے تمام تر قوت سے اپنا جسم پیچھے ہٹانا چاہیے تھا۔ یوں اسے بنّے خاں کے چاقو کی رسائی سے خود کو دور رکھنا تھا۔ بنّے خاں آدھا اٹھ چکا تھا، باقی آدھا وہ رجّن کے پکڑے جانے والے ہاتھ کے زور پر اُٹھا۔ ایسے پیچیدہ داؤ کے لیے بہت تجربہ چاہیے۔ تجربہ تو خیر ہر قدم، ہر مرحلے پر شرط ہے۔ پہلے رجّن بے توازن ہوا تھا، دوسرے اپنا ہاتھ گرفت میں چلے جانے سے وہ بوکھلا گیا۔ یہ موقع بنّے خاں کے لیے بالادستی کا تھا۔ کسی داؤ کے نتیجے میں متعدد صورتیں ذہن میں رکھنی پڑتی ہیں، پے در پے پینترے، آدمی کو بجلی بننا پڑتا ہے۔ اٹھتے ہی بنّے خاں کو چاقو والے ہاتھ سے رجّن کو مزید منتشر کرنا چاہیے تھا۔ اس کا یہی ارادہ ہوگا مگر رجّن کے لیے جیسے زندگی کا یہ آخری معرکہ تھا۔ ایک لمحے کا حجاب مقابل کے عزمِ تازہ کا سبب بن جاتا ہے۔ جیسے ہی بنّے خاں اپنے پیروں پر استوار ہوا، رجّن ایک جھٹکے سے زمین پر بیٹھ گیا اور بیٹھتے ہی اُس نے پیر پھیلا دیے اور مصرعِ طرح، پر پھڑکتی ہوئی گرہ لگانے کے مانند بنّے خاں کا داؤ اسی پر لوٹانے کی کوشش کی یعنی بنّے خاں کی ٹانگوں پر پیر مارنے کی۔ رجّن کے لیے یہی ایک بہتر صورت تھی تاہم بنّے خاں نے صبر و ضبط کا ثبوت دیا اور رجّن کی کلائی پر اپنے پنجے کی گرفت بھرنے کی ضد نہیں کی۔ ضد کے لیے سو معرکوں کا خمار لازم ہے۔ بنّے خاں نے اسی دم رجّن کی کلائی چھوڑ دی اور پلک جھپکتے میں اس سے دور ہو گیا۔ [illegible] کے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر بنّے خاں کو

آندھی کی طرح بڑھتا اور رجّن کو اُٹھنے کا وقت نہیں رجّن کو بھی اپنی نسبتاً کم زور صورتِ حال کا احساس وہ فرش سے اٹھا ہی نہیں، گیند کے مانند لڑھکتا ہوا سے دور ہو آ گیا۔ جتنی دیر میں بنّے خاں اس تک پہنچے محفوظ فاصلے پر جا کے وہ یک لخت اُٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں پیشانیوں سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ دور کھڑے کھڑے اُنھوں نے سانسوں کی ہمواری کا وقفہ کیا اور بنّے خاں نے پیش قدمی کے بجائے رجّن کو بڑھنے کا اشارہ کیا۔ رجّن نے بھی دیر نہیں کی اور چاقو گھماتا ہوا دوبارہ اپنی جگہ سے بڑھا اور پھر کے اُس نے ہاتھ میں دبا ہوا چاقو جھٹک دیا۔ چاقو گرنے کی آواز کے ساتھ عمارت میں حیرت آمیز سسکیاں سی گونجیں۔ رجّن کے دونوں ہاتھ اب خالی تھے۔ استغنا کے اِس اظہار سے مقابل پر اپنا غلبہ و اثر جمانا مقصود ہوتا ہے، یہ ایک آزمودہ حربہ ہے مگر ہر دفعہ کارگر نہیں ہوتا۔ رجّن کی یہ جگری اس کے اعتماد کا مظہر تھی تو ذہنی پراگندگی کی غماز بھی تھی۔ اس کا ایک ہی معقول جواب تھا۔ بنّے خاں نے وہی کیا جو اُس سے متعلق کسی بھی کج کلاہ استاد کا شیوہ ہو سکتا ہے۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک لہر نمودار ہوئی اور اُس نے بھی کسی تامل کے بغیر اپنا چاقو ترک کر دیا۔

پھر تو دونوں ایسی شدت سے ایک دوسرے کی جانب لپکے جیسے ٹکرا کے پاش پاش ہو جائیں گے۔ آمنے سامنے کے اُنھوں نے طرح دی اور ایک دوسرے کے شانوں پر شانوں سے ضربیں لگائیں۔ دونوں ہی لڑکھڑا گئے اور گرتے گرتے بچے۔ تیز رفتاری سے آمنے سامنے آ کے ایک دم طرح دینا اور ضرب لگانا آسان بھی نہیں تھا۔ مقصد میں ناکامی پر پلٹ کے وہ بازوؤں کا زور کرنے لگے، اور بنّے خاں نے اچھل کے رجّن کے پیٹ میں گھٹنا مارنا چاہا۔ لگتا تھا، دونوں پاگل ہو گئے ہیں۔ مکّوں سے، گھٹنوں سے ضربیں، پسلیوں سے تڑیچے، بہتر گردن توڑ دیتے، پیر کچل دیتے اور اُٹھا کر پٹخ دینے کی کوششیں۔ دونوں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے فرش پر آ گئے۔ کچھ دیر کے لیے تو وہ پہلوانوں یا سڑک پر لڑنے والے وحشیوں کی طرح ایک دوسرے پر ٹوٹتے رہے۔ یہ اکھاڑا نہیں تھا نہ ہی کسی گلی کے چوک میں وہ دست و گریباں تھے۔

آدمی اپنے زور، مشق، ہنرمندی، خصوصاً "چاقو پر
برتری کا فیصلہ کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا۔
کلائیاں چھل گئی تھیں اور کپڑے پھٹ گئے تھے،
ہلے کر انھیں ٹوکنے کے لیے جھل اور شمشاد خاں
اد ہو، انھیں خود ہی ہوش آگیا کہ وہ وقت ضائع کر
ہ لڑنے کی روایت سے اجتناب ہے اور اس
یں کچھ حاصل نہیں ہو رہا۔ مشکل یہ تھی کہ کسی
جانب سے گرفت کمزور کرنے پر اسی کو ضرر پہنچنے کا
خاطر بنّے خاں نے حوصلہ کیا۔ اس نے رتن کی گردن
ہٹائے تو موقع غنیمت جان کے رتن بھی اڑنے سے

دونوں بے حال ہو گئے تھے۔ ایک دوسرے کے تسلط سے
نے ہی پہلے رتن کھڑا ہوا پھر بنّے خاں۔ رتن نے مجمع
ہوئے اپنے کسی حمایتی کی طرف نگاہ اٹھائی تھی کہ
چاقو ہوا میں لہرایا۔ جسم کو ایک ذرا خم دے کے رتن
چاقو اچک لیا اور پھلکے کو بوسہ دیا۔ بنّے خاں کچھ سوچتا
اس نے پہلی بار استفہامی تیور سے شمشاد خاں اور
جھل کو دیکھا اور اس کی مضطرب نظریں ہم تینوں پر منڈ
گئیں۔ ہم نے آنکھوں آنکھوں میں اسے عزم و ہمت کی
دی۔ شمشاد خاں کی طرف سے کوئی تائیدی اشارہ ملا
تو بنّے خاں نے جھک کے اپنا چاقو فرش سے اٹھالیا۔
اب تک کا حاصل اتنا تھا کہ مجموعی طور پر بنّے خاں کا پلّہ
بھاری رہا تھا مگر پانسہ بھر، رتن نے زیادہ تر احتیاط کی
ہوشیاری کی تھی۔ ایک قدم بڑھ کے کترا جانا اور وار روکتے
ہوئے کوئی شوشہ طرازی کر کے بنّے خاں کو مشتعل کرنا۔
اشتعال میں لغزش کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ وہ ایک عیّار
شخص معلوم ہوتا تھا، بذلہ بھی۔ اس چلتر پن سے مقابل کو
سخت بیزاری ہوتی ہے اور غصّہ آنے لگتا ہے۔ غصّہ بجائے
خود ایک قوت ہے مگر زہر بھی ہے اور یہ زہر دوسرے کے لیے
کاری ہو سکتا ہے، اتنا ہی اپنے لیے بھی ہوتا ہے۔ بیزاری
کے غصّے میں آدمی سے کوئی بھی الٹا سیدھا قدم اٹھ سکتا ہے۔
ادھر اپنا دفاع کرتے رہنا بھی معمولی بات نہیں۔ حملے کے بغیر
دفاع بھی ناممکن ہے۔ یوں سب سے آخری دفاع تو شکست کی
سبب گا۔

گوتم بدھ کا نظریۂ حیات منفی اور سلبی تھا اس لیے جہاں کہیں بدھ مت کی اشاعت ہوئی، لوگ جبریت اور یاسیت کا شکار ہو گئے۔ مردم بیزاری اور رہبانیت کا دور دورہ ہو گیا۔ ان اقوام کے بہترین دل و دماغ سنسار چکر سے نجات پانے کے خبط میں مبتلا ہو گئے جس سے مشرقِ بعید اور جنوب مشرقی ایشیا کی اقوام ولولۂ حیات سے یکسر محروم ہو گئیں۔ بدھوں کی رہبانیت، مألویت کے واسطے سے مسلمان صوفیا کے افکار میں بھی نفوذ کر گئی چناں چہ مشرقِ وسطیٰ کی ملّتِ اسلامیہ کے ذہنی و فکری جمود کی ذمّے داری ایک حد تک بدھ مت پر بھی عائد ہوتی ہے۔

عامر عباس، جلال پور پیر والا

آمادگی ہے۔ کسی قرعے ہی میں رتن نے اتنا بڑا دعوا کیا ہوگا۔ بنّے خاں نے اب تک اسے کوئی موقع نہیں دیا تھا تو رتن مایوس بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اسے کوئی اطمینان تھا کہ امکان ہمیشہ بہت دور اور بہت قریب ہوتا ہے۔ بہت دیر ہو گئی تھی اور اس سے یہ مراد تھی کہ کسی کے حق میں بھی فیصلہ ہو سکتا ہے۔ جو لوگ بنّے خاں سے امیدیں وابستہ کیے ہوئے تھے، اُن کا اضطراب اور فزوں ہو گیا تھا۔ بہر حال کسی کے بس میں کچھ نہیں تھا، سب کچھ آنے والے لمحوں کے بارے میں متعیّن تھا۔ دونوں طرف سے ابھی تک کوئی ایسا وار نہیں آزمایا گیا تھا جس کا جواب دفاع میں نہ ہوتا۔ شاید شروع ہی سے رتن اور بنّے خاں نے ایک دوسرے کو مکّے میں تولنے کی ٹھانی تھی۔

بنّے خاں نے پہلے اپنا حلیہ درست کیا۔ دانتوں میں الجھی بالوں کی پھر سے لباس کی شکنیں ٹھیک کیں، آستینیں چاک ہو گیا تھا، دامن کھینچ کے اسے ہموار کیا۔ اس کے اطوار سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اب اسے کوئی جلدی نہیں ہے۔ یہ ایک اچھی علامت تھی۔ رتن خونخوار نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ بنّے خاں کے حرکت کرنے پر اس نے بھی اپنی جگہ سے جنبش کی۔ بنّے خاں نے اچانک رفتار بڑھا کے فاصلہ کم کیا۔ ظاہر ہے، یہ دیکھ کر رتن کو دائیں یا بائیں ہو جانا تھا پھر دونوں نے دائرے میں نہایت تیز رفتاری سے چکر کاٹنے شروع کر دیے۔ ان کے

چاقو والے ہاتھ متوازی تھے۔ دو تین چکروں کے بعد یکایک درمیان میں رخ بدل بدل کے وہ ایک دوسرے پر جھپٹنے لگے۔ کسی سے بھی پہلو بچانے میں ذرا سی چوک ہو جاتی تو چاقو اس کے کولھے اور پسلیاں کاٹ دیتا۔ اس داؤ میں بے پناہ چستی اور چابک دستی کی ضرورت ہوتی ہے' اور اصرار جاری رہے تو یہ کسی فیصلے ہی پر ختم ہوتا ہے۔ دونوں تھکے ہوئے تھے لیکن ان پر جنون طاری تھا۔ بتے خاں نے ابتدا کی۔ رجّن کو بھی اپنا چاقو والا ہاتھ سیدھا یا متوازی رکھنا تھا۔ ایک دوسرے کے قریب آ کے بھی انھوں نے ایک محفوظ دوری قائم رکھی۔

اس تکرار میں بتے خاں سے وہ کوتاہی ہوئی جس کا رجّن دیر سے منتظر تھا۔ اس لغزش کی پاداش واجب تھی۔ فرش پر بتے خاں کا پیر رپٹا یا اپنی جھونک میں اس کے پیر جمے نہ رہ سکے۔ اس دوران وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جلدی جلدی چاقو بھی منتقل کرتے رہے۔ یہ شغل مقابل سے ایک فاصلہ ہونے ہی پر مناسب ہوتا ہے۔ رجّن کا سامنے کیا ہوا چاقو بردار ہاتھ بتے خاں کی پسلیوں کے نزدیک آیا تو بتے خاں نے لمحے بھر پہلے چاقو دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا تھا۔ وہ اتنے آگے ہو چکا تھا کہ طرح دینا' پہلو بچانا اور بیٹھ جانا اس کے لیے ممکن نہ رہا۔ یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ ادھر اُدھر ہونے کے بجائے وہ رجّن کا بڑھا ہوا ہاتھ پسلیوں اور بازو کے بیچ داب لے۔ یہ جکڑ اتنی مضبوط ہونی چاہیے کہ مقابل کسی طرح اپنا ہاتھ کھینچ نہ پائے۔ پسلیوں کی جکڑن بازو کی پکڑ کے مقابلے میں آدھی ہوتی ہے چناں چہ بہت احتیاط' بہت قدرت کی ضرورت پڑتی ہے۔ مقابل کی طرف سے ہاتھ کھینچ لینے میں کام یابی کا مطلب صاف ہے' چاقو بازو یا پسلیاں کاٹتا ہوا گزر جاتا۔ بتے خاں کو اس حقیقت کا اچھی طرح علم ہوگا کہ اس نے خود کو ایک خطرناک حالت سے دوچار کر لیا ہے۔ رجّن کا ہاتھ اس نے جکڑ لیا تھا۔ یہ نازک گرفت مضبوط کرنے کے لیے اسے اپنا ہاتھ موڑ کے گرد لگانا تھا اور بیک وقت' بیک لحظہ کئی کام کرنے تھے' اپنے جسم کو جھٹکا دینے اور اپنے کھلے ہوئے چاقو بردار ہاتھ سے رجّن کو نشانہ بنانا تھا۔ کیوں کہ اب رجّن کا جسم بھی اس کی رسائی سے دور نہیں تھا مگر بتے خاں

خود سے دور ہو چکا تھا۔ پہلے تو اپنے آپ کو
ہے۔ اپنے آپ پر مستقل نگاہ۔ یا یوں کہا جا سکتا
دیر کم از کم اتنی دیر کے لیے جب تک مقابل
ہو' خود کو ایک ہی منظر سے' سامنے کے منظر
رکھنا پڑتا ہے۔ رجّن تو بس بتے خاں کی ایک
کشتی کی تاک میں تھا اور اسے آنے والے
اقتداری کا خوب احساس تھا۔ سو اس نے
ستاروں کی مہابی چانا اور کوئی بھول' کوئی نادانی
خاں نے ادھر پسلیوں اور بازو کے درمیان اس
ہاتھ جکڑا' اُدھر رجّن نے بندر کی طرح اچھل
کردی۔ پسلیاں اور بازو بچانے کی فکر نے
سرگرداں کیا۔ اس کا ارادہ ڈگمگا گیا۔ اس کے بازو او
کی گرفت سے باہر رجّن کا ہاتھ انگلیوں میں دب
کی حرکت میں آزاد تھا۔ رجّن اپنا چاقو گھما سکتا تھا
چاقو کی نوک بتے خاں کی کمر یا پسلیوں میں چبھی
خاں پر اس ضرر کا اندیشہ غالب آ گیا تھا کہ وہ حواس
برقرار نہ رکھ سکا۔ غالباً بتے خاں نے ساری توجہ
جکڑنے پر مرکوز رکھی۔ اپنے کھلے ہوئے چاقو بردار
طرف سے غفلت یا بے پروائی اسے مہنگی پڑنی چاہیے
رجّن نے بتے خاں کے چاقو والے ہاتھ پر پنجہ ڈال
اور دگرگوں کیا۔ بتے خاں کا کھلا ہوا ہاتھ رجّن کے
میں جانا آخری کیل ٹھکنے کے مصداق ہوا۔ اتنی جلد
کرشمہ سازی نہیں تھی' یہ محض رجّن کی مستعدی کا
ہیجان و اضطراب سے دوچار بتے خاں کے ہاتھ میں چا
نہ رہ سکا۔

شمشاد خاں نے اپنا منہ چھپا لیا۔ رجّن کا ہاتھ ابھی
بتے خاں نے جکڑ رکھا تھا۔ ایک پل کی تاخیر ہو گئی۔ ایک
کی تاخیر کبھی پہاڑ کے مساوی ہوتی ہے۔ دوسرے ہی
ایک تیز جھٹکے سے رجّن کے ہاتھ سے بھی چاقو گر گیا
بھی گواہ تھے کہ کون اپنے چاقو سے پہلے دست بردار
ہے۔ عمارت میں موت جیسا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پھر
کسی نے ساری دیواریں ہٹا دیں' سارے روزن کھول
دیے۔ ایسا شور و غوغا ہوا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں

تھی۔ دیکھتے دیکھتے دائرہ تنگ ہو گیا۔ چاروں طرف سے ہجوم امڈ پڑا تھا۔ سبھی اپنی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ شمشاد خاں اور اڈے کے معتبر با اثر آدمیوں کی تنبیہہ و تلقین سے لوگ کسی حد تک پُرسکون ہوئے۔ دائرے کے وسط میں، ہجوم کے درمیان گھرے ہوئے بُت کے مانند فرش پر ایستادہ بنّے خاں کی بس ایک جھلک دکھائی دی تھی، پھر وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ رجّن کے ساتھیوں نے رجّن کو کندھوں پر اٹھا لیا تھا اور تحسین و آفریں کے نعروں سے عمارت گونج رہی تھی۔ رجّن سب کو سر جھکا جھکا کے سلام کر رہا تھا۔ لوگ کندھوں پر اٹھائے اٹھائے اُسے چوکی کے پاس لے آئے۔

شمشاد خاں کی آنکھوں میں دہکتی آگ اس کے زرد چہرے پر اور نمایاں ہو گئی تھی۔ بھّل نے اس کا بازو تھام کے ایک طرح اس کی لگام کھینچے رکھی۔ چوکی پر بیٹھے ہوئے اور لوگوں کا حال بھی شمشاد خاں کی کیفیت سے مختلف نہیں تھا۔ ہم تینوں چوکی سے اتنی دور نہیں تھے، جمو کے کھسک جانے پر کچھ اور قریب ہو گئے۔ اب وہاں بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ رہ رہ کے بنّے خاں کا خیال آتا۔ وہ یقیناً عمارت کے اندرونی حصے یا بالائی منزل کی طرف چلا گیا ہوگا۔ اُسے اس وقت گداز کی بڑی ضرورت تھی۔ میری طرح زورا بھی اس کے پاس جانے کے لیے بے کل تھا۔ جمو نے ہم دونوں کو اُٹھنے نہیں دیا۔ ویسے بھی اتنے لوگوں کو پھلانگ کے بنّے خاں تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔

رجّن کو چوکی کے نزدیک اُتار کے اُس کے ساتھیوں نے پھر نعرے لگانے شروع کر دیے۔ رجّن کو بنّے خاں کی جگہ بٹھایا گیا۔ کسی شخص نے چوکی پر چڑھ کے پھولوں کا ہار اس کے گلے میں ڈال دیا۔ کسی نے بلائیں لیں اور پیشانی کو بوسہ دیا۔ اُس کے ساتھی وفورِ مسرت سے دیوانے ہو رہے تھے، انھیں کوئی احساس نہیں تھا کہ چوکی پر اور اطراف میں بیٹھے ہوئے بے شمار لوگوں کو اُن کی نخوت آمیز مستی گراں گزر رہی ہوگی۔ چوکی پر موجود ایک سن رسیدہ شخص نے رجّن کے سر پر صافہ باندھ دیا۔ رجّن کا چہرہ دمک رہا تھا، لرزتے ہونٹ، پھڑکتے ہوئے نتھنے۔ بار بار وہ سر گھما کے اِدھر اُدھر دیکھتا تھا۔

بھّل نے دیر نہیں لگائی۔ دودھ سے کٹورہ بھر کے اُس نے رجّن سے گھونٹ لینے کو کہا۔ شمشاد خاں نے بظاہر ... کا ثبوت دیا مگر اُس کے تیور بتا رہے تھے کہ اُسے اب ... سے اُٹھ جانے کی جلدی ہے۔ رسموں کی ادائی کا آغاز ... بہت سے لوگ اُٹھ کے عمارت سے باہر چلے گئے۔ دروازے کی طرف سے کسی کے سسکنے کی آواز آئی۔ سب نے پیچھے مڑ کے اُس شخص کو دیکھنا چاہا مگر لوگ ... فوراً باہر لے گئے۔ بھّل کی ترغیب پر رجّن نے چاقو ... خاں کے قدموں میں رکھ دیا۔ شمشاد خاں کی آنکھیں ... گئیں تاہم جواباً اس نے بھی خاموشی سے اپنا چاقو رجّن ... آگے بڑھا دیا۔

ابھی کئی رسمیں باقی تھیں۔ میرے جسم میں کانٹے ... چبھ رہے تھے۔ دماغ بہت الجھا ہوا، دل بہت گھبرا رہا تھا۔ اچھا تھا کہ ہم وہاں سے اُٹھ جاتے، یہ سب کچھ تو د... پڑتا۔ یکایک جیسے کسی نے مجھے ٹوکا۔ میں سیدھا تن کے بیٹھا ... میری سوالیہ نظریں بھّل کی جانب گئیں۔ وہ اپنے کام ... مصروف تھا۔ میں نے جمو سے کچھ کہنا چاہا مگر اُس سے ... کہے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا۔

جمو اور زورا نے میری پنڈلیاں جکڑ لیں۔ "کیا بات ... لالے؟" جمو نے بے تابی سے پوچھا۔

سبھی کی نگاہوں کا ہدف میں بن گیا تھا۔ شمشاد خاں ... بھّل کو میری طرف متوجہ کیا۔ ایک لمحے کے لیے بھّل کی پیشانی پر لکیریں کھنچ گئیں، پھر اس نے سر کو ہلکی سی جنبش ... کے دھمکتی آواز میں پوچھا۔ "کیا کیا ہے رے؟"

"استاد!" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "تم نے بنّے خاں ... کے وقت پوچھا تھا کہ کوئی اور تو اڈے کی چوکی کا طلب گار نہیں ہے؟"

شمشاد خاں کی حالت اضطراری ہو گئی۔ "ہاں ہاں، پوچھا تھا۔" بھّل کے بجائے وہ پٹ پٹاتی پلکوں سے بولا۔

"ابھی کوئی اور رستم کا جنا ہے اِدھر؟" بھّل نے ... آواز سے پوچھا۔

"ہاں استاد!" میں نے سانس بھر کے کہا۔ "ہو سکتا ہے ... کوئی۔"

ہر جانب کھلبلی مچ گئی۔ لوگ اُٹھ اُٹھ کے مجھے دیکھنے ...

میں بھی پھیل گئیں۔
کون ہے وہ؟" شمشاد خاں مضطرب ہو کے بولا۔
میں میرے تامل پر بھل نے کسی قدر ناگواری
"تو ادھری بیٹھنا چاہتا ہے؟"
نے پہلے شمشاد خاں کی طرف پھر رتن کی طرف
کے چہرے پر جسم کا سارا خون سمٹ آیا تھا۔ اس
نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ "کیا بولتے ہو تم؟"
درد لہجے میں شمشاد خاں سے پوچھا۔
"ہم کیا بولیں۔" شمشاد خاں تذبذب میں پڑ گیا۔
کو کیا ہے۔ ٹھیک ہے، سولہ آنے ٹھیک ہے بھل

میں دائیں سمت بیٹھا ہوا بھاری تن و توش کا ایک
اور چیخ کر بولا۔ "ایسا کیسے استاد! بھئی اپنے شہر کا

"ایسا کہا تو نے؟" شمشاد خاں بھڑک کے بولا۔ "آگے
سوچ کر زبان ہلایا کر جنی۔ یہ کدھر لکھا ہے کہ اپنے
کا جانور ہی چوکی پر آئے گا۔ کہتن سیتا پور کا تھا، میں
کا ہور۔ ہتے؟ ٹھیک ہے یہیں پیدا ہوا تھا یہ رتن،
استاد!" شمشاد خاں کی آواز میں تلخی بھری ہوئی تھی۔
کی نال بھی تو لکھنؤ میں گڑی ہوئی نہیں ہے۔ باتیں کرتا
ا تھوڑی دیر میں بولے گا، خاندان بھی جانِ عالم پیا کا
ہے۔"
سرگوشیاں بھن بھنانے لگیں۔
"اور ادھر کلکتے میں استادوں کا استاد اپنا بھل بھائی کون
گیا ہے۔ اڈے کی چوکی بازو پہ چلتی ہے راجا!" شمشاد
نے بازو دکھا کے کو تلہ مُرد جیسی ہاں شخص سے کہا۔ "کسی
میں راج گدی پر بیٹھنے کو ایسے ہی کیڑا کلبلاتا ہے تو وہ بھی
ہو جائے۔"
مگر رتن استاد کو ابھی سامنا نہیں کرنا چاہیے۔" بھل
سے بولا۔
"کیوں؟ میں اس کو بھی دیکھ لیتا ہوں۔" رتن نے
کے کہا۔ "یہ تمہارا پٹھا ہے نا استاد بھل؟"
سامنے میں نہیں آرہا تیرے۔"



"تم بھی آجاؤ، حسرت نکال لو۔"
"ابھی تیری حالت ٹھکانے پر نہیں ہے رے۔"
"ہائیں!" شمشاد خاں اپنا سینہ کوٹنے لگا۔ "استاد بھل
کے آگے ایسا ہوتا ہے مردار! ہم نصیبے! دماغ لوٹ گیا ہے تیرا؟
میں کہتا ہوں، کھال میں رہ، کھال میں رہ۔"
"استاد بھل کیا خاص اوپر سے بھیجا گیا ہے۔" رتن نے
چیخ کے کہا۔
"زبان کو لگام دے رتن! حرام کی اولاد۔" شمشاد خاں
پھنکار کے بولا۔ "آگے ایک بات بھی منہ سے نکلی تو زبان
گدی سے الگ کر دوں گا۔ استاد بھل اپنے مہمان ہیں شور
کے تخم، مہمان!"
"ہاں ہاں، بڑے نمک حلال مہمان۔"
شمشاد خاں نے اٹھ کے رتن کے گریبان پر ہاتھ ڈالنا
چاہا۔ بھل آڑے آگیا۔ ایک دانے ٹھہر کے اس نے رتن
سے کہا۔ "زیادہ کیوں بولتا ہے بادشاہ سلامت! اپنے کو دانا،
کب سامنے آنا چاہتا ہے؟"
"جب تم بولو مہاراج!" رتن بگڑی ہوئی آواز میں بولا۔
"ہم تو کہتے ہیں، ابھی کیوں نہیں ہو جاتا ہے سالا، ابھی دودھ
کا دودھ، پانی کا پانی ہو جائے۔"
"نہیں رے، اتنی جلدی نہیں۔" بھل نے آہستگی سے
کہا۔ "دو تین دن ذرا پٹھوں کی مالش کروا لے۔ بہت اچھل
کود کی ہے تو نے۔"
"ہاں، بعد میں مت بولنا کہ استاد بھل اور شمشاد خاں

نے الٹی چھری چلائی تھی۔ "شمشاد خاں بھڑکتی آواز میں بولا۔ "تم کو ہمارا چوکی پر بیٹھنا پسند نہیں ہے استاد تو صاف بول دو۔"

"ابھی کچھ بولنے کا تو نے کدھر کو رکھا ہے خان بہادر!" طنز' غصہ' یاسیت' شمشاد خاں کا لہجہ ساری آلائشوں سے لبریز تھا۔ کہنے لگا۔ "اور چوکی کی کیا بات کرتا ہے بھتنیا کے۔ چوکی کسی کی میراث نہیں ہوتی۔ جیسا تو بجنے کے وقت مرکھنے بیل کی طرح بیچ میں آگیا تھا' ویسا کوئی اور بھی آسکتا ہے۔"

"اگلے جمعے کے دن میں بہت دیری ہے استاد!" بھلّن نے کھردری' اینٹھتی آواز میں رجّن سے کہا۔ "اس ٹائم تک اپنے کو ٹھہرنا نہیں ہے۔ ایک دو دن کی بات الگ ہے۔ اس بیچ کوئی فیصلہ کراؤ اور اپنی چھٹی کرو۔ تخت پر چاہے تم جمعے کے دن براجمان ہو جانا۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے بھلّن بھائی! آج میں اپنا جی بہت بھاری ہے' خواہ مخواہ تمہارا ٹرسٹ کھوتا گیا۔ پر اب زیادہ نہیں' بس دو ایک دن اور۔" شمشاد خاں التجائی انداز میں بولا اور اس نے خشمگیں نظروں سے رجّن کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ "بول رے' پھر کیا وچار ہے تیرا؟؟"

"اپنا کیا وچار۔" رجّن نے منہ ٹیڑھا کر کے جواب دیا۔ "جیسا تم بولو' ہم تو ابھی تیار ہیں۔ ہاتھ پیر سارے سلامت ہیں اپنے۔"

بھلّن نے ہاتھ اُٹھا کے کہا۔ "کل سویرے کا بول دیں پھر؟ ہاتھ پیر کھولنے اور پانی دیکھنے کو پورا دن پڑا ہے۔ باقی تو ٹھیک ہی بولتا ہے۔ اوپر سے نیچے تک سارا بندھا ہوا ہے۔"

"جمعے کا دن کوئی اوپر کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ پرانے وقت سے چلتا آرہا ہے' اس واسطے سب مانتے ہیں۔" شمشاد خاں دھیمے لہجے میں بولا۔ "پر اس کو کل ہی تاج پہنا دیں گے۔"

شمشاد خاں کی ہدایت پر پہلوان طرز کا ایک بزرگ شخص کھڑا ہو گیا اور اس نے مختصراً بلند آواز میں اعلان کیا کل صبح رجّن استاد اور بابر استاد کے درمیان چوکی نشینی کا فیصلہ ہو جائے گا۔

اعلان کرنے والا آدمی خاموش ہوا تو رجّن جلی ہوئی آواز میں بولا۔ "اور کوئی ادھر اُدھر چھپا ہوا ہو تو نقارہ پیٹ دو۔ دنیا

بہت بڑی ہے' مل جائیں گے بہت سے تیس مار خاں۔ ایک ساتھ سب کو سامنے کر دینا۔"

شمشاد خاں کے تن بدن میں آگ بھڑکی' بمشکل اسے سنبھالا۔

دوپہر ہو گئی تھی۔ کھانا کب کا تیار تھا۔ اڈے والوں نے دسترخوان بچھا دیے لیکن عمارت میں افسردگی تھی۔ بہت سے لوگ پہلے ہی چلے گئے تھے۔ کچھ لوگ کھانا کھائے بغیر باہر نکل گئے۔ موت کے کھانے کی خاموشی ہوتی ہے۔ ببّے خاں عمارت میں موجود نہیں تھا۔ اُس کی تلاش میں ہم تینوں بھی باہر آگئے۔ گلی میں اژدحام تھا اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ آدمیوں نے میرے گرد گھیرا ڈال دیا۔ وہ عزم اور تحسین کے علاوہ میری سرخ روئی کی دعائیں کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ ببّے خاں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اسی وقت کہیں چلا گیا تھا جب اُس کے ہاتھ سے چاقو گرا تھا۔ عمارت میں واویلا ہوا تھا اور لوگ بے قابو ہو گئے تھے۔ کسی کو بھی ببّے خاں کی خبر نہیں تھی۔

آغا پیا کی رہنمائی میں شام تک ہم ببّے خاں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے۔ جانے وہ کون سی کھوہ میں جا چھپا تھا۔ شام کو ہم اڈے واپس آئے تو شمشاد خاں بہت مضطرب دکھائی دیتا تھا۔ اُس نے بھی کئی آدمیوں کو مختلف سمتوں میں دوڑایا ہوا تھا۔

جمرو اور زورا' سلمٰی کی وجہ سے بے چین ہو رہے تھے۔ کل پہلے پہر کے بعد سے اب تک ہمارا اس کے پاس جانا نہیں ہوا تھا۔ اڈے پر کچھ دیر ٹھہر کے ہم شمشاد خاں کے بھائی عزیز خاں کے گھر چلے آئے۔ یہاں سلمٰی بھی واقعی کم مضطرب نہیں تھی۔ مطلوب صورتیں بھی کیسی دلدار ہوتی ہیں۔ ہمیں دیکھ کے اس کا چہرہ چمکنے لگا۔ زورا اور اُس کے لیے موتیا کے گجرے لے گئے تھے' میزبانوں کے لیے مٹھائی کی ٹوکری بھی۔ جمرو نے عزیز خاں کے گھر والوں سے معذرت کی کہ ہماری روانگی میں دو ایک دن کی تاخیر ہو گئی مگر وہ تو جیسے اس حادثے کے آرزومند تھے۔ خوش جمالی' خوش شعاری مستزاد ہے اور لوگ کہتے ہیں' خوش شعار

...ل منڈی ہے۔ دو دن میں سلمٰی نے کیسا جادو
...ی اُس کے گرویدہ نظر آتے تھے۔ کل اور آج
...ے لکھنؤ کی خوب سیر کرائی تھی۔ عزیز خاں کے
...و اڈے سے وابستہ آدمیوں اور سلمٰی کے تعلق کی
...ی جستجو یقیناً ہوگی۔ ہم سے تو وہ کچھ پوچھ نہیں
...و سکتا ہے' انھوں نے سلمٰی سے سُن گُن لینے کی
...ی ہو یا کسی ناگفتنی کے خیال سے وہ محتاط ہی رہے
...حال سلمٰی کو بھی بات کرنے کا سلیقہ تھا۔

...اں کے ہاں خاطر مدارات میں ہم اتنے سیر ہو گئے
...رات کو کھانا کھایا ہی نہیں گیا۔ حالانکہ شمشاد خاں نے
...انکار میں سب کو روکا ہوا تھا۔ اڈے پر بہت سے
...و تھے لیکن ایک ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ ساری
...وں سے ہوتی ہے۔ رات کے کھانے کے بعد رقص
...ل محفل کا اہتمام تھا۔ تماشاگر واپس چلے گئے تھے۔
...کے سروں اور منڈیروں پر ابھی تک چراغ ترتیب
...ے تھے لیکن روشنی کے بغیر۔ روشنی نہ ہو تو چراغ بھی
...ہیں' نابینا آنکھوں کے مانند۔ بنّے خاں کی گم شدگی
...شاد خاں بہت متوحش تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ بنّے خاں
...و وقت اڈے ہی پر گزرتا تھا اور اپنی بڑی بہن کے ہاں
...اں کا آنا جانا مستقل رہتا تھا۔ آغا پا ہمیں وہاں بھی لے
...تھا۔ بنّے خاں نے تاکید کی ہوگی' بہن کے گھر والوں نے
...ے غلط بیانی کی مگر آخر رات کو اڈے کے ایک آدمی نے
...ا اگلا لیا۔ وقفے وقفے بعد اڈے کے آدمیوں کی آمد سے
...ی کو فکر لاحق ہوئی ہوگی چنانچہ اُسے زبان کھولنی پڑی۔
...ے نکل کے بنّے خاں سیدھا بہن کے گھر ہی گیا تھا۔
...اسباب سمیٹ کے اور یہ بتا کے کہ وہ کچھ عرصے کے لیے
...سے باہر جا رہا ہے' وہ فوراً بہن کے گھر سے رخصت ہو گیا
...اگر ہم اُس کے تعاقب میں اسی وقت روانہ ہو جاتے
...اُسے ہجوم کی افراتفری میں خاموشی سے نکل جانے کا
...ل گیا تھا تو کہیں نہ کہیں اُس کا ہمارا سامنا ہو جاتا۔
...سے تو ہم بعد میں بھی نمٹ سکتے تھے۔ بنّے خاں کو ایسی
...کی توقع نہیں تھی۔ شکست تو بڑے بڑے سورماؤں کو
...ل ہے۔ اڈے کے آدمی کو اتنا شبہ بھی نہیں ہوتا
...گا۔

چاہیے۔ رات گئے ایک آدمی نے بتایا کہ غروبِ آفتاب کے
وقت بنّے خاں کو چار باغ اسٹیشن کے نزدیک کسی شناسا نے
دیکھا تھا۔ لوگ اپنی اپنی بولیاں بولتے رہے کہ اُسے فلاں جگہ
فلاں مقام پر دیکھا گیا ہے۔ کسی نے خود اُسے نہیں دیکھا تھا۔
بہن کے گھر سے معلومات اور چار باغ اسٹیشن پر بنّے خاں کی
موجودگی کی اطلاع سے یہی قیاس کیا جا سکتا تھا کہ وہ اب لکھنؤ
میں نہیں ہے۔ جتنا وقت گزرتا جا رہا تھا' شمشاد خاں کے
چہرے پر چھایا ہوا دھواں گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ لگتا تھا' محض
تحمل کی وجہ سے چوکی پر بیٹھا وضع نبھا رہا ہے' ورنہ وہ بھی
اڈا چھوڑ کے نکل گیا ہوتا۔ بنّے خاں کے دو ہمدم و دمساز
دوست بھی لازماً اسی کے ساتھ تھے۔ وہ بھی اڈے واپس نہیں
آئے تھے۔ کاش بنّے خاں کچھ دیر اور ٹھہر جاتا۔ اُسے کہاں
معلوم ہوا ہوگا کہ رنجن نے ابھی چوکی نہیں سنبھالی ہے۔ ابھی
اُسے کل صبح میری دیوار راستے سے ہٹانا باقی ہے۔ اڈے سے
اپنے جانے کے بعد کے واقعات کی بھنک بھی بنّے خاں کے
کانوں تک پہنچ جاتی تو وہ ارادہ بدل دیتا اور شہر بدری کا یہ
انتہائی قدم نہ اٹھاپاتا۔ لکھنؤ کے لوگ اپنے شہر کے ویسے بھی
بڑے شیدائی ہیں' کسی اور جگہ اُن کا جی کم ہی لگتا ہے۔

ہم اوپر اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھا ہی چاہتے تھے
کہ اڈے کے ایک آدمی نے آ کے سرگوشیانہ انداز میں مجھے
بتایا کہ مبارک میاں نامی کوئی شخص مجھ سے ملنے کے لیے
اجازت کا خواہاں ہے۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ اس نام کا کوئی'
لکھنؤ میں کسی نام کا میرا کوئی واقف کار نہیں تھا۔ جمّو اور
زورا نے مشورہ دیا کہ اندر بلانے کے بجائے باہر نکل کے ہی
اُسے دیکھا جائے۔ اندر شمشاد خاں' محفل اور اڈے کے
دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ دروازہ عبور کرنے سے پہلے
جمّو نے تارا بیگم کے قرشاوے کا شبہ ظاہر کیا تھا اور وہ وہی
تھا' تارا بیگم کا سازندہ۔ اس نے مؤدبانہ سلام کیا اور بے
تکلّفی میں بولا۔ "تارا بیگم کل کسی وقت غریب خانے پر
سرکار کی منتظر رہیں گی۔ کوئی مصروفیت درپیش ہو تو پرسوں
سہی۔ بڑی نوازش ہوگی' اگر پہلے اطلاع مل جائے۔"

میں نے جمّو کی طرف دیکھا اور اسی نے جواب دیا کہ
"ٹھیک ہے' آنے سے پہلے ہرکارہ بھیج دیں گے۔"

جمو نے بند مٹھی سے مبارک میاں کے ہاتھ میں کچھ نقدی منتقل کر دی۔ مبارک میاں نے بھی شمار نہیں کی، جیب میں رکھ کے سر خم کیا اور واپس چلا گیا۔

قاصد کے چلے جانے پر ہم تینوں وہیں کھڑے ایک دوسرے کو دیکھا کیے پھر جمو ہنکارا بھر کے بولا۔ "کیا خیال ہے لاڈلے؟"

"کیا کہا جا سکتا ہے۔" میں نے کھوئی ہوئی آواز میں کہا۔ "اب تارا بیگم کے راضی ہونے نہ ہونے سے کیا حاصل۔"

جمو کے پاس حجت کے لیے کچھ نہ تھا۔ اس نیرنگیٔ صبح و شام کے سامنے سبھی بے اختیار ہیں۔ وہ شانے سکوڑ کے رہ گیا۔

ہم تینوں واپس چوکی پر نہیں گئے، بالائی منزل پر اپنے کمرے میں چلے آئے۔ سارا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ جمو اور زورا بھی بکھرے بکھرے دکھائی دیتے تھے۔ بیداری بھی کبھی کیسا بیزار کرتی ہے آدمی اپنے آپ کو برا لگتا ہے۔ زورا بستر پہ کروٹیں بدلتے بدلتے اوب گیا تو اٹھ کے کمرے میں ٹہلنے لگا اور بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "دادا! ابھی ایک بات بولے۔"

میں نے اپنا بوجھل سر ہلا کے پوچھا۔ "کیا ہے؟"

"یہ اپن کا بنّے دادا کیسا آدمی تھا۔" زورا نے بے ربط لہجے میں شکایت کی۔ "ابھی پیچھے اتنا لوگ چھوڑ کے چلا گیا۔"

میں کیا کہہ سکتا تھا۔ زورا کہنے لگا۔ "اپن سوچتا ہے، آج کا دن بنّے دادا کو اس تختے کا پچّی رتّن کے آگے جانے کا نہیں تھا۔"

"پھر کون سا دن رکھنے کا تھا دادا؟" جمو نے اچکتی آواز میں دخل دیا۔

"نہیں جمو بھائی! مسخری نہیں۔ ماں قسم، رات اُودری بائی جی کے کوٹھے پر بنّے دادا نہیں جاتا تو سویرے ایسا نہیں ہوتا۔"

زورا کچھ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ رات تارا بیگم کے بالا خانے پر جا کے بنّے خاں کو ایک سلسلۂ خیال کے سحر سے دوچار ہونا چاہیے۔ چاندنی بانو کے سامنے میں نے اُس کے چہرے پر بہت سے رنگ دیکھے تھے۔ حسرت، امید، اشتیاق اور اُنہی کے رنگ۔ وہاں سے آ کے تو اُس کی آنکھیں

مسلسل خواب دیکھتی رہی ہوں گی۔ بس ایسے ہی ...
آفریں، خیال انگیز لمحے کا فسوں اسے زیر و زبر ...
ہی تارا بیگم آمادہ ہو جاتی تو بنّے خاں کا عالم دگر ...
اُسے اِس طرح روپوشی کی ضرورت نہ پڑتی۔ وہ ...
اڈّے کی مسند پر بیٹھا ہوتا اور اڈّے کی عمارت میں ...
دھومیں مچی ہوتیں۔

جمو بھی اٹھ کے بیٹھ گیا اور خود کلامی کے انداز ...
"تارا بیگم کو بھی تو پتہ چل گیا ہو گا کہ بنّے خاں ...
نہیں بیٹھ پایا۔"

"ایک دم دادا!" زورا کی آواز میں تیزی آ گئی۔ ...
نہیں دیکھا! بولی کے ٹیم کیسا چکری دیتا تھا بائی جی۔ ...
میں نیچے کو آتا ہی نہیں تھا۔ اپن بولتا ہے، رات ...
نہیں آیا ہو گا۔ اڈّے پر بنّے دادا کے الٹپ جانے ...
ہی آدمی ایدر آیا، ابھی سونا بھرا پوٹلی ہاتھ سے ...
جائے۔"

"اور اس ٹھٹھن لال مبارک میاں نے تو بنّے خاں ...
ہی نہیں۔" جمو لنک کے بولا۔ "سیدھا اپنے لاڈلے ...
پوچھتا ہوا آیا۔"

"بات بھی تو راجا دادا نے چلایا تھا۔ اس کے پاس ہی ...
بھیجنے کا تھا۔"

"اُدھر تارا بیگم نے سارا دن آس پاس نواب لوگ ...
ٹولا، کھلکوڑا ہو گا۔"

"اکھا دن آج جو یہ نواب لوگ کا ٹوں کاٹا کیا ہو گا ...
کا بات ہے جمو بھائی!" زورا نے کڑوی آواز میں کہا۔ ...
سالا نواب لوگ پہلا مالک کیدر رہے۔ ایدر راجا دادا ...
بھی آسمان پر جا کر لگایا۔"

وہ دونوں دیر تک ایک دوسرے کی تائید و تردید ...
رہے۔ میں بستر پہ پڑا سنتا رہا۔ میں نے اُن سے بحث نہیں ...
کہ یہ قیمت بھی کوئی قیمت ہے، لوگ تو تخت و تاج ...
کر دیتے ہیں اور زندگی نذر کر دیتے ہیں۔ ایک آدمی کی ...
کیا ہو سکتی ہے۔ اس کا تعین تو کوئی طلب گار ہی کر سکتا ہے۔ ...
کوئی کتنا ہی پری پیکر، گل اندام ہو، اور جیسا کہ لوگ ...
ہیں، سانچے میں ڈھلا ہو، قیمت تو مطلوب کی ہوتی ہے ...

...طلوبی صفات لازم نہیں۔ اس کی قیمت نہ ... یکتائی سے مشروط ہے نہ باطنی حُسن کی ... دیکھتے میں جا گزیں اور آنکھوں میں نقش ہو ... ہر شخص کا اپنا ایک پیمانہ ہے۔ جو بھی ... جائے' یا کسی تحیّر نگاہ کا کرشمہ ہے' جو اس کی ... آدمیوں کے مابین یک نفسی و یک جائی کی ... جان سکتا ہے۔ کبھی تو خود مطلوب کو خبر نہیں ... ان پر کھڑا دستک دے رہا ہے اور کتنا بڑا ... ادی ہے۔ یہ رقم تو کچھ بھی نہیں تھی۔ جس ... اور کے کسی مطلوب کی قیمت وہی سمجھ سکتے ... نہیں سمجھ سکتا' اسی طرح چاندنی بانو کی قدر و ... کی بنّے خاں ہی کر سکتا تھا۔ وہ کوئی نواب زادہ' ... سارا لاؤ لشکر نذر کر سکتا تھا' اور یہ تو محض ایک ... محسی کا اتّفاق کہ بنّے خاں کا مطلوب نیلام ... ب ہو سکتا تھا' لیکن جہاں بولی کا امکان نہ ہو' ... کا سونا چاندی کس کام کا' اس کے جواہر و نوادر ... کے محل دو محلے تو کھنڈروں کے مانند ہیں۔

... کے آخری پہر اُنھیں نیند نے آلیا۔ صبح کاذب ... میری آنکھ بھی لگ گئی۔

O

...خاں کا دستِ راست مرزا دل برنہ آتا تو ہم جانے ... اپنے آپ سے بے گانہ رہتے۔ اس کی صداؤں پر ... کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ نو بج رہے تھے۔ سورج ... اتر آیا تھا۔ مرزا نے بتایا کہ نیچے عمارت میں ... لوگ جمع ہو چکے ہیں اور ان کی آمد کا سلسلہ جاری ... بھی اپنے ساتھیوں سمیت آچکا ہے۔ بھمل اور ... ہمارے منتظر ہیں۔ مرزا دل بر نے ناشتے کا اہتمام ... لیے تھے۔ نہا دھو کے ہم نے کپڑے تبدیل کیے ... جلدی ناشتہ کر کے نچلی منزل پر چلے آئے۔

... میں کل سے بڑا ہجوم تھا۔ جہاں تک نگاہ جاتی' سر ... رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کے بے تحاشا شور مچنے لگا۔ ... وسط میں بھمل اور شمشاد خاں حاکمانہ تیور سے ... تھے۔ اُن کے علاوہ اڈے کے اور آدمی بھی چوکی پر موجود تھے۔ دودھ کے کٹورے' لوبان کا برتن' ہار پھول وغیرہ کوئی چیز بھی آج بھمل کے آگے نہیں تھی۔ چوکی کے دائیں طرف چار زانو نشست میں رتجن خاموش بیٹھا تھا۔ چہرے کی تاب ناکی و تروتازگی درونِ خانہ اعتماد کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ وہ سفید لباس میں ملبوس تھا۔ کُرتے کے گلے سے سونے کی زنجیر جھانک رہی تھی۔ زنجیر میں تعویذ بھی پیوست ہوگا۔ چمکتا ہوا چاندی کا کڑا کلائی میں جھول رہا تھا۔ یہ کڑا کل اُس کے ہاتھ میں نہیں تھا' بازو سے بندھا ہوا کالی دھجّی کا امام ضامن آستین سے جھلک رہا تھا۔ اِرد گرد بیٹھے ہوئے ساتھیوں نے میری طرف اشارہ کیا تو اُس نے سر گھمایا۔ اس کی آنکھوں میں طرح طرح کی کیفیتیں نمودار ہوئیں' غصّہ' حقارت اور اضطراب کی لہریں۔ پھر اُس نے میری جانب سے نگاہ پھیر لی۔ ہم تینوں کو جگہ دینے کے لیے لوگ پہلے ہی پیچھے ہٹ گئے تھے۔ شمشاد خاں کی ہدایت پر ہم رتجن کے عین مقابل چوکی کے بائیں طرف بیٹھ گئے۔ چوکی کے سامنے دائرے کی جگہ آج کھلی رکھی گئی تھی اور لوگ دائرے میں بڑھنے سے لوگوں کو روک رہے تھے۔

ہمیں آئے ہوئے چند منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک باراں دیدہ قسم کے شخص نے کھڑے ہو کے خاموشی کی تاکید کی۔ اُس کی ہم نوائی میں آگے پیچھے کئی آدمی کھڑے ہو گئے۔ اُن کی کوششوں سے مجمع بڑی حد تک پُر سکون ہو گیا۔ تب بزرگ آدمی نے مختصر لفظوں میں آج کے اجتماع کی غرض و غایت بیان کی اور بہم تنبیہی' بہم التجائی لہجے میں کہا کہ لوگوں کی خاموشی دونوں فریقوں کے لیے بہتر ہوگی۔ کوئی اگر یا صدا بلند کرنے' ناشایستہ کلمہ ادا کرنے والے کو عمارت سے نکال دیا جائے گا۔ رسّی سے دائرے کی حدیں قائم کر دی گئیں اور بھمل نے پہلے رتجن سے' پھر مجھ سے ہماری آمادگی کی بابت پوچھا۔

ہم دونوں ایک ساتھ اُٹھے۔ مسہود روایت میں نے جیب سے چاقو نکال کے اڈّے کے استاد شمشاد خاں کے قدموں میں رکھ دیا۔ شمشاد خاں نے میرا چاقو پیٹے سے لگایا اور اپنا چاقو بھمل کی طرف بڑھا دیا۔ بھمل نے اسے میرے حوالے کر دیا۔ رتجن نے بھی یہی کیا۔ ہم دونوں دائرے میں آ گئے۔

رتّجن نے اپنی کمر کے گرد پٹکا باندھ لیا تھا۔ ایک نظر بھّل کی طرف دیکھ کے میں نے چاقو کھول لیا۔ بھّل نے جواب میں ہاتھ کو خفیف سی جنبش دی۔ میں نے سر جھکا کے گویا اپنی تفہیم کا اظہار کیا۔ یہ رمزو کنایہ مقابل پر دباؤ ڈالنے کا ایک موثر طریقہ ہے۔ رتّجن نے بھی اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ انھوں نے ہاتھ اٹھا اٹھا کے اُس کا حوصلہ بلند کیا۔

میں نے طے کر لیا تھا کہ جلد از جلد' ہو سکے تو لمحوں میں کسی نتیجے پر پہنچنا ہے۔ حالانکہ جی یہی چاہتا تھا کہ اُسے دیر تک گھمایا جائے۔ وہ میرے لیے اب ایسا اجنبی نہیں رہا تھا۔ کل میں اسے اچھی طرح دیکھ چکا تھا' البتہ وہ مجھ سے بالکل نا واقف تھا۔ ممکن ہے' کل سے اب تک اُس نے میرے بارے میں کچھ سنا ہو لیکن لکھنؤ میں لوگ ہی کتنے مجھے جانتے تھے۔ شاید کوئی بھی نہیں۔ بھّل کا نام بے شک بہت سے لوگوں نے سنا تھا اور بھّل سے میری نسبت کی وجہ سے رتّجن کو بھی محتاط ہونا چاہیے تھا۔ خصوصاً ابتدا میں تو کچھ زیادہ ہی۔ اُسے اِس حقیقت کا بھی خوب احساس ہو گا کہ اس کے اور بنّے خاں کے درمیان معرکہ آرائی کے بعد میں نے خود کو پیش کیا ہے تو یہ کسی بُوتے اور برتے ہی پر کیا ہو گا۔ اس نے پہل نہیں کی۔ میں نے بھی اُس کی تقلید میں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں چاقو منتقل کرنے کی مشق سے اجتناب کیا۔ شروع میں اپنی چابک دستی اور مشاقی سے بے خبر رکھنا میرے لیے سُود مند تھا۔ مجھے اپنے زخم خوردہ ہاتھ کا بھی خیال رکھنا تھا' اس پر زیادہ زور نہیں دینا تھا۔ گو زخم بڑی حد تک ٹھیک ہو چکا تھا لیکن ابھی تک پٹی بندھی ہوئی تھی۔

پہلے وہ مجھ سے دور دور ہی رہا پھر میرے فاصلہ کم کرنے پر وہ بھی کسی قدر نزدیک آگیا اور جیسے ہی وہ چاقو لہراتا رُو بہ رُو ہوا' میں نے اپنے خالی ہاتھ کے بجائے چاقو بردار ہاتھ اس کے چاقو بردار ہاتھ کی طرف دراز کیا۔ عموماً ایسا نہیں ہوتا' کسی طور مقابل کے چاقو والے ہاتھ کا پنجہ گرفت میں لے کے بے بس کر دینے پر زور اور وقت صَرف کیا جاتا ہے لیکن اصل میں مجھے اپنے خالی ہاتھ سے اس کے شانے پر ضرب لگانی تھی۔ میرا چاقو والا ہاتھ اپنی جانب جھپٹتا دیکھ کے وہ ہوشیار ہو' منتشر ہوا۔ مجھے اُس کی تمام تر توجہ اس کے اور اپنے چاقو والے ہاتھ پر مرکوز رکھوانی تھی۔ ...
کے مطابق اس نے سارا دھیان میرے اور ...
ہاتھوں کی نقل و حرکت پر دیا' دوسرے ہی ...
میرے خالی ہاتھ پر نہیں۔ اس طرف میں ...
اُس کے شانے پر پوری قوت سے ضرب ...
گردن کے قریب ترچھے ہاتھ کی ضرب لگی ...
دیر کے لیے سر سے پیر تک جسم متلاطم رہتا ...
حواس بھی یک جا نہیں رہے' اُس کی سمجھ میں ...
فرش پر بیٹھ جائے' کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا ...
اُس کے قدم بھی لڑکھڑائے تھے۔ اُسے اپنے ...
کا بھی ہوش نہیں رہا۔

وہیں کھیل ختم ہو جاتا۔ اس اثنا میں کہیں ...
جسم اپنے چاقو سے نشانہ بنا سکتا تھا لیکن ایک ...
بیٹھتے یا ڈگمگا کے گرتے ہی دور ہو گیا' دوسرے ...
دانستہ دور ہو جانے کا موقع دیا۔ میری خواہش ...
خاں پر کل اُس نے جس داؤ سے برتری حاصل ...
آج اعادہ ہو۔ رتّجن اپنے پیروں پر دوبارہ کھڑا ...
میں دکھائی دیا تو میں نے بنّے خاں کی طرح ...
عمودی یعنی سیدھا رکھ کے اُس کی طرف بڑھا ...

اب تو اُسے اپنی جگہ سے حرکت کرنی ہی ...
پیروی میں چاقو والا ہاتھ جسم کے درمیان سیدھا ...
رکھنا تھا۔ اس داؤ میں دائرے کے چکر کاٹنے ...
ہے۔ کسی جگہ میرے قریب آنے پر اس کے ...
راستے تھے کہ وہ طرح دے کے دائیں یا بائیں ...
سامنے ہونے کا فیصلہ کر لے۔ دائرے کے چکر ...
بجا طور پر ہر فریق کی جانب سے کسی بھی لغزش ...
امکان ہر وقت موجود رہتا ہے۔ گو مجھے رتّجن کی ...
کسی غیر متوقع حربے کا اندیشہ مطلق نہیں تھا ...
اُس کے ہاتھ میں کھُلا چاقو تھا اور بھّل کے ...
کسی درجے کا ہو' کھُلے چاقوؤں میں آنکھیں ...
رکھنی چاہئیں۔ کسی وقت بھی اس کے دماغ میں ...
پا سکتی تھی اور کسی وقت بھی مجھ سے حساب ...
بھول چُوک ہو سکتی تھی۔ ہزیمت کے نتیجے میں ...

بھٹک سکتا ہے اور کوئی اوچھی حرکت بھی سرزد ہو سکتی ہے۔

آہستہ آہستہ میں اپنے اور اس کے درمیان فاصلہ کم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ خاصا پھرتیلا تھا۔ پینترا بدلنے میں اُسے بڑی مشاقی تھی۔ کچھ دیر یہی صورت رہی۔ میرا فاصلہ کم کرتے رہنا' اس کا طرح دینا اور بھبکیاں دیتے ہوئے اِدھر اُدھر ہو جانا' مگر کب تک وہ یہ آنکھ مچولی کرتا رہتا۔ کبھی کبھی ایک دوسرے کے سامنے صف آرا فریقوں میں سے کسی ایک کو تماشائیوں کا لحاظ بھی آ جاتا ہے' اس عجلت یا مروّت کے نتائج اچھے نہیں نکلتے۔ رجّن کی طرف سے تو آخر دم تک اس غلطی کا ارتکاب ممکن نہیں تھا کہ ہجوم میں کتنے تماشائی اس کے دل دادہ و دل دار تھے۔

میرے تخمینے سے وقت کچھ اوپر ہو رہا تھا۔ یقیناً رجّن کو میری منشا کا کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا سو اُسے نامراد بنّے خاں کے آخری داؤ والی صورتِ حال کی تکرار سے پہلو تہی کرتے رہنا چاہیے تھا۔ پہلے ہی ہلّے میں جب میں نے اُس کے شانے پر ضرب لگائی تھی' اُسے میرے بارے میں رائے قائم کرنے یا یوں کہا جائے کہ رائے بدلنے کا اچھا موقع مل گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ کچھ زیادہ ہی چوکنا ہو گیا تھا۔ کل بھی وہ بیش تر اپنا دفاع ہی کرتا رہا تھا لیکن کل اس کے دفاع میں غصّہ اور غضب شامل تھا' آج اضطراب آمیز ہوش مندی غالب تھی۔ اُس نے جیسے اپنی جانب سے پیش قدمی کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ مجھے اس بارے میں کچھ اور سوچنا چاہیے تھا۔ اصرار سے کچھ دیر لگ سکتی تھی اور رجّن اس عزّت کا سزاوار نہیں تھا۔

ایک مرحلے پر فاصلہ خاصا کم رہ گیا تو میں نے یکایک اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔ رجّن نے چاقو والا ہاتھ سیدھ میں رکھا ہوا تھا۔ میرے اس غیر متوقع اقدام پر وہ ششدر بھی ہوا' متذبذب بھی۔ پر سامنے سب کچھ صاف تھا۔ اس ناگہانی کو حسنِ اتفاق بھی کہتے ہیں۔ اس نے یہی بہتر جانا کہ اپنا چاقو بردار ہاتھ جُوں کا تُوں سیدھا رکھے اور اب کوئی پہلو نہ بدلے۔ میں اسے اپنی ذہنی ابتری اور خرد ماتی کا تاثر دینا چاہتا تھا۔ رجّن کا چاقو عمودی تھا۔ درمیان میں فاصلہ بہت کم تھا اور میں بڑھا چلا آ رہا تھا۔ کوئی دیوانہ ہی اس مضحکہ خیز جرأت

کا متحمّل ہو سکتا تھا۔ بہ ظاہر اس میں میرے [illegible]
دس گُنا تھا تو رجّن کا ایک گُنا بھی نہیں تھا۔ [illegible]
باعث یہ میرے لیے ایک پیچیدہ اور مشکل [illegible]
نے میزان کر کے ہی قدم اُٹھایا تھا۔

ہونٹ بھینچ کے اور آنکھوں میں آگ [illegible]
میری طرف زقند بھری۔ ہر سلیم العقل کی [illegible]
اپنی تمام صلاحیتیں مجتمع کر کے اس کرشمۂ [illegible]
لمحے سے بہرہ مند ہوتا۔ کچھ اور سوچنے کے لیے [illegible]
ہی نہیں دیا تھا' اسے اپنی جانب اُمڈتا دیکھ کے [illegible]
قدم منجمد کیے' اب اُس کے لیے ٹھیر جانا' [illegible]
نظرِ ثانی کرنا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ اتنی قربت [illegible]
کسی کو بھی زاویہ بدلنے کی توفیق نہ ہوتی' اور [illegible]
ضرورت بھی نہیں تھی کیوں کہ سامنے اپنا کوئی [illegible]
آ رہا تھا۔ اس کے عمودی چاقو بردار ہاتھ کی [illegible]
لیے مجھے بروقت چند انچ دائیں جانب اپنا جسم [illegible]
نشانہ بالکل ٹھیک تھا۔ میرے جسم کے بائیں [illegible]
کے نزدیک چاقو پیوست ہونا چاہیے تھا۔ [illegible]
میں نے تیزی سے جسم دائیں طرف ہٹایا تو [illegible]
رجّن کا دراز ہاتھ اس تکونی خالی جگہ یعنی میری [illegible]
قریب سے گزرا اور میرے اُٹھے ہوئے ہاتھ کے [illegible]
نے اسے بازو یا پسلیوں کے درمیان جکڑ لیا۔ [illegible]
احساس تھا۔ رجّن کے زور کرنے' اُچھلنے کودنے [illegible]
دینے سے اُس کا ہاتھ میری گرفت سے نکل بھی [illegible]
میں چاقو میرا بازو اور پسلیاں کاٹتا ہوا گزر جاتا۔ [illegible]
اور بازو کی گرفت سے باہر رجّن کے ہاتھ کا کچھ [illegible]
تھا۔ وہ چاقو انگلیوں میں گھما سکتا تھا مگر تبھی [illegible]
مہلت ملتی یا میں اپنے دوسرے چاقو بردار ہاتھ [illegible]
کی طرح غافل رہتا۔ یک وقت میرے دوسرے [illegible]
اُس کی گردن کے قریب چاقو کی نوک چبھو دی اور [illegible]
کو محفوظ کرنے کے لیے اپنے بازو اور پسلیوں [illegible]
جکڑے ہوئے اُس کے چاقو والے ہاتھ کی کلائی [illegible]
کی کوشش کی اور مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی [illegible]
ساری توجّہ اپنی گردن کے قریب چاقو کی نوک پر [illegible]

بے تاج و تخت

مولانا اعزاز علی امروہوی دارالعلوم دیوبند کے مشہور اساتذہ میں سے تھے۔ وہ درس و تدریس میں وقت کے انتہائی
انھیں درس گاہ کے دروازے پر دیکھ کے گھڑی ملائی جا سکتی تھی۔ پاکستان کے ممتاز عالم دین مفتی محمد شفیع
سے تلمذ حاصل تھا۔ ایک مرتبہ مولانا اعزاز علی اور اُن کے کچھ شاگردوں کو سفر پر جانا تھا۔ سب لوگ اسٹیشن
ریل کا انتظار کر رہے تھے۔ مولانا نے ساتھیوں سے کہا: "کئی افراد سفر پر جا رہے ہوں تو انھیں شریعت کے
میں سے کسی ایک کو امیر بنا لینا چاہیے لہٰذا بہتر ہے کہ ہم امیر کا انتخاب کر لیں۔" مفتی محمد شفیع نے عرض کیا۔
انتخاب کا کیا سوال ہے۔ امیر تو پہلے ہی موجود ہیں۔" مولانا اُن کا اشارہ سمجھ گئے، انھوں نے پوچھا: "کیا آپ
نا چاہتے ہیں؟" سب نے یک آواز ہو کر جواب دیا کہ "جی ہاں۔ آپ کی موجودگی میں کسی اور کے امیر بننے کا کیا سوال ہے۔"
کہا: "ٹھیک ہے، مجھے کوئی تکلف یا اعتراض نہیں لیکن یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ امیر کا حکم ماننا ضروری ہوتا ہے۔
میرے احکام ماننے ہوں گے۔" سب نے کہا: "آپ کا حکم ویسے بھی ہمارے لیے واجب تعمیل ہے۔ امیر بننے کے بعد
اور زیادہ لازمی ہو گی۔" مولانا نے امارت قبول کر لی۔ تھوڑی دیر میں ریل آ گئی۔ مولانا بجلی کی سی پھرتی
اور جلدی جلدی اپنے ساتھیوں کا سامان اُٹھانے لگے۔ ایک چیز ہاتھ میں، دوسری بغل میں اور کوئی چیز
میں۔ غرض وہ جتنی چیزیں اُٹھا سکتے تھے، اُٹھا لیں۔ یہ صورت دیکھ کے اُن کے شاگرد بے چین ہو گئے
آگے بڑھ کر مولانا کے ہاتھ سے سامان چھیننا چاہا لیکن مولانا نے سختی سے سامان سنبھالے رکھا اور کہا: "میں آپ
امیر ہوں۔ آپ وعدہ کر چکے ہیں کہ میرا کہنا مانیں گے لہٰذا میں امیر کی حیثیت سے حکم دیتا ہوں کہ سامان مجھی کو اٹھانے
شاگرد مجبوراً خاموش ہو گئے۔ پورے سفر میں مولانا کا یہی معمول رہا۔ جب بھی محنت و مشقت کا کوئی کام آتا، وہ
بڑھ کے انجام دیتے، کسی دوسرے کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہ ملتی۔ آخر ایک بے تکلف شاگرد نے کہہ دیا کہ "حضرت!
کو امیر بنا کے بہت پچھتائے۔" مولانا مسکرا دیے۔ اُن کی مسکراہٹ کا مقصد غالباً یہی تھا کہ امیر کا صحیح مطلب
بھی تو میری ذمے داری ہے۔

مولانا محمد تقی عثمانی کے ایک مضمون سے

ھیلی کر کے اور ہاتھ موڑ کے میں نے جھٹ
پنجہ ڈالا تھا۔ اس احتیاط کی اگرچہ ایسی
تھی، رنجن کو چند لمحوں میں اپنا چاقو ترک کرنا ہی
خواہش تھی کہ رنجن اپنے ہاتھ میں چاقو
سے ثابت و سالم تو واپس نہیں جانا چاہیے
کوئی نقش تو یادگار میں اس کے چہرے پر کندہ
گردن پر اپنے چاقو کی نوک کی پیوستگی میں اسی
قوت اختیار نہیں کی تھی لیکن رنجن نے جلد ہی
اور چاقو ہاتھ سے چھوڑ بیٹھا۔ اس کے باوجود
درمیان میں ایک دوسرے کو قطع کرتی ہوئی
تھیں۔ اُس کی ناک بھی بیچ کے تیو اڑی
چہرے سے جدا کی جا سکتی تھی، اور کچھ نہیں تو
اس کی گردن میں ذرا گہری کر سکتا تھا مگر وہ
چاقو سے دست بردار ہوا بلکہ اس نے ہاتھ پیر بھی

چھوڑ دیے۔ مزاحمت کے دوران کوئی داغ کندہ کرنے کی
بات اور تھی۔ مجھے خود کو روکتے ہوئے بہت بیزاری ہوئی۔

میرے اندازے سے چند لمحے زیادہ صرف ہوئے۔ لوگوں
کو اپنے دیکھے ہوئے پر یقین کرنے کے لیے۔ بہرحال کچھ
وقت چاہیے تھا۔ سب کچھ دیکھتے دیکھتے بس پلک جھپکنے کے
عرصے میں ہوا۔ میرے جسم نے خودکار انداز میں ایک ساتھ
کئی کام کیے تھے۔ رنجن کے بڑھنے پر خود کو روکا، بائیں طرف
جھکایا، خالی ہاتھ نے اس کا چاقو بردار ہاتھ جکڑا، میرے چاقو
بردار ہاتھ نے اس کی گردن حصار میں لی۔ کمال کا کہنا تھا کہ
چاقو کی گرفت اپنی جگہ لیکن اصل بات تو اس کے استعمال
کے نظم و ضبط میں ہے۔ چاقو تو کوئی بھی گھونپ سکتا ہے۔ صحیح
مہارت اور مشاقی یہ ہے کہ چاقو مقابل سے کتنے فاصلے پر رکھنا
ہے؟ کیا مقصود ہے؟ محض مس کرنا ہے، ہلکی لکیریں ڈالنی
ہیں، لباس چاک کرنا ہے یا نشانے کے لیے کوئی مخصوص جگہ

مطلوب ہے؟ ایک دفعہ بھل نے حیدر آباد میں ایسے ہی ایک موقع پر مجھے نوٹ کے چاقو چلانے کا اشارہ کیا تھا سو میں نے شاہ کیرا کا ازار بند کاٹ دیا تھا۔ اڈّے کے دادا کی اس سے بڑی رسوائی کیا ہو سکتی ہے۔ شاہ کیرا کے جسم کے کسی حصّے سے چاقو مَس نہیں ہوا تھا۔ رجّن سے بھی کچھ ایسا ہی سلوک کیا جا سکتا تھا لیکن اس نے اپنا جسم ہی اچکا دیا۔

عمارت میں شور کے سوتے پھوٹ پڑے۔ میں نے ٹھوکر سے رجّن کا گرا ہوا چاقو اس سے دور کیا اور اس کی گردن سے ہاتھ اٹھا کے اپنا چاقو جمو اور زورا کی طرف اچھال دیا۔ دونوں نے ہاتھ بلند کیے تھے لیکن جمو نے چاقو اچک لیا۔ اچھا ہوا جو میرے ہاتھ میں چاقو نہیں رہا ورنہ انگلیاں بہت اینٹھ رہی تھیں۔ رجّن کو دیکھ کے بنّے خاں کا چہرہ نظروں میں گھوم جاتا تھا۔

جھٹکا دینے پر رجّن مجھ سے الگ ہوا اور فرش پر لڑھک پڑا۔ اُسے اس کے حال پر چھوڑ کے میں نے چوکی کی طرف قدم بڑھائے۔

ادھر سے جمو اور زورا نے، ادھر سے شمشاد خاں اور اڈّے کے کئی آدمیوں نے چوکی سے اُتر کے مجھے دبوچ لیا۔ ہر جانب سے لوگ امڈنے لگے۔ ہر کوئی چیخ رہا تھا، والہانہ نعرے لگا رہا تھا۔ اُنھوں نے میرے ہاتھ چومنے شروع کر دیے۔ جمو اور زورا نے مجھے کندھوں پر اٹھا لیا۔ شمشاد خاں نے میری ٹانگ جکڑ لی۔ وہ میرے پیر چومنے پر تُلا تھا، آنکھوں سے مس کرتا۔ اسی طرح وہ لوگ مجھے بھل کے سامنے لے آئے۔ بھل نے چمکتی آنکھوں سے ایک بار نظر پھیر کے مجھے دیکھا۔ جانے کیوں اُس سے نگاہیں ملا کے مجھے وحشت ہونے لگی۔ بھل بھی سر جھکا کے حقّہ گڑگڑانے لگا۔

سبھی جیسے پاگل ہو گئے تھے۔ ہر ایک چوکی کی طرف آنے کے لیے بے قرار تھا اور وہ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ بہت ہاتھ پیر چلا کے بہت چیخ پکار کے بعد جمو، زورا اور اڈّے کے آدمیوں نے مجھے اُن سے بچایا اور بھل کے پاس بٹھا دیا۔

چوکی کے آدمی کھڑے ہو ہو کے نظم و ضبط کے احکام صادر کرتے رہے، پھر انھیں کسی کمرے سے لاٹھیاں منگوانی پڑیں، لاٹھیاں لے کر چند آدمی چوکی سے اُترے تب سکون ہوا۔ خاموشی ہوتے ہی شمشاد خاں نے ہجوم سے کہا کہ شہر میں جتنی مٹھائی تیار ہو جتنے کہیں نظر آئیں، اڈّے پر سمیٹ لائیں، صدر دیگیں چڑھوائی جائیں اور رَت جگے کی منادی یہ فرمان جاری کرتے کرتے شمشاد خاں کی آواز تھی، آگے اس سے کچھ نہیں کہا گیا۔ بھل نے کے اسے پاس بٹھایا تو وہ بھل کے گلے سے لگ طرح رونے لگا۔

بار بار عمارت میں اٹھتے شور سے میرا جی تھا۔ چوکی سے ہٹ جانے کا محل نہ تھا۔ سب کی پر منڈلا رہی تھی۔ میں تماشا بنا بیٹھا تھا۔ پھر نہیں گزرا ہوگا کہ لوگ مٹھائی کے ٹوکرے اٹھا اُنھوں نے پھولوں کی پتّیاں مجھ پر اور بھل پر دیں۔ شمشاد خاں کی دیکھا دیکھی اڈّے کے اتنے ہار پھول میرے اور بھل کے گلے میں ڈال ہمارے چہرے ہی چُھپ گئے۔

دھوپ عمارت کے صحن میں اُتر آئی تھی۔ گھٹنے ٹیکے بیٹھے رہے۔ انھوں نے چوکی کے قریب لیے نذریں گزرانی شروع کر دی تھیں۔ میں نے کا اشارہ کر دیا تھا اور ہم اٹھا ہی چاہتے تھے دروازے سے آغا پیا لپکتا جھپکتا، راستہ بناتا ہوا چوکی پر آیا اور اس نے میرے پہلو میں شمشاد خاں کے کان میں جلدی جلدی کچھ کہا۔ شمشاد خاں اچھل پڑا اور بے طرح گالیاں بکنے چھنال زادی اِدھر اپنی ماں کے یاروں کے پاس گئی۔"

"کیا ہے استاد؟" بھل نے چونک کر پوچھا۔

"دیکھا تم نے، اس تارا بیگم مسری والوں کو جا کے بول دیا ہے۔ بھل بھائی! فوج دار تھانے دار چوہان جی باہر کھڑے ہیں حرام خور، اس کو کوئی اور گھر دکھائی نہیں دیا۔"

تارا بیگم اور پولیس کے نام پر میرا ماتھا

اور زورا کی طرف دیکھا۔ اُن کی آنکھیں بھی

اندر۔" بمّل نے تیوری چڑھا کے کہا۔
بمّل بھائی!" شمشاد خاں مایوسی سے بولا۔ وقت دیکھتے ہیں نہ موقع۔ اس رنڈی کو اچھی تھا کہ اپنا کوئی واسطہ نہیں ہے۔"
منتظر تھا۔ اس کے ٹوکنے پر شمشاد خاں نے کہ چوہان کو زینے کے بیرونی دروازے سے بالائی منزل پر بٹھایا جائے۔ اڈے کے ایک سرگوشیوں میں ہدایات دے کے شمشاد خاں اُٹھ گیا۔ بمّل نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ سے نہیں پوچھا لیکن ہم وہاں کیسے بیٹھے رہ تینوں بھی اٹھ گئے۔ لوگوں نے پیچھے ہٹ ہٹ دیا۔ آغا پا کی آمد اور یکے بعد دیگرے ہم منزل کا رخ کرنے پر عمارت میں چہ میگوئیاں

ایک دروازہ عمارت کے اندر بھی کھلتا تھا۔ کو زینے میں روک لیا اور تھانے دار چوہان بھی۔ آغا پا نے سنسناتی آواز میں بہ عجلت ہمارے لیے ناقابلِ فہم بھی تھا' ناقابلِ یقین کہنے کے مطابق صبح کوئی سات بجے تانگے میں تارا بیگم اڈے پر دہائیاں دینے آئی تھی۔ رات اُس کے بالا خانے پر ڈھاٹے باندھے ہوئے آئے۔ ان کے پاس خنجر اور طمنچے تھے۔ خانے پر موجود تمام افراد کو ایک کوٹھری میں سے ہاتھ پیر باندھ دیے۔ وہ چاندنی بانو گئے۔ صبح کاذب کے وقت بازار میں گہرا سناٹا پاس کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ تارا بیگم لے رہی تھی۔ شمشاد خاں نے اُس کے ساتھ ایک سازندے کو' بالائی منزل بھیج دیا کہ وہ اپنی لے' میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ آرام شمشاد خاں کے علاوہ صبح اڈے پر موجود چند بھی تارا بیگم کو مطمئن کرنے کی کوشش کی

کہ رات گئے تک ہم لوگ ان سب کے درمیان اڈے پر بیٹھے رہے ہیں۔ شمشاد خاں نے اس واقعے کی بابت ہمیں کچھ بتانا نامناسب اور غیر ضروری سمجھا۔ عمارت میں لوگ جمع ہو چکے تھے اور تھوڑی دیر میں رتّن سے میرا آمنا سامنا ہونے والا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ تارا بیگم کے بیان کی روداد میرے لیے انتشار کا باعث ہو سکتی ہے۔ تارا بیگم کو کوئی غلط فہمی تھی تو شمشاد خاں نے اپنی دانست میں رفع کر دی تھی۔

آغا پا کی زبانی یہ ماجرا سن کے سب گنگ رہ گئے۔ زورا اُس سے کچھ اور جاننا چاہتا تھا مگر جمرو کی سرزنش پر خاموش ہو گیا۔ ہم نے تیز قدموں سے زینہ عبور کیا۔

بھاری تن و توش' مناسب قدو قامت' پھولے ہوئے گالوں' چھوٹی چھوٹی آنکھوں' بادامی رنگ کا ادھیڑ تھانے دار چوہان دو سپاہیوں' ایک نوجوان ماتحت افسر کے ساتھ آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ اُس کے سامنے دائیں بائیں بمّل اور شمشاد خاں تھے۔ کمرے میں ہمارے داخلے پر چوہان کی بھویں کھنچ گئیں۔

"یہی ہے وہ جس کا آپ نام لیتے ہیں۔" شمشاد خاں نے میری جانب انگلی اٹھا کے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "یہی ہے اپنا بابر۔" بمّل بھائی سمیت یہ تینوں ہمارے مہمان ہیں چوہان جی!"

چوہان گہری نظروں سے ہمیں دیکھتا اور سر ہلاتا رہا۔ "تم کہتے ہو' رات کو یہ تینوں الگ جاروں میں تھے۔" وہ مشکوک آواز میں بولا۔

"جی' جی ہاں جناب ایسی کہا ہے" شمشاد خاں نے الگ سے کہا۔ "ادھر سارے لوگ جانتے ہیں۔ جی' جی۔"

"اور بنّے' بنّے خاں بہادر کہاں ہے؟"

شمشاد خاں نے ایک لمبی سانس کھینچ کے مختصراً اسے کل کے حادثے کے بارے میں بتایا اور کہا کہ کل صبح سے بنّے خاں کا کوئی علم نہیں۔

تھانے دار' ایک نظر اپنے ماتحت افسر کو دیکھ کے چپ ہو گیا اور کچھ دیر کے مراقبے کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔ "تو تمہارا ہی نام بابر ہے؟"

میں نے سر جھکا کے تائید کی۔

"تم ہی نے پرسوں رات تارا بیگم کے بالا خانے پر چاندنی بانو کے سودے کی بات کی تھی؟"

"جی ہاں۔" میں نے اُلجھی ہوئی آواز سے کہا۔

"اچھا۔" چوہان کے لہجے میں طنز نمایاں تھا۔

"خوب! کتنے میں سودے کی بات کی تھی؟"

"آپ کو نہیں معلوم؟"

"ہم تم سے پوچھتے ہیں۔" وہ نخوت سے بولا

"جو آپ کو معلوم ہوا ہے' وہی ٹھیک ہے۔"

اس کے چہرے پر ایک رنگ آیا تھا لیکن وہ سنبھل گیا اور کٹیلے لہجے میں بولا۔ "تارا بیگم نے بتایا' تم نے دو لاکھ روپے کی بولی لگائی تھی۔"

"آپ نے ٹھیک سنا۔"

"دو لاکھ!" اس نے معنی خیز انداز میں دہرایا۔ "خاصی بڑی رقم ہوتی ہے۔" میں نے کچھ نہیں کہا تو وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "نشہ کر کے تو بالا خانے پر نہیں گئے تھے؟"

"یہ تو تارا بیگم ہی صحیح بتا سکتی ہے۔"

میرے جواب سے وہ جز بز ہوا' اس کی آواز میں تیزی آگئی۔ "دو لاکھ! ایک ساتھ اتنی بڑی رقم بھی دیکھی ہے تم نے؟"

میرا دماغ گھوم گیا تھا لیکن میں نے خاموشی مناسب سمجھی۔

"کیا پوچھتے ہیں ہم؟" وہ درشتی سے بولا۔ "اونچا سنتے ہو کیا؟"

"بہتر ہے' آپ کام کی بات کیجیے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میری زبان سے نکل گیا۔

اس نے کرسی پر کئی پہلو بدلے اور جھڑکتی آواز میں بولا۔ "کام ہی کی غرض سے یہاں آئے ہیں صاحب زادے! جو کچھ ہم پوچھتے ہیں' تمھارے لیے اچھا ہو گا کہ ٹھیک ٹھیک جواب دو۔"

"بشرطیکہ آپ ٹھیک ٹھیک سوال بھی کریں۔"

اُس نے پلکیں جھپکائیں' اس کے ہونٹ بھی سکڑ گئے۔ "کب سے تارا بیگم کو جانتے ہو؟"

"پرسوں رات سے۔"

"گویا پرسوں پہلی بار چاندنی بانو کو دیکھا تھا؟"

"یہی نتیجہ نکلتا ہے۔"

"اور' اور پہلی ملاقات میں بولی لگا دی؟"

آپ کو کوئی اعتراض ہے!"

"نہیں نہیں۔" وہ کسمسا کے بولا۔ "ہم
ہے۔ لکھ لناؤ۔"

"تارا بیگم کا بالا خانہ ایک دکان ہے۔
سکتا ہے۔" میں نے ترشی سے کہا۔ "دو لاکھ
دگنی چوگنی رقم بھی لگائی جا سکتی تھی۔"

"جی ہاں' جی ہاں۔" چوہان نے تمسخرانہ
اور مچل کے بولا۔ "یہ رقم تمھارے پاس
"بہتر ہے' آپ اس سوال پر نظر ثانی
نامناسب جواب کا الزام عائد مت کیجیے گا۔"

"کچھ پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔"

شمشاد خاں مداخلت کرنا چاہتا تھا' چوہان
کے اسے روک دیا۔

"معلوم ہوتا ہے' اڈے والوں نے اب
بھی شروع کر دیے ہیں۔ زمانہ ہی بدل گیا ہے
زہریلے لہجے میں بڑبڑاتے ہوئے بولا اور شمشاد
پوچھنے لگا۔ "سنا ہے' آج سے کئی نواب زادے
استاد ہیں۔"

"جی ہاں چوہان جی!" شمشاد خاں نے تیزی

"اور ایسے نہیں' رتن حرام کے بچنے کو ناکوں چنے
پوری طرح اُلٹا کے۔"

"سنا ہے ہم نے بھی۔ باہر لوگوں میں اِنھی
کہتے تھے' چاقو اشاروں پر چلتا ہے۔"

"خدا کی قسم چوہان جی! آپ دیکھتے تو کہتے
خاں تڑپ کے بولا۔ "چاقو اٹھا کے کہتے ہیں اِس
ہے۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں' کیوں نہیں۔" چوہان
طور پر آنکھیں پھاڑ کے کہا۔ "تیور بتا رہے ہیں' ان
متوالے لگتے ہیں۔"

سارا معاملہ ہی الٹا ہو گیا' بگڑ گیا تھا' رنجن تھے کی
میں آ گیا۔ میں نے تو چوکی چھوڑ دی تھی۔
آئے کا کیا حشر ہوتا۔ اپنے یار میاں نے لاج
شمشاد خاں نے مفاہمت کی کوشش کی۔
دار چوہان نے شمشاد خاں کی باتوں پر توجہ نہیں
کی نظریں مجھ پر مرکوز تھیں' کہنے لگا۔ "تم کہاں کے
ہو؟"

بستی میں رہتے ہیں۔"
بھی اڈا گیری کرتے ہو؟"
کوئی بھی نہیں ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں

چھن گیا؟"
دیا۔"
؟"
نہیں لگتا تھا۔"
آج کل کیا کرتے ہو؟"
ہی۔" میں نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ "بس
تے رہتے ہیں۔"
جاگیر وغیرہ بنالی ہے کیا؟"
بنا لیے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔
اسی طرح حسیناؤں کی بولیاں لگاتے پھرتے ہو؟"
نے کوئی جواب نہیں دیا۔
بار جیل گئے ہو؟"
ے کے آدمی شمار نہیں کرتے۔"
آدمی وادمی بھی مارا؟"
کب سے پولیس میں ہیں؟"
کیوں؟" وہ برہمی سے بولا اور شانے پھیلا کے کہنے
شمشاد خاں سے پوچھو۔"
جی' جدی پولیس والے ہیں چوہان جی۔" شمشاد
انداز میں بولا۔ "بڑا نام ہے ان کا۔"
ایسا سوال یہ کیوں کر رہے ہیں؟" میں نے تیکھے
کہا۔ "شاید پہلی بار کوئی کیس ہاتھ لگا ہے۔"
چوہان کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں' آواز اکڑ گئی۔



"لگتا ہے' شمشاد خاں۔ تم نے ہمارا پورا تعارف نہیں کرایا۔"

شمشاد خاں مجھے سمجھانا چاہتا تھا کہ میں نے اُس کی بات قطع کر کے کہا۔ "اس کی ضرورت نہیں' نظر آ رہا ہے۔"

"کیا کیا نظر آ رہا ہے؟" چوہان پیچ و تاب کھا کے بولا "زبان کو لگام دے کے رکھو استاد! ایک لڑکی اغوا ہو گئی ہے۔ یہ نہایت سنگین واقعہ ہے۔ خبر ہے' تارا بیگم نے اپنے بیان میں کیا لکھوایا ہے۔ اُس نے لکھوایا ہے کہ چاندنی بانو کے اغوا میں تمہارا ہاتھ ہو سکتا ہے۔"

"ساتھ میں یہ بھی تو بتایا ہے کہ ہم نے چاندنی بانو کی بولی لگائی تھی۔"

"ہاں بتایا ہے۔" چوہان چنگھاڑتی آواز میں بولا۔ "اور یہ بھی کہ اس نے انکار کر دیا تھا۔"

"لیکن شاید وہ یہ بتانا بھول گئی ہو کہ کل اُس نے ایک قاصد بھی ہمارے پاس بھیجا تھا' کہ بات کرنے کے لیے' کس سلسلے میں؟ آپ اندازہ لگانا چاہیں تو لگا سکتے ہیں۔"

"مگر تم وہاں نہیں گئے؟"

"قاصد کل رات ہی یہاں آیا تھا۔"

"اور صبح لڑکی اغوا ہو گئی' واہ! کیا دل چسپ اور عجیب اتفاق ہے۔ ایک رات تم بالا خانے جاتے ہو' سودے کی بات کرتے ہو' دوسری رات لڑکی اغوا ہو جاتی ہے۔ تارا بیگم کی پوری زندگی کوٹھے پر گزری ہے۔ سارا بازار زمانے سے قائم ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا۔" چوہان میں ہاتھ نچاتے ہوئے بولا۔ "بولی تو جرم اٹھانے کے لیے

بھی لگائی جا سکتی ہے۔"

"جو آپ کہنا چاہتے ہیں، کھل کر کہیے۔"

"ہم تمھیں چاندنی بانو کے اغوا کے شبے میں گرفتار کر سکتے ہیں۔"

"اور آپ کر بھی کیا سکتے ہیں۔ پھر دیر کاہے کی ہے۔ اتنی حجت کی کیا ضرورت تھی۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "لیکن ایک بات سمجھ لیجیے تھانے دار صاحب! فرض کیجیے، جن لوگوں کی آپ کو تلاش ہے، اگر وہ ہم نہ نکلے تو آپ کو بہت شرمندگی ہوگی۔ بعد میں کچھ مت کہیے گا۔ ہمیں صرف اڈّے کا آدمی مت سمجھو۔ تھوڑی بہت الف بے تے ہم کو بھی آتی ہے۔ جو دو لاکھ کی بولی لگا سکتے ہیں، وہ اور بھی جگہوں پر اپنا داغ مٹانے کے لیے ڈھیریاں لٹا سکتے ہیں۔"

"تم، تم ہم سے یہ کس طرح کی زبان میں بات کر رہے ہو؟" طیش میں چوہان کی آواز بگڑ گئی۔ "یہ تو سراسر دھمکیاں ہیں"

"آپ کو سیدھی زبان نہیں آتی، ہم کوئی آپ کے زر خرید نمک خوار نہیں ہیں۔ جرم بھی ثابت نہیں ہوا، نہ آپ ثابت کر سکیں گے۔ پولیس افسر آپ ہوں گے تو مجرموں کے لیے۔"

"شمشاد خاں، شمشاد خاں!" چوہان مشتعل ہو کے بولا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے، تمھارے سامنے ہم سے بدکلامی؟ اس نادان کو بتاؤ کہ ہم اس طرزِ گفتگو کے عادی نہیں۔ اونچی آواز ہمیں پسند نہیں، ہم زبان کتر لیتے ہیں۔ اس سے کہو کہ سرکاری افسروں سے بات کرنے کی تمیز سیکھے۔"

چوہان کے چہرے پر آگ دہکنے لگی تھی۔ ہاتھ پیروں میں تشنج کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا ماتحت افسر اور دونوں سپاہی جیسے اشارے کے منتظر تھے کہ مجھ پر ٹوٹ پڑیں، وہ بار بار چوہان کی طرف دیکھتے، اس کے سامنے لب کشائی کی ہمت نہیں ہوگی ورنہ اب تک خاموش نہ رہتے۔ بہ ہر حال شمشاد خاں کی سمجھ میں کچھ آ گیا تھا کہ میری زبان درازی کا سبب کیا ہے۔ صاف لگ رہا تھا کہ چوہان کوئی ارادہ ہی کر کے یہاں آیا ہے، اڈّے پر نشان لگا کے اُس

نے کسی اور طرف سوچنے کی ضرورت ہی نہیں ... خود اپنا یہ لہجہ، یہ حیل و حجت زہر لگ رہی تھی لیکن ... ہوا چارہ بھی کیا تھا۔ میں نے بالا خانے پر چاندنی ... قیمت لگائی تھی اور مجھی کو وضاحت کرنی چاہیے ... دوسروں کی دخل اندازی سے چوہان کا اطمینان نہ ہو ...

"سرکار! ایک بات کہوں، گستاخی معاف۔" ... خاں نے کرسی سے اُٹھ کے لجاجت آمیز جرأت ...

"ہمیں لکھنؤ کے لوگوں کی طرح مت دیکھیے۔ ... ہی کی آئیں ہوں گی۔ رات بھر یہ چاروں مہمان ... لوگوں کے سامنے رہے ہیں۔ ایک دو نہیں، بہت ... ہیں۔ صبح نو بجے تو مرزا ولی بڑ نے انھیں جگایا ... بات مان لو صاحب! آپ غلط جگہ آ گئے ہیں، ان کی ... بات بری لگی ہو، کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو میں۔۔۔"

"کوئی گستاخی نہیں کی ہم نے۔" میں نے شمشاد ... بات پوری نہیں کرنے دی اور زور دے کے کہا ... چوہان جی مسلسل ہماری توہین کر رہے ہیں۔ کیا ... انھوں نے ہمیں۔"

"اس کا دماغ خراب معلوم ہوتا ہے۔" چوہان ... کے بولا۔

"دماغ آپ کا ٹھکانے پر نہیں ہے صاحب! آپ ... تفتیش کرنے آئے ہیں یا فیصلہ سنانے۔ جائیے، کسی ... جائیے۔ اس طرح آپ اپنا وقت بھی خراب کر رہے ... ہمارا بھی۔"

اُس نے پہلی بار متوحش انداز میں اپنے ماتحت ... طرف دیکھا۔ ماتحت افسر نے دبے لہجے میں اسے ... کہ ہم سے یہاں کوئی بات کرنا فضول ہے۔ اب ... معقول صورت ہے کہ ہمیں تھانے لے جایا جائے ... خود ہوش ٹھکانے آ جائے گا۔ چوہان نے اس کی ... میں سر ہلایا اور کہنے لگا۔ "تم سے اب تھانے چل ... گی۔"

"وہاں پھانسی پر لٹکائیں گے کیا! تھانے کے ... ایک جگہ ہوتی ہے، اور ہر جگہ آپ کی عمل داری ... ہے۔"

تحمل کی خاموشی میرے لیے تائید کے مانند تھی۔ اس کے اشارے پر میں نے اپنے لہجے میں کسی قدر ترمیم کی۔ اتنا ہی بہت تھا۔ سو میں نے تحمل سے کہا۔ "چوہان جی! آپ سنجیدہ معلوم نہیں ہوتے۔ اگر آپ کو واقعی چاندنی بانو کی بازیابی کے لیے ایسی بے کلی ہے تو مناسب ہوگا' کسی اور طرف بھی نظر کریں۔ شاید آپ کو سراغ مل جائے۔"

"ہم کو گائیڈ کرتے ہو۔" وہ جلی ہوئی آواز میں بولا۔ "ہمیں اپنا کام اچھی طرح معلوم ہے۔"

"لیکن راستے نہیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"تو تم' تم بتاؤ گے راستے؟"

"جستجو شرط ہے۔"

"کون' کون سا راستہ؟" وہ بہ ظاہر بے دلی بلکہ حقارت سے بولا۔

"تارا بیگم کے بالا خانے کا۔"

"کیا!" اس کا منہ بن گیا' پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں تاہم اس کے تیور میں مدافعت آگئی تھی۔ "پولیس سب سے پہلے وہیں گئی تھی۔" اس نے بے اعتنائی سے کہا۔

"وہیں سے آپ کو سراغ مل سکتا ہے۔"

"وہاں سے۔" وہ سر جھٹک کے بولا۔ "مجرم اپنی نشانی چھوڑ جائیں گے؟"

"سب سے بڑی نشانی تو خود تارا بیگم ہے۔"

"تارا بیگم! کیا بکتے ہو؟"

"دیکھیے' اس طرح کے لہجے میں آپ ہم سے مجرم ثابت ہونے کے بعد بات کیجیے گا۔"

"کیا!" وہ جھنجلا گیا۔ "کیا اب تم ہمیں بات کرنے کا سلیقہ بھی سکھاؤ گے؟"

"ہم اپنی زبان میں بات کریں تو پھر آپ کو بھی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔"

"تم ہو کون؟ سمجھتے کیا ہو؟"

میرے جی میں تو کچھ اور آیا تھا لیکن میں نے خود پر جبر کیا۔ "ہم کوئی بھی ہوں لیکن وہ نہیں ہیں جن کے لیے آپ بے قرار ہو رہے ہیں۔"

بدزبان کے ماتحت کا پارا چڑھ گیا۔ اس سے برداشت نہیں ہوا' اس نے چوہان سے اجازت لیے بغیر لہجے میں مجھے تنبیہہ کی کہ میں اپنی کھال میں ر اوقات سے بڑھ کے بات نہ کروں۔

"آپ بھی ذرا زمین دیکھ کے بات کیجیے جناب ا کچھ کہنے سے پہلے کان کھول کر سن لیجیے' اور اس کے بعد جو مرضی ہو' کیجیے گا۔ استاد شمشاد خاں پر آپ نے غور نہیں کیا یا یقین نہیں کیا لیکن آپ ذرائع کی کمی نہیں۔ اپنے طور پر' آپ یہاں آ لوگوں سے تو لے سکتے ہیں کہ پچھلی رات ہم گزاری ہے۔ اب آپ پوچھیں گے کہ چاندنی با لے گیا' اس کا ایک جواب یہ ہے کہ ہم کوئی ہیں۔ ایک دوسرا جواب بھی ہے۔ پہلے یہ شبہ لیے سہی' ذہن سے نکال دیجیے کہ وہ ہی ہو سکتے میں کہتا ہوں' اچھا ہوگا' اسے توجہ سے سنیے اور درمیان میں دخل مت دیجیے۔ ایک ہی بات میں آتی ہے۔ تارا بیگم نے چاندنی بانو کے لیے قیمت سن کے بے شک انکار کر دیا تھا لیکن اس میں زور نہیں تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اسے موقع دیا جائے۔ اسے چاندنی بانو کا عندیہ بھی لینا بڑی بولی سن کے اس کا پریشان ہو جانا لازم تھا۔ ہم بھی اسے سوچنے کی مہلت دی تھی اور باور کرایا آمادگی کی صورت میں وہ ہمیں جلد سے جلد مطلع ہو سکتا ہے' اس نے کل سارے دن بالا خانے والے چاندنی بانو کے طلب گار رہا ہوں' توا کیا ہو۔ ہم جیسا گاہک نکل جانے کے اندیشے میں انھیں بہت کم وقت دیا ہوگا۔ ان لوگوں کی طرف کوئی امید افزا یا دوسرے لفظوں میں مثبت جواب اس نے فی الفور ہمارے پاس قاصد روانہ کیا۔ ہم ہی' اسی قاصد کے ہم راہ چاندنی بانو کو لانے کے خانے جا سکتے تھے لیکن جس شخص کے لیے ہم بانو کی بات کی تھی' وہی کہیں گم ہو گیا تھا۔ اب وہاں جانے سے کیا حاصل۔ بہتر ہے' پہلے ان لوگوں کے متولے جن سے کل تارا بیگم نے چاندنی با

تھی۔ ہمیں معلوم ہے' وہاں آپ کی رسائی اتنی آسانی سے نہیں ہو گی' اجازت لینی پڑے گی' سات سلام کرنے پڑیں گے۔ اس طرح آپ منہ اٹھا کے وہاں نہیں جا سکیں جس طرح یہاں ہم چور اچکوں' اٹھائی گیروں کے پاس آ جاتے ہیں۔"

حسبِ توقع کے مطابق اس مرتبہ چوہان ایسا برگشتہ نہیں ہوا۔ وہ منہ پھلائے' منہ سجائے کچھ سوچتا اور مسلسل غور کرتا رہا' پھر چونک کے آمرانہ لہجے میں بولا۔ "ہم بھی جا سکتے ہیں۔ ہمارے راستے میں کوئی بھی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ سب ہمیں جانتے ہیں کہ ہم کسی لاٹ صاحب کی پروا نہیں کرتے۔"

اتنی دیر میں آغا پیا بھل کے لیے پیچوان لے آیا۔ اس کے برابر اڈے کے دوسرے آدمی مٹھائی کے طشت' وغیرہ لے آئے۔ تھوڑی دیر کے لیے خاموشی ہو گئی۔ اڈے کے آدمیوں کے واپس جاتے ہی چوہان اکھڑی آواز میں بولا۔ "ٹھیک ہے' دوسری طرف بھی ہم جائیں گے لیکن خیال رہے استاد! ہم کسی وقت بھی واپس آ سکتے ہیں۔"

میں نے سکون کی سانس لی اور کہا۔ "آپ کو زحمت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کسی کو بھیج دیجیے گا' ہم خود آ جائیں گے لیکن ایک درخواست ہے جناب! زیادہ وقت نہ لگے تو مہربانی ہو گی۔ ہمیں یہاں سے جلد از جلد روانہ ہونا ہے۔ آپ نہ آتے تو ہم آج شام یا کل صبح کسی وقت چلے جاتے۔"

"تم لوگ ابھی کہیں نہیں جاؤ گے۔"

"ہم ولایت نہیں جائیں گے جناب! ہمیں ہندوستان میں رہنا ہے اور اپنے اتے پتے سارے دیتے جائیں گے۔ یہاں استاد شمشاد خاں بھی ہماری ضمانت کے لیے موجود ہیں۔"

"بالکل' بالکل۔" شمشاد خاں نے سینے پر ہاتھ مار کے کہا۔ "ایک میں ہی نہیں' سارا اڈا' اڈے کا ایک ایک آدمی۔"

"ہمیں صرف تمہارے مہمانوں سے واسطہ ہے۔"

جہاں پناہ

قدیم ایران کے ایک فرماں روا کمبوجیہ نے ایک روز اپنے درباری پراکساپس سے سوال کیا۔ "پراکساپس! ایرانی رعایا کا ہمارے بارے میں کیا خیال ہے؟" درباری نے جواب دیا۔ "سب لوگ جہاں پناہ کی تعریف میں ہمہ وقت رطب اللسان رہتے ہیں البتہ یہ کہا جاتا ہے کہ جہاں پناہ شراب بہت پیتے ہیں۔" یہ جواب سنتے ہی بادشاہ سلامت کے تیور بدل گئے۔ اُس نے درباری سے کہا۔ "پراکساپس! دیکھو تمہارا جوان بیٹا سامنے کھڑا ہے۔ اگر میں ایسا تیر چلاؤں جو سیدھا اُس کے دل میں ترازو ہو جائے تو ایرانیوں کا یہ خیال غلط ثابت ہو جائے گا' اور اگر میرا نشانہ چوک گیا تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ رعایا ٹھیک کہتی ہے اور شراب نے میرے حواس واقعی مختل کر دیے ہیں۔" اُس نے ایک تیر چلے میں رکھ کر نشانے پر پھینکا۔ پراکساپس کا جوان بیٹا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ کمبوجیہ نے حکم دیا کہ اس کا سینہ چاک کیا جائے۔ حکم کی فی الفور تعمیل ہوئی۔ زخم جانچا گیا تو معلوم ہوا کہ تیر مقتول کے عین دل میں پیوست ہوا تھا۔ بادشاہ باغ باغ ہو گیا اور بولا۔ "دیکھا' یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ایرانیوں کے اپنے حواس بجا نہیں ہیں۔" پراکساپس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ "ایسا بے خطا نشانہ صرف جہاں پناہ کا ہو سکتا ہے۔"

علی عباس جلال پوری کی کتاب "روایاتِ تمدنِ قدیم" سے

چوہان حتمی لہجے میں بولا۔ "یہ کہیں نہیں جائیں گے۔"

"میں آپ سے متفق کرتا ہوں چوہان جی! ان کے رکنے نہ رکنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" شمشاد خاں عاجزی سے بولا۔ "ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ایک تو میں ہی ان کے راستے کا پتھر بن گیا۔ یہ بے چارے تو آگے جا رہے تھے۔ مجھے معلوم ہوا تو میں خود کر کے اسٹیشن سے یہاں لے آیا۔ اس وقت میں اتو کا پٹھا بھل جلال کی بات مان لیتا تو یہ سارا کھٹ راگ کاہے کو ہوتا۔ لیکن ہونی کو کون بولتے ہیں' کون ٹال سکتا ہے۔ آپ کو خود اندازہ کرنا چاہیے کہ یہ گڑبڑ بھی کسی کی وجہ سے ہے۔ میں آپ کو اصل بات بتاتا ہوں۔ شہزادے بابر میاں نے اپنے لیے نہیں' بتے خاں' فراری کے لیے چاندنی بانو کی بات کی تھی۔ بتے خاں اس پر مرمٹا تھا لیکن وہ سور کا بچہ ایسا غائب ہوا کہ پھر

دکھائی ہی نہیں دیا' سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ پر ہوا یہی ہے بنّے خاں میں بھی کوئی لڑکی اٹھا کے لے جانے کا دم نہیں ہے مگر کیا پتہ' غیرت مند کی اولاد تھا' پاگل ہی نہ ہو گیا ہو۔ وہ خریدی ہوئی چاندنی کے لیے تیار نہیں تھا۔ بنّے خاں کو بھی ڈھونڈیے۔ یہ لوگ میرے مہمان ہیں اور مجھ کو جی جان سے پیارے ہیں۔ میرے منہ میں خاک' ان پر جرم ثابت ہو جائے اور یہ آپ کو اِدھر دکھائی نہ دیں تو آپ مجھ کو لے چلیے گا۔ میں جرم قبول کر لوں گا۔ یہ واپس جا کے کیا کہیں گے۔ لکھنؤ میں ان سے ایسا برتاؤ ہوا۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے مگر جب تک ہماری اجازت نہ ہو۔" چوہان تحکمیہ لہجے میں بولا۔ "انھیں یہاں ٹھہرے رہنا ہے۔"

"اس سے بہتر ہے کہ آپ فوراً ہمیں عدالت میں پیش کر دیں۔" میں نے اچٹتی آواز میں کہا۔

"وقت آنے پر تمھاری یہ خواہش بھی پوری کر دی جائے گی۔"

"مگر ہم بہت دیر تک یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔"

"کیوں؟ تم کو تو یہاں کا اڈا سنبھالنا ہے۔"

"اڈے پر اب استاد شمشاد خاں ہی بیٹھیں گے۔"

"پھر رحمٰن استاد سے چھینا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"رحمٰن نے حرامی پن کیا تھا۔" شمشاد خاں نے غصے اور نفرت سے لبریز آواز میں کہا۔ "رحمٰن اِدھر چوکی پر بیٹھ جاتا تو اڈا برباد ہو جاتا۔" شمشاد خاں نے از سرِ نو وہ حالات بیان کیے جن کے سبب مجھے رحمٰن کے خلاف چاقو اٹھانا پڑا تھا۔

چوہان نتھنے پھلائے' ہونٹ بھینچے گُپ چُپ بیٹھا رہا' پھر اس نے اپنے ماتحت افسر سے انگریزی میں پوچھا کہ ہم لوگ ٹھیک سر مختلف کہانی سنا رہے ہیں' وہ کیا سمجھتا ہے۔

"جناب! میری رائے میں تو حفظِ ماتقدّم کے طور پر انھیں تھانے لے چلنا چاہیے۔" ماتحت افسر نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ کہانی سوچی سمجھی ہوئی بھی ہو سکتی ہے۔"

چوہان کا منہ جیسے کڑوا ہو گیا۔ "میں ایسا نہیں سمجھتا۔"

"تو پھر یہاں ان کے ٹھہرے رہنے کی ...

یہ بھاگ بھی سکتے ہیں۔"

چوہان نے کچھ تامّل کے بعد ...

"بھاگ کر کہاں جائیں گے' شمشاد خاں تو ... اسے کھینچ دیں گے۔"

"شمشاد خاں لڑکی کو بازیاب کرانے میں ... ہماری مدد کر سکتا ہے۔" ماتحت افسر ...

"ابھی تو بات اپنی حد تک ہے لیکن لڑکی جلد ... ہوئی تو معاملہ اوپر بھی پہنچ سکتا ہے اور سنگین ... کر سکتا ہے۔ اہم بات لڑکی کا سراغ ملنا ہے۔"

"لیکن شاید ہمیں یہاں سے کچھ نہیں مل ... نوجوان استاد کی گفتگو پر غور نہیں کیا۔ یہ ... معلوم نہیں ہوتا۔ لکھنؤ کے اڈے سے اسے ... تو یہ خود یہاں ٹھہرنے پر اصرار کرتا۔"

"ٹھیک ہے جناب لیکن بیچ میں لڑکی بھی ... ایسے حالات میں ان کا شہر میں قیام کرنا کیوں ... سکتا ہے۔" ماتحت افسر نے زیرِ لبی سے کہا۔ "یہ ... ہو سکتی ہے۔"

چوہان کچھ منتشر سا نظر آنے لگا' پھر بولا۔ "لیکن ... حیرت ناک واقعہ ہے کہ ایک نوواقف کی خوشنودی ... کوئی اتنی بڑی رقم داؤ پر لگا دے۔"

"یہ کہانی کا سقم بھی تو ہے جناب!"

"مگر بولی لگائی گئی تھی۔ تارا بیگم کا بیان ہے۔"

"بولی لگانا اور بولی ادا کرنا دو مختلف باتیں ہیں۔ ... ادائی کا مرحلہ کب آیا تھا اور آنا بھی کب تھا جناب! ... بڑی رقم یہ ساتھ لیے پھرتے ہیں؟"

میرے جی میں آئی' اسے بتاؤں کہ رقم موجود ہو ... کا بندوبست ثانوی چیز ہے لیکن میں خاموش ہی رہا۔

چوہان نے گویا میری طرف سے جواب دیا۔ "بات ... ہونے پر رقم کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ جب تک لڑکی ... بیگم کی تحویل میں رہتی۔"

"لیکن جناب! جیسا کہ آپ نے خود کہا ہے' بولی ...

...والے جرم کی اعانت کے طور پر بھی لگائی

...بولی لگائی ہی نہیں چاہیے تھی۔ بولی لگانے
...اعانت سے ان تک پہنچ گئے۔ لڑکی انھیں
...انھوں نے اتنی عجلت کیوں کی۔ کچھ روز کا
...سے کچھ دن باہر رہ کے یہ چپ چپاتے
قدم اٹھا لیتے۔"
...ہے، ہمیں ٹٹولنا چاہیے کہ ان کے پاس
صلاحیت بھی ہے یا نہیں۔ اس نکتے سے
...ہی ہے۔"
...لگتا نہیں۔" چوہان نے رکھائی سے کہا۔
...انتظام کرسکتے ہیں۔"
...رقم ہے جناب!"
...رہنا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ مُغل نے
...انھیں بیچ کے مجھے کوئی اشارہ کیا، میں کچھ اخذ
...یہ اُن کی گفتگو میں مداخلت سے باز رہنے کی
...مداخلت کرنے کی۔ میری دانست میں ابھی مجھے
...چاہیے تھا۔ میں بہرا بنا بیٹھا رہا۔
...کشمکش سے دوچار دیکھ کے ماتحت افسر نے
...تو یہ لوگ بہت پُراسرار لگتے ہیں۔ اگر واقعی یہ
...انھوں نے چاندنی بانو کے لیے اس رقم کی پیش
...بھی تو آگے کا تخمینہ بھی لگایا جا سکتا ہے، اور آپ
...قول ایک نوواقف کے لیے یہ اس خطیر رقم کی
...کرسکتے ہیں تو یہی کچھ ہمیں تک تو ان کے پاس نہیں
...تو ایک معمّا ہے جناب! مجھے تو یہ سب کچھ مبالغہ
...ہوتا ہے۔ اصل بات کچھ اور ہے۔"
"ہو سکتا ہے، ہو سکتا ہے۔" چوہان متردد لہجے میں
...بہرحال آگے دیکھتے ہیں۔"
"فرض کرو، چاندنی بانو بازیاب ہو جاتی ہے اور بنّے
...بھی مل جاتا ہے۔" چوہان نے مجھے مخاطب کر کے
...کہا۔ "تو تمھاری بولی قائم رہے گی؟"
"یہ بنّے خاں پر منحصر ہے، اگر بنّے خاں چاندنی بانو کے
...ہونے کے بعد بھی اس کا طلب گار ہے تو ہم اپنی زبان

پر قائم ہیں۔"
"دیکھا آپ نے!" ماتحت نے بہ عجلت انگریزی میں کہا۔ "اب پیش کش مشروط ہو گئی ہے۔ شاید اس لیے کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔"
میں نے چاہا کہ کہوں، ظاہر ہے، اب صورتِ حال بدل گئی ہے لیکن میں نے کچھ نہیں کہا۔
"چوہان نے غالباً" اپنے ماتحت کی دل جوئی کے لیے اسی کا سوال دہرا دیا۔ "رقم کا انتظام کتنی دیر میں ہو جائے گا؟ تم اتنی بڑی رقم ساتھ لیے تو نہیں پھرتے ہو گے؟"
"میں نے سوچا، کہوں، اس کا جواب وہی ہے جو ابھی خود اُس نے اپنے ماتحت کو دیا تھا لیکن اپنی انگریزی دانی کا اظہار سردست مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا۔ "ہمیں کے ایک بینک میں رقم محفوظ ہے۔ وہاں سے منتقل ہونے میں چند روز لگ جائیں گے۔"
"پیشگی کے پیچھے، پچیس تیس ہزار روپے تو آگے ڈالے جا سکتے ہیں۔" مُغل نے پہلی بار زبان کھولی۔
"اوہ!" چوہان دیدے پھاڑ کے رہ گیا۔
میرا خیال تھا کہ چوہان پولیس کا آدمی ہے، شک اس کا وتیرہ اور خاصّہ ہے۔ یہ کہہ سکتا ہے کہ رقم دکھائی جائے مگر اُس نے خواہش نہیں کی۔
"شمشاد خاں نے مغل اور [illegible] کی طرف چوہان کو توجہ دلائی لیکن اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کی۔ [illegible]
"یہ بہرحال ابھی تین چار روز [illegible] ہمیں [illegible] رہنا ہے۔"
"یہ حکم کس بنیاد پر ہے؟" میں نے الجھ کے کہا۔
"واقعے کی نوعیت کی بنیاد پر۔" وہ [illegible] بولا۔ "مشتبہ لوگوں کو پابند کرنے کا ہمیں اختیار ہے اور تمھارے لیے بھی یہی بہتر ہے۔"
"لیکن ہم بھی آپ سے کچھ کہہ رہے ہیں۔"
"صرف تمھارے کہہ دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔"
"ہمارا اعتبار کیجیے۔ کوئی کسر رہ گئی ہو تو میں پھر وضاحت کرتا ہوں۔" میں نے پژمردگی سے کہا۔ "یقین کیجیے، کوئی معمّا اور مبالغہ نہیں ہے۔ ایک سیدھا سادا معاملہ پیچیدہ

مت بتایے۔" بنّے خاں' ایک نوجوان جس کے سامنے زندگی پڑی تھی' اس لڑکی چاندنی بانو کے بغیر بہت ادھورا رہتا۔ کبھی کبھی ایک آدمی دوسرے آدمی کے بغیر بہت ویران ہو جاتا ہے صاحب! بنّے خاں کے بس میں نہیں تھا کہ وہ اس لڑکی کو حاصل کر سکے۔ یہ اتفاق تھا کہ چاندنی اس قسم کی لڑکیوں میں تھی جنھیں اس طرح کا کچھ بدل دے کے' کچھ نذر کر کے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ادھر میرے پاس اپنی ضرورت سے زائد روپے تھے۔ یہ رقم چلے جانے سے مجھے کوئی فرق نہ پڑتا مگر بنّے خاں کو چاندنی مل جاتی۔ کسی کو اس کا مطلوب مل جائے تو اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی ہے مگر آپ شاید نہیں سمجھیں گے' میں سمجھا نہیں پاؤں گا۔ بس اتنی سی بات ہے جناب! بنّے خاں' رنجن سے کبھی زیر نہ ہوتا۔ اُس کا دماغ ہی حاضر نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے' وہی چاندنی بانو کو لے گیا ہو لیکن اس واقعے سے ہم لوگوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"ہم سمجھ رہے ہیں لیکن گواہ و شہادت' دلیل و ثبوت قانونی واجبات ہیں۔" چوہان کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک پیدا ہوئی۔ پہلی بار مجھے اس کے لہجے سے جذب اور گداز کا احساس ہوا۔ کہنے لگا۔ "آگے بیانات کے لیے تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

"مگر کبھی' جب ہم کسی طور ملوث۔۔۔۔" میں نے بنّے کی طرف دیکھا اور پھر مجھ سے کچھ نہیں کہا گیا۔

چوہان بھی ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ شمشاد خاں نے بہت اصرار کیا لیکن چوہان نے مٹھائی کا ایک دانہ' شربت کا ایک جرعہ لینا گوارا نہیں کیا۔ سبھی اُس کے ساتھ اٹھ گئے اور پیچھے پیچھے گلی تک آئے۔

رسمی سلام و دعا کے بعد وہ رخصت ہو گیا۔ جمو اور زورا نے زور سے میرے بازو پکڑ لیے۔ چوہان کو مڑتے دیکھ کر وہ سیدھے ہو گئے۔ مجھے سمجھنے میں کچھ دیر لگی۔ چوہان نے میری ہی جانب انگلی اٹھائی تھی۔ کچھ توقف کے بعد اگلے قدموں سے میں اس کے پاس پہنچا۔ پہلے تو وہ میری صورت دیکھتا رہا' پھر یکایک میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اس نے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔ "کب جانا چاہتے ہو تم؟"

میں نے جلدی سے کہا۔ "آج شام یا کل وقت" مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ چوہان نے انگ سے پوچھا ہے۔ گو میں نے جواب اپنی زبان میں دیا اب کیا ہو سکتا تھا۔ آگے کوئی وضاحت کرنے زبان لڑکھڑا گئی۔

وہ مسکرانے لگا اور میرا شانہ تھپکتے ہوئے نگاہ نے دھوکا نہیں کھایا۔ سب انسپکٹر رضوی کے دوران' تمہارے چہرے کے رنگوں سے تھا' آخر تم ہی سے ایک غلطی ہو گئی۔ مباحثے بات تو میرے اور رضوی کے درمیان ہوئی تھی

ایک لمحے کے لیے مجھ پر سنّاٹا سا چھا گیا۔

"لیکن ایک حیرت ابھی باقی ہے۔ تم' تم ان لڑ درمیان کیوں ہو؟" وہ کترائی ہوئی آواز میں بولا۔ مراد ہے' اڈّے کے اس ماحول میں۔"

میں کسی مجرم کی طرح سر جھکائے سوچتا رہا کہ بتاؤں۔

"یہ جاننے کا اشتیاق رہے گا' خیر پھر کبھی سہی۔ تو جانے سے پہلے ایک بار مجھ سے ملنا۔ اگر اب ممکن جب بھی یہاں آؤ۔ یقیناً' تمہاری روداد میرے اضافے کا سبب ہو گی۔"

"جی' جی۔" میں نے سٹ پٹاتے ہوئے کہا۔

"اور اس بڈھے توتے شمشاد خاں سے کہنا' وہ تھا کہ تم یہاں نہ ہوئے تو وہ خود کو پیش کر دے گا اور جرم قبول کر لے گا۔ اس سے کہنا کہ وہ جرم تو ضرور قبول لے گا' لڑکی کو کہاں سے ہمارے حوالے کرے گا۔"

مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ میں نے بہ مشکل کہا۔ " نہایت مہربان پولیس افسر ہیں۔ مجھے معاف کر دیجیے دل میں آپ کے لیے بڑی بدگمانیاں۔۔۔"

"میری کمر پہ دھپ مار کے وہ مجھے گلے سے لگا لیتا لیکن شاید اُسے اپنے منصب کا خیال آ گیا۔ ادھر گلی میں سے لوگ ہماری جانب نگراں تھے۔ چوہان نے رسمی انداز میں مجھ سے ہاتھ ملایا اور چلتے چلتے ٹھہر گیا۔ شام کو سب

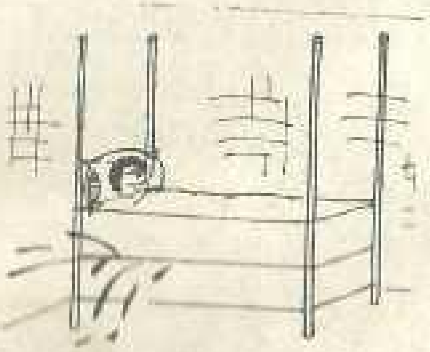
کے آنے پر اپنا بیان لکھوا دینا۔ اُس کے بعد
ہاں سے....."
ور بھی کہنا چاہتا تھا کہ پلٹ کے تیز قدموں سے

نہوں نے انتظار کیا کہ چوہان اور اُس کے
موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔ اُن کے
ی زورا' جھرو اور شمشاد خاں نے مجھے بُری طرح
اُن کی حیرت آمیز مسرّت نہایت فطری تھی۔ مجھے
میں آتا تھا کہ اس خوش وضعی سے یہ مرحلہ گزر
ایک دفعہ پولیس کے نرغے میں آجانے کے بعد
سان نہیں ہوتا۔ وہ ہمیں چند روز کیا' بہت دنوں
سکتے تھے۔ خانہ پُری کے لیے اُنھیں کچھ لوگوں کی
وتی ہے اور اڈّے کے آدمی پہلے زد پر آتے ہیں۔
سکتا تھا کہ اُلجھتے اُلجھتے بہت سی گرہیں پڑ جاتیں
نے کوئی معرکہ سر نہیں کیا تھا۔ میرے لیے تو یہ
وختہ تھا۔ بسمل کو کئی بار میں دیکھ چکا تھا۔ پیرو کے
ن' رات کو بمبئی پولیس سے اور تبت سے واپسی
پولیس سے اُس نے اسی طور نجات حاصل کی تھی'
ولی وجاہت سے۔ چند روز پہلے سکندر آباد اسٹیشن پر
ہوا تھا۔

پولیس کی آمد' عمارت میں موجود ہجوم کے لیے بے
کا باعث ہونی چاہیے تھی۔ لوگ وہم و قیاس کے
جا رہے ہوں گے۔ گلی میں اسی لیے بہت سے لوگ
ہو گئے تھے کہ پولیس کی واپسی کا منظر بہ چشمِ خود دیکھ
۔ وہ تو انسپکٹر چوہان نے خیال آرائیوں اور سخن
رائیوں کا باب ہی بند کر دیا۔ رخصت ہوتے وقت مجھ سے
ے سلوک کے بھی گواہ تھے۔ اب اُنھیں قرار آگیا
ہو گا۔

دیگیں پک چکی تھیں۔ کھانے کی خوشبو عمارت میں
ہوئی تھی۔ اتنی جلد اتنا بڑا انتظام بجائے خود ایک
نامہ تھا۔ جیسے ہی ہم چوکی پر آکے بیٹھے' دسترخوان بچھا
گئے۔ کچھ لوگوں کو جگہ نہ ملنے کی وجہ سے باہر جانا پڑا۔
شاد خاں نے اعلان کر دیا تھا کہ آج اڈّے پر آنے والے
ب تک





ہر شخص کو مہمان کے طور پر برتا جائے گا۔ کھانا' مٹھائی'
مشروبات' جس کی جو خواہش ہو' اُسے سیر کر دیا جائے۔ چار
بجے شام تک کھانے کا سلسلہ چلتا رہا۔ دسترخوان بار بار
اُٹھائے اور بچھائے جاتے رہے۔ لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔
عصر کے بعد شیرینی' شربت اور قہوے کا دور چلا۔ واللہ اعلم'
مگر آغا پا نے مجھے بتایا کہ رجّن بھی بتے خاں کی طرح
خاموشی سے چلا گیا۔ اس کے بعد وہ نظر نہیں آیا۔ واجد
لوگوں نے اس سے تاسّف کا اظہار کیا تو جواب میں اس
نے کسی تکدّر اور تندی کے اظہار کیا کہ اس نے کچھ کھویا نہیں'
پایا ہے۔ کسی ایسے ویسے سے نہیں' وہ تو استاد بسمل کے
شاگرد سے زیر ہوا ہے۔ اور اسے اطمینان ہو کہ بھلا
کے اڈّے پر پہلی مرتبہ کوئی استاد آیا ہے۔ اڈّے کی چوکی کی
یہ مضبوطی اس کی دخل اندازی کی وجہ سے بسمل وہاں ہو
اور اگر وہ چوکی پر نہیں ہے تو کیا ہوا' بتے خاں بھی تو نہیں
ہے۔ آغا پا کے مطابق رجّن کہتا تھا کہ اس کچھ وہ ہر گز
ماحول میں اسے استاد بسمل کے پاس جانے کی جرات نہیں
لیکن یہاں نہ سہی' اس کی خدمت میں سلام پیش کرنے اور
اُس کے یہاں پر سر رکھنے وہ کلکتے ضرور جائے گا۔ اسے تو
کسی ایسے ہی استاد کی تلاش تھی۔ یہ سن کے مجھے کچھ یہ
گمان ہوا کہ آغا پا بھی رجّن کے لیے نرمی کا ایک گوشہ

رکھتا ہے اور اُس کی عرضِ احوال میں ریحؔن کے لیے کوئی سفارش پنہاں ہے۔

چوکی سے اُٹھنا مشکل ہو گیا تھا' بہ طورِ خاص میرا۔ شام کے وقت تو قطار لگ گئی' ایک جاتا نہیں تھا کہ دوسرا آ جاتا تھا۔ سلام کرتا' کیلے کے پتّوں میں لپٹے ہوئے تازہ پھولوں کے ہار کھول کے بھؔل اور شمشاد خاں کے علاوہ میرے گلے میں ڈالتا' مٹھائی کا دونا آگے رکھتا اور لوٹ جاتا' کوئی سکّوں سے بھری ہوئی ریشمی کپڑے کی تھیلی میری طرف چپکے سے بڑھا دیتا' کوئی ہاتھ چُومنے لگتا۔ اڈّے کا ایک بزرگ آدمی سامنے آنے والے شخص کا سرسری طور پر تعارف کراتا۔ میرا اور بھؔل کا سر ہلانا' نذر گزار کی نذر قبول کرنے اور اُس کا نام ذہن نشین کر لینے سے عبارت تھا۔ مجھے تو اس فضول معمول سے گھبراہٹ ہونے لگی۔ زورا اور جمو بھی میری وجہ سے بندھے بیٹھے تھے۔ میں نے اشاروں میں جمو سے التجا کی کہ وہ کسی طرح مجھے ان رسموں سے چھٹکارا دلائے۔ اُسی نے میری مشکل حل کی اور شمشاد خاں کے کان میں کوئی عذر کر کے یکایک اُٹھ کھڑا ہوا' پھر میں نے بھی پلٹ کے شمشاد خاں اور بھؔل کی طرف نہیں دیکھا اور چوکی سے اتر آیا۔

عمارت کے اندرونی حصّے سے گزرتے ہوئے ہم بالائی منزل کے کمرے میں آ کے بستروں پر دراز ہو گئے۔ زورا اور جمو کو بے چینی ہونے لگی کہ کچھ دیر کے لیے کیوں نہ سلمٰی کو دیکھ آئیں' بعد میں وقت ملے نہ ملے۔ پورا ایک دن ہو گیا تھا لیکن بستر پہ آ کے کچھ اور کسل مندی ہو گئی۔ میں نے اُن سے کہا کہ وہی سلمٰی کے پاس چلے جائیں' میری طرف سے اُسے پوچھ لیں۔ دونوں چلے گئے۔ پیچھے جا کے اُنھوں نے میری دل بستگی کے لیے آقا پیا کو بھیج دیا۔

آقا پیا ایک خوش طبع شخص تھا اور ایران و توران کی باتیں کرتا تھا۔ جانے کہاں کہاں کے مزے دار قصّے کہانیاں اسے ازبر تھیں۔ میں نے اسے بھی واپس کر دیا۔ آدمی کا کبھی اپنے آپ سے باتیں کرنے کو بھی تو دل چاہتا ہے۔ نچلی منزل سے اٹھنے والے شور سے کمرہ بھی محفوظ نہیں تھا۔ طرح طرح کی آوازیں دور جا کے یک آواز ایک طرز ہو جاتی

ہیں اور اتنی گراں نہیں گزرتیں۔ نیند تو ...
لیکن بہت سکون محسوس ہوا۔ ہر بار ایک ...
سے رہائی کا ایک سکون۔ آدمی کو نوشتۂ ...
بار بار کی آزمائشوں کے باوجود ہر آزمائش ...
چند دن بھی یوں ہی گزرنے تھے' خواہ ...
وہی بات ٹھیک ہے کہ گوشہ گیری میں بڑی ...
کسی مناسب وقت کا انتظار تھا۔ میں نے ...
بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

میں نے طے کیا تھا کہ اس سے کہوں ...
آباد میں زریں کے پاس ٹھہر جائے یا بمبئی میں ...
ہاں چلا جائے۔ اب ہمیں کہیں اور نہیں جانا ...
نکلنا ہمیں راس نہیں۔ ہر جگہ ایک نئی ...
منتظر رہتی ہے' اور اب اتنے شہر اتنے گلی ...
ہیں کہ باقی سے کوئی امید نہیں۔ آگے جہاں ...
جگہوں پر ہم جائیں گے' کوئی ضمانت نہیں کہ ...
وہاں سے کسی اور طرف کا قصد نہ کر چکے ہوں۔ ...
کو قائل کرنے کے لیے نت نئے عذر تراشتا' ...
رہا مگر مجھے کوئی بھی نیا عذر' نئی دلیل سجھائی نہیں ...
سے تو پہلے ہی میں بہت کچھ کہہ چکا تھا' ناراضی اور ...
حد تک میں نے اصرار کیا تھا' ایک مرتبہ نہیں' ...
یہی ایک طریقہ تھا کہ فیض آباد اور بمبئی جانے کے ...
دل تن تنہا نکل کھڑا ہوں اور اپنا آزار خود جھگتوں' ...
واپس آ گیا تو ٹھیک' ورنہ لوگ صبر کر لیں گے۔ میر ...
ہو' آدمی عادی ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی میں کسی کے ...
زندہ ہوں۔ یا ایک دوسری صورت بھی تھی کہ اپنا ...
ترک کر کے ان کے حوالے کر دوں۔ اُن کا ارادہ ...
ہو۔ آدمی غلامی بھی تو کرتا ہے' معذور بھی تو ہو جاتا ...
مال و زر کی طرح اپنے طلب گاروں میں خود کو تقسیم ...
دیتا ہے۔ موت کے بعد ترکے کے سزاوار بھی تو ...
ہیں۔ کوئی ایک فیصلہ تو کبھی نہ کبھی مجھے کرنا ہی ...
شاید میرا ارادہ' میرا عزم میرے اختیار میں نہیں ...
جتنا میں کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتا' دھند اتنی ...
ہو جاتی۔ ظاہر ہے میں کہیں منہ چھپا لوں گا تو ...

ویران ہو جائیں گے۔ ایک کے بعد ایک چہرہ۔ کیسے کیسے میرے دل ساز و دل نواز ہیں۔ میں خود کو اُن کے سپرد کر دوں تو یہ سپردگی کتنی حقیقی اور گہری ہو گی۔ میں ان میں شامل ہو کے کس قدر شامل رہا ہوں۔ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ پہلے بھی میں نے بہت جتن کیے ہیں۔ کیا حاصل ہوا؟ میں اپنے عزم اور ارادے کی بات کرتا ہوں مگر یہ میرے اختیار میں ہے کہاں۔ کوئی اور فیصلہ کرنے کی سکت مجھ میں کتنی ہے۔ پھر شاید جو ہو رہا ہے' یہی مناسب ہے' آدمی توفیق و مقدور کے سوا کیا کر سکتا ہے۔

اندھیرا چھا گیا تھا۔ وقت کی کچھ خبر ہی نہیں ہوئی۔ بیداری کی غفلت نیند سے زیادہ نادم کرتی ہے۔ جمو اور زورا کے آ جانے پر میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ دوسروں کا اتنا خیال بھی خود کو ترک کر دینے کے مترادف ہے۔ یہ سب کچھ تو میں کرتا ہی رہا ہوں۔ اس مروت سے ان کی سیری ہو جاتی ہے تو بس یہی میرے امکان میں ہے۔

آغا پیا بالائی منزل پر میرے کمرے کے ارد گرد منڈلاتا رہا تھا' چوکی دار کی طرح۔ میرے آرام کی خاطر وہ کمرے میں داخل نہیں ہوا اور روشنی بھی نہیں کی۔ اسے کیا معلوم تھا ایک پل کے لیے بھی میری آنکھ نہیں لگی ہے۔ عمارت میں ہر سو چراغاں ہو رہا تھا۔ کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں چراغ نہ جل رہا ہو۔ اندر نچلی منزل پر تو جشن کا منظر تھا۔ باہر گلی میں نوبت بج رہی تھی۔ لنگر جاری تھا۔ آغا پیا نے بتایا کہ کھانے کے بعد' پہلے زنانے اٹھکیلیاں کریں گے' پھر مجرے کی محفل آراستہ کی جائے گی۔ عرصے بعد کہیں اڈے کی رونق بحال ہوئی ہے' بختن خاں کے رخصت ہونے کے بعد اڈا ہی اُجڑ گیا تھا۔ جمل اور شمشاد خاں گاؤ تکیے سے کمر لگائے چوکی پر بیٹھے تھے۔ ہم بھی وہیں چلے گئے۔ انھیں ہمارا ہی انتظار تھا۔ چوکی پر دستر خوان بچھا دیے گئے۔ بریانی' پتلے شوربے کا قورمہ' ماش کی پھریری دال' فیرنی' نان اور چپاتیوں کا اہتمام تھا۔ بھوک ایسی کھلی نہیں تھی لیکن کھانوں کی خوشبو بھی اشتہا مہمیز کرتی ہے۔ خوشبو بے جواز نہیں تھی۔ تمام چیزیں ذائقے دار تھیں۔ کھانے کے لیے بھی ایک ماحول چاہیے۔ لگتا تھا' عمارت میں موجود ہجوم

آنے والے کل سے بے نیاز ہے یا آنے والے ... معمول سے بہت بیزار' آج ہی سارا کچھ سمیٹ ... تھا۔

سب نے عجلت کی اور نو بجے تک دستر خوان ا... گئے۔ عمارت کے وسط میں چاندنیاں بچھا دی گ... زنانوں نے کھیل تماشا شروع کر دیا۔ ہنساتے ہنسا... نے سب کو لوٹ پوٹ کر دیا۔ میری سمجھ میں آج ... آیا کہ لوگ زنانوں کو دیکھ کے بے قابو کیوں ہو جا... اور ان سے ناروا قسم کی چھیڑ خانیاں کیوں کرنے لگ... ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ یہ کوئی دوسری مخلوق ہے... انسانوں کے گھر پیدا نہیں ہوئے۔ مجھے تو ہمیشہ ان پ... آیا۔ یہ بھی جانے کس طرح اپنی ذلّت برداشت ... ہیں۔ یہ تو سراسر آدمیت کی توہین ہے۔ آدمی کی کسی ... خامی میں اس کی کیا خطا! پیدائشی اندھوں' گونگوں او... کا تو کوئی مذاق نہیں اُڑاتا' پھر ان لوگوں سے ایسا ... کیوں کیا جاتا ہے۔ شاید اس میں کچھ ان لوگوں کا بھی ... ہے۔ یہ اپنے آپ کو تماشا بنواتے ہی کیوں ہیں۔ ا... لُولے' لنگڑے لوگ سولہ سنگھار کر کے اپنے آپ کو ... نہیں کرتے۔ وہ بھی تو کسی طور زندگی بسر کرتے ہی ہیں ... کیا بھیک مانگنا سوانگ بھر کے پیٹ پالنے سے بہتر ہے؟

گیارہ بجے کے قریب اُن کی نوٹنکی بند ہوئی اور ... کے دَوران مجرے کی محفل کا آغاز ہوا۔ دو نوجوان ... اندام لڑکیاں' ایک کم سن دوسری نسبتہ "پختہ کار" ... دو بجے تک ناچتی گاتی رہیں۔ اچھا خاصا گا لیتی تھیں ... بھی خوب آتا تھا۔ دیکھنے میں شگفتہ و تابندہ تھیں ... آرائش و زیبائش کی بات بھی تھی لیکن دو دن پہلے ... کے بالا خانے پر ہم نے چاندنی بانو کا رقص دیکھا تھا اور ... کی آواز سنی تھی۔ گانے والے کا کمال یہ ہے کہ ... بجائے خود ساز ہو' ساز مستزاد ہوں۔ کہتے ہیں' آواز و... ہے جو دل چُھو لے اور رقص کے لیے لوگوں کا کہنا ... بدن میں لہروں جیسی بے ساختگی ہو' بجلی کی چمک اور شا... کا لوچ ہو۔ یہ لڑکیاں چاندنی کا عشر عشیر بھی نہیں تھیں ... تماش بین بے حال ہوتے رہے۔ سکوں اور روپوں کی ...

...ں۔ کوئی نہیں چاہتا تھا کہ یہ رات تمام ہو لیکن ...اں نے بخل کے اشارے پر روشنیاں گل کرنے کا ...دار کر دیا۔ پھر بھی لوگ ڈھائی تین بجے تک بیٹھے

...حیرت تھی کہ لوگ بنّے خاں کو کتنی جلد، کتنی ...سے فراموش کیے بیٹھے ہیں، یہ سارا اہتمام تو اصلاً ...کے نئے استاد بنّے خاں کے لیے کیا گیا تھا۔ اس کی ...کوئی خبر نہیں تھی اور کسی کو اس کی اب کوئی فکر ...معلوم نہیں ہوتی تھی شمشاد خاں تک کو۔ کچھ عجیب سی ...تھی۔ اس بے اعتنائی کی وجہ بظاہر بنّے خاں کی اچانک ...ہی ہو سکتی تھی جسے لوگ بنّے خاں کی زود حسی و زود ...رنگ دلی اور دوں ہمتی پر محمول کر رہے ہوں گے۔ ...اور وجہ بھی تھی۔ غیر متوقع، رجّن نے سامنے آ کے ...کو مضطرب کر دیا تھا۔ گو دوسرے دن وہ پنچ پا ہو گیا ...یہ ایک دن بڑے تلاطم اور انتشار کا دن تھا۔ اس ...نے سے جس شخص نے انھیں نکالا، وہ بنّے خاں سے ...فضیلت کا مستحق تھا، اور یہ تبدیلی شمشاد خاں کی مرضی ...معیار کے مطابق تھی تو اس سے بڑی سرخوشی کیا ہو سکتی ...تھی۔ وہ تو شمشاد خاں کی طرف دیکھتے تھے۔ شمشاد خاں ایک ...زمانے سے ان کا مرکزِ نگاہ تھا۔ اڈّے کے معاملات میں اس ...شا ان کے لیے اعتبار کا درجہ رکھتی تھی۔ ایک اور ...بھی ہو سکتا تھا۔ شاید لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ بعد از ...خرابی بسیار آخر اڈّے کو کپتن خاں مرحوم کا جانشین مل گیا، ...اب اڈّے پر نئے استاد کا قیام مستقل رہے گا۔

تین بجے کے قریب ہمیں بھی اپنے کمرے میں جانے کا ...موقع مل گیا اور جلد ہی نیند نے آلیا۔ آغا پیا کو ہم نے تاکید ...کر دی تھی کہ صبح آٹھ بجے ہمیں جگا دے۔ ٹھیک آٹھ بجے ...آغا پیا اور مرزا دل بر نے دروازے پر دستک دی۔ ناشتے کا ...انتظام بھی انھوں نے وہیں کر دیا۔ نیند آنکھوں سے پوری ...طرح دور نہیں ہوئی تھی یا بیداری میں کچھ کسر رہ گئی تھی کہ ...آغا پیا نے یہ بتا کے ہم تینوں کو سیدھا کر دیا کہ رات سادہ ...لباس والے پولیس کے کئی آدمی محفل میں موجود تھے۔ ...گزشتہ رات کئی بار مجھے خیال آیا تھا کہ کسی وقت بھی

انسپکٹر چوہان کا ماتحت رضوی ہمارے بیانات لینے آ سکتا ہے۔ رضوی کے نہ آنے کا ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا کہ چوہان نے یہ رسم بھی غیر ضروری سمجھی ہے یا اُسے کسی اور طرف کوئی نشان نظر آ گیا ہے۔ یہاں سے مایوس ہو کے پولیس کو زیادہ فعّال و مستعد ہو جانا چاہیے تھا۔ پہلے تو اُنھوں نے سیدھے تارا بیگم کے بالا خانے کا رُخ کیا ہو گا اور اُن دل پھینک نواب زادگان کی ٹن گن لینے کی کوشش کی ہو گی جو چاندنی بانو کے والہ و شیدا تھے اور جن سے تارا بیگم نے میری بولی کے بعد رابطہ کیا ہو گا۔ بہر حال آغا پیا کی اطلاع صرف میرے لیے نہیں، بھو اور زورا کے لیے بھی طمانیت و تقویت کا باعث تھی۔ اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی تھی کہ پولیس ہماری نگرانی کر رہی ہے۔ لازماً اُنھوں نے اڈّے کے بعض کم زور آدمی بھی مخبری کے لیے مامور کیے ہوں گے۔ زورا کا خیال تھا کہ بنّے خاں کے تنگ دار ساتھی ابھی تک اڈّے پر واپس نہیں آئے۔ کوئی بعید نہیں کہ بنّے خاں ہی نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے چاندنی بانو کو اغوا کر لیا ہو۔ یہ ایک ناقابلِ یقین جرأت تھی مگر شکست خوردگی بھی ایسے ہی جنون سے دوچار کر دیتی ہے۔

رات محفل کے اختتام پر شمشاد خاں نے اڈّے کے منتخب آدمیوں کو صبح اڈّے پر جمع ہونے کی ہدایت کی تھی۔ ہم پہنچے تو تمام لوگ موجود تھے۔ چوکی پر ہمارے پہنچتے ہی [illegible] نے [illegible] کی لے ترک کی اور سپاٹ آواز میں انھیں مخاطب کیا۔ "ہماری بات ذرا دھیان سے سنو۔ اپنے کو آگے جانا ہے۔ بیچ میں اڈّے پر لوٹ پلٹ نہیں ہو جاتی تو ہم پہلے ادھری سے نکل جاتے۔ ہمارے پیچھے پہلے کی طرح استاد شمشاد خاں چوکی کو دیکھے گا۔ کسی آدمی کے تیّار ہو جانے پر استاد شمشاد خاں کی مرضی ہے۔ اس کو چوکی پر جگہ دے کہ نہیں۔ رجّن کی طرح کوئی حرام کا جنا بھی سامنے آیا تو استاد شمشاد خاں ہم کو خبر کر دے گا اور مہینے کے اندر اندر ہمارا لوٹنا نہیں ہوا تو جیسا کہ اڈّے کی ریت ہے ویسا ہی ہو گا۔ ایک جام میں دو یا دو سے زیادہ سر اٹھانے والے پنجہ کر کے چوکی کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ سن لیا

سب ہے؟"

شمشاد خاں سر جھکائے سنتا رہا۔ ببّھل کے چپ ہو جانے پر چند لمحوں بعد اس نے دل گیر آواز میں کہا۔ "ٹھیک ہے' جو استاد ببّھل بھائی کہتے ہیں' ٹھیک ہے۔ ہم نے ان کو روکا تھا پر کیا پتہ تھا' اب الٹ پلٹ ہو جائے گا۔ اپنے کو معلوم ہے' ببّھل بھائی کو آگے جانا ہے۔ کچھ بولنا بے کار ہے۔ اپنا منہ بھی نہیں پڑتا لیکن ایک بات سارے سن لیں' ببّھل بھائی کے کہنے پر ہم یہاں ضرور بیٹھیں گے پر اڈّا بابر استاد کے نام پر چلے گا۔ شمشاد خاں کی آواز بھرا گئی۔ "سب جانتے ہیں' ہم نے ادھر سے ہلنے کا طے کر لیا تھا۔ رجّن کتے نے سارا کھیل الٹا کر دیا۔ اب اڈّے کے آدمیوں سے ہمارا کہنا ہے کہ نیا آدمی جلدی سے تیار کرو اور بس ہماری چھٹّی کرو۔ اب زیادہ دن نہیں بچے اپنے پاس۔ چوکی پر کوئی رجّن جیسا گیدڑ کی اولاد' سور کا بچّہ پھر سامنے آ جائے گا۔ پھر مت کہنا' اور ایک بات!" شمشاد خاں کی ٹھنماتی آواز میں تندی آ گئی۔ "ایک بات کان کھول کے سن لو سب۔ بابر استاد کی واپسی مشکل ہے' ٹھیک ہے' لیکن رجّن کی طرح کوئی دوسرا الّو کا پٹھا آگے آیا تو بابر میاں اور ببّھل بھائی کتنے ہی دور ہوں' اپنے بھائی شمشاد خاں کے پکارنے پر ضرور لکھنؤ آئیں گے اور کھال نوچ لیں گے اُس حرامی کی۔ شمشاد خاں اور گبّن خاں کی چوکی پر وہ کسی پاپی کو نہیں دیکھ سکتے۔ ہماری آنکھیں بند ہونے کے بعد بھی یہ بات پکّی سمجھو۔"

ببّھل چوکی پر نہیں ٹھہرا۔ اس کے ساتھ سبھی نیچے آ گئے اور گلی میں دور تک ہمارے ساتھ چلتے رہے۔ تانگے' سامان اور ہجوم دیکھ کے مجھے اندازہ ہوا کہ ہم اسٹیشن کی طرف جا رہے ہیں۔ میں نے ہجوم سے چند قدم الگ لے جا کے جمرو سے تصدیق چاہی۔ "کیا ہم یہاں سے جا رہے ہیں؟"

"نہیں؟ کیا ہے لاڈلے؟" جمرو بمبیا زبان میں شوخی سے بولا۔ "ابھی اور ادیدھر ٹھہرنے کو مانگتا کیا؟"

"یہ بات نہیں۔" میں نے الجھ کے کہا۔

"پھر کیا ہے۔ بڑی مشکل سے سالی گردن چھٹی ہے۔ اب ادھر رکھا بھی کیا ہے۔"

"کچھ دیر بعد ہم اسٹیشن نہیں پہنچ سکتے۔"

جمرو چونک کے بولا "بات کیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" میری نظریں ببّھل پر بھٹکنے لگیں۔

"ادھر کوئی کان لگائے نہیں ہے' صاف بتا۔"

"جمرو بھائی! ایک بات کا خیال آتا ہے۔" میں اٹکتی آواز میں کہا۔ "اگر زورا کا کہنا صحیح ہے تو تارا بیگم برباد ہو گئی۔ بتّے خاں نے چاندنی بانو کو اغوا کیا ہے تو چاندنی تو اسے مل گئی۔ اب ہمیں جا کے تارا بیگم کو کچھ چاہیے۔ مطلب یہ کہ سب ہماری... ہماری وجہ سے۔"

"ہا!" جمرو سر جھٹک کے بولا۔ "کیا بولتا ہے۔ زورا سالا کوئی جوتشی پیر فقیر ہے۔ وہ تو جو منہ میں آئے' اکلتا ہے۔ مانو اگر ایسا نہیں ہوا تو! تو ہم تارا بیگم کے آگے ڈھیری ڈال آئیں؟ اور وہ! وہ بتّے خاں' تیس مار خاں' پاگل نہیں تھا۔"

"اور فرض کرو' زورا کی بات صحیح نکلی؟"

"تو ہم ٹھیکے دار ہیں کیا؟ ہم لوگوں پر پھر بھی تارا بیگم کا حق نہیں بنتا۔" جمرو نے ناگواری سے کہا۔ "پولیس ادھر پیچھے لگی ہے۔ ایسے میں کوٹھے پہ جا کے اُلجھنا ڈالیں ہم' سیدھے سبھاؤ نکلنا ہی ٹھیک ہے۔" جمرو مجھے سمجھانے لگا کہ سفر کے سارے انتظامات ہو چکے ہیں۔ گاڑی کی روانگی کے وقت ہی ہم اڈّے سے نکلے ہیں۔ زورا' مرزا دل بر کے ساتھ سلمیٰ کو لینے جا چکا ہے۔ یہ معمہ جوئی بہت مہنگی پڑ سکتی ہے۔ بات چھپی تو نہیں رہے گی۔ ببّھل کو خبر ہوئی تو الگ ناراض ہو گا۔ کہنے لگا کہ چاندنی بانو کون سی تارا بیگم کی پہلوٹھی زاد ہے۔ کہیں سے' کسی سے خرید کے ہی تارا بیگم نے اسے پروان چڑھایا ہے۔ یہ عورتیں اپنی تربیت یافتہ لڑکیوں کو بیٹی ہی کہتی ہیں۔ اس رات بالا خانے پر جتنی لڑکیاں ہم نے دیکھی تھیں' سب تارا بیگم کی بیٹیاں تو نہیں تھیں۔ چاندنی بانو سے جتنا حاصل کرنا تھا' تارا بیگم نے کر لیا ہے۔ میں خاطر جمع رکھوں کہ چاندنی بانو کے چھن جانے سے تارا بیگم غارت نہیں ہو جائے گی۔

جمرو کی بات سمجھ میں آ رہی تھی لیکن جی نہیں مانتا تھا۔

اے وحشی طبع تو رہزن بلا شدی

محمد ظفر

شیر کی زرافے سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ زرافے نے ادب کے ساتھ شیر کے راستے سے ہٹنا چاہا۔ شیر کو جلال آ گیا۔ "ٹھیرو!" اس نے دہاڑ کر زرافے کو حکم دیا۔ زرافہ رک گیا اور تھر تھر کانپنے لگا۔ شیر نے سوال کیا۔ "بتاؤ، اس جنگل کا بادشاہ کون ہے؟"
زرافے نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "یہ آپ کیا پوچھ رہے ہیں جہاں پناہ! جنگل کے بادشاہ تو آپ ہی ہیں۔" شیر نے حقارت سے زرافے کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔
کچھ دور چل کے شیر کی نظر ایک گدھے پر پڑی۔ گدھے نے اسے دیکھ کر فرار ہونا چاہا۔ شیر ایک زوردار دہاڑ کے ساتھ ایک جست میں گدھے کے سر پر پہنچ گیا۔ گدھے سے بھی اس نے یہی سوال کیا۔ "بتاؤ، اس جنگل کا بادشاہ کون ہے؟" گدھے نے سہم کے اعتراف کیا۔ "آپ سرکار! جنگل کا بادشاہ آپ کے سوا کون ہو سکتا ہے۔" شیر گردن اکڑا کے وہاں سے چل پڑا۔
کچھ دور چل کے شیر کا گزر ایک ایسے درخت کے نیچے سے ہوا جس پر درجنوں بندر اچھل رہے تھے۔ شیر کو بندروں سے سوال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ بندر اسے دیکھتے ہی خاموش ہو گئے اور اپنے ناسمجھ بچوں کو بھی خاموش رہنے کے اشارے کرنے لگے۔ شیر کی چال میں کچھ اور مستی آ گئی۔
کچھ دور چل کے شیر کی نظر ایک ہاتھی پر پڑی۔ شیر نے دہاڑ کر ہاتھی کو متوجہ کیا اور اپنا سوال دہرایا۔ "بتاؤ، اس جنگل کا بادشاہ کون ہے؟" ہاتھی نے جواباً شیر کو ایک دم اپنی سونڈ میں کس لیا اور پوری قوت سے زمین پر دے مارا۔ ساتھ ہی چھ سات لاتیں رسید کر دیں۔ شیر ادھ موا ہو گیا۔ ہاتھی دیر تک اس کی خبر لیتا رہا پھر اسے مردہ سمجھ کے چنگھاڑتا ہوا ایک طرف چل دیا۔
شیر ہانپتا کانپتا اٹھا۔ زرافے اور گدھے کے علاوہ کئی جانور دور سے شیر کی درگت بنتی دیکھ رہے تھے۔ شیر ان کے قریب سے گزرا تو جھینپ گیا۔ اس کے منہ سے نکلا۔ "عجیب احمق ہاتھی تھا۔ اسے پتہ ہی نہیں تھا کہ میں کون ہوں۔"

ادھر بنجل، شمشاد خاں کے ساتھ تانگے میں بیٹھ چکا تھا۔ مجھے اپنے بازو میں بھر کے دوسرے تانگے میں سوار ہو گیا۔ تانگوں اور سائیکلوں کا ایک قافلہ اسٹیشن تک ہمارے ساتھ چلا۔ اسٹیشن پر پہلے سے کافی لوگ پہنچ چکے تھے۔ گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ ٹکٹ، ڈبے اور نشستوں کا بندوبست اڈّے کے آدمیوں نے کر لیا تھا۔ ڈبہ لگ چکا تھا۔ سلمٰی بھی ڈبے میں بیٹھی تھی۔ سلمٰی کو برقع میں دیکھ کے مجھے کھٹکا ہوا۔ سادہ لباس والے، ظاہر ہے۔ یہاں بھی موجود ہونے چاہئیں۔ وہ کہیں بدگمان نہ ہو جائیں۔ میں نے جمو کو بتایا تو اس نے بھی تائید کی۔ سلمٰی کو نقاب اٹھائے رکھنے کی ہدایت بہت نا روا معلوم ہوتی تھی اور ہر چند چاندنی بانو کو اس طرح لے جایا بھی نہیں جا سکتا تھا مگر پولیس کا کچھ ٹھیک نہیں، وہ کوئی بھی رخنہ ڈال سکتی تھی۔ جمو نے جانے کس طرح سلمٰی کو نقاب ہٹانے پر آمادہ کیا۔ اڈّے کے سامنے اڈّے کے آدمیوں کا ہجوم تھا۔ بہت سے لوگوں نے اس کا چہرہ دیکھا ہو گا۔ سلمٰی برقع میں نہ ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی یا پہلے سے نقاب کھلا ہوتا تو بھی کچھ نہیں تھا۔ اب اچانک نقاب اٹھا لینا اور چہرے کی نمائش کرنا سلمٰی کو بالکل اچھا نہیں لگ رہا ہو گا لیکن پولیس کے اطمینان کے لیے یہی ایک چارہ تھا۔

زیادہ دیر نہیں لگی کہ انجن نے سیٹی بجا دی۔ شمشاد خاں بار بار ہم سب سے [illegible] پیشانی چومی، ہاتھ چومے اور [illegible] آواز میں بولا۔ "ہو سکے تو جلدی شکل دکھانا۔ زیادہ [illegible] کے لیے نہیں کہتا۔ اب وقت بہت کم ہے اپنے پاس۔"

گاڑی حرکت میں آنے تک سب ہمارے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

○

بارہ بج چکے تھے۔ تیز دھوپ پڑ رہی تھی۔ لکھنؤ شہر سے نکلتے ہی گاڑی نے رفتار پکڑی۔ ڈبے میں ہمارے سوا کوئی مسافر نہیں تھا۔ سو ہمیں اپنے آپ میں گم ہونے کی آزادی تھی۔ یہی ہوا۔ اتنی ہاؤ ہو کے بعد کسی گوشۂ سکوں میں آ

جانے سے آدمی خالی خالی ہو جاتا ہے۔ گزرے ہوئے مناظر کی بازگشت آدمی کو متلاطم کیے رہتی ہے۔ کچھ دیر کا سکوت تھا۔ فاصلے ذہن پر چھائے ہوئے مناظر دھندلے کرتے جاتے ہیں یا چھلنی کرتے جاتے ہیں۔ وقت بجائے خود ایک فاصلہ ہے مگر بعض نقش جو پتھر ہو جاتے ہیں، مٹائے نہیں مٹتے، نہ زمانی فاصلے سے نہ مکانی دوریوں سے۔

سلمٰی نے بمبل کے کہنے پر برقع اتار دیا تھا اور بدن پر شال لپیٹ لی تھی۔ اُس کے چہرے پر شادابی نظر آ رہی تھی۔ شادابی، خوشی کی علامت ہے۔ خوشی اس یقین کی کہ قسمت نے مآل کار کسی منزل پر پہنچا دیا ہے۔ اُس نے بتایا کہ میزبانوں نے اسے قیمتی کپڑوں کے دو جوڑے تحفے میں دیے ہیں اور سونے کی چار چوڑیاں بھی۔ میزبانوں نے کھانے پینے کا بہت سارا سامان بھی ساتھ کر دیا تھا۔ لکھنؤ سے فیض آباد کا سفر چند گھنٹوں کا ہے۔ یہ پسنجر گاڑی تھی۔ بہ قول شخصے بیتوں بیتوں چل رہی تھی۔ ہر چھوٹے بڑے اسٹیشن پر رُکتی۔ آدھ گھنٹے میں ملہور، پندرہ بیس منٹ بعد ہمکور اور اس کے چند منٹ بعد سفید آباد آ گیا۔ ڈیڑھ گھنٹے میں گاڑی بارہ بنکی پہنچ گئی۔ یوں بھی ڈیڑھ ہی بج رہا تھا۔ جمو، دورا اور بمبل بھی نیند لے چکے تھے یا ایسے ہی میری طرح آنکھیں میچے نشستوں پر پڑے رہے تھے۔

بارہ بنکی اسٹیشن پر جمو نے سلمٰی کے میزبانوں کا دیا ہوا توشہ کھولا اور دورا فضول میں پلیٹ فارم سے کچھ اور چیزیں لے آیا۔ رکابیاں موجود نہیں تھیں۔ سب نے انھی برتنوں میں کھایا جو شمشاد خاں کے عزیزوں نے ساتھ کیے تھے۔ بہت خوش مزہ کھانا تھا۔ پراٹھے، مرغ قلیہ، بھنا ہوا گوشت، شامی کباب اور سوجی کا حلوہ، چائے پی کے سب پھر ادھر اُدھر نشستوں پر دراز ہو گئے۔ فرسٹ کلاس کے یہی ٹھاٹ ہیں۔ یہ پیسے کا بھی کیا کرشمہ ہے۔ آدمی کتنی چیزیں حاصل کر سکتا ہے۔ آرام، خلوت، جلوت۔ کہتے ہیں، آدمی کی خواہشوں کے سامنے پیسہ ہمیشہ کم پڑ جاتا ہے، اور کہتے ہیں، آدمی خواب نہیں خرید سکتا، خیال نہیں خرید سکتا پر اور ہزار چیزوں کے حصول کی مقدرت، جو پیسہ پیدا کر دیتا ہے۔ کتنی محرومیوں کی ایک شوٹی، کتنی پشیمانیوں کی تلافی ہو جاتی ہے۔ اسی لیے لوگ دیوانہ واری سے پیسے کا شکار... ہیں، پیسے سے آدمی کے دس ہاتھ ہو جاتے ہیں۔

سلمٰی گھڑی ہی کھڑکی سے باہر بھاگتے ہوئے ... رہی تھی۔ میں بھی نیچے آ کے اس کے سامنے کی ... کے مقابل بیٹھ گیا۔ اتنے دن ہو گئے تھے، سلمٰی سلام کلام کے علاوہ فراغت سے کبھی بات کرنے ... نہیں ملا تھا۔ ممکن ہے، وہ مجھے کوئی بددماغ شخص ... میرے جی میں آئی کہ اس کی نشست پر جا کے ... باتیں کروں، پوچھوں کہ کوئی کسک، کوئی ملال، ... اندیشہ تو اب نہیں ہے اس کے دل میں، اور ہو سکے ... تسلی دوں کہ اب بیتے ہوئے کا اعادہ نہیں ہو گا۔ وہ ... ہوا اندھیرا بھول جانے کی کوشش کرے۔ ایک بار ... نے کھڑکی سے نگاہیں ہٹائیں اور میری آنکھوں کو ... نگراں پایا تو پہلے وہ سٹ پٹائی، پھر اُس کے ہونٹوں ... شائستہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے پیر اور سکیڑ لیے ... نے جرأت کی اور فکر مندانہ لہجے میں بولی "طبیعت ... ہے؟"

میں نے جلدی سے کہا۔ "ہاں، ہاں، بالکل۔" اس ... ٹوکنے پر مجھے احساس ہوا کہ اوپر کی برتھ سے نیچے آ کے ... کسی پہلو قرار نہیں رہا تھا۔ آدمی کو اپنی بے کلی کی بھی خبر نہیں ہوتی۔

اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ "چائے تھرماس ... ہے، آپ کہیں تو......"

"نہیں۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "چائے پیے ... ابھی کچھ ہی دیر ہوئی ہے۔"

"ہاں، ان لوگوں نے گلوریاں بھی رکھی تھیں۔" ... کھنکتی آواز میں بولی "میں تو بھول ہی گئی۔"

"ضرور۔" میں نے بہ ظاہر اشتیاق سے کہا۔

وہ شال سنبھال کے اپنی نشست سے اُٹھی اور ڈ... کھکوڑنے لگی۔ نئی ہزاری ڈبیا میں بہت سی گلوریاں رکھی تھیں۔ سلمٰی نے میرے پاس آ کے ڈبیا میری طرف بڑھا دی۔ میں نے ایک ساتھ دو گلوریاں کھائیں۔ واقعی منہ میں خوشبو بس گئی۔ اس خدمت سے سلمٰی کا چہرہ اور چمکنے لگا۔

گل رنگ ہو گئے۔ بعض لوگ کسی سے سلوک کرنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔ سلمیٰ بھی زریں کی بہن معلوم ہوتی تھی۔ اس کے تکلف آمیز اطوار میں بڑی بے ساختگی تھی۔ تکلف تصنع سے عاری ہو تو بہت دل آویز ہوتا ہے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

تھیلی میں ڈبیا رکھ کے وہ اپنی نشست پر جا بیٹھی۔ اتنی دیر میں صفدر گنج اسٹیشن آ گیا۔ پھر سید خان پور، دریا باد، پھر بنے خاں میرے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا۔ میں نے اُسے سر سے جھٹکنے کی بہت کوشش کی لیکن بنے خاں تھا کہ آنکھوں سے دور نہیں ہوتا تھا۔ بار بار اس کا خیال سینے میں کھٹکنے لگتا۔ معلوم نہیں۔ اچھا ہوا یا برا، اگر بنے خاں ہی چاندنی بانو کو لے گیا ہے تو اس نے عواقب پر اچھی طرح غور کر لیا ہو گا۔ میری دانست میں اُس کے اور چاندنی بانو کے درمیان پہلے سے کوئی معاملہ فہمی نہیں تھی۔ ایسی صورت میں اُسے چاندنی پر اپنے پیچ کے اظہار میں کیسی دشواری پیش آ سکتی ہے۔ کیا معلوم کہ چاندنی بانو کو بالا خانے کی زرق برق زندگی بہت مرغوب ہو اور کسی چار دیواری کی سادہ زندگی کا تصور اس کے ذہن میں ہو یا اس کی مراد ہی نہ ہو۔ ضروری نہیں کہ بالا خانے پر پلی ہوئی ہر عورت بالا خانے سے نامطمئن ہو۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ شمعِ محفل سے چراغِ خانہ کا درجہ افضل ہے، محفل کی زیب و زینت کی نسبت گھر کی سادگی میں بہت عزت اور طمانیت ہے، اور ایسا تمنائی، ایسا شیدائی کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ بنے خاں کے پاس اتنے پیسے کہاں ہوں گے کہ ابتدائی دنوں میں چاندنی بانو کو کچھ باور کرانے کے لیے سائے اور سکون میں رکھ سکے۔ اُس نے لکھنؤ ہی میں کسی جگہ چاندنی بانو کو چھپا رکھا ہے تو آخر کب تک اسے روپوش رکھا جا سکتا ہے مگر بنے خاں بھی کہاں تک ہاتھ پیر توڑے، بیڑیاں ڈالے بیٹھا رہے گا۔ کسی وقت بھی پولیس آہٹیں سونگھتی ہوئی اُس کے سر پر پہنچ سکتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ لکھنؤ سے بہت دور کسی بڑے شہر میں وہ گھر بسانے کی کوشش کرے اور کوئی خزانہ اُس کے ہاتھ لگ جائے ورنہ چاندنی بانو تو شیشے کی طرح نازک ہے۔ تارا بیگم



نے اپنی پلکوں پر اُس کی پرورش کی ہے۔ وہ تو ذرا سی دھوپ سے کمھلا جائے گی۔

یہی سمجھ میں آتا تھا کہ بنے خاں اتنا دیوانہ نہیں ہوا ہو گا اور یہی بات ٹھیک معلوم ہوتی تھی کہ تارا بیگم نے چاندنی کے دل دادہ نواب زادگان کو بہت کم مہلت دی تھی۔ ایک دن میں جواب مانگا ہو گا۔ کسی بھی نواب راجا کے لیے اتنی خطیر رقم ادا کرنے کے بجائے، کرایے کے شورہ پشتوں کا بندوبست کرنا آسان تھا۔ بنے خاں نے بہت عجلت کی۔ اسے کچھ تو تحمل کرنا چاہیے تھا۔ بے شک کوئی ضمانت نہیں تھی کہ خریدی ہوئی چاندنی، بنے خاں کو دل و جان سے قبول کر لے۔ روپے سے آدمی خریدا جا سکتا ہے، اُس کے دل و دماغ نہیں۔ پیسہ کس حد تک چاندنی بانو کو مطیع رکھ سکتا تھا۔ اطاعت اور چیز ہے، بندگی اور چیز، اور ربطِ خاطر اور چیز۔ اصل چیز تو خود رفتگی ہے۔ چاندنی پر مکمل اختیار کے باوجود یک جائی و یک نفسی لازم نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ پیمانے کے مطابق ہی پیسے کو قابلِ اعتبار سمجھتے ہیں۔ جو لوگ جاہ و حشم ترک کر کے گوشہ نشین ہو جاتے ہیں، انھیں پیسے کی بے مائیگی، بے ثباتی کا شعور، کوئی عرفان ہو جاتا ہو گا۔ ریشم، پھول، شیشہ، جواہر، اچھے گھوڑے، خدام و ایوان، من و سلوا، پیسے سے حاصل کیے جا سکتے ہیں مگر کسی کی طلب ان سے سوا، ان سے دگر ہو تو؟

آدمی اپنے آپ سے بھی تو بیزار ہو سکتا ہے۔ لکھنؤ مسلسل دور ہو رہا تھا۔ اپنی دل بستگی کے لیے ورق پلٹ دینا ہی بہتر تھا مگر کتاب ہی کے ورق تو آسانی سے پلٹے جا سکتے ہیں، اور یہ گزشتہ ورق کے نوشتے کی سرایت کاری اور اثر پذیری پر منحصر ہے کہ کب تک طاری رہے، کب تک لذت ناب اور زہر قائم رہے۔ میرا قصور صرف اتنا تھا کہ میں نے بنے خاں کو دیکھ کے چاندنی بانو کے لیے بات کی تھی۔

تارا بیگم کا بالا خانہ اجڑ جائے گا اور چاندنی بانو کسی ناکردنی' ناگفتنی سے دوچار ہو جائے گی' یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ممکن ہے' اب تارا بیگم مجھے کوسنے دے رہی ہو اور چاندنی بانو آہ و بکا کر رہی ہو مگر میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو کیا کر سکتا تھا۔ میں نے تو یہاں تک سوچا تھا کہ ممکن ہوا تو چاندنی بانو کو کچھ عرصے کے لیے فیض آباد لے جائیں گے۔ زریں کی حویلی میں وہ گھر کے لطف و لذّت سے آشنا ہو گی اور بنّے خاں' ایسے طلب گار کی پاس بانی اور سایہ داری کا اُسے کچھ اندازہ ہو گا۔ آدمی کو سمجھنے میں دیر تو لگتی ہے۔ خدا جانتا ہے' اس کی بولی لگا کے مجھے عجب مسرّت ہوئی تھی۔ واقعی وہ ایسی ہی لڑکی تھی کہ جو کچھ بھی امکان میں ہو' اس پر نچھاور کر دیا جائے۔ دکان پر رکھی ہوئی چیز کی قیمت کتنی ہی اونچی ہو' وہ بھی اس وجہ سے بھی بے وقار ہو جاتی ہے کہ اس کی کوئی قیمت متعیّن ہے اور ادا کی جا سکتی ہے۔ چاندنی بانو بالا خانے پر نہ ہوتی تو اس پر جاگیریں قربان کی جا سکتی تھیں۔ میں نے بنّے خاں کو چاندنی بانو کے سامنے بے کسی اور بے چارگی کی حالت میں دیکھا تھا۔ راج کرشنا جیسا کوئی مہربان بنّے خاں کے لیے دفینہ چھوڑ جاتا تو وہ سارا کچھ داؤ پر لگا رہتا۔ صاحبِ نظر اور جوہر شناس ہی نہیں' قیمت تو صحیح وہی ادا کر سکتا ہے جسے کہیں' کسی موڑ پر اپنا مطلوب' اپنا مقصود نظر آ جائے' اور ضروری نہیں کہ ہر شخص' دوسرے کے ارادے اور جستجو سے متّفق ہو۔ ہر شخص صحرا نوردی کا متحمّل نہیں ہو سکتا اور نہ جوئے شیر نکالنے کے عزم سے بہرہ مند' اس کے لیے بہت شرطیں ہیں۔

سوا تین بجے گاڑی ردولی اسٹیشن پر ٹھہر گئی۔ فیض آباد کا فاصلہ اب ڈیڑھ گھنٹے کے قریب رہ گیا تھا۔ میری نظر سلمٰی پر گئی۔ پلیٹ فارم اس کی نشست کے سامنے آیا تھا۔ لوگوں کی نگاہوں سے بچنے کے لیے سلمٰی نے کھڑکی کی جالی نیچے کر دی۔ میں نے سوچا' بعد میں موقع ملے نہ ملے۔ میں اسے کچھ زریں کے بارے میں بتا دوں تاکہ نئے گھر اور نئے ماحول میں وہ کوئی اجنبیت محسوس نہ کرے گو اس تمہید و تاکید کی ایسی ضرورت نہیں' زریں کا دل تو ایک دریا کے مانند ہے جس کا پانی ہر دم رَواں' شفّاف اور شہد آگیں ہو۔

وہ تو کوئی گلستان ہے جہاں ہر موسم میں پھول ... ہیں۔ وہ تو ایسا شجر ہے جس کے ثمر اور جس کا ... نہیں ہوتا۔ وہ تو سر بہ سر پھول' سرتاپا خوشبو ... لطف و التفات کے بیان کے لیے لفظ کم پڑ جاتے ... سلمٰی کو یہی کچھ بتانا چاہتا تھا کہ کسی لمحے زریں کی ... اور سرد لہجے سے وہ آزردہ نہ ہو۔ حالاں کہ ... سلمٰی کو کبھی نہ ہو' لیکن ایک رعایت آدمی کو اس ... خانہ تموّج' نادیدہ فشار کی ضرور دینی چاہیے اور ... کی بھی۔ کبھی اپنی سماعت اور نگاہ کے غبار میں ... مطالب اور مفہوم اخذ کرنے کی چُوک ہو جاتی ... خود ایک معاملہ فہم' نرم خو' پُرتپاک اور خوش ... ہے۔ زریں بھی اس سے مل کے بہت خوش ہو گی کہ سلمٰی پوری طرح مطمئن ہو کے حویلی میں قدم ... جان لے کہ کسی ایسی ویسی جگہ نہیں' وہ ہمارے ... ہے۔ وہ بسمل کا اور میرا ہی گھر ہے' زریں تو بسمل کی ... بیٹی ہے۔ سگے سے بڑا وہ ہوتا ہے جو چہیتا ہو۔ ایک ... جو بسمل پر حکم چلاتی ہے اور وہ تعمیل کے لیے ... ہے۔

ردولی اسٹیشن پر گاڑی ٹھہرے چند لمحے ہوئے ... بسمل اوپر کی برتھ سے نیچے آ گیا۔ وہ جاگتا رہا تھا ... اس نے نیچے بیٹھتے ہی پان کی فرمائش کی۔ اسی اثنا میں ... پلیٹ فارم سے تازہ چائے لے آیا تھا۔ ردولی پر ... ہونے کا وقت گزار کے گاڑی پھر چل پڑی۔ چائے ... ختم کر کے اور گلوری منہ میں دبا کے بسمل سلمٰی کی ... پر چلا گیا اور اس کے پاس بیٹھا دیر تک چائے کی ... پروازیاں کرتا رہا۔ زریں ہی موضوعِ سخن ہو گی۔ ... ہدایت نامہ جو میں سلمٰی کو تعلیم کرنا چاہتا تھا اور ... باندھتا' جمع کرتا رہ گیا تھا گاڑی کے شور میں بسمل کی ... آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ دیورا کوٹ بھی گزر ... سالار پور کے بعد اب فیض آباد ہی آنا رہ گیا تھا۔ گاڑی ... منزل پر پہنچنے میں ابھی پندرہ بیس منٹ ہوں گے کہ زور ... جمرو بکسے کھولنے اور سامان کو نیچے پلٹنے لگے۔ دونوں نے ... سامان الگ اٹیچی میں رکھ لیا۔ تمنچے' کارتوس اور چاقو ...

مجھے بے چینی ہوئی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ ہم سے جدا ہو کے فیض آباد سے آگے جا رہے ہیں یا مجھے اور بختل کو فیض آباد نہیں رکنا ہے۔ میں چپ چاپ دیکھتا رہا۔ ظاہر ہے' میری حیثیت کسی مجہول اور راضی بہ رضا شخص کی تھی۔ مجھے کچھ بتانا اور مشورہ کرنا ضروری نہیں تھا اور اصلاً "تو یہ سب کچھ میری وجہ سے تھا' یہی کیا کم تھا۔ میں نے اُن سے کچھ نہیں پوچھا۔ میرے علم میں جمو اور زورا کو آگے کوئی ایسا کام درپیش نہیں تھا۔ بختل کو ویسے بھی فیض آباد رکنا چاہیے تھا۔ فیض آباد اسٹیشن تک آ کے زریں کو دیکھے بغیر آگے چلے جانے کی کوئی تک نہیں تھی۔ زریں سے رخصت ہوئے بہت دن ہو گئے تھے۔ بمبئی میں اس کے متعدد شکایتی خط آئے تھے۔ منیر علی کو ابا جان نے بمبئی میں روکے رکھا تھا۔ خانم بھی خود گزیدہ نواب عالم تاب کی مسیحائی کے لیے حیدر آباد جا کے وہیں رہ گئی تھی۔ نیساں اور جہاں گیر کے علاوہ زریں کے ساتھ منیر علی کا پورا کنبہ تھا مگر بختل وہاں نہیں تھا اور میں وہاں نہیں تھا۔ زریں کو تو ہم دونوں ہی سے نسبت تھی۔ میں نے کئی بار چاہا کہ زریں کو بمبئی بلا لیا جائے۔ وہاں وہ سب سے مل لے گی یا پھر سب کو فیض آباد چلنا چاہیے۔ زریں نے فرخ' فریال' فارہ اور اکبر کو نہیں دیکھا تھا۔ جولین سے بھی وہ نہیں ملی تھی۔ دونوں کو ایک دوسرے سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ شہ پارہ' گیتا اور گیتا کی ماں رانی نے زریں کے تذکرے ہی سنے تھے اور زریں نے اُن کے۔ بمبئی جا کے فرصت ہی نہیں ملی۔ پہلے کانٹے کیا پھر پیرو۔ ابا جان محل خرید کے نوک پلک کی درستی میں لگ گئے اور اچانک مارتی چلا گیا۔ اس دوران حیدر آباد سے نواب ثروت یار کا خط آیا اور ہمیں حیدر آباد جانا پڑ گیا۔ سب کچھ اتنی جلدی جلدی ہوا کہ نہ زریں کو فیض آباد سے بلایا جا سکا تھا نہ اس کے پاس جانا ممکن ہوا۔

ٹھیک پانچ بجے گاڑی فیض آباد شہر میں داخل ہو گئی۔ جمو اور زورا اپنا کام کر چکے تھے۔ سبھی ڈبے سے اتر گئے اور اسٹیشن سے باہر نکلنے کے بجائے اُنھوں نے انتظار گاہ کا رخ کیا۔ لکھنؤ سے آنے والی یہ گاڑی یہیں ختم ہو جاتی تھی اس لیے دوسری گاڑی سے آگے جانے والوں کو میں ڈیرا ڈالنا پڑتا تھا۔ ہمیں وہاں بٹھا کے جمو اور نکل گئے۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ بختل کا ارادہ نہیں ہے۔ زورا اور جمو کو آگے سفر کرنا ان سے رخصت ہو جاتا۔ گویا زریں کے پاس پہنچانے کی ذمے داری زورا اور جمو کے سپرد کی گئی یہ بات بہت عجیب تھی۔ ہر چند دخل در معقولات سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن مجھ سے یہ نہیں مجھے اپنی آواز کی تپش پر بھی قابو نہیں رہا۔ میں نے سے کہا۔ "ہمیں کہاں جانا ہے؟"

"آگے رے۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

"آگے کہاں؟"

اُس نے سر اُٹھا کے غنودہ آنکھوں سے میری دیکھا اور کہنے لگا۔ "تو نے سنا نہیں' تو تے بولے چدھری دانہ پانی زور کرے۔"

"اس میں دانے پانی کی کیا بات ہے۔" میں نے کہا۔ "میری مانو تو ہمیں سیدھے حویلی چلنا چاہیے۔"

"نہیں رے' اُدھری ابھی نہیں۔"

"ابھی کیوں نہیں؟"

"اُدھری بہت بیڑیاں ہیں اُس کے پاس۔ بھری گی۔ اپنا من بھی نہیں کرے گا جلدی لوٹنے کو۔ اٹکے جائیں گے اب۔"

"یہاں تک آ کے حویلی نہ جانا...! وہ کیا کہے گی اسٹیشن سے لوٹ گئے۔"

"بول دیا ہے ان سے' سمجھا دیں گے اُس کو۔"

"لیکن یہ تو ہم بھی وہاں جا کے اسے بتا سکتے ہیں۔" میں نے باگواری سے کہا۔ "بیچ میں ہر جگہ کوئی نہ کوئی رکاوٹ جاتی ہے۔ بعد میں پھر آنے میں نہ جانے کتنا وقت لگ جائے' ایک دو دن ٹھہر کے بھی ہم یہاں سے نکل ہیں۔"

"نہیں رے" وہ بیڑی سلگانے میں مشغول ہو گیا۔

"دو تین دن ممکن نہیں تو ہفتے عشرے بعد سہی۔ میں بھی تو آخر ہم رکے تھے۔"

ھری کی اور بات تھی رے۔"
وہ مراد آباد میں؟"
ھری بھی کام سے تھے۔" وہ تنک کے بولا۔
اب' اب کون سا کام ہے؟"
ابھی آگے جا کے نہیں دیکھنا کیا!" اُس کے لہجے میں
ال۔
دیکھنا ہے؟" میں نے زہرخند سے پوچھا۔
کو پتہ نہیں؟ کیا بیچ میں چھوڑ دیں پھر!"
"تمھارا مطلب ہے' ابھی کچھ باقی رہ گیا ہے۔"
اُس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "کیسا بولتا ہے' ٹھیک سے
رے۔"
"کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے جلی ہوئی آواز میں کہا۔
کوئی جواب دینے کے بجائے وہ اضطراری انداز میں سر
رہا۔
"اب چھوڑو سب۔" میری آواز ڈوبنے لگی۔ "سب
ار ہے۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ کب تک' کہاں تک۔۔۔"
"ابھی تھوڑا دم ساتھ ہے رے۔"
"ٹھیک ہے لیکن' لیکن۔۔۔" سلمٰی کے چہرے پر
گھبراہٹ کے آثار دیکھ کے مجھے خود کو روکنا پڑا تاہم چند
لمحوں کے توقف کے بعد میں نے دھیمے لہجے میں بحث کو
طول کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ میں نے کہا کہ ہمیں
ادھر سے چلے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں۔ اس دوران
ہمیں زریں کی کوئی خیر خبر نہیں ملی ہے۔ جا کے پوچھتے ہیں'
حویلی کا کیا حال ہے۔ خدانخواستہ درمیان میں کوئی ایسی ویسی
بات ہوئی ہو تو ہم تو لاعلم ہی رہیں گے۔ ممکن ہے' زریں کو
ہماری ضرورت ہو۔
میری التجا کا اُس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بیڑی پھونکتا
رہا اور کہنے لگا "اُدھری بمبئی سے چلتے ٹائم بڑے صاحب منیر
علی کو بولا تھا' اپنے کو چلنے میں دیر ہو جائے تو آپ فیض آباد
چلے جانا۔"
"اور اگر وہ نہ پہنچے ہوں؟"
"تو بھی اپنے دونوں شگرے اُدھری جا رہے ہیں۔"
"لیکن وہاں ہمارے جانے میں کیا حرج ہے؟"



"ہے رے۔ جان کے بولتے ہیں۔"
"میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔"
"تو اتنا چیں چیں مت کیا کر۔ تجھ کو اپنے سے زیادہ
فکر ہے اس کی؟"
میرے پاس شاید کوئی جواب نہیں تھا۔ اُس کی بیزاری
دیر ہی سے ظاہر تھا کہ وہ کوئی دلیل سننا نہیں چاہتا۔ میں
نے خواہ مخواہ اتنی حجت کی۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ اُس
سے کچھ کہنا اپنا ہی سر پھوڑنے کے مترادف ہے۔ جو اُس
نے طے کر لیا ہے' وہی اٹل ہے۔ کرنے کو میں بھی بہت
باتیں کر سکتا تھا' ایک بار میرے جی میں آئی تھی کہ اُس سے
کہوں' ٹھیک ہے' مجھے کہیں نہیں جانا اور ایسا ہی ہے تو میں
زورا اور جمو کے ساتھ چلا جاتا ہوں مگر سلمٰی سامنے بیٹھی
تھی' وہ نہ ہوتی تو بھی شاید میرا منہ نہ پڑتا۔
بے شمار موقعوں کی طرح میرے پاس یہی چارہ تھا کہ
خود کو سرزنش کروں' مجھے آخر اتنی بے کلی کیوں ہے۔ ہو
سکتا ہے میں ہی کچھ غلط سمجھ رہا ہوں۔ کوئی بات ضرور ہوگی
جو وہ حویلی جانے پر رضامند نہیں ہے۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا
ہے' یقیناً اُسے مجھ سے زیادہ زریں کی فکر ہونی چاہیے۔
مجھے اپنے سوا کسی کی فکر ہی کتنی ہوتی ہے۔ ممکن ہے' وہ
زریں سے کوئی وعدہ کر آیا ہو۔ حویلی میں تو اُس کا جی
ہی لگتا ہے۔ اس نے تو اپنی محل داری' اپنا آستانہ ہی کو
خیرباد کہہ دیا ہے' جہاں ہر وقت اُس کے غلام مولا
کی ایک فوج اس کی ایک جنبش ابرو پر سرنگوں کرنے کو تیار
رہتی ہے۔ جمو اور زورا ہمارے لیے ٹکٹوں کا انتظام
کرنے گئے تھے۔ جمو نے آ کے بتایا کہ اگر تاخیر نہ ہوئی تو
ہماری مطلوبہ گاڑی ایک گھنٹے بعد فیض آباد پہنچ جائے گی۔
زورا انتظار گاہ کے خدمت گار سے چائے کے لیے کہہ آیا

تھا۔ جیسے ہی اُنھوں نے چائے ختم کی، بُھل نے زورا اور جمو کو گھر جانے کی ہدایت کی۔ وہ اور ٹھیرنا چاہتے تھے لیکن بُھل نے منع کر دیا۔ دونوں بادلِ ناخواستہ کرسیوں سے اُٹھے۔ سلمیٰ بھی کھڑی ہو گئی۔ بُھل نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا، کمر تھپکی اور پیشانی کو بوسہ دیا۔ سلمیٰ کی آنکھیں بھر آئیں۔ "نانا، جاری اب، اُدھری جا کے سب بھول جانا۔"

سلمیٰ کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ ہم ساتھ ہوتے تو کم از کم اُس کی یہ کیفیت نہ ہوتی۔ "اُدھری بنیا ہے اپنی، بولا نا تجھ کو تیری بہنا، بس اُس کے پاس جا کے سارا اُدھل جائے گا۔ دیکھنا!" بُھل نے سلمیٰ کو سمجھانے کی کوشش کی، کہنے لگا۔ "اور جی نہ لگے تو اپنے لَوٹنے تک پتھر رکھ لینا۔ پھر کچھ اور دیکھیں گے ری۔"

دروازے سے نکلتے ہوئے سلمیٰ نے پلٹ کے پھر ہماری طرف دیکھا۔ "ٹُھٹلیا رکھ لی ہے پاس؟" بُھل نے بھاری آواز میں پوچھا۔ "کبھی اُدھری دکن جانا ہوا تو مار دیں گے منہ پہ مال زادوں کے۔"

سرنگوں سلمیٰ آگے چلی گئی۔ بُھل انتظار گاہ کے دروازے تک اسے رخصت کرنے آیا۔ میں اُن تینوں کے ساتھ اسٹیشن سے باہر آ گیا۔

سورج زرد پڑ چکا تھا۔ اسٹیشن کے اطراف لوگوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی۔ اتفاق سے کوئی تانگا موجود نہیں تھا مگر جلد ہی ایک سواری آ کے اُتری اور انھیں تانگا مل گیا۔ معمر کوچوان جمو کو دیکھتے ہی اچھل پڑا اور پوربیا میں جمو بھیا، جمو بھیا کی گردان کرتا ہوا تھر کے مٹکنے لگا۔ "اپنی انکھیاں کا دیکھو رہل ہیں، بھیا!"

جمو بھی اسے پہچان گیا تھا۔ جمو کا چہرہ بجھا ہوا تھا لیکن تانگے والے کے جوش و خروش کے جواب میں اُس نے بھی مصنوعی چہک کا اظہار کیا۔

تانگے کے وسط میں پچھلی نشست پر پردہ لٹکا دیا گیا۔ میں نے جھجکتے ہوئے سلمیٰ کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ سلمیٰ کے بیٹھتے ہی تانگے والے نے سامنے کی طرف بھی پردہ کھینچ دیا۔

مجھ سے گلے مل کے جمو اور زورا بھی تانگے پر سوار ہو گئے۔ زورا اگلی نشست پر کوچوان کے پہلو میں بیٹھا اور جمو پردہ کمر کے پیچھے کر کے پچھلی نشست پر سلمیٰ [illegible] بیٹھ گیا۔ زورا نے مجھے بتایا کہ بس تھوڑے دنوں [illegible] ہے۔ بُھل نے تاکید کی ہے کہ چند روز فیض [illegible] وہ کلکتے پہنچ جائے اور جمو چاہے تو اسے بھی سا[illegible] آئے۔

جمو آخر تک ہاتھ ہلاتا رہا۔ جب تانگا نظ[illegible] اوجھل ہو گیا تب میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی ا[illegible] قدموں سے انتظار گاہ میں لوٹ آیا۔ بُھل [illegible] سونے آرام کرسی پر دراز تھا۔ میں بھی قریب کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

ٹھیک سات بجے ہماری گاڑی آ گئی تھی۔ را[illegible] خرابی کی وجہ سے بار بار رکتی رہی۔ دوسرے دن صبح [illegible] مغل سرائے اسٹیشن پر ٹھیر کے ہم دوسری گاڑی میں [illegible] ہو گئے۔

❁ الہ آباد سے بنارس اور غازی پور ہوتے ہوئے ہم [illegible] بہار میں آ گئے اور گیا کے علاوہ دولت گنج، ستی پور [illegible] پور، پٹنہ، دربھنگا، آرا، مونگیر، بھاگل پور، چمپارن، موتی ہا[illegible] سہرسا، رانچی، ہزاری باغ اور جھریا۔ تقریباً سارے چھو[illegible] بڑے شہروں میں مولوی صاحب کے اسم کا ورد کرتے [illegible] بنگال کے صنعتی شہر آسن سول چلے آئے۔ صبح کہیں، [illegible] کہیں، کبھی ایک دن، کبھی دو دن یا تین چار دن کا پڑاؤ [illegible] ریل میں، کبھی لاری اور تانگے کے ذریعے۔ جتنی بڑی [illegible] اتنا ہی وقت۔ بستیوں میں مسلمانوں کی آبادی کی نسبت [illegible] صَرف ہونے والے وقت کی کمی و بیشی مشروط تھی۔ بعض [illegible] جگہوں پر مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی مگر [illegible] مسلمان ہر جگہ موجود تھے۔

کئی دن سے جسم ٹوٹ رہا تھا۔ آسن سول آ کے تو [illegible] جواب دینے لگیں۔ کلکتہ یہاں سے قریب تھا۔ سوچا تھا [illegible] مناسب وقت بُھل کو آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا [illegible] کہیں اور جانے کے بجائے کچھ دن کے لیے کلکتے چلیں [illegible] چند روز آرام کر کے پھر اس طرف آ جائیں گے لیکن [illegible] سوچ کے رہ گیا کہ کلکتے پہنچنے تک درمیان کی بستیوں میں [illegible]

میں لگانا چاہیے۔ ممکن ہے اِس دوران طبیعت ہو جائے۔ بھل کو اپنی حالت بتا کے میں لٹے اور روں گا حالانکہ صورت یہ تھی کہ ذرا دیر کہیں بیٹھ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا۔ مختصر فاصلوں ت سے بھی پنڈلیوں میں کھولن ہونے لگتی۔

ے سوا سو میل دور، دامودر ندی کے کنارے سے موناناگ پور کمشنری کے پلیٹو کے مغربی کنارے پر ریلوے کے بڑے مرکز، بجلی کے تار، شیشے، المونیم کے برتن، سائی کل اور پارچہ بافی کے کارخانوں سے ہوئے شہر آسن سول کی آبادی لاکھ سے اُوپر ہی ہو اطراف میں کوئلے کی کانیں پھیلی ہوئی ہیں۔ دوسرے کی نسبت یہاں موسم خوش گوار تھا۔ آسن سول میں ادوں کی تعداد چند ہی تھی، ہمیں وہاں سے مایوس یں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ہاں، ایک مدرسے میں ایک ل صورت، درویش مثال بزرگ قاری فرمان احمد سے ات ہو گئی۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ اِدھر اُدھر بھٹکنے کے ہمیں شہر کے ایک معزز رئیس سیّد محمود علی سے مل نا چاہیے۔ اُن کی حویلی کے مہمان خانے میں اطراف اف سے آئے ہوئے مہمان ٹھیرتے ہیں۔ رئیس سیّد محمود علی بہت اثر و رسوخ کے آدمی ہیں، مزاج بھی مختلف پایا علم و ادب کے قدر دان، موسیقی کے رسیا، بڑی سوجھ کے، خوش خلق اور وضع دار شخص ہیں۔ شہر میں اُن کا ذہبی ادارہ ہے، محفلوں کا مرکز ہے۔ قاری فرمان احمد کی ب المثالی سن کے میری طرح بھل کے دل میں بھی محمود علی سے ملاقات کی خواہش شدید پر ہوئی ہوگی۔

صبح وقفے وقفے سے ہونے والی بارش ٹھیر گئی تھی لیکن ان بادلوں سے اَٹا ہوا تھا۔ کوئی بھروسا نہیں تھا کہ بادل پھر کب ہو جائیں اِس لیے ہم نے اپنے ٹھکانے پر جا کے دوسرے کپڑے بدلنے کا ارادہ ترک کیا۔ پانچ سے کچھ اوپر وقت ہوا ہوگا۔ بادلوں کی وجہ سے اندھیرا پھیل گیا تھا۔ اوسان درست کرنے کے لیے ہم نے سرِ راہ واقع چائے کے ایک ہوٹل میں منہ ہاتھ دھویا، کنگھی کی، لباس کی شکنیں درست کیں اور چائے پی کے گھوڑا گاڑی میں بیٹھ گئے۔

سخن سنج

علی گڑھ یونی ورسٹی میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ ہوٹنگ زوروں پر تھی۔ ایک شاعر اپنا کلام سنانے کے لیے کھڑے ہوئے: "حضرات! غزل پیش کرنے سے پہلے دو قطعات پیش کرتا ہوں۔ پہلا قطعہ عرض کیا ہے کہ......" مجمع سے آواز آئی: "دوسرا قطعہ پہلے پڑھیے، دوسرا قطعہ پہلے پڑھیے۔"

*

ایک مبتدی شاعر نے دو غزلیں لکھ کر کالج کے اُستاد کو دیں اور کہا کہ "مجھے آج ایک مشاعرے میں شرکت کرنی ہے۔ آپ یہ دونوں غزلیں دیکھ کے بتائیے کہ میں ان میں کون سی پڑھوں؟" اُستاد نے صرف ایک غزل پر نظر ڈالی اور دونوں کاغذ واپس کرتے ہوئے کہا: "دوسری پڑھ دینا۔"

*

شاعر مشاعرے میں غزل سنا رہا تھا۔ چوتھا شعر سنانے کے بعد اُس نے کہا کہ "اپنا یہ شعر مجھے بہت پسند ہے۔" کسی نے بلند آواز سے کہا: "ذرّہ نوازی ہے آپ کی ورنہ شعر تو کیا ہے۔"

*

سڑکیں ابھی تک گیلی تھیں۔ بارش سے عمارتیں دھلی دھلی لگ رہی تھیں۔ چھوٹے شہر میں فاصلے اتنے طویل نہیں ہوتے۔ چند ہی منٹ میں گھوڑا گاڑی عام سڑک سے مڑ کے ایک کشادہ اور صاف ستھری گلی میں داخل ہو گئی۔

کوچوان سیّد محمود علی سے واقف تھا۔ اس نے عمارت کے عین سامنے گاڑی روک دی۔ باہر سے چار دیواری کے اندر عمارت کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا اور گرد بھی چھوٹے بڑے مکانات بنے تھے۔ کوچوان نے اُتر کے پھاٹک جیسے دروازے کا کُنڈا ایک بار ہی کھٹکھٹایا تھا کہ دربان باہر آ گیا۔ ہم گاڑی میں بیٹھے رہے۔ وہی ادارے پاس آیا اور قاری فرمان احمد کا نام سن کے اُس کے چہرے پر صاف ہو گئیں۔ وہ فوراً اندر چلا گیا اور کچھ دیر بعد واپس آ کے خندہ پیشانی سے ہمیں اندر چلنے کی ہدایت کی۔ چار دیواری کے اندر تازہ رنگ و روغن سے آراستہ درمیانہ درجے کی ایک دو منزلہ عمارت ایستادہ تھی۔ اُسے بنگلا بھی

نہیں کہا جاسکتا تھا' نہ قدیم طرز کی حویلی۔ چار دیواری سے عمارت کی راہ داریوں تک کے فرش پر سبزہ بچھا تھا اور کنارے کنارے کیاریوں میں پھلواری سجی ہوئی تھی۔ اطراف میں اِدھر اُدھر تناور درخت اُٹھے ہوئے تھے۔ چار دیواری سے عمارت کا فاصلہ کہیں کم تھا' کہیں زیادہ۔ پھاٹک کے دائیں جانب سبزے کے وسیع قطعے پر سنگِ مرمر کا چبوترا تھا اور بید کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ عمارت سے مکین کی خوش ذوقی اور نفاست جھلکتی تھی۔ دربان ہمیں وہاں بٹھا کے واپس اپنی جگہ چلا گیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اسی اثنا میں ایک دوسرا معمر باریش ملازم لپکتا ہوا باہر آیا اور اس نے مؤدبانہ لہجے میں کہا کہ مالک کو اطلاع کر دی گئی ہے' ذرا دیر ہمیں انتظار کی زحمت ہو گی۔ اُس نے ہم سے شربت وغیرہ کے لیے پوچھا۔ بسمل کے انکار پر وہ سر جھکائے آہستہ قدموں سے چلتا ہوا راہ داری میں گم ہو گیا۔

بظاہر عمارت کے مکین سیّد محمود علی اور مولوی صاحب کی شناسائی کی کوئی توقع نہیں تھی' خانہ پُری کی بات تھی۔ وقت کی ہمارے پاس کیا کمی تھی۔ بے شمار دروازوں پر دستک دے چکے تھے۔ سائل خوش گمانی نہ کیا کریں تو ہر کس و ناکس کے آگے ہاتھ کیوں پھیلائیں۔ کوئی ایک صدا تو کارگر ہو جاتی ہے۔ ہمیں چبوترے پر بیٹھے دس منٹ سے زیادہ ہو گئے' سیّد صاحب برآمد نہیں ہوئے۔ بسمل گم سُم بیٹھا تھا۔ میرے تو سارے جسم میں کُڑکُن ہو رہی تھی۔ بہتر یہی تھا' مجھے بسمل کو اپنی حالت بتا دینی چاہیے تھی۔ یہاں آنے کے بجائے ہوٹل میں آرام کرنا ہی مناسب تھا۔ یہاں ہم پھر کسی اور وقت بھی آسکتے تھے۔ ایک پہلو بیٹھنا دوبھر ہو رہا تھا۔ رگیں جیسے اندر سے کوئی مسوس رہا ہو۔

یوں یہ ایک خوش گوار شام کہی جاسکتی تھی۔ فضا ابر آلود تھی' ہوا بھیگی بھیگی اور ٹھنڈی ٹھنڈی' سبزے اور مٹی کی سوندھی مہک ہر سُو رچی ہوئی تھی' پرندے آشیانوں میں کوچ کے لیے شور مچا رہے تھے۔ مگر سارے موسم پابند ہوتے ہیں ورنہ ان کی کیفیتیں سب پر ایک جیسی مرتّب ہوا کرتیں۔ مجھے مسلسل کرسی پر کسمساتا دیکھ کے بسمل نے اٹک کے پوچھا "کیا ہے رے؟"

میں ہڑبڑا سا گیا۔ "کچھ نہیں' کچھ نہیں۔"

"لوٹ چلیں پھر؟"

"نہیں نہیں' ابھی ...." میری آواز میرے ... نہیں تھی' پھر میں نے منتشر لہجے میں کہا کہ ہاں ٹھیک ... واپس چلیں' یہاں پھر آجائیں گے۔

"کچھ الٹا ہے کیا؟"

"ہاں!" میں نے کمر سیدھی کر کے کہا "بس دل بیٹھ ... رہا ہے لیکن' لیکن چاہو تو کچھ دیر ٹھہر جاؤ۔"

"نہیں رے' چلتے ہیں۔" یہ کہتے ہی وہ اُٹھ کھڑا ہوا ... ایک قدم بھی نہ بڑھ سکا تھا کہ چبوترے کے عقب میں ... راہ داری میں کھن کھناتی آواز سن کر رک گیا' دوسرے ... جو شخص ہمارے سامنے تھا' وہ مکان کے مالک کے سوا ... نہیں ہو سکتا تھا۔ پچاس سے اُوپر کی عمر' قد متناسب' ... زیادہ نہ کم' گٹھا ہوا جسم' ناک نقشہ ترشا ہوا' گداز ... سرخ و سپید تپی ہوئی اور کسی قدر سیاہی مائل رنگت' ہلکی ... مونچھیں' سفید کرتے' پاجامے اور ہلک کی واسکٹ میں ملبوس' سلیم شاہی جوتا' ٹیڑھی مانگ' سامنے سے سر کے ... اُڑ جانے کی وجہ سے پیشانی چوڑی ہو گئی تھی۔ کسی زمانے میں خاصا وجیہ ہو گا۔ چہرہ دمکتا ہوا' بڑی بڑی آنکھوں میں گہری چمک۔ آسودہ حالی کی چمک دمک ہی اور ہوتی ہے۔ ... قدموں سے سیّد محمود علی چبوترے پر آئے اور پُرتپاک انداز میں ہم سے مخاطب ہوئے' کھنکتی آواز میں بتایا کہ وہی سیّد محمود علی ہیں۔ ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔ مصافحے کے ... بسمل نے زحمت دینے کی معذرت چاہی اور آمد کا مدعا بیان کیا یعنی آموختہ دہرایا۔

سیّد صاحب کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ "مولوی شفیق احمد ... کچھ سنا ہوا' آشنا آشنا سا لگتا ہے۔" وہ بدبداتے ہوئے بولے۔ "ذرا حلیہ اور وضع قطع تو بتائیے؟"

بسمل نے میری طرف دیکھا' مجھ سے بات نہیں ہو پا رہی تھی۔ میں نے ہمّت مجتمع کی اور مولوی صاحب کے بارے میں مزید کچھ تفصیل بتائی۔

"ہاں ہاں' کچھ یاد آتا ہے' یاد آتا ہے جناب!" سیّد محمود علی نے ہچکچاتے ہوئے کہا "ایک صاحب' بے شک' ...

یقیناً ان کا یہی نام ذہن پر نقش ہے مگر اب تو زمانہ ہو گیا دیکھے ہوئے۔" مولوی صاحب کے بارے میں انھوں نے کرید کے مجھ سے دوبارہ استفسار کیا' میری تصدیق پر [illegible] سے سر ہلانے لگے اور بولے۔ "وہ مدرس اور مبلغ ہیں' وہ عالم آدمی ہیں۔ جی ہاں' یہاں تشریف لا چکے ہیں' [illegible] نہیں' شاید دو تین بار...... اچھی یاد اللہ تھی ان سے۔ اب تو بہت وقت ہو گیا۔"

اسی بات سے ظاہر ہو گیا کہ ہمیں یہاں سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے لیکن اس طرح تو اب اٹھا نہیں جاتا تھا' بسمل نے بھاری آواز میں پوچھا۔ "کتنے برس لگ گئے؟"

"اچھا وقت ہو گیا' صحیح تو کچھ نہیں بتا سکتا۔" سید محمود علی نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے' دس سال سے زیادہ گزرے ہوں گے۔ ان کا پتہ محفوظ تھا۔ خیر خیریت کو عرصہ ہوا۔ یاد آتا ہے' ایک دو مرتبہ انھیں خط بھی لکھے' کوئی جواب نہیں آیا۔ مگر اب کہاں' کہاں ہیں قبلہ؟" سید صاحب نے فکر مندی سے پوچھا۔

"اپنے کو پتہ ہوتا تو آپ کے در پر کیوں آتے۔"

"جی' جی ہاں۔" سید صاحب مچل کے بولے۔ "آپ ان کے آبائی شہر مراد آباد بھی گئے؟ وہیں سے کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔"

"وہ گو ہری آئے تھے' ابھی تھوڑے دن ہوئے' اپنا [illegible] کسی کو بول کے نہیں گئے۔" بسمل نے گہری سانس بھر کے کہا۔

ابتدا ہی میں بسمل اپنی آمد کی غرض و غایت بتا چکا تھا لیکن [illegible] سے سید محمود علی کی سیری نہیں ہوئی تھی' تجسس بھرے لہجے میں بولے۔ "مگر ایسی' ایسی کیا' میرا مطلب ہے' آپ کو ان کی اس قدر تلاش کیوں ہے؟"

"[illegible] بات ہے صاحب!" بسمل نے منہ بنا کے کہا اور [illegible] طرف اشارہ کرتے ہوئے دوبارہ انھیں بتایا کہ میں مولوی صاحب کا عزیز ہوں' کچھ خاندانی جائداد کی تقسیم وغیرہ کے سلسلے میں مجھے مولوی صاحب کی تلاش ہے۔ یوں سمجھا جائے کہ مولوی صاحب کا حصہ انھیں لوٹانا ہے' وغیرہ وغیرہ۔

یہ کہانی اسے حفظ ہو گئی تھی۔

"یعنی مولوی صاحب قبلہ کی کسی جائداد کے امین یہ خوش اطوار نوجوان بابر میاں ہیں؟" سید صاحب پلکیں پٹپٹا کے بولے۔

"ٹھیک' بالکل ایسا ہی۔" بسمل نے بے اعتنائی سے کہا۔

"یقیناً بڑی جائداد ہی ہو سکتی ہے جو آپ قریے قریے انھیں ڈھونڈ رہے ہیں؟" سید صاحب نے ہونٹ سکیڑ کے پوچھا۔

"بڑی ہے صاحب' اچھی بڑی۔"

سید صاحب نے ہنکار بھری اور متانت سے بولے۔

"مولوی صاحب یہاں کا راستہ تو شاید بھول ہی گئے۔ خدا انھیں سلامت رکھے۔ بڑے درویش صفت آدمی ہیں' حدیث و فقہ کے عالم' شعر و سخن کے دل دادہ' وہ ایک روشن خیال علامہ ہیں' اپنی بات منوانے اور دوسروں کی بات سننے کا حوصلہ رکھنے والے۔"

"پچھلی بار وہ اکیلے آئے تھے یا کوئی......؟" سید صاحب نے سانس لینے کے لیے توقف کیا تھا کہ بسمل نے پوچھا۔

"نہیں' بالکل تنہا' بالکل تنہا۔" سید صاحب نے [illegible] کہا۔ "آپ کی مراد ان کی بیگم سے تو نہیں ہے؟ اس وقت تو جیسا کہ انھوں نے فرمایا تھا' ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ کیا کیا بعد کو حضرت نے......؟ کاش یہ ممکن ہوا ہو۔" سید صاحب کے لہجے سے [illegible] تھی۔

"نہیں صاحب ابھی وہ [illegible] رہے ہیں۔"

سید صاحب کی سمجھ میں [illegible] آیا اور انھوں نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ "جی ہاں' واقعی' شادی کے بعد تو آدمی آدھا ہی ہو جاتا ہے مگر آپ کی مراد..." وہ سنجیدہ ہو کے بولے۔ "پھر آپ کی مراد کس سے ہے؟ کون ان کے ساتھ ہو؟"

"ان کی بیٹیا۔"

"ان کی بیٹی!" سید صاحب نے چونک کے پوچھا۔ "مگر انھوں نے تو شادی...؟ آپ فرما رہے ہیں کہ......"

بسمل نے ہاتھ اٹھا کے صراحت کی۔ "انھوں نے ایک

کو منہ بولی بنالیا ہے۔"

"ہوں ہوں۔" سیّد صاحب پُر مزاق آواز میں بولے۔
"کب کب یہ دل خوش کُن واقعہ پیش آیا؟"

"برس بیت گئے؟" بھل نے آہستگی سے کہا۔

"یہ اچھی بات ہوئی' وہ اکیلے بھی بہت تھے۔" سیّد صاحب نے تبصرہ کیا۔ "ویسے جناب کو اُن کے بارے میں معلومات خاصی ہیں۔"

"اپنے کو کوئی اور کام نہیں ہے۔"

"کتنے برس ہوگئے قبلہ کی تلاش میں؟"

"اب گنتی یاد نہیں رہی۔"

سیّد صاحب کے چہرے پر ہم دردی اور فکر کا تاثر ابھرا اور اُنھوں نے نسبتہً دھیمی آواز میں کہا "معاف کیجیے' آپ صاحبان کے تعارف میں تشنگی محسوس ہوتی ہے۔" وہ اشتیاق اور کسی قدر لجاجت سے بولے۔ "مناسب ہو تو کچھ اور بتائیے۔"

"کیا بولیں صاحب!" بھل نے بڑبڑاتے ہوئے کہا کہ بمبئی میں کچھ جائداد وغیرہ ہے' اُسی کی آمدنی پر گزارا ہے۔

"ماشا اللہ' لیکن جناب بمبئی کے مستقل رہنے والے تو نہیں معلوم ہوتے۔"

"اب تو اِدھری ہیں' پہلے فیض آباد میں ہوتے تھے اور جانے کدھری...... اپنا دانہ پانی بہت مستی کرتا ہے۔"

"خوب" سیّد صاحب نے شگفتگی سے پوچھا۔ "اِس سمت پہلی بار آنا ہوا؟"

بھل نے سرہلانے پر اکتفا کی۔

"یہاں کہاں قیام ہے؟"

"اُدھری نزدیک ایک جگہ پر بکھا دھرا ہے۔" بھل نے سپاٹ لہجے میں کہا اور رخصت کی اجازت چاہی۔

سیّد صاحب بے قرار ہوگئے۔ "ایسا کیجیے جناب! آپ نے غریب خانے کو عزت بخشی ہے' کاش میں آپ کے کسی کام آسکتا لیکن اس طرح' اِس طرح آپ یہاں سے' کم از کم میرے گھر سے تو نہیں جاسکتے۔ واہ صاحب' اتنی دور سے تشریف لائے ہیں' کچھ میزبانی کا موقع تو اس عاجز کو دیجیے۔" اُنھوں نے اُونچی آواز میں نصیر یا نامی کسی ملازم کو پکارا۔

"آپ کا ناچیز بہت الٹا کیا' اتنا بہت ہے' اب اجازت دو۔" بھل نے میری ناسازیٔ طبع کا عذر کیا' بہ صورتِ دیگر ہم کچھ اور بیٹھتے۔

سیّد صاحب کی پیشانی لکیروں سے بھر گئی۔ "ارے رے؟ آپ نے پہلے کیوں نہیں فرمایا۔ کیسا محسوس کر رہے ہیں آپ؟" اُنھوں نے تشویش میں مجھ سے پوچھا۔

میں نے شکستہ آواز میں اُنھیں مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ "سفر کی تھکن غالب ہے۔ ایسے ہی بس ہے۔ کچھ آرام کرلوں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

سیّد صاحب نے بے تابانہ کرسی سے اُٹھ کے میری کلائی تھام لی۔ اُن کے ٹھنڈے ہاتھ سے مجھے اندازہ ہوا کہ میرا بدن تو جل رہا ہے۔ "حیرت ہے صاحب' آپ اس طرح سمٹے ہوئے بیٹھے ہیں۔ آپ کو تو تیز بخار ہے۔ بھل میاں' نہیں' آپ کو تو دوا کی شدید ضرورت ہے۔"

"اِدھری سے نکل کے کسی وید حکیم کو پکڑتے ہیں۔"

"وید حکیم یہیں آجائے گا۔ آپ ذرا ٹھہریں۔ شفا خانہ یہاں سے قریب ہے۔ انگریزی ڈاکٹر' میرے دوست کشن دواوی۔ کتنے ہی مریض ہوں' پیغام ملتے ہی آئیں گے۔ ہاتھ میں شفا ہے۔ تانتا بندھا رہتا ہے مریضوں کا۔ دور دور سے لوگ آتے ہیں۔" رابن نامی ملازم آس پاس ہی بھٹک رہا تھا کہ طلبی پر حاضر ہوگیا۔

بھل نے اس زحمت سے سیّد صاحب کو روکنے کے لیے بہت کچھ کہا لیکن اُنھوں نے ایک نہ سُنی۔ رابن کو جب تک ڈاکٹر بلانے کی ہدایت نہ کردی' اُنھیں چین نہیں آیا۔

"کب سے یہ کیفیت ہے؟"

"رات سے۔" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "صبح کچھ بڑھ گئی۔"

"اور آپ چلتے رہے؟"

"یہ ولایتی نہیں ہے' نہ اُودھری لکھنؤ کا راجہ نواب جنا' بھوسا چنے بہت چبائے ہیں اِس نے۔" بھل نے میری سخت جانی کا انھیں یقین دلانا چاہا لیکن سیّد صاحب پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

دائیں جانب راہ داری سے خاص مقامی لباس پہنے ہوئے ایک نوعمر ملازمہ شربت، مٹھائی اور نمکین چیزوں کا نفیس قسم کی طشتریوں سے بھرا ہوا طشت لے کے حاضر ہوئی۔ طشت جھالروں والے گیروی رنگت کے ریشمی کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ ملازمہ نے کرسیوں کے وسط میں رکھی ہوئی گول میز پر خوش نما طشتریاں سجا دیں۔ اِس دوران سیّد صاحب آبن سول کے موسم کی نیرنگی کے بارے میں بتاتے رہے۔ اچھا ہوا، اُنھوں نے مجھ سے کھانے پینے کے لیے اصرار نہیں کیا۔ بھِل نے سموسے، مٹھائی کا دانہ اور لال رنگ سے آمیز کیا ہوا دودھ کے شربت کا گلاس زہرمار کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اِس وقت کوئی چیز اچھی نہیں لگ رہی ہوگی۔ زندگی کا بڑا حصّہ تو آدمی کا وضع نبھانے میں صرف ہو جاتا ہے۔

سیّد صاحب ٹھیک کہہ رہے تھے، اُنھیں ابتن کو حکم دیے ہوئے دس بارہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ڈاکٹر کا بیگ تھامے 'تہمد' کرتے اور جالی دار ٹوپی میں ملبوس، چھریرے جسم کا نوجوان ابتن سامنے سے حاضر ہو گیا۔ اُس کے پیچھے ڈاکٹر کشن تواڑی ہی ہو سکتا تھا۔ وہ سانولی رنگت کا پستہ قد، گول مٹول اور درمیانی عمر کا شخص تھا۔ دور ہی سے جانے کیا کیا بکتا ہوا آیا۔ "سب خیر تو ہے بھیا صاحب؟"

سید صاحب اور ڈاکٹر کے مراسم بے تکلّفانہ معلوم ہوتے تھے۔ کسی رسمی تپاک کے بغیر سیّد صاحب نے میری طرف اشارہ کیا اور متردّد لہجے میں کہا کہ میرے عزیز مہمان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

ڈاکٹر نے کرسی پر بیٹھنے سے پہلے میری نبض ٹٹولی اور ابتن کو حکم دیا کہ مجھے فوراً مہمان خانے کے کمرے میں منتقل کردیا جائے۔ مہمان خانہ گھر کے خاص دروازے کے بائیں جانب تھا۔ اتنی دیر بیٹھے رہنے پر اچانک اُٹھ جانے سے میرا سارا جسم ڈگمگا گیا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا۔ مہمان خانہ زیادہ دور نہیں تھا مگر اتنی سی مسافت میں سانس پھولنے لگی۔ وہ مجھے ایک صاف شفاف سجے ہوئے کمرے میں لے آئے اور نہایت صاف ستھرے بستر پر لٹا دیا۔ ڈاکٹر نے کسی تاخیر کے بغیر مختلف آلات میرے جسم پر آزمانے شروع کردیے۔ درمیان میں وہ مجھ سے ... سوال بھی کرتا رہا۔

"کیا صورت ہے؟" ڈاکٹر کے نمٹنے پر سیّد صا... بے تابی سے پوچھا۔

"تیز بخار ہے، ٹائی فائڈ کا اٹیک۔" ڈاکٹر ... منمناتے ہوئے کہا۔ "آرام، پرہیز اور دوا کی ضرور..."

"اور تو سب ٹھیک ہے۔" سید صاحب الجھ ...

"میرا مطلب ہے، ایسی تشویش کی کوئی بات تو نہیں؟"

"بیماری کا پہچانہ کرو تو گلے میں اٹک جا... صاحب! یہ ٹائی فائڈ ہے ٹائی فائڈ، نزلہ زکام کھانسی ..."

"ابھی آپ اتنا کرو ڈاکٹر صاحب! اپنے کو کلکتے کی کوئی دوائی دے دو، اُدھری بھی ہمارا گھر ہے۔" ... نرمی سے کہا۔ "کلکتہ اِدھری سے زیادہ دوری پہ نہیں ..."

"ہم کو بھی معلوم ہے، پر آپ کی اِس کی کوئی ... ہے کیا؟" ڈاکٹر تلخی سے بولا۔

بھِل چپ ہو گیا اور چند لمحوں کے توقّف کے بعد ... نے آہستہ سے پوچھا۔ "کتنے دن لوگے آپ؟"

"کیا بول سکتے ہیں، یہ تو اِس جوان پر ہے، دوا کے ... بیمار کا زور بھی چلتا ہے۔ زیادہ تو نہیں لگنا چاہیے۔ آ... زیادہ بھی۔ ابھی اِس وقت ٹھیک سے کچھ نہیں بول ... ٹائی فائڈ تھوڑی نخرے والی بیماری ہے۔" ڈاکٹر اپنے کام ... مصروف رہا۔ اُس نے بیگ سے انجکشن نکال کے ... میں گھونپ دیا اور مختلف رنگوں کی گولیاں کھانے کو ... میری کمر میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ دوا پینے کے بعد ... نے اُٹھنا چاہا مگر ڈاکٹر نے مجھے جھڑک دیا اور خاموشی سے رہنے کی تاکید کی۔

"سیّد صاحب! ایک بات تھوڑی تسلّی سے سن ..." بھِل نے دبی دبی آواز میں کہا۔ "اپنے کو اُدھری ... نزدیک کوئی ٹھکانا دلا دو، آٹھ دس دن کے لیے، چاہیے ہو۔"

"واہ صاحب! یہ گھر، یہ مہمان خانہ ہم نے کس لیے ... کے لیے بنایا ہے۔" سیّد صاحب ناگواری سے بولے۔ "ٹھکانے آپ کو بہت مل سکتے ہیں، اِس سے بہت اچھے ...

وصاف بتائیں، یہاں جیسا آرام کہیں نہیں ملے گا۔
ہوں، اس میں حرج ہی کیا ہے۔ درست ہے، کی پہلی مڈ بھیڑ ہے لیکن پہلی نہ ہو تو دوسری بھی ہوتی۔ اجنبی سہی مگر آدمی کا آدمی سے ایک رشتہ ہے۔ بہتر ہوگا آپ سب کچھ ہم پر چھوڑ دیجیے، ہے، سامان کہاں رکھا ہے، وہ لے آئے گا۔ آپ دیکھیے، "انشاءاللہ جلد افاقہ ہوگا" ڈاکٹر کرشن بام ہی انوں کے بھی کرشن کنہیا ہیں۔"

ان گولیوں والے، بس ہم کو مرلی بجانا نہیں آتا۔" انگلیاں نچا کے کہا اور بسمل سے بولا۔ "بابا! آپ کرتے ہو، ادھر مزے سے رہٹھان کرو، وشرام کرو، صاحب کو مہمان پالنے کا بہت شوق ہے۔"

شک، بے شک۔" سید صاحب سینے پر ہاتھ رکھ لے۔ "میزبانی میری عادت ہے۔ یہاں مہمان خانے مہمان نہیں ہوتا تو سچ پوچھیے، عجب اداسی سی رہتی یہاں دس بارہ افراد کے قیام کی گنجائش ہے۔ یہ اتفاق ان دنوں کم ہی لوگوں کا اس طرف آنا ہوا ورنہ برکت رہتی ہے۔ مہمان خانہ بسا رہتا ہے۔ بہاول پور کے ایک بزرگ البتہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ بھی صبح رخصت ہو جائیں گے۔ اب تو خیریات ہی دوسری ویسے بھی جناب! ہم آپ کو ایسے تو نہیں جانے کم از کم ایک رات کے لیے تو آپ ہماری درخواست نہیں کر سکتے تھے۔"

"آپ بھیا صاحب کو نہیں جانتے بابا! ان کا دل کسی دن اور چیک کرتا ہے، اتنا بڑا ہونے پہ ڈاکٹری میں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔" ڈاکٹر مسکراتے ہوئے بولا۔

"اب دل رہا ہی کہاں ہے۔" سید صاحب نے بہ ظاہر آہ بھر کے کہا۔

"رہے بھی کیسے، پاس رکھو تبھی تو بھیا صاحب؟"

ڈاکٹر کرشن کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ سید صاحب نے بہ عجلت کہا۔ "تم نے پرہیز کے لیے کچھ نہیں بتایا مرلی منوہر؟"

"کم اور ایک دم ہلکا پھلکا، بہت نرم، دوائی کے ساتھ ان کے ہاتھ پورا چارٹ بنا کے بھیج دوں گا۔" ڈاکٹر نے کہا۔

بیگ بند کیا، مجھے تھپکی دے کے اور منتظر مریضوں کی کثرت کا عذر کر کے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا کہ بسمل نے چند قدم لپک کے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

سید صاحب بھی سمجھ گئے۔ "تم جاؤ کنہیا!" انھوں نے ڈاکٹر سے کہا اور اشاروں سے بسمل کو کچھ تلقین کرنی چاہی۔

"اب تو ٹوکری بھر موتی چور کے چھوٹے میاں جی کے اچھے ہو جانے پر کھائیں گے۔" ڈاکٹر مچلتے ہوئے لہجے میں بولا اور بسمل کو تحمل کا درس دینے لگا۔ اس نے از خود وعدہ کیا کہ صبح و شام میری خبر گیری کے لیے آتا رہے گا۔ بسمل کو اس نے شکریے کا موقع نہیں دیا اور تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد وہ دونوں میرے پلنگ کے نزدیک کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سید صاحب ڈاکٹر کرشن کی طبی مہارت کے مختلف واقعات سناتے رہے۔ کہنے لگے کہ برسوں سے ان کی دوستی ہے۔ خاصا منہ پھٹ اور کسی قدر مسخرا منش ہے۔ یہاں تو اس نے احتیاط کی، بے تکلف گالیاں بکتا ہے۔ دل کا بہت اچھا ہے۔ الٰہ آباد سے تعلق ہے، برسوں پہلے آسن سول آ کے مطب شروع کیا تھا۔ اب فرصت ہی نہیں ملتی۔ پھر وہ اپنے بارے میں بتانے لگے کہ آسن سول کے گرد و نواح میں ان کی تھوڑی بہت زمیں داری ہے، کچھ اثاثہ بردوان میں بھی ہے۔ شہر کی میونسپلٹی میں بھی ان کا بھی عمل دخل ہے۔ زیادہ تر وہ رفاہی، فلاحی کاموں میں مصروف رہتے ہیں، ہفتے عشرے میں ایک دو دن کے لیے دیہاتوں کی نگرانی کے سلسلے میں دورے کرنے پڑتے ہیں۔ یہاں ان کے مراسم اعلیٰ حکام، تاجر، زمیں دار اور معززین سے [illegible] شاید ہی کسی اہم تقریب میں انھیں مدعو نہ کیا جاتا ہو۔ رنگ و نسل، فرقہ و مسلک میں رواداری کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تعلق ہر طرح کے لوگوں سے ہے اور اطراف و اکناف میں ان کی عزت کی وجہ بھی یہی ہے۔

"اور ادھری گھر میں....." بسمل نے پہلو بدل کے پوچھا۔ "گھر میں [illegible]....؟"

سید صاحب نے گہری سانس بھری، چہرے پر کئی رنگ آئے، کہنے لگے کہ گھر کے معاملے میں وہ زیادہ خوش قسمت

نہیں ہیں۔ دو مرتبہ شادی کی' دونوں بیویاں گزر گئیں۔ پہلی بیوی سے ایک بیٹی' تین بیٹے ہوئے تھے۔ ایک بیٹے کا بچپن میں انتقال ہو گیا۔ باقی دو ولایت تعلیم حاصل کرنے گئے تھے لیکن وہاں کی زندگی ایسی مرغوب ہو گئی کہ یہاں آنا نہیں چاہتے۔ سال دو سال بعد چکر لگاتے ہیں اور جلد ہی لوٹ جاتے ہیں۔ دوسری بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ بیٹی اپنے گھر کی ہو چکی ہے اور بھوپال میں آسودہ زندگی گزار رہی ہے۔ کبھی کبھی میکے آ جاتی ہے۔

"پھر تو گھر میں پنچھو بڑھ گئے ہوں گے۔"

"جی' جی ہاں مگر نہیں' ایسی تنہائی تو نہیں' گھر تو اللہ رکھے بھرا ہوا ہے' نوکر چاکر ہیں' دوست احباب کا جمگھٹا رہتا ہے۔ ایک بوڑھی رشتے دار خاتون بھی ساتھ ہیں' جی لگا رہتا ہے۔"

"پھر کانا کھینچ لیا کیا؟"

"جی' جی کیا فرمایا آپ نے؟"

"تیسری کوئی نہیں کھوج پھر؟" "شکر ہے'" بٹھل کا لہجہ طنز سے عاری تھا۔ "اچھا کیا۔"

"ایک ثانیے کے تردد کے بعد سید صاحب جھک کے بولے۔ "تیسری بھی ممکن تھی بس یوں سمجھیے ستارے نہیں ٹکرائے' جو نہیں پائی' ہو بھی سکتی ہے۔ آپ فرمائیے' آپ نے تو اپنے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں؟"

"کچھ بولنے کا ہو تو منہ کھولیں۔"

"کتنے بچے وغیرہ۔۔۔۔۔۔؟"

"بہت سارے۔"

ماشاءاللہ" "کتنے؟" سید صاحب نے اشتیاق سے پوچھا۔

"میا بولیں' گنتی یاد نہیں۔"

"یہ بھی خوب رہی' سید صاحب نے قہقہہ لگایا اور سنجیدگی سے بولے۔ "زیادہ بچے رحمت بھی ہیں' زحمت بھی' اور یہ کچھ بیوی کا ہے۔ آج تک سمجھ میں نہیں آیا' ہونے یا نہ ہونے میں کون سی صورت زیادہ اچھی ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"اپنے کو سچ پوچھو تو کچھ پتہ نہیں۔"

"آپ کا تجربہ کیا ہے؟"

"کبھی فرصت ہی نہیں ملی صاحب!"

"آپ کے چہرے پر بہت تجربے لکھے ہیں۔"

"اپنے کو پتہ نہیں' آپ پڑھے لکھے آدمی ہو۔"

"لگتا ہے' زندگی بہت جھیلی ہے آپ نے۔"

بٹھل بے حرکت بیٹھا رہا۔

"یہ بابر میاں! آپ نے بتلایا ہی نہیں کہ ان سے کیا عزیزداری۔۔۔۔۔؟"

"کبھی کچھ۔"

"وہ تو نظر آ رہا ہے' پھر بھی۔۔۔۔۔"

"چھپا چھپلا ضروری ہے کیا؟"

"نہیں' بے شک نہیں۔"

"پھر جو آپ سمجھو' وہی ٹھیک ہے۔"

"مناسب ہے۔" سید صاحب خفیف سے ہو گئے کہنے لگے۔ "ہماری گفتگو سے بابر میاں بے آرام ہو رہے ہوں گے' آئیے باہر چلتے ہیں۔"

میں نے بہ وقت کہنے کی کوشش کی کہ وہ بھی کریں' بہتر ہے' یہیں بیٹھیں۔

لیکن سید صاحب اٹھ گئے۔ "ملازم نصیر بابا کمرے کے باہر رہیں گے۔ دوسرے ملازموں کو بھی ہدایت کر دی ہے۔ کسی فوری ضرورت کے لیے مہمان خانے میں مختصر سا باورچی خانہ بھی ہے۔ نصیر بابا کو اشارہ کر دینا۔" انھوں نے میری جلتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور رہے۔

"مہمان ادھری آ کے تو پیچھے کا سارا بھول جاتا" بٹھل نے چٹکی بھرنے والے انداز میں کہا۔

"نہیں صاحب! اپنی اپنی مصروفیت میں گھر سے لوگ آتے ہیں۔ میری تو بس یہی تمنا رہتی ہے کہ کوئی ناخوش نہ جائے مگر یہ کوئی بہت بڑا شہر تو ہے نہیں پاس اچھے شاداب مقامات ہیں لیکن بمبئی' کلکتے کی رنگینیاں تو یہاں نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں' لوگ عزت افزائی کے لیے اس طرف کا رخ کرتے ہیں۔ کام کی غرض سے' کچھ خاص تعلقِ خاطر کی وجہ سے حضرات سکون کی تلاش میں غریب خانے کو ترجیح دیتے

پہلے ندوے کے ایک عالم کتاب لکھ رہے تھے،
کی ضرورت تھی۔ یہاں تشریف لے آئے،
مہینے قیام رہا۔ انھی دنوں دوسرے کمرے میں
استاد دل شاد خاں ٹھیرے ہوئے تھے۔ صبح و
میں بند ہو کے ریاضت کرتے تھے۔ افسر، مصوّر،
قسم کے لوگ، تفصیل کیا عرض کروں۔"
ہر ایک کو کھلی چھٹی ہے کیا؟"
ایک کو نہیں، معاف کیجیے، یہ سرائے یا ہوٹل نہیں
محبت کی ایک رسم ہے، محبت کا ایک سلسلہ ہے جو
جاری رہے گا۔"
کوئی کانٹا تو رکھا ہو گا آپ نے؟"
سب سے بڑی ترازو ہوتی ہے، نظر آجاتا ہے
پرکھ ہو گئی ہے۔" سیّد صاحب نے انکسار سے کہا۔
پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔"
صاحب نے فوراً "کوئی جواب بن نہ پڑا" بے ترتیبی
"آدمی بھی تو کوئی چیز ہوتا ہے۔"
تو دکھائی نہیں دیتے چاہئیں صاحب! کسی ترازو پر
نہیں اُترتے۔"
صاحب کے جسم میں تموّج سا نمودار ہوا۔ "آپ
ہیں جناب! یہ کسرِ نفسی بھی خوب ہے، جانے
لیجیے، آپ ہمیں اچھے لگے، دوسروں سے الگ۔"
نے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "دھوپ میں تو
نہیں ہو رہے۔"
ابھی پورے پکّے بھی نہیں ہوئے۔"
اللہ کب سے ہو چکی ہے، باقی کتنے دن کے ہیں۔"
کوئی نوشتی والا بھی ٹکرایا ہو گا؟"
صاحب کی پلکیں مرتعش ہو گئیں، اضطراری لہجے میں
"جی ہاں۔ مگر ایک دو بار ہی پیار ہوا۔ اصل
آدمی اتنا متحمّل نہیں ہوتا، مگر آپ، آپ یہ کیوں
ہیں؟"
ہی صاحب! اپنے بارے میں سوچتے ہیں۔"
مت سوچیے اور آیئے، باہر کھلی ہوا میں بیٹھتے ہیں۔
سہانا ہے، بارش کی بھی اپنی مستی ہوتی ہے۔"



بخار اور سر درد کی شدّت کے باوجود مجھے اُن کی باتوں میں لطف آ رہا تھا۔ باہر سے ایّن کے آجانے پر سیّد صاحب اس کی طرف متوجّہ ہو گئے۔ ایّن دوا کی شیشی بلکہ شیشیاں اور گولیاں لایا تھا۔ اُس کے پاس پرہیز کا مکمل گوشوارہ بھی تھا۔ چارٹ پر ایک نگاہ ڈال کے سیّد صاحب سرہلاتے رہے اور ایّن کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے اُسے باہر لے گئے۔ کمرے میں کچھ دیر سنّاٹا سا ہو گیا۔ میری آنکھیں بند ہو گئی تھیں کہ کسی کی چاپ سے کھل گئیں۔ وہ ملازم نصیر بابا تھے۔ دبے قدموں چلتے ہوئے وہ میرے سرھانے آکے بیٹھ گئے اور سر دبانے لگے۔ میرا سر پھٹا جا رہا تھا۔ اتنے عمر رسیدہ شخص کو یہ زحمت دینا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے بہت منع کیا، وہ نہیں مانے۔ اُن کے ہاتھ سخت کھردرے تھے لیکن دباؤ میں بلا کی نرمی تھی۔ انگلیاں بھی بولتی ہیں۔ کہتے ہیں تو استاد کی اپنی موسیقی کے اظہار پر قادر ہوتے ہیں۔ مجھے قرار سا آ گیا۔ ایسی غفلت طاری ہوئی کہ رات گئے آنکھ کھلی۔ ان دواؤں میں یقیناً کوئی نیند آور دوا بھی شامل کی ہو گی۔

سیّد صاحب نے کوئی مبالغہ نہیں کیا تھا بلکہ واقعہ سے کچھ کم ہی بیان کیا تھا۔ کسی بڑے ہوٹل میں یہ اہتمام اور اسپتال میں یہ نگہداشت ممکن نہ ہوتی۔ مطب جانے سے پہلے ڈاکٹر عرشی معائنہ کرنے آتا اور مطب ختم کرکے رات کو ایک بار پھر چکر لگاتا۔ سیّد صاحب بھی دن میں متعدد بار کم وقت کے لیے سہی مگر پوچھ گچھ کے لیے آتے رہے۔ بوڑھی ملازمہ اصل گھر سے ہلکی پھلکی غذائیں اور پھلوں کا تازہ رس لاتی رہی۔ ایّن اور دوسرے ملازم بشارت اور نذرو بھی بہت مانوس ہو گئے تھے۔ نصیر بابا نے مچھر دانی لگا کے اپنی

چارپائی راہ داری میں دروازے کے ساتھ بچھائی تھی۔ وہ میری ایک صدا' ایک آہٹ پر مستعد ہوجاتے تھے۔ بھمل نے حسبِ عادت' ملازموں کے انکار کے باوجود جانے کتنی رقم اُن میں تقسیم کی تھی اور انھیں باور کرادیا تھا کہ سیّد صاحب کو ان عنایات کی بھنک نہیں پڑنے دی جائے گی۔ مال و زر تو مستزاد ہے' روپے کا ریشم آدمی کو زیادہ آسودہ رکھتا ہے۔

بھمل کا بیش تر وقت میرے پاس کمرے میں گزرتا یا پھر وہ سیّد صاحب کے ساتھ گھنٹے دو گھنٹے کے لیے باہر چلا جاتا۔ کوئی اور ہوتا تو جانے کن کن موضوعات پر نصیر بابا سے اس کی کھسر پھسر ہوتی رہتی۔ نصیر بابا نے اس کے لیے حقّے کا انتظام کردیا تھا۔ اُن دونوں کے تعلقات دیکھ کے لگتا تھا کہ برسوں سے آشنائی ہے۔

چوتھے دن کہیں بخار کا زور ٹوٹا' پانچویں دن میں اس قابل ہوگیا کہ کمرے سے باہر دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی آرام کرسیوں پر بیٹھ سکوں۔ پانچ چھ روز میں تقریباً سارے ملازم بھمل کے مصاحب ہوچکے تھے۔ بھمل کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اُن کی خاطر مدارات سے تنگ آجاتا۔

سیّد صاحب کے ہاں آئے ہوئے چھ دن ہوچکے تھے' لگتا تھا جیسے مہینے گزر چکے ہیں۔ چھٹے دن میری طبیعت خاصی بہتر ہوگئی تھی۔ نصیر بابا بہت خوش تھے۔ وہ صبح مہمان خانے کے عقب میں پھیلے ہوئے سبزہ زار میں چہل قدمی کے لیے مجھے لے گئے۔ بڑی دل کش جگہ تھی۔ چار دیواری کے ساتھ مختلف پھلوں اور پھولوں کے اونچے نیچے درخت' وسط میں قالین کے مانند سبزہ' کیاریوں میں آراستہ بڑے بڑے رنگ برنگے گلاب۔ ایک گوشے میں مغل طرز کی جالیوں کی دیوار کے پیچھے ملازموں کے مکانات تھے۔ بیلوں نے آدھی دیوار ڈھانپ رکھی تھی۔ شام کو سنگترے کا رس اور سبزی کے کباب کھانے اور دوا کی خوراک نگلنے کے بعد سبزہ زار میں جانے کو میرا جی مچلنے لگا۔ چھ دن کی قید کے بعد آج رہائی ملی تھی۔ میں تو اس مکان سے دور بازاروں اور گلیوں میں جانا چاہتا تھا لیکن ڈاکٹر کشن نے راہ داری کے سوا اور کہیں چلنے پھرنے کی سختی سے ممانعت کی تھی۔ اُس کے احکام کی تعمیل ہی لازم تھا کہ اب جسم قابو میں محسوس ہورہا تھا۔ اس نے تنبیہہ کی تھی کہ ذرا سی تکان سے بخار لوٹ سکتا داری سے چند قدم کے فاصلے پر سبزہ زار تھا۔ میں سے وہاں چلنے کی فرمائش کی' پہلے تو انھوں نے کردیا' پھر جلد ہی کچھ اپنی محکومی کے احساس سے خوشنودی کی خاطر آمادہ ہوگئے۔ شام کے وقت سماں اور فرحت انگیز تھا۔ نصیر بابا کے پاس باتوں کی تھی' اتنے قصے کہانیاں یاد تھیں اور زندگی کے معمولا ایسے تجربے ازبر تھے کہ آدمی بس سنتا رہے۔ باتوں پتہ ہی نہیں چلا' ہم دور آگئے۔ صحن اس طرف تھے۔ چلتے چلتے یکایک نصیر بابا کو خیال آیا اور وہ منتشر ہو

"واپس چلتے ہیں میاں! اِدھر سے زنان خانے کا حصّہ ہوجاتا ہے۔"

میں مہمان خانے کی سمت پلٹا ہی چاہتا تھا کہ سامنے ہاتھ کی جانب عمارت کے تکونی گوشے میں پہلی منزل محرابی دریچے کے پٹ کھلنے اور پردہ کھسکنے کی آواز قدم ٹھٹک گئے۔ آنکھیں بھی سماعت رکھتی ہیں۔ غیر ارا طور پر میری نگاہ نے دریچے کا تعاقب کیا۔ کوئی شاعر برملا شاید یہی کہتا' جیسے ماہ تاب دریچے میں اُتر آیا ہو۔ وہ چھپاکا سا تھا۔ تپتا ہوا سرخ و سپید کتابی چہرہ' تیکھے نقش سانچے میں ڈھلے ہوئے' بڑی بڑی آنکھیں' بے ترتیب بال' کُرتا سفید تھا' دوپٹا سبز رنگ کا' کانوں میں آویزے جھول رہے تھے۔ وہ ایک حسین لڑکی تھی۔ دونوں کی نظریں ایک لمحے کے لیے چار ہوئی تھیں کہ دن میں وہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔ میں دیکھتا رہ گیا۔

نصیر بابا نے بھی اسے دیکھ لیا تھا' آہستگی سے میرا ہاتھ کے وہ مہمان خانے کی جانب مڑ گئے۔ معمول کی طرح نے بھی اُن کی پیروی کی۔ چند لمحوں کے لیے میں آپ سے بیگانہ ہوگیا تھا۔ واپسی کا باقی رستہ خاموشی گزرا۔ نہ نصیر بابا نے کوئی کلام کیا' نہ مجھ میں اُن سے کی جرأت ہوسکی۔ منظر کی تبدیلی سے مراد منظر کی نہیں ہے۔ بعض منظر آنکھوں میں جذب ہوجاتے کیمرے سے کھینچی گئی تصویر کی طرح۔ میرے سبزہ زار سے پہلے سیّد صاحب بھمل کو کہیں لے گئے تھے' وہ

نہیں آیا تھا۔ مجھے واقعی تھکن محسوس ہو رہی
میں آ کے میں بستر پر دراز ہو گیا۔ ملازمہ اصل
نے حسبِ معمول کسی چیز کی ضرورت کے لیے
استفسار کیا اور میری طرف سے معمول کا جواب سُن
گئے۔ میں کمرے میں تنہا دیر تک آنکھیں موندے
جب بستر جسم میں چبھنے لگا تو باہر راہ داری میں آ کے
پر بیٹھ گیا۔ شام اندھیرے میں ڈوب رہی تھی۔
کے باوجود ملازم ابّن نے میرے پیر دبانے شروع
خدمت گاری بھی شاید جزوِ جاں بن جاتی ہے۔
صحت کی بحالی پر خدا کا شکر ادا کرتا اور مسرّت کا
رہا اور سادگی سے کہنے لگا کہ اُسے میرے اچھے
کی جتنی خوشی ہے، اتنا ہی یہ سوچ کے وحشت ہوتی
چند دن بعد میری طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی تو
بُھل یہاں سے چلے جائیں گے۔ بُھل کو سارے
کہتے تھے۔ ابّن بہ طورِ خاص اُسے بابا صاحب، بابا
کے لقب سے مخاطب کرتا تھا۔ ابّن کی آواز میں کوئی
نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ کہہ رہا تھا کہ مہمان تو آتے
آتے ہی رہتے ہیں، بڑے بڑے اُونچے لوگ، لیکن
دوں جیسے آج تک نہیں آئے۔ میرا تو خیر کیا ذکر تھا، میں
کے لیے مسلسل بوجھ بنا ہوا تھا اور میں تو اتنے دن بستر
میں بدلتا، ایذا تا ہی رہا تھا۔ بُھل ہی سے اُن کی راہ و
ہوئی تھی۔ میرے جی میں آیا کہ ابّن سے زنان خانے
والوں کے بارے میں کچھ ٹوہ لوں۔ سیّد صاحب نے گھر
رشتے کی ایک عمر رسیدہ خاتون ہی کا ذکر کیا تھا، باقی
لوں کا، البتّہ اُنھوں نے مبہم انداز میں یہ بھی کہا تھا کہ
بھی لوگ ہیں۔ ممکن ہے، زنان خانے میں مہمان خواتین
ٹھہرتی ہوں، سیّد صاحب کی عزیز رشتے دار خواتین۔
نے ابّن سے کچھ نہیں پوچھا اور خود کو روک لیا کہ مجھے
کیا جستجو ہے۔ وہ لڑکی کوئی بھی ہو، مجھے اس سے کیا
؟ میں نے کسی حد تک خود کو مطمئن کر لیا تھا لیکن
کیوں وہ دریچہ میری آنکھوں سے دور نہیں ہوتا تھا۔
کا کچھ جواز بھی تھا۔ اُس لڑکی کے چہرے پر اضطراب
اذیت چھائی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھیں بھی بے تاثر

نہیں تھیں۔ سوچتی ہوئی، کھوئی ہوئی آنکھیں۔ میں اس کیفیت کو کوئی نام دینے میں اُلجھتا رہا۔

بُھل کوئی آٹھ بجے واپس آیا۔ اس رات اس نے کمرے ہی میں کھانا کھایا۔ معلوم ہوا کہ سیّد صاحب کسی خاص دوست کے ہاں مدعو ہیں۔ بُھل کا توشہ تو خاص الخاص تھا، میرے پرہیزی کھانے میں بھی کچھ کم اہتمام نہیں تھا۔ مرغ کا شوربہ، مونگ کی دال کی پتلی کھچڑی، چپاتی، سلاد، دہی اور پھلوں کا رس، میٹھا دلیا بھی۔ مجھے رات کی خوراک پلانے اور بُھل کے لیے تازہ حقّہ لانے کے بعد روشنی کم کر دی گئی۔ نصیر بابا سب سے آخر میں رخصت ہوئے۔ وہ دروازہ پوری طرح بند نہیں کرتے تھے تاکہ کسی ضرورت کے لیے ہماری آواز، باہر راہ داری میں دروازے کے ساتھ بچھی ہوئی اُن کی چارپائی تک پہنچ جائے۔ تمام کھڑکیوں اور دروازوں پر جالیاں لگی تھیں۔ ہمارے کمرے میں آمد و رفت کے راستے پر دو دروازے آگے پیچھے نصب تھے، دوسرا جالی دار تھا۔ چاروں طرف سبزے کی کثرت کی وجہ سے کیڑوں مکوڑوں کی بہتات ہو سکتی تھی مگر نصیر بابا کے کہنے کے مطابق ہفتے میں ایک بار ولایتی کیڑے مار دوا کے چھڑکاؤ اور کھڑکیوں دروازوں پر کھنچی ہوئی جالیوں سے عمارت کا اندرونی حصّہ محفوظ رہتا تھا۔

اس وقت دیواری گھڑی نے گیارہ کا گھنٹہ بجایا تھا۔ بُھل حقّہ کشی میں مصروف تھا۔ کہتے ہیں نیند کے لیے کوئی شرط نہیں، نیند کا اپنا تو رب ہے۔ بُھل کی آنکھوں میں بھی نیند آ رہی ہے۔ میرا ذہن جانے کہاں کہاں بھٹک رہا تھا اور نیند بھی پیچھا خالی کر رہی تھی۔ اچانک جالی والا دروازہ چرچرایا۔ نصیر بابا نے ابّن کو ہدایت کی تھی کہ وہ دروازے کے قبضوں میں تیل ڈال دے، کسی طور تو یہ تکلیف دہ آواز ختم ہو۔ روشنی کے باوجود پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی۔ وہ نصیر بابا تھے، چوروں کی طرح کمرے میں داخل ہوئے۔

"بابا" انھوں نے سرگوشی میں بُھل کو پکارا۔ "سو تو نہیں گئے؟"

"نہیں بھلا، ادھر رات کو کبھی نیند سو جاتے ہیں اپنے سے تو بہت کھیلاں کرتی ہے، پر ایک دن تو..." بُھل نے گہری آواز

میں کہا۔ "تم بولو' آگے پیچھے سب ٹھیک ہے تو کھینچ لاؤ اس کو۔"

"یہی پوچھنے کو آیا ہوں۔" نصیر بابا کے لہجے سے سراسیمگی عیاں تھی۔ "میں نے اس کو بول دیا ہے' اچھی جی دار ہے' پر ڈر رہی ہے بہت۔ میں نے بڑی کمر تھپکی' دلاسے دیے کہ بڑے صاحب جلدی نہیں آئیں گے' محفل میں گئے ہیں۔ اُسے بھی معلوم ہے' کبھی کبھی تو سویرے ہی پلٹتے ہیں۔"

"اس کو بولا نہیں' بڑے صاحب بیچ میں آجائیں تو کیا ہے' دیکھ لیں گے پھر۔" بٹھل نے بے پروائی سے کہا۔

"میں نے بولا تھا' وہ تو کانپ گئی۔ آنے سے انکار کرنے لگی' میں نے سمجھایا' پھر یہ وقت نکل جائے گا' اچھی طرح سوچ لو' تیار ہو گئی۔"

"پھر دیری کاہے کرت ہو؟" بٹھل نے پوربی لہجے میں کہا۔

"یہیں' یہیں..... میرا مطلب ہے' یہیں لے آؤں؟" نصیر بابا ہچکچاتے ہوئے بولے۔ وہ بہت گھبرائے ہوئے تھے۔

"اور کدھری پھر؟" بٹھل نے تندی سے کہا۔

"کوئی دوسرا کمرا کھول دیتا ہوں' یہاں تو اپنے میاں....."

"نہیں' ادھری لے آؤ' بڑے صاحب گھر لوٹیں گے تو اس ٹائم ادھری رخ نہیں کریں گے۔"

"اور کیا پتہ کس حال میں ہوں۔"

"یہ تو تم اچھا جانتے ہو۔"

نصیر بابا یہ کہہ کے کہ وہ تھوڑی دیر میں واپس آتے ہیں' اسی لمحے کمرے سے چلے گئے۔ مجھ سے بستر پہ لیٹا نہ جا سکا۔ میں نے طے کیا تھا کہ بٹھل سے سوال کم ہی کیا کروں گا' جواب اس کی مرضی پر ہوتا ہے' خواہ مخواہ' پھر مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے لیکن میں خود کو نہ روک سکا۔ "کون آ رہا ہے؟ یہ کیا ہے؟" میں نے جھنجلاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"دیکھتے ہیں رے ابھی۔" وہ حقے کا کش لیتے ہوئے بولا۔

"کون ہے وہ؟ مجھے کیوں نہیں بتاتے؟"

"ابھی سارا تمرے سامنے آجائے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے ترشی سے کہا۔ "مگر مگر....."

میں ہونٹ چبا کر رہ گیا۔

یہی بہتر تھا کہ آنے والے لمحوں کا انتظار کیا جا... وہ مجھے اب تک کوئی بچہ سمجھتا ہے یا اُسے میری ... پر شبہ ہے' اُس کی دانست میں' میں ایک ... ہوں' اسی لیے وہ مجھ سے صحیح طرح بات نہیں کرتا ... بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن کوئی سرا مجھے نہیں ... تھا۔ کون اسے باور کراتا کہ جتنا وہ مجھ میں شامل ... اس سے کچھ سروکار رکھتا ہوں۔ اسے بالکل احساس ... کہ اس کے اس رویئے سے دوسرے کو کتنی اذیت ... ہے' اور دوسرا کوئی اور نہیں وہ میں ہوں۔

نصیر بابا کو گئے دیر ہو گئی۔ گھڑی نے ساڑھے گیارہ کا ... بجایا۔ یقیناً زنان خانے سے کوئی آ رہا ہے۔ وہاں ... خانے کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں ہے۔ میری نظریں دروازے ... جمی ہوئی تھیں۔ ایسی خاموشی تھی کہ قدموں کی ہلکی سی ... کمرے میں در آئے۔ بٹھل دوبارہ بستر پہ دراز ہو گیا۔ ... میال اس کے ہونٹوں سے چپکی ہوئی تھی۔ وقفے وقفے ... حقے کی گڑگڑاہٹ کمرے میں گونجتی رہی۔ میں پلنگ ... سرہانے کمر ٹکائے بت بنا بیٹھا رہا۔ گھڑی کی ٹک ٹک ... مجھے بیزاری ہونے لگی تھی۔

چند منٹ اور گزر گئے۔ میں نے پلنگ کے پاس رکھی ہوئی میز سے جگ اٹھا کر آدھا گلاس پانی پیا اور اس طرح ... گزارنے اور حواس یکجا رکھنے کی کوشش کی۔ بارہ ... سے اوپر ہو گئے۔ اب رات بہت ہو گئی تھی اور کسی کی آ... امکان کم ہوتا جا رہا تھا مگر بارہ نہیں بجے تھے کہ مجھے راہداری میں سرسراتی چاپوں کا گمان ہوا۔ عام دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ... پھر بعد جالی والے دروازے کی چرچراہٹ سنائی دی۔ میں سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ نصیر بابا نے دروازے سے جھانک کر پہلے اطمینان کیا' پھر دبے قدموں اندر آ کے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔ "بابا میں آ گیا ہوں۔"

ہاں ہاں دیکھ لیا ہے۔ بٹھل بھی بستر پہ بیٹھ گیا۔

"آجاؤ آجاؤ۔" نصیر بابا نے اپنے پیچھے سرمئی چادر میں لپٹی ہوئی لڑکی یا عورت کے شانے پر ہاتھ رکھ کے تقریباً اسے دھکیلا۔ اُس کی حالت اضطرابی' سیمابی سی تھی۔ جیسے ہی وہ اندر آئی' انہوں نے پلٹ کے جھٹ عام دروازے کی





...ادی۔ "بیٹھ جاؤ' بیٹھ جاؤ' تسلی سے۔" نصیر بابا کی ...ک رہی تھی۔ "یہ ہیں اپنے بابا صاحب اور یہ' یہ ...صاحب' بابر میاں۔ میں نے تم کو ان کے بارے میں ...دیا ہے۔ اب گھبراؤ بالکل نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں ...ے کی۔"

...لے تو سکڑی سمٹی دروازے کے پاس کھڑی رہی' پھر ...با کی مسلسل تلقین و تاکید پر اُس نے اپنی جگہ سے ...ی اور جھجکتے' اکھڑتے قدموں سے کونے میں رکھے ...صوفے پر ایک جانب بدن چُراتے ہوئے بیٹھ گئی۔ اُس ...ر کے آنچل سے آدھا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا' چادر سے ...ہی چھپی ہوئی تھی۔ صرف اُس کی سیاہ اور پھیلی ہوئی ...یں نظر آرہی تھیں۔ بھِل کی طرف سے روشنی تیز ...کی ہدایت پر نصیر بابا کو کسی قدر تامل ہوا تھا لیکن اُنھوں ...یل کردی۔ روشنی بھی حیرت' خوف اور رنج و الم کچھ ...نے کا سبب ہوتی ہے۔

...ب ادھری آگئی ہو تو آرام سے بیٹھو۔" بھِل نے بستر ...لو کے نرمی سے کہا اور صوفے کے قریب کرسی پر بیٹھ ..."ادھری تمھارے آجانے سے لگتا ہے" نصیر بابا نے کم ...والا ہے۔"

وہ صوفے میں دبکی بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ بولو "نصیر بابا نے پچکارتے لہجے میں کہا۔ "اپنے کو جتنا پتہ تھا" ...صاحب کو بتا دیا ہے لیکن اصل بات تو تمھاری ہے۔ تمھی ...زبان سے بولو تو اچھا ہے۔"

وہ کوئی لڑکی ہی تھی۔ اُس کا سر اور جھک گیا اور ہونٹ ...نے لگے۔ پھر جانے اُسے کیا ہوا؟ وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ ...ے نصیر بابا لپک کے اس کے پاس پہنچے' ادھر سے بھِل ...لک

نے اُٹھ کے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھا تو وہ اور بکھر گئی۔ نصیر بابا جلدی سے پانی کا گلاس لے آئے۔ اور مشفقانہ انداز سے بولے کہ وہ حوصلہ رکھے اور یقین کرے کہ ہم دردوں میں آئی ہے۔ خیال رہے کہ اُسے زنان خانے میں' جتنی جلد ہوسکے' واپس پہنچنا ہے۔ اگر اس نے یوں ہی چپ سادھے رکھی اور روتی رہی تو کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا' یہ وقت نکل جائے گا۔

نصیر بابا کے اصرار پر اس نے بہ مشکل گھونٹ بھر پانی پیا۔ اُس کی چادر اس دوران میں چہرے سے ہٹ گئی تھی اس نے دوبارہ چہرہ ڈھانپنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ وہ لڑکی نہیں تھی جس کی ایک جھلک میں نے سرِ شام زنان خانے کے دریچے میں دیکھی تھی۔ چودہ' پندرہ سے زیادہ اس کی عمر نہیں ہوگی۔ نکلتا ہوا قد' شفق رنگ رخسار' ستواں ناک اور ترشے ہوئے ہونٹ۔ اسے دیکھ کے بے اختیار مجھے نیساں یاد آگئی۔ نیساں کے چہرے پر بھی ایسی ہی ملاحت اور معصومیت تھی۔ وہ بھی ایسی ہی نازک تھی' پھول کی پنکھڑی کی طرح۔ فرق ... دونوں کے فرق تھا جو فرق پھولوں میں ہوتا ہے۔

"یہ تو ایک نرم مورتی کی طرح ہے۔" بھِل نے بے ساختہ کہا۔

"سچ بابا صاحب' کیا بولوں' دونوں بہنوں کو اللہ میاں نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے" ... "ایک کو اُٹھاؤ' دوسری کو بٹھاؤ۔ ... ایک سے بڑھ کے ایک۔" نصیر بابا تو بھر کے بولے۔

دوسری بہن کے ذکر پر میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہ دریچے والی لڑکی' کہیں اس کی بہن تو نہیں؟ دونوں میں ایک شباہت ضرور ہے۔ میں بستر سے اُٹھ کے بھِل کے پاس جا بیٹھا۔

"کیا نام ہے ری تیرا؟"

لڑکی کے ہونٹ پھڑک کے رہ گئے۔

"بولو بٹیا بولو' بابا صاحب کیا پوچھتے ہیں' اطمینان رکھو' تم اپنوں میں ہو' یہاں کوئی غیر نہیں ورنہ میں تم کو یہاں کیوں لاتا۔" نصیر بابا شکایت آمیز مربیانہ لہجے میں بولے۔

بنھل نے دوبارہ لڑکی کا نام پوچھا تو اس نے زیر لبی سے یاسمن بتایا۔

"یاسمن!" بنھل نے مجھے مخاطب کر کے پوچھا۔ "کیا بولتے ہیں اس کو' کوئی پھول نا؟"

"ہاں' چنبیلی۔" میں نے کہا۔

بنھل نے اپنا بھاری سر ہلایا۔ "اور بڑی کا؟" اس نے یاسمن سے پوچھا۔

"فروزاں۔" وہ پژمردگی اور ناتوانی سے بولی۔

بنھل نے اس بار مجھ سے فروزاں کے معنی نہیں پوچھے۔ نصیر بابا کچھ کہنا چاہتے تھے کہ بنھل نے ہاتھ اٹھا کے انھیں روک دیا اور تھمی ہوئی' تھکتی ہوئی آواز میں یاسمن سے کہا کہ جس استقامت سے اس نے یہاں آنے کا عزم کیا ہے' یہی عزم و جرأت اسے اور فزوں کرنا ہے۔ ہو سکتا ہے' یہاں آنے کے بعد ہم سے مل کے' ہمیں دیکھنے کے بعد اسے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہو۔ اس کے خیال میں ہم وہ لوگ نہ ہوں جن کی اسے تلاش ہے۔ اسے ہماری توفیق و استطاعت پر کوئی شبہ ہے یا ہم اسے معتبر و محترم لوگ نظر نہیں آ رہے ہیں تو ہماری جانب سے کوئی اصرار بھی نہیں۔ یہ بات اسے ذہن میں رکھنی چاہیے کہ خود اس نے ہمارے دروازے پر دستک دی ہے' ہم اس کے پاس نہیں گئے ہیں۔ تاہم یہاں آ کے اسے کوئی پچھتاوا ہو رہا ہے تو نصیر بابا موجود ہیں' وہ اسی وقت واپس جا سکتی ہے۔ اور وہ خاطر جمع رکھے' ہم اس کی آمد اور اس معاملے کا کسی سے ذکر نہیں کریں گے۔ ہمیں تو جلد از جلد یہاں سے چلے جانا ہے اور شاید دوبارہ اس شہر میں واپسی ممکن نہ ہو۔

یہ کیسی باتیں ہو رہی ہیں؟ میں ان تینوں کو بے چارگی سے دیکھا کیا۔ سب سے بڑی بے چارگی تو دیکھنے اور سننے کی صلاحیت سے متصف ہونے کے باوجود کچھ نہ سنائی اور دکھائی

دینا ہے۔ میرا سر دُھنک رہا تھا۔ یاسمن نامی یہ لڑکی
اتنی رات کو اس کے یہاں آنے میں کیا رمز ہے؟
اس قسم کی صراحتوں کی ضرورت کیوں پیش آ رہی
بابا نے لڑکی کے بارے میں کیسا واقعہ بنھل پر
ہے۔ آخر اس پاکیزہ صورت' نازک اندام' ناتواں
افتاد کیا پڑی ہے؟ صرف اس قدر واضح ہو سکا
صاحب' ملازموں اور زنان خانے کے مکینوں کی اطلاع
یہاں آئی ہے۔ ظاہر ہے' کسی بڑی وجہ کے بغیر
نہیں اٹھا سکتی تھی۔ کچھ بنھل کا سرد و گرم مخاطب
میں آ رہا تھا۔ اسے بہ ہر حال عجلت ہونی چاہیے تھی
طرف کسی کے جھانکنے سے پہلے مناسب ہو گا' وہ زنان
واپس چلی جائے۔ بنھل کے سامنے زمانے کے
سے ناواقف' زندگی کی نیرنگیوں سے ناآشنا' ایک
لڑکی بیٹھی تھی۔ اجنبی مردوں کے درمیان اس طرح
ہونے کا تجربہ یاسمن کو پہلے کبھی نہیں ہونا چاہیے۔ اس
امتناع نہایت فطری تھا۔ اپنے حواس کی یک سوئی اور
کی استواری کے لیے اسے کچھ وقت تو لگنا چاہیے تھا
صورتوں میں' جیسا کہ بنھل نے اس سے کہا تھا
صورتِ دیگر وہ کسی بھی لمحے زنان خانے واپس جانے
کر سکتی ہے' مگر اب آ جانے کے بعد یہ فیصلہ اتنا آسان
نہیں تھا' وہ بیٹھی رہی۔ اس کی ذہنی کش مکش کا اندازہ
کی سرخ آنکھوں اور جلتے بجھتے چہرے سے کیا جا سکتا تھا

"اتنے دنوں میں کتنے بڑے بڑے لوگ مہمان خانے
آئے' میں نے تم کو کچھ بولا۔ اب آدمی دیکھ کے ہی
ہے بٹیا رانی!" نصیر بابا لجاجت سے بولے۔

"میں کیا' کیا کہوں۔" یاسمن کی چیختی آواز سینے میں
رہی تھی۔

"بابا صاحب کو بولو کہ تمھارے ساتھ کیا ہو رہا ہے
رہا ہے؟" نصیر بابا دل دہی کے لیے اس کے پاس ہی

"آپ نے نہیں بتایا؟" وہ کرب سے بولی۔

"لیکن تم بھی تو اپنی زبان سے ...."

بنھل نے نصیر بابا کو پھر روک دیا۔ "نہیں' اس کو
بولنے کی ضرورت نہیں' ہم سارا جان گئے ہیں۔" وہ

بولا۔ "ہم کو اتنا بول ری' آگے کیا مرضی ہے؟ ہم
کی بات کرو۔"
سن کے گلابی چہرے پر دھواں سا چھا گیا۔ "میں کیا
مجھے کچھ نہیں معلوم' بس کسی طرح ہمیں یہاں سے'
......" اس سے مزید کچھ نہیں کہا گیا۔
ٹھیک ہے۔" بتول کی آواز پگھلنے لگی۔
"ری آس پاس رشتے ناتے کا کوئی ہو تو بولو؟"
سن نے سر اٹھا کے ڈبڈبائی آنکھوں سے بتول کی
ھا اور چادر سے چہرہ چھپا کے بری طرح بلکنے لگی۔
"ارے" نصیر بابا نے بے تکلفی اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا'
تھپکیاں دیں اور بچوں کی طرح بہلانے پھسلانے
"اپنے آپ کو سنبھالو میری بٹیا! میری گڑیا! تم تو بڑی
ال ہو۔ یہ رونے کا وقت نہیں' کوئی دور نزدیک کا ہو تو
اب کو بولو۔"
سن بہت منتشر ہو گئی جیسے کسی آزمائش سے دوچار ہو یا
ی عذاب سے گزر رہی ہو۔ بہ مشکل اس نے خود کو
یا اور اٹکتی' لڑکھڑاتی زبان سے بتایا کہ اس کے والد
ل الدین سیفی کے کئی قریبی دوست' پٹنے' "لکھنؤ" ریاست
آباد اور دلی وغیرہ میں ہیں لیکن کوئی رشتے دار ہندوستان
یں ہے۔ اس کے عالم و فاضل' محقق و مجتہد دادا سیف
ین نوری کا تعلق ایران سے تھا۔ نوجوان دادا کے کسی
ون نے ان کے ایک مقالے پر انھیں عتاب شاہی سے
ت زدہ کیا کہ وہ فرار ہو کے ہندوستان آ گئے۔ یہاں مسلم
ی ورسٹی علی گڑھ میں انھیں فارسی زبان اور ادبیات کی
و تدریس کی عارضی ملازمت مل گئی۔ پھر وہ حیدر آباد
چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ ہندوستان میں ان کی
ل اولادیں ہوئیں' صرف ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہی زندہ بچ
دونوں کو انھوں نے اعلا تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا
کو عرصہ ہوا' انھیں اطلاع مل گئی تھی کہ توقع کے
س اُن کے مقالے پر دربار نے کشادہ قلبی و وسیع النظری
ت دیا ہے اور انھیں فضیلت کی سند سے نوازا ہے۔
امت پہلے اپنے آبائی وطن واپس جا سکتے تھے لیکن ریاست
آباد میں انھوں نے بڑی عزت و مرتبت حاصل کر لی

لیڈر

تقسیم برصغیر سے پہلے کا ذکر ہے۔ گاندھی جی کو کسی مخالف نے نہایت اشتعال انگیز خط بھیجا۔ بڑے سائز کے پورے تین صفحے گالیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ گاندھی جی نے تحمل سے سب کچھ پڑھا' پھر اطمینان سے خط کے صفحات میں لگی ہوئی پن نکال کے رکھ لی اور خط پھاڑ کے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ حاضرین حیران رہ گئے۔ کسی نے گاندھی جی سے پوچھا۔
"آپ نے خط پھاڑ کیوں دیا؟" گاندھی جی پن کی طرف اشارہ کر کے کہا: "کام کی چیز میں نے رکھ لی ہے۔"

تھی۔ وہ یہاں بہت خوش تھے۔ ہندوستان انھیں ایسا پسند آیا تھا کہ ترک وطن کا فیصلہ کر لیا تھا۔ البتہ چند ماہ کے لیے ایران جا کے انھوں نے اپنے ہم پیشہ و دیرینہ رفیق کار کے تعلیم یافتہ صاحب زادے سے بیٹی کی شادی کر دی تھی۔ بیٹی وہیں رہ گئی اور اپنے شوہر کے ساتھ پہلے عراق' پھر روس میں جا بسی۔ روس میں آباد ہونے سے پہلے یاسمن کی پھوپی اور پھوپا سے خوب رابطہ تھا۔ شادی کے بعد ایک مرتبہ پھوپی عراق سے اپنے میکے ہندوستان بھی آئی تھی۔ دادا نے بیٹی کی شادی کے سلسلے میں ایران کے دورے میں' اعلا درباری و سرکاری عہدے پر فائز ایک رشتے دار کی صاحب زادی سے اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے بات پکی کر لی تھی۔ چناں چہ کچھ عرصے بعد اپنی بہو کو بیاہ لانے کے لیے انھیں دوبارہ ایران جانا پڑا۔ بیٹے کی شادی کو سال بھر سے زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ زندگی کا باب تمام ہو گیا۔ ریاست حیدر آباد میں دادا نے ایک چھوٹی سی حویلی بنا لی تھی۔ والی دکن حضور نظام نے ان کے علمی و تحقیقی کام کی ستائش میں شہر کے قریب زرعی زمین کا ایک قطعہ بھی عطا کیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی انھیں ریاست کی طرف سے اعزاز و انعام ملتے رہتے تھے۔ یاسمن اور فردوس حیدر آباد میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کا ایک بھائی شیر خواری کے زمانے میں انتقال کر گیا تھا۔ دونوں بہنیں بھی ایران نہیں گئیں۔ ان کے والد جمال الدین سیفی بھی ہندوستانی ہو کے وہاں کے دل دادہ تھے اور اپنے والد [illegible] کے سچے پیرو کار تھے۔ وضع و مروت میں یکتا' نہایت خوش

گفتار، خوش شعار، اُن کا بیش تر وقت مطالعے میں گزرتا تھا۔ سیاحت کا شوق تھا اور ہندوستان کی قدیم تہذیب پر تحقیق کر رہے تھے۔ بڑی بہن فروزاں نے مشرقی علوم کی پہلی سند حاصل کر لی تھی۔ باپ اپنی بیٹیوں کے اتالیق بھی تھے۔ اردو اور انگریزی کے لیے انھوں نے گھر پہ استاد رکھے تھے۔ دونوں بہنوں کو خود بھی پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ حیدر آباد میں ان کا گھرانا آسودہ، عزت مندانہ زندگی گزار رہا تھا کہ نواب بھوپال کی پیش کش پر جمال الدین سیفی بھوپال آ گئے۔ وہاں ان کا جی زیادہ نہیں لگا تو دلی کا رُخ کیا، پھر لکھنؤ چلے آئے اور لکھنؤ سے پٹنا۔ پٹنے میں ان کی ملاقات سیّد صاحب سے ہوئی اور دونوں میں جلد ہی گہرے مراسم ہو گئے۔

نصیر بابا بھَل کے لیے حقّہ اٹھا لائے تھے لیکن بھَل نے ایک کش نہیں لیا۔ ہم تینوں خاموش بیٹھے یاسمن کی ٹوٹی پھوٹی آواز میں اُس کی رُوداد سن رہے تھے۔ کہتے ہیں، عورت کے آنسوؤں میں بڑی تپش ہوتی ہے۔ ایسی کم سِن، سادہ و معصوم لڑکی کے آنسو تو برداشت ہی نہیں ہو رہے تھے۔ بار بار یاسمن کی آنکھیں امڈ آتی تھیں۔ بار بار اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب جاتی تھی۔ اُس کے اسلوب میں یکسانی تھی نہ ترتیب لیکن اس ہذیانی و ہیجانی بیان میں بہت سوزش تھی۔ نصیر بابا کی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں۔ یاسمن نے ابھی تک اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں کسی حد تک بتایا تھا اور کسی غیر معمولی حادثے یا سانحے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اُس کے ماں باپ میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہا تھا مگر اس قسم کے تماشے تو آئے دن زندگی نہ جانے کتنے لوگوں سے کیا کرتی ہے۔ صرف اسی قدر ہوتا تو یاسمن کے لہجے میں ایسی دل گیری و دل سوزی نہ ہوتی۔ آگے یقیناً بہت کچھ مختلف تھا۔ اسے جاننے کی جستجو کے باوجود مجھے اس کی گرانی و ستم ناکی کا اچھی طرح احساس تھا۔ سننے والے کی مستعدی اور شمولیت سے بھی کہنے والے کا حوصلہ کچھ سوا ہوتا ہے۔ اس دوران یاسمن کی وحشت کچھ کم ہونی چاہیے تھی۔ ہم کتنے ہی اجنبی ہوں لیکن تماشائی تو نہیں معلوم ہوتے تھے۔ کہنے لگی کہ پٹنے میں سیّد صاحب کے مشورے پر اُس کے والد نے حیدر آباد جا کے دادا کی حویلی اور زرعی زمین کا سودا کر لیا۔

"بس رہی، بس کر۔" بھَل نے بھاری آواز میں ...

بھَل کی اس اچانک مداخلت پر وہ حیران و ...

چادر میں لپٹے اس کے سراپا میں تموّج سا نمودار ہوا۔

"اور وہ، وہ کون تھا بھلا؟" بھَل نے نصیر بابا ...

"اس کے باپ کے ساتھ والا جوان! کیا نام بولا تھا اس ...

"کون، کون بابا صاحب؟" نصیر بابا گڑبڑا گئے۔

"وہی، جس کا تم بولتے تھے، اس کے باپ کا ... نام بھی بولا تھا تم نے۔"

"وہ، وہ ظفر میاں، ہاں بابا صاحب!" نصیر بابا ...

"اس بے چارے نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی ...

"اس کا کوئی اَتا پتہ ہے تمھارے پاس؟"

"مل جائے گا، ضرور مل جائے گا۔" نصیر بابا ... رکھ کے بولے۔

بھَل نے ہنکار بھر کے سر ہلایا اور نصیر بابا کو ... وہ یاسمن کو واپس لے جائیں۔

"جی، جی بابا صاحب!" نصیر بابا بدحواسی سے ... بناتی پلکوں سے بھَل کو دیکھنے لگے۔

مجھے بھی بڑی حیرت ہوئی لیکن میری تب ... محل ہی نہ تھا۔ نصیر بابا دیر تک گم سم سے رہے۔ ... ہو گا کہ شاید بھَل کوئی اور حکم صادر کرے۔ بھَل ... کی مہَل ہونٹوں سے نکالی تھی۔ ناچار نصیر بابا نے یا... اٹھنے کا اشارہ کیا۔ یاسمن کا چہرہ بھی زرد پڑ گیا تھا۔ ... کے ٹوکنے پر اس نے جلدی جلدی چادر درست کی ... صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بھَل نے بھی کرسی ... کر دی۔ صوفے سے اٹھ کے یاسمن دروازے کی طرف ... گئی تھی کہ نصیر بابا نے اسے ٹھیرے رہنے کی تاکید کی ... دونوں کے پیچھے پیچھے بھَل بھی آہستہ آہستہ دروا... جا پہنچا اور یاسمن کے رُو بہ رُو کھڑا ہو گیا۔ چینی گرا... مختلا انداز میں دروازے سے سر نکل کے باہر بھاگ ... یاسمن ابھی کمرے میں تھی کہ بھَل نے اس کے سر ... پھیلا دیا۔ یاسمن کا سر اور جھک گیا۔ بھَل نے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور دھیمی آواز سے بولا۔ "اب ... آرام کرو، بڑی کو بھی سمجھا دینا۔"

یاسمن کی آنکھیں پھیل گئی تھیں، اس کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ بٹھل نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور تادیر اسے تکتا رہا، پھر یکایک اس نے ہاتھ بڑھا کے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

"نا" نا ری نا "بٹیا" ایسے نہیں، بالکل نہیں۔ آگے اچھے کا آسرا رکھ، ابھی ہم لوھری ہیں اور اب شاید جلدی جانا نہ ہو۔"

نصیربابا نے دروازے سے باہر جھانکنے ہی پر اکتفا نہیں کی، راہ داری میں جا کے بھی اطمینان کر لیا کہ یاسمن محفوظ طریقے سے زنان خانے واپس جا سکتی ہے۔ وہ اسے فوراً باہر لے گئے۔ میں جالی کے دروازے سے تھموں اور دیواروں کی آڑ میں چھپتے چھپاتے انھیں جاتے دیکھتا رہا، پھر وہ اندھیرے میں گم ہو گئے۔

کمرے میں جی نہیں لگا تو میں راہ داری میں آ گیا۔ ہر سو سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ مینڈکوں کی ٹرٹراہٹ سناٹا اور بڑھا دیتی ہے۔ بے ارادہ دروازے کے آس پاس بھٹکتے بھٹکتے میرے قدم خود بہ خود عقبی سبزہ زار کی طرف بڑھنے لگے۔ راہ داری کے سرے پر پکے فرش سے نیچے سبزے پر پاؤں رکھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ یہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ اس وقت اگر کسی کی نظر مجھ پر پڑ گئی تو؟ میرا دماغ ہی کام نہیں کر رہا تھا۔ واپس اپنے کمرے تک آ کے میں نصیربابا کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ انھیں گئے ہوئے دیر ہو گئی تھی یا مجھے گزرتے وقت کی رفتار کا شعور نہیں رہا تھا۔ مجھے نصیربابا کا انتظار تھا اور یہ بلاغت یا اعتیاد بھی میرے ذہن سے اوجھل ہو گئی تھی کہ اتنی رات کو کھلی راہ داری میں نصیربابا سے سرگوشیاں کسی طور مناسب نہیں۔ راہ داری میں قدموں کی آہٹ پر میں چونک پڑا۔ نصیربابا ہی ہوں گے۔ اس سے پہلے کہ اندھیرے سے نکل کر کوئی سامنے آتا، میں کمرے میں آ کے اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

ادھورا علم بہت خوار کرتا ہے۔ پورے علم کی آسودگی ہی بات اور ہوتی ہے یا پھر آدمی سرے سے کچھ جانتا ہی نہ ہو "اندھوں اور بہروں کی طرح" اور شاید نہ جاننا ہی جاننے سے بہتر رہتا ہے۔ مکمل آگہی کے بعد قرار و سکون کی کیا ضمانت ہے؟ یہ تو آگہی کی نوعیت پر منحصر ہے۔ بٹھل جاگ رہا تھا۔ کئی بار میں نے ارادہ کیا کہ ایک ... دیکھوں لیکن کسی ترشی و تلخی کے اندیشے ... اس رات مجھے نیند نہیں آئی۔ مجھے اپنے آپ ... تھی۔ صبح اذانوں کے وقت غنودگی طاری ہوئی ... میں ہونے والی کھڑکھڑاہٹ سے آنکھ کھلی ... ورزش بٹھل کا معمول تھا۔ نصیربابا بھی نماز ... گئے تھے۔

علی الصباح نصیربابا نے بٹھل کو بتایا تھا ... آخری پہر سید صاحب کی واپسی ہوئی ہے ... اطلاع کا مقصد یہ معلوم کرنا بھی تھا کہ بٹھل کے ... اہتمام کہاں کیا جائے۔ میرا، پرہیزی ناشتہ اسی کمرے ... تھا۔ بٹھل روزانہ سید صاحب کے ساتھ کھانے ... کمرے میں ناشتہ کیا کرتا تھا۔ سید صاحب کی عدم ... میں کھانے کے کمرے میں بٹھل کے تنہا ناشتہ کر... نہیں تھی۔ روشنی بڑھتے بڑھتے دوسرے ملازموں کی ... شروع ہو گئی تھی۔ کسی نے بستر درست کیا، چادریں ... کسی نے صفائی کی، پھر ابن اور اصل ناشتے کے ... آ گئے۔ کچھ کھانے کو طبیعت نہیں چاہ رہی تھی لیکن ... ہدایت کے مطابق دوا کی خوراک سے پہلے کسی قدر ... لازم تھی۔ طرح طرح کی چیزیں طشت میں سجی ہوئی ... میں نے تھوڑا سا دلیا لیا، دو ایک انگریزی بسکٹ اور ... چائے کے بعد کسی اور چیز کی طرف رغبت ہی نہیں ... بٹھل بھی خاصا الجھا ہوا لگتا تھا۔ اس نے بھی بس ... رسم نبھائی، پراٹھے اور آلو کی ترکاری کے چند لقمے ... کے دو چار چمچوں کے بعد ہاتھ کھینچ لیا۔ اس دوران ... بڑبڑاتا، شور مچاتا کمرے میں داخل ہوا اور میری طرف ... کے بجائے وہ بٹھل کے سامنے رکھے ہوئے طشت ... طشت پر جھپٹ پڑا۔ "اچ چھا تو آج یہاں میلا لگا ہے ... ٹھیک ہے، اپنے مہاراجا سید میاں تو رات کی محفل ... رہے ہوں گے۔ صاحب بہادر ڈی سی کی دعوت تھی ... نہیں۔ بڑی رنگ دار محفل ہوگی، بڑے بڑے ... درباری آئے ہوں گے۔ جلدی چھٹی کہاں ملتی۔" ... آواز میں خود کلامی کر رہا تھا، پھر یاسیت سے بولا۔ "جانا تو ...

واپس' رات کو اُدھر تالی بجاتے تو سویرے اُدھر
کار بچی ہوتی۔ یہ ڈاکٹری بھی سسری گلے کا
کانہ گھاٹ کا' ہے اپنے سیّد بادشاہ کو دیکھو' من
من اٹھا' چل پڑے۔ بہت چاؤ تھا میاں جی کو'
ڈاکٹری پڑھ لے۔ میں نے بولا' بھیا' اس کو آدمی ہی
دی ہونا تم کو بُرا لگتا ہے کیا؟ بات مٹھے میں آگئی۔
زمانے سے دیکھ ہی رہے ہیں۔" بھمل چپ
ڈاکٹر کو احساس ہوا تو چونک کے بولا۔ "کیا بات
آج آپ کا مُن بھی تھوڑا ٹھیک نہیں لگتا۔"
کو کیا ہوا؟" بھمل نے سیدھے ہو کے کہا۔
کل کدھری ہے اپنے پاس۔"
ہی ہونا چاہیے۔" ڈاکٹر اچھل کے بولا۔ "یہ کیا کہ
ذرا ٹیڑھی چلی اور آج چھیں' آج چھیں..... کیا
کیا کالج کا بنا' نواب کا لگا اپنے پاس آتا ہے۔
ویسے ہی بدنام ہے۔"
نے ازراہِ مروّت اس کی ہنسی میں ساتھ دیا۔ میرا
موقع دیکھ کے بھمل' سیّد صاحب کے بارے میں
شاید کوئی سلسلہ جنبانی کرے۔ اس نے چپ
رکھی۔ پھلوں اور بسکٹوں سے اچھی طرح شغل
کے بعد ڈاکٹر میری طرف متوجہ ہوا۔ اس نے دوائیں
بدلی اور غذا میں رعایت کر دی تھی۔ گزشتہ کل کا
اسے خدشہ تھا کہ بیماری پر بڑی حد تک قابو پالیا گیا ہے
کھوئی ہوئی توانائی کی بحالی کے لیے آرام' مقوی غذائیں
ائیں ازبس لازم ہیں۔ میں نے اسے یقین دلانا چاہا کہ
مجھے ذرا سی بھی کمزوری محسوس نہیں ہو رہی ہے' میں
بھلا چنگا ہوں۔ اس نے منہ بنا کے مجھے جھڑک دیا' کہنے
بڑی اچھی بات ہے لیکن جیسا وہ کہتا ہے' مجھے تعمیل
تے رہنا ہے۔ وہ مجھے مختلف مریضوں کے تجربات سنانے
مجھے آج نہ وہ اچھا لگ رہا تھا' نہ اس کی باتیں متاثر کر رہی
جی چاہتا تھا' اسے نکال باہر کروں۔ معمول کے خلاف
نے آج زیادہ وقت صرف کیا' بڑی مشکل سے وہ ٹلا
کے جانے کے کچھ دیر بعد' ساڑھے دس بجے کے قریب
بھمل' نصیر بابا کو ساتھ لے کے جانے کہاں نکل گیا' دونوں

نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ مجھے بتانا ضروری بھی کیا تھا۔ بعد میں
ان سے معلوم ہوا کہ اُن دونوں کی جلد واپسی ممکن نہیں
ہے۔ جاتے وقت بھمل نے ان سے کہا تھا کہ دیر ہو جائے تو
سیّد صاحب دوپہر کے کھانے پر اس کا انتظار نہ کریں۔ میرے
پاس اپنے آپ کو چٹکیاں بھرنے' تڑپنے کھسوٹنے کے سوا کوئی
کام نہ تھا۔

ہمیں یہاں آئے ہوئے ساتواں دن تھا۔ بھمل کئی بار گھر
سے باہر جا چکا تھا لیکن جلدی واپس آگیا تھا۔ ایک دو مرتبہ
سیّد صاحب اسے اپنی زمینیں دکھانے لے گئے تھے اور صبح
سے شام ہو گئی تھی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ بھمل کے سر
میں کیا سمائی ہوئی ہے۔ اس اہتمام سے وہ نصیر بابا کے ساتھ
بے سبب تو کہیں نہیں گیا ہو گا۔ مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ "آنے والا
وقت بہت کانٹے بکھیر سکتا ہے' دیکھیں' کیا رنگ دکھاتا
ہمارے ساتھ جگہ جگہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ [illegible]
کا یہ قول ہی شاید معتبر ہے کہ آدمی کو پہلے اپنے راستوں پر
نظر رکھنی چاہیے۔ آدمی کی اپنی مجبوریاں' محرومیاں کم نہیں
ہوتیں۔ کاش فیض آباد اسٹیشن پر بھمل میری بات مان لیتا۔
درمیان میں خاصا وقت گزر گیا تھا۔ [illegible]
بے تاب ہو رہی ہوگی۔ [illegible]
[illegible]

بھل سے زیادہ مولوی صاحب کے سراغ کی جستجو مجھے ہونی چاہیے۔ فیض آباد سے دوبارہ سفر پہ نکلتے وقت جمو اور زورا بھی ہمارے ساتھ ہوتے اور بیماری کی صورت میں ہمیں سیّد صاحب کا زیر بار احسان ہونے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اتنے عرصے ساتھ سفر کرتے ہوئے جمو اور زورا کی رفاقت کی عادت ہو گئی تھی۔ بھل بے شک میرے ساتھ تھا لیکن لگتا تھا' وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے' میں تو اس کے ساتھ ہوں' وہ میرے ساتھ نہیں ہے۔

کمرے میں دن بھر ابّن' نذرو' اصل اور دوسرے ملازموں کا تانتا بندھا رہا۔ دوپہر کا کھانا بھی ایسے ہی واپس چلا گیا۔ مجھ سے کچھ کھایا ہی نہیں گیا۔ سہ پہر کو سیّد صاحب میری پُرسش کے لیے آئے تھے' میری صحت کی بحالی پر اُنھوں نے بڑی مسرّت کا اظہار کیا' بھل کے بارے میں پوچھنے لگے۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی تو اُنھوں نے کوئی تردّد نہیں کیا۔ میں نے اخلاقاً" اُن سے کچھ دیر ٹھیرنے کی درخواست بھی کی لیکن میرے آرام کا عذر کر کے وہ جلد ہی رخصت ہو گئے۔ کمرے میں ابّن سے تنہائی کا موقع ملا تھا' میں اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے کوئی ٹوہ لے سکتا تھا۔ میں نے خود کو روکے رکھا' مبادا مجھ سے کوئی چوک ہو جائے اور تلافی مشکل ثابت ہو۔ ضروری نہیں کہ ابّن اور نصیر بابا میں کوئی فرق نہ ہو۔ ملازم تو دونوں ہیں مگر آدمی تو ایک نہیں۔ بعض ملازم کتوں کی صفات رکھتے ہیں۔

"چار بجے' پھر پانچ بج گئے۔ دن بھر میرا مشغلہ کبھی بستر پہ آ کے جسم ڈھیر کر دینا کبھی کمرے سے باہر آ کے راہداری میں ٹہلتے رہنا تھا۔

دھوپ آسمانوں میں لوٹ چکی تھی کہ بھل اور نصیر بابا کی صورتیں دکھائی دیں۔ دونوں کے چہروں سے تکان عیاں تھی۔ میں نے اُن سے کچھ نہیں پوچھا۔ آتے ہی بھل غسل کے لیے چلا گیا اور نئے کپڑے پہن کے راہداری میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھا حقّہ کھینچنے لگا۔ ملازمہ اصل نے پھلوں کا طشت کمرے سے اُٹھا کے اُس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ کل کی طرح سبزہ زار میں چہل قدمی کا وقت گزر چکا تھا۔ آنے کے بعد نصیر بابا بھی کہیں کھو گئے تھے۔ شاید زنان خانے کی

طرف نکل گئے تھے یا ہو سکتا ہے' اپنے ہی کسی کام گئے ہوں۔ ملازموں کے اپنے بھی تو کچھ کام ایک ہی صورت تھی کہ میں کسی ملازم کے انھیں طلب کروں۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ ملازموں سے پہلے اصل مجھے نظر آئی' اُسی سے میں نے منٹ بعد ہی نصیر بابا حاضر ہو گئے۔ وہ بہت اُجڑے لگ رہے تھے۔ اصل سے مجھے یہ معلوم ہو ملاقاتیوں کی خصوصی نشست گاہ میں سیّد صاحب اور چند خاص دوستوں کی محفل جمی ہوئی ہے۔ نصیر مشکل ہو گا مگر وہ آ گئے۔

بھل کمرے کے باہر موجود تھا۔ نصیر بابا اُس کے آئے تھے۔ اِس سے پہلے کہ وہ نصیر بابا کو کوئی کرے' میں نے اُنھیں عقبی سبزہ زار کی طرف چلنے کہا۔ وہ متذبذب ہوئے تھے لیکن انکار کی جرأت "سیّد صاحب کی طرف تو آپ کی ضرورت نہیں؟" پوچھا۔

"اُدھر کا انتظام کر کے آیا ہوں۔" نصیر بابا کی ضعف طاری تھا۔ "بولو میاں! کیا خدمت ہے؟"

"میرے ساتھ آیئے۔" میں نے نیم حکمیہ لہجے

"عشا کے بعد کھانے کا وقت ہو جائے گا۔" وہ ہوئے بولے۔

"عشا میں ابھی وقت ہے اور کھانے میں تو کبھی بھی ہو جاتی ہے' پھر ابھی تو سیّد صاحب کے مہمانوں کی کا دور چل رہا ہو گا۔" راہداری کا مختصر فاصلہ عبور کر کے سبزہ زار میں آ گئے۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ "آپ تھکے ہوں گے۔" میں نے قریب ہی ایک سنسان گوشے میں ہوئی پتھر کی بینچ کی جانب بڑھتے ہوئے کہا اور کسی بغیر پوچھا۔ "کیا ہوا' جہاں آپ گئے تھے' کوئی کامیابی ہوئی؟"

وہ میری صورت دیکھنے لگے۔ پھر اُنھوں نے گھبرائی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ملازموں کو تیور شناسی کی مہارت ہوتی ہے یا ہونی چاہیے۔ اُنھوں نے سرگوشیانہ میں کہا۔ "ہاں میاں! ملاقات ہو گئی۔"

"کیا' کیا ہوا پھر؟" میں انھیں اپنی بے خبری کا تاثر

تھا اور اپنی دانست میں اسی طور اُن سے کچھ جان

برابر مسلسل نظریں اطراف میں منڈلاتی رہیں۔ "یہ
نہیں ہے' سنا ہو گا میاں آپ نے' دیواروں کے
ہوتے ہیں۔"
وقت یہاں کون پھٹک سکتا ہے' فکر مت کیجیے۔"
انھیں دلاسا دیا۔ "ہاں تو آپ کیا کہہ رہے تھے؟"
بات ہو گئی لیکن وہ تو امید کھو بیٹھا تھا۔" وہ میرے
ہو کے رازدارانہ انداز میں بولے۔ "ہاتھ پیر ہی چھوڑ
تھا۔ بابا صاحب نے اسے بہت کچھ بولا تب جا کے ہامی

ہامی؟"
کہ وہ ہر طرح سے تیار ہے' تیار تو خیر وہ پہلے سے

مجھے پوری بات بتایئے۔"
یہ قصہ ہے میاں۔"
کیا کہہ رہا تھا وہ؟"
اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ بابا صاحب کے ساتھ مجھے
دیکھ کے یا یوں کہو کہ بابا صاحب کی مضبوطی دیکھ کے حوصلہ
ہوا ورنہ وہ تو...... وہ تو۔"
نصیر بابا کے جوابات میرا تجسس اور اضطراب دو چند
رہے تھے۔ یہی بہتر تھا کہ پہیلیاں بجھا کر کچھ اخذ کرنے کی
کوشش کے بجائے میں اپنی ناواقفی کا اعتراف کر لوں۔ ہرچند
اس میں اُن کے محتاط ہو جانے کا اندیشہ تھا' ضروری نہیں تھا
کہ بھل کی طرح وہ مجھے بھی رازداری کا سزاوارِ اعتبار
سمجھیں۔ یہ امر اُن کے سر میں گرہ بھی ڈال سکتا تھا کہ بھل
نے اب تک مجھے اس معاملے میں شریک نہیں کیا ہے۔ میں
انھیں کس طرح باور کراتا کہ بھل کی پردہ پوشی مصلحت
کی نہیں ہے' یہ دانستہ اخفا نہیں ہے۔ "یاسمن بی بی سے
بات ہوئی؟" مجھے کچھ اور سُجھائی نہیں دیا تو میں نے انھیں
ٹٹولا۔
"وقت کدھر ملا' ہاں' آنے کے بعد اتنی تسلی ضرور
ہو گئی ہوں کہ ظفر میاں سے ملاقات ہو چکی ہے۔ زیادہ بات
نہیں ہو سکی۔"



کرنے کا موقع نہیں تھا۔" وہ پیچھے سے بولے۔
مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں وقت ضائع کر رہا ہوں' اس
طرح مجھے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ میں نے کھوکھلا پیرا اِل دی
اور منت کی۔ "نصیر بابا! مجھے شروع سے سب کچھ بتایئے۔"
میری توقع کے مطابق اُن کی آنکھیں حیرت سے پھیل
گئیں۔ "بابا صاحب نے کچھ نہیں بتایا؟"
"شاید میری بیماری کی وجہ سے۔" میں نے کھوکھلا کے
کہا۔ "لیکن اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کوئی
نہیں ہو گا یوں لگتا ہے کہ کچھ نہ جاننا مگر آج کل کا مسئلہ بن
رہا ہے۔"
"میاں! یہ تو لمبی داستان ہے۔" وہ ہونٹ سکوڑ کر
بولے۔
"کچھ تو یاسمن بی بی کی زبانی مجھے بھی آج ہی پتا چلا ہے۔
مجھے تفصیل سے بتایئے' اُلجھن ہے' میں بھی کوئی مشورہ دے
سکوں۔" یاسمن کا ذکر میں نے عمداً کیا تھا کہ وہ جان سکیں'
بھل کو مجھ سے کچھ چھپانا مقصود ہوتا تو وہ یاسمن کو میری
موجودگی میں نہ بلاتا۔ گزشتہ رات' جیسا کہ خود نصیر بابا نے
بھل سے معلوم کیا تھا' وہ کسی دوسرے کمرے میں بھی

یاسمن کو بُلا سکتا تھا۔

"کیا بولوں میاں! اُدھراتے ہوئے کلیجا منہ کو آتا ہے۔ اللہ جانتا ہے سوچتا ہوں' تو سر چکرانے لگتا ہے۔" نصیر بابا کی آواز بھرا گئی۔

"میں سمجھ رہا ہوں۔"

"میں نے اِس گھر کا نمک کھایا ہے' لیکن کیا کروں' یہ اندھیر او دیکھا نہیں جاتا۔"

"بات کیا ہے بابا!" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"آپ نے سن ہی لیا تھا اِس بچی کی زبانی تھوڑا بہت ماجرا۔ اسے دیکھ بھی لیا ہے۔ دونوں ایسی ہیں کہ ذرا چھُو دو تو میلی ہو جائیں۔" وہ ڈوبتی آواز میں بولے۔

"یاسمن بی بی نے اپنے والد کے پٹنا آنے تک کا احوال بیان کیا تھا اور کہا تھا کہ سیّد صاحب کی ایما پر اُن کے والد نے حیدر آباد جا کے ساری زمین' مکان وغیرہ کا سودا کر لیا تھا۔"

"وہ بڑے نیک آدمی تھے' بہت پڑھے لکھے' اللہ والے۔ خدا انھیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے۔ اُن کی صورت اب تک آنکھوں میں گھومتی ہے۔ بہت نور تھا چہرے پر اُن کے۔ ماتھا چمکتا تھا' منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ ہر وقت کھِلے کھِلے' ہم جیسے چھوٹے لوگوں کی بہت پوچھ گچھ کرتے تھے۔ مجھ سے تو خاص لگاؤ تھا' بس میاں!" نصیر بابا کا گلا رُندھنے لگا۔

نصیر بابا سے بات کرنی مشکل ہو رہی تھی۔ وقت کم تھا اور یہ جگہ بھی مناسب نہیں تھی تاہم پھر کب وقت ملتا۔ یاسمن کی طرح اُن کے بیان میں بھی بڑی سوزش تھی' بار بار مغلوب ہو جاتے تھے۔

کہنے لگے' سیّد صاحب نے علّامہ پروفیسر جمال الدین سہیلی کو حیدر آباد کی جائداد سے ملنے والی رقم سے پٹنے کے نواح پھلواری شریف میں ایک زرعی زمین دلا دی اور کچھ ہی دنوں میں خطیر منافع کے عوض اسے فروخت کر دیا۔ وہ ایک اِسی نوع کے سودوں میں سیّد صاحب کے مشوروں اور اعانت سے پروفیسر کو اچھا منافع ہوا۔ پروفیسر نے روپے پیسے کی کبھی ایسی جستجو نہیں کی تھی' علم ہی اُن کے لیے سب سے [illegible] رہا تھا۔ گھر میں ویسے بھی کسی چیز کی تنگی نہ تھی'

عزّت آبرو سے گزر بسر ہوتی تھی۔ پہلی بار [illegible] اور اس کی کرشمہ سازی کا عرفان ہوا تھا۔ وہ [illegible] سے زیادہ کشش ہوتی ہے۔ طاقت کی فضیلت [illegible] پروفیسر اپنے محسن سیّد صاحب کی فہم و فراست [illegible] متاثر تھے۔ سیّد صاحب کی طرزِ بیباک' حسنِ [illegible] اور دریا دلی مستزاد صفات تھیں۔ چھٹیوں میں [illegible] نے پروفیسر کو خاندان سمیت آسن سول مدعو کیا۔ [illegible] مہینے کی اس مہمانی و میزبانی سے دونوں گھروں کو [illegible] کا موقع ملا اور راہ و رسم کچھ ایسی بڑھی کہ ذرا وقت [illegible] کبھی سیّد صاحب' پٹنے کا رُخ کرتے' کبھی پروفیسر [illegible] آکے دم لیتے۔ یہاں زنان خانے میں ملازماؤں اور [illegible] کار خاتون کے سوا کوئی نہ تھا' پروفیسر صاحب نے [illegible] سے سیّد صاحب کا پردہ بھی ختم کرا دیا تھا۔ پھر سیّد صاحب [illegible] اپنے دوست پر ایک احسان یہ کیا کہ آسن سول [illegible] میل کے فاصلے پر ایک بڑے زرعی قطعۂ اراضی کی [illegible] کرلی۔ سُنتے ہیں' اس خریداری میں کم پڑنے والی [illegible] صاحب نے بطور قرضۂ حسنہ عطا کی تھی اور طے [illegible] پہلی فصل کی آمدنی سے یہ قرض ادا کر دیا جائے گا۔

پروفیسر نے یہ قطعہ اپنی بیگم کے نام سے خرید [illegible] پٹنے میں پڑھاتے تھے۔ سیّد صاحب کی کوشش سے [illegible] سول کے ایک مکتب میں بھی فارسی زبان کی تدریس [illegible] اُنھیں چند گھنٹوں کی تقرری مل گئی۔ یوں آسن سول میں [illegible] بھنے پروفیسر کی آمد یقینی ہو گئی مگر اتنی قربتوں کے [illegible] تشنگیاں اور سوا ہو گئیں۔ سیّد صاحب نے اس [illegible] نکالا کہ آسن سول میں کرائے پر اٹھا ہوا اپنا ایک پختہ اور [illegible] مکان خالی کرا کے پروفیسر کو پیش کر دیا۔ سیّد صاحب کی [illegible] تو یہ تھی کہ اُن کی اپنی اقامت گاہ میں کچھ کم گنجائش [illegible] ہے' پروفیسر کا کنبہ چار افراد پر مشتمل ہے' کیوں نہ پروفیسر [illegible] کے بڑے مکان کے ایک حصّے میں منتقل ہو جائیں۔ پر[illegible] اس پیش کش پر آمادہ نہ ہوئے' ہاں آسن سول میں مستقل سکونت کے لیے تیار ہو گئے اور سیّد صاحب کا خالی مکان اس شرط پر قبول کر لیا کہ زرعی زمین سے سال بہ سال ہونے والی آمدنی سے مکان کی رقم ادا کی جاتی رہے گی۔ سیّد صاحب [illegible]

جائے یہ سلوک کیا کہ ایک جزوی علامتی قسم
لے مکان کی رجسٹری پروفیسر کے نام کرا دی۔
بعد کی قسط وار ادا کی جانے والی کثیر رقم کی شق
نہیں کی گئی تھی۔ سیّد صاحب کا یہ بے پناہ اعتماد
از بھی نہیں تھا کہ پروفیسر بہ باطن ایک اصول
ت باز اور دیانت دار آدمی تھے۔ زرعی زمین سے
معقول آمدنی کا امکان تھا۔ چند سال میں اس رقم کی
فیسر کے لیے کوئی وقت طلب یا صبر آزما مرحلہ نہ

فیسر کا خاندان پٹنے سے ہجرت کرکے آسن سول میں
ایک پروفیسر اب ہفتے میں تین دن کے لیے پٹنے چلے
چار دن آسن سول میں قیام کرتے تھے۔ عدم موجودگی
اور بیٹیوں کی خیر خبر کے لیے سیّد صاحب آسن سول
وہ دو ہی تھے۔ دن میں ایک مرتبہ پروفیسر کے گھر پھیرا
صاحب نے شعار بنایا تھا۔ انھوں نے وہاں اطاعت
ملازم بھی رکھوا دیے تھے۔ امورِ خانہ داری میں ماہر ایک
ملازمہ بھی تعینات کی تھی۔ سیّد صاحب کی تجویز تھی
عرصے بعد پروفیسر زرعی زمین پر ایک چھوٹا سا گھر بنا کے
تھا" وہیں اقامت اختیار کرلیں' اس سحر کار مرغ زار میں
یکسوئی سے تصنیف و تالیف کے مواقع میسّر آئیں
ساتھ ساتھ زمینوں کی نگہداشت بھی ہوتی رہے گی۔
فیسر پھر درس و تدریس کا مشغلہ ترک کردیں۔ ایک زمانے
تخلیقی و تحقیقی کام کے لیے پروفیسر کو اس فراغت کی تمنا
۔ آسن سول میں اُن کی شامیں سیّد صاحب کی معیت میں
گزرتیں۔ سیاحت کا پہلے سے شوق تھا' سیّد صاحب اُنھیں
آسن سول سے دورے جاتے' کبھی پہاڑی مقامات پر' کبھی
وں کی طرب گاہوں میں' کبھی دونوں شکار پر نکل جاتے'
گلوں کی سیر کرتے۔ آسن سول شہر ہی میں نہیں گرد و
نواح میں دور و نزدیک سیّد صاحب کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔
تر شاموں میں یا تو وہ خود کہیں مدعو ہوتے یا ان کے اپنے
گھر ضیافتوں کا اہتمام ہوتا۔ کئی قریبی دوستوں کی محفلوں میں
وہ پروفیسر کو بھی لے جانے لگے۔
پروفیسر کے لیے یہ دنیا نئی تھی۔ یہ دنیا افسانوی نہیں تھی'

طلاق کی خواہش مند ایک عورت نے عدالت میں بیان
دیا اُس کا شوہر اُس سے بات چیت تک نہیں کرتا۔
"کیا یہ الزام درست ہے؟" عدالت نے شوہر سے پوچھا۔
"جی ہاں!" شوہر نے اقرار کیا۔ "دراصل مجھے شادی شدہ
خواتین سے بات چیت کی عادت نہیں ہے۔"

اس میں خواب کم' تعبیریں بہت تھیں۔ ممکن ہے' شروع
شروع میں انھیں اجنبیت محسوس ہوئی ہو لیکن رفتہ رفتہ وہ
بدلی ہوئی زندگی میں شامل نظر آنے لگے تھے۔ انھوں نے
روایتی لباس درس و تدریس کے لیے وقف کردیا۔ وہ سرخ و
سپید رنگت' اٹھتے ہوئے قد' متوازن دست و بازو کے ایک
وجیہ اور جامہ زیب شخص تھے۔ پینتالیس سے زیادہ کے نہ
ہوں گے' دیکھنے میں بہت کم کے لگتے تھے۔ نئی وضع قطع میں
اور پُر وقار ہو گئے تھے۔ جہاں جاتے' نگاہوں کا مرکز بن
جاتے۔
دو دوستوں کی اس باہمی شیفتگی کو ڈیڑھ دو سال کا عرصہ
گزر گیا۔ لگتا تھا' دونوں میں کوئی ازلی رشتہ ہے' بھائیوں میں
بھی ایسی یگانگت' مہر و الفت کیا ہوگی۔
پھر ایک دن ایسا ہوا' آدھی رات کا وقت تھا۔ سیّد
صاحب کو پروفیسر کی طبیعت اچانک خراب ہو جانے کی اطلاع
ملی۔ سیّد صاحب کسی تاخیر کے بغیر وہاں پہنچ گئے اور انھوں
نے عزیز از جان دوست کے علاج معالجے کے لیے دن رات
ایک کردیے۔ پروفیسر کو افاقہ ہو گیا تھا لیکن کچھ دنوں بعد
طبیعت پھر بگڑنے لگی۔ کئی حکیم و ڈاکٹر دیکھ چکے' کوئی [illegible]
تشخیص کر پاتا تھا کوئی کچھ۔ پروفیسر نے [illegible]
آزمائی کی۔ کبھی اُن کی حالت درست ہو جاتی' کبھی [illegible]
جاتی۔ طرح طرح کے ٹوٹکے بھی آزمائے گئے' تعویذ و
وظائف کا سلسلہ جاری رہا اور [illegible]
[illegible] سے مرض [illegible] سیّد صاحب پروفیسر کو [illegible] کے
[illegible] لے جانا چاہتے تھے مگر اس کا موقع نہ آیا' ایک
رات پروفیسر نے ساری اذیتوں سے نجات حاصل کرلی۔
ایک دو مہینے کے بعد [illegible] ایک [illegible]
محسوس ہوا' پٹنے سے چلا گیا۔ کسی کو یقین نہیں آتا تھا مگر یہ

یقین تو ایک جبر ہے' سب کو کرنا پڑتا ہے۔ سب کو معلوم ہے' کسی کو یہاں نہیں رہنا۔ جتنے نظر آتے ہیں' سب چھپ جانے' مٹ جانے کے لیے ہیں۔ کوئی کتنا ہی عزیز' رگِ جاں سے قریب ہو' ہر ایک کو ہر ایک سے جدا ہو جانا ہے۔ وہ لوگ بھی مر جاتے ہیں' ایک خلقت کے جو کام آتے ہیں۔ جن کی ضرورت ہوتی ہے' وہ بھی مر جاتے ہیں۔ کوئی کتنا ہی گل بوٹے کھلائے' نقش رہ جاتے ہیں' نقش گر چلے جاتے ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے' موت' زندگی کی توہین ہے' اور حیف کہ زندگی اسی ذلت سے دوچار رہے گی۔ کاش یہ حقیقت آدمی تسلیم کر لے کہ زندگی حادثہ ہے' موت کوئی حادثہ نہیں۔ پروفیسر کی بیوی اور بیٹیاں خاصی ہوش مند تھیں۔ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ کسی کا قیام یہاں مستقل نہیں ہے لیکن جو چوک ہر ایک سے ہو جاتی ہے' ان سے بھی ہوئی۔ پروفیسر کے اس طرح چلے جانے سے اُن کے رگ و پے میں درد بیٹھ گیا۔ مرنے والا تو مر کے ہمیشہ کے لیے قرار سے ہو جاتا ہے' اُس کے پُرسانِ حال جو بار بار مرتے ہیں' مرتے رہتے ہیں اور مر بھی نہیں پاتے۔ پروفیسر نے نزع کے عالم میں وصیت لکھی تھی اور سیّد صاحب کو اپنے گھر والوں کا ولی مقرر کیا تھا۔ بیوی اور بیٹیوں کو اُنھوں نے وصیت کی تھی کہ سیّد صاحب کو اپنا رہ بر سمجھیں۔ کئی مہینے ماں بیٹیوں کا قیام اپنے شوہر اور باپ کے گھر رہا۔ پروفیسر واپس نہیں آئے۔ ناچار سیّد صاحب کے اصرار پہ وہ ان کے گھر چلی آئیں۔

پروفیسر کے پس ماندگان میں ایک اور شخص بھی تھا' ایک نوجوان' پروفیسر کا عزیز ترین' لائق ترین شاگرد' مسمّی ظفر احمد خاں۔ اُس کے والد پٹنے میں ریلوے کے افسر تھے۔ شاہ جہاں پور سے تعلق تھا۔ پٹنے میں مستقل تبادلے کی وجہ سے اسی شہر میں سکونت ہو گئی تھی۔ ریل گاڑی کے حادثے میں باپ کے ختم ہو جانے کے بعد ماں اور بہن کا واحد کفیل ظفر احمد خاں تھا۔ ظفر نے اپنے آبائی شہر شاہ جہاں پور جا کے چھوٹی بہن کی شادی خالہ زاد بھائی سے کر دی۔ ماں بیٹی اور داماد کے پاس ہی رک گئی تاکہ بیٹا دل جمعی سے اعلا تعلیم مکمل کر سکے۔ پٹنے سے واپس آ کے ظفر اپنی تعلیم میں منہمک ہو گیا۔ وہ انگریزی ادب کا طالب علم تھا اور کوئی بڑا سرکاری ا... کر کے سرکاری افسر بننے کا آرزو مند تھا۔ ... دوران اس کی ملاقات نابغۂ روزگار پروفیسر جمال ... سے ہوئی۔ انھی کے توسط سے اسے فارسی ا... شغف ہوا۔ معلوم نہیں' وہ فارسی ادب سے زیا... یا جمال الدین سیفی کی دل آویز شخصیت سے' ... شاگردی میں آنے کے بعد وہ انھی کا ہو رہا۔ اُس کی ... ہی بدل گئیں۔ پروفیسر بھی اُس کی سعادت مندی' ... علم کی جستجو اور جستجو میں شدّت کے اوصاف سے ... تھے۔ وہ ہر وقت اُسے خود سے قریب رکھتے تھے۔ ... ظفر کالج کے ہوسٹل میں رہتا تھا' بعد میں پروفیسر ... اپنے گھر میں جگہ دے دی۔ ذہین' ایثار پیشہ' معلم ... خوش نہاد ظفر نے اولادِ نرینہ سے پروفیسر کی محرومی ... بڑی حد تک کم کر دیا تھا' سو پروفیسر کے ہاں اپنی دختر ... فروزاں اور شاگردِ عزیز ظفر کو یک جا کر دینے کی ... بالیدگی غیر فطری تھی نہ غیر منطقی۔ ان کی بیگم بھی ... اس خواب میں شریک تھیں' اور ظفر کے لیے تو اس ... کا تصور ہی ایک اعزاز تھا۔ وہ کیا' کوئی بھی اس کی جگہ ... اپنی خوش بختی پر ناز کرتا۔ فروزاں حُسن و جمال کی ایک ... تھی' وہ تو ایک شاہ کار تھی۔ صورت و رنگ' خال و ... یکتائی کے علاوہ ذہانت و فطانت سے آراستہ۔ بعض ... خوبیاں تو اُسے ورثے میں ملی تھیں۔

آسن سول منتقل ہو جانے کے بعد پروفیسر کے خاندان ... ساتھ ظفر بھی یہاں آ گیا۔ حالانکہ اپنا ادھورا نصاب ... کرنے کے لیے اسے بار بار پٹنے جانا پڑتا تھا۔ جیسے ہی ... امور سے فراغت ملی' وہ آسن سول کا رخ کرتا۔ تعلیم ... مکمل کر کے وہ مستقل آسن سول آ گیا۔ وہ پروفیسر کے ... ایک جزو تھا۔ سیّد صاحب سے روز افزوں رسم و راہ کی ... سے پروفیسر کا گھر میں قیام کچھ کم ہونے لگا تھا مگر ایک ... مرد' گھر کا ایک فرد ظفر گھر میں موجود تھا' اس کی موجودگی ... پروفیسر کو گھر کی فکر سے آزاد کر دیتی تھی۔

اپنے مرشد کے منظورِ نظر ہونے کی نسبت سے ... صاحب ظفر کی نظروں میں نہایت واجب احترام تھے۔ ...

دونوں میں علیک سلیک کے سوا ربط و ارتباط کی کوئی خوش گوار صورت پیدا نہ ہو سکی تھی۔ اس بے گانگی میں ظفر کی جانب سے کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہ تھی' سیّد صاحب ہی کھنچے کھنچے' لیے دیے سے رہتے تھے۔ گو ان کی زبان سے ظفر کے لیے پروفیسر یا ان کی بیوی' بیٹیوں کے سامنے کبھی کوئی ناروا' نازیبا کلمہ ادا نہیں ہوا تھا نہ انھوں نے بالمشافہ ظفر سے خلوت و جلوت میں کسی موقع پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا تاہم وہ اس سے کچھ اس طرح پیش آتے تھے جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہو' جیسے اُس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ سلام کے جواب میں ان کے ہاں لپک اور چمک کا فقدان ہوتا تھا۔ کسی خدمت کی پیش کش پر وہ بالعموم معذرت کر لیتے تھے۔ ان کی یہ بے نیازی' بے اعتنائی ظفر کو بہت کھٹکتی تھی۔

پروفیسر کے رخصت ہو جانے پر سیّد صاحب ان کی بیگم اور بیٹیوں کو صبر کی مسلسل تلقین کرتے رہے۔ ظفر کو بھی اس دل جوئی اور تلقین کی بڑی ضرورت تھی۔ سیّد صاحب کو خوب معلوم تھا کہ ظفر کے لیے یہ صدمہ اتنا ہی کاری ہے جتنا پروفیسر کے اہلِ خانہ کے لیے۔ بزرگ ہونے کی حیثیت سے سیّد صاحب نے ایک مرتبہ بھی اس سے کچھ نہیں کہا' ایک بار بھی اسے گلے نہیں لگایا۔ جب تک پروفیسر کی بیوہ اور بیٹیاں گھر میں رہیں' سیّد صاحب کی مغائرت میں کسی معاندت کا احساس ظفر کو نہیں ہوا تھا' بعد میں دھندلے لفظ روشن ہوتے گئے۔

ظفر نے پروفیسر کی سوگ وار بیوہ اور بیٹیوں سے منّت کی تھی کہ وہ اپنے گھر ہی رہیں' ظفر بکھرا ہوا گھر سنبھالنے کی استطاعت رکھتا ہے مگر سیّد صاحب کے سامنے اس کی حیثیت ہر اعتبار سے فروتر تھی۔ پروفیسر کے گھر والے سیّد صاحب کے بے شمار احسانات' خسروانہ سلوک اور مراسم کی مروّت سے زیرِ بار تھے۔ وہ تینوں ان دنوں ذہنی انتشار سے بھی دوچار تھیں۔ انھیں ظفر پر پورا اعتماد تھا لیکن سیّد صاحب کو انکار کر دینے کی جرأت بھی نہ تھی۔ پروفیسر کی وصیّت بھی ابھی تازہ تھی۔ پروفیسر کے کنبے میں اب ظفر کا بھی شمار ہونے لگا تھا۔ سیّد صاحب کے علم میں تھا کہ پروفیسر نے اپنی بیٹی فروزاں اور ظفر کے لیے کیا طے کیا ہوا ہے۔ انھیں اپنے گھر

پروفیسر کی بیوی اور بیٹیوں کو لے جاتے وقت رسماً" ہی ظفر کو ساتھ چلنے کے لیے کہنا چاہیے تھا۔ انھوں نے یہ رواداری نہیں کی۔ ظفر کا تو ویسے بھی ان صاحب کے گھر جانا مناسب نہیں تھا۔ پروفیسر کی بیوہ نے البتّہ ظفر کے لیے سیّد صاحب کو اشارہ کیا تھا۔ سیّد صاحب نے انھیں مطمئن کر دیا کہ ظفر اُن سے کہاں دور ہے۔ کیا پروفیسر کا گھر بند کر دیا جائے؟ گھر کے کسی ایک فرد کو وہاں رہنا چاہیے۔ یہ عذر معقول تھا۔ پروفیسر کی بیوہ بھی گھر میں اپنے مرحوم شوہر کا گھر قائم رکھنا چاہتی تھیں۔

سیّد صاحب کے ہاں پروفیسر کے گھر والوں کے منتقل ہو جانے کے بعد صبح و شام ان کی پُرسشِ احوال ظفر نے فرض کا درجہ رکھتی تھی۔ شروع کے چند دن تو خیریت سے گزر گئے۔ کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا۔ وہ بلا ناغہ دن میں دو بار سیّد صاحب کے گھر جاتا رہا۔ آنے والے دن اُس کے لیے بڑی آزمائش کے تھے۔ ایک روز دربان نے اسے اندر جانے سے روک دیا۔ ظفر نے ناراضی کا اظہار کیا تو دوسرے ملازمین دربان کی تائید میں کمربستہ ہو گئے۔ سیّد صاحب سے ملنے کی التجا پر جواب دیا گیا کہ وہ جب چاہیں گے 'خود اس سے مل لیں گے۔ وہ رنج و غم' غصّہ و غضب کی حالت میں واپس آیا۔ یہاں سیّد صاحب کا ایک فرستادہ بے دخلی کا نامہ لیے پہلے سے موجود تھا۔ ظفر اس ذلّت کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے اسی وقت سیّد صاحب کے گھر کا رخ کیا لیکن اُسے باریابی کی اجازت نہیں ملی۔ اُس کے تو اوسان خطا ہو جاتے رہے۔ پھر اس نے پروفیسر اور سیّد صاحب کے ایک مشترکہ ملاقاتی مختار جگن ناتھ کے گھر جا کے دستک دی۔

اس اقدام سے اتنا ضرور ہوا کہ سیّد صاحب ملاقات کے لیے آمادہ ہو گئے لیکن وہ اسے ایک بدلے ہوئے آدمی نظر آئے' جیسے اُن کا ظفر سے کوئی واسطہ ہی نہ رہا ہو' وہ اسے پہچانتے ہی نہ ہوں۔ اُنھوں نے ظفر کو الگ گھر کا انتظام کرنے کا حکم دیا۔ ظفر نے فریاد کی کہ وہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ پروفیسر کا گھر ان کا نہیں' پروفیسر کا ہے جو اس کے معنوی باپ اور پیر و مرشد تھے۔ پروفیسر نے اسے اپنے گھر مستقل قیام کی ہدایت کی تھی بلکہ اسے مجبور کیا تھا' وہ اسے دل و جان سے

...ئے تھے۔ سیّد صاحب نے سُنی اَن سُنی کر دی، اور ...' گھر بے شک پروفیسر کا ہے لیکن ظفر کا نہیں ... تعلق پروفیسر سے تھا اور پروفیسر اب موجود نہیں ...رحوم کی وصیت کی رُو سے وہ ان کے سارے ...کے امین ہیں۔ وہ جو بہتر سمجھتے ہیں، وہی کریں گے۔ ...فروزاں سے اپنے رشتے کی بات یاد دلائی۔ سیّد ...نے سرد مہری سے کہا کہ وہ کس برتے پر اس رشتے کا ...وار ہے۔ اسے میزان کرنا نہیں آتا کیا؟ اسے اپنی ...کا عرفان ہونا چاہیے۔ ظفر نے عاجزی کی کہ اسے ...ئی میں بہت اچھی ملازمت مل رہی تھی۔ وہ تو پروفیسر ...ے روکے رکھا تھا۔ اُن کی خواہش تھی کہ ابھی وہ مزید ...حاصل کرے۔ سیّد صاحب نے اسے دھتکار دیا کہ پہلے ...لائق تو ہو جائے، تب آ کے ان سے بات کرے۔ اس ...فروزاں کے لیے انھیں بہتر رشتہ مل گیا تو وہ ظفر کا ...بھی نہیں کریں گے۔ ظفر نے بہت دُہائیاں دیں مگر سیّد ...تو پتھر کے ہو گئے تھے۔ پروفیسر کی بیگم سے ملاقات کی ...است بھی انھوں نے سختی سے ٹھکرا دی۔

...ظفر ایک ذکی الحس، سلیم الطبع، سریع الفہم نوجوان تھا۔ ...تخمینہ لگانے میں دیر نہیں لگی اور یہ سمجھنے میں کہ ...دلیل و حجت کا کچھ حاصل نہیں ہے۔ سیّد محمود علی نے ...ترتیب کا پورا خیال رکھا ہے۔ سب کچھ ایک سلسلے سے ...اب وہ کیا کرے، وہ کہاں جائے! کس دلیل پر جا کے ڈھیر ...کھائے۔ سیّد صاحب نے اسے خوب آئینہ دکھایا ...شاید وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں، وہ تو خود کو جانتا ہی نہیں، وہ ...بے دلیل ہے۔ وہ تو ریت کے گھروندے میں رہتا تھا۔ اس کے وجود کی استواری تو پروفیسر کے ستون سے مشروط تھی۔ اس نے اسی دن پروفیسر کا گھر چھوڑ دیا۔ اس کے سوا ...بھی نہیں تھا کہ سیّد صاحب کے نمک خوار وہاں موجود ...تھے۔ اس کا ذہن معطل ہو چکا تھا۔ ہر جانب اندھیرا نظر آتا ...تھا۔ یہ ناکامی تو پروفیسر کی موت سے بڑا سانحہ تھی۔ اس نے ...ڈھونڈ ڈھونڈ کے سیّد صاحب کے دوستوں کے گھر جا کے ...عرض گزاری۔ پھر اس نے کسی قانون داں سے مشورہ کر کے پولیس کی مدد حاصل کی۔ پولیس کا بڑا عہدے دار سیّد ...[illegible]

صاحب کے گھر سے شرم سار واپس آیا۔ سیّد صاحب نے پروفیسر کی وصیت کی نمائش کے علاوہ ان کی بیگم اور ملازموں کے بیانات بھی پولیس افسر کے گوش گزار کرا دیے تھے۔ سیّد صاحب کے گھر سے واپس آ کے اس نے الٹی ظفر کو سرزنش کی اور یہ فہمائش بھی کہ بہتر ہے، وہ سیّد محمود علی جیسے عزت دار، حیثیت مند شخص سے نبرد آزمائی کا خیال دل سے نکال دے ورنہ اسے گھاٹا ہو جائے گا۔ نوجوان ظفر نے خود کو کبھی ایسا بے دست و پا، بے بس محسوس نہیں کیا تھا۔ اُس کی حالت دیوانوں جیسی ہو گئی۔ بدحواسی میں ایک روز اس نے سیّد صاحب کے مکان پر دھرنا دے دیا۔ نتیجے میں اسے جسمی اذیت سے گزرنا پڑا، کرائے کے غنڈوں نے اس پر لاٹھیاں برسائیں اور ناتوانی کی حالت میں شہر کے کنارے پھینک آئے۔

کوئی بھی کہیں بھی اس کی بات سننا گوارا نہیں کرتا تھا۔ لگتا تھا، سارا شہر سیّد صاحب کے طلسم میں ہے۔ ظفر نے صرف کتابیں پڑھی تھیں، آدمی نہیں دیکھے تھے۔ کتابوں کے دل دادہ اس نوجوان کو پہلی بار تجربہ ہوا کہ آدمی وہ نہیں ہوتا جو نظر آتا ہے۔ جو اس کا چہرہ، ہاتھ پیر، جثہ و قامت دکھائی دیتے ہیں۔ آدمی تو وہ ہوتا ہے جو کبھی دو آدمیوں کے برابر ہوتا ہے، کبھی تین، چار یا اس سے زیادہ، بہت زیادہ۔ اور آدمی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ آدمی آدھا بھی ہوتا ہے اور نہ ہونے کے برابر بھی ہوتا ہے۔ [illegible] ظفر اور [illegible] سے آدمی کی [illegible] عقل و دل کھلا ہے۔ آدمی کے [illegible] تو سمندر بھی پیچھے ہے۔

ظفر نے سیّد صاحب کے ملازموں کا تعاقب شروع کیا۔ ایک ایک سے ہاتھ جوڑ کے منت کی کہ وہ اس کا ایک [illegible] پروفیسر کی بیگم تک پہنچا دیں۔ پہلے تو وہ تیار نہیں ہوئے [illegible] نذرانے بھی ان سے مسترد ہو گئے۔ ظفر [illegible] خط ان کے حوالے کرتا رہا۔ کسی کا جواب نہیں آیا۔ ملازم [illegible] انھیں آقا کی خدمت میں پیش کرتے تھے اور آقا [illegible] ملازموں کو ظفر کے نذرانوں سے کہیں زیادہ انعام و اکرام سے نوازتے تھے۔ ملازم باہر جا کے ظفر کو باور کراتے رہے کہ وہ اس کا ہر خط بہ حفاظت بیگم صاحب تک پہنچا دیتے ہیں۔

ہو اب وہ مانہ وہ ان کی مرضی پر ہے۔ کسی ملازم نے ظفر کے کانوں میں یہ زہر بھی گھولا کہ بیگم صاحب اس کے خطوط پڑھے بغیر تلف کر دیتی ہیں اور اس بات پر برگشتہ ہوتی ہیں کہ آخر وہ یہ خط وصول ہی کیوں کرتے ہیں' وہ ظفر سے کوئی تعلق ہی کیوں رکھتے ہیں۔ سیّد صاحب کے مکان کی دیواریں بہت اونچی تھیں۔ ظفر بھی قد و قامت میں کوتاہ نہیں تھا لیکن یہ دیواریں پار کرنے کے لیے بہت مختصر اور ناکافی قامت تھا اس کا۔

نصیر بابا کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اندھیرا اور بڑھ گیا تھا۔ رات کے کھانے کا وقت ایسا متعین نہیں تھا لیکن کسی بھی لمحے کوئی ہرکارہ ہمیں تلاش کرتا ہوا اس طرف آسکتا تھا۔ بہرحال جمل کمرے میں موجود تھا۔ اتنے دنوں تک سیّد صاحب کے ساتھ تینوں وقت 'ناشتے اور کھانے میں وہی شریک ہوتا رہا تھا' میری ڈھنڈیا نہیں پڑے گی۔ مجھ بیمار کا کھانا تو کمرے میں آجاتا تھا۔ جمل کے سامنے ہی میں نصیر بابا کو لے کے عقبی سبزہ زار کی طرف چلا تھا' اسے اندازہ ہو گا کہ اس وقت مجھے نصیر بابا کی ضرورت کیوں پڑ گئی ہے۔ وہ ملازموں سے کمرے میں میری عدم موجودگی کا کوئی بھی عذر کر سکتا تھا۔ مجھے ایسی کوئی بے چینی نہیں تھی لیکن نصیر بابا کو بار بار کسی کے آجانے کا خوف گھیر لیتا تھا' میں نے بے وقت انھیں روک رکھا تھا۔

نصیر بابا کی ڈھلتی آواز میں نفرت اور بیزاری شامل ہو گئی تھی۔ سیّد صاحب کے ذکر پر وہ اپنا منہ نوچتے اور گالوں پر طمانچے مارنے لگے۔ کہنے لگے کہ یہاں سارے ملازم آدمی کی نہیں' جانوروں کی نسل سے ہیں۔ سب کو بس دُم ہلانا آتا ہے۔ وہ بھی کبھی انھی میں سے تھے۔ وہ بھی بہت برے کتے تھے۔ سیّد صاحب کی نظروں میں تو ان کی یہی حیثیت ہے۔ نصیر بابا نے بتایا کہ وہ ایک زمانے سے سیّد صاحب کی خدمت کر رہے ہیں۔ میرٹھ میں گوروں کے خلاف شورش نے فرقہ وارانہ فساد کی شکل اختیار کر لی تھی۔ بلوائیوں نے ان کے گھر کو آگ لگا دی۔ بوڑھے ماں باپ' دو جوان بہنیں' ایک چھوٹا بھائی' ان کی بیوی اور تین بچے آگ کی نذر ہو گئے۔ ادھر مشتعل گوروں نے اندھا دھند گرفتاریاں شروع کر دیں۔

کبھی کسی موقع پر جوش میں آکے نصیر بابا نے ... ہندوستان سے نکالنے کی تحریک میں اپنا نام بھی ... میں لکھوا دیا تھا۔ کسی غدار نے وہ فہرست گوروں ... کر دی۔ نصیر بابا بھی زد پر آگئے۔ وہ عدالت میں ... کرتے رہے۔ گورے حاکم نے انھیں تین سال ... جیل بھیج دیا ابھی تین مہینے ہوئے تھے کہ ایک ... قیدیوں نے باہر کے کارکنوں کی مدد سے جیل میں ... کر دیا۔ اس افراتفری میں نصیر بابا کو جیل سے فرار ... موقع مل گیا۔ میرٹھ میں اب کیا رہ گیا تھا۔ وہ ... خورجہ میں رشتے داروں کے پاس بھی نہیں جا ... مختلف شہروں میں حلیہ بدل بدل کے منہ چھپاتے رہے' طرح طرح کے کام کیے اور بھاگتے بھاگتے ... آگئے اور آخر انھیں سیّد محمود علی کے ہاں پناہ مل گئی ... صاحب بھی اس زمانے میں اوسط درجے کے آدمی ... چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے لیکن صبح و شام ... میں لگے ہوئے تھے۔ دیکھتے دیکھتے اُن کے پاس زر کی ... ہونے لگی۔ انھوں نے یہ قلعہ مثال مکان بنوالیا۔ ... سیّد صاحب کے سب سے پرانے ملازم ہیں۔ اپنے ... سے وہ اس قدر دل برداشتہ ہو چکے تھے کہ سفید و سیاہ کی ... ہی جاتی رہی تھی۔ کہتے ہیں' کانٹوں والے پودے اکھاڑ اکھاڑ پھینک دیے جائیں تو تناور درخت کیوں بنیں۔ ... کا یہ درخت نصیر بابا کے سامنے پروان چڑھا ہے' وہ اس ... سائے کے ساتھ کانٹوں کے بھی عادی ہو گئے تھے۔ سب ... ان کے سامنے گزرا ہے اور یہ روز بروز بڑھتا' پھیلتا ... ہے۔

نصیر بابا بگڑی ہوئی آواز میں کہنے لگے کہ وہ ... دہرا گئیں۔ زنان خانے کی ساری ملازمائیں چھن چھن کے ... گئی ہیں۔ وہ ساری عورت ذات پر تہمت ہیں۔ اُن کی ... بوڑھی خاتون رئیس بیگم سیّد صاحب کی کوئی رشتہ دار نہیں' اوّل درجے کی قطّافہ ہے' کسی کٹنی کے مانند۔ سیّد صاحب جانے کہاں سے اُسے لائے تھے۔ یقیناً کسی بالا خانے سے تعلق ہونا چاہیے۔ اُس وقت سیّد صاحب کی پہلی بیوی زندہ تھی' رئیس بیگم کی آمد کے سال بھر کے اندر اندر چل بسی۔

...اری کی بعد حیرت انگیز طور پر اس کا انتقال ہو گیا۔ ...ب کے دونوں بیٹے نینی تال کے انگریزی اسکول میں ...ے ہیں‘ وہاں کی تعلیم کے بعد انھیں ولایت بھیج دیا ...ی اپنے گھر کی ہو گئی تھی۔ پہلی بیوی کی موت کے ...و سال بعد سیّد صاحب آگرے کی ایک طوائف ...دراز قد‘ سانولی رنگت‘ تیکھے نقوش کی ایک نازک ...ی کے ایسے شیدا ہوئے کہ منہ مانگی رقم پر گھر لے ...۔ وہ ایک خوش شعار‘ پاکیزہ اطوار لڑکی تھی‘ عزت ...زندگی کی طلب رکھتی تھی۔ نماز روزے کی پابند ہو گئی ...ایک روز وہ بھی اچانک بیمار پڑ گئی۔ سیّد صاحب علاج ...ے کے لیے اُسے الٰہ آباد لے گئے۔ رئیس بیگم بھی ہم ...ی۔ پندرہ بیس روز بعد دونوں واپس آئے تو وہ عفیفہ ...نہیں تھی۔ بتایا گیا کہ اُس کا وقت آگیا تھا۔ بڑے بڑے ...ں ڈاکٹروں نے کوشش کی لیکن جس کا بلاوا آجائے‘ ...کون روک سکتا ہے۔ اصل بات کا کسی کو علم نہ ہو سکا۔ ...واقعے کے بعد سیّد صاحب نے کسی عورت کو یہ حیثیت ...نہیں رکھا۔ ہاں عورتیں آتی جاتی رہیں‘ آتی جاتی ...ہیں‘ کبھی چند روز‘ ہفتے دو ہفتے‘ مہینے دو مہینے کے لیے۔

...شہر اور اطراف میں دور و نزدیک سیّد صاحب کے ...وں کا ایک وسیع حلقہ ہے۔ بہت سے ہم مزاج و قفے ...ے ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں‘ پُر شکوہ دعوتیں‘ ...رنگ کی محفلیں‘ جام و مینا کے دور‘ ان کی دنیا ہی الگ ...۔ ہندوستان بھر سے رقص و سرود کی ماہر حسین و جمیل ...تیں اہتمام سے ان محفلوں میں بلائی جاتی ہیں‘ کبھی اس ...ال مند کے گھر‘ کبھی اُس منصب دار کے ہاں۔ سیّد صاحب ...ے ہاں بھی کوئی مہمان خاندان سمیت آکے ٹھیرتا ہے اور ...اس میں کوئی دوشیزہ یا رشکِ آئینہ عورت سیّد صاحب کی نگاہ ...کو بھا جاتی ہے تو رئیس بیگم کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ وہ شیشے ...یں اتارنے کا اپنا ہنر آزماتی ہے۔ رئیس بیگم ناکام کبھی نہیں ...وتی۔ وہ اور اس کی کنیزیں‘ زنان خانے کی مخصوص ...ملازمائیں سب مل کے تجویزوں‘ ترغیبوں‘ تحائف اور ان ...ب سے بڑھ کے خوابوں اور خیالوں کا ایسا جال بچھاتی ہیں کہ ...سیّد صاحب کی مطلوب کے لیے گریز کا راستہ نہیں رہ جاتا۔



مہمان خانے پر کثیر مصارف ہوتے ہیں، وقت بھی کم صرف نہیں ہوتا لیکن میزبانی و مدارات کے اس سلسلے کا حاصل بے اندازہ ہے۔ یہاں بڑے مختلف لوگ آکے ٹھیرتے ہیں۔ علوم و فنون کے ماہر‘ جیّد و مستند عالمِ دین‘ بڑے سرکاری عہدے دار‘ کلاہ بردار‘ زمیں دار اور زردار تاجر اور وہ لوگ جو سیّد صاحب کو زیادہ مرغوب ہیں۔ کسی بہت خصوصی مہمان کے لیے زنان خانے سے متصل عمارت کے وسطی حصے میں انتظام کیا جاتا ہے۔ ہر مسلک اور فرقے کے لوگوں سے سیّد صاحب کا تعلق ہے۔ محرموں میں چندہ ان کے ہاں سے جاتا ہے۔ دسہرے کی تقریبات میں بھی وہ [illegible] کرتے‘ [illegible] بھی شریک ہوتے ہیں‘ [illegible] ہولی و دیوالی سے حظ لیتے ہیں۔ وہ اور ان کے بعض خاص دوست ایسی [illegible] عورتوں کا [illegible] بھی معیوب نہیں سمجھتے۔

نصیر پاپا کو مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ [illegible] رگوں میں جلن ہونے لگی تھی۔ نصیر پاپا [illegible] انھیں یقین ہے‘ پروفیسر کی موت کا وقت نہیں تھا۔ وہ [illegible] بڑے صحت مند‘ بہت زندہ دل آدمی تھے۔ ان کے گھر سیّد صاحب نے [illegible] ملازم [illegible] پروفیسر کے پاس زرعی زمین کی صورت میں ایک بڑا اثاثہ تھا۔ سیّد صاحب [illegible] پروفیسر زرعی زمین کی آمدنی سے [illegible] زرعی بات تو ثانوی

ہے۔ پروفیسر کی بیوی خانم فرخ ایک پری پیکر، ماہ جمال خاتون تھی۔ کسی ملکہ کے مانند، اس کے چہرے پر وقار تھا۔ اس کی آنکھوں میں بجلی سی کوندتی رہتی تھی۔ اس کا سراپا کسی لچکتی شاخ کے مثل تھا۔ اس کی شہابی رنگت، شفق سے مشابہ تھی۔ فارسی لب و لہجے میں وہ ہندوستانی بولتی تھی اور یوں اس کی طرز گفتار، اور دل کش اور دل نشیں ہو جاتی تھی۔ ہر لباس اس پہ خوب جچتا تھا۔ وہ اپنی دو بیٹیوں کی ماں کے بجائے بڑی بہن نظر آتی تھی۔ بڑی بیٹی فروزاں ہو بہ ہو اس کی مثال ہے۔

سید صاحب کے گھر میں آنے کے بعد وہ تینوں ابتدائی چند دنوں تک بڑی آزردہ و دل گرفتہ رہیں مگر یہاں ان کی دل بری و دل دہی کا سارا اہتمام کیا گیا تھا۔ رئیس بیگم ان کے لیے پلکیں بچھاتی تھی۔ رئیس بیگم کے اشارے پر دیگر ملازمائیں باندیوں کی طرح خدمت بجلانے کو مستعد رہتی تھیں۔ خود سید صاحب ہمہ وقت ان کی دل داری و دل جوئی کے لیے مضطرب رہتے تھے۔ یکایک جب ظفر کی آمد بند ہو گئی تو ماں اور بیٹیوں کی تشویش لازم تھی۔ ظفر تو ان کے لیے پروفیسر کی امانت، یادگار اور نشانی کی طرح تھا۔ ظفر تو ان کی امید تھا۔ سید صاحب نے ظفر کی اس روپوشی پر حیرت و تکدر کا اظہار کیا۔ خانم کو بتایا گیا کہ ظفر تو گھر میں بھی نہیں، پھر بتایا گیا کہ وہ تو اپنا سامان اور کتابیں اپنے ساتھ لے گیا ہے اور گھر میں موجود چوکی دار سے بھی کچھ کہہ سن کے نہیں گیا۔ خانم کو یقین نہیں آتا تھا۔ اس نے مختلف ملازموں سے گلی کوچے ظفر کا سراغ لگانے کی منت کی۔ ہر ایک ناکام واپس آ کے خانم اور اس کی بیٹیوں کو وحشت زدہ کرتا رہا۔ سید صاحب مسلسل انھیں تسلی دیتے رہے کہ جلد یا بدیر ظفر کے بارے میں اچھی خبر آئے گی۔ وہ خاطر جمع رکھیں، ظفر کی تلاش میں کوئی کسر نہ رکھی جائے گی۔ انھوں نے ہر جگہ کہہ رکھا ہے، یہاں تک کہ پولیس کی بھی مدد لی ہے۔ وہ پٹنے میں رہ چکی تھیں اور انھیں پروفیسر اور ظفر کے بعض ملاقاتیوں کے نام یاد تھے۔ ان کے اصرار پر ملازم پٹنے روانہ کیے گئے، ایک بار نہیں، کئی بار۔ دوسرے تیسرے روز بظاہر وہ پٹنے سے واپس آ کے مایوسی کا اظہار کر دیتے تھے۔

شاہ جہاں پور میں مقیم ظفر کی ماں اور بہن کی با... خانم تھوڑا بہت جانتی تھی۔ ظفر اکثر ان کا تذکرہ کیا کر... گھر کی الماریوں، کونے کھدروں میں شاہ جہاں پور والے ظفر کے خطوط تلاش کرائے گئے، یعنی خانم کو ... دیا گیا۔ سید صاحب نے خانم اور اس کی بیٹیوں کے اطمی... کے لیے ایک آدمی بھی شاہ جہاں پور روانہ کیا، جو ک... نہیں گیا۔ دس پندرہ روز کے غیاب کے بعد آ کے اس ... بھی خانم کو کوئی فرحت اثر خبر نہیں سنائی۔ ظفر کے لی... سے دل فگار فروزاں تھی۔ وہ کسی سے کچھ کہتی نہیں لیکن اس کے چہرے پر بادل سے چھائے رہتے تھے۔ دنوں بلکہ مہینوں تک انھیں ظفر کا انتظار رہا۔ وہ سید صا... کے گھر سے مانوس ہونے لگی تھیں۔ کسی مرد کے بغیر و... جوان عورتیں اپنے گھر میں تنہا رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ ادھر سید صاحب نے ان کی خوشنودی... لیے ہر جتن کیا تھا۔ رئیس بیگم کی ترغیب پر خانم گھ... معاملات میں بھی دل چسپی لینے لگی تھی کیوں کہ اس ... رائے کو فوقیت دی جاتی تھی۔ سید صاحب بھی کبھی کبھ... خانم سے ایرانی کھانوں کی فرمائش کرتے اور داد و تحسین... حق ادا کر دیتے۔

کچھ عرصے بعد سید صاحب نے گھر کی یکسانی سے اکتا... پہاڑی مقامات پر جانے کا اعلان کیا۔ رئیس بیگم، نصیر بابا، چند ایک ملازموں کے ساتھ یہ لشکر پہلے دار جلنگ گیا، وہاں کے سبزہ زاروں، کوہساروں کا نظارہ کیا، مشرقی بنگال میں بن کی سیر کی۔ کلکتہ شہر میں گھومے پھرے۔ ایک ڈیڑھ م... مسلسل رو بہ روئی کے اس سفر میں رہی سہی اجنبیت بھی ختم ہو جانی چاہیے تھی۔ کلکتے میں زیورات اور ملبوسات کی خریداری میں سید صاحب نے ہزاروں صرف کر دیے۔ اس سفر سے خانم اور بیٹیوں پر لازماً خوش گوار احساس مرتب ہونے چاہیے تھے۔ گھر واپس آ کے یقیناً اچانک نہیں مناسب وقت دیکھ کے رئیس بیگم نے خانم کے کان میں شوشہ طرازی کی ہو گی کہ کیوں نہ وہ اور سید صاحب یہ رسمی دوریاں مٹا دیں۔ نصیر بابا کا کہنا تھا کہ خانم اس کے لیے جلد آمادہ نہیں ہوئی ہو گی مگر رئیس بیگم ایک دست کار مشاطہ ... سے ...

بہلانے کے فن سے واقف۔ اُس کی دلیلیں بھی عاری نہیں تھیں۔ ظفر جا چکا تھا' آمنے سامنے' [illegible]ں میں سیّد صاحب کے سوا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اس کی ذمے داری تھیں۔ خود اس کے آگے زندگی تھی۔ اتنے دنوں تک وہ سیّد صاحب کی شیفتگی و وارفتگی [illegible] کر چکی تھی۔ رئیس بیگم اس بار بھی اپنی سحر کاری [illegible] نہیں ہوئی۔ ایک رات وہ خانم کو عمارت کے وسطی [illegible] لے گئی۔ سیّد صاحب کے علاوہ وہاں ایک مولوی' اور ایک اور شخص پہلے سے موجود تھے۔ دستخطوں [illegible] کاغذ تیار تھا۔ منٹوں میں رسم ادا ہو گئی۔

رئیس بیگم کے مشورے پر سردست یہ واقعہ بیٹیوں سے [illegible] گیا' دوسرے ملازموں سے بھی مخفی رکھا گیا۔ خانم نے اخفا پر تعجب کا اظہار کیا تھا مگر عذر پیش کیے گئے کہ [فرو]زاں اور یاسمن ابھی ناپختہ اور حساس ہیں۔ ہو سکتا ہے' [خان]م اور سیّد صاحب کے اس محترم و مقدس رشتے کی قبولیت [کے] لیے ابھی وہ ذہنی طور پر تیار نہ ہوں۔ کچھ عرصہ اور گزر [جا]نے پر مرحوم باپ کے نقش ضرور دھندلے پڑ جائیں گے کہ [وق]ت سب سے بڑا مسیحا ہے۔ ابھی اس افشا سے اُن پر کوئی [اُ]لٹا اثر پڑا تو اندمال کی ساری کوششیں اکارت جائیں گی' اور [باہر] کے لوگ یا ملازم سیّد صاحب اور خانم کی اس یکجائی سے آشنا ہوئے تو فروزاں اور یاسمن سے بھی کچھ ڈھکا چھپا نہیں رہے گا۔ بے شک یہ مبارک و مسعود کام موخر کیا جا سکتا تھا لیکن خانم کو ذاتی طور پر گداز اور یقین کی ضرورت ہے اور جب کسی کام میں بہتری کا پہلو مضمر ہے تو کسی طور بھی اسے انجام دینے میں دیر کیوں کی جائے۔ آخر ایک دن سبھی کو معلوم ہو جانا ہے۔ ان توجیہوں نے خانم کو اتنا قائل نہیں کیا مگر سیّد صاحب کی زیرکی' دُور اندیشی اور نکتہ پروازی تو مسلّم تھی۔ وہ خاموش رہی۔ نصیر بابا کہہ رہے تھے' تو انھیں بھی بڑی حیرت ہوئی تھی' بہت دنوں بعد اُن پر اس پردہ داری کے جواز منکشف ہوئے۔ نصیر بابا کے کہنے کے مطابق اس وقت ایک بے نام خوف کے ساتھ انھیں مسرّت بھی ہوئی تھی کہ خانم کے غم کا اس طرح کچھ مداوا تو ہو گیا۔ نصیر بابا خود کو ملامت کر رہے تھے' کہنے لگے' وہ یہ بھول گے کہ خانم کی عمر ابھی [illegible] کون ہے۔ خانم نصیر بابا سے [illegible] امید باندھی کہ اب شاید سیّد صاحب کی زندگی کا [illegible] جائے۔ خانم فرخ واقعی مبارک [illegible] لالہ رُخ بیوی کے بعد اب انھیں کسی اور طرف نہیں دیکھنا چاہیے۔

سیّد صاحب نے بڑی احتیاط کی' کسی کو ہوا نہ لگنے دی۔ خانم اور بیٹیوں کے الگ الگ کمرے تھے۔ [illegible] رئیس بیگم بیٹیوں کو سنبھال لیتی تھی اور خانم اپنے مجازی خدا کے پاس خلوت میں چلی جاتی تھی۔ ان دنوں سیّد صاحب کا عجب عالم تھا۔ [illegible] گالوں پہ سرخی پھوٹی تھی' [illegible] تاب دار ہو گئی تھیں۔

نقرہ طرح

رشید شاہد کی طرف سے

شادی کی ایک تقریب میں مہمان ایک دوسرے سے متعارف ہو رہے تھے۔ ایک صاحب نے اپنا تفصیلی تعارف کروا کے کہا۔ "اب میں آپ کی خدمت میں اپنی بیوی کو پیش کرتا ہوں۔"

"جی نہیں' شکریہ۔" دوسرا آدمی بولا۔ "میرے پاس پہلے ہی ایک بیوی موجود ہے۔"

●

میاں بیوی اپنے ہونے والے بچے کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ شوہر کہہ رہا تھا۔ "بچے کی آمد سے پہلے ہمیں یہ مکان تبدیل کر لینا چاہیے۔"

اُن کا پہلا بچہ ساری باتیں سن رہا تھا' وہ جلدی سے بولا۔ "ڈیڈی! مکان تبدیل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں' وہ وہاں بھی آ جائے گا۔"

●

ایک لڑکے نے اپنے کزن سے کہا۔ "جس دن میری شادی ہو گی' اُس دن بہت سی لڑکیاں روئیں گی۔"

کزن نے پوچھا۔ "کیا تم صرف ایک لڑکی سے شادی نہیں کرو گے؟"

●

"مجھے کوئی ایسی کتاب درکار ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ میں چھٹیاں کہاں گزاروں؟"

"یہ معلومات آپ کو ایک ہی کتاب سے مل سکتی ہیں۔" "اپنی چیک بک سے۔"

رفتار میں تیزی آگئی تھی۔ لباس پر یوں بھی توجّہ دیتے تھے، ان دنوں تو رنگ ڈھنگ ہی بدل گیا تھا۔ لگتا تھا جیسے انھوں نے دنیا تسخیر کر لی ہو۔ کئی مہینے اس سرشاری میں گزر گئے اور خانم شکوہ کناں ہونے لگی کہ اس طرح چوری چھپے سیّد صاحب کے پاس آنا اسے اچھا نہیں لگتا۔ وہ بیٹیوں کے سامنے خود کو مجرم محسوس کرتی ہے۔ اسے ملازموں کے سامنے بھی شرمندگی سی ہوتی ہے۔ یہ کیسا ستم ہے، وہ سیّد صاحب کی بیگم، اس گھر کی مالکہ ہے اور اپنے استحقاق کی دعوے دار نہیں ہے۔ اب سب کو بتا دینا چاہیے۔ خانم کو اولادِ نرینہ کی بڑی تمنّا تھی۔ پروفیسر کے زمانے میں گزر جانے والے بیٹے کی موت کی تلافی اس طرح ہو سکتی تھی۔ نصیر بابا کہتے تھے، اولاد سے تو تجدیدِ پیمان ہوتی ہے۔ اس سے بندھن مضبوط ہوتے ہیں۔ دربدرگی کے ان تعلّقات میں اولاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ بات خانم کے لیے بڑی سوہانِ روح تھی۔

سیّد صاحب کی پردہ پوشی کی رمز کچھ اُس وقت کُھلی جب ان کا چھوٹا بیٹا اسد علی لندن سے وارد ہوا۔ بیٹے آئیں یا بیٹی اور داماد، رئیس بیگم سیّد صاحب کی اولاد کی آمد پر پروانہ وار نثار ہو جاتی تھی۔ وہ اپنی خاطر تواضع سے اُن کی ماں کی کمی دُور کر دیتی تھی۔ سیّد صاحب نے بڑی ہدایتیں دی تھیں مگر ایک روز زنان خانے کے جھروکے میں اسد علی نے فروزاں کا جلوہ کر لیا۔ وہ دم بخود رہ گیا۔ والد صاحب سے سلسلہ جنبانی کی جرأت نہیں تھی۔ اُس نے رئیس بیگم سے فروزاں کی بات چھیڑی اور خوب منّت سماجت کی۔ رئیس بیگم نے جواب میں کسی لمحے کا توقّف نہیں کیا، معذرت کر دی کہ اسد علی اس قسم کی کوئی آس نہ لگائے تو بہتر ہے۔ فروزاں اپنے والد مرحوم پروفیسر کے ایک شاگرد ظفر سے منگ چکی ہے اور فروزاں خود بھی اس رشتے کی مدّعی ہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ظفر کے آنے کی دیر ہے، فروزاں اپنے گھر کی ہو جائے گی۔ یاسمن ابھی شادی کی عمر کو نہیں پہنچی ہے لیکن یاسمن کے لیے بھی پروفیسر اپنی زندگی میں رشتہ تلاش کر چکے تھے۔ یہ سن کے اسد علی پر آشفتگی طاری ہوئی۔ وہ ضد کرنے لگا کہ بابا چاہیں تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اُس نے نصیر بابا سے بھی ایک روز جھجکتے ہوئے سیّد صاحب سے بات [کرنے کی] درخواست کی۔ نصیر بابا نے موقع غنیمت جان کے سیّد صاحب کو اسد علی کی خواہش سے آگاہ کیا۔ [سیّد] صاحب کی برہمی پر انھیں تعجّب ہوا۔ انھوں نے نصیر [بابا کو] تاکید کی کہ وہ اسد علی کے دل سے یہ خیال نکالنے کی [کوشش] کریں اور نہ مانے تو واضح طور پر جتا دیں کہ اُس کے بارے میں قطعاً مجبور ہیں، انھیں اپنے دوست پروفیسر [...] الدّین سیفی سے کیے ہوئے وعدے کا پاس ہے۔ اسد علی [سے] رئیس بیگم نے جو کچھ کہا ہے، وہی صحیح ہے۔ اس کے [لیے] ایک سے ایک ماہ جبیں لڑکی ڈھونڈی جا سکتی ہے۔ نصیر بابا [نے] آقا کے حکم کی تعمیل کی، حالانکہ ان کے خیال میں ولایت [میں] پڑھنے والا اسد علی فروزاں کے لیے کوئی نامناسب [لڑکا نہیں] تھا۔ اُدھر سیّد صاحب ظفر کا باب تو ہمیشہ کے لیے بند کر [چکے] چکے ہیں۔ اب ان کے ذہن میں کیا ہے؟ اسد علی کے [لیے] فروزاں جیسی رشکِ ماہ تاب لڑکی انھیں ملنی مشکل [ہے]۔ آج نہیں تو کل، انھیں اپنے ہاتھوں سے فروزاں کی شادی کرنی ہی ہے۔ شاید خانم بھی منع نہ کرے۔ اسد علی نے [بڑے] ہاتھ پیر مارے، بڑی سرکشی کی، اور ایسا دل گرفتہ ہوا کہ ادھورا چھوڑ کے ولایت واپس چلا گیا۔

اُدھر خانم نے شدّت سے اصرار کرنا شروع کر دیا تھا، فروزاں اور یاسمن نے نیا گھر اور نیا ماحول اچھی طرح قبول کر لیا ہے۔ اب کوئی حرج نہیں۔ سیّد صاحب اور ان کی [اس] شادی کی نوید سے انھیں ایسا صدمہ نہیں ہوگا۔ ممکن ہے، وہ کچھ سکون ہی محسوس کریں۔ انھیں بھی تو اپنی ماں کا بہت خیال ہے۔ اس طرح انھیں اس گھر پہ اپنے حق کا احساس بھی حاصل ہوگا۔ گھر میں نصیر بابا اور رئیس بیگم، خانم اور سیّد صاحب کے خفیہ رشتۂ ازدواج کے گواہ تھے۔ خانم نے ان سے بھی داد خواہی کی کہ وہی سیّد صاحب کو ہموار کریں۔ ایک نہایت متبرک تعلّق، راز کیوں رہنے دیا جائے۔ اچھا ہو کہ [وہ] کر لے ایک مسلسل احساسِ ندامت سے نجات دلائی جائے۔ فروزاں اور یاسمن اب ایسی نادان بھی نہیں ہیں۔ سیّد صاحب نے حسبِ سابق کچھ اور مہلت مانگی اور اس مہلت میں ایک دن خانم کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اسے

پروفیسر جتنا وقت بھی نہیں ملا۔ وہی ڈاکٹر، حکیم اور ویدوں کا سلسلہ شروع ہوا اور قصّہ مختصر، ہفتے ڈیڑھ ہفتے کی کش مکش یا زور آزمائی کے بعد خانم بھی پروفیسر کے پاس چلی گئی۔

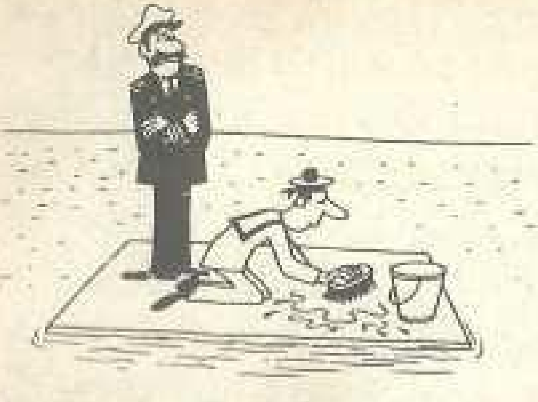
فروزاں اور یاسمن کو سکتہ ہو گیا تھا۔ ان کی ویرانی کا حال بیان کرتے ہوئے نصیر بابا بُڑبُڑانے لگے۔ اُن دونوں نے سب سے کنارہ کر لیا تھا اور اپنے کمرے میں محبوس ہو گئی تھیں۔ رئیس بیگم واری صدقے جاتی تھیں۔ سیّد صاحب ان کے لیے آسمان سے تارے لانے کے دعوے کرتے۔ صبر کی تلقین کرتے کرتے ان کی آواز ڈوب جاتی تھی اور ان کی آنکھیں سیلاب ہو جاتی تھیں۔ سب موت و حیات کا فلسفہ بیان کرتے تھے۔ کہتے تھے 'زندگی تو خدا کی امانت ہے' موت سے کسے مفر ہے۔ کوئی یہاں قیام کرنے والا نہیں۔ یہ سب تو پیدا کرنے والے کی مشیّت ہے، جسے چاہے، جب چاہے، پاس بُلا لے۔ اس موقع پر خدا کے حوالے خاصے کار آمد ہوتے ہیں۔ کئی دن تک گھر میں کلام پاک کا ورد ہوتا رہا اور مرحومہ کی روح کو ثواب پہنچایا جاتا رہا، اس کی منزلیں آسان کی جاتی رہیں۔ گھر کے سارے افراد اشک شوئی کے لیے فروزاں اور یاسمن کے ارد گرد رہتے تھے مگر صرف آنکھیں ہی تھوڑی روتی ہیں۔

نصیر بابا کا سر بھی اب گھومنے لگا تھا۔ دست و بازو کی طرح آدمی کے حواس کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جیل سے فرار ہو کے انھیں یہ سب کچھ دیکھنا تھا تو جیل ہی اچھی تھی۔ کاش وہ بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ جل مرتے۔ ایک دفعہ کی آگ، زندگی بھر کی آگ سے چھٹکارا دلا دیتی۔ ان کی زندگی تو ایک اتفاق ہے۔ بلوائیوں کے دھاوا بولتے وقت وہ گھر پہ ہوتے تو ان کا انجام بھی ماں باپ، بیوی بچّوں جیسا ہوتا۔ اب انھیں یہ مستعار زندگی واپس کر دینی چاہیے۔ بے اختیار زندگی تو موت سے بدتر ہے۔ موت کی سزا میں ایسی بے سکونی نہ ہو گی۔ نمک کا حق آخر کس قدر ہوتا ہے، ظرف سے سوا تو نہیں۔ کیا عجب کہ ایک یہ آخری اقدام عاقبت سنوارنے کا سبب بن جائے مگر اس سے پہلے انھیں فروزاں اور یاسمن کے لیے کوئی انتظام کرنا چاہیے۔ انھیں ظفر کو تلاش کرنا چاہیے۔ کچھ عرصے پہلے تک تو وہ درماندہ، درد آشنا، شکستگی سے دو چار شہر میں نظر آجاتا تھا۔ اب جانے [illegible] ہے۔ بہت سوچ سمجھ ہی کے قدم اٹھانا ہو گا۔ [illegible] نہیں کہ وہ خنجر لے کے نکل کھڑے ہوں۔ انھیں [illegible] یاسمن کے لیے بہتر عواقب کی ضمانت درکار تھی [illegible] تگ و دو میں رہے اور کچھ نہ کر سکے۔ انھیں [illegible] وحشت ہونے لگی تھی، وہ کیسے ادھورے [illegible] آدمی ہیں۔ انھوں نے تو بس ایک تماشائی [illegible] زندگی گزاری ہے۔ انھوں نے بس سانس لینے [illegible] قناعت کر لی ہے۔

ایک روز انھیں آسن سول میں ظفر نظر آیا۔ [illegible] پہلے کہ وہ حرفِ مدّعا زبان پر لاتے، ظفر نے ان کے [illegible] اور وہی دیوانگی کرنے لگا کہ ایک بار، صرف ایک [illegible] اور فروزاں یا یاسمن سے ملنے کا موقع فراہم [illegible] اسے دیکھ کے نصیر بابا کا جی چاہا کہ وہ گلے سے لگا کے [illegible] مگر وہ بُت بنے رہے۔ زباں کے بہت سے اندیشوں [illegible] انھیں گھیر لیا تھا۔ نصیر بابا نے خانم کے سانحے سے [illegible] نہیں کیا اور نہ کچھ اور بتایا۔ ظفر کے ہوش و حواس [illegible] موزونیت پر انھیں شبہ تھا۔ ظفر شہر میں تھا، کسی [illegible] سے بھی اس کی مڈبھیڑ ہو سکتی تھی۔ اس کے سامنے ظفر [illegible] ذرا سی لغزش ہو جاتی تو نصیر بابا کے لیے زندگی اور [illegible] ہو جاتی۔ انھوں نے ظفر سے یہ بھی نہیں کہا کہ اس کے [illegible] ہوئے خط خانم اور اس کی بیٹیوں کے پاس پہنچ ہی [illegible] پائے۔ ہاں، انھوں نے ظفر سے ایک اور خط لکھنے کی گزارش کی۔ اس خط کی انھیں بڑی ضرورت تھی۔ ظفر کی تحریر [illegible] حرماں نصیب فروزاں اور یاسمن کے ہاں امیدیں روشن ہو سکتی تھیں۔

شام کو اسی جگہ انھوں نے ظفر سے دوبارہ ملنے کا وقت طے کیا۔ گھر سے باہر نکلنے کا موقع اور عذر تلاش کرنے میں انھیں دیر ہو گئی۔ ظفر بے قراری سے ان کا منتظر تھا۔ نصیر بابا نے خط وصول کر کے کچھ حوصلہ کیا۔ انھوں نے دبے لفظوں میں ظفر کو عزم و استقامت کی نصیحت کے علاوہ خبردار بھی کیا کہ اب ان کے سوا وہ سیّد صاحب کے کسی ملازم سے کوئی علاقہ نہ رکھے۔ مناسب ہو گا کہ اب وہ آسن سول آیا ہی نہ [illegible]

و اس خط کے جواب کے لیے بھی اتنا متوحش نہ
ل کرے اور بہتری کی توقع رکھے۔ اب گزشتہ کی
ں ہوگا۔ دیر سے سہی' اُمید ہے' اس خط کا جواب
ئے گا۔ نصیر بابا نے اسے یقین دلایا کہ وہ خود اس سے
یں گے اور واضح رہے' ان دونوں کی ملاقات کی
سی کو پڑ گئی تو دونوں کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ ظفر
سول سے آدھ گھنٹے کی مسافت پر دھن پلو شہر کا پتہ
ی عاجزی پر نصیر بابا کا دل بھر آیا۔ ایک بار تو ان کے
ائی کہ وہ اسے سارا احوال بتادیں۔ انھوں نے خود کو
ظفر بہرحال ایک نوجوان تھا۔ جوانی جلد ہی آگ پکڑ
۔ وہ بہت پاگل بھی ہو سکتا تھا۔ پھر فروزاں اور یاسمن
ے نصیر بابا کی آنکھوں میں در آئے۔ درمیان میں وہ
بھی تو ہیں' صرف ظفر اور نصیر بابا کا معاملہ تو نہیں۔
ط جیب میں رکھ کے وہ واپس گھر آگئے۔ جیسے اُنھوں
ول چوری کی ہو' چوری پکڑی نہ جائے' ان کا دل دھکڑ
کر رہا۔ زنان خانے میں ان کی آمد و رفت پر کوئی پابندی
تھی۔ وہ خود ہی دستکیں دیتے اور کھنکارتے ہوئے ادھر
تے تھے۔ خط کی وجہ سے ان پر احتیاط کا احساس اور غالب
اللہ رئیس بیگم اور دیگر ملازمائیں ان دنوں بطور خاص
زاں اور یاسمن کی نگہداشت اور دل داری کے لیے ان
ارد موجود رہتی تھیں۔ ایسے میں فروزاں اور یاسمن کے
ے کا رخ کرتے ہوئے نصیر بابا کے قدم اٹکتے تھے۔
انھیں تین دن تک موقع نہیں ملا اور تین دن تک انھیں
د بھی نہیں آئی۔ اصل میں خط سپرد کرنا دوسرا مرحلہ تھا'
اس سے پہلے فروزاں اور یاسمن کو عقل و ہوش کا درس دینا
ضروری تھا۔ چوتھے دن انھوں نے ہمت باندھی۔ ایک بے
ضرر سی ترکیب ان کے منتشر دماغ میں آئی تھی۔ یاسمن اور
فروزاں کے کمرے کے باہر کھڑے ہو کے انھوں نے ملازمہ
اس سے کہا کہ وہ فروزاں اور یاسمن میں سے کسی کو ذرا باہر
بلادے۔ مولوی معظم علی نے ردِّ بلا اور سکونِ قلب کے لیے
ایک آزمودہ اور آسان سا وظیفہ تجویز کیا ہے۔ اللہ نے چاہا'
اس کے ورد سے دونوں بہنوں کی تشفی ہوگی۔ سادہ مزاج نصیر
بابا پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔



حفظِ ماتقدم کے طور پر نصیر بابا نے یہاں تک خیال رکھا تھا
کہ قریبی مسجد کے مولوی معظم علی کی خدمت میں حاضر
ہو کے مذکورہ وظیفہ لکھوا لائے تھے اور اُن کے سامنے اسے
حفظ بھی کرلیا تھا۔ یاسمن فوراً باہر آگئی۔ اس نے پژمردگی
سے نصیر بابا کو سلام کیا اور سر جھکائے کھڑی رہی۔ امثل
سامنے نہیں تھی۔ نصیر بابا نے وظیفے کا پرزہ یاسمن کے حوالے
کیا اور سرگوشیانہ انداز میں جلدی جلدی کہا کہ یاسمن ذرا
توجہ سے سنے' اس سے ملنے کے لیے انھوں نے اس پرزے
کا سہارا لیا ہے' کوئی اہم چیز اسے سپرد کرنی ہے' لیکن اس سے
پہلے ضروری بات بھی کرنی ہے اور بات تفصیلی ہے اس لیے
یہاں بیان نہیں کی جاسکتی۔ یاسمن اور فروزاں پہلے کی طرح
زنان خانے میں گھومنا پھرنا شروع کریں تو ان تک رسائی
آسان ہو جائے۔ یاسمن مبہوت ہوگئی تھی۔ اس نے پہلے
ہو سے دیدوں سے پوچھا کہ ایسی کیا بات ہے؟ نصیر بابا نے اس
کے سر پہ ہاتھ رکھ کے دلاسا دیا کہ وہ پریشان نہ ہو' اور خیال
رہے کہ آنے والے دنوں میں دونوں انھیں پھر ضرور ملیں
عجلت اور بدحواسی سے اجتناب کریں۔ یہ بھی بات ہے' ان
کی خیر خواہی سے متعلق ہے اور وہ ان کے شکوں کے بغیر
ممکن بھی نہیں ہے۔ بس انھیں اپنے آپ کو سنبھالے رکھنا'
زبان بند رکھنا اور محتاط رہنا ہے۔ حیرت زدہ یاسمن نے پوچھا'
پھر اب وہ ان سے کب ملیں گے؟ نصیر بابا نے بتایا کہ وہ زنان
خانے کا پھیرا لگاتے رہیں گے ورنہ قریب تو رہیں گے ہی۔
ان کی کوشش ہوگی کہ جلد ہی انھیں کوئی موقع مل جائے اور
وہ صراحت سے اسے یا فروزاں کو کچھ باور کرا سکیں۔
وہ یاسمن کو حیران و پریشان چھوڑ کے وہاں سے چل

نصیر بابا کا قیاس درست نکلا، فروزاں اور یاسمن نے اسی دن سے اپنے کمرے میں بند رہنے کا طور ترک کر دیا۔ لیکن چار دن ایسے ہی گزر گئے۔ یاسمن اور فروزاں سے کئی بار نصیر بابا کا آمنا سامنا ہوا مگر تنہائی میں بات کرنے کی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ وہ مسلسل اسی فکر میں لگے ہوئے تھے اور انھیں ملال ہو رہا تھا کہ یاسمن اور فروزاں ان سے کہیں زیادہ مضطرب ہو رہی ہوں گی۔ پانچویں دن شام کا وقت تھا، سیّد صاحب گھر پر موجود نہیں تھے۔ نصیر بابا عقبی سبزہ زار کے اُس حصّے کی طرف چلے گئے جو خواتین کے لیے مخصوص تھا۔ فراغت کے اوقات میں عادت کے مطابق وہ کیاریاں درست کرنے لگے۔ یاسمن نے جھروکے سے انھیں دیکھ لیا۔ زنان خانے کی صورتِ حال بھی موافق ہوگی جبھی لمحوں میں وہ نصیر بابا کے پاس پہنچ گئی۔ نصیر بابا نے کیاریوں سے پھول توڑ کے چھوٹا سا گل دستہ بنایا اور ہر طرف سے مطمئن ہو کے ظفر کا مڑا تڑا رقعہ گل دستے کے ساتھ یاسمن کو پیش کر دیا۔ یہ ظفر میاں کا خط ہے بی بی! انھوں نے دھڑکتی آواز میں کہا۔ "پڑھ کے فوراً جلا دینا۔" ظفر کے نام پر یاسمن دنگ رہ گئی۔ نصیر بابا نے مختصر وقت میں جتنا کچھ ممکن تھا، بہ عجلت تمام یاسمن کو آگاہ کیا اور کہا کہ اب سارا معاملہ ان دونوں پر ہے کہ وہ کس ہوش مندی اور حوصلہ مندی سے آنے والا وقت بسر کرتی ہیں۔ انھیں سیّد صاحب، رئیس بیگم اور ملازموں کے سامنے اپنی حالت کی بحالی اور اوسان کی درستی کا تاثر دینا ہے تاکہ نگراں ملازموں کی بھیڑ اطراف سے چھٹ جائے۔ رئیس بیگم کی شیدائیت اور فدائیت کے جواب میں انھیں بھی اس کے ساتھ تپاک سے پیش آنا ہے۔ انھیں گھر کے ہر فرد کو یہ جتانا ہے کہ اپنی ماں کے سانحے پر انھوں نے صبر و شکر کر لیا ہے۔ سب اللہ کی جانب سے ہے، اور وہ اس گھر کا حصّہ ہیں، ان کا مستقبل تو اسی گھر سے وابستہ ہے۔ نصیر بابا نے یاسمن سے کہا، "انھیں معلوم ہے، یہاں تک تو سب ٹھیک تھا لیکن ظفر کا خط پڑھنے کے بعد ان پر گزرنے والی کیفیت بڑی مختلف ہوگی۔ بہت اندھیرا اور حبس انھیں یہاں محسوس ہوگا۔ ان پر ایک ایک لمحہ عذاب ہو سکتا ہے۔ انھیں اپنے اردگرد ہمہ دم مستعد پرسانِ حال، اپنے خدمت گار سے بڑی گھٹن آئے گی اور ڈر بھی لگے گا۔ وہ جان لیں وقت ان کی آزمائش کا ہے۔ نصیر بابا ادھر اپنی کوششوں لگے رہیں گے مگر دیر ہو سکتی ہے، بہت دیر بھی ہو سکتی بھی انھیں امّید ہے، کوئی راہ ضرور نکل آئے گی۔ وہ ا سے مسلسل رابطہ رکھیں گے۔ اس خط کا جواب بھی پہنچا دیں گے۔ جواب صرف دو سطری ہونا چاہیے۔ صر خط کی رسید اور اپنی خیریت سے ظفر کو مطلع کرنا ہے اور ا ہے، اس سے پہلے اس کا کوئی خط فروزاں اور یاسمن کو مل پایا ہے۔ تفصیلی جواب وہ بعد میں لکھیں گی۔ اپنی ماں بارے میں بھی انھیں ایک لفظ نہیں لکھنا۔ سرگراں ظفر کوئی بھی الٹا سیدھا قدم اٹھ سکتا ہے۔ فروزاں اور یاسمن یقین کرنا چاہیے کہ وہ اس گھر میں تنہا نہیں ہیں۔ ایک بو آدمی نگراں کا بہی خواہ، ان کا غم گسار نصیر بابا زندہ ہے۔ ا موت بھی آنے لگی تو وہ یوں انھیں بے آسرا چھوڑ کے نہیں جائے گا۔ نصیر بابا نے عزم سے کہا، "ایک فیصلہ تو ہر و ان کے پاس محفوظ ہے۔ وہ بھروسا رکھیں۔"

ہکّا بکّا یاسمن سنتی رہی۔ نصیر بابا نے اسے اپنے پاس نہیں ٹھیرنے دیا اور آیندہ بھی چاروں طرف سے مطمئن ہو کے اپنے قریب آنے کی تاکید کی اور کہا کہ دونوں بہنوں اور نصیر بابا کے درمیان غیر معمولی ربط و ضبط کا کسی کو احساس نہ ہونے پائے۔

ظفر کا خط ملنے کے بعد یاسمن کو پر لگ کے اپنی بہن فروزاں کے پاس پہنچنے کی وحشت ہونی چاہیے تھی مگر اس نے ص تحمّل کا ثبوت دیا، کوئی جلدی نہیں کی۔ وہ شدید کش مکش اور تشنّج سے دوچار نظر آتی تھی۔ اسی حالت میں وہ نصیر بابا کے پاس سے ہٹ گئی اور آہستہ قدموں سے دور ہوتی گئی۔

نصیر بابا سوکھے ہونٹوں سے بولے کہ انھیں اتنے ہی الفا آتے تھے۔ ان کی زبان ہی ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔ یاسمن کا دھواں دھواں چہرہ دیکھ کے ان کا سینہ کٹ رہا تھا۔ شکر ہے، یاسمن نے ان سے سوال جواب نہیں کیے، وہ خاموشی سے چلی گئی۔ کسی گوشے سے اچانک کسی کے نمودار ہو جانے کا خدشہ نصیر بابا کو اور ہولائے ہوئے تھا۔ یاسمن کے

ے ہی انھیں ایک اور وسوسے نے آگھیرا کہ ان سے کوئی
ک تو نہیں ہو گئی؟ ظفر کا خط پڑھنے کے بعد تو دونوں بہنوں
یک باب حیرت کھل جائے گا۔ اب تک یہ گھر ان کے لیے
زنداں نہیں تھا؟ اب تو سب کچھ انھیں بدلا ہوا نظر آئے
گا۔ نصیر پاپا نے کتنی آسانی سے ہدایتیں جاری کر دیں' یہ
سوچے سمجھے بغیر کہ سامنے کون ہے' وہ تو شیشے کی طرح نازک
ہیں' کس حد تک ان کے احکام کی گراں باری کی متحمل
ہوں گی' انھیں یہ زمانہ سازی' یہ سوانگ اور بہروپ کہاں
آتا ہے۔ انھیں کبھی اتنے چھوٹے لوگوں سے کب واسطہ
پڑا ہوگا۔ وہ تو بڑے صاف و شفاف اطوار کی لڑکیاں ہیں۔
انھیں تو جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا ہوگا کیوں کہ انھیں کبھی
اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی ہوگی۔ نصیر پاپا کو یہ فکر کھائے
جا رہی تھی کہ فروزاں اور یاسمن پر خوف و دہشت کے علاوہ
مایوسی اور اداسی کا غلبہ بھی ہو سکتا ہے اور وہ' وہ...... ایک
اختیار تو ان کے ہاتھ میں بھی ہے' مایوسی میں آدمی زیادہ کم
زور ہو جاتا ہے۔ اے خدا انھیں ہمت و استقامت دے'
اے خدا انھیں اپنی امان میں رکھ۔ نصیر پاپا نے ظفر کا خط
نہیں پڑھا تھا۔ ظاہر ہے' ظفر نے اپنی بے بسی و بے چارگی کا
حال رقم کیا ہوگا۔ کاش ظفر کی تحریر ہی جوت جلائے رکھے۔
نصیر پاپا کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ یاسمن کو گئے دیر نہیں
ہوئی تھی کہ ان کے قدم بے اختیار زنان خانے کی طرف اٹھ
گئے۔ وہ دونوں اپنے کمرے میں تھیں۔ نصیر پاپا ادھر ادھر کا
چکر لگاتے ہوئے واپس آ گئے۔ اس رات وہ صبح تک دعائیں
مانگتے رہے۔

مہمان خانے میں اُن دنوں ایک دو مہمان ٹھہرے ہوئے
تھے۔ نصیر پاپا سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ مہمانوں کو جیسے
تیسے ناشتے سے نمٹا کے انھوں نے فوراً" زنان خانے کا رخ
کیا۔ انھوں نے پھر ایک گل دستہ تیار کیا اور اپنی ہی تائید میں
نکل گئے۔ یاسمن کو انھوں نے کسی ملازمہ کے ذریعے
کمرے سے بلوا لیا۔ اسے دیکھ کے جیسے ان کی سانسیں بحال
ہو گئیں۔ ایک رات میں یاسمن کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔
آنکھیں انگارا ہو رہی تھیں۔ انھوں نے لرزتے ہاتھوں سے
گل دستہ اس کے حوالے کر کے سر پہ تھپکیاں دیں اور اس
سے پہلے کہ یاسمن کی آنکھیں چھلک جاتیں اور وہ انھیں روک لیتے
مڑ گئے۔

تین چار دن تک ان سے خود اپنی عادت کے دوام پر
عمل نہ ہو سکا۔ عام روش کے برعکس وہ کئی بار زنان
خانے جاتے رہے اور دوسرے ہی دن انھیں یہ محسوس ہوا کہ
لیے یاسمن سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ انھوں نے اس
ارادہ و عزم کے سابق درس کی تکرار کی۔ یاسمن نے اپنی والا
ظفر کے خط کا جواب ان کے سپرد کر دیا۔ نصیر پاپا کو خط کسی
حد تک اچھی اردو آتی تھی مگر انھوں نے سرسری ایک آدمی
کو روک کے عام سے کاغذ پہ چند سطری تحریر لکھوائی۔ اس
شخص کو اردو نہیں آتی تھی۔ نصیر پاپا بولتے گئے' وہ انگریزی
میں لکھتا گیا۔ کسی اور اجنبی سے نصیر پاپا نے ظفر کا پتا لفافے
پر درج کرایا اور یاسمن کے خط کے ساتھ اپنا رقعہ لفافے میں
بند کر کے لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ انھوں نے مرسل کا نام بھی
لفافے پر نہیں لکھا' نہ اپنے خط میں۔ ان کے مختصر خط کا متن
بہت سادہ تھا۔ انھوں نے لکھوایا تھا کہ دوسرا خط آنے تک
ظفر اپنی جگہ ٹھہرا رہے جب اسے بلایا جائے' تبھی آئے اور
اگر اپنی مرضی سے آئے تو ان سے ملنے کی کوشش نہ کرے
کرے۔ اُسے امید رکھنی چاہیے' شاید وہ جلد ہی اچھی خبر
سے اسے مطلع کر سکیں۔

وعدے کے مطابق ظفر کو انھوں نے جواب بھیج دیا تھا
لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ انھیں کب تک جلد مطلع کر سکے
کا یہ دوسرا وعدہ کس طرح اور کب پورا کر سکیں گے۔ یاسمن کا
خط کا جواب مل جانے کے بعد ظفر کے ذہن میں کوئی شک نہیں
شک تھا' اور تحریر اگر فروزاں کی ہے تو ظفر کے ساتھ کیا
جائے۔ کئی روز گزر گئے۔ یاسمن نے اشارۃً ان سے ایک بار
ظفر کا ذکر چھیڑا۔ نصیر پاپا نے کچھ نہیں چھپایا' صاف بتا دیا کہ
انھوں نے ظفر کو دشمن کی رسائی سے دور رکھا ہے۔ اس کا اس شہر
میں آنا مناسب نہیں ہے۔ انھوں نے اسے خط لکھنے سے بھی
منع کر دیا ہے۔ وہ اس کے ذریعے تو کوئی خط یہاں بھیج ہی
نہیں سکتا۔ اب تک وہ یہاں نہ آئے' خیریت ہے' آنے کا امکان
نہیں۔ دشمن بہ ایں دوری پر نہیں ہے۔ کسی دن کسی بہانے
وہ خود اس سے ملنے وہاں جائیں گے۔ یاسمن ان سے اصرار یا

ضد کرنے کا ناز نہیں کر سکتی تھی حالانکہ اس ناز برداری کی نصیر بابا کو بڑی حسرت تھی۔ دونوں بہنیں ان کی ہدایت کے عین مطابق غم فراموشی اور زندگی میں رغبت کے وظیفے پر بہ تدریج عمل کر رہی تھیں۔ سیّد صاحب، رئیس بیگم اور ملازم، فروزاں اور یاسمن میں اتنی سُرعت سے امید کی بحالی اور زندگی کی طرف مراجعت کے آثار پر بہت شاداں تھے۔ سیّد صاحب تو جب وہ سامنے آتیں، بہ قولِ شخصے، دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیتے۔ رئیس بیگم ان کے اشارے سونگھتی پھرتی تھی۔ ملازمہ اصل کے خیال میں فروزاں اور یاسمن میں یہ قرار اور استغنا مولوی معظم علی کے عطا کیے ہوئے وظیفے کی کرامت تھی۔ سیّد صاحب اسے رئیس بیگم کی مشاقی کا کرشمہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس حسنِ خدمت کے اعتراف میں ایک جڑاؤ گلوبند رئیس بیگم کے زیبِ گلو کیا۔ فروزاں اور یاسمن نے سیاہ لباس کے بجائے رنگ برنگے کپڑے پہننے شروع کر دیے تھے۔ وہ گھر میں اپنی ماں خانم کے نقش خود ہی مٹا رہی تھیں۔ کوئی اُن کے سامنے مرحومہ کا ذکر کر بیٹھتا تو وہ چُپ سادھ لیتیں جیسے ان کی ماں کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ انھوں نے اپنی آنکھیں آنسوؤں سے عاری کر لی تھیں۔ عمر ان کی زیادہ نہیں تھی، تجربہ بھی کچھ نہیں تھا لیکن پہلی شرط تو آدمی کا عقل و ہوش سے آراستہ ہونا ہے۔ کتابیں تو وہ مستقل پڑھتی رہی تھیں۔ کتاب پڑھنے والا آدمی زیادہ دیکھتا، زیادہ سنتا ہے۔ جو استاد نہیں کہہ پاتے، وہ کتابیں سکھا دیتی ہیں۔ سیّد صاحب نے بھی اپنے گھر میں ان کے لیے کتابوں کے ڈھیر لگا دیے تھے۔

وقت گزرنے پر نصیر بابا کے سر میں جالے پڑنے لگے۔ انھوں نے اپنی دانست میں کئی دروازے کھول دیے تھے مگر اب سمتیں جیسے ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ ظفر سے رابطہ ہو جانے، گھر میں فروزاں اور یاسمن کے گرد پاس بانوں کا حصار ٹوٹ جانے سے یہ مراد کہاں تھی کہ حصار ٹوٹ گیا، پاس بانوں کو موت آ گئی۔ اب کچھ بھی نصیر بابا کی دست رس سے دور نہیں، کچھ وقت جاتا ہے، کسی خوش گوار دن اور مبارک ساعت میں فروزاں اور یاسمن کو ایک اشارے کی ضرورت پڑے گی اور حویلیں سر ہو جائیں گی۔ درمیان میں حائل پتھروں اور کانٹوں کا نصیر بابا کو اتنا اندازہ اونچی اونچی دیواروں، پتھروں سے بھرے ستونوں دیواری، مسلح دربان اور نمک کا احترام کرنے والے زیادہ نا خداؤں پر اعتبار کرنے کی سرشت رکھنے والے سے آگے دور دور تک سیّد صاحب کا سکّہ چلتا تھا۔ سیّد صاحب کے ہم شہریوں میں ایک ایک سے واقف کیسے کیسے بلند اقبال، زور و اثر والے ان میں شامل وقت گزرا جا رہا تھا، دیر ہو جانے سے اور پیچیدگیاں پیدا کا احتمال تھا۔ زنان خانے جا کے فروزاں اور یاسمن نصیر بابا کا سر جھک جاتا تھا۔ انھیں دیکھتے ہی ان کے بکھری آرزوئیں نصیر بابا کو بہت آزردہ، بہت سراسیمہ تھیں، سوچتے سوچتے ان کے اعصاب جواب دینے تھے۔ ان کی منشا کی تعمیل میں فروزاں اور یاسمن نے کیسا جبر کیا ہے۔ بہروپ بھرنے والوں کے سامنے بہروپ ایک اذیت ناک مشقت ہے۔ کب تک وہ اس سوانگ تماشے پر قادر رہیں گی۔ کسی دن ان کا پیمانہ چھلک سکتا خواب اور تعبیر میں اتنی فصل نہیں ہونی چاہیے۔

نصیر بابا کو رئیس بیگم کی طرف سے بڑی فکر تھی۔ وہ خود اس خوش گمانی سے سرشار تھی کہ ماں کی موت فروزاں اور یاسمن کے نہاں خانے میں جو اندھیرا تیرتا اُسے اس نے اپنی حکمت سے اُجالے میں بدل دیا ہے۔ پہلا مرحلہ تھا۔ پہلے مرحلے کی تکمیل کے بعد اب وہ دو مرحلے کے لیے تیر و تفنگ، دشنہ و خنجر صیقل کر رہی ہوگی۔ دوسرا مرحلہ خانم کی طرح اس کی بیٹی فروزاں پر اپنے آزمانے کا ہے۔ سیّد صاحب نے ابھی سے بے صبری کا اظہار شروع کر دیا ہوگا۔ بے شک اب کے رئیس بیگم ہو جائے گی کہ اس کے سامنے خانم نہیں، فروزاں ہے۔ شعار خانم کو رئیس بیگم کی صورت شناسی سے زیادہ دیکھنے سمجھنے کی فرصت نہیں ملی تھی۔ خوش قسمتی سے خانم کی بیٹی فروزاں کو رئیس بیگم کی سیرت آشنائی کا موقع فراہم ہوا ہے۔ مگر اس گھر میں تو رئیس بیگم کی موجودی کا ایک ہی ہوا ہے۔ اس کا تمام عزّ و افتخار اس کے کار فسوں کے سبب سے ہے۔ وہ ایسی آسانی سے پسپائی قبول نہیں کرے گی۔ اس

لے اس کی عادت نہیں ہے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ
اپنے ولی نعمت کی نظروں میں سُرخ روئی کے لیے
کون سا حیلہ تراشے' کون سا پینترا بدلے' وہ انگلیاں
کرا بھی جانتی ہوگی اور فروزاں کا آب گینہ تو اس کی
زیادہ نازک ہے۔ وہ کہاں تک اپنی پیر کا بوجھ اٹھا
گی۔

وقت چپکے سے اور گزر گیا۔ نصیر بابا نے گھر سے باہر جا کے
کے نام ایک اور خط کسی سے لکھوالیا۔ انھیں اس کا بھی
خیال تھا۔ پہلے کی بات اور تھی' ظفر ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھا
نصیر بابا نے اُس کی آنکھوں میں دوبارہ خواب جگا دیے
اب اس کا حال دِگر ہوگا۔ نصیر بابا نے تصدیق نہیں کی
انھیں یقین تھا کہ فروزاں نے ان کی ہدایت سے بیش
ظفر کو کچھ نہیں لکھا ہوگا۔ لیکن جتنا بھی لکھا تھا' ظفر کے
ایک مقصود و مطلوب کی تحریر تھی۔ ظفر کے روز و
تو پھر اس کے بس میں نہ رہے ہوں گے۔ نصیر بابا کا خط
کے دوسرے ہی دن ظفر آسن سول آ گیا۔ شہر سے دور
غیر آباد مقام کی سنسان مسجد میں ان کی ملاقات ہوئی۔
انھیں دیکھ کے ظفر نے سوالوں کی یورش کر دی۔ نصیر بابا اس
سے اتنا ہی کہہ سکے کہ وہ ایک آدھے' ادھورے آدمی ہیں'
بلا کے اعتبار سے معذور بھی۔ جسمی نقص سے آلودہ
معذور نہیں ہوتا' غلام بھی معذور ہوتا ہے' بے اختیار بھی
معذور سے کم نہیں ہوتا۔ دنیا میں بہت سے آدمی اپنا کوئی
وجود نہیں رکھتے' وہ بھی ان میں سے ایک ہیں۔ نصیر بابا کو اپنی
بے کلی' بے سرو سامانی' جسم و جاں کی ناتوانی کا ایسا احساس
بھی نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے ظفر سے کہا کہ وہ حتمی طور پر
کچھ نہیں کہہ سکتے' صرف اس قدر کہ اسے ان کی طرح
آسمان سے لو لگانی چاہیے۔ وہ آسماں نشیں بھی تو سب کچھ
دیکھ رہا ہے۔ کیا ظفر بھول گیا' اس نے بھی تو کوئی گوشہ نہیں
چھوڑا تھا' قانون' پولیس' سفارشیں' دہائیاں۔ اس دن ظفر'
نصیر بابا کے بجھے ہوئے چہرے اور کھلائی ہوئی باتوں سے
بہت نا آسودہ ہوا مگر نصیر بابا' ایک تہی دست اُسے دے بھی کیا
سکتے تھے۔

نصیر بابا خاک کے بہانے اور فسانے وضع کرتے رہے کہ ایک

ملکۂ عالیہ

چین کی ایک ملکہ تاہو کی انتہائی عیاش اور سنگ دل تھی۔ اُس کی شبانہ محفلوں میں عورتیں اور مرد برہنہ ہو کر ناچتے تھے۔ اس روش سے تنگ آ کر کچھ درباریوں نے ملکہ کے خلاف ایک منصوبہ بنایا لیکن راز فاش ہو گیا۔ ملکہ نے درباریوں کو اس جسارت پر ایک نئے طریقے سے عبرت ناک سزا دی۔ اُس کے حکم پر ایک گڑھے میں آگ بھڑکائی گئی۔ گڑھے کے دہانے پر ایک آہنی بانس لگا دیا گیا۔ بانس پر چربی لگا دی گئی تھی۔ مجرموں کو حکم دیا گیا کہ وہ ایک ایک کر کے نٹوں کی طرح بانس پر چڑھیں اور گڑھا پار کریں۔ کوئی اجل گرفتہ بانس سے پھسل کر الاؤ میں گرتا تو ملکہ خوشی سے تالیاں بجاتی۔

اقبال فرید خان کا مطالعہ

دن کاش ان کے پاس جادو کی چھڑی آ جائے۔ وہ سیّد صاحب' رئیس بیگم' ملازم' دربان اور چار دیواری سے پار ممکنہ تعاقب کاروں کی بصارت اس چھڑی سے زائل کر دیں یا پھر ایسا ہو' کسی دن سیّد صاحب زمینوں کے دورے پر زیادہ وقت کے لیے گئے ہوئے ہوں تو تجربدست نصیر بابا زنان خانے میں داخل ہو جائیں' پھر کوئی بھی ان کے آڑے نہیں آئے گا یا وہ سیّد صاحب کی شکاری بندوق پر قبضہ کر لیں۔ بس انھیں اتنا وقت چاہیے کہ سیّد صاحب کے والا مرتبت احباب' افسران عالی مقام کی قلم رو سے وہ پرے ہو جائیں۔ اُن سے کوئی لغزش سرزد نہ ہو' فروزاں اور یاسمن کو کوئی گزند نہ پہنچ سکے۔ ورمیان میں کہیں' کسی جگہ وہ ملوث ہو گئیں تو' وہ تو پھولی مُولی کے مانند ہیں۔ گھر کی بات اور ہے' باہر کی دنیا دوسری ہے۔ نصیر بابا کو اپنے آپ پر شک ہونے لگتا کہ اُن سے کوئی نادانی تو نہیں ہو رہی؟ انھیں یہ گمان ہوتا ہے' سیّد صاحب اُن سے کچھ خفا ہو گئے ہیں۔ گھر کے ملازموں کی نظریں بھی انھیں کبھی کبھی بدلی ہوئی لگتیں۔ انھیں ہر دم یہی کھٹکا رہتا کہ کسی کو ذرا بھی ان پر شک ہو گیا تو کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔

یوں ہی دن گزرتے گئے اور نصیر بابا' فروزاں اور یاسمن کا سامنا کرتے ہوئے پہلو کترانے لگے۔ بس ایک بدترین فیصلے کا عزم انھیں توانا رکھتا تھا اور وہ تنہائی میں اپنے اس عزم کی تجدید کرتے رہتے تھے۔ انھیں صرف' فروزاں اور یاسمن

کے لیے ایک گوشۂ اماں کا یقین چاہیے تھا۔ اپنی کوئی فکر انھیں مطلق نہ تھی۔ اس کے بعد سارے بہتان' ساری سزاؤں کے لیے گریباں چاک کرنے کی ہمت اُن کے اندر موج زن تھی۔ پھر انھیں موت آجائے یا اُن کے لیے موت تجویز کردی جائے۔ اُنھیں معلوم تھا کہ ایسی موت زندگی سے نہایت اعلا ہوگی۔

اور پھر خدا نے' اُن کے بہ قول "بابا صاحب" کی صورت میں ایک صاحبِ دل بھیج دیا۔ اس دَوران حسبِ معمول کئی مہمان آئے' بڑے بڑے صاحبانِ زر اور صاحبانِ زور۔ اپنی بات کے دُھنی' قول و فعل کے پکّے۔ نصیر بابا سے وہ بہت مانوس بھی تھے' ان کا بڑا احترام کرتے تھے مگر کسی کے سامنے زبان کھولنے کی توفیق نصیر بابا کو نہ ہو سکی۔ جانے کیوں بھمل کو دیکھ کے انھیں ایسا لگا جیسے انھیں بس اسی کا انتظار تھا۔ پھر انھوں نے دیر بھی نہیں کی۔

سبزہ زار کی بینچ پر بیٹھے ہوئے ہمیں خاصا وقت ہو گیا تھا۔ نصیر بابا کا گلا ویسے بھی خشک ہونے لگا تھا اور اب کچھ کہنے کو رہ بھی نہیں گیا تھا۔ میں نے اُن کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے تسلّی دی تو وہ سسکنے لگے۔ میں نے ان کا بازو پکڑ کے انھیں اُٹھا دیا۔

میرے جسم میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ بھمل تو چوسر اور شطرنج کی طرح سوچ بچار میں لگا رہے گا۔ جی کرتا تھا' میں ہی جا کے سیّد محمود علی کو دیکھوں۔ میں بھی کوئی فیصلہ کرنے کی استطاعت رکھتا ہوں' میرے یہ ہاتھ پیر کس کام کے ہیں۔

سبزہ زار سے اُٹھ کے ہم راہ داری میں آ گئے۔ یہاں تیز روشنی تھی۔ بھمل نہ کمرے کے باہر موجود تھا نہ کمرے کے اندر۔ نصیر بابا مجھ سے الگ ہو کے عمارت کے وسطی حصّے کی جانب چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں کسی گوشے سے ابّن نمودار ہو گیا۔ مجھ سے کمرے میں بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ سینے میں بڑی کھولن ہو رہی تھی۔ ابّن نے کھانے کے لیے پوچھا تو میں نے منع کر دیا۔ میرے لہجے کی ترشی پر وہ چونک پڑا اور معذرتی انداز میں بولا کہ پہلے بھی وہ دو مرتبہ آ چکا ہے۔ بھمل نے اس سے کہہ دیا تھا کہ میں دیر سے کھاؤں گا اور جب ضرورت ہوگی' اسے طلب کر لیا جائے گا۔

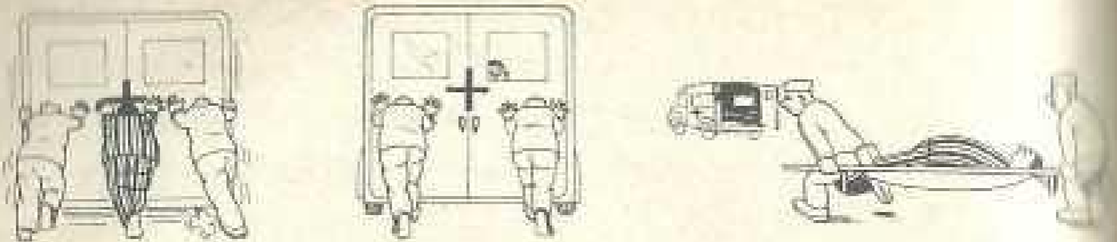
بھمل کے بارے میں استفسار پر ابّن نے بتایا کہ چند منٹ پہلے وہ کھانے کے کمرے کی طرف گیا ہے۔ سیّد صاحب مہمانوں کو رخصت ہوئے پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے ہوں گے' اس لیے آج کھانے میں دیر ہو گئی۔ اس گھر میں اب کچھ کھانے پینے کو دل ہی نہیں کرتا تھا' اتنا کچھ جانتے ہوئے جانے کس طرح بھمل شکم پُری کا مشغلہ جاری رکھے ہوئے تھا۔ مگر آج کی بات تھوڑی ہے' اسے تو پہلے ہی سب معلوم ہو چکا تھا اور کھانا ترک کر دینے سے کیا ہوتا ہے۔ جنگ کس کی تھی' یہ ساز و سامان' یہ خدمت گار۔ ابّن کے ساتھ میں بھی غیر ارادی طور پر کھانے کے کمرے تک آ گیا۔ لیکن دروازے میں داخل ہوتے ہی میرے قدم رک گئے۔ مجھ سے ابھی شاید اس شخص کا سامنا نہ ہو سکے۔ کسی طرح مجھ سے یہاں نہیں بیٹھا جائے گا۔ میرے لیے بہتر تھا کہ واپس چلا جاؤں۔

ابّن نے اندر جا کے بتا دیا کہ میں باہر ٹھیرا ہوا ہوں۔ اگلے لمحے اندر سے سیّد صاحب کی حلاوت آمیز آواز گونجی۔ "ارے بھئی' آئیے آئیے بابر میاں! باہر کیوں رک گئے۔ مبارک ہو' آج تو مٹھائی کھلانے کا دن ہے۔ واہ واہ ماشاء اللہ۔"

سیّد صاحب اندر سے اُٹھ کے میرے سامنے آ گئے۔

انھیں دیکھ کے آنکھوں میں دُھند اتر آئی تھی۔ سیّد صاحب نے میرا بازو تھاما تو سارا جسم متزلزل ہو گیا۔

چند لمحوں کے لیے دماغ سُن ہو گیا تھا۔ اس کشادہ اور مرصّع طعام گاہ میں پہلی بار میرا آنا ہوا تھا۔ یہاں مغربی' مشرقی' دونوں طرز کے انتظامات تھے۔ کمرے کے وسط میں وسیع میز کے اطراف کرسیاں رکھی تھیں اور سامنے کی دیوار کے ساتھ تخت بچھا تھا۔ چھت کے بیچ میں فانوس لٹک رہا تھا۔ دیواروں پر ابھرے ہوئے گل بُوٹے کندہ تھے اور ان میں شیشے جڑے تھے۔ فرش پر قالین چسپاں تھا۔ چاروں طرف دیواروں کے ساتھ صوفے پیوست تھے۔ "کہیے' اب کیا حال ہے۔ آج تو شہ زادے بہتر دکھائی دیتے ہیں۔" سیّد صاحب مسکراتے ہوئے مجھے تخت تک لے آئے۔ "بسم اللہ۔ آج واقعی بڑا وقت ہو گیا۔ کیا بتائیں' پنچے سے ایک پرانے واقف کار سرکاری افسر جب بھی اس طرف آتے ہیں' غریب خانے ضرور تشریف لاتے ہیں' اور جناب اچانک آ گئے۔



ساتھ میں ان کے دو تین احباب بھی تھے۔ محفل جم
کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے گزارش بھی کی مگر وہ
لوز دعو تھے۔" انھیں فوراً خیال آیا۔ "ارے وہ
اتو پرہیزی کھانا چل رہا ہو گا۔ آپ نے کھانا کھا لیا؟"
جواب دینے میں تامل ہوا۔
"ہاں کھو گئے؟" سیّد صاحب نے شگفتگی سے مجھے ٹوکا

"جی!" میں نے سٹ پٹا کے کہا۔ "جی نہیں، مجھے بھوک
نہیں ہے۔"
"رات کو تو کچھ نہ کچھ ضرور کھانا چاہیے اور بھوک نہ
لگنا جناب! اچھی نشانی نہیں ہے۔ دوا تو چل رہی ہے نا؟"
میں نے بہ مشکل اقرار میں سر ہلایا۔
"ولایتی دوا سے پہلے کچھ کھا لینا بہتر ہوتا ہے، میرا خیال
ہمارے ساتھ ہی بیٹھ جائیے۔ یہاں بھی چند ایسی چیزیں
ہیں جو آپ اطمینان سے کھا سکتے ہیں۔"
"رہنے دو صاحب!" بھل نے دخل دیا۔ "بھوک سے
کھائے تو ٹھیک ہے۔"
"یہ بھی مناسب ہے۔" سیّد صاحب نے برملا اس کی
کی اور اچھا ہوا کہ ان کی توجہ بھل کی جانب ہو گئی۔ "تو
آپ نے کیا کیا دیکھا یہاں؟"
"اتنے میں کیا دیکھتے، سارا ٹائم چکر میں رہے۔"
"میرے ساتھ چلیے، یہاں اِرد گِرد کے علاقے، خصوصاً
بانسا اور پورولیا شہر میں مسلمانوں کے مدرسوں سے
مجھے بہت واقفیت ہے۔ قبلہ مولوی شفیق اس طرف
کہیں ہوتے تو مجھے ضرور خبر ہوتی اور وہ اتنے قریب رہ کے
یہاں کیوں نہ آتے۔"
"اُن کا ہی نہیں تھا۔ اِدھری اتنے دن بندرہ کے گاؤں
گئی تھی۔ کھلے میں جا کے تھوڑے ہاتھ پاؤں بھی کھلے۔

آدمی کو جانور سے زیادہ ہریالی کی ضرورت پڑتی ہے، چرتا
نہیں تو کیا ہوا، آدمی بھی جنگل کا جانور ہے۔"
"بے شک، سبزہ زندگی ہے۔" سیّد صاحب چہکتی آواز
میں بولے۔ "اور یہاں کے کیا کہنے، یہاں تو زمین سے سبزہ
اُبلتا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں، زمین سونا اُگلتی ہے، یہاں کی زمین
سونا نہیں، ہیرے موتی اُگلتی ہے۔"
"اپنے کو اِدھری منہ مارنے کو چھوٹا موٹا ٹکڑا مل جائے گا؟"
بھل نے دھیرے سے پوچھا۔
سیّد صاحب اچھل پڑے۔ "کیوں نہیں، چھوٹا موٹا کیا،
آپ اشارہ کیجیے، بلکہ پہلے ارادہ تو کیجیے، لیکن... لیکن..." وہ
جھجکتے ہوئے بولے۔ "اور جگہوں کے مقابلے میں یہاں
زمین کسی قدر مہنگی ہے۔"
"اب منگا سستا کیا دیکھنا، آپ جو چوکٹ میں ملو گے۔"
سیّد صاحب نے قہقہہ لگایا۔ "ہاں ہاں، آپ نے صحیح کہا،
بالکل صحیح کہا۔" پھر وہ سنجیدہ ہو کے بولے۔ "آپ فرمائیں تو
کھوج لگاؤں؟"
"یہی بول رہے ہیں۔"
"ذرا سوچ لیجیے، بڑا فیصلہ ہے۔ کہاں بمبئی، کہاں یہ گاؤں
آسن سول۔"
"اِدھری آپ جو ہو۔"
"میں، میں کیا، ذرہ نوازی ہے آپ کی۔"
"سارا آپ پر ہے، اِدھری پاس رکھنا چاہتے ہو کہ نہیں۔"
"اس سے بڑی خوشی کی بات میری لیے کیا ہو سکتی ہے۔
میں کل ہی ٹوہ لگواتا ہوں، کچھ عرصہ گزرا، کسی نے مجھ سے
کہا بھی تھا بلکہ یاد آیا، پیچھے، کل رات ہی دعوت میں کلکٹر
صاحب اپنے کسی عزیز کی زمین کا ذکر کر رہے تھے۔"
میں تخت کے پاس صوفے پر بیٹھا ان دونوں کی گفتگو سن
رہا تھا اور میری آنکھیں جل رہی تھیں کہ بھل یہ کس قسم

کی باتیں کر رہا ہے۔ وہ تو اس طرح سیّد صاحب سے شیر و شکر ہے جیسے کوئی اور بات ہی اس کے دماغ میں نہ ہو۔ جیسے نصیر بیا نے جو کچھ مجھے بتایا ہے' بھل اس سے ناآشنا ہو۔

"آپ کا کیا خیال ہے یار میاں؟" یکایک سیّد صاحب نے میری جانب پہلو بدل لیا۔ "آپ کو یہ علاقہ کیسا لگتا ہے؟"

"جی' جی ہاں' اچھا ہے۔" میں نے ہکلاتی آواز میں کہا۔ "بہت اچھا ہے۔"

"آپ کیا کہتے ہیں؟ لگتا ہے' بیا صاحب نے تو یہیں ڈیرے ڈالنے کی ٹھان لی ہے۔"

میں بھل کی تائید کے سوا کیا کر سکتا تھا۔

"ایک اہم بات تو رہ گئی۔" سیّد صاحب نے شائستگی سے پوچھا۔ "کم از کم کتنی زمین کی بات کی جائے؟"

"جتنی آپ ٹھیک جانو۔"

"یہ تو گز ڈالنے والی بات ہے صاحب! اب بات ہزاروں تک جاتی ہے' کہیں کہیں تو اس سے زیادہ' بہت زیادہ' مجھے ایک اندازہ تو ہونا چاہیے۔"

"اپنے کو پتہ نہیں' آپ جیسا بولو۔"

"اس طرح کیسے؟" سیّد صاحب کسی قدر بے چینی سے بولے۔ "میری تو یہی خواہش ہوگی کہ آپ کی یہاں سب سے بڑی زمین ہو' کچھ مزا تو آئے۔"

"پھر آپ بڑی کی بات کرو' جتنی چاہے بڑی' بعد کو تو چھوٹی رہ جائے گی۔ کمتی بھی شاید بڑی پڑ جائے۔"

"نہیں صاحب' یہاں میں آپ سے اتفاق نہیں کرتا۔ جو آپ فرما رہے ہیں' وہ تو ہوتا ہی ہے' سب یہیں دھرا رہ جائے گا۔ وہ جو کہتے ہیں' جب لاد چلے گا بنجارہ' مگر یہ زندگی کیا کوئی خواب ہے؟ یہ کوئی جھوٹ ہے؟ یہ بھی تو ایک سچ ہے' اور جب تک ہے' اس کا پورا اسواد کیوں نہ لیا جائے' اگر سولو دست یاب ہو سکتا ہو۔ زندگی میں رس بھی بہت ہے۔ کسی کو نظر نہ آئے اور کوئی منہ پھیرے رکھے تو اسے کیا کہیں گے آپ؟ کیا اس آنے والی زندگی کے لیے سامنے کی اس زندگی پر خاک ڈال دی جائے؟ نہیں صاحب نہیں' یہ بات اپنے پلّے آج تک نہیں پڑی۔"

"پر اپنے نزت بھلا میں تھوڑا دوسروں کا بھی دھیان رہے۔"

"کیا مطلب؟ معاف کیجیے' میں سمجھا نہیں۔" ... صاحب کا چہرہ تمتمانے لگا۔

"جانے دو صاحب!"

"نہیں نہیں' آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"کیا بولیں۔ دیکھا ہے' اپنی رنگ بازی میں' کبھی دو ... پر بھی الٹی سیدھی چل جاتی ہے۔ کبھی کسی سے سنا تھا' ... کی طرف بھاگتے بھاگتے بیچ میں پڑنے والوں کا دھیان ... رہتا' اور جدھر رو گڑے سے پوتا تر ہوتا ہے' اُدھری کسی ... ضرور دیا ہوتا ہے۔ دھن کے بنا تو تنگی بھی نہیں ہوتی۔ ... کے بعد ایک' ایک سے بڑھ کے ایک۔ آدمی کو پھر ... بیٹھتا نہیں۔"

"آہا!" سیّد صاحب نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ ان کی آنکھیں بھی بند ہو گئیں۔ نیاز مندانہ انداز میں بولے۔ "واقعی جس نے کہا ہے' اچھا کہا ہے۔ جہاں تک ناچیز ... ہے' کوشش تو یہی رہتی ہے' اپنے عیش و عشرت میں ... دوسرے کا ضرر نہ ہو۔ آپ یہاں دیکھ ہی رہے ہیں۔"

"اچھی طرح سے دیکھ رہے ہیں۔"

"بس ہنس کھیل کر گزار لیتے ہیں' اور ہے بھی کیا ... روزہ زندگی ہے جناب! اپنا تو اصول ہے' جو مل جائے ... نہیں' جو نہ ملے' اس کی جستجو کرو' ہاتھ پاؤں چلاؤ' دماغ ... پھر بھی نہ ملے تو راستہ بدل لو۔ معلوم ہے' کوئی یوں آ کے ... جھولی میں ڈالنے سے رہا۔"

"ایسے کتنی بار راستہ بدل کیا ہے؟"

"جی!" سیّد صاحب پلکیں جھپکانے لگے۔ "سچ پوچھیے ... ابھی تک اس کی نوبت نہیں آئی۔"

بھل نے کوئی تبصرہ نہیں کیا' شکر ہے' بات آگے ... بڑھی ورنہ سیّد صاحب کچھ کھٹک گئے تھے۔ "ہم کیا ... کر رہے تھے؟" انھوں نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ بھل کے یاد دلانے پر ان کی آواز دمک اٹھی۔ "ہاں' میں کہہ رہا تھا جناب! ایسے نہیں' میرے لیے کوئی حد ... کر دیجیے۔ تاکہ میں اس کے اندر یا اس کے آس پاس ... حساب کتاب پھیلاؤں۔"

آپ کے لیے کوئی نہیں' جو حد آپ چاہو۔"

"یہ کیسی بات کر رہے ہیں آپ؟ شاید آپ سنجیدہ نہیں ہوتے۔"

"...کی بات بولتے تھے آپ! اپنے پاس اس کی کتائی ہے۔"

"ماشا اللہ' خدا کا فضل و کرم کیجیے۔ یہ بات ہوئی نا۔" سیّد ...ب کی آواز میں حیرت شامل تھی۔ ان کی نظریں بھمل پر ...ہو گئیں۔ "دیکھیے' میں دیکھتا ہوں۔" وہ تذبذب سے ...۔ "لیکن اچھا ہوگا' آپ بھی ساتھ ایک نظر دو ڈالیں۔"

"آپ سے اچھی نہیں ہے اپنی۔ دور کی' پاس کی' بھی ...س ہے یا نیر ہی بولو۔"

"...نفسی تو کوئی آپ سے سیکھے۔" سیّد صاحب ...انے لگے۔ "میرا کہنا تھا اب تو بابر میاں بھی رُو بہ صحت ...ان کی طرح آپ کل بھی نکل سکتے ہیں۔"

"پہلے آپ پکی کرلو' اور آپ کے ہوتے اپنے کو کیا ...۔"

"مجھ پر اتنا اعتبار مت کیجیے' میں بھی انسان ہوں۔"

"آپ جیسا ابھی تک نہیں دیکھا۔"

ایک لمحے کے تردّد و توقف کے بعد سیّد صاحب کھل کھلا ...۔ "خدا میری لاج رکھے' آپ مجھے کانٹوں میں گھسیٹ ...رہے ہیں۔"

"ابھی تو کانٹوں کی بات ہے' آگے دیکھو صاحب!"

...یری کے پیالے پر یک لخت سیّد صاحب کا ہاتھ رک ...پھر انھوں نے جلدی سے چمچا منہ میں رکھ لیا۔ "تیّار ...صاحب! چلیے یوں ہی سہی' آپ جان مانگیے۔"

...کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ زمین کی بات چھیڑنے ...طول دینے میں بھمل کی کیا منشا ہو سکتی ہے مگر یہ تو ایک ...اول مرحلہ تھا۔

"ایک بات بولیں مہاراج! اپنے کو جلدی ہے' ابھی آگے ...جانا ہے۔" بھمل نے رکھائی سے کہا۔ "یہ سامنے رکھ لو۔"

"آگے جانا ہے مگر ابھی تو آپ......!"

"وہ تو آپ ادھری ہو' جب بولو گے' لوٹ آئیں گے۔ ...بہت دن ہو گئے۔ تھوڑا گھر بار بھی دیکھنا ہے۔"

"مگر ابھی آپ کو جانا نہیں چاہیے۔ آپ بھول گئے۔ ڈاکٹر کشن نے کیا کہا تھا' بابر میاں کو پورے ہفتے آرام کرنا چاہیے۔"

"یہ تو نخرا ہے صاحب!"

"یہ ایک بڑی بیماری سے اُٹھے ہیں۔ ابھی دوا جاری ہے' ٹائی فائڈ تھا انھیں!" سیّد صاحب زور دے کے بولے۔ "ٹائی فائڈ کے بعد کم از کم ہفتے بھر مکمل آرام ضروری ہے۔"

"اپنے کو زیادہ آرام سے اکڑن ہو جاتی ہے۔"

"نہیں صاحب! میں آپ کو مشورہ نہیں دوں گا۔ کم از کم چند دن تو اور ٹھہریے۔ باقی آپ کی مرضی' میرا ارادہ تو بابر میاں کی صحت کی بحالی پر چھوٹا موٹا جشن منانے کا تھا۔"

بھمل نے بحث نہیں کی' کہنے لگا کہ وہ اپنی یہ حسرت بعد میں بھی پوری کر سکتے ہیں۔ زمین وغیرہ کی کوئی بات طے پائی تو ہمیں واپس آنا ہی ہے۔ یہ جشن اس وقت تک کے لیے موخر کیا جا سکتا ہے۔

"ارے صاحب!" سیّد صاحب مچل کے بولے۔ "کل پہ اتنا اعتبار کون کرے' کل کس نے دیکھی ہے۔ خوشی کے لمحے ارزاں ہوں تو لُوٹ لینے چاہئیں۔ زیادہ بڑی نہیں' چھوٹی سی محفل رکھیں گے۔ اس بہانے یہاں کے بعض خاص لوگوں سے آپ کا تعارف بھی ہو جائے گا۔"

"آپ کے بعد اب کسی سے جان پہچان کیا کرنا۔"

"یہ تو آپ کی نوازش ہے۔" انکسار میں سیّد صاحب کا جسم سمٹ گیا۔ "اصل میں وہ لوگ ابھی شہر میں ہیں۔" وہ رازداری سے بولے۔

"کون صاحب؟" بھمل نے چونک کے پوچھا۔

"ارے جناب وہی' جو کل رات چیف ایڈمنسٹریٹو کمشنر صاحب بہادر کی دعوت میں خاص طور سے بلائے گئے تھے۔ یاد رکھے جانے والے لوگ ہیں' اپنے فن میں طاق' ہر لحاظ سے یکتا و یگانہ۔ ساری رات جادو جگائے رکھا' رات بھر محفل چہکتی رہی۔ ابتدا ہی میں مجھے آپ کے صاحب ذوق ہونے کا اندازہ ہو گیا تھا۔ خود آپ نے بھی فرمایا تھا کہ شعر دل سے قریں ہے' غزل کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ کل رات آپ بہت یاد آئے۔ بس کیا بتائیں' کیسی محفل رہی۔ کم کم ایسا دیکھا

ہے۔ کمشنر صاحب بھی دنگ رہ گئے۔ چیدہ چیدہ لوگوں کا اجتماع تھا۔ خوب جمگھٹ رہا۔ کمشنر صاحب کو آج دلّی جانا تھا۔ میں نے گزارش کی تھی 'آج رات غریب خانے کو عزت دی جائے۔ افسوس کا اظہار کرنے لگے کہ دلّی میں طلبی ہے' رُک نہیں سکتے۔ خاک سار سے تو بہت خوش ہیں۔ ایک بار بس شکار کھلوایا تھا' اہتمام البتہ خاصا کرلیا تھا' بساط سے کچھ زیادہ۔ جنگل میں منگل کا سماں ہوگیا تھا۔ یہ گورے بھی کمال کے نشانے باز ہوتے ہیں۔ اچھی دھماچوکڑی رہی۔ رات کو جنگل میں محفل جمی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن' ایسی یاد اللہ ہوئی کہ کیا عرض کروں۔ اس طرف دورہ ہوتا ہے تو ضرور طلب کرتے ہیں۔ پوچھتے رہتے ہیں 'کوئی پریشانی تو نہیں ہے' کوئی کام ہو تو بتاؤ۔ خادم نے اپنا کوئی کام اُن سے نہیں کرایا ہے۔ ہاں' ایک بار مجبور ہوگیا۔ اِدھر قریب کے علاقے رام گڑھ میں ایک بڑے زمیں دار لالہ بشن داس رہتے ہیں۔ حالات آدمی کے ایک جیسے نہیں رہتے۔ قرض لینے کی نوبت آگئی۔ بُزرگوں کی زمین گروی رکھنا پڑگئی۔ پھر کسی طرف سے کوئی انتظام ہوا تو قرض خواہ کی نیت میں کھوٹ آگیا' ٹال مٹول کرنے لگا' آئیں بائیں شائیں کرتا رہا۔ مقصد وقت گزارنا تھا کہ لالہ کے پاس آنے والی رقم باقی نہ رہ سکے۔ وقت گزر گیا تو عدالت میں فیصلہ لالہ کے خلاف ہوگیا۔ آپ تو واقف ہی ہوں گے' ہر جگہ دَرپردہ الگ کھیل چلتا ہے۔ لالہ بشن داس کو کسی نے بتایا کہ گورے کمشنر سے سیّد محمود علی کی بڑی صاحب سلامت ہے۔"

ملازموں نے تخت پر بچھے ہوئے دستر خوان سے قابیں اٹھانی شروع کردی تھیں۔ سیّد صاحب منتشر ہوگئے اور ناگواری سے ملازموں کو حکم دیا کہ وہ بہ عجلت اپنا کام نمٹائیں۔ پھر اُنھوں نے بھٹّی سے معذرت کی کہ وہ یہ کیا ذکر لے بیٹھے' انھیں بے لطفی ہو رہی ہوگی۔ بھٹّی نے ان کی توقع کے مطابق جواب دیا کہ ان کی تدبر آمیز باتوں سے کوئی کیسے بے لطف ہوسکتا ہے' وہ سلسلۂ کلام جاری رکھیں' اور ہمیں جانا کہاں ہے۔ ملازموں نے قابیں اُٹھا کے قہوے کا طشت تخت پر رکھ دیا اور سلیقے سے ہم تینوں کے لیے چھوٹی چھوٹی پیالیاں قہوے سے بھردیں۔

"بس جناب!" سیّد صاحب قہوے کے گھونٹ سے تر کرکے بولے۔ "ایک دن کیا دیکھتا ہوں' لالہ ... میں موجود ہیں۔ ضرورت بھی آدمی کو کہاں کہاں ... ہے۔ راجوں مہاراجوں سے تعلق ہے لالہ کا ... خانہ' بہت لاؤ لشکر ہے۔ میں نے کہا' مجھے بلا لیا ہوتا' آپ نے کیوں زحمت کی' مجھے شرمندہ کیا۔ کہنے لگے ... تھی جھجک۔ خیر مدّعا بیان کیا' کام پیچیدہ تھا' عدالتی ... تھا۔ اوپر کی عدالت میں جانے اور وہاں سے کوئی ... میں بال سفید ہوسکتے ہیں۔ میری عجب مشکل تھی۔ انکار کردینا بھی ممکن نہ تھا۔ لالہ جیسے ذی حیثیت آدمی ... آنا اور دستِ سوال دراز کرنا' آپ سوچیے' کیسے ... پڑگیا ہوں گا۔ ڈر تھا کہ اگر کہیں لاٹ صاحب ... کے دماغ میں نہ آئی؟ مجھ سے بیان کی کوتاہی ہوگئی؟ ... کے سامنے کیا منہ لے کے جاؤں گا۔ خیر صاحب ... صاحب اس وقت پٹنے میں تھے۔ پٹنے جا کے ... خدمت میں حاضری کا خواست گار ہوا۔ باریابی میں ... گئی۔ بے کم و کاست مدّعا حضور والا کے گوش گزار ... کمشنر صاحب سوچ میں پڑگئے۔ منع بھی نہیں کرسکتے ... میں نے کہا' اگر معاملے میں پڑنے سے آپ کی ذات پر حرف آتا ہے تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔ کہنے لگے ... نو پرابلم' کوئی وعدہ نہیں۔ فائل یہیں چھوڑ جاؤ' ہم ... ہیں۔ میں نے واپس آکے یہی بات لالہ سے بیان کردی ... بھی پورا نہیں گزرا ہوگا کہ ایک روز لالہ گھوڑے پر ... ڈھول تاشے کے ساتھ مٹھائی اور ہار پھولوں کے ٹوکرے لدے پھندے گھر وارد ہوئے' گلے سے لگالیا۔ منہ ... لگے' سیّدا تم نے تو کمال کردیا۔ وہ بدذات جیوتی رام ... آکے کاغذات واپس کرگیا' اور کہہ گیا کہ پیسے جب چاہیں بھجوادیں۔ میں نے بھی اسی وقت منیم جی اور وکیل کے ساتھ ہرکارے دوڑا کے رقم بھجوادی اور رسید حاصل کرلی ... آپ نے گورے بہادر کا اقبال' اللہ اللہ۔ گورے بات کم کام زیادہ کرتے ہیں۔ اور صاحب' کرشمہ کرتے ہیں' کرشمہ ... سارے میں اس واقعے سے تاجیز کی رُسوائی ہوگئی۔ اس کے بعد نہ پوچھیے' یہاں کے افسران جو پہلے ہی کم مہربان نہ تھے ...

اذیت کا حال کیا بیان کروں۔ بس جناب! بھرم رہ
سید صاحب نے قہوے کی پیالی خالی کر کے مغل سے
کی سمع خراشی سے مراد تھی کہ جان پہچان بڑے کام
۔ رکھنی پڑتی ہے سلام دعا' غرض اور بے غرضی'
صورتوں میں۔ اس سے زندگی آسان ہو جاتی ہے۔ شہر
میں بھی اس عاجز کا نام لیجیے' اور......" سید صاحب
ہاتھ رکھ کے خود کو سرزنش کرنے لگے۔ "بڑے بول
"اللہ مجھے معاف کرے۔"
مغل سنتا رہا اور قہوے کی چسکیاں لیتا رہا۔ "کچھ جان
ہم بھی واری ہوئے ہیں۔" اس نے مدھم لہجے میں

"تو آپ کی محبت ہے جو اتنی عزت دے رہے ہیں۔"
"کوئی کیا دے سکتا ہے' یہ تو آدمی خود لیتا ہے۔"
"ہاں جناب! کیا اچھی بات کہی آپ نے' عزت ایسے
پڑی تو نہیں مل جاتی۔"
"اور ذلت کا بھی تھوڑا یہی چکر ہے۔"
سید صاحب کا جسم تن سا گیا' زبان میں بھی لکنت آگئی۔
"سب کچھ' سب کچھ آدمی کے اعمال پر موقوف ہے۔
ذلت دونوں اپنے ہاتھوں میں ہوتی ہیں' اور عزت کی
بڑی مشقت چاہتی ہے۔ ذلت کے لیے ایک نادانی بہت
ہے۔ آپ کتنی دل پر لگنے والی باتیں کرتے ہیں۔"
"پر دل ہی نہ ہو......"
"ہاں ہاں جناب!" سید صاحب سر ہلانے لگے۔ "دل کا
بھی لازم ہے۔ دل ہونے کا مطلب صاحب دل ہونا نہیں
لگتا ہے' ہماری آپ کی خوب چھنے گی۔"
"دیکھو صاحب' آپ پچھتاتے ہو کہ نہیں۔" مغل
مسکرایا۔
"میں' میں' میری طرف سے بے فکر رہیے۔ خوب
گزرے گی۔ بس کل سے کام شروع' انشاءاللہ کوئی نگینہ
ہی ڈھونڈیں گے۔"
"دوری پہ ہو تو بھی چلے گا۔ دور آنے جانے کا مزا اور ہوتا
ہے۔"
"بالکل' سفر کا اپنا ایک لطف ہے' میری زمین شہر میں ہے

ہی کتنی' نہ ہونے کے برابر' بیش تر تو ادھر ادھر بکھری پڑی
ہے۔"
"کچھ دام درم کی ضرورت بھی تو پڑے گی آپ کو' بولو تو
رتی ڈوری کھینچیں۔"
"دام درم کس لیے؟" سید صاحب نے حیرانی سے
پوچھا۔
"تھوڑا چارہ ڈالنے' بات پکی کرنے کو۔"
"یہاں زبان چلتی ہے' اور کہیں ضرورت پیش آئی تو اتنا
تو یہ خادم بھی انتظام کر سکتا ہے' لیکن ایک بات طے کیجیے'
بات پکی کرنے سے پہلے ایک نظر آپ کا دیکھنا ضروری ہے
اسی لیے گزارش کر رہا ہوں' ابھی آپ جانے کی جلدی نہ
کیجیے۔"
"اپنی زبان کو ہماری زبان سمجھو۔"
"پھر بھی' دیکھیے روپے پیسے کا معاملہ ہے' اپنے اطمینان
کے لیے مجھے آپ کی تصدیق کی ضرورت ہوگی۔ بہتر ہے'
آپ بھی اچھی طرح دیکھ بھال لیں۔"
"ہم نے آپ کو دیکھ لیا ہے۔"
"ٹھیک ہے صاحب!" سید صاحب زچ ہو کے بولے۔
"خدا میری عزت رکھے۔ میں کل ہی نکلتا ہوں مگر...... اس
محفل کا کیا رہا؟"
"وہ آپ کی مرضی پر ہے۔"
"ہاں تو ذرا مشکل ہے' پرسوں پر رکھیں؟"
مغل نے اقرار کیا نہ انکار۔
"معاف کیجیے' آپ کی جلدی نے میرے ارادے منتشر
کر دیے۔ خیال تھا' یار میاں چلتے پھرتے لگیں تو کسی روز
شکار پر چلیں۔ مجھے یاد ہے' آپ نے شکار کا شوق ظاہر کیا تھا۔"
"پر صرف جانوروں کا۔"
سید صاحب پہلے تو سنت بنائے' پھر ہنس کے بولے۔
"جانوروں ہی کی بات کر رہا ہوں۔"
"کبھی انسان کا بھی کھیلا؟"
سید صاحب کی پیشانی لکیروں سے بھر گئی۔ "آپ نے
کھیلا؟" ان کے لہجے میں واضح طور پر تلخی آگئی۔
"ہاں صاحب' جب بھی موقع لگے' کھیلتے ہیں اور ہم ہی

نے کیا کھیلا' جدھری دیکھو' کھیلا جاتا ہے۔ آدمی' آدمی کے پیچھے ہے۔ سب سے آسان شکار تو انسان کا ہوتا ہے۔ جال پھندے' ہتھیار کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ انسان تو سارے پالتو ہوتے ہیں' پالتو کا شکار آسان ہوتا ہے۔ بُرا تو نہیں مانے آپ؟"

"نہیں' نہیں۔" سیّد صاحب کے چہرے پر سکون کے آثار ہویدا ہوئے۔ "آپ سے ملاقات میرے لیے ایک نیا تجربہ ہے۔"

"ابھی تو شروع ہوئی ہے۔"

"اور' آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔" سیّد صاحب کے قہقہے سے طعام گاہ گونج اٹھی۔ "نشانہ کیسا ہے آپ کا؟" مضطربانہ اُنھوں نے پوچھا۔

"چُوک بھی جاتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے' کمال کا ہے۔"

"کام چل جاتا ہے' نشانے پر آنے والے سے بھی غلطی ہو جاتی ہے۔"

"یہ ایسا لگتا ہے' آپ وہ نہیں جو نظر آتے ہیں۔"

"پھر کیا ہیں؟"

"کچھ اور۔"

"کچھ اور کیا صاحب؟ صاف بولو۔"

"ارے بھائی یہی' بہت زمانہ دیکھے ہوئے' گرم و سرد آشنا۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولے۔

"اور لگتے کیا ہیں؟"

"لگتے بہت اچھے لگتے ہیں۔" سیّد صاحب کتراتی ہوئی زبان سے بولے۔ "سیدھے سادے' بھولے بھالے لگتے ہیں' اور کیا کہا جائے' آپ نے تو جناب بات پکڑ لی۔"

دیواری گھڑی کے ڈائل کے وسط میں چھوٹا سا دروازہ کھلنے پر کھٹاک کی آواز آئی' دروازے سے انگشت بھر چڑیا جھپاک سے برآمد ہوئی اور سر خم کر کے چہکنے لگی۔ ٹھیک گیارہ مرتبہ وہ چہکی۔ سیّد صاحب چونک پڑے اور معذرت کرتے ہوئے تخت سے اٹھ گئے۔ "وقت خاصا ہو گیا۔" اُنھوں نے متانت سے کہا۔ "آپ بھی آرام کیجیے۔"

ہم دونوں بھی کھڑے ہو گئے۔

دروازے سے باہر نکلتے نکلتے سید صاحب کو خیال آیا۔ "ارے یار میاں! حد ہو گئی جناب! یاد ہی نہیں رہا' آپ تو ابھی تک کچھ کھایا پیا ہی نہیں۔ کچھ کھانے پینے کو ہلکی غذا ضرور لیجیے یا پھل وغیرہ۔۔۔۔"

میں نے سر جھکا لیا۔

نصیر بابا اور ابنِ دوسرے ملازموں کے ساتھ باہر مستعد کھڑے تھے۔ ہمیں دیکھ کے وہ ایک طرف سیّد صاحب شب بخیر کہتے ہوئے زنان خانے کی طرف گئے۔ ابنِ میرے کھانا نہ کھانے کی وجہ سے بے چین معلوم ہوتا تھا۔ بھوک ہی نہیں لگ رہی تھی۔ ایسے میں بھوک لگتی بھی کیا۔ دماغ ہی حاضر نہ ہو یا جکڑا ہوا ہو تو جسم پابند ہو جاتا ہے۔ کمرے میں آ کے میں بستر پر لیٹ گیا۔ سب کچھ ذہن سے محو کر دینے کی کوشش کرتا رہا لیکن محمود علی کا چہرہ بار بار آنکھوں میں کھینچنے لگتا تھا۔ آدمی پُر پیچ ہوتی ہیں۔ کیسی دیدہ دلیری سے وہ باتیں کر رہا تھا' بنجل بھی کیسی ڈھٹائی سے سنتا رہا تھا۔ کبھی کبھی لگتا تھا' جیسے نصیر بابا کو کوئی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہر طرح کے لوگ ہر جگہ پائے جاتے ہیں اور سب ایسے نہیں ہوتے۔ اگر یاسمن کو میں خود نہ دیکھ لیتا تو شاید مجھے یقین آ تک۔ طعام گاہ میں کئی بار سینے میں غبار اٹھا اور جی چاہا کہ میں بھی سیّد سے کچھ کہوں مگر بنجل کی طرح مجھے اپنی زبان و لہجے پر قابو نہ رہ پاتا۔ اُس کے سامنے تو بیٹھنا ہی مجھے دوبھر ہو رہا تھا۔ بہرحال' بنجل کی کٹ حجتی اور طول کلامی بلاوجہ نہیں تھی' اور کچھ واضح نہیں ہو رہا تھا کہ اُس کے سر میں کیا تدبیریں سمائی ہوئی ہیں۔ یہ کوئی ایسا آسان کام تو نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ اندازے کی ذرا سی غلطی سے ہم نامعلوم حد تک بے اختیار ہو سکتے ہیں۔ بنجل کو بھی اس کا احساس ہو گا۔ مجھے کوئی کام نہیں تھا یا میرا وجود بھی محدود تھا لیکن بنجل کی تو بڑی ذمے داریاں تھیں۔ اُس کو تو بہت سے طلب گار تھے۔ ایک زرّیں ہی نہیں' اور بھی بہت سے' ایک میں بھی تو تھا۔

ابنِ میرے اردگرد منڈلا رہا تھا اور کسی اشارے کا منتظر تھا۔ نصیر بابا سے سارا ماجرا سن کے اب کسی ملازم کی

الب ہی نہیں ہو رہی تھی۔ بات کرنے کو بھی جی
ہا تھا۔ ابن کو نظروں سے دور کرنے کے لیے میں
کھانوں کی بابت پوچھا اور مرغ کا سادہ شوربہ لانے کی
ی۔ دس منٹ کے اندر اندر وہ آ گیا۔ طشت میں وہ
کی چیزیں سیٹ لایا تھا۔ میں نے اسے جلد ہی فارغ
جیسا کہ مجھے توقع تھی' اس کے جاتے ہی نصیر بابا
میں آ گئے اور دروازہ بند کر کے بھّل کے پلنگ کی
ہو گئے۔ کچھ دیر خاموشی رہی' پھر بھّل کی بڑبڑاتی
دی۔ "سویرے ہی ان کو تیاری کا بول دینا۔"
"کل ہی۔۔۔؟" نصیر بابا سنسناتی آواز میں بولے۔
"کل یا پرسوں' بولنا' گہنے پاتے' کاغذ نشانیاں ساتھ رکھ
زیادہ اعتبار نہیں' دو تین جوڑی کپڑے لا سکیں تو
ہے' نہیں تو ایسی ہی چلی آئیں۔"
"وہ حرافہ جو ناگن کی طرح پھن پھیلائے بیٹھی ہے۔"
کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔
"دیکھ لیں گے اس کو بھی۔"
"ایک وہی نہیں' اور بھی سور کھانے والے پہرے پر
"
"پڑا ہے۔" بھّل نے تنک کے کہا۔ "گھوڑا گاڑی میں
دیر نہیں لگے گی؟"
"نہیں' آسانی سے مل جاتی ہے۔" نصیر بابا ہانپتے ہوئے
لہجے سے بولے۔
"ابن یا نذرو کو باہر بھیج کر گاڑی بلوا لینا' پوچھیں تو ہمارا
ہے' ورنہ تم کو ادھر ہی رہنا ہے۔"
نصیر بابا کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ جلدی جلدی سر
ہلاتے رہے۔ "اور' اور بیچ میں بڑے صاحب آ گئے تو۔۔۔؟"
"ان کو کون روک سکتا ہے؟ آنے دو پھر۔۔۔"
"خدا خیر کرے۔" نصیر بابا کی آواز کانپ رہی تھی۔
"بولو تو ابھی نکل لیں پھر۔۔۔"
"نہیں نہیں' یہ مطلب نہیں' جو آپ نے سوچا ہے'
ٹھیک ہے' پر اپنے تو ہاتھ پاؤں' دماغ ہی ٹھکانے پر نہیں
"
"کھونٹے پر باندھ کے رکھو' تم کو دیکھ کے تو وہ آدمی
لگ

ہو جائیں گی۔"
"بس اللہ ساتھ خیریت کے معاملہ نمٹا دے۔ میں تو
ساری زندگی شکرانے کے نفل پڑھتا رہوں گا۔" نصیر بابا بکی
بکی آواز میں بولے۔ پھر کچھ توقف کے بعد بھڑک اٹھے۔
"اور' اور دروازے پر بھی دو رستم سہراب ڈٹے ہوئے ہیں۔
ایک کے پاس دونالی ہے' دوسرا لاٹھی لیے بھٹکتا رہتا ہے۔"
"پڑھیں گے کوئی منتر بابا!"
"بعض دفعہ خیال آتا ہے' میں نے آپ کا رستہ بھی کھوٹا
کیا' یہ یہاں کس چکر میں پھنسا دیا۔ خدانخواستہ کچھ اودھر
اودھر۔۔۔"
"اب تو پھندا ڈال ہی دیا ہے۔"
"مناسب سمجھیں تو کوئی اور وقت رکھ لیں' کچھ دنوں
بعد' ذرا اور دیکھ بھال کے۔۔۔"
بھّل ہنکاری بھر کے حقہ پینے لگا۔ نصیر بابا بت بنے بیٹھے
رہے۔ وقفے وقفے سے بھّل کے حقے کی گڑگڑاہٹ کمرے
میں گونجتی یا پھر نصیر بابا کی تیز سانسوں کی آواز' اور کمرے میں
سناٹا چھا جاتا۔ گھڑی کی ٹک ٹک تو خاموشی کا جزو بن چکی
تھی۔ روشنی کم کر کے نصیر بابا دبے پاؤں کمرے سے چلے
گئے۔
ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ بھّل بھی دیر تک بیٹھے
سے نقل کرتا رہا۔ صبح وہ حسب معمول جلدی اٹھ گیا تھا۔
نصیر بابا نے اٹھ کر مجھے قریب بلایا کہ بڑے صاحب باہر
جا رہے ہیں' انہیں بھّل ہی کے گھر سے ... اٹھایا ہے' ابھی
بھی ناشتے میں وہ شریک نہیں ہوں گے' دوپہر کے کھانے پر
بھی شاید ملاقات نہ ہو سکے۔ ہاں' اگر کوئی پروگرام ہوا تو گیارہ
بجے تک وہ گھر ہی رہیں گے۔
بھّل نے آنکھیں بچھا لیں۔ "ٹھیک ہے بابا!"
"اور ابھی ایک نئی بات ہوئی۔" نصیر بابا نے بھّل کے
اور قریب ہو کے سرگوشی کی۔ "بڑے صاحب بولتے تھے کہ
میں آپ دونوں پر ذرا نگاہ رکھوں۔ کہاں آتے جاتے ہیں'
انہوں نے یہ بھی کہا کہ خاطر و مدارات میں کوئی کمی نہ کی جائے۔"
"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" نصیر بابا کا چہرہ جل بجھ رہا تھا۔
بھّل کچھ دیر کے لیے چپ رہا' پھر اس نے نصیر بابا کو تاکید کی کہ

جیسے ہی سید صاحب باہر جائیں' اسے مطلع کر دیا جائے۔

کچھ دیر میں ڈاکٹر کشن آ گیا۔ پورے ہفتے' کل پہلی بار دوا میں تواتر نہیں رہا تھا۔ رات کی خوراک کا تو ناغہ ہو گیا تھا لیکن طبیعت بہتر تھی۔ نبض دیکھ کے اور سینے پر آلہ رکھ کے ڈاکٹر مطمئن ہو گیا۔ آج اس کی آمد بہت گراں گزر رہی تھی۔ کل کی طرح بنھل کے لیے ناشتہ کمرے میں آ چکا تھا۔ ڈاکٹر کشن نے آج پھلوں کے رس پر قناعت کی اور جلد ہی چلا گیا۔

میری نظریں گھڑی پر لگی ہوئی تھیں۔ ابھی دس بجے' دیر نہیں ہوئی تھی کہ نصیر بابا بولائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور ہانپتی آواز میں بولے۔ "وہ چلے گئے ہیں اور شام تک آنے کا کہہ گئے ہیں۔"

بنھل نے انہیں تسلی سے بیٹھ جانے کو کہا اور چائے دانی سے چائے انڈیل کے اپنے لیے چائے بنائی۔ نصیر بابا کو کسی پہلو قرار نہیں تھا۔ چہرے پر ایک رنگ آتا' ایک جاتا تھا۔

"آج تو بڑی گھبری ہے سارے میں۔" بنھل نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ہاں' لیکن گھرے' گھرے بادل نہیں ہیں۔" نصیر بابا حواس باختگی سے بولے۔ "اور کچھ کہا بھی نہیں جاسکتا' کب چھلک پڑیں۔"

"اُدھری دونوں کو بول دیا ہے؟"

"ہاں ہاں' کہہ آیا ہوں' بڑی گھبرا رہی ہیں' بالکل پیلی پڑ گئی ہیں۔"

بنھل نے چائے نوشی اور حقہ کشی میں وقت صرف کر دیا' پھر کہیں گھڑی پر نظر ڈال کے کرسی سے اٹھنا چاہتے تھے۔ اتنی دیر میں ابن بھی آ گیا تھا۔ بنھل نے تانگا لانے اور بہ طورِ خاص عمارت کے اندر تانگا ٹھہرا... ہدایت کی۔

ابن نے فدویانہ انداز میں پوچھا۔ "باہر جانے کا' بابا؟"

"ہاں رے۔" بنھل نے ناگواری سے کہا۔

"دوپہر کا کھانا ______؟"

"کھائیں گے رے اُدھری' لوٹ کے۔"

ابن چند لمحے متذبذب ہوا تھا مگر اس نے مز... مزاحمت نہیں چاہی اور کمرے سے نکل گیا۔ اس کے ... ہی بنھل نے مجھے مخاطب کیا۔ "تو بابا کے ساتھ اُ... دیکھ' خالی مت جانا۔"

اس کا اشارہ میں سمجھ گیا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے سنسناتی آواز میں کہا۔ "... مجھ سے زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ ... نصیر بابا کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا' میں نے جلدی ... اٹیچی کھولی۔ سیدھے پھل کا کھٹکے والا یہ اصلی رام پوری ... لکھنؤ میں مجھے شمشاد خاں نے دیا تھا۔ دونوں باہر ... تھے۔ بنھل وہیں ٹھہرا رہا۔ میں آہستہ قدموں نصیر ... پیچھے پیچھے عقبی راستے کی طرف چل پڑا۔ ہمارا رخ ... خانے کی طرف تھا۔



بازی گر' سب رنگ کا سب سے مقبول سلسلہ
ایک سینہ فگار و سرگزار نوجوان کا فسانۂ زندگی
پانچویں درویش کی داستانِ عبرت ستاں۔
وہ تحریر جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔
باقی واقعات آئندہ شمارے میں۔

شوشہ طراز، شرارہ کار، طنز از جمال، طنز ...
آرٹ بکوالڈ کی طرف سے چند زخم گہرے، مشاہدہ آفرین ...
دُنیا کے ساڑھے پانچ سو سرکردہ اخباروں کے قارئین روزانہ ...
تیر و نشتر کا ہدف بنتے ہیں ...
آرٹ بکوالڈ کے کچھ اور منتخب ... کالم

...ن ساز



...ں آپ کو بتاتا ہوں کہ اس وقت میں کس بات سے بے ...ف زدہ ہوں۔ آیندہ جنگِ عظیم کا آغاز دو ممالک کی وجہ ...یں ہو گا بلکہ اس کا سبب بڑے ٹیلی ویژن نیٹ ورکس ... کسی ایک کا میزبان ہو گا۔

...ج کل میں ٹی وی پر فاک لینڈ آئی لینڈز کے متعلق تمام ... باقاعدگی سے دیکھ رہا ہوں اور بہت سنجیدگی سے یہ ...س کر رہا ہوں کہ متعلقہ لیڈروں سے انٹرویو کرنے والا ... انہیں اپنی گفتگو سے اس طرح گھیرنے کی کوشش کرتا ... ان کے لیے بچ نکلنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔ میں ...ڈراؤنا خواب دیکھا ہے، اس کا احوال کچھ یوں ہے۔

...بان اپنی میز کرسی پر براجمان ہے اور اس کی پشت پر ...وی سی اسکرین ہے۔ وہ ناظرین سے مخاطب ہوتا ہے۔

...ظرین کرام! چند لمحوں بعد ہم ارجنٹائنا کے وزیرِ جنگ مسٹر راؤرگز سے گفتگو کریں گے..... مسٹر راؤرگز! کیا آپ کے خیال میں موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر کوئی اور راستہ باقی رہ جاتا ہے، جنگ کے سوا؟"

"ارجنٹائنا نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ وہ ایک باعزت حل کی خاطر گفت و شنید کے لیے تیار ہے۔"

"لیکن فرض کیجئے کہ برطانیہ آپ کے بحری جہازوں میں سے کوئی ایک ڈبو دیتا ہے تو؟"

"تب ہم اپنے اسلحہ خانے میں موجود ہر شے سے ان پر حملہ کریں گے۔"

"شکریہ جناب عالی! اور ناظرین! اب ہم آپ کو لندن لیے چلتے ہیں جہاں ہمارے اسٹوڈیو میں خارجی معاملات کے انڈر سیکرٹری مسٹر ایولن پرین تشریف فرما ہیں۔ مسٹر پرین! جیسا کہ ابھی ابھی آپ نے سنا، ارجنٹائنا کے وزیرِ جنگ نے فرمایا ہے کہ وہ برطانیہ کے بحری بیڑے پر اسلحہ خانے میں موجود ہر شے سے حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہمیں ... چاہیے کہ اس سے ان کی مراد بم بار طیاروں اور ... سے ہے۔ برطانیہ عظمیٰ کا اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے کیا منصوبہ ہو گا؟"

"میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمیں اس قسم کی بھی صورتِ حال کا سامنا ہو گا ہم اس سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ملکہ عالیہ کی حکومت ... کے ذریعے پُرامن طریقے سے حل کرنا چاہتی ہے اور کوئی بھی جنگ کرنے کا خواہاں نہیں ہے لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی واضح کر دینا چاہوں گا کہ اس وقت ہماری عزت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔"

"میں بخوبی سمجھ رہا ہوں سر! لیکن فرض کیجئے کہ ارجنٹائنا کا

ترجمہ: سلیم انور

کی حکومت مذاکرات کی میز پر آنے سے انکار کر دے تو کیا آپ اپنی عزت اور وقار کی خاطر ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کے لیے تیار ہیں؟"

"میں نہیں سمجھتا کہ یہ جگہ یا یہ وقت اس بات پر گفتگو کے لیے مناسب ہے کہ کیا ہمیں ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کا اختیار ہو گا۔"

"کیوں مناسب نہیں؟"

"ہم جنگ کے بارے میں گفتگو اس حد سے آگے بڑھانے کو ترجیح نہیں دینا چاہتے جس حد تک وہ پہنچ چکی ہے۔"

"میں اس بارے میں اپنے اصرار پر معذرت خواہ ہوں‘ لیکن کیا آپ یہ فرما رہے ہیں کہ اگر ارجنٹائنا کوئی برطانوی طیارہ بردار بحری جہاز ڈبو دیتا ہے تو آپ بیونس آئرس پر ایٹمی حملہ نہیں کریں گے؟"

"ہم نے اپنے اختیارات کی تمام راہیں کھلی رکھی ہیں۔"

"شکریہ جناب والا۔ اور ناظرین! اب نیویارک چلتے ہیں جہاں اقوام متحدہ میں ارجنٹائنا کے سفیر سے گفتگو ہو گی۔۔۔ مسٹر ایمبیسیڈر! جیسا کہ ابھی آپ نے سنا‘ اگر آپ نے اپنی فوجیں فاک لینڈ آئی لینڈز سے واپس نہ بلائیں تو برطانیہ آپ کے شہروں پر ایٹمی ہتھیار استعمال کر سکتا ہے۔ اس قسم کے حملے کی صورت میں آپ کا جواب کیا ہو گا؟"

"ہمیں یقین نہیں کہ ایسا ہو گا‘ لیکن اگر ایسی کوئی صورت حال پیش آئی تو ہم ایک بڑی طاقت کو طلب کریں گے کہ وہ برطانیہ کو ترکی بہ ترکی جواب دے‘ مذکورہ بڑی طاقت برطانیہ سے زیادہ قریب واقع ہے۔"

"ظاہر ہے کہ آپ سوویت یونین کی بات کر رہے ہیں۔ کیا آپ کی حکومت ماسکو سے رابطہ رکھے ہوئے ہے؟"

"میں فی الوقت اس بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔"

"شکریہ سر!۔ آئیے اب ہم واشنگٹن کے اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ چلتے ہیں جہاں ہماری گفتگو انڈر سیکریٹری رابرٹ ولسن سے ہو گی۔۔۔ مسٹر ولسن! اگر روس‘ ارجنٹائنا کو ایٹمی ہتھیار فراہم کرتا ہے تو کیا ایسی صورت حال سے نمٹنے کے لیے اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ نے کوئی خصوصی منصوبہ تیار کر رکھا ہے؟"

"ہم اس بحران کے پُرامن حل کے لیے ... دونوں فریقوں کو ایک ساتھ بیٹھنے اور ایک ... پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"میرا خیال ہے‘ آپ نے میرے سوال کا ... دیا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اگر روسیوں نے ... کرنے میں اپنے ایٹمی میزائل متعارف کرا... ہائے متحدہ امریکا روس سے جنگ کرنے کے لیے ..."

"نو کمنٹ۔"

"شکریہ سر! ناظرین! میں معذرت خواہ ہوں ... شب ہمارے پروگرام کا وقت ختم ہو رہا ہے۔ کل ... ہمارا خصوصی پروگرام دیکھیے گا جو سوویت یونین اور ... ہائے متحدہ امریکا کے مابین کیوبن میزائل کے ... تازہ ترین صورت حال کے بارے میں ہو گا۔ ... خوش گوار خوابوں کی دعا کے ساتھ ہم آپ کو شب ... ہیں۔"



کج رو

2

گزشتہ ہفتے میں نے اپنی شادی کی ساتویں سال گرہ ... یہ میں کوئی شیخی نہیں بگھار رہا ہوں۔ یہ تو میرے لیے ... پریشان کن بات تھی۔ میں نے اپنے اطراف کا جائزہ ... انکشاف ہوا کہ ہمارے وہ دوست جن کی شادی لگ ... میرے ساتھ ہوئی تھی‘ ان میں سے اکثر یا تو اپنی بیوی کو ... دے چکے ہیں یا ان کے درمیان علیحدگی ہو گئی ہے۔ ... ایسے تھے جو ابھی تک خوش گوار ازدواجی زندگی بسر کر...

گیا کہ ہونہ ہو ہم میاں بیوی کے ساتھ کچھ نہ

"

ہیں۔" میں نے اپنی بیوی سے کہا۔ "ہمیں آخر

"

نے مجھ سے اتفاق کیا۔ "ہم لوگ غیر معتدل ہیں۔
ایسی بنا رہا ہے۔ جو لڑکیاں میرے ساتھ اسکول میں
ان میں سے بیش تر کی کم سے کم دوسری شادی تو

"

سات سال سے ہم دونوں حالات کے دھارے
اکٹھے بہتے چلے آ رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "میرا
ہمیں کسی غیر کی مدد کی ضرورت ہے۔"
میں بھی یہی بات کہنے والی تھی۔" بیوی نے کہا۔ "اگر
چاہتے ہو تو میں بھی رضامند ہوں۔"
گفتگو سے ذہن کا بوجھ ہلکا ہو گیا اور ہم نے فوراً
قانونی مشیرِ طلاق سے وقت لے لیا' قانونی مشیرِ طلاق کا
ر قانونی مشیرِ شادی کی طرح ہوتا ہے' اس فرق کے
دو افراد کو یک جا کرنے کے بجائے انھیں جدا
کی کوشش کرتا ہے۔ لوگوں کی اکثریت قانونی مشیر
کے پاس آخری جائے پناہ کے طور پر جاتی ہے جب
محسوس ہونے لگے کہ ان کی شادی خدا نہ کرے'
کے لیے قائم و دائم رہنے والی ہے۔
ہم اس کے دفتر ایک ساتھ پہنچے۔ یہ ہماری پہلی غلطی
استقبالی کارکن نے ہمیں علیحدہ علیحدہ داخل ہونے کے
ا۔ استقبالیہ کمرے کی آرائش سے سادگی ظاہر ہو رہی
چند کرسیوں اور ایک نچلی میز کے سوا کوئی فرنیچر نہیں
میز پر رکھے ہوئے رسالوں میں جو کہانیاں تھیں' ان کے
ات اس قسم کے تھے (۱) شادی کی گھنٹیوں نے مجھے پاگل
(۲) میری بیوی بہ طور سیکریٹری کی بہ نسبت سیکریٹری بہ
بیوی بہتر رہی (3) میں نے اپنے نان نفقے کی رقم سے
طرح سرمایہ کاری کی اور لاکھوں ڈالر کمائے۔"
مشیرِ طلاق باہر آیا اور اس نے سر کی جنبش سے ہمیں
اندر آنے کا اشارہ کیا۔
ہم اس کے کمرے میں داخل ہو کر ساتھ ساتھ بیٹھ گئے

اس نے سب سے پہلی بات یہ کہی "میں آپ کا ممنون ہوں گا'
اگر آپ دونوں اس دفتر میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنے سے
گریز کریں۔"
ہم نے اپنے ہاتھ اپنی اپنی گود میں رکھ لیے۔
"اب آپ اپنی داستان بیان کیجیے۔ کوئی تفصیل چھوٹی
نہیں چاہیے۔ کوئی بھی معمولی سی بات جو آپ کی نظر میں خواہ
غیر اہم ہو' میرے لیے معاملہ سمجھنے کے سلسلے میں روشنی کا ہالہ
بن سکتی ہے۔"
ہم نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ ہماری ملاقات کس طرح
ہوئی تھی' ہمارا گھر کیسا ہے' ہمارے درمیان شاذ و نادر ہی
جھگڑا ہوتا ہے اور ہم کس طرح ایک دوسرے کو منا لیتے ہیں۔
اس دوران مشیرِ طلاق پنسل سے اپنا کان مستقل کھجاتا
رہا۔ "پیسوں کے بارے میں کبھی کوئی جھڑپ ہوتی ہے؟" اس
نے پوچھا۔
"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں پیسے انھیں دے
دیتا ہوں اور یہ خرچ کر لیتی ہیں۔"
مشیرِ طلاق کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ "اچھا یہ بتایئے کہ
جب آپ دونوں کے درمیان جھگڑا ہوتا ہے تو کیا یہ اپنے میکے
جانے کی دھمکی دیتی ہیں؟"
اس سوال کا جواب میری بیوی نے دیا۔ "میری ماں کا گھر
بہت دور ہے' جہاں آسانی سے نہیں جایا جا سکتا۔ اس کے علاوہ
ہمارے بچے اسکول میں پڑھتے ہیں اور میں اس خیال ہی سے
نفرت کرتی ہوں کہ وہ اپنی کسی ٹرم کا ناغہ کریں۔"
"کیا آپ اپنی بیوی کو کبھی پھول بھجواتے ہیں؟"
"ہمیشہ۔" میں نے جواب دیا۔ "پھول مجھے تھوک کے
بھاؤ مل جاتے ہیں۔"
مشیرِ طلاق میری بیوی سے مخاطب ہوا۔ "جب آپ
آرائشِ گیسو کے لیے جاتی ہیں یا کوئی نیا لباس یا ہیٹ وغیرہ
خریدتی ہیں تو کیا یہ اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں؟"
"جی ہاں۔" میری بیوی نے جواب دیا۔ "ان کی رائے
کے بغیر تو میں کوئی نئی چیز خرید ہی نہیں سکتی۔"
"یہ کیا کہتے ہیں؟"
"یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس پر کتنی رقم خرچ ہوئی۔"

"اور جب آپ تفریح مناتی ہیں تو یہ پاگل ہو جاتے ہیں؟"
مشیرِ طلاق نے پُر امید لہجے میں سوال کیا۔

"نہیں، یہ شانے اچکا کر دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔"

مشیرِ طلاق نے اپنی پنسل دو ٹکڑے کر دی۔ "کیا آپ کے درمیان ایسی مشترک باتیں ہیں جن پر باہم گفتگو ہوتی ہو؟"

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "بہت سی باتیں ہیں۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً" یہ کہ ہمارے تمام دوستوں کے درمیان علیحدگی ہو رہی ہے۔"

"آپ کی سہیلیاں کیا کہتی ہیں؟" مشیرِ طلاق نے میری بیوی کو مخاطب کیا۔ "کیا کبھی کسی نے آپ کو فون کر کے بتایا کہ اس نے آپ کے شوہر کو کسی خوب صورت لڑکی کے ساتھ لنچ کرتے دیکھا ہے؟"

"جی ہاں۔ کئی بار"۔ میری بیوی نے جواب دیا۔ "یہ تو میرے شوہر کے کام کا حصّہ ہے۔ اگر یہ لنچ پر خوب صورت عورتوں سے گفتگو نہ کریں تو مجھے اپنے لیے کوئی نیا لباس خریدنے کی استطاعت نہ ہو سکے۔"

مشیرِ طلاق نے جھلّا کر ٹوٹی ہوئی پنسل کمرے کے دوسری جانب پھینک دی۔ "میں نے آج تک جتنے بھی معاملات فیصل کیے ہیں، یہ ان میں سب سے زیادہ مہمل معلوم ہوتا ہے۔ آخر آپ دونوں ایک دوسرے سے عاجز کیوں نہیں ہوتے؟ آپ نے جو باتیں بتائی ہیں، ان کا کوئی سر ہے نہ پیر۔ آپ کے درمیان بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اب میرا آپ دونوں کو یہی مشورہ ہے کہ گھر جائیے اور ایک دوسرے کے اعصاب پر سوار ہونے کی کوشش کیجیے۔ آپ کو لازماً یہ سیکھنا چاہیے کہ حاسد بیوی کیسی ہوتی ہے۔" وہ میری بیوی سے مخاطب ہوا۔

"اور آپ کو مزید لاابالی پن کا مظاہرہ کرنا ہو گا۔" یہ بات اس نے مجھ سے کہی۔ "ایک دوسرے کی غلطیوں کی ٹوہ میں لگے رہیے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں اتنی بڑھا چڑھائیے کہ وہ واقعی بڑے مسائل دکھائی دیں۔ بڑے مکان سے چھوٹے مکان میں منتقل ہو جائیے۔ ایک دوسرے کے خیالات میں بھی دخل اندازی کیا کیجیے۔ یہ بات گرہ میں باندھ لیجیے۔ محبت اور خوشیاں ہی سب کچھ نہیں ہوتیں۔"

مشیرِ طلاق ہمیں رخصت کرنے کے لیے دروازے تک آیا۔ میں نے اس کا بھرپور شکریہ ادا کیا لیکن جب میں نکلتے وقت اپنی بیوی کے لیے بڑھ کر دروازہ کھولا تو وہ چلّا پڑا۔ "خدارا! کچھ تو خیال کیجیے۔ ابھی آپ میرے دفتر سے بھی نہیں نکلے ہیں کہ ان کے لیے دروازے کھولنے [illegible] دیے۔ اگر آپ نے اس قسم کی احمقانہ حرکتیں جاری رکھیں تو علیحدگی کیوں کر ممکن ہو سکتی ہے؟"



عیب دار

3

صدر نکسن کی چین سے واپسی کے دو دن بعد کی بات ہے۔ ہم اہل خانہ رات کا کھانا کھانے کے بعد ٹیلی ویژن دیکھنے کے لیے نشست گاہ میں داخل ہوئے۔ میری بیوی ٹی وی کھول کے بولی۔ "عجیب بات ہے۔ ٹی وی میں کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے۔ اسکرین پر نکسن دکھائی نہیں دے رہے۔"

"کسی دوسرے چینل پر کوشش کرو۔" میں نے مشورہ دیا۔

میری بیوی نے چینل تبدیل کیا تو ایک پرائیویٹ [illegible]

پروگرام آ رہا تھا۔ صدرِ محترم اس چینل پر بھی
یں ہیں۔"
نے اپنی کرسی سے اٹھ کر ٹی وی کے ڈائل سے چھیڑ
ع کر دی۔ تمام چینل آزما لیے لیکن نکسن کہیں بھی
یں ہوئے۔ "اس سیٹ میں کون گھسا تھا؟ کس نے گڑ
؟" میں چیخ پڑا۔
سہم گئے۔ ہر ایک اپنی اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔
اسے چھوا تک نہیں۔" میرے بیٹے نے کہا۔
یوں کا بھی یہی کہنا تھا کہ انھوں نے سیٹ کو ہاتھ تک
یا۔
لعنت ہے۔" میں بڑبڑایا۔ "ہم دن ہو یا رات، کسی بھی
سیٹ آن کرتے تھے اور کوئی بھی چینل لگاتے تھے،
کسن کی تصویر نمایاں ہو جاتی تھی اور آج ہم انھیں
یلی ویژن پر بھی دیکھنے سے محروم ہیں۔"
ہو سکتا ہے کہ صفائی کرنے والی عورت نے سیٹ کے
کچھ اکھاڑ پچھاڑ کی ہو۔" میری بیوی نے خیال ظاہر کیا۔
لیکن میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اس سیٹ کو ہاتھ نہ
ے۔"
ہمی کی اسی کیفیت میں، میں نے ٹیلی ویژن مرمت
نے والے شخص جارج کو فون کیا اور اسے فوراً" آنے کو
اس نے پوچھا کہ کیا میں کل تک انتظار نہیں کر سکتا؟
"کسی صورت نہیں، تم ابھی آؤ، چاہے تمھاری زندگی پر
جائے۔" میں نے کہا۔ "میں گزشتہ تین سال میں ٹیلی
پر صدر نکسن کے دیدار سے کبھی محروم نہیں رہا۔ اب
اس محرومی کا آغاز مجھے کسی طور گوارا نہیں۔"
کچھ دیر بعد جارج اپنے اوزار لے آ پہنچا۔
"میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔" میں نے اسے
۔ "صدر نکسن روزانہ صاف تصویر اور واضح آواز کے
ھ پرائم ٹائم پر نمودار ہوتے ہیں لیکن آج کی شب ایک
وی ڈین مارٹن شو اور لوسی کے ری رن کے سوا کچھ نہیں آ
ا۔"
"میں کوشش کرتا ہوں۔" جارج نے کہا۔ پھر اس نے
ل آگے اور پیچھے کی طرف گھمایا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے
یں۔ یقیناً" کوئی نہ کوئی خرابی ہے۔ ہو سکتا ہے، ایریل میں
کچھ نقص ہو۔"

جارج ایریل چیک کرنے چھت پر چڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ نیچے آیا تو بولا۔ "ایریل تو ٹھیک دکھائی دے رہا ہے۔ اس کا رخ بھی چین کی جانب ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ پرسوں تک اس سیٹ میں کوئی خرابی نہیں تھی؟"

"بالکل ٹھیک۔" میں نے جواب دیا۔ "ہم نے صدر کی اینڈریو ایر فورس بیس پر آمد کا پروگرام دیکھا تھا۔ آواز بالکل صاف تھی اور رنگ بھی زندگی سے بھرپور تھے۔"

"ہو سکتا ہے، خرابی پکچر ٹیوب میں ہو۔" جارج نے کہا۔

"بھلا ٹیلی ویژن پکچر ٹیوب کا اس معاملے سے کیا تعلق؟" میں نے پوچھا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ جب یہ پکچر ٹیوبیں نصب کی جاتی ہیں تو انتہائی طاقت ور قسم کا نکسن سگنل خارج کرتی ہیں لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا ہے، فلامنٹ میں اندرونی ردِ عمل شروع ہو جاتا ہے اور پکچر ٹیوب کم زور اور کم زور تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ بعض پرانے ٹیلی ویژن سیٹوں پر لوگوں کو نکسن دکھائی ہی نہیں دیتے لیکن یہ سیٹ تو خاصا نیا ہے، اس پر نکسن کا عکس ضرور موصول ہونا چاہیے، خواہ ان کا سایہ ہی کیوں نہ دکھایا جا رہا ہو۔"

جارج نے پکچر ٹیوب چیک کی۔ "وہ اس میں بھی نہیں ہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ آپ کے افقی ایڈجسٹر میں کوئی خرابی ہو۔ بعض سیٹ ایسے بھی ہیں کہ جب ان کی اسکرین سے نکسن غائب ہو جاتے ہیں تو یہ عیب افقی ڈائل کے ایڈجسٹمنٹ سے دور کیا جاتا ہے۔ آپ یہ بتائیے کہ جب آخری مرتبہ آپ نے صدر نکسن کا دیدار کیا تھا تو وہ کھڑے تھے یا لیٹے ہوئے تھے؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ کھڑے تھے۔" میں نے جواب دیا۔

"گویا گڑبڑ عمودی ڈائل میں ہو سکتی ہے۔"

جارج ٹیلی ویژن سیٹ کا عقبی کور کھول کر تین گھنٹے تک مصروف رہا۔ ہم سب اس دوران نروس بیٹھے ٹی وی ٹھیک ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ آخر اس نے ٹی وی دوبارہ آن کیا۔ وہ مختلف چینل تبدیل کرتا رہا اور ہمیں اسکرین پر ٹک

کیوٹ' جونی کارسن' پیری میسن اور ویلس بیری کے چہرے دکھائی دیے' لیکن صدر نکسن بدستور غائب تھے۔

جارج ٹھی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں مزید کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ کو یہ ٹی وی سیٹ کوڑے دان میں پھینکنا پڑے گا۔"

"لیکن یہ تو ابھی صرف ایک سال پرانا ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔

"سیٹ ہی گھٹیا ہے تو اس میں میرا کیا قصور۔" جارج نے کہا۔ "یہ بات تو ظاہر ہے کہ اس سیٹ میں کسی جگہ کم زور نکسن فیوز موجود ہے لیکن میں اسے تلاش نہیں کر سکا۔"

"اگر میں یہ سیٹ تمھیں فروخت کرنا چاہوں تو تم اس کی کیا قیمت لگاؤ گے؟" میں نے جارج سے پوچھا۔ "یا یہ سیٹ لے کر تم اس کے بدلے نیا سیٹ دو تو مجھے مزید کتنی رقم دینا پڑے گی؟"

"کیا آپ کا دماغ چل گیا ہے؟" جارج نے کہا۔ "ایک ایسے ٹی وی سیٹ کی میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں دوں گا جو دن کے وقت بھی صدر نکسن کی زیارت کرانے سے قاصر ہو۔"



درد آشنا

اس ملک کو جس سب سے بڑے مسئلے کا سامنا ہے' وہ معیشت' امن و امان' لاقانونیت یا انقلاب نہیں بلکہ کمر کا درد ہے۔ •

یہ بات اب ظاہر و باہر ہے کہ اس ملک میں ... تکلیف میں مبتلا ہے' جب تک اس کا علاج ... جاتا' ہم اپنے دیگر مسائل کبھی حل نہیں کر سکیں گے۔

یہ حقیقت حال ہی میں اس وقت مجھ پر عیاں ... میری بیوی کی کرینس کھیلنے کے دوران جواب ... اسے فوراً ہڈیوں کے ایک ماہر (آرتھوپیڈک) سرجن ... لے گیا۔ سرجن نے بتایا کہ میری بیوی کی ریڑھ کی ... مہرہ کھسک گیا ہے اور اس کا جوڑ بٹھانے کے لیے ... میں اسفنج کا کالر پہننا پڑے گا۔

بیوی کے کالر پہننے کے نتیجے میں یہ انکشاف ... کے کتنے افراد کمر کی تکلیف میں مبتلا ہیں۔ لوگ ... تک اپنی تکلیف کا ذکر نہیں کرتے جب تک کسی ... پہنے نہ دیکھ لیں۔ کالر دیکھ کر ہی وہ زبان کھولتے ... اعتراف کرتے ہیں کہ وہ بھی اس تکلیف میں مبتلا ... انھیں کیا کیا دشواری پیش آرہی ہے۔

گردن میں کالر پہننے کے بعد جب میں اپنی بیوی کو ایک پارٹی میں لے گیا تو ایک دوست نے دریافت ... لوگ کیا علاج کر رہے ہو؟" میری بیوی نے اسے ... ہڈیوں کے ماہر ایک ڈاکٹر کے زیر علاج ہے۔ دوست ... "تمھیں اس سلسلے میں کچھ علم نہیں ہوتا۔ کمر کی ... لیے نفسی و اعصابی سرجن کو دکھانا چاہیے تھا۔"

اگلے روز ہم نے ملک کے بہترین نیورو سرجن ... اور اس کے پاس جا پہنچے۔ نیورو سرجن نے میری بیوی ... سے معائنہ کیا اور یہی نتیجہ اخذ کیا کہ اس کی ریڑھ کی ... ایک مہرہ کھسک گیا ہے' اس کا جوڑ بٹھانے کی خاطر ... میری بیوی کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی گردن میں اسفنج ... شروع کر دے۔ چوں کہ یہ تشخیص بالکل وہی تھی ... امراضِ استخوان (آرتھوپیڈک) سرجن نے کی تھی ... بیوی کو قدرتی طور پر نیورو سرجن کی تشخیص سے مایوسی ...

لیکن چند دنوں بعد اس کا جذبہ پھر بیدار ہو گیا۔ ... روز میں گھر واپس پہنچا تو بیوی بولی۔ "جو شخص ... درختوں کے جھڑے ہوئے پتے اکٹھے کرتا ہے' اس کا ...

سرجن کمر کی تکلیف کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔
بتایا ہے کہ کمر کی تکلیف سے نجات حاصل کرنے کا
بہتر طریقہ یہ ہے کہ میں فرش پر سویا کروں۔"
بے شک۔ سوکھے پتے اکٹھا کرنے والے کو اس کا
معلوم ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔
ایک ہفتے بعد میری بیوی نے مجھے دفتر فون کیا۔ "سنو!
ایک ایسی عورت سے واقف ہے جو سیون کارنرز میں
ہے اور اپنی انگلیوں کے ناخنوں سے ریڑھ کی ہڈی کے
علاج کرتی ہے۔ اس نے آج تک کسی ایسے شخص
نہیں کیا جسے صحت یابی نہ ہوئی ہو۔"
ان دن بعد میری بیوی کے کانوں میں ایک ایکوپنچرسٹ
پڑی جو چائنا ٹاؤن میں رہتا تھا۔ اس کی سہیلی اسنجی
بولا۔ "بس، سونے کی چار سوئیاں، اور تم ہفتے بھر میں
ٹینس کھیلنے لگوگی۔"
اس سے قبل کہ میری بیوی ایکوپنچر کے ڈاکٹر کے پاس
اس کی بہن نے سن سینٹی سے فون کیا کہ کمر کی تکلیف
سے چھٹکارا حاصل کرنے کا واحد ذریعہ یوگا اور مراقبہ ہے۔
کئی ہفتے گزر گئے۔ میری بیوی گردن میں اسفنج کالر پہنے تو
لیکن اس کا دل اس علاج سے مطمئن نہیں تھا۔
"یہ علاج بے حد سست رفتار معلوم ہو رہا ہے۔" میری
نے احتجاج کیا۔ "میری گیسو تراش (ہیرڈریسر) نے مجھے
ہے کہ اٹلی میں ایک معدنی چشمہ ہے جس کی مٹی سے
مالش کرنے سے کمر کی تکلیف سے ہمیشہ کے لیے نجات مل
جاتی ہے۔ وہ چشمہ اور اس کی مٹی اس علاج کے لیے بہت
مشہور ہے۔"
"اگر اس سے بھی فائدہ نہ ہوا تو تم جب چاہو لارڈز کیس
جا سکتی ہو۔" میں نے جواب دیا۔
لیکن ابھی میری بیوی اٹلی جانے کے لیے پاس پورٹ کی
کارروائیوں میں مصروف تھی کہ ویسٹ ورجینیا سے برادرِ نسبتی
نے فون کیا اور کمر کی تکلیف کے ایک نئے معجزاتی علاج کی
خبر سنائی جو بلیو رج ماؤنٹین کی کسی خاتون نے جڑی بوٹیوں
سے شروع کیا تھا۔
"یہ علاج کیچڑ سے غسل کے مقابلے میں بہتر لگتا ہے۔"
بیوی نے کہا۔

میں نے رائے دی۔
چند دنوں بعد خاتون کا جڑی بوٹیوں سے [illegible]
گیا اور حیرت انگیز طور پر اس نے بھی میری بیوی کو کوئی [illegible]
نہیں پہنچایا۔
ہر قسم کی کوشش کرنے کے بعد ہم نے واپس [illegible]
سرجن کے پاس جانے کا فیصلہ کیا، اس امید سے کہ [illegible]
وہ اس تکلیف کا کوئی ایسا حل جانتا ہو جس کا علم [illegible]
نہیں تھا۔
ڈاکٹر نے معائنے کے بعد بتایا کہ صورتِ حال پہلے کے
مقابلے میں خاصی بہتر ہے اور تمھاری بیوی [illegible]
رہی ہے البتہ اسے مزید ایک ماہ تک گردن میں اسفنج کالر پہننا
پڑے گا۔
ہم ڈاکٹر کے کلینک سے رخصت ہوئے تو آپ میری
بیوی کی پژمردہ ذہنی کیفیت کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں لیکن
خوش قسمتی سے گھر جانے کے لیے ہم جس ٹیکسی میں سوار
ہوئے، اس کے ڈرائیور نے میری بیوی کے مرض کی علامت
بھانپ لی۔ وہ بولا۔ "میں اسکندریہ کے ایک حال
سے واقف ہوں جو کسی اور علاج میں نہیں، صرف ریڑھ کی
ہڈی کے مہروں کے علاج میں مہارت رکھتا ہے۔"



5 سُرساگر

دی تھمپ سکر رپورٹ حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔
ڈاکٹر الفرڈ تھمپ سکر نے تحریر کی ہے۔ اس میں دو قسم کی

مشکلوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک مشکل وہ جو والدین کو اپنے بچوں سے رابطہ رکھنے اور بول چال میں پیش آتی ہے' دوسری مشکل بچوں سے متعلق ہے اور وہ یہ کہ بچے کسی سے بھی رابطہ قائم کرنے اور بول چال کرنے سے قاصر ہیں۔

"والدین کی اکثریت اعتراف کرتی ہے کہ بچوں کی پرورش کے معاملے میں قسمت ان کا ساتھ نہیں دیتی۔" ڈاکٹر تھمب سکر نے مجھے بتایا۔ "تمام والدین اپنے دفاع میں یہی کہتے ہیں کہ آپ خود دیکھ لیجیے' ہمارا واسطہ کس قسم کے بچوں سے ہے۔"

"آپ نے جو رپورٹ مرتب کی ہے' اس کے مطابق بچوں اور ان کے والدین کے درمیان سب سے بڑی رکاوٹ کیا ہے؟"

"راک میوزک۔" ڈاکٹر تھمب سکر نے جواب دیا۔ "جب نو عمر بچے اپنی تمام ضروریات کے لیے گریٹ فل ڈیڈ (راک اینڈ بینڈ گروپ) کی جانب راغب ہو جاتے ہیں تو ان پر سے والدین کا کنٹرول ختم ہو جاتا ہے۔ یہ بات عموماً لوگوں کے علم میں نہیں کہ ریاست ہائے متحدہ امریکا میں جیسے ہی کوئی بچہ جنم لیتا ہے' ڈاکٹر اس کے کانوں میں ننھے سے واک مین اسپیکر نصب کر دیتے ہیں۔ یہ واک مین اس وقت فعال ہو جاتا ہے جب ڈاکٹر نومولود کے کولھوں پر دھپ رسید کرتا ہے اور پھر کالج میں تعلیم مکمل کرنے کی عمر تک یہ فل والیوم کے ساتھ فعال رہتا ہے۔"

"آپ نے جو نکتہ پیش کیا ہے' اس کی رو سے آپ کو تمام اخبارات اپنے صفحۂ اول پر شائع کریں گے۔"

"جیسے جیسے بچہ پروان چڑھتا ہے' وہ اپنی بیداری کا ہر لمحہ موسیقی سننے پر صرف کرتا ہے اور باقی تمام چیزیں ٹیون آؤٹ کر دیتا ہے۔ جب بھی کوئی نو عمر سر ہلاتا ہے' اس کے والدین یہ تاڑ لیتے ہیں کہ ان کا بچہ سوال کے جواب میں 'ہاں' یا 'نہ' کہہ رہا ہے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ ان کا لاڈلا رولنگ اسٹونز کی موسیقی پر سر دھن رہا ہے۔"

"کیا کسی ماں یا باپ کو یہ خیال کبھی نہیں آیا کہ ان کی اولاد کے ذہن میں سوچنے سمجھنے کے علاوہ کوئی اور چیز سمائی ہوئی ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں' یہ خیال ماں باپ کو نہیں آتا۔ والدین بچوں کو انگلیاں چٹخاتے دیکھ کر ہی خوش ہو جاتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کا بچہ ابھی زندہ ہے رین بچوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ واک مین کا آلہ ان کی راک موسیقی کی خواہش کے مطابق طاقت ور نہیں انھوں نے آواز بڑھانے کی خاطر اپنے کندھوں پر ریڈیو اٹھا لیے۔ انھوں نے اپنی خواب گاہوں میں بھی رکھ لیے تاکہ گھر میں کوئی اور آواز نہ سنی جا سکے۔

"ان بچوں کی دست رس میں اتنی زیادہ ہونے کے باعث اب یہ بات تعجب خیز نہیں رہی کہ کسی بھی زبان میں کلام کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے وجہ ہے کہ جب والدین چیخ کر یہ کہتے ہیں' میں نے تم کہا ہے' وہ کیوں نہیں کرتے؟' تو انھیں کوئی جواب اس لیے کہ بچے کو گمان ہی نہیں گزرتا کہ اس کی ماں کیا کہہ رہے ہیں۔"

"تو پھر یہ نو عمر' رابطے اور بول چال کے بغیر کس طرح رہے ہیں؟"

"ان میں سے اکثریت نے زندگی کی ابتدا ہی میں دریافت کر لیا تھا کہ چاہے وہ کچھ بھی کریں' میں میں قیام و طعام میسر رہے گا۔ یہ حقیقت جاننے کے کے لیے یہ کوشش کرنے یا معلوم کرنے کا کوئی جواز رہتا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔"

"کم از کم انھیں یہ تو علم ہے کہ انھیں کیا درکار" میں نے کہا۔

"راک موسیقی کے مداحوں کی نسلیں جو بدستور میٹر سے منسلک ہیں' اب اس ملک کی لیبر فورس ہیں۔ اب ان کا شمار ڈاکٹروں' وکلا اور آئل ٹینکر کے میں ہوتا ہے لیکن وہ اب بھی بروس اسپرنگ اسٹین کے لیے وقت نکال لیتے ہیں۔"

"کیا آپ نے اپنی رپورٹ مرتب کرنے کے لیے کے انٹرویو لیے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے اس بارے میں بہت سے والدین سے بات کی لیکن وہ اس معاملے میں معاون ثابت ہونے کے

زیادہ الجھن میں دکھائی دیے۔ بچوں کا معاملہ بھی قطعی مختلف رہا۔ میں جب بھی کوئی سوال کرتا وہ دیدے گھمانے اور تالیاں پیٹنے لگتے۔ میں ان کی ان حرکتوں سے یقیناً پریشان ہو جاتا اگر مجھے اس حقیقت کا علم نہ ہوتا کہ ان میں سے ہر ایک کے اندر ایک والک مین پیوند ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کی تحقیق لوگوں کی گفتگو کے بجائے زیادہ تر آپ کی اپنی معلومات پر مبنی ہے؟"

"یہ درست ہے' اس کے باوجود یہ ایک ٹھوس قسم کی تحقیق ہے اس لیے کہ میں آج تک کبھی کسی ایسے بچے سے نہیں ملا جس نے مائیکل جیکسن سے زیادہ اپنے والدین کو سنا ہو۔"



پیمانہ

میں اپنے بیٹے کو فلم دکھانے سینما لے گیا۔ فلم دوسری جنگِ عظیم سے متعلق تھی جس میں جاپانی فوجی' اتحادی بحریہ کی آب دوزوں کا عملہ حراست میں لے کر اسے طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتے ہیں۔

گھر واپس آتے ہوئے میرے بیٹے نے کہا۔ "جاپانی تو بہت ہی برے تھے جو ملاحوں سے اس قسم کا سلوک کر[...] تھے۔ کیوں ڈیڈی؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن جاپانی اب [...] نہیں ہیں۔ اب وہ اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کرتے۔"

میرا بیٹا ایک منٹ کے لیے کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ [...] اُس وقت وہ اِس قسم کی حرکتیں کیوں کرتے تھے؟"

"غالباً" انھیں علم نہیں تھا کہ یہ حرکتیں بری ہیں۔"

"انھیں کسی نے یہ بتایا کیوں نہیں کہ یہ بری [...] ہیں؟"

"ہم نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔" میں [...] جواب دیا۔ "لیکن انھوں نے ہماری ایک نہ سنی۔"

"جرمن بھی برے ہیں۔ ہیں نا ڈیڈی؟ جنگی قیدیوں [...] کیمپ کے متعلق وہ فلم یاد ہے آپ کو۔ جو ہم نے [...] تھی؟"

"وہ لوگ بھی برے تھے" میں نے بتایا۔ "لیکن اب [...] اچھے ہیں۔"

"کیا اب وہ پہلے والے لوگ نہیں ہیں؟" میرے [...] نے جاننا چاہا۔

"ہیں تو وہی' کم از کم اکثریت انھی لوگوں کی ہے۔ [...] یہ ہے کہ جنگ ختم ہونے کے بعد وہ سب کچھ فراموش [...] ہوتا ہے جو برے لوگوں نے کیا تھا اس لیے کہ اگر [...] فراموش نہیں کریں گے تو ایک اور جنگ شروع ہو [...] ہے۔"

میرا بیٹا خالی خالی نظروں سے میری صورت تکنے لگا۔ [...] منٹ کی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔ "کیا آپ [...] جنگ کے دوران کسی روسی کو قتل کیا تھا؟"

"نہیں۔ اس لیے کہ وہ جنگ میں ہماری طرف [...] لڑے تھے' وہ اچھے لوگ تھے۔"

"لیکن اگر جنگ کے دوران وہ اچھے تھے اور انھوں [...] ہمارے ساتھ مل کر برے لوگوں کو ہلاک کیا تھا تو اب وہ [...] کیوں ہو گئے؟"

"وہ اب بھی برے نہیں ہیں۔ روسیوں کی اکثریت اچھے [...] لوگوں کی ہے۔ البتہ ہم ان کے لیڈروں کے قول و فعل [...]

کرتے اور وہ ہم سے اتفاق نہیں کرتے۔ یہی وجہ جرمنی کے معاملے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ تمہیں یہ تو معلوم ہو گا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ نصف جرمنی پر روسیوں نصف پر ہم نے قبضہ کر لیا تھا۔ پھر روسی تسلط کے ں سے برے جرمنوں نے اچھے جرمن برلن سے گئے تھے۔"

پھر برے جرمنوں کو روسیوں نے ہلاک کیوں نہیں بیٹے نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

اس لیے کہ روسی یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے جرمن ہیں۔ وہ اپنے جرمنوں کو اچھا سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال در اصل ہمارے جرمن برے ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کے جرمن یا کم از کم ان کے جرمن لیڈر برے ہیں ہمارے جرمن اچھے ہیں۔ سمجھ رہے ہو نا؟"

نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

اچھا! تو پھر اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔" میں نے اپنا سر ہوئے کہا۔ "میں نے آج تک ایسا بچہ نہیں دیکھا جو تم کے احمقانہ سوالات کرتا ہو۔"



اسپیشلسٹ

7

میری ملاقات گلوور سے ہوئی تو وہ بیمار دکھائی دے رہا میں نے پوچھا۔ "تم اپنے ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں گئے؟"

گیا تھا، اس کا مشورہ ہے کہ میں کسی اسپیشلسٹ (متخصص) کو دکھاؤں۔"

"تو پھر تم نے اسپیشلسٹ کو کیوں نہیں دکھایا؟"

"وہ اپنے اختصاص کے بارے میں مقالہ پڑھنے سڈنی آسٹریلیا گیا ہوا ہے۔ اس کی واپسی جولائی سے پہلے نہیں ہو گی۔"

"تو کسی اور اسپیشلسٹ کو دکھا دو۔"

"میں نے ایک اور خصوصی معالج سے رابطہ کیا تھا، اس کے سیکریٹری نے بتایا کہ وہ ستمبر سے پہلے مجھے وقت نہیں دے سکتا۔ میں نے کہا کہ ہو سکتا ہے، اس وقت تک میں مر جاؤں، چناں چہ سیکریٹری نے از راہِ عنایت مجھے اگست کا وقت دے دیا ہے۔"

"ابھی تو مئی چل رہا ہے، اگست کے لیے تمہیں خاصا طویل انتظار کرنا پڑے گا۔ کیا تم نے اس بات سے اپنے مستقل ڈاکٹر کو آگاہ کیا؟"

"ہاں اس نے کئی جگہ فون کیے اور آخر ایک ایسا شخص ڈھونڈ نکالا جو مجھے فوراً دیکھنے پر آمادہ تھا۔"

"خوب!" میں نے کہا۔ "تو تم اس کے پاس کیوں نہیں جاتے؟"

"اس لیے کہ مجھے اس کی صلاحیتوں کے متعلق کچھ علم نہیں ہے۔"

"کیا تم نے اس کے بارے میں کسی سے کچھ سنا ہے؟"

"نہیں، لیکن اگر وہ واقعی ایک ماہر ڈاکٹر ہے تو مریضوں کو دیکھنے کے بجائے مقالہ پڑھنے وہ کیوں نہیں گیا؟ اس کے نہ جانے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

"ممکن ہے کہ اسے دو مقالوں کے درمیان کچھ وقفہ مل گیا ہو۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"ٹھیک۔ لیکن اگر وہ اپنے فن میں ایسا ہی یگانۂ روزگار ہے تو دوسرے تمام اسپیشلسٹوں کے مانند اس کے پاس منتظر مریضوں کی دو ماہ کی فہرست کیوں نہیں ہے؟"

"یہ ایک اچھا نکتہ ہے۔ اگر اس نے تمہیں فوراً دیکھنے کی ہامی بھری ہے تو وہ عظیم معالج ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے، اس نے حال ہی میں پریکٹس شروع کی ہو۔"

"یہی بات میرے ذہن میں آئی تھی۔ اس کا مطلب یہ

انڈونیشیا میں تعلیم کی شرح ۶۲ فی صد ہے، فلپائن میں ۸۰ فی صد ہے، تھائی لینڈ میں ۸۴ فی صد ہے، چین میں صد فی صد ہے اور پاکستان میں؟ صرف ۲-۲۶ فی صد۔ وہ بھی سرکاری اعداد و شمار کے مطابق۔

٭

ہوا کہ اگر میں نے اس سے معائنہ کرایا تو مجھے کسی دوسرے مشہور ماہر کی رائے بھی لینی پڑے گی۔"

"جب اس نے یہ کہا تھا کہ وہ فوراً" تمھارا معائنہ کر سکتا ہے تو کیا تمھارے ڈاکٹر کو کوئی شبہ نہیں ہوا تھا؟"

"میرا ڈاکٹر نروس ہو گیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اس کے علم میں آج تک ایسا کوئی اسپیشلسٹ نہیں آیا جو کسی مریض کو فوراً" دیکھنے کے لیے تیار ہو۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ میرے پاس اس کے سوا کوئی اور نام بھی نہیں ہے۔ یا تو میں اسی کے پاس چلا جاؤں یا اس سے بہتر شخص کا انتظار کروں جو آسٹریلیا گیا ہوا ہے۔"

"ہو سکتا ہے جس شخص نے تمھیں بے تاخیر دیکھنے کی بات کی ہے' اس کے کسی مریض نے اپنی ملاقات ملتوی کرا دی ہو اور ڈاکٹر نے اس مریض کا وقت تمھیں دے رہا ہو؟" میں نے اپنے دوست کو خوش کرنے کی خاطر کہا۔ "میرے علم میں ایک ایسا واقعہ ہے کہ صفِ اوّل کے ایک سرجن نے میرے ایک دوست کو اس کے ٹیلی فون کرنے کے صرف چار ہفتے بعد معائنے کے لیے طلب کر لیا تھا۔"

"سرجن نے تمھارے دوست کو کیا بتایا تھا؟"

"یہی کہ اسے کوئی بیماری نہیں' وہ بالکل تن درست ہے۔ اس دوست کے ساتھ جو بھی مسئلہ تھا' وہ اس دوران خود بخود ٹھیک ہو گیا تھا۔"

"تو تمھارا خیال ہے کہ اگر میں آسٹریلیا جانے والے ڈاکٹر کا انتظار کروں تو اس کی واپسی تک میں بھی صحت مند ہو جاؤں گا؟"

"میں ڈاکٹر تو نہیں ہوں لیکن میں نے ایسے بہت سے واقعے سنے ہیں کہ مریض کو متعلقہ شعبے کی سب سے بڑی شخصیت سے ملاقات کرنے کے لیے اتنا طویل انتظار کرنا پڑا

کہ اس کے مرض کا خود بخود علاج ہو گیا۔"

"لیکن کیا آپ اس وقت احمق نظر نہیں ...
تمام وقت تو معالج کا انتظار کرتے رہیں اور ...
معائنہ کرائیں تو وہ آپ میں کوئی خرابی تلاش نہ کر ...

"وہ اسپیشلسٹوں کو اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی ...
یہ بے حد مصروف ہوتے ہیں اس لیے تم میں کوئی ...
ان کا بہت سا وقت بچ جاتا ہے جو انھیں تمھارے ...
خرچ کرنا پڑتا' اگر تمھارے ساتھ کوئی مسئلہ ہوتا۔"

"میں اب بھی الجھن میں ہوں کہ کیا اس ...
ڈاکٹر سے ملاقات منسوخ کرا دوں جو فوراً" معائنے پر ...
اور اس اسپیشلسٹ سے وقت لینے کی کوشش کروں ...
دیکھنے سے قاصر ہو۔"

"ہاں' میرا خیال ہے' وہی شخص زیادہ بہتر ہو ...
دیکھنے سے قاصر ہو۔ تمھیں بھی اس پر زیادہ اعتماد ...
ساتھ ہی اگر تم فوراً" والے ڈاکٹر سے مل لو تو ...
گوارا حیرت بھی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے' وہ اپنے ...
واقعی ماہر ہو اور طبی محفلوں میں مقالے پڑھنے ...
ہو۔ تم جانتے ہو گے' بعض ڈاکٹر پرواز کرنے ...
ہیں۔"

"ایک بات بتاؤ۔" گلوور نے کہا۔ "کیا وہ ...
اسپیشلسٹ معالجانہ سرگرمی تک محدود نہیں رہتے؟ ...
وقت مقالے پڑھنے کے لیے نیوبلی اور قاہرہ' اور ...
جانے کی کیوں پڑی رہتی ہے؟"

"اس لیے کہ اگر وہ صرف اپنے مریضوں کی ...
تک محدود رہیں تو ان کے متعلق کسی کو پتہ نہیں چلے ...
اپنے شعبے کی ممتاز شخصیت ہیں۔ دیکھو' میرا خیال ہے ...
مسئلے میں الجھ کر اپنے آپ کو مزید اذیت میں مبتلا کر ...
میرا مشورہ یہ ہے کہ تم اس ڈاکٹر کے پاس چلے جاؤ جو ...
فوراً" دیکھنے پر آمادہ ہے لیکن اس سے قبل کہ وہ ...
معائنہ شروع کرے' اس سے یہ پوچھ لینا کہ اس سال اس ...
کتنے جلسوں میں شرکت کی۔ اگر اس کا جواب یہ ہو کہ ...
میں بھی نہیں تو اپنا لباس اتارنے سے پہلے وہاں سے ...
بھاگنا۔ مناسب ہے نا؟"



ہم سر

ہر ملک کو لازماً" ایک دشمن کی ضرورت ہوتی ہے۔ حقیقت میں اس وقت تک آپ کی کوئی خارجہ پالیسی نہیں بن سکتی یا کوئی ویو یکل وفاقی ادارہ وجود میں نہیں آسکتا جب تک آپ کی فوجی سالمیت کو کسی اور قوم سے خطرہ لاحق نہ ہو۔

صدر نکسن ملک کے سابق دشمنوں سے خوشگوار سیاسی تعلقات کی بحالی کے لیے جس تیز رفتاری کا مظاہرہ کر رہے ہیں' اس کے پیشِ نظر ویت نام کی جنگ کے بعد یہ سوال سامنے آیا ہے کہ وہ کون سا ملک ہوگا جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے خارجی معاملات میں سب سے مضبوط کردار ادا کرے گا؟

اس مسئلے پر غور و خوض کے لیے ہنری کسنجر کے ایک نائب ہیرنچ ہمفل فالب کی زیرِ ہدایت ماہر سیاست کاروں اور فوجی حکام پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی جسے کام کرتے ہوئے ایک سال سے زیادہ ہو چکا ہے۔

ہمفل فالب وہائٹ ہاؤس میں "فرائونٹس کراوٹ" کے نام سے مشہور ہے' اس نے مجھے بتایا۔ "صدر صاحب کے دورۂ پیکنگ کے بعد دشمن تلاش کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ ایک مرتبہ ٹیلی وژن پر صدر نکسن کو وزیر اعظم چین چو این لائی کے ساتھ وان ٹن سوپ پیتے دکھا دیا گیا تھا' چنانچہ ہمیں چین کو امریکہ کے لیے پہلے نمبر کا خطرہ قرار دینے سے خارج کرنا پڑا۔"

"روس کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ لوگ ہماری تمام گندم خرید رہے ہیں۔ ہم ان ممالک میں سے کسی کو اپنا دشمن قرار نہیں دے سکتے جو ادائیوں کا توازن برقرار رکھنے میں ہماری مدد کر رہے ہیں۔"

"کیوبا؟" میں نے تجویز پیش کی۔

"کیوبا کے بارے میں بھی ہم غور کر چکے ہیں' لیکن کہ ہمارے درمیان ہوائی جہازوں کے اغوا کے انسداد کا معاہدہ طے پانے کے لیے گفت و شنید ہو رہی ہے۔ اس لیے صدر صاحب کا خیال ہے کہ جہاں تک کیوبا کو دشمن بنانے کا معاملہ ہے' اسے فی الحال سرد خانے میں رہنے دیا جائے۔"

"لیکن ہمارا کوئی نہ کوئی دشمن تو ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "ہر قوم کو ایک ایسے ملک کی ضرورت ہوتی ہے جس سے وہ نفرت کر سکے۔"

"ہم اس سے بہ خوبی آگاہ ہیں۔" ہمفل فالب نے جواب دیا۔ "اور ہمارا خیال ہے' ہمارا ایک دشمن ہے۔" ہمفل فالب اپنے دفتر میں رکھے ہوئے ایک بڑے سے گلوب کے پاس گیا اور ڈراؤنے انداز میں اس کے اوپری حصے پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ سویڈن ہے۔"

"سویڈن؟"

"ہاں۔" ہمفل فالب نے اقرار کیا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارا ہو گئیں۔ "سویڈن نہ صرف ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی سلامتی کے لیے بلکہ آزاد دنیا کے لیے ایک خطرہ ہے۔ اگر ہمارا ملک خود کو مسلح کرنے کے ساتھ ساتھ مخصوص رویہ اختیار نہیں کرے گا تو نصف دنیا سویڈش ہو جائے گی۔"

"کیا یہ معاملہ اتنا سنجیدہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں' نظریاتی طور پر سویڈن ہر اس چیز کے خلاف ہے جس پر ہم یقین رکھتے ہیں۔ وہ لوگ مفت علاج' غریبوں کی امداد' بوڑھوں کے لیے مفت اقامت اور ہر ایک کے لیے مفت محبت کے قائل ہیں۔ امریکہ اس معاملے میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتا اور نہ انھیں اس کی اجازت دے سکتا ہے کہ وہ اپنا یہ پیغام بقیہ کرۂ ارض پر پھیلائیں۔"

میں نے پلکیں پٹ پٹائیں۔

"ایف بی آئی کے پاس اس بات کے ناقابلِ انکار شواہد موجود ہیں کہ سویڈن نے پورے امریکہ میں سویڈش مساج پارلروں میں سرمایہ کاری کی ہے۔ یہ پارلر امریکی مردوں کو فرضی احساسِ تحفظ اور عارضی سکون عطا کرنے کے لیے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ سویڈش فلمیں نوجوان نسل کو تخریب کاری پر اکسانے اور شہری حقوق سے محروم کرنے کے لیے استعمال کی گئی ہیں۔ ہمیں اس حقیقت کا بھی بخوبی علم ہے کہ اسٹاک ہوم میں انقلاب کا منصوبہ ہی تیار نہیں کیا گیا بلکہ براہِ راست وہیں سے اس پر عمل درآمد کی نگرانی بھی کی جا رہی ہے۔"

"ارے یہ بات تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

"سویڈش ٹینکر چھپتے بحری بیڑے کا تعاقب کرتے رہے ہیں' سویڈش مال بردار جہاز نیویارک کی بندرگاہ پر دیکھے گئے ہیں' ایک سویڈش مسافر بردار طیارے نے لاس انجلز کی فضا میں پرواز کی ہے۔ امریکی قوم کو جارحیت کے ان اقدامات سے خبردار کرنا بے حد ضروری ہے اور ہم یہ معاملات نظر انداز نہیں کر سکتے۔"

"لیکن کسی سویڈ سے نفرت کرنا تو بے حد مشکل ہے۔" میں نے کہا۔

"مشکل کیوں ہے؟ انھوں نے امریکی بھگوڑوں اور ڈرافٹ کے فریب کاروں کو پناہ دی ہے' انھوں نے ویت نام کی لڑائی میں ہمارے خلاف مظاہرے کرائے پھر جب صدر نکسن نے کرسمس کے موقع پر ہنوئی پر بمباری کا حکم دیا تو انھوں نے صدر پر شدید نکتہ چینی کی جو ایک ناقابلِ معافی بات ہے۔ اگر اب بھی یہ ملک ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا دشمن نہیں ہے تو پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس لفظ کے کیا معنی ہیں۔"

"لیکن اگر صدر نکسن نے چین اور سوویت یونین کے ساتھ امن کے معاملات طے کر لیے ہیں تو وہ سویڈن کے ساتھ سفارتی تعلقات کی بحالی کی کوئی نہ کوئی راہ بھی نکال سکتے ہیں۔"

"یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک سویڈن اپنے عوام کو غلام بنانے اور اپنے شیطانی مسائل بیرونِ ممالک میں پھیلانے سے باز نہیں آجاتا۔"



خاک در دہن

[illegible]

ہے کہ وہ ہر رات بہ مشکل چار گھنٹے سوپاتا ہے۔"

"بہت خوب!"

"کیا تمھیں ان بچّوں سے کوئی ہم دردی نہیں جو آج کل پورے امریکا میں سرخ سرخ آنکھوں کے ساتھ اس اذیت میں مبتلا ہیں؟"

"کوئی خاص ہم دردی نہیں۔" میں نے اعتراف کیا۔ "بچّوں کی اکثریت سخت محنت اس لیے کر رہی ہے کہ انھوں نے اس وقت پڑھائی نہیں کی جب کرنی چاہیے تھی۔"

"میں یہ تسلیم نہیں کر سکتی۔ شان ایک اچھا طالب علم ہے لیکن بہت سے دوسرے طلبہ کی طرح اس سسٹر میں وہ بھی غیر نصابی سرگرمیوں میں مصروف رہا اور اپنی درسی کتابوں سے زیادہ لگاؤ پیدا نہ کر سکا۔"

"ہاں' یہ بات سمجھ میں آتی ہے لیکن اس سلسلے میں تم کیوں پریشان ہو؟ فرض کرو' اگر شان فیل ہو جاتا ہے یا ڈی گریڈ حاصل کرتا ہے تو زیادہ سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے؟"

"وہ ایک اچھے کالج میں جانے کے قابل نہیں رہے گا۔"

"اس میں کیا برائی ہے؟"

"اس کا باپ اسے مار ڈالے گا۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کیوں کہ جب میں چھوٹا تھا تو کسی کو یہ فکر نہیں ہوتی تھی کہ میں اپنے امتحان میں پاس ہوتا ہوں یا نہیں۔ یہ مسئلہ میرا ہوتا تھا۔ آج کے دور میں جب بھی کسی بچے کو کوئی' امتحان دینا ہوتا ہے تو اس کے والدین اعصابی تناؤ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔"

صوفیہ بولی۔ "وہ آخر ہماری اولاد ہیں۔ ان تاریک لمحات میں اگر ہم ان کا ساتھ نہیں دیں گے تو کون دے گا؟"

"لیکن انھیں تو زندگی بھر کسی نہ کسی امتحان سے گزرنا ہے' تم ہر مرتبہ ان کی مدد کے لیے موجود ہونے سے رہیں۔ لہٰذا میرا مشورہ ہے کہ ابھی سے خود کو اس معاملے سے علیحدہ کر لو اور یہ بات ان پر چھوڑ دو کہ وہ تیرنا سیکھتے ہیں یا ڈوب جاتے ہیں۔"

"میں خود کو علیحدہ نہیں کر سکتی۔" صوفیہ نے کہا۔ "اگر شان قرونِ وسطیٰ کی تاریخ میں ایف گریڈ حاصل کرتا ہے تو میں خود کو زندگی بھر معاف نہیں کروں گی۔ یہ بات تاحیات میرے ذہن پر بوجھ بنی رہے گی۔"

"کیا شان کو اس کا احساس ہے کہ اسے کوئی امتحان دینا ہوتا ہے تو تم کس قدر پریشان اور ہراساں رہتی ہو۔" میں نے پوچھا۔

"میں اسے یہ بات نہیں بتا سکتی ورنہ وہ ذہنی انتشار کا شکار ہو جائے گا۔"

"کیا سال کے اس حصّے میں تمام ماؤں کی یہی کیفیت ہو جاتی ہے؟"

"ہاں' ہم تمام مائیں جنھوں نے قدرتی طور پر بچّے جنے ہیں' اسی کیفیت کا شکار ہوتی ہیں۔ شان پیدا ہوا تھا تو میں نے عہد کیا تھا کہ اسکول کے معاملات میں اسے کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گی اور اس کی تشفّی کے لیے روحانی طور پر ہمیشہ اس کے پاس رہوں گی۔"

"میرا خیال ہے شان کے لیے یہی بہتر ہوگا کہ وہ اس بات سے لاعلم رہے کہ تم اس کے لیے پریشان اور فکرمند اس کے پاس موجود ہو۔"

"تمھارے منہ میں خاک!"

اسرار و رموز کے دو آتشہ افسانے

شرافت صدیقی کے قلم کا شاہکار افسانہ

ہوس کے جانفروش

ایک کا نام لالی تھا، دوسرے کا رحیم داد۔ وہ جیل کی اونچی دیوار پھاند کے باہر تو آ گئے تھے لیکن اب کھلی فضا میں ان کی سانس رکی جا رہی تھی۔ دن بھر چھپتے چھپاتے وہ مسلسل آگے بڑھتے رہے۔ دن کا اجالا ہونے تک وہ کسی محفوظ جگہ پہنچ جانا چاہتے تھے۔ آخر انھیں ایک گاؤں میں شاداں نامی ایک طرح دار عورت کے گھر میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔ شاداں ان مفرور قیدیوں سے قطعاً نہیں گھبرائی۔ اس کے برعکس لالی اور رحیم داد خوف زدہ تھے کیوں کہ اس کے گھر میں ایک لاش رکھی تھی۔ شاداں نے اس رات اپنے بے وفا آشنا کو قتل کر دیا تھا۔ واردات سنگین تھی مگر لالی اور رحیم داد کو مشکل سے سر چھپانے کا ٹھکانا نصیب ہوا تھا۔ دونوں نے لاش دفن کرنے میں شاداں کی مدد کی اور اس کی ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جہاں نصیب شاداں کا ماجرا سن کر لالی تو کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گیا تھا اور اس کے لیے یہ واقعہ بھی حیران کن تھا کہ جس شاداں نے انھیں پناہ دی، وہی دو ہزار روپے کے لالچ میں ان کی مخبری کر آئی تھی۔ وہ اپنے گھر میں دونوں مفرور ملزموں کی موجودی کے راز سے پولیس کو مطلع کر آئی تھی اور اپنی اس حرکت پر نادم بھی اس قدر ہوئی کہ پولیس کے آنے سے پہلے اس نے لالی کو باخبر کر دیا۔ دونوں وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور انھیں ایک تاریک غار میں پناہ لینی پڑی۔ وہ مشکل وقت کسی طور ٹل گیا تو جیل کے لباس سے آزاد ہونے کے لیے لالی کو پھر ہمت استوار کرنی پڑی۔ رحیم داد کو غار میں چھپے رہنے کی تاکید کر کے لالی باہر آیا اور بھٹکتا ہوا کہیں سے کہیں نکل گیا۔ اسی دشت نوردی میں اس کی مڈبھیڑ علاقے کے ایک بڑے زمیں دار میاں حیات محمد سے ہو گئی۔ لالی کو سانس لینے کا وقت مل گیا تھا لیکن زمیں دار کی نظر کرم کی لالی کو بہت سخت قیمت ادا کرنی پڑی۔ میاں حیات محمد نے





جاگیرداری خاطر اپنے سگے بڑے بھائی کو تہ خانے میں قید کر رکھا تھا۔ قیدی کو جانے کب سے سست اثر زہریلے انجکشن لگائے جا رہے تھے۔ یہ حویلی بھی ایک طرح کا زنداں ثابت ہوئی۔ حیات محمد کے حکم پر لالی کو انجکشن لگانے کا اذیت ناک کام بھی انجام دینا پڑا۔ حویلی کے رنگ ڈھنگ نرالے تھے۔ وہاں کا بادشاہ میاں حیات محمد تھا باقی سارے اس کے محکوم۔ انسانی جان کی وہاں کوئی وقعت نہیں تھی۔ لالی نے آزمائش کے یہ دن بھی اطمینان سے گزارے۔ ایک رات میاں حیات محمد اپنی بیوی ناصرو پر شعلہ بار تھا کہ خلوت گاہ میں لالی کی بروقت مداخلت سے ناصرو کی جان بچ گئی۔ لالی نے وار کو مار کر یتیم جاں کر دیا۔ ناصرو کی اعانت سے وہ حویلی سے باہر آگیا اور ناصرو کی گاڑی نے اسے میاں حیات محمد کے آہنی حصار سے دور کر دیا۔ سنسان مقام پر ناصرو نے اسے اتار دیا۔ یہاں کتوں کا ایک غول اس کا منتظر تھا۔ ایک قریبی ریسٹ ہاؤس کی دیوار پھاندنے پر کہیں لالی کو ان درندوں سے نجات مل سکی۔ اسے رحیم داد کی فکر تھی مگر ہوا کا رخ موافق نہیں تھا۔ دونوں مفرور قیدیوں کی تلاش میں پولیس ہر طرف منڈلا رہی تھی۔ اس کی نظروں سے بچنے کے لیے لالی کو طرح طرح کے لوگوں کا سہارا لینا پڑا۔ وہ جبراً "و قہراً" ان کے احکام پر سر جھکاتا رہا۔ اسے قبرستان میں انسانی اعضا نکالنے کے ناقابل برداشت امتحان سے بھی گزرنا پڑا۔ رات کی تاریکی میں ڈھانچوں کی فروخت کا گھناؤنا کام بہت منظم پیمانے پر ہوا کرتا تھا۔ یہ خطرناک لوگ تھے۔ ان کے نرغے سے نکلنا لالی کے لیے میاں حیات محمد کے زنداں سے بھی مشکل ہو گیا تھا تاہم جلد ہی ایک رات قبرستان سے ڈھانچے لے جانے والے ٹرک میں سوار ہونے کا موقع اسے مل گیا۔ راستے میں پولیس نے ٹرک روکا بھی لیکن لالی پر ان کی نظر نہیں پڑی۔ پھر آگے وہ ٹرک سے کود پڑا اور اندھیرے میں جد هر منہ اٹھا بھاگتا رہا۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ ایک بڑا سرکاری افسر ہمدانی اس کی راہ کا ہمسفر بنا۔ ہمدانی کی گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ لالی نے اس کی مدد کی۔ ہمدانی افسر ہونے کے باوجود بے تکلف یار باش قسم کا آدمی تھا۔ اس نے اپنی گاڑی میں لالی کو اٹھایا اور اپنے گھر لے آیا۔ اپنے ایک خاص کام کے لیے ہمدانی کو لالی موزوں شخص نظر آیا تھا۔ لالی کو انکار کی مجال نہیں تھی۔ اس رات وہ لالی کی وجہ سے اپنی زندگی کے سب سے حسین، حیرت انگیز اور شرم ناک منظر سے دوچار ہوا۔ چند متمول اور بارسوخ لوگوں نے غالباً زندگی کی یکسانیت سے اکتا کر ایک خفیہ کلب قائم کر رکھا تھا۔ کلب کے گنے چنے ارکان کسی رات وہاں اپنی اپنی سجائی بیگمات سمیت جمع ہوتے اور نائٹ آف کریٹ منا تے۔ رنگ، روشنی اور خوشبو بھری ایک رات۔ ہمدانی نے کلب کے مستقل امپائر کی غیر حاضری کے باعث لالی کو امپائر کے طور پر پیش کیا۔ کلب کی عشرت گاہ میں سات کمرے بنے ہوئے تھے۔ تمام ممبر عورتیں مختلف کمروں میں بھیج دی جاتیں۔ صرف امپائر کو معلوم ہوتا تھا کہ کون سے کمرے میں کون عورت ہے۔ امپائر ہر ممبر کو قرعے کے مطابق کمرے کی چابی پیش کرتا۔ ہمدانی کی فرمائش پر لالی نے بڑی چالاکی سے اسے اس خاص کمرے کی چابی دے دی جہاں اس کی مطلوب نظر موجود تھی۔ کلب کے ایک ممبر کی بدخوشی کے سبب لالی نے ایک بند کمرے کی سیر بھی کر لی۔ اس کمرے میں ہمدانی کی ماہ جمال بیگم سولہ سنگھار کیے اپنے شب شریک کی منتظر تھی۔ وہ لالی کو دیکھ کر مشتعل ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ شور مچاتی لالی کمرے سے نکل گیا اور عشرت گاہ سے فرار ہو گیا۔ اندھیری رات میں وہ خاردار جھاڑیوں سے الجھتا ہوا ایک نہر کے کنارے پہنچ گیا اور پانی میں چھلانگ لگا دی۔ پانی کے ایک زبردست ریلے میں غوطے کھاتا ہوا وہ دور نکل گیا اور کسی نہ کسی طرح اندھیرے چیرتا ہوا اپنی منزل شاداں کے پاس پہنچنے میں کام یاب ہو گیا اور شاداں کے پاس آ کے وہ خود کو بھول گیا۔ دونوں نے ہمیشہ ساتھ رہنے کے عہد و پیماں کیے۔ وہ ایک نئی زندگی شروع کرنا چاہتے تھے۔ شاداں کی اطلاع کے مطابق پولیس کئی بار لالی کی جستجو میں اس کے گھر آ چکی تھی۔ زیادہ دیر لالی کا وہاں ٹھہرنا خطرناک تھا۔ وہ شاداں سے قادر آباد میں ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا اور چھپتا چھپاتا جگہ جگہ رحیم داد کو ڈھونڈتا رہا اور آخر رحیم داد اسے ایک جگہ نظر آ گیا۔ دونوں مدت بعد ملے تھے ضبط نہ کر سکے۔ یہاں سے لالی کو شاداں کے پاس قادر آباد جانا تھا، رحیم داد کو اپنے بیوی بچوں کے پاس احمد کوٹ۔۔۔۔ وہ مخفوظ راستوں کی سمت ارادے باندھ رہے تھے کہ پولیس نے آ لیا۔ لالی کے پاس رائفل تھی۔ اس نے رحیم داد کو جنگل کی طرف نکل جانے کو کہا اور خود پولیس سے نبرد آزما ہو گیا۔ اکیلے لالی کا آخری کارتوس بھی کام آ گیا اور زنجیریں پھر اس کا مقدر ٹھہریں۔

ادھر رحیم داد نے اپنے ساتھی سے بچھڑنے کے بعد بہت خاک چھانی۔ جیل کے کپڑوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے اسے جنگل میں ایک چرواہے کو قتل کرنا پڑا۔ رحیم داد نے اس کے کپڑے پہن لیے اور جیل کا لباس اسے پہنا دیا۔ جنگل میں مسخ شدہ لاش دریافت ہونے پر مقتول چرواہے کو مفرور قیدی رحیم داد سمجھ لیا گیا اور پولیس کے مسلسل تعاقب سے رحیم داد کی جان چھوٹ گئی مگر سکون اسے پھر بھی نہیں ملا۔ وہ اپنے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا کہ راستے میں گورداس پور کے ایک خستہ حال مہاجر چودھری نور الٰہی سے اس کی ملاقات ہوئی۔ رحیم داد نے ترس کھا کے اس ناتواں کو گھر پہنچانے میں مدد دی۔ چودھری نے اسے روک لیا اور اپنی دل دوز داستان سنا کے رحیم داد کو آزردہ کیا۔ تقسیم کے فسادات میں اس کے بیوی بچے بچھڑ چکے تھے۔ اس نے کلیم کسی طرح منظور کرا لیا تھا مگر بیوی بچوں کی جدائی نے اسے زندہ درگور کر رکھا تھا۔ رحیم داد کو چودھری کی تحویل میں کلیم کے کاغذات کی اہمیت معلوم تھی۔ ایک ہی صورت تھی کہ وہ نحیف و نزار چودھری کا کام تمام کرے اور خود چودھری بن جائے۔ ایک قتل کے بعد دوسرے کی آمادگی میں اسے کچھ دیر نہیں لگی۔ کلیم کے کاغذات قبضے میں کر کے وہ بڑی آرزوؤں، ارمانوں کے ساتھ اپنے گاؤں پہنچا مگر وہاں ایک اور منظر اس کی چشم تماشا کے لیے درس عبرت تھا۔ اس کی بیوی اس کے عزیز ترین دوست جلال دین کے پہلو میں بسی ہوئی تھی۔ وہ جس طرح خاموشی سے گیا تھا اسی خاموشی سے لوٹ آیا۔ وہاں سے دل شکستہ ہو کے وہ اپنی بہن بیگماں سے ملنے شہر امیر خاں پہنچا۔ یوں براہ راست بیگماں کے گھر جا کے دستک دینا مناسب نہیں تھا۔ اس نے ایک دردمند شخص کے ذریعے بیگماں کو بلانا چاہا اور یہ ممکن نہ ہوسکا۔

ایک رات خود بیگماں کے گھر جانے کی جرأت کی۔ بہن کو بھائی کے پہچاننے میں خاصی دشواری ہوئی۔ رحیم داد اب چودھری نور الٰہی کے بہروپ میں تھا۔ جب بیگماں پہچان پائی تو اس کی وارفتگی کا ٹھکانا نہ رہا۔ بے اختیار بھائی کے سینے سے آ لگی۔ اسی دوران اچانک بیگماں کی نند گھر کے کسی گوشے سے نمودار ہو گئی۔ رحیم داد فوراً چھپ گیا اور بہ سلامت بہن کے گھر سے نکل آیا۔ رحیم داد کو خوش گمانی تھی کہ بیگماں کی نند اُسے دیکھ نہیں سکی ہے۔ دوسرے دن بے قرار بیگماں چھپتی چھپاتی اپنے بھائی سے ملنے اس کے دوست کے گھر خود پہنچ گئی۔ عرصے سے بچھڑے بھائی بہن ایک دوسرے میں گم تھے کہ غیظ و غضب کی حالت میں بیگماں کا مسلح شوہر مولاداد اور اس کا بھائی ناگہاں سروں پر پہنچ گئے۔ رحیم داد کو ان کی غلط فہمی اور شک دور کرنے یا اپنے آپ کو ظاہر کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ مشتعل مولاداد نے کلہاڑی سے بیگماں کی گردن اُڑا دی۔ بیگماں کے بعد وہ جنون کے عالم میں رحیم داد کی جانب بڑھا۔ سینہ سپر ہو جانے کے سوا رحیم داد کے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ نتیجتاً زمین پر پھیلے ہوئے بیگماں کے خون میں مولاداد اور اس کے بھائی کا خون بھی شامل ہو گیا۔ مزید ایک لمحے بھی رحیم داد کو وہاں ٹھہرنا نہیں چاہیے تھا۔ اب پھر وہ تھا اور اس کا نامعلوم سفر۔ وہ چلتا رہا، بھاگتا رہا اور راتوں رات واردات کی جگہ سے بہت دور ہو گیا۔ وہ اندھا دھند فاصلے طے کرتا جا رہا تھا کہ کوٹلہ ہرکشن کے ساکن اللہ وسایا نامی ایک زمیں دار کے گھوڑے سے ٹکرا گیا۔ شرم سار اللہ وسایا زخمی رحیم داد کو اپنی حویلی میں لے آیا۔ وہ ایک نیک نفس شخص تھا۔ اس کی حسین و جمیل بیوی جمیلہ بھی بہت نفیس طبع اور غریب پرور عورت تھی۔ جمیلہ دراصل علاقے کے ایک بڑے ہندو زمیں دار کی بیٹی تھی۔ تقسیم کے بعد اس کا خاندان ہندوستان ہجرت کر گیا۔ جمیلہ کو فسادات میں دوسری بے سہارا لڑکیوں کی طرح زمانے کے بہت رنگ دیکھنے پڑے پھر وہ درماندہ کوچے کوچے بھٹکتی ہوئی کسی طور اپنے قدیم مزارع اللہ وسایا کی تحویل میں آ گئی۔ اسلام قبول کر کے اس نے اللہ وسایا سے نکاح کر لیا۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے پر ناز کرتے تھے۔ جمیلہ کی واپسی کے لیے ہندوستان کوچ کر جانے والے اس کے گھر والوں نے بہت جتن کیے مگر اللہ وسایا سے شادی کے بعد اس نے اپنے شوہر اور گھر ہی کو مقصود سمجھ لیا تھا۔ قرب و جوار کے زمیں دار کاشت کاروں سے جمیلہ اور اللہ وسایا کا مربیانہ مشفقانہ سلوک سخت ناپسند کرتے تھے۔ خصوصاً احسان شاہ نامی ایک بااثر زمیں دار اللہ وسایا سے بہت عناد رکھتا تھا۔ اس غبار و تکدر کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اللہ وسایا جدی پشتی رئیسوں کے قبیل سے نہیں تھا۔ احسان شاہ کے اثر و رسوخ کا کرشمہ تھا کہ ایک دن حکومت نے جمیلہ کو اپنے باپ کی تمام جائداد سے بے دخل کر دیا کیوں کہ اب وہ مسلمان تھی اور قانون کی رُو سے اپنے ہندو باپ کے ترکے کی وارث نہیں ہو سکتی تھی۔ خوش خلق منکسر المزاج رحیم داد، اللہ وسایا اور جمیلہ کی نوازشیں ارزاں تھیں۔ وہ اب ان کے ساتھ ہی رہنے لگا تھا۔ بہت دنوں کی کشاکش اور کش مکش کے بعد اسے گھر کی چھاؤں ملی تھی۔ زمین اور حویلی سے بے دخلی کے سانحے پر رحیم داد نے وہی پیش قدمی کی جو ایک دوست اور گھر کے فرد کو کرنی چاہیے تھی۔ اس نے چودھری نور الٰہی کے قلم کے کاغذات اللہ وسایا اور جمیلہ کی خدمت میں پیش کر دیے۔ اس دوران رحیم داد نے چودھری نور الٰہی کے دستخطوں کی اچھی مشق کر لی تھی۔ وقت طلب قانونی کارروائیوں میں وقت صرف ہوا لیکن حویلی اور ڈھائی سو ایکڑ زمین چودھری نور الٰہی کے نام منتقل ہو گئی۔ رحیم داد کوئی مفرور مجرم اور قاتل نہیں رہا۔ اب وہ چودھری نور الٰہی کے نام سے سکہ بند زمیں داروں کی صف میں شامل ہو گیا۔ رفتہ رفتہ علاقے کے ممتاز جاگیردار احسان شاہ سے اس کی صاحب سلامت ہو گئی۔ احسان شاہ کی پرورش سونے کے پالنے میں ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ دراز، رسائی دور دور تک تھی۔ اس نے اپنے ہم شعار رحیم داد کو بڑی عزت و مرتبت دی۔ جمیلہ اور اللہ وسایا کی نشاط خاطر کے لیے رحیم داد نے احسان شاہ سے اپنی رسم و راہ کی بھنک انھیں نہیں پڑنے دی تھی۔ جب ذرا ذرا گھبراتا ہی بہکتا تو کسی بہانے احسان شاہ کے ہاں چلا جاتا جہاں رنگ ہی رنگ تھے۔ احسان شاہ کا اپنا حرم تھا۔ اشاروں کے تابع کارندے تھے۔ بڑے سرکاری افسر اور کج کلاہ جاگیردار اس کی بارگاہ میں شامیں سرمست کرنے آتے تھے۔ احسان شاہ نے ابتدا ہی سے اللہ وسایا کے لیے رحیم داد کے رگ پے میں کانٹے بھرنے شروع کر دیے تھے۔ اس مسلسل تحیہ و تاکید کا ثمر یہ نکلا کہ رحیم داد اپنے مربی اپنے محسن اللہ وسایا کے قتل کی سازش میں آمادہ ہو گیا مگر صرف احسان شاہ ہی نہیں، خود رحیم داد کی ترغیب و تحریص بھی کم نہیں تھی۔ بات یہ تھی کہ مثال جمیلہ کے خیال سے رحیم داد کے سینے میں آگ بھڑکنے لگتی تھی۔ جمیلہ کی آہٹوں سے اس کا دل دھڑک اٹھتا تھا۔ اللہ وسایا کی دیوار ہٹائے بغیر جمیلہ کی منزل ممکن نہ تھی۔ سو احسان شاہ کے تعاون سے اس نے اللہ وسایا کو زندگی سے عاری کر دیا۔ جمیلہ ایک بار پھر لٹ گئی۔ رحیم داد ہر طرح اس کی دل جوئی کرتا رہا اور اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ جمیلہ سے وابستگی کی تمنا کسی خواب کے مانند ہے۔ اللہ وسایا کے بعد جمیلہ ویران ہو گئی تھی۔ اس نے رحیم داد پر کوئی الزام عائد نہیں کیا مگر اس کے تیوروں سے ظاہر تھا کہ وہ اپنے محبوب شوہر کے قاتلوں کو ابھی طرح جانتی ہے۔ اس انکشاف سے رحیم داد کی بے کلی بڑھتی گئی۔ وہ ہر قیمت پر جمیلہ کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس موقع پر احسان شاہ نے اس کی مدد کی۔ یتیم لڑکی تاجاں کی شادی کی تیاریوں میں جمیلہ ماں اور بہن کے طور پر مصروف تھی کہ شادی کی رات احسان شاہ نے عین وقت پر تاجاں کو اٹھوا لیا۔ جمیلہ سکتے میں آ گئی۔ تاجاں کی رہائی کے لیے اس نے احسان شاہ کے دربار میں جا کر گریہ و زاری کی۔ احسان شاہ نے رحیم داد سے نکاح کی شرط عائد کی۔ تاجاں کو آزاد کرانے کے لیے جمیلہ کے پاس تعمیل حکم کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ جمیلہ اسی رات رحیم داد کی زوجیت میں آ گئی۔ اس طرح رحیم داد جمیلہ کا مالک تو بن گیا مگر اس نے جمیلہ کو ہمیشہ ملول اور محروم ہی پایا۔ رحیم داد نے محض جمیلہ کی پرچھائیں اس کی تصویر پر غلبہ پایا تھا۔ تاجاں کی شادی تمام تر اہتمام سے ہوئی۔ رحیم داد کو امید تھی کہ اب اس کی تصویر نظر کو اس کی طرف دیکھنے کا موقع ملے گا۔ جمیلہ ایک سہمی ہوئی عورت کے مانند نئے حالات میں خود کو ڈھال لے گی مگر جمیلہ نے کچھ اور طے کر رکھا تھا۔ رحیم

داد اس قسم کی شعبدہ بازی نہ کرتا تو شاید وہ حویلی میں زندگی کے باقی دن گزار دیتی۔ تاجاں کی شادی کے بعد اس نے جیلوں بھانوں سے مضطرب رحیم داد کو اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیا۔ پھر ایک رات سرحد پار سے اس کا بڑا بھائی اپنے مسلح ساتھیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا اور زندگی سے بگڑی ہوئی اپنی بہن پاروتی کو رحیم داد کے شکنجے سے نکال لے گیا۔ جیلہ ہی نے کسی پیغام رساں کے ذریعے اسے بلوایا تھا۔ رحیم داد کے سان و گمان میں نہ تھا کہ جیلہ اس طرح اس سے بھی جدا ہو جائے گی۔ اس کے دنوں میں اندھیرا بھر گیا۔ اس کا نہ کہیں آنے کو جی چاہتا تھا نہ کسی سے ملنے کو۔ جیلہ کی جدائی پر پُرسانِ حال اس سے ہم دردی کا اظہار کرنے آنے لگے تھے۔ ایک روز اس کا مشیر اور جلیس احسان شاہ بھی آیا۔ اس نے بھی رحیم داد کو آسودہ رکھنے کی ہمت کوشش کی لیکن جیلہ تو رحیم داد کی نس نس میں سما چکی تھی۔ احسان شاہ رحیم داد کے احوال درون سے بے خبر تھا۔ رحیم داد کے لیے جیلہ ہی سب سے بڑی جاگیر تھی۔ اس نے احسان شاہ سے فریاد کی کہ اس کا اثر و رسوخ تو اطراف و اکناف میں رہتا ہے۔ وہ سرحد پار سے جیلہ کو واپس لانے کا کوئی بندوبست کرے۔ کم از کم اس کی بے قراری اس کی عاجزی جیلہ تک پہنچا دے۔ احسان شاہ نے عرصے پہلے رحیم داد کی زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے اپنے ایک آزمودہ آدمی نادر خاں کو مینجر رکھوا دیا تھا۔ نادر خاں نے بھی رحیم داد کا دل زمین کے کاموں میں لگانا چاہا مگر جیلہ کے بغیر رحیم داد کا دل کسی کام میں نہیں لگتا تھا۔ احسان شاہ کے ذریعے اس کی ملاقات بڑے بڑے جاگیرداروں، زمین داروں اور افسروں سے ہوئی تھی، سردار مراد خاں شاہانی، سردار شاہ نواز مزاری سے بالخصوص اس کے خاص مراسم ہو گئے تھے۔ اس نے ان کے شیش محل، ان کے پری خانے دیکھے تھے۔ ان کے عالی شان ایوان، ذاتی جیلیں، سنگ خانے اور ان کی شوکت و تمکنت کے نظارے کیے تھے۔ جیلہ کے چلے جانے کے بعد اس کا بیشتر وقت انھی عالی وقار لوگوں کی صحبت خاص میں گزرا مگر اسے چین نہیں آتا تھا۔ وہ مرید کوٹ میں سردار مراد خاں کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا کہ ایک روز سر راہ اس نے ایک شکستہ حال مجذوب عورت دیکھی۔ یہ جان کے رحیم داد کو خود سے نفرت ہونے لگی کہ وہ عورت حکیم نقش بندی کی بیوہ ہے۔ مرید کوٹ سے اس کا جی اکتا گیا تو وہ اپنے دوستوں سے ملنے ملتان، بھکر اور میلسی والی کی طرف نکل گیا۔ ہر جگہ اسے وہی آدمی نظر آئے۔ عامل معمول، حاکم محکوم، زمین دار اور کسان۔ رحیم داد کہیں تماشائی بن جاتا، کہیں تماشے کا حصہ۔ وہ خوب جان گیا تھا کہ بڑا زمین دار بننے کے لیے زمین داروں کی ایک خاص وضع ضروری ہے۔ اس کا کارندہ نادر خاں اس کی مختصر جائداد میں وہی کردار ادا کر رہا تھا جو جاگیرو زمین کے معاملات میں ہنرمندوں کا شیوہ ہونا چاہیے۔ مزارعوں سے زیادہ سے زیادہ کام کس طرح لیا جا سکتا ہے۔ رشوت کے ذریعے پانی اور دیگر سہولتوں کا حصول، توسیع زمین کی مستقل جستجو، افسروں کی خوشنودی وغیرہ۔ انھی دنوں احسان شاہ کے توسط سے اس علاقے کے ایک بڑے زمیندار، اسمگلر رفیع سمہ سے رحیم داد کی ملاقات ہوئی۔ سرحد پار اس کے بڑے تعلقات تھے۔ رفیع سمہ کی مشترک عادتوں کی وجہ سے جلد ہی اس کا دوست بن گیا اور اس نے مضطرب رحیم داد سے وعدہ کیا کہ وہ جیلہ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ رفیع سمہ اسے اپنے گاؤں بھی لے گیا۔ وہاں ایک نئی افتاد سے رحیم داد کا سامنا پڑا۔ گاؤں کی ایک گلی میں خلاف توقع اس نے اپنے بڑے بیٹے کی جھلک دیکھی۔ پہلے تو اس نے نظر کا فریب سمجھا مگر وہ کوئی بیگانہ ہوش شخص نہیں تھا۔ یقیناً یہ کوئی وہم نہیں تھا۔ رات کو اس کی وحشت اور سوا ہو گئی۔ وہ آرام کے لیے بستر پہ دراز ہوا ہی تھا کہ دروازے پر دستک سے چونک پڑا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ رحیم داد کے کہنے پر ایک عورت جھجک سے اندر آئی۔ اسے دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا۔ وہ اس کی بیوی نوراں تھی۔ نوراں کو شبہ ہو گیا تھا کہ وہ اس کا بچھڑا ہوا شوہر ہی ہے۔ اس ستم رسیدہ نے بہت کہا، بہت لوبی اور دہائی دی۔ رحیم داد انکار کرتا رہا کہ وہ تو چودھری نور الٰہی ہے۔ اتنے مصائب جھیلنے، اتنی دور آنے کے بعد وہ اپنی موجودہ زندگی سے دست کش نہیں ہونا چاہتا تھا۔ نوراں پر اپنا راز افشا کر دینے میں خدشے ہی خدشے تھے۔ نوراں ناکام لوٹ گئی۔ رحیم داد تو کب کا اپنی گزشتہ زندگی کا باب بند کر چکا تھا۔ پھر ایک روز رفیع سمہ نے آ کے اسے اور دل گرفتہ کیا۔ رفیع سمہ کے بیان کے مطابق جیلہ نے جالندھر میں ایک نابینا ہندو ڈاکٹر سے شادی کر لی تھی۔ اس تلخ حقیقت سے آگہی کے باوجود رحیم داد، رفیع سمہ سے جیلہ کی بازیابی کے لیے اصرار کرتا رہا۔ ادھر احسان شاہ نے لائل پور کی ایک زمین رحیم داد کے کلیم میں منتقل کرانے کے لیے افسروں سے رابطہ کر لیا تھا۔ اس کا ارادہ رحیم داد کی شراکت میں اس زمین پر ٹیکسٹائل مل قائم کرنے کا تھا۔ احسان شاہ کی ہدایت پر کلیم کے کاغذات لے کے وہ جیپ میں لاہور کا سفر طے کر رہا تھا کہ ملتان روڈ کے کچے راستے پر درختوں کی آڑ سے نکل کر ایک عورت اور مرد اچانک اس کے سامنے آ گئے۔ لالی اور شاداں کو پہچان کے رحیم داد بہت سراسیمہ اور بدحواس ہوا مگر خیر ہوئی دونوں کے نزدیک ہونے سے پہلے اس کی جیپ کا پہیا بدل چکا تھا۔ وہ کتنا ہی چودھری نور الٰہی کا حلیہ اختیار کر چکا ہو، جلد یا بدیر لالی اور شاداں کی نظریں اسے پہچان لیتیں۔ رحیم داد کے اشارے پر ڈرائیور تیز رفتاری سے جیپ بھگا لے گیا۔ لاہور میں احسان شاہ کی کوٹھی میں رحیم داد کئی دن مقیم رہا۔ پاک و ہند کی تقسیم کو کئی برس ہو گئے تھے۔ پاکستان میں محلاتی سازشیں زوروں پر تھیں۔ جعلی پرمٹ اور اصلی جعلی کلیم کا بازار گرم تھا اور چودھری نور الٰہی کے کلیم میں ابھی بڑی گنجائش تھی۔ رحیم داد کے ہم مرتبہ دوست اپنے اپنے علاقوں میں زمین لینے کی ترغیب اسے مسلسل دے رہے تھے۔ احسان شاہ ٹیکسٹائل مل کے سلسلے میں کراچی جا کے پھنس گیا تھا۔ اس کے ہاں اتنے دن قیام سے رحیم داد اکتانے لگا تھا اور بے کلی اور تنہائی محسوس کر رہا تھا کہ ایک روز سردار شاہ نواز اور سردار مراد خاں کے لاہور آ جانے سے جیسے دریچے وا ہو گئے۔ اس رات انھوں نے شہر کے ایک ہوٹل میں بڑی رنگین رات گزاری۔ دوسرے دن سردار شاہ نواز اپنے علاقے میں ایک نئی زمین دکھانے کے عذر سے رحیم داد کو بہ اصرار اپنے ساتھ لے گیا۔ ریل سے دونوں محمود کوٹ پہنچے، وہاں سے سردار جتکانی کی کار میں غازی گھاٹ اور وہاں سے اسٹیمر میں بیٹھ کر ڈیرہ غازی خاں آ گئے۔ اس طرف آنا بے سبب نہیں تھا۔ سردار شاہ نواز ان دنوں اپنے ایک خاندانی معاملے میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اس کی جوان سوتیلی ماں مرجان اپنی حویلی کے ایک ماشکی کے ساتھ فرار ہو گئی تھی۔ ایک

سے گا۔

اُس شخص کے ساتھ مرجان کا یوں چلے جانا ایک طرف عزت و ناموس کا مسئلہ تھا تو دوسری جانب سردار کے مرحوم باپ کے ترکے سے مرجان کے حصے میں آنے والی جائداد جاگیر سے محرومی کا بھی۔ سردار شہ زور مرجان اور سراب کو سزا دینے کے لیے بے تاب تھا۔ اس نے ان کی نقل و حرکت سے باخبر رہنے کے لیے اپنے مخبر اردگرد پھیلا رکھے تھے۔ مخبروں نے اطلاع دی تھی کہ مرجان اور سراب کو قطاریوں کی پناہ میں جانے کے لیے شام کو کسی وقت کسی سواری سے مسرور والی نا قاری گھاٹ کے راستے سے گزرنا چاہیے۔ سردار شہ زور نے سارے کام پس پشت ڈال کے سردار جسکانی، رحیم داد اور اپنے کارندوں کے ایک مسلح دستے کے ہم راہ کسی مہم کی طرح نشان زدہ راستے کا رخ کیا اور نشیبی علاقے کے ایک محفوظ مقام پر پڑاؤ ڈال دیا۔ اس کے ادھر گزرنے والی سواریوں کی تاک میں ادھر ادھر چھپ گئے۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ انھیں خاصا انتظار کرنا پڑا۔ پہلے ایک ریوڑ گزرا، پھر تین ٹرک، پھر اونٹوں کا ایک قافلہ۔ مخبروں کی اطلاع درست ثابت ہوئی۔ قطار کے آخری اونٹ کے کجاوے میں حسین مرجان اپنے وجیہ محبوب کے پہلو میں سمٹی بیٹھی تھی۔ شہ زور کے کارندے اطراف سے ٹوٹ پڑے۔ سراب نے مقابلہ کرنا چاہا مگر اسے جلد ہی بے بس کر دیا گیا۔ سردار شہ زور کی جیپیں راتوں رات فاصلے عبور کرتی ہوئی دونوں بدکاروں کو سردار کے آبائی گاؤں شاہ میر میں واقع کوٹ میں لے آئیں۔ انھیں زنجیریں پہنا کے زمین دوز عقوبت خانے میں ڈال دیا گیا۔ رحیم داد وہیں ٹھہرا رہا۔ سرداری کا خسروانہ سلوک، ہر دم حاضر رہنے والے خدام، لب ریز شامیں، گل ریز راتیں، وہاں کبھی کچھ تھا۔ اور ایک روز رات کو خادم نوشیر کی نوجوان بیوی نوری نے رازدارانہ انداز سے رحیم داد کی خلوت گاہ میں آکے اور اسے یہ بتا کے بہت حیران و پریشان کیا کہ ملوک زادی مرجان آج رات اس سے ملنے کی خواہش مند ہے۔ رحیم داد، سردار شہ زور کا مہمان تھا۔ سردار کی لاعلمی میں اس طرح کی ملاقات اسے کسی پہلو مناسب معلوم نہیں ہوئی مگر نوری نے اسے رازداری کا پورا یقین دلایا۔ خود رحیم داد کا تجسس بھی کم نہیں تھا۔ نوری کی التجا مستزاد تھی۔ وہ رد و قدح کے بعد آمادہ ہو گیا۔ آدھی رات کے وقت نوری دوبارہ اس کی خلوت میں وارد ہوئی۔ وہ اس کے ساتھ اندھیروں کی اوٹ میں اپنا وجود چھپائے مرجان کے زنداں میں داخل ہو گیا۔ مرجان چھبیس ستائیس سال کی ایک دل کش عورت تھی مگر اس وقت غم و اندوہ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس نے رحیم داد سے عاجزی کی کہ عزت و ناموس تو دکھاوے کی بات ہے، سردار محض جاگیر جائداد کے لیے اس کی جان کے درپے ہے۔ وہ اپنی زندگی کے عوض ساری جائداد سے دست بردار ہونے کے لیے تیار ہے۔ رحیم داد، مرجان کے روپ رنگ، انداز گفتار اور منت و زاری سے بہت متاثر ہوا۔ یہ نہایت نازک معاملہ تھا۔ اسے چھیڑنے پر سردار ایک دم مشتعل ہو سکتا تھا تاہم رحیم داد سے مرجان کی کس مپرسی دیکھی نہ گئی۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ سردار شہ زور کو آمادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ جس طرح وہ گیا تھا اسی خاموشی سے، دھڑکتے دل اور دھڑکتے قدموں سے وہ اپنی خلوت گاہ واپس آ گیا۔

سردار شہ زور خاں واپس آیا تو مراد خاں شاہانی بھی اس کے ہم راہ تھا۔ رحیم داد نے اسے حیرت سے دیکھا اور گرم جوشی سے بغل گیر ہوا۔ "شاہانی! تو کیسے ادھر آ گیا؟"

شاہانی نے بتایا۔ "شاہ جی تو ابھی کراچی سے لوٹا نہیں، البتہ اس کا مینیجر مہران علی لائل پور سے آ گیا ہے۔ میں ایک روز شاہ جی کی کوٹھی پر گیا تو مہران علی مجھے مل گیا۔ میں نے تیرے کلیم کے کاغذات اس سے لے لیے۔ میں نے پتہ تھا کہ تو ابھی ادھر ہی ہے، سوچا تجھ سے مل لوں گا اور کاغذات تیرے حوالے کر دوں گا۔"

"یہ تو نے بہت اچھا کیا۔" رحیم داد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی پتہ چلا کہ لائل پور کی زمین کے الاٹ منٹ کا کیا ہوا؟"

"مہران کہتا تھا، الاٹ منٹ میں کچھ پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ زمین پہلے ہی دو کلیم ہولڈروں کو الاٹ ہو چکی ہے۔ مقدمے بازی چل رہی ہے۔ معاملہ عدالت کے سامنے ہے۔"

"یہ تو نے اچھی خبر نہیں سنائی۔" رحیم داد بجھ کر رہ گیا۔

"چودھری! فکر نہ کر۔" شہ زور نے اسے تسلی دی۔ "میں نے ڈپٹی کمشنر اور محکمۂ بحالیات کے افسروں سے تیرے بارے میں بات کر رکھی ہے۔ تحصیل راجن پور میں تیرے لیے متروکہ اراضی بھی دیکھ لی ہے۔ فاضل پور کے نزدیک ہے۔"

"کیسی زمین ہے؟" رحیم داد نے دل چسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"تو نہری زمین کو کہتا تھا، یہ نہری زمین ہی ہے۔" شہ زور نے رحیم داد کو بتایا۔ "بہت بڑی ہے۔ تیرے لیے اڑھائی سو ایکڑ تو آسانی سے الاٹ ہو جائے گی۔"

شام کا جھٹ پٹا تھا۔ نوکروں نے سرکنڈوں کے بنے ہوئے مونڈھے لا کر رکھ دیے۔ وہ اطمینان سے بیٹھ گئے۔

"چودھری! یہ تو بہت اچھا ہوا۔" مراد خاں شاہانی نے قہقہہ

لگایا۔ "تجھے اِدھر زمین الاٹ ہو گئی تو شہ زور کے ساتھ اچھا وقت گزرے گا۔ یہ یاروں کا یار ہے۔ اور کام آنے والا بندہ ہے۔"

شہ زور نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "شاہانی آج صبح شاہ میر پہنچ گیا تھا۔ میں نے اس سے تیرے کلیم کے کاغذات لے کر درخواست بھی تیار کروائی۔ چاکر خاں کے پاس ہے۔ دستخط کر دینا، دو چار دن میں وہ درخواست لگا دے گا۔ اِلاٹ منٹ کی پروا نہ کر۔ کام فٹافٹ بن جائے گا۔ میں چاہتا ہوں، تو اِدھر میرے پاس آ جا۔"

"اِلاٹ منٹ مل جائے تو اِدھر بھی آتا رہوں گا۔" رحیم داد نے تسلی سے کہا۔ "پر میری اصل زمین داری تو کوٹلہ ہر کشن ہی میں ہے۔ اسے میں نہیں چھوڑ سکتا۔"

"کون کہتا ہے، تو اسے چھوڑ دے۔" شاہانی نے اتفاق کیا۔ "پر تیرا اُدھر رہنا کون سا ضروری ہے۔ تو نے خود تو زمین داری چلائی نہیں۔ تیرا کاردار نادر خاں زمین داری کی اچھی طرح دیکھ بھال کر سکتا ہے۔ زمین داری تو کاردار اور کم دار ہی چلاتے ہیں۔"

"سارے ہی وڈے زمین داروں کا کام ایسے ہی چلتا ہے۔ ذرا ہشیار رہنا پڑتا ہے۔ کاردار، کم دار اور کراووں پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔" شہ زور نے مراد خاں شاہانی کی تائید کی۔

چاکر خاں گورچانی بھی پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں اِلاٹ منٹ کی درخواست تھی۔ رحیم داد اس کے ہم راہ کمرے کے اندر گیا، لیمپ کی روشنی میں اس نے درخواست پر ایک نظر ڈالی اور دستخط کر دیے۔ کلیم کے کاغذات بھی اس نے گورچانی کے حوالے کر دیے۔ گورچانی چلا گیا۔

رحیم داد احاطے میں واپس پہنچا تو شام گہری ہو چکی تھی۔ باورچی خانہ نوکروں کی کوٹھری کے قریب ہی تھا۔ اُدھر گوشت بھونا جا رہا تھا۔ شہ زور اور شاہانی کے سامنے اسکاچ کی بوتل رکھی تھی۔

مراد خاں شاہانی نے پیگ بنا کر رحیم داد کو دیا پھر اپنا گلاس رحیم داد کے گلاس سے ٹکرایا اور چسکی لگاتے ہوئے بولا۔ "شہ زور نے تیرا دل بہلانے کا بھی کوئی انتظام کیا؟"

"کیا تو ہے۔" رحیم داد نے دبی زبان سے کہا۔

"لگتا ہے، تجھے اِدھر پسند کی زال نہیں ملی۔" شاہانی نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "چودھری! پسند ناپسند کے چکر میں نہ پڑ۔ ہر زال اچھی ہوتی ہے۔ بس نئی ہونی چاہیے اور چھوٹی بھی ہونی چاہیے۔"

"شاہانی! تو زال کے معاملے میں بالکل سندھی وڈیرہ ہے۔" مزاری نے ہلکا قہقہہ بلند کیا۔ "میری ایک بہن سانگھڑ میں بیاہی ہے۔ اس کا خاوند سندھی بلوچ ہے، جانے کب سے ان کا خاندان اُدھر آباد ہے۔ وہ سندھی کی ایک مثال دیا کرتا تھا، کچھ اس طرح ہے کہ بھوک میں تو کواڑ بھی پاپڑ لگتے ہیں۔ رن کے معاملے میں تو سندھی وڈیروں کا حال یہ ہے کہ جھاڑی پر بوچھن پڑا لہراتا ہو تو وڈیرے دونوں بازو پھیلا کر بھینچ لیتے ہیں۔"

نوکر نے گرم گرم تلا ہوا مرغ لا کر میز پر رکھ دیا۔ اسکاچ وسکی کے گھونٹ بھرتے رہے اور نوچ نوچ کر کھاتے رہے رات کی تاریکی بڑھتی گئی۔ شہ زور کچھ ایسا تھکا ہوا تھا۔ پہر رات گزرتے ہی وہ اُٹھ کر چلا گیا۔ شاہانی اور رحیم داد وسکی سے شغل کرتے رہے۔

سردار شہ زور کے اچانک چلے جانے پر رحیم داد پریشان ہو گیا۔ وہ مرجان کے بارے میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا مگر شہ زور اکیلا نہیں تھا، مراد خاں بھی ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایسی بات چھیڑنا اسے مناسب معلوم نہیں ہوا۔

مگر شہ زور جا چکا تھا۔ صبح جرگہ تھا۔ اس کے شروع ہونے سے پہلے ہی رحیم داد کو مرجان کا عندیہ نہ صرف شہ زور کو دینا تھا بلکہ اسے رضامند کرنے کی بھی پوری کوشش کرنی تھی۔ رحیم داد آہستہ آہستہ گھونٹ بھرتا رہا اور سوچتا رہا کہ مرجان کے معاملے پر کس طرح سردار مزاری سے بات کرے۔

مراد خاں شاہانی نے اسے خاموش پایا تو اکتا کر بولا۔ "کیسں چودھری! تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

رحیم داد لمحے بھر تک ٹکٹکی باندھے اسے تکتا رہا، پھر اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں نے شہ زور سے ایک ضروری گل کرنی تھی۔"

"وہ اتنی دیر تیرے ساتھ بیٹھا رہا، تو نے تب گل کر لی ہوتی"۔ شاہانی نے مشتبہ نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "لگتا ہے، تو میرے سامنے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔"

"ہاں!" رحیم داد انکار نہ کر سکا۔ "بات ہی کچھ ایسی ہے۔"

"مجھ سے بتانے کی نہیں؟" شاہانی نے پوچھا۔

"اب تجھے ہی بتانی ہوگی۔" رحیم داد نے کہا۔ "شہ زور تو اپنے کمرے میں ہوگا۔ اس کے ساتھ جلاوت کی گھروالی یا کوئی اور زنانی ہوگی۔"

شاہانی نے قدرے توقف کیا۔ "کوئی خاص گالہ نہ ہو تو مجھے ..."

"..." رحیم داد اپنا سونڈھا کھسکا کر مراد خاں سے اور قریب ہو گیا۔ اس نے ادھر ادھر چوکنا نظروں سے دیکھا۔ آس پاس کوئی نظر نہ آیا۔ رحیم داد کے چہرے سے سراسیمگی عیاں تھی۔ مراد خاں شاہانی نے اس کی یہ کیفیت دیکھی تو پوچھا۔ "اس چودھری! تو اتنا گھبرایا ہوا کیوں ہے؟"

"گل ہی ایسی ہے۔" رحیم داد نے رازدارانہ انداز میں ... سے کہا۔ "تو نے پتہ ہے، مرجان ادھر ہی ہے۔"

"ہوگی، تو نے اس سے کیا لینا۔" شاہانی نے بے نیازی سے کہا۔

"پہلے میری گل تو سن لے۔" رحیم داد نے سرگوشی کی۔ "اس نے ایک رات مجھے اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔"

"مرجان نے تجھے اپنے پاس بلایا تھا؟" شاہانی نے چونک کر رحیم داد کو دیکھا "تو اس کے پاس گیا تھا؟"

"ہاں گیا تھا۔"

"تو نے اسے دیکھا ہے؟" شاہانی بدستور حیرت زدہ تھا۔

"ویسے دیکھا تو میں نے اسے ایک بار پہلے بھی تھا۔ تب وہ چادر سے منہ چھپائے ہوئے تھی، اندھیرا بھی تھا۔ شہ زور بھی ساتھ تھا۔ میں دیکھ کر بھی اسے دیکھ نہ سکا تھا۔" رحیم داد نے بتایا۔ "پر اس رات جب اس نے اپنے کمرے میں بلوایا تب میں نے اسے ٹھیک سے دیکھا۔"

"سنا ہے بہت سوہنی رن ہے۔ تو بتا کیسی ہے؟" شاہانی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"ہے تو جی وہ بہت سوہنی، اور جوان بھی ہے۔ بالکل غبارہ لگتی ہے۔" رحیم داد نے رک رک کر بیان کیا۔ "پر اب تو سمجھو اجڑ کر رہ گئی ہے۔ موت کے ڈر نے اسے ایک دم ہلا کر دیا ہے۔" اس نے شاہانی کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ "تو نے پتہ ہے اصل جھگڑا کیا ہے؟" پھر اس نے خود ہی اپنے سوال کا جواب بھی دے دیا۔ "سارا جھگڑا تو جائداد کا ہے۔"

"اتنا تو میں نے بھی پتہ ہے۔ یہ بہت پرانا جھگڑا ہے۔" شاہانی نے بتایا۔ "یہ جھگڑا تو شہ زور کے پیو سردار نجیب خاں کی زندگی ہی میں کھڑا ہو گیا تھا، اس کے مرن کے بعد اور بڑھ گیا۔" اس نے چسکی لگائی۔ "پر جائداد کا جھگڑا تو بہت پیچھے رہ گیا۔ اب تو یہ جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا کہ وہ سہراب کے ساتھ بھاگ کر لغاریوں کے پاس چلی گئی۔ تو نے پتہ ہے، لغاریوں سے مزاریوں کی کتنی زبردست دشمنی ہے۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "مرجان نے یہ بہت برا کیا۔ اس نے شہ زور اور اس کے خاندان کی پیشانی پر کلنک لگا دیا۔ اسے اپنی ہی حویلی کے کسی سہراب کے ساتھ نہیں بھاگنا چاہیے تھا۔ ذرا سوچ تو اس نے یاری بھی لگائی تو ما تیسے کے ساتھ۔" شاہانی کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "بھاگنے کے لیے سہراب کے سوا اسے کوئی نہیں ملا۔"

"مرجان کہتی تھی، شہ زور اسے جائداد حاصل کرنے کے لیے جان سے مار دینا چاہتا تھا۔" رحیم داد نے مرجان کی جانب سے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "شاید تو نے پتہ نہیں، شہ زور اور اس کے چھوٹے بھائی نے مرجان کو دو بار زہر دے کر مارنے کی کوشش کی۔ جائداد کے لیے تو اس نے اپنے سگے بھائی کو بھی قتل کرا دیا۔"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم تھا۔" شاہانی کی آنکھوں میں استعجاب تھا۔ "میں نے تو یہ سنا ہے، اس کی لاش جیپ میں پائی گئی تھی۔ وہ اکیلا اپنی جیپ چلا رہا تھا، چھپ کر اس پر حملہ کیا گیا اور رات کے اندھیرے میں قاتل فرار ہو گئے۔ شہ زور نے مجھے یہی بتایا تھا۔ تو بالکل نئی گالہ سنا رہا ہے۔"

"پتہ نہیں، کون سچا ہے۔ مرجان تو مجھے یہی بتاتی تھی کہ اسے شہ زور نے قتل کرایا تھا۔"

"چودھری! سچ پوچھ تو یہ جائداد ہوتی ہی ایسی ظالم ہے۔ اندھا بنا دیتی ہے، اندھا۔ اچھا، اب یہ دس، مرجان نے تجھے کس لیے رات کو اپنے پاس بلایا تھا؟" اس نے نشے کی جھونک میں قہقہہ لگایا۔ "یاری لگانے کے لیے تو تجھے بلایا نہیں ہوگا۔"

"ایسی کوئی گل بات نہیں۔" رحیم داد نے تحمل سے بتایا۔ "وہ چاہتی ہے، شہ زور اسے معافی دے دے۔" جرگے میں اس کا معاملہ پیش نہ کرے تو وہ اپنے حصے کی تمام جائداد شہ زور کے

نام لکھ دے گی۔ اسے زندگی چاہیے ہے' جائداد نہیں۔ شہ زور سے یہی بات کہنے کے لیے اس نے مجھے بلایا تھا۔"

"یہ بات تو وہ شہ زور سے خود بھی کہہ سکتی ہے۔" شاہانی نے کہا۔ "تیرے ذریعے کیوں کہلوانا چاہتی ہے؟"

"اس نے شہ زور سے کھل بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ لگتا ہے' اسے کامیابی نہیں ہوئی۔" رحیم داد نے توجیہہ پیش کی۔ "میں نے تو اس کی باتوں سے یہی اندازہ لگایا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے' وہ یہ سمجھتی ہو کہ میرے سمجھانے بجھانے پر شہ زور راضی ہو جائے اور جائداد لے کر اسے چھوڑ دے۔"

شاہانی کچھ دیر خلا میں گھورتا رہا۔ وہ کچھ سوچتا نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "سیں چودھری! ویسے تو شہ زور کو مرجان کی تجویز مان لینی چاہیے تھی پر اب ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا۔" رحیم داد نے کہا۔ "اسے جائداد چاہیے' وہ مل جائے گی' مرجان کا خون وہ کیوں اپنی گردن پر لینا چاہتا ہے۔ جب آسانی سے کام بن جائے تو خون خرابے سے کیا فائدہ۔" اس نے گلاس اُٹھا کر گھونٹ بھرا۔ "مجھے قانون کا ٹھیک سے پتہ نہیں پر ایسے ہی ایک مقدمے میں مجھے گواہ بننا پڑا تھا۔ میرے پڑوس میں ایک رانڈ تھی۔ اس کے بھی کوئی اولاد نہیں تھی۔ مرنے کے بعد سوتیلے بیٹوں نے زمین پر قبضہ کر لیا لیکن مرنے والی کے بھائی بھتیجوں نے ان کے خلاف مقدمہ کر دیا اور جیت بھی گئے۔"

"تو کہنا کیا چاہتا ہے؟"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مرجان کے مرنے کے بعد اس کا بھائی بھی جائداد حاصل کرنے کے لیے شہ زور کے خلاف مقدمہ کر سکتا ہے' اسے جیت بھی جانا چاہیے۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" مراد خاں بولا۔ "شہ زور کو بھی اس کا پتہ ہو گا تبھی وہ جرگے کے سامنے مقدمہ پیش کرنا چاہتا ہے۔ اگر مرجان پر سیاہ کاری کا جُرم ثابت ہو گیا اور جرگے نے اسے کالی اور سہراب کو کالا قرار دے دیا تو جائداد پر مرجان کا حق ختم ہو جائے گا۔ اس کی ساری جائداد خود بخود شہ زور کو مل جائے گی۔"

"تب تو شہ زور نہیں مانے گا۔" رحیم داد نے بُجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس نے قدرے توقف کیا پھر سوالیہ نظروں سے شاہانی کی جانب دیکھا۔ "کیا جرگے کے فیصلے کے خلاف عدالت میں معاملہ نہیں پیش کیا جا سکتا؟"

"پیش تو کیا جا سکتا ہے اور اکثر ایسے مقدمے عدالت میں پیش بھی کیے گئے۔" شاہانی نے بتایا۔ "پر بلوچ جرگے کے فیصلے کے خلاف عام طور پر عدالتوں میں نہیں جاتے۔ اسے بہت بُرا سمجھا جاتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے' مرجان کا بھائی ایسا کرے۔" رحیم داد نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "وہ تو یہاں رہتا بھی نہیں' ممکن ہے وہ جرگے کا فیصلہ نہ مانے۔ میں تو کہتا ہوں' شہ زور کے لیے یہ اچھا ہو گا کہ وہ مرجان کی تجویز مان لے۔" رحیم داد نے ایک بار پھر مراد خاں شاہانی کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ "آخر خواہ وہ کیوں جھگڑے میں پھنسنا چاہتا ہے' اسے تو جائداد ہی چاہیے ہے نا' وہ مل جائے گی۔ مرجان کی جان لے کر اسے کیا ملے گا۔"

"مان لے' وہ مرجان کی شرط منظور کر لے۔" شاہانی نے سنجیدگی سے کہا۔ "جائداد اپنے نام لکھوا کر اسے چھوڑ دے۔ پر شہ زور یہ کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ وہ سہراب کے ساتھ رہے۔ سہراب کو تو وہ زندہ نہیں چھوڑے گا' وہ کتی ہے' ملوک زادی کو بھگا کر لے گیا۔ اس کا یہ جُرم کیسے معاف کیا جا سکتا ہے۔ اسے اتنے سنگین جُرم کی ضرور سزا ملنی چاہیے۔"

رحیم داد کے اندر چھپا ہوا زمین دار فوراً جاگ اُٹھا۔ "تو ٹھیک کہہ رہا ہے' سہراب کتی ہے۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے اس سے کچھ نہیں لینا۔ جتنا وڈا اس نے جُرم کیا' اتنی ہی اسے سخت سزا ملنی چاہیے۔" رحیم داد نے قدرے تامل کیا۔ "میرا خیال ہے' مرجان بھی سہراب کو بچانے کی کوشش نہیں کرے گی۔ وہ تو اپنی جان بچانا چاہتی ہے۔ اسے اب یہ پتہ چل گیا ہے کہ اس نے سہراب ایسے کتی کے ساتھ فرار ہو کر غلطی کی۔"

"مرجان نے ایک اور زبردست غلطی یہ کی کہ لغاریوں کی پناہ میں چلی گئی' ان کی باہوٹ بن گئی۔" شاہانی نے نشے میں لہرا کر کہا۔ "یہ اس نے بہت بُرا کیا۔ اپنے بھائی کے پاس چلی جاتی تو بہت سی مصیبتوں سے بچ جاتی۔ میں نے سنا ہے کہ اس کا

سہاگ...

سوال بھی ہے۔"

"ہاں، مرجان کا اب ایک ہی بھائی ہے۔ صادق آباد میں ری کرتا ہے۔ مرجان نے مجھے یہی بتایا تھا۔ وہ یہ بھی ی کہ وہ اس سے اتنا زیادہ ناراض ہے کہ نہ اس سے بات اور نہ ہی اسے اپنے گھر میں داخل ہونے دیا۔ وہ روتی پیٹتی آگئی۔ اس کا کوئی ایسا شریکا بھی نہیں جس کے پاس جاکر جاتی۔ لغاریوں کے پاس پناہ لینے نہ جاتی تو کس کے پاس ۔ ایک بار تو وہ لغاریوں کے پاس سے چلی آئی تھی۔ جب کہیں بھی پناہ نہ ملی، کوئی اسے اپنے ساتھ رکھنے پر تیار نہ تو مجبور ہو کر دوبارہ لغاریوں کے پاس جارہی تھی۔ کرتی بھی ۔ اس نے پتہ تھا کہ شہ زور نے اپنے بندے اسے اور اب کو پکڑنے یا قتل کرنے کے لیے لگا رکھے ہیں۔ رستے میں زور نے اسے اور سہراب کو پکڑ لیا۔"

"یہ بتا، آگے کیا کرنا ہے؟"

"شہ زور کو سمجھا بجھا کر راضی کرنے کی کوشش کر۔" رحیم داد نے کہا۔ "تو اس کا پرانا یار ہے۔ تیری گل وہ مان لے گا۔ مرجان زندہ بچ گئی تو تجھے دعا ہی دے گی۔ وہ مرنا نہیں چاہتی۔ پھوٹ پھوٹ کر روتی تھی۔"

"مرجان کو نہیں مرنا چاہیے۔ تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ابھی تو وہ جوان ہے۔" میں اس کے بارے میں شہ زور سے بات تو کر سکتا ہوں۔ جب وہ لغاریوں کے پاس چوٹی میں تھی تو شہ زور نے مرجان کے بارے میں بات کی تھی اور اپنا پرانا یار سمجھ کر کی تھی۔"

"تب تو مزاری سے تو اچھی طرح گل بات کر سکتا ہے۔"

"مزاری نے جب بات کی تھی تب حالات اور تھے۔ تب وہ مجبور تھا اور سخت پریشان۔" شاہانی رک رک کر بول رہا تھا۔ "اب وہ شہ زور کی قید میں ہے۔ ایسے میں اگر بات کروں گا تو وہ پوری طرح جرح کرے گا۔"

"تیری باتوں سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ مرجان کو بچانے کی کوئی صورت نہیں رہی۔" رحیم داد نے مایوسی سے کہا۔

شاہانی بڑا سا گھونٹ بھر کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے رحیم داد کی طرف دیکھا۔ "یہ بتا، شہ زور نے اگر مجھ سے یہ پوچھا کہ مرجان کو اس نے چھوڑ دیا تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ دوبارہ لغاریوں کی باعث نہ بن جائے۔ تو نے خود بتایا تھا، لغاریوں کے سوا کوئی اسے اپنے پاس رکھنے کو تیار نہیں۔"

"یہ سوال تو شہ زور کر سکتا ہے۔" رحیم داد نے شاہانی سے اتفاق کیا۔

"ایک تجویز اپنی سمجھ میں آتی ہے۔" شاہانی نے کہا۔ "کہ مرجان کسی سردار یا اونچی ذات برادری والے زمین دار سے نکاح کرلے۔ اسی طرح شہ زور کو رضامند کیا جا سکتا ہے، پر سوال یہ ہے کہ ایسا بندہ کہاں ملے گا جو مرجان سے پرنا کرنے پر آمادہ ہو جائے۔"

"میں تو کہتا ہوں، تو مرجان کو اپنی گھر والی بنالے۔ وہ جوان ہے، سوہنی ہے اور ملوک زادی بھی ہے۔" رحیم داد نے مشورہ دیا۔ "تو بھی بلوچ سردار ہے۔ شہ زور بھی مان جائے گا۔"

"تو کیسی گالہ کر رہا ہے۔" شاہانی جھنجلا کر بولا۔ "تو خود اسے اپنی گھر والی کیوں نہیں بنالیتا۔ تجھے اپنے لیے ایک زن کی ضرورت بھی ہے۔"

"تو کہتا ہے تو میں مرجان سے ویاہ کرلوں گا۔ سچ پوچھ تو مرجان مجھے پسند بھی ہے۔" رحیم داد نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"سئیں چودھری! تو مرجان کو اپنی رن بنائے گا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" مراد خاں نے یقین نہ آنے کے انداز میں کہا۔ "یہ تو سوچ، وہ سہراب کے ساتھ یاری لگا چکی ہے۔ مدت تک اس کے ساتھ رہی ہے۔ وہ بہت بدنام ہو چکی ہے۔ ایسی بدچلن اور بے معیار زال کو تو کیسے اپنی گھر والی بنا سکتا ہے۔"

"میں تیری طرح بلوچ سردار نہیں ہوں۔" رحیم داد نے پوری سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے بدنامی شہدنامی کی فکر نہیں۔ جبلہ بھی تو کئیوں اور مزارعوں کے پاس رہ چکی ہے۔ تو نے تو پتہ ہی ہے کہ میں تو اسے ہر طرح اپنی گھر والی بنانے پر تیار تھا پر وہ راضی ہی نہیں ہوئی۔ واپس اپنے گھر والوں کے پاس چلی گئی۔"

"تو مرجان ہی سے کیوں پرنا کرنا چاہتا ہے؟" شاہانی نے اسے باز رکھنے کی کوشش کی۔ "تجھے تو بہت اچھی اور عزت دار خاندان کی وہٹی مل سکتی ہے۔"

"میں نے مرجان سے وعدہ کرلیا ہے۔" رحیم داد نے جوش و

ترش کا اظہار کیا۔ "میں اسے مرنے نہیں دوں گا۔ اسے بچانے کے لیے پوری کوشش کروں گا۔" اس نے پُر اعتماد نظروں سے مراد خاں شاہانی کو دیکھا۔ "میں تو تیار ہوں پر یہ بتا' شہ زور بھی مان جائے گا؟ میں بلوچ سردار نہیں ہوں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" مراد خاں نے کہا۔ "لغاریوں نے اپنی ایک دھی مخدوموں کو اور دوسری ممدوٹوں کو دیا ہی ہے۔ وہ کون سے بلوچ سردار ہیں۔" اس نے گلاس اٹھا کر چسکی لگائی۔ "تو بھی اچھا زمین دار ہے۔ شہ زور کو تجھے قبول کر لینے میں کیا رکاوٹ ہو سکتی ہے۔"

"وہ مان سکتا ہے تو میں مرجان کو نکاح پڑھا کر اپنے ساتھ لے جانے پر بالکل تیار ہوں۔ میں مرجان کو موت کے منہ سے نکالنا چاہتا ہوں۔ شاہانی اسے بچانے میں میری مدد کر۔ تو شہ زور سے بات کر۔ تو کہے گا تو وہ ضرور مان جائے گا۔"

"سئیں چودھری! تو بہت نیک بندہ ہے۔" شاہانی نے رحیم داد کا جذبہ سراہا۔ "میں شہ زور سے ضرور بات کروں گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس شرط پر مان جائے کہ مرجان کے ساتھ تیرا پرنا ہو جائے اور مرجان اپنے حصے کی جائداد سے دست بردار ہو جائے۔"

"تو نے کل سویرے ناشتے پر جرگہ شروع ہونے سے پہلے شہ زور سے بات کرنی ہو گی۔" رحیم داد نے مشورہ دیا۔ "میں ناشتہ اپنے کمرے ہی میں کر لوں گا۔ تو اکیلے میں شہ زور سے کھل کر بات کر سکے گا۔ ضرورت پڑے تو مجھے بلا لینا۔"

مراد خاں نے رحیم داد کو یقین دلایا۔ "اطمینان رکھ' میں سردار شہ زور سے ضرور گل کروں گا۔" وہ کھڑا ہو گیا اور جھومتا جھامتا اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔ اس کا کمرہ بالکل نکڑ پر تھا۔

رحیم داد بھی اپنے کمرے کی طرف چلا۔ اس کا پلنگ دروازے کے آگے برآمدے میں بچھا تھا۔ اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ صرف نوکروں کی ایک کوٹھری میں چراغ روشن تھا۔

رحیم داد نے بستر پر لیٹ کر ابھی جھپکی ہی لی تھی کہ آہٹ سے آنکھ کھل گئی۔ نوری بستر کے قریب کھڑی تھی۔ وہ جھٹ اٹھ کر بیٹھ گیا' نوری کا ہاتھ پکڑ کر قریب بٹھا لیا۔ نوری کے کپڑے صاف ستھرے تھے۔ سر کے بالوں میں تیل چمک رہا تھا۔ آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ اس کا سانولا چہرہ کر[illegible] جلتے ہوئے لیمپ کی ہلکی روشنی میں تازہ اور بشاش نظر آ رہا تھا۔

نوری نے بستر پر بیٹھتے ہی پوچھا۔ "تو نے ملوک زادی کے بارے میں سردار سے بات کی؟"

"شام ہی کو بات کی تھی۔ جیسے مرجان نے کہا' ویسے ہی کی تھی۔" رحیم داد صاف جھوٹ بول گیا۔

"سئیں' یہ تو نے بہت اچھا کیا۔ تو سدا جیوے۔ [illegible] صحت ہووی۔" وہ اسے دعائیں دینے لگی۔ اس کے انداز میں خوشامد تھی۔ "ملوک زادی بہت دکھ میں ہے' بار بار روتی ہے۔" اس کا لہجہ اور مدھم ہو گیا۔ "اسی نے مجھے تیرے پاس بھیجا ہے۔"

"تو شیر کو پتہ ہے' تو ادھر ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"بالکل پتہ ہے"۔ نوری نے مسکرا کر بتایا۔ اس کے انداز میں لگاوٹ تھی۔ "اسے یہ بھی پتہ ہے' ملوک زادی نے اپنے کئی اور گہنے بھی مجھے دے دیے ہیں۔" اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ "ان میں سونے کی بالی بھی ہے۔ بہت سوہنی ہے۔ میں اسے یہاں پہنوں گی۔" اس نے اپنے کان کا درمیانی حصہ انگلیوں سے پکڑ کر دکھایا۔ "یہ بتا' سردار تیری گالھ سن کر کیا بولا؟"

"تو اس وقت مرجان کے پاس جا سکتی ہے؟"

"اب تو مشکل ہے۔ سردار بھی اُدھر موجود ہے۔" اس کے چہرے سے سراسیمگی جھلکنے لگی۔ "تو نے ملوک زادی سے کچھ کہلوانا ہے؟"

"بہت ضروری گل بات کہلوانی ہے۔" رحیم داد نے کہا۔

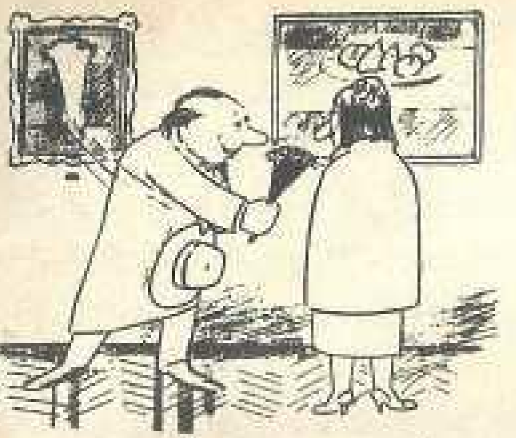
"تو شیر سے گالھ کرنی ہو گی۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ "تو نے ملوک زادی سے کیا کہلوانا ہے؟"

"اسے جا کر بتا دے کہ جائداد کے ساتھ اسے سراب کو بھی چھوڑنا ہو گا اور مجھ سے ویاہ کرنا ہو گا۔"

"تو اسے اپنی رن بنا لے گا؟" اس نے آنکھیں پھاڑ کر رحیم داد سے دریافت کیا۔ "سوچ لے۔"

"سوچ لیا' بالکل سوچ لیا۔" رحیم داد نے کہا۔ "میں مرجان کو بچانے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ تو جا کر اسے بتا دے۔ اگر اس نے یہ شرط مان لی تو سردار اسے معافی دے

دے گا۔ جرگے میں اس کا مقدمہ بھی پیش نہیں کرے گا۔"
"پتہ نہیں ملوک زادی تیری شرط مانتی ہے کہ نہیں۔"
نوری نے آہستہ سے کہا۔ "میں نوشیر کے پاس جاتی ہوں۔ اس سے صلاح کرنے کے بعد ملوک زادی کو تیری گالہ بتانے کی کوشش کرتی ہوں۔" وہ چلی گئی۔
رحیم داد پھر بستر پر لیٹ گیا۔ بے چینی سے نوری کا انتظار کرنے لگا۔ وہ جلد ہی واپس آگئی۔ "تو مرجان کے پاس گئی تھی؟" رحیم داد نے بے قراری سے پوچھا "کیا کہا اس نے؟"
"میں اس کے پاس نہیں گئی' جا بھی نہیں سکتی تھی۔"
"کیوں؟" رحیم داد نے گھبرا کر دریافت کیا۔
"جب میں تیرے پاس تھی تو سردار نے نوشیر کو بلایا۔ ملوک زادی کے کمرے پر جو تالا پڑا ہے' اس کی چابی نوشیر سے لے کر اپنے پاس رکھ لی۔" اس نے چوکنا نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "سردار ابھی جاگ رہا ہے۔ جلاوت کی رن بھی اس کے کمرے میں ہے۔"
رحیم داد اور پریشان ہو گیا۔ "سردار کو کچھ شبہ تو نہیں ہو گیا؟"
"پتہ نہیں۔" نوری نے کہا۔ "ویسے ایسا لگتا نہیں۔ سردار جب اِدھر ہوتا ہے تو ملوک زادی کے کمرے کی کنجی رات کو بھی کبھی اپنے پاس رکھتا ہے۔"
"سردار اس سے ملنے تو نہیں گیا؟"
"پتہ نہیں۔" نوری اُٹھ کر جانے لگی۔ رحیم داد نے اسے روکنا چاہا مگر وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی رات کی تاریکی میں گم ہو گئی۔ رحیم داد دیکھتا رہ گیا۔
ناشتہ رحیم داد نے اپنے کمرے ہی میں کیا۔ وہ شاہانی کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ دن بڑھتا رہا۔ گیارہ بجے سے چند منٹ پہلے شاہانی اس کے پاس آیا۔ رحیم داد نے پہلا سوال یہی کیا۔ "شہ زور سے مرجان کے بارے میں گل کی؟"
"میں نے اس سے گالہ کر لی ہے۔" شاہانی موڑھے پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بولا۔ "اس نے کیا سوچا اور کیا طے کیا' وہ تجھے خود بتاوے گا۔ ویسے جرگہ آج نہیں ہو رہا۔"
"یہ تو نے اچھی خبر سنائی۔" رحیم داد نے خوش ہو کر کہا۔ "شہ زور سے کیا کیا گل ہوئی؟"



"وہ تجھ سے خود بات کرے گا۔ تجھے سب کچھ بتا دے گا۔"
"تو نے اس کی باتوں سے کیا اندازہ لگایا؟ وہ مان جائے گا نا؟"
"مان تو جانا چاہیے۔ اس کی باتوں سے لگتا تو ایسا ہی ہے۔"
"آگے تیرا کیا ارادہ ہے۔ ابھی تو یہاں ٹھہرے گا نا؟" رحیم داد نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں' تیرے یہاں ہوتے ہوئے سب کچھ آرام سے طے ہو جائے۔"
"پر میں نے تو ابھی واپس جانا ہے۔" مراد خاں شاہانی نے بتایا۔ "میں تو تیرے کلیم کے کاغذات دینے آیا تھا۔ اب مجھے بھکر جانا ہے۔ تو نے پتہ ہے' اُدھر گڑبڑ ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوئی۔"
"ٹھہر جاتا تو اچھا تھا۔" رحیم داد نے اسے روکنا چاہا۔
شاہانی رضامند نہ ہوا' اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں خاموش تھے اور آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ وہ پھاٹک پر پہنچے۔ شہ زور کی کار سامنے کھڑی تھی۔ شہ زور بھی وہاں موجود تھا۔ شاہانی باری باری شہ زور اور رحیم داد سے بغل گیر ہوا۔ چاکر خاں سرگانی نے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا اور شاہانی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔
رحیم داد واپس ہوا مگر شہ زور اندر نہیں گیا' وہ سرگانی کے ہم راہ بستی کی جانب چلا گیا۔ رحیم داد سے اس کی بات نہیں ہوئی۔
اپنے کمرے میں پہنچ کر رحیم داد کو توقع تھی کہ شہ زور اس کے پاس آئے گا۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کچھ دیر بعد سردار شہ زور کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ تھکا ہوا سا ایک موڑھا کھسکا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر وہ خاموش رہا پھر اس نے رحیم داد کو مخاطب

کیا۔ "چودھری! تیرا کلیم داخل کر دیا گیا ہے۔ سرکاری بتاتا تھا' چند روز میں الاٹ منٹ بھی مل جائے گی۔"

رحیم داد کو الاٹ منٹ سے زیادہ مرجان کے معاملے سے دل چسپی تھی۔ اس نے بے نیازی سے کہا۔ "تو کوشش کرے گا تو الاٹ منٹ بھی مل جائے گی۔"

"کیوں چودھری! تجھے الاٹ منٹ ملنے کی خوشی نہیں ہوگی؟" شہ زور نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"کیوں نہیں ہوگی۔ اراضی کس کو بری لگتی ہے۔" اس نے تامل کیا پھر دھڑکتے دل سے دریافت کیا۔ "مراد خاں سے صبح تیری گل ہوئی تھی؟"

"ہوئی تو تھی۔" شہ زور نے ہاتھ اٹھا کر پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ وہ رحیم داد سے نظریں ملانے سے کترا رہا تھا۔ "اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔"

"تو نے کیا طے کیا؟" رحیم داد مجسم سوال بن گیا۔

"تو سب کچھ پتہ ہے' تجھ سے کچھ چھپا نہیں۔" اس نے رک رک کر کہا۔ "اب تو تجھ سے یاری بھی ہو گئی' تو بتا' میں نے کیا طے کرنا چاہیے؟"

"شاہانی نے تجھے نہیں بتایا؟"

"اسے چھوڑ' اپنی گل کر۔ میں تیری زبان سے سننا چاہتا ہوں کہ مرجان کے بارے میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں تیری صلاح لینا چاہتا ہوں۔"

"میری صلاح پوچھتا ہے تو میں تجھے یہی کہوں گا' مرجان اگر ہکیر میں اپنا حصہ چھوڑنا چاہتی ہے' اور تیرے نام کرنے پر تیار ہے تو اسے معافی دے دے۔"

"یہ شرط اس نے خود تجھے بتائی تھی؟" شہ زور نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"ہاں!" رحیم داد نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ اسے دھڑکا تھا' کہیں شہ زور یہ نہ پوچھ لے کہ وہ مرجان کے پاس پہنچا کیسے۔

مگر شہ زور نے صرف اتنا کہا۔ "اپنی جائداد تو وہ چھوڑ دے گی پر وہ سراب کو بھی چھوڑنے پر تیار ہے کہ نہیں؟" اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ "وہ اسے چھوڑے نہ چھوڑے' پر میں اس نمک حرام کو نہیں چھوڑوں گا۔ وہ یہ بالکل بھول بیٹھا کہ وہ کمی ہے اور مرجان ملوک زادی۔ اس جرم کی اسے سزا ملنی چاہیے۔" اس نے گہری نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "تو بتا' مجھے سراب کے ساتھ کیا کرنا چاہیے؟"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اسے اپنے کیے کی ضرور سزا ملنی چاہیے۔" رحیم داد نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اسے سراب سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ وہ تو مرجان کو چاہتا تھا' جو خوب صورت تھی' جوان تھی اور اسے پسند بھی تھی۔ اس نے برملا اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "میں نے سراب سے کیا لینا۔ تو اسے جو سزا دینا چاہے خوشی سے دے' پر مرجان کو معافی دے دے۔"

"تو کہتا ہے تو اسے معافی دے دوں گا۔ شاہانی کہتا تھا' تو اس کو اپنی رن بنانا چاہتا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں' میں اس کے لیے تیار ہوں۔" رحیم داد نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "اگر تو نے کوئی اعتراض نہ ہو۔"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں نے اس سے کیا لینا۔ تو اچھا وڈا زمین دار ہے' عزت دار بھی ہے۔ تیرے گھر میں رہے گی تو عزت ہی سے رہے گی۔ میرے لیے اور میرے خاندان کے لیے بدنامی کا سبب تو نہیں بنے گی۔" اس نے رحیم داد کا جائزہ لیا۔ "پر سوال یہ ہے کہ وہ بھی اس کے لیے تیار ہے؟ تو نے اس سے معلوم کر لیا ہے؟"

"نہیں' میں نے اس بارے میں ابھی تک اس سے کوئی بات نہیں کی۔" رحیم داد نے کہا۔ "تیری مرضی ہو تو میں ہی اس سے پوچھ لوں؟"

"ابھی نہیں۔ پہلے میں اپنے نام جائداد کی منتقلی کی اسٹامپ پیپر پر دستاویز تیار کروا لوں۔ تو اسے لے کر مرجان کے پاس جانا۔ اس کے دستخط لینا۔ وہ دستخط کرنا جانتی ہے' انگوٹھے کا نشان نہ لگوانا۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "دستخط کرانے سے پہلے اس سے پوچھ لینا کہ وہ تیرے ساتھ نکاح کرنا چاہتی ہے کہ نہیں۔"

"تو خود دستاویز لے کر اس کے پاس چلا جا۔" رحیم داد نے مشورہ دیا۔ "اس سے میرے بارے میں بھی پوچھ لینا۔"

"نہیں' میں اس کے پاس نہیں جاؤں گا۔ اسے دیکھ کر میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ میں اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔" شہ زور

رحیم داد کی تجویز مسترد کردی۔ "تو نے ہی اس کے پاس جانا ہے۔ وہ تیار ہو جائے تو دستاویز پر اس کے دستخط لے لے۔ ہاں ہی تجھے بھی گواہ کی حیثیت سے دستاویز پر دستخط کرنے ہوں گے۔ دوسرا گواہ چاکر خاں ہوگا۔ وہ بھی دستخط کرے گا۔"

"تو کہتا ہے تو میں چلا جاؤں گا۔ دستاویز تو کب تیار کرائے گا؟"

"میں ابھی اس کام کے لیے چاکر خاں کو روانہ کیے دیتا ہوں۔ جیپ تو موجود ہی ہے۔ وہ اس میں بیٹھ کر وکیل کے پاس چلا جائے گا اور کل شام تک واپس آجائے گا۔"

شہ زور چلا گیا۔ رات کو بھی وہ رحیم داد کے پاس نہیں آیا۔ وہ رات رحیم داد نے بے قراری سے گزاری۔ آخر شب کہیں اس کی آنکھ لگی۔

دوسرے روز ناشتہ بھی رحیم داد نے تنہا کیا' دوپہر کا کھانا بھی اکیلے کھایا' پھر دن ڈھلے شہ زور نے رحیم داد کو اپنے کمرے میں بلوایا۔ "چودھری! تو سو تو نہیں رہا تھا؟ چاکر خاں واپس آگیا ہے۔ وہ دستاویز تیار کروالایا ہے۔ تیرے پاس اسے لے کر آئے گا۔ تو مرجان کے پاس چلا جانا۔ میں نے ایک بہت ضروری کام سے روجھان جانا ہے۔"

شہ زور آگے بڑھا۔ رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں برآمدے میں پہنچے۔ رحیم داد نے دریافت کیا۔ "تو کب تک لوٹے گا؟؟"

"سویرے واپس آجاؤں گا۔" سردار نے بتایا۔ رحیم داد کے کمرے کے سامنے پہنچ کے وہ ٹھہر گیا۔ "تو اب آرام کر۔ باہر دھوپ بہت تیز ہے۔"

شام کو چاکر خاں سرگانی اسٹامپ پیپر لے کے رحیم داد کے پاس پہنچا۔ دستاویز مرجان کی جانب سے اُردو میں تحریر کی گئی تھی۔ تحریر کی رُو سے مرجان نے بہ قائمی ہوش و حواس اور بہ رضا و رغبت اپنی تمام منقولہ اور غیر منقولہ املاک اپنے سوتیلے بیٹے' سردار شہ زور خاں کے نام منتقل کردی تھی۔ رحیم داد نے چاکر خاں سے سوال کیا۔ "میں نے مرجان سے دستخط لینے کب جانا ہوگا؟؟"

"ابھی چلنا ہوگا۔" سرگانی نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "سئیں' میرے ساتھ آ۔"

دونوں شام کے ہلکے اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر قدم اُٹھاتے ہوئے اس کمرے پر پہنچے جس میں مرجان کو قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔ چاکر خاں نے کنجی نکال کر قفل کھولا اور رحیم داد کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔

مرجان گم سم بیٹھی تھی۔ لیمپ کی زرد زرد روشنی میں اس کا چہرہ مُرجھایا ہوا نظر آرہا تھا۔ آنکھیں ویران تھیں۔ لباس ملگجا ہوگیا تھا۔ وہ اور زیادہ اُجڑ گئی تھی۔ اس نے رحیم داد کو دیکھا تو ہڑبڑا کر کھڑی ہوگئی۔ "سئیں چودھری! تو یہاں کیسے آگیا؟"

رحیم داد نے اسے تسلی دی۔ "گھبرا نہیں۔ میں چوری سے نہیں آیا ہوں۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔ "شہ زور کی اجازت سے آیا ہوں۔"

دیوار کے قریب ایک مونڈھا پڑا تھا' بوسیدہ اور کمزور سا۔ رحیم داد اس پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں حبس تھا۔ ہوا اور روشنی کے لیے صرف ایک روشن دان تھا جو چھت کے قریب بلندی پر تھا۔ رحیم داد پریشان ہو کر بولا۔ "یہاں تو بہت گرمی ہے۔ تو کیسے رہتی ہے؟؟"

وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "گرمی سردی کی فکر نہ کر۔ یہ بتا' شہ زور نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا؟؟" اس کے چہرے پر دُکھ کے سائے پھیل گئے۔ "پر وہ خود فیصلہ کب کرے گا۔ وہ تو جرگے سے فیصلہ کرائے گا۔"

"جرگے سے فیصلہ کرانا ہوتا تو مجھے تیرے پاس آنے کی اجازت کیسے دیتا۔ جرگہ تو کل صبح ہونے والا تھا۔" رحیم داد نے کہا۔ "پر اب جرگہ نہیں ہوگا۔"

مرجان کے چہرے پر چھائے ہوئے سائے ہٹنے لگے۔ وہ سر جھکا کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ پریشانی میں بھی وہ حسین نظر آرہی تھی۔ رحیم داد بے قرار نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔ مرجان نے نگاہیں اُٹھائیں۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ مرجان نے جھٹ پلکیں نیچی کرلیں اور دبی زبان سے پوچھا۔ "شہ زور نے کیا فیصلہ کیا؟؟"

"فیصلہ اسے نہیں' اب تجھے کرنا ہے۔" رحیم داد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"میں! میں کیا فیصلہ کرسکتی ہوں۔ تو کیسی گالھ کر رہا ہے۔" اس کے لہجے میں گھبراہٹ اور حیرت کا امتزاج تھا۔

"ہاں' تُو نے ہی فیصلہ کرنا ہے۔" رحیم داد نے زور دے کر کہا۔ "تُو نے مجھے جو کچھ کہا تھا' وہ میں نے شہ زور سے کہہ دیا۔" اس نے اپنی اہمیت جتائی۔ "پہلے تو وہ تیار نہیں ہوا۔ تجھ سے سخت ناراض ہے پر جب میں نے اسے سمجھایا بجھایا تو وہ تیار ہو گیا۔ تجھے نہیں معلوم' اسے منانے میں مجھ کو کتنی دیر لگی ہے۔"

"اب وہ کیا چاہتا ہے؟" مرجان نے دریافت کیا۔

"وہی جو تُو چاہتی تھی۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ "تُو ساری جائداد اس کے نام کر دے گی' وہ تجھے معافی دے دے گا۔ تو یہی چاہتی تھی نا؟ اس نے وکیل کے مشورے سے دستاویز بنوائی ہے۔" رحیم داد اسٹامپ پیپر اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "پڑھ سکتی ہے تو اسے پڑھ لے۔"

"میں اتنا پڑھنا نہیں جانتی۔ ہاں دستخط بنا لیتی ہوں۔"

"تو نے صرف دستخط ہی لگانے ہیں۔ میں نے دستاویز اچھی طرح پڑھ لی ہے۔" رحیم داد نے اسے اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔ "مجھے تو ٹھیک ٹھاک لگی۔ پتہ نہیں' تُو نے مجھ پر بھروسا ہے کہ نہیں۔"

"میرے لیے تجھ پر بھروسا کرنے کے سوا رستہ ہی کون سا ہے۔" اس کا لہجہ صاف اور تیکھا تھا۔ رحیم داد نے اندازہ لگایا کہ وہ ذہین اور سمجھ دار عورت ہے۔ مرجان نے رحیم داد سے دریافت کیا۔ "شہ زور کی اور بھی شرطاں ہوں تو صاف صاف بتا دے۔"

"تو نے سراب کو چھوڑنا ہو گا۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ "ویسے تو اسے چھوڑنے کو نہ بھی تیار ہو' تب بھی شہ زور اسے معافی نہیں دے گا۔"

مرجان نے فوری ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا' اس کا چہرہ ایک بار پھر افسردہ ہو گیا۔ "قصور جتنا میرا ہے' اتنا ہی سراب کا بھی ہے۔" مرجان نے رحیم داد کی جانب پُر اعتماد نظروں سے دیکھا۔ "جب وہ جائداد لے کر مجھے معافی دے سکتا ہے تو سراب کو بھی معافی ملنی چاہیے۔ اسے تو جائداد چاہیے' وہ اسے مل جائے گی۔ اس کے بعد اُسے مجھ سے اور سراب سے کیا لینا۔"

"یہ تو سوچ" سراب ماشیا ہے۔ حویلی کا پرانا نوکر رہ چکا ہے۔" رحیم داد نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔ "اس نے اپنے مالک سے نمک حرامی کی ہے۔"

"ٹھیک ہے' سراب حویلی کا ماشیا ہوتا تھا۔ شہ زور اور اس کے پیو کا بانسا رہ چکا ہے۔" اس کا لہجہ تیز تھا۔ "میں نے اچھی طرح پتہ ہے۔" اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ "سراب نے زیادہ سے زیادہ نمک حرامی ہی تو کی ہے' شہ زور کی طرح اوہ خونی تو نہیں ہے۔ جائداد کے لیے اس نے اپنے سگے بھرا کو قتل تو نہیں کروایا۔"

"لگتا ہے' تو سراب کو چھوڑنا نہیں چاہتی۔" رحیم داد نے زچ ہو کر کہا۔

"میں تو خود ہی سوچ' سراب نے اپنی جان پر کھیل کر مجھے بچانے کی کوشش کی۔" مرجان نے وضاحت کی۔ "وہ مجھے گوٹھ سے نکال کر نہ لے جاتا تو شہ زور جائداد لینے کے لیے کب کا میرا خون کر چکا ہوتا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "شہ زور کے ساتھ اگر اس نے نمک حرامی کی ہے تو میرے ساتھ وفاداری بھی تو کی ہے۔ میں اسے کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔ یہ تو خود غرضی اور کمینگی ہو گی۔ میں اسے دھوکا نہیں دے سکتی۔"

اس کے اعتماد سے رحیم داد کو بخوبی اندازہ ہو گیا کہ اب وہ پہلی سی مرجان نہیں رہی جس نے اپنی زندگی بچانے کے لیے رو کر اس سے التجا کی تھی۔ پچھلے چند دنوں میں اس نے موت کو اس قدر قریب پائی کہ اس کا خوف کم ہو گیا۔ رحیم داد نے بھی محسوس کیا کہ مرجان خود سر اور دبنگ عورت ہے۔ وہ زندگی سے اکتائی ہوئی نظر نہیں آتی تھی۔

رحیم داد نے اسے رام کرنے کی کوشش کی "تو بھی ٹھیک کہہ رہی ہے مگر مرجان! یہ تو سوچ' تو ملوک زادی ہے اور سراب کمی ہے۔ شہ زور یہ کیسے دیکھ سکے گا کہ تو سراب سے یاری لگائے۔ شہ زور بلوچ سردار ہے' یہ اس کی آن کا سوال ہے۔"

"سئیں چودھری! آن کی گالہ نہ کر۔" وہ جھنجلا کر بولی۔ "میں نے سب پتہ ہے۔ وہ ہر رات کسی ذال کے ساتھ حرام کاری کرتا ہے پر اپنی مونچھ اُونچی کیے عزت والا بنا پھرتا ہے اور آن کے لیے اپنی بھینوں اور رن کو حویلی کی اُونچی اُونچی دیواروں کے اندر بند رکھتا ہے اور ان کی چوکی داری کرتا ہے۔" اس نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ "پر چوکی داری سے کیا

...میں سے پتہ ہے' کس نے کس کی تی اور کس باشے
...انکار کی ہے۔ میں نے ان آنکھوں سے سب کچھ
...شہ زور کو تو یہ بھی پتہ نہیں ہو گا کہ وہ کسی باشے کا پتر
...یب خاں کا۔"

...اس سیدھی گلاں نہ کر۔" رحیم داد نے گھبرا کر
...کی جانب دیکھا جس کے دوسری طرف چاکر خاں
...موجود ہونے کا امکان تھا۔" لگتا ہے' تو معافی نہیں
...ایسا ہی تھا تو اس رات تو نے نوری کے ذریعے مجھے کیوں
...کیوں مجھ سے رو رو کر کہا تھا کہ میں تجھے معافی دلانے
...شہ زور سے گل کروں۔" اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "اپنی
...بچانے کے لیے تو جائداد تک چھوڑنے کو تیار تھی۔ تو
...سوال ہے؟"

...خوشی سے مرنا چاہتا ہے۔" مرجان نے دل گرفتہ ہو کر
...۔ "مرنا ہی ہوتا تو تجھے کیوں اپنے پاس بلاتی۔ پر میں یہ
...نہیں چاہتی کہ سراب کو شہ زور مار ڈالے۔"

"اس کو بھی معافی دلانے کی ایک صورت ہو سکتی ہے۔"

"وہ کیا؟" مرجان نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"تو کسی اور سے نکاح پڑھا لے۔" رحیم داد نرمی سے بولا۔
...تو ایسا کرنے پر تیار ہو جائے تو میں کسی نہ کسی طرح شہ زور
...راضی کراوں گا کہ وہ سراب کو بھی معافی دے دے۔" اس
...نظر بھر کر مرجان کو دیکھا۔ "ضد سے کام نہیں چلے گا۔ اس
...طرح تیرے ساتھ سراب کی بھی جان بچ جائے گی۔ ایک بار
...دونوں کی جان بچ جائے تو آگے کے لیے بعد میں جو تیرا جی چاہے
...کرنا۔ پر شہ زور کو راضی کرنے کے لیے یہی ٹھیک رہے گا کہ تو
...سراب کے سوا کسی اور سے نکاح پڑھوا لے۔"

رحیم داد نے کچھ اس ڈھب سے بات کی کہ مرجان رضامند
...ہو گئی۔ مدھم لہجے میں بولی۔ "تیری صلاح ویسے تو ٹھیک ہی لگتی
...ہے پر اتنی بدنامی کے بعد کون مجھے اپنی رن بنانے پر تیار ہو گا۔
...شہ زور تو یہی چاہے گا کہ وہ کوئی وڈا زمین دار اور عزت والا بندہ
...ہو۔ ایسا کوئی بندہ ہے تیری نظر میں؟"

"میں تو کسی ایسے بندے کو نہیں جانتا۔" رحیم داد نے کہا۔
"یہ تو تجھے ہی سوچنا ہو گا اور اس میں دیری بھی نہیں ہونی
چاہیے۔"



"میں تو یہاں بند ہوں۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔" اس نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔ "تو نے جب میری اتنی مدد کی ہے تو اس معاملے میں بھی تو ہی کوئی مدد کر سکتا ہے۔"

"تو نے تو پتہ ہی ہے' میں یہاں بالکل اجنبی ہوں۔ کسی سے میل ملاپ بھی نہیں۔" رحیم داد نے دل کی بات زبان پر نہیں آنے دی۔

مرجان عاجزی سے بولی۔ "سئیں چودھری! اس بار بھی تو نے ہی مدد کرنی ہو گی۔ میں تو کچھ بھی نہیں کر سکتی۔"

"میں تیری یہی مدد کر سکتا ہوں کہ خود تجھ سے نکاح کراوں۔" رحیم داد نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "یہ تیری مرضی پر ہے کہ مانے یا نہ مانے۔ فیصلہ تو نے ہی کرنا ہے۔"

"میں نے کیا فیصلہ کرنا ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "سئیں' تو بہت نیک بندہ ہے۔ تو جو کہہ رہا ہے' وہی ٹھیک ہے۔"

"اچھی طرح سوچ لے۔" رحیم داد نے اپنی اہمیت جتائی۔ "میں نے تو تجھے بچانے کے لیے ایسا کہا ہے۔" اس نے لہجے میں رقت پیدا کی۔ "مرجان! تو نے پتہ نہیں' میں بھی تیری طرح مصیبت کا مارا ہوا ہوں۔ گورداس پور کے موضع نیا پور کا مہاجر ہوں۔ فسادات میں گھر بار لٹ گیا۔ وڈا بھرا میری آنکھوں کے سامنے سکھ بلوائیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ جوان دھی کو بھی وہ اٹھا کر لے گئے۔ میں بیڑی میں سوار ہو کر کسی نہ کسی طرح راوی پار کر کے اکیلا ہی پاکستان پہنچ سکا۔ گھر والی اور بچوں کا پتہ

نہیں کیا۔ ماما' زندہ ہیں یا سب ختم ہو گئے۔ بہت تلاش کیا پر کسی کا پتہ نہ چلا۔" اس نے گہری سانس بھری "تب سے میں اکیلا ہوں۔" اس نے مرجان کی جانب دیکھا۔ "میں نے اپنے بارے میں تجھے سب کچھ بتا دیا۔ کچھ بھی نہیں چھپایا۔"

"نہ بھی بتاتا تو کیا فرق پڑتا۔" مرجان نے کہا۔ "میں نے تو اتنا پتہ تھا کہ تو بھی وڈا زمین دار ہے اور شہ زور کا گہرا یار ہے۔"

"تو نے کیا طے کیا؟" رحیم داد بے قراری پر قابو نہ رکھ سکا۔

"طے کیا کرنا۔" مرجان نے نظریں جھکا کر کہا۔ "پر چودھری! تو نے سراب کو بھی معافی دلانی ہو گی۔ تو نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔"

"تجھ سے جو وعدہ کیا ہے' اسے پورا کروں گا۔" رحیم داد نے سینے پر ہاتھ رکھ کر مرجان کو یقین دلایا۔ "یہ مرد کا وعدہ ہے۔"

رحیم داد لیپ اٹھا کر مرجان کے پاس پہنچا' فونٹین پین نکالا' مرجان کی جانب بڑھایا۔ "لے' اب دستاویز پر دستخط لگا دے۔" رحیم داد نے انگلی رکھ کر جس جگہ بتایا' مرجان نے اسی جگہ دستخط کر دیے۔

رحیم داد مرجان سے مخاطب ہوا۔ "میں نے اب جانا ہے"۔ اس نے نرمی سے کہا "چاکر خاں باہر میرا انتظار کرتا ہو گا۔"

مرجان نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "سیئں چودھری!" وہ کچھ اور نہ کہہ سکی اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ رحیم داد نے پلٹ کر اسے دیکھا اور باہر چلا گیا۔

شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ چاکر خاں سرگانی دروازے سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا' رحیم داد کو دیکھتے ہی وہ قریب آیا۔ "سیئں! تو نے بہت دیر لگا دی۔" رحیم داد خاموش رہا۔ چاکر نے دروازے میں تالا لگا دیا۔

برآمدے میں پلنگ بچھا کر رحیم داد کا بستر لگا دیا گیا تھا۔ رحیم داد تھکا ہوا سا بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے چاکر خاں سرگانی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چاکر خاں نے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "سیئں! تو چپ چپ نظر آ رہا ہے۔ کوئی فکر کی گالھ تو نہیں؟ کیا ملوک زادی نے دستخط نہیں لگائے؟"

"اس نے دستخط لگا دیے ہیں۔" رحیم داد نے اسٹامپ چاکر خاں سرگانی کی جانب بڑھایا۔ "یہ رہی دستاویز۔ اسے اندر جا کر لیپ کی روشنی میں ٹھیک سے دیکھ لے۔"

چاکر خاں کی آنکھوں میں خوشی کی چمک ابھری۔ "کام بن گیا۔ اب تو نے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

رحیم داد نے بات بنانے کی کوشش کی۔ "اس نے آسانی سے دستخط نہیں لگائے۔ دیر تک مغز مارنا پڑا۔"

"وہ تو میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ میں نے پتہ ہے' وہ کتنی ضدی اور سرپھری رن ہے۔"

چاکر کمرے کے اندر گیا پھر لیپ اٹھا کر رحیم داد کے پاس آیا' دستاویز اس کے سامنے کی۔ "سیئں! اب تو بھی گواہ کے طور پر دستخط کر دے۔" رحیم داد نے قلم لے کر دستخط کر دیے۔

چاکر خاں کے جانے کے بعد رحیم داد بستر پر لیٹ گیا۔ اسے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ شہ زور کسی صورت میں سراب کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ مرجان کو اس کا نہ صرف شدید دکھ ہو گا بلکہ وہ اس کی طرف سے بدگمان بھی ہو جائے گی۔ ساتھ ہی رحیم داد یہ بھی چاہتا تھا کہ سراب کا کانٹا اس کے راستے سے صاف ہو جائے اور مرجان نکاح کے بعد پوری طرح اس کے قبضے میں آ جائے۔

دوسرے دن سردار شہ زور واپس نہیں آیا۔ چاکر خاں اور نوشیر بھی دن بھر نظر نہیں آئے۔ رحیم داد بہت بے چین رہا۔

آدھی رات سے کچھ پہلے برآمدے میں چاپ ابھری۔ رحیم داد نے چونک کر کروٹ بدلی۔ اندھیرے میں ایک سایہ نظر آیا' رحیم داد کو توقع تھی کہ وہ نوری ہو گی مگر وہ نوری نہیں' تمیسو کی بیوی تھی۔ وہ صاف ستھرا لباس پہنے ہوئے تھی۔ بالوں میں تیل چمک رہا تھا' آنکھوں میں کاجل تھا۔ رحیم داد نے مسکرا کر پوچھا۔ "اب تو ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

"سیئں ٹھیک ہی ہوں۔" وہ اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "پر بچے کی طبیعت گڑبڑ ہے' ہر دم روتا رہتا ہے۔ بہت مشکل سے اسے سلا کر آئی ہوں۔"

"کیا ہو گیا بچے کو؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"سیئں' اسے تپ چڑھی ہے۔" اس نے بتایا۔ "تو نے تمیسو کو معافی دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ لگتا ہے' تو نے اس کے بارے میں سردار سے گالھ نہیں کی۔" اس کے لہجے میں

ناراضی پیدا ہوگئی۔ "سئیں! اُسے معافی دلوا دے۔ میرا بھی ادھر جی گھبراتا ہے۔ گھر بہت یاد آتا ہے۔ تمیسو بھی بُرے حال ہوگا۔"

رحیم داد نے اسے تسلی دی۔ "گھبرا نہیں، سردار کل واپس آجائے گا۔ میں اس سے تمیسو کو معافی دلانے کے بارے میں ضرور گل کروں گا۔"

"پہلے بھی تو نے یہی کہا تھا۔" اس نے شکوہ کیا۔ "اب تو تمیسو کو ویسے ہی معافی مل جانا چاہیے، سنا ہے، بالو کو اس کا بدلہ مل گیا ہے۔ اس نے جھوٹی شکایت لگائی تھی۔ تبھی تو وڈیرے نے کر بھاگ گیا۔"

"تو ٹھیک کہہ رہی ہے، اب تمیسو کو ضرور معافی مل جائے گی۔"

"سئیں! تو سردار سے کل ضرور گالھ کرے گا ناں؟" اس نے اصرار کیا۔

"کروں گا، ضرور کروں گا۔" رحیم داد نے اسے یقین دلایا۔ "یہ بتا، نوشیر کدھر ہے؟ کل سے بالکل نظر نہیں آیا، اس کی گھر والی نوری بھی نہیں آئی، دونوں کہاں ہیں؟"

"سئیں! میں نے بھی نوشیر اور نوری کو نہیں دیکھا۔" اس نے جھجکتے ہوئے دبی زبان سے کہا۔ "ماچھی کی رن بتاتی تھی، سردار نے دونوں کو شاہ میر بھیج دیا۔ بہت ناراض ہے ان سے۔"

"سردار ان سے کیوں ناراض ہے؟" رحیم داد نے حیران ہوکر پوچھا۔

"سئیں! مجھے بس اتنا ہی پتہ ہے۔"

رحیم داد کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات منڈلانے لگے۔

○☆○

صبح ناشتے کے بعد چاکر خاں سرگانی رحیم داد کے کمرے میں آیا، مسکرا کر یہ خوش خبری سنائی۔ "سردار نے بتایا ہے کہ سئیں! تیری درخواست پر کارروائی شروع ہوگئی ہے، فکر نہ کر، بات منت بھی چند روز میں مل جائے گی۔"

"کیا سردار واپس آگیا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"سئیں! وہ تو سویرے ادھر پہنچ گیا تھا۔"

بے ساختہ

میر مونس نے اپنے بھائی میر انیس کو یہ شعر دکھایا۔

نہ تڑپنے کی اجازت ہے، نہ فریاد کی ہے
یوں ہی مر جاؤں، یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

میر انیس نے دوسرے مصرع میں ذرا سی تبدیلی کر کے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

نہ تڑپنے کی اجازت ہے، نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں، یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

✿

میر انیس ایک مرثیے میں شہر بانو کی زبانی یہ دعائیہ مصرع کہہ چکے تھے کہ

یارب رسولِ پاک کی کھیتی ہری رہے

مگر دوسرا مصرع حسبِ دل خواہ نہ سوجھتا تھا اور بڑے اسی فکر میں بیٹھے تھے کہ میر انیس کی بیوی اُس طرف آنکلیں اور پوچھا "کس سوچ میں ہیں؟" میر انیس نے اپنا مصرع پڑھا اور کہا کہ دوسرا مصرع سوچ رہا ہوں۔ بیوی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

صندل سے مانگ، بچوں سے گودی بھری رہے

میر انیس پھڑک اُٹھے۔ فوراً یہ مصرع لکھ لیا۔ شعر مکمل ہو کر زبان کی لطافت اور محاورے کی خوبی سے یوں مالا مال ہوگیا۔

یارب، رسولِ پاک کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ، بچوں سے گودی بھری رہے

"ہم کیا ہیں" سے مسعود انور کا اقتباس

"کدھر ہے وہ؟ میرے پاس کیوں نہیں آیا؟" رحیم داد نے تعجب کا اظہار کیا۔

"سئیں! آج جرگہ ہے ناں۔" سرگانی نے بتایا۔

"آج جرگہ ہے!" رحیم داد نے آنکھیں پھاڑ کر دریافت کیا۔ "جرگہ کیوں بلایا گیا ہے؟"

"جرگے کے سامنے ملوک زادی اور سہراب کا مقدمہ پیش ہوگا۔"

رحیم داد دم بخود رہ گیا۔ "جرگہ کب شروع ہوگا؟"

"سئیں! دوپہر کی روٹی کھانے کے بعد شروع ہوگا۔" چاکر خاں نے مطلع کیا۔ "سردار اپنے کمرے میں معتبروں کے ساتھ بیٹھا بات چیت کر رہا ہے۔ جرگے میں شرکت کرنے گیارہ

معتبر آئے ہیں۔"

"کیا میں جرگے کی کارروائی نہیں دیکھ سکتا؟" رحیم داد نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"مشکل ہی ہے سئیں!" چاکر خاں نے جواب دیا۔ "جرگہ تو بند کمرے میں ہوگا' وہاں سردار ہوگا' معتبر ہوں گے۔ ان کے علاوہ ملوک زادی ہوگی' سہراب ہوگا۔"

"تو جرگے میں موجود نہیں رہے گا؟"

"میں بھی رہوں گا سئیں۔ میرا کام پیش کار کی طرح ہوگا۔ بدھیل' ہجر خاں اور داؤد بھی رہیں گے۔ تینوں گواہ ہیں' سردار کے ساتھ ہی ادھر پہنچے ہیں۔"

"سردار نے کہا' چودھری تجھے اپنے کمرے میں بلا رہا ہے۔" چاکر خاں چلا گیا۔

سردار شہ زور دن بھر گزارنے کے بعد رات کو رحیم داد کے پاس آیا۔ وہ تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ آتے ہی مونڈھا کھسکا کر بیٹھ گیا اور رحیم داد سے پوچھنے لگا۔ "طبیعت ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہی ہے۔" رحیم داد نے بے رخی سے جواب دیا۔ "میں نے کل صبح لاہور واپس جانا ہے۔"

"چلا جانا"۔ سردار نے بے تکلفی سے کہا۔ "میں نے بھی جانا ہے' اکٹھے چلیں گے۔"

"نہیں' میں نے کل ہی جانا ہے۔" رحیم داد نے زور دے کر کہا۔ "میں نے اب یہاں ہرگز نہیں ٹھہرنا۔"

"او ہو' سخت ناراض لگتا ہے تو۔ میں نے پتہ ہے' تو کیوں ناراض ہے۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا اور رحیم داد کو منانے کی کوشش کی۔ "میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔"

"میں نے تجھے بلایا تھا' تو میرے پاس آیا کیوں نہیں؟"

"میں معتبروں کے ساتھ جرگے میں بیٹھا تھا' تیرے پاس کیسے آتا۔ جرگہ ختم ہوتے ہی سیدھا ادھر آیا ہوں۔"

"تو نے تو پکا وعدہ کیا تھا کہ جرگہ نہیں ہوگا۔" رحیم داد نے شکوہ کیا۔

"میں نے تجھے یار کہا ہے' اب تو ہمیشہ میرا یار رہے گا۔" سردار نے دل جوئی کے انداز میں کہا۔ "تو نے کئی باتوں کا پتہ نہیں۔ جب تجھے پتہ لگے گا تب سب کچھ تیری سمجھ میں آ جائے گا۔ تو ادھر پہلی بار آیا ہے۔" شہ زور نے سنجیدگی سے کہا۔ "تو بلوچوں اور ان کی قبائلی ریتاں رسماں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ان کا اپنا قانون ہے۔ تو نے پتہ نہیں' سردار کیا ہوتا ہے' سرداری کیسے چلتی ہے۔ تجھے کیا پتہ' مجھے جرگہ کیوں بلانا پڑا۔"

رحیم داد نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ "اچھا یہ بتا' جرگے نے کیا فیصلہ کیا؟"

عین اس وقت نوکروں کی کوٹھری کی جانب سے تیز نسوانی چیخ ابھری۔ رحیم داد تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سردار بھی اس کے ساتھ تھا۔ "چودھری! میرے ساتھ آ۔ تو نے خود پتہ لگا لینا کہ جرگے نے کیا فیصلہ کیا۔"

"مجھے ادھر نہ لے جا"۔ رحیم داد سراسیمہ ہو گیا۔

سردار نے رحیم داد کا ہاتھ تھام لیا۔ "ادھر میں داری کی ہے تو تجھے سب کچھ دیکھنا پڑے گا۔"

رحیم داد تھکے تھکے قدموں سے سردار کے ہم راہ چلا۔ دونوں برآمدے سے اتر کر احاطے میں پہنچے۔ ہر طرف اندھیرا تھا' خاموشی تھی۔ دونوں نوکروں کی کوٹھریوں کی جانب بڑھے اور ایک کوٹھری کے سامنے پہنچے۔ چاکر خاں باہر کھڑا تھا۔ اس نے کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ دونوں اندر داخل ہوئے۔ سردار آگے تھا۔ رحیم داد اس کے عقب میں پریشان اور سہما ہوا کھڑا تھا۔

کوٹھری میں لالٹین روشن تھی۔ مٹیالی زرد روشنی میں دیوار کے نزدیک سہراب کی لاش پڑی تھی۔ اس پر چادر ڈال دی گئی تھی مگر اس کی گھنی سیاہ داڑھی اور چہرے کا کچھ حصہ چادر کھسک جانے کے باعث نظر آ رہا تھا۔ اسے بہت پہلے پھانسی دی جا چکی تھی۔

چھت کے عین بیچ مضبوط شہتیر تھا' اس میں لوہے کا کڑا تھا' کڑے سے رسّی بندھی تھی۔ اس کا پھندا مرجان کی گردن میں پڑا تھا۔ مرجان کا منکا ٹوٹ چکا تھا۔ گردن ایک طرف لٹک رہی تھی۔ وہ مر چکی تھی۔ لاش کے نیچے ایک اسٹول الٹا پڑا تھا۔ اسی اسٹول پر چڑھ کر اس نے رسّی کا پھندا اپنے گلے میں ڈالا تھا۔"

دروازے کے قریب دو معتبر کھڑے تھے۔ ان کی داڑھیاں سفید اور خوب گھنی تھیں۔ مونچھیں بھی سفید تھیں اور چڑھی ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے تھے' چہروں پر سختی

اور گہری سنجیدگی چھائی تھی۔ رحیم داد نے مرجان کی لاش کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں ابل کر باہر نکل آئی تھیں۔ زبان بھی منہ سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ گردن کھنچ کر لمبی ہو گئی تھی۔ اس کا خوب صورت اور دل آویز چہرہ مسخ ہو کر نیلا پڑ گیا تھا۔ رحیم داد یہ لرزہ خیز منظر زیادہ دیر نہ دیکھ سکا' چپ چاپ نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد سردار شہ زور خاں باہر نکلا۔ دونوں معتبر اس کے ہم راہ تھے۔ چاکر خاں سرکائی گردن جھکائے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ سب خاموش تھے۔ سردار نے مڑ کر چاکر خاں کی جانب دیکھا "چاکر! مسجد کے مُلا کو بلوا لے۔ وہ لاشوں کو غسل دے کر کفن ڈال دے گا۔ تو نے کفن تو تیار کرا ہی لیا ہوگا؟"

"ہا سئیں! وہ تو میں نے شام ہی کو مولوی سے تیار کروا لیا تھا۔" چاکر خاں نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔

"اب دیر کرنے کی ضرورت نہیں۔ دونوں کو سورج نکلنے سے پہلے پہلے دفن کر دیا جائے۔" سردار نے حکم دیا۔

سردار نے گردن کو خم دے کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چودھری! تو بہت تھکا ہوا نظر آ رہا ہے' تھوڑا آرام کر۔ میں تیرے پاس چند منٹ بعد واپس آ جاؤں گا' سونا نہیں"۔

سردار آگے بڑھا اور معتبروں کے ہم راہ احاطے کے پھاٹک کی جانب چل دیا۔ چاکر خاں سرکائی مڑا اور درختوں کے نیچے اندھیرے میں جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

رحیم داد گم صُم تھا۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا ہوا برآمدے کی جانب بڑھا اور ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ وہ نڈھال نظر آ رہا تھا۔ اس کے جذبات میں ہل چل برپا تھی۔ اسے سردار کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ آیا اور اس کے قریب مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ "چودھری! تو کب تک چپ کر کے بیٹھا رہے گا۔ روٹی شوٹی بھی کھائی؟"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" رحیم داد نے بیزاری سے کہا۔

"تھوڑی سی وسکی لگا لے' شاہانی لہور سے لایا تھا' میرے کمرے میں پڑی ہے۔ ایک دم کھلا ڈلا ہو جائے گا۔"

"نہیں' میں نے آج نہیں پینی۔" رحیم داد نے انکار کر دیا۔

"تیرا جی کرتا ہے تو ضرور لگا۔ میں نے تیرا ساتھ نہیں دینا۔"

"تو نے نہیں پینی تو میں بھی نہیں پیوں گا۔ پر یہ بتا' تو اتنا ناراض کیوں ہے؟"

"تو بھی عجب بندہ ہے۔" رحیم داد اس کی بے نیازی پر ابل اٹھا۔ "پوچھتا ہے' میں ناراض کیوں ہوں۔ ایک طرف تو یاری کا دم بھرتا ہے' دوسری طرف تو نے نوری اور نوشیر تک کو میرے پاس آنے سے روک دیا۔"

"نوری اور نوشیر کا نام نہ لے۔" سردار کا لہجہ اچانک بدل گیا۔ چہرے پر جھنجلاہٹ نظر آنے لگی۔ "زیور اور گہنوں کے لالچ میں دونوں نے نمک حرامی کی' مرجان سے مل کر سازباز کی۔ میں نے انہیں جیل میں ڈال دیا ہے تاکہ انہیں اور دوسرے کراووں اور ہاسوں کو پتہ چل جائے کہ میرا حکم نہ ماننے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔"

"نوری اور نوشیر کے بارے میں تجھے شاہانی نے بتایا تھا؟"

"نہیں!" سردار نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اس نے ان کے بارے میں کوئی گالہ نہیں کی' پر مجھے سب کچھ پتہ چل گیا۔" اس کا رویہ اور سخت ہو گیا۔ "میں اتنا چوکنا نہ رہوں تو چل چکی سرداری۔"

"تب تو یہ بھی تو نے پتہ ہوگا کہ میں اپنی مرضی سے مرجان سے ملنے نہیں گیا تھا' اسی نے مجھے اپنے پاس بلوایا تھا۔" رحیم داد کا انداز مدافعانہ تھا۔

"تو بھول رہا ہے۔ یہ گالہ تو نے پہلے بھی مجھے بتائی تھی۔" سردار نے رحیم داد کو یاد دلایا۔ "تجھے مجھ سے گلہ ہے اور تو مجھ سے ناراض بھی ہے' پر مجھے بھی تجھ سے گلہ ہے' تو چھپ کر مرجان سے ملنے کیوں گیا۔ تو میرا یار ہے تو اس سے کیا لینا تھا۔ تو نے اچھی طرح پتہ تھا کہ اس نے مجھے تنگ کیا' بدنام کیا' میری ناک پر کالک لگا دی۔"

رحیم داد بہت سٹ پٹایا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا مگر اس نے اظہارِ ندامت کے بجائے دفاعی حربہ آزمایا۔ "تو نے میری حرکت پر برا منایا تھا تو پہلے اس کا گلہ کیوں نہ کیا۔ تب تو چپ کر کے رہ گیا۔" اس نے سردار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "تو نے تو برا منانے کے بجائے جائداد اپنے نام کرانے کے لیے جھٹ دستاویز تیار کرائی' اس پر دستخط لینے کے لیے مجھے مرجان کے پاس بھیجا۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "تو نے کیا پتہ' دستاویز پر دستخط لینے کے لیے میں نے کس طرح مرجان سے ...

...نہیں کیا۔ وہ آسانی سے دستخط کرنے کے لیے تیار نہیں
..."

"...میں نے سب پتہ ہے۔ چاکر نے مجھے سب کچھ بتادیا تھا۔"

...ور کا لہجہ نرم پڑ گیا۔

"تو وعدہ کر کے پلٹ گیا' یہ تُو نے اچھا نہیں کیا۔" رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "تُو نے بہت بُرا کیا۔ تُو نے ...نہیں کرنا چاہیے تھا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "تو ایسا کرنا ہی تھا تو کسی اور کو اس کام پر لگایا ہوتا۔ مجھ سے یہ ...لیا ہوتا۔ تُو نے پتہ نہیں' مجھے کتنا دکھ پہنچا۔"

"تُو ٹھیک کہہ رہا ہے' مجھے تجھ سے ایسا کام نہیں لینا چاہیے تھا۔" سردار نے معذرت کرنے کے انداز میں کہا۔ "تو خاما خا پریشان نہ ہو' جو کچھ ہوا' ٹھیک ہی ہوا۔"

"کیا ٹھیک ہوا۔" رحیم داد تڑپ کر بولا۔ "تو اُسے معافی دے دیتا' اس کا خون نہ کرتا تو تیرا کچھ نہ جاتا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ چہرے پر غم کے سائے پھیل گئے۔ "وہ مرنا نہیں چاہتی تھی' میں بھی یہی چاہتا تھا۔"

"لگتا ہے' تجھے اس سے بہت ہمدردی ہے۔" سردار نے کہا۔ "تو اس سے پیار کرتا چاہتا تھا۔"

"تو یہ سمجھتا ہے کہ مجھے اس سے پیار شیار تھا تو یہ ٹھیک نہیں۔ میں تو اسے صرف اس لیے اپنی گھروالی بنانا چاہتا تھا کہ اس کی زندگی بچ جائے اور اس کی جائداد تجھے مل جائے' میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"

سردار نے اس کی نیک نیتی کے بارے میں شک کا اظہار نہیں کیا۔ "میں نے پتہ ہے' تو بہت نیک بندہ ہے۔ دل بھی تیرا بہت نرم ہے۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "پر تو نے یہ پتہ نہیں' وہ کتنی مکارن اور فریبی تھی۔ تو اس کی چترائی اور چالاکی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ تجھے اور مجھے' دونوں کو دھوکا دینا چاہتی تھی۔ تیرے سامنے اس نے ٹسوے بہائے۔ تیرا دل پگھل گیا۔ تو نے اس کی باتیں سچ مان لیں۔ نہیں چودھری! جھگڑا صرف جائداد کا نہیں۔ مرجان نے تنگ کیا۔ میری ناک پر سیاہی مل دی اسی لیے مجھے یہ معاملہ جرگے کے سامنے پیش کرنا پڑا۔ میں چاہتا تو دونوں کو تبھی ختم کر دیتا جب میں نے گیدڑ والا میں ان کو پکڑ لیا تھا' میں ان کا خون کر دیتا تو بلوچوں کے قانون کی

سب تگ۔

رُو سے یہ ہرگز جرم نہ ہوتا۔ پر میں چاہتا تھا کہ دونوں کو ان کے جرم کی سزا جرگے کی جانب سے ملے۔ اس طرح میں اپنی ناک اچھی طرح صاف کر سکتا تھا۔ جرگے کے فیصلے کے بعد اب کوئی میرے خلاف یہ الزام نہیں لگائے گا کہ میں نے جائداد پر قبضہ کرنے کے لیے اس کا اور سہراب کا خون کیا۔ جرگے میں دونوں کے خلاف سیاہ کاری کا جرم ثابت ہو گیا تھا۔ جرگے نے مرجان کو کالی اور سہراب کو کالا مان لیا۔ بلوچ قانون کی رُو سے کالی کی سزا یہ ہے کہ اسے خود اپنے ہاتھ سے گلے میں پھندا ڈال کر پھانسی پر لٹکنا پڑتا ہے۔ کالے کو کوئی بھی پھانسی پر چڑھا سکتا ہے۔ دونوں کے بارے میں جو فیصلہ ہوا' وہ سارے معتبروں کا فیصلہ تھا' معتبر اپنے اپنے قبیلے کے نمایندے ہوتے ہیں۔ ان کا فیصلہ سب کو ماننا پڑتا ہے۔ کوئی اس کے خلاف نہیں بول سکتا۔"

"جو بھی تُو نے کیا' اپنے تئیں ٹھیک ہی کیا۔" رحیم داد نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "پر ایسا نہ ہوتا تو بہت اچھا تھا۔"

"تو سمجھتا ہے کہ مرجان سے نکاح پڑھانے کے بعد تُو اسے اپنے ساتھ لے جاتا اور کوٹلہ ہرکشن میں اپنی رن بنا کر رکھتا اور وہ تیرے ساتھ آرام سے رہتی؟"

"کیوں نہیں رہتی۔ کس کے پاس جاتی۔ کہیں بھی تو اس کا ٹھکانا نہیں تھا۔ ویسے میں نے اس کی مرضی معلوم کر لی تھی۔ وہ مجھ سے ویاہ کرنے اور میری گھروالی بننے کے لیے بالکل رضامند تھی۔"

"ہرگز رضامند نہیں تھی۔ بالکل جھوٹ بول رہی تھی۔" سردار نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "میں نے پتہ ہے' وہ تیرے ساتھ نکاح پڑھا لیتی۔ تیرے ساتھ گھروالی بن کر کوٹلہ ہرکشن بھی چلی جاتی۔" اس کے ہونٹوں پر زہرخند ہویدا ہوا۔ "پر ایک روز چپکے سے تیری حویلی سے نکلتی اور سیدھی مدو ولوں کے پاس لہور پہنچتی۔ وہ اسے پوری حفاظت کے ساتھ لغاریوں کے پاس چوٹی بالا پہنچا دیتے۔"

"ایسا کر کے اسے کیا ملتا؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "ویسے بھی وہ تیرا کیا بگاڑ سکتی تھی۔ دستاویز پر دستخط کرنے اور مجھ سے نکاح کرنے کے بعد وہ کچھ بھی تو نہیں کر سکتی تھی۔"

"وہ بہت کچھ کر سکتی تھی۔" سردار مزاری نے ہنس کر کہا۔

"سئیں چودھری! تو نے کچھ پتہ نہیں۔ وہ لفاریوں کی مدد سے میرے اور تیرے دونوں کے خلاف پولیس میں پرچا چاک کراتی' یہ الزام لگاتی کہ میں نے ڈرا دھمکا کر زبردستی دستاویز پر دستخط کرا لیے اور جائداد اپنے قبضے میں کر لی۔ تجھ پر وہ میرے ساتھ ساز باز کرنے اور جبری نکاح کرنے کا الزام لگاتی۔ وہ یہی کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ یہ راز مجھے کسی اور نے نہیں' خود مرجان نے بتایا ہے' پھانسی پر لٹکنے سے پہلے۔"

"کیا کہتی تھی وہ؟" رحیم داد نے حیرت سے دریافت کیا۔

"پھانسی کا پھندا ڈالنے سے پہلے وہ غصے سے پاگل ہو گئی۔ چیخ چیخ کر معتبروں سے کہنے لگی' جرگے کے سامنے مقدمہ پیش نہ ہوتا اور مجھے معاف کر دیا جاتا تو میں شہ زور اور اس کے یار چودھری' دونوں کو عدالت میں بلاتی۔ سراب کا خون کرنے اور جائداد پر قبضہ کرنے کے لیے اسٹامپ پر زبردستی دستخط کرانے کا الزام لگاتی۔ پورا پورا بدلہ لیتی۔ پر میں ہار گئی' میں اپنا بدلہ نہ لے سکی۔" سردار نے رحیم داد کو غور سے دیکھا۔ "پھر وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔" رحیم داد پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ حیران و پریشان نظر آ رہا تھا۔ سردار بھی خاموش رہا۔ رات اور سنسان ہو گئی تھی۔

کچھ دیر بعد سردار نے پہلو بدلا' مسکرا کر بولا۔ "تو پریشان نظر آ رہا ہے۔ اب تو آرام کر۔ تمیسو کی رن تیرے پاس آ جائے گی۔ تیری ساری پریشانی جاتی رہے گی۔"

اس نے اٹھنا چاہا مگر رحیم داد نے روک دیا۔ "شہ زور! تو میری ایک گال مان لے گا؟"

"بتا کیا کہنا چاہتا ہے؟" سردار نے مستعدی سے کہا۔

"ہاتو کا اونٹھ مل جانے کے بعد یہ تو ثابت ہو گیا ہے کہ لنگر نے چوری نہیں کی تھی۔"

"ہاتو کا اونٹھ مل جانے سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ لنگر نے چوری نہیں کی تھی۔" شہ زور نے رحیم داد کی دلیل مسترد کر دی۔ "ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ چوری کرنے کے بعد لنگر نے جس کے پاس اونٹھ چھپا کر رکھا تھا' اس نے سزا کے ڈر سے اسے چھوڑ دیا ہو اور وہ ہاتو کے پیو کو مل گیا ہو۔ جب تک پوری تفتیش نہ کی جائے تب تک ٹھیک ٹھیک کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "لنگر کی گل چھوڑ' صاف صاف بتا' تو چاہتا کیا ہے؟"

"میں چاہتا ہوں' تو تمیسو اور جلاوت کو معافی دے دے۔ ان کے بال بچوں کو چھوڑ دے تاکہ وہ اپنے گھر چلے جائیں۔" رحیم داد نے کسی قدر عاجزی سے کہا۔

"تو کہتا ہے تو دونوں کو معافی دے دوں گا۔" سردار نے مسکرا کر کہا۔ "اب تو خوش ہو جا۔ تجھے یار کہا ہے تو تیری بات بھی ماننی پڑے گی۔" وہ مسکرایا۔ "میں نے جانا ہے۔ جلاوت کی رن میرا انتظار کرتی ہو گی۔" وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا رات کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔

○☆○

تاریکی میں یکایک ایک پرچھائیں لہرائی' رحیم داد نے چونک کر دیکھا۔ تمیسو کی بیوی اندھیرے سے نکل کر سامنے آ گئی۔ وہ پریشان اور گھبرائی ہوئی تھی۔ "سئیں! تو نے اپنی کھٹ یہاں کیوں ڈلوائی۔" ایک ہاتھ اٹھا کر درختوں کے جھنڈ کی جانب اشارہ کیا۔ "ادھر ملوک زادی اور سراب کا مردہ نہلایا جا رہا ہے۔"

رحیم داد نے گردن موڑ کر نظر دوڑائی۔ درختوں تلے لالٹینوں کی دھندلی روشنی میں انسانی سائے ادھر ادھر حرکت کرتے نظر آ رہے تھے۔ پانی گرنے کی آواز ابھر رہی تھی۔ ساتھ ہی رک رک کر کلمۂ شہادت کا ورد کیا جا رہا تھا۔ رحیم داد نے تمیسو کی بیوی کا گھبرایا ہوا چہرہ دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "سئیں! تو نے تمیسو کو معافی دلانے کو کہا تھا۔ تو نے سردار سے بات کی؟" اس کی نظروں میں التجا تھی۔ "سئیں! تو اسے معافی دلوا دے۔ توں سدا جیوے۔ تیکھی صحت ہووی۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

"تمیسو اور جلاوت کو معافی مل جائے گی۔ کل تو اپنے گھر چلی جائے گی' جلاوت کی گھر والی بھی چلی جائے گی۔ سردار نے معافی دینے کا مجھ سے وعدہ کر لیا ہے۔"

"سئیں! تو سچ کہہ رہا ہے؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ رحیم داد کو اس طرح دیکھنے لگی جیسے اس کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔ وہ بے قرار ہو کر بولی۔ "سئیں! ٹھیک ٹھیک بتا' سردار نے وعدہ کر لیا ہے؟"

"میں تجھ سے جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔" رحیم داد نے

اسے باور کرایا۔ "نمیسو اور جلاوت کو اب نہ ہاتو کے لیے اُوٹھ کا بندوبست کرنا پڑے گا نہ سردار کو جرمانہ ادا کرنا ہو گا۔"

وہ دوپٹے کے پلّو سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "سیّں تو جھوٹ نہیں بول سکتا۔ تُو ٹھیک ہی کہہ رہا ہو گا۔" اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ ویران آنکھوں میں چراغ روشن ہو گئے۔ اس نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر رحیم داد کو دیکھا۔ اس میں عشوہ تھا، لگاوٹ تھی۔ "سیّں تو کمرے کے اندر چل۔ میں کھٹ اندر ڈال دوں گی۔ تیرے ہی پاس رہوں گی۔"

"مجھے یہیں بیٹھا رہنے دے۔" رحیم داد نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تو اپنے ننگے کے پاس جا۔ وہ بھوکا ہو گا۔ جلاوت کی گھروالی کو بھی بتا دینا۔"

"وہ تو سردار کے کمرے میں ہے۔ سویرے اسے بتا دوں گی۔" رحیم داد خاموش بیٹھا رہا مگر وہ خاموش نہ رہی۔ "سیّں تو ناراض تو نہیں ہے؟" اس نے عاجزی سے کہا۔ "میں اب جاؤں؟"

"ہاں، اب تو جا۔" رحیم داد نے بے رُخی کا مظاہرہ کیا۔

نمیسو کی بیوی نوکروں کی کوٹھری کی جانب روانہ ہو گئی۔ رحیم داد بُت بنا بیٹھا رہا۔ ہوا میں تیزی تھی۔ خشک پتّے ہولے ہولے آہٹیں پیدا کر رہے تھے۔ فضا میں کافور کی تیز بُو تھی۔

رحیم داد نے بے چینی سے پہلو بدلا، مڑ کر درختوں کی جانب دیکھا۔ کفن میں لپٹی ہوئی مرجان اور سراب کی لاشیں لالٹین کی دُھندلی روشنی میں دُور سے نظر آ رہی تھیں۔ رحیم داد پریشان ہو کر اُٹھا، کمرے کے اندر گیا۔ اس نے لباس تبدیل کیا، برآمدے کی جانب بڑھا مگر دروازے پر ٹھٹک کر رہ گیا۔ جنازے اب چارپائیوں پر رکھے تھے۔ مزاری کے کارندے اور نوکر چار چارپائیاں کاندھوں پر اُٹھائے، آہستہ آہستہ پھاٹک کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ایک کراوا ہاتھ میں لالٹین سنبھالے جنازوں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

رحیم داد بوجھل قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے نکلا، بستر کی جانب بڑھا اور نڈھال ہو کر لیٹ گیا۔ وہ بہت دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

صبح اس نے حسبِ معمول سردار شہ زور کے ساتھ ناشتہ کیا اور دھوپ کی تمازت بڑھنے سے پہلے ہی سردار کے ہم راہ جیپ



میں بیٹھ کر شاہ میر کی جانب روانہ ہو گیا۔

○☆○

رحیم داد کو ٹلہ ہرکشن واپس جانے کے لیے سخت بے چین تھا۔ اسے اپنے مینیجر نادر خان پر پورا اعتماد تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ زمیں داری کی دیکھ بھال خوش اسلوبی سے کر رہا ہو گا مگر رحیم داد زیادہ عرصے زمیں داری کے معاملات سے بے تعلق رہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ ٹلہ ہرکشن پہنچنے سے پہلے لاہور جائے۔ توقع تھی کہ احسان شاہ اب تک کراچی سے آ گیا ہو گا۔ رحیم داد اس سے مل کر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ لائل پور کی حدود کی اراضی کی الاٹ منٹ کے بارے میں کیا فیصلہ ہوا۔ اگر الاٹ منٹ نہ ہوا ہو تو احسان شاہ کے ذریعے اسے جلد سے جلد حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ احسان شاہ کے لیے الاٹ منٹ دلوانا مشکل نہیں تھا۔ رحیم داد کو بخوبی علم تھا کہ وہ حکم راں جماعت ری پبلکن پارٹی کا اقتدار مستحکم بنانے کے لیے سیاسی جوڑ توڑ میں مصروف ہے۔

رحیم داد اب بیزار نظر آ رہا تھا۔ شاہ میر پہنچنے کے دوسرے ہی روز اس نے سردار شہ زور خان سے کہہ دیا۔ "سیّں! میں نے لہور جانا ہے۔ اب میں تیرے ساتھ نہیں ٹھہر سکتا۔"

مگر سردار ہنس کر بولا۔ "لہور جانا ہے تو ضرور جا۔ میں کب کہتا ہوں نہ جا۔ پر میں نے بھی لہور جانا ہے۔ اکٹھے چلیں گے۔"

رحیم داد نے اصرار کیا۔ "تو بعد میں پہنچ جانا۔ مجھے جانے دے۔ میں لہور میں تیرا انتظار کروں گا۔ میں نے شاہ جی سے مل کر لائل پور کی زمین کا فیصلہ کرانا ہے۔"

"شاہ جی بتاتا تھا، وہ تو جھگڑے کی اراضی ہے۔ اس کے کئی

دعوے دار ہیں۔ اس کے فیصلے میں تو دیر لگے گی۔" شہ زور نے کہا۔ "جب تک اُدھر کا فیصلہ ہو، اِدھر تجھے الاٹ منٹ بھی مل جائے گا۔ تیری درخواست پر کارروائی شروع ہو چکی ہے۔ اب تو بس الاٹ منٹ ملنے کا انتظار ہے۔ محکمہ بحالیات میں اوپر سے نیچے تک سارے ہی اپنے بندے لگے ہیں۔ ڈپٹی کمشنر اور افسرِ مال سے بھی یاری ہے۔ قبضہ بھی جھٹ مل جائے گا۔"

رحیم داد نے اس کی تائید کی۔ "ٹھیک ہے اِدھر کے الاٹ منٹ کا کام تو دیکھ لے گا۔ لائل پور کا معاملہ الجھا ہوا ہے۔ وہاں مجھے خود جا کر کوشش کرانی ہوگی۔"

"ضرور کرانا۔ پر ادھر کی اراضی کے الاٹ منٹ کے لیے تیرا یہاں ہونا ضروری ہے۔" شہ زور نے کہا۔ "میں آج ہی چاکر کو روانہ کرتا ہوں کہ وہ افسروں سے مل جل کر کم سے کم مدت میں الاٹ منٹ حاصل کرے۔ تو چند روز ادھر آرام کر۔ اپنی اراضی کا الاٹ منٹ لے اور لہور چلا جا۔ بعد میں چاکر تیری اراضی کی دیکھ بھال کرتا رہے گا۔" اس کے لہجے میں نرمی اور محبت تھی۔ "میری خوشی ہے کہ تو ابھی نہ جا۔ دونوں اکٹھے ہی چلیں گے۔ چند روز کی تو بات ہی ہے۔"

رحیم داد نے مزاری کے اصرار پر لاہور جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ مزاری نے چاکر خاں سرگانی کو بلایا اور اسے ڈیرہ غازی خاں کی جانب روانہ کر دیا۔

رحیم داد کوٹ کے ڈیرے میں ٹھیرا رہا۔ شاہ میر پہنچتے ہی سردار شہ زور کی مصروفیت بڑھ گئی تھی۔ وہ روزانہ ناشتے کے بعد کچہری لگاتا۔ کچہری کا بندوبست عام طور پر مال خانے کے وسیع اور کشادہ کمرے میں کیا جاتا جو روشن اور ہوادار تھا۔ اس کی کھڑکیاں صحن میں کھلتی تھیں۔ زیادہ گرمی ہوتی تو کچہری درختوں تلے لگتی۔ سردار مزاری اونچے اور چوڑے پلنگ پر بیٹھ جاتا۔ کوئی باتھایا کراڑ اس کے پیروں اور کمر کے گرد فیری لپیٹ کر زانو بندی کر دیتا۔ کچہری میں طرح طرح کے مقدمات پیش کیے جاتے۔ مقدمے کی کارروائی کے دوران مزاری کے چہرے پر رعب چھایا ہوتا۔ وہ فریقین کے بیانات پوری توجہ سے سنتا، گواہوں پر جرح کرتا، مقدمہ سمجھنے اور اصل حقیقت کا سراغ لگانے کی حتی الوسع کوشش کرتا۔ فیصلہ سنانے سے قبل وہ کچھ دیر مقدمے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا۔ اس کا فیصلہ قطعی اور آخری ہوتا۔ کوئی فریق اس کے فیصلے کے خلاف سرکاری عدالت سے رجوع کرنے کا مجاز نہ تھا۔ اگر کوئی ایسی جرأت کرتا تو حکم عدولی اور نافرمانی کے الزام میں اس کے خلاف قبائلی قوانین کے مطابق مقدمہ چلایا جاتا اور کڑی سزا دی جاتی۔ کچہری مزاری کی آمدنی کا ایک معقول وسیلہ تھی۔ وہ مقدمات کی باقاعدہ فیس وصول کرتا اور جرمانے کی رقم بھی۔ وہ دوپہر تک کچہری لگاتا پھر کھانا کھاتا اور آرام کرنے حویلی میں چلا جاتا۔ شام کو پینے پلانے کا شغل ہوتا۔ دوست احباب اور سرکاری افسر آ جاتے تو جوا بھی ہوتا اور رات گئے تک یہ شغل جاری رہتا۔ ہزاروں روپے اِدھر سے اُدھر ہو جاتے۔

رحیم داد دل بہلانے کے لیے کچہری میں جا کر بیٹھ جاتا۔ مقدمات کی کارروائی دل چسپی سے سنتا اور اس سے بھی زیادہ دل چسپی سے فیصلے سنتا۔ مقدمات کی طرح فیصلے بھی عجیب و غریب ہوتے۔ ان سے رحیم داد کو بلوچوں کے روایتی قوانین اور ان کے قبائلی رسم و رواج سمجھنے کا موقع ملتا۔

چاکر خاں سرگانی ڈیرہ غازی خاں میں رحیم داد کے کلیم کی بنیاد پر متروکہ اراضی کا الاٹ منٹ حاصل کرنے کے لیے اعلیٰ حکام اور اہل کاروں سے ملاقاتیں کر رہا تھا، دفتروں کے چکر کاٹ رہا تھا، فائلیں ایک شعبے سے دوسرے شعبے تک جلد سے جلد پہنچانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ اس کی غیر حاضری میں کچہری کا انتظام کم دار وحدت خاں گورچانی کے سپرد تھا۔ وہ پیش کار کے فرائض بھی انجام دیتا، مقدمات کی فیس اور جرمانوں کی رقم وصول کرتا، رجسٹر میں باقاعدہ اس کا اندراج کرتا۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن پرانا ملازم تھا۔ کم دار کی حیثیت سے کام کرتے کرتے زمیں داری کے اُمور کے ساتھ کچہری کے معاملات بھی خوش اسلوبی سے انجام دینے لگا تھا۔ وہ سردار شہ زور کا مزاج بخوبی سمجھتا اور اس کی نظریں پہچانتا تھا۔

ایک صبح کچہری لگی ہوئی تھی۔ رحیم داد بھی موجود تھا۔ سردار مزاری، رنگیلی کھٹ پر ویڑھ مارے بیٹھا تھا۔ اس کی طبیعت قدرے مکدر تھی۔ رات اس نے کچھ زیادہ ہی شراب نوشی کی تھی اور قمار بازی میں ہارا بھی زیادہ تھا۔ اس کے چہرے سے تھکن اور شب بیداری کے اثرات ہویدا تھے۔ مقدمات کی کارروائی کے دوران وہ بار بار پانی پیتا۔ ایک ملازم پیچھے
سب گیا۔

دیدہ وشنید — مولانا کوثر نیازی

ہمارے بہت سے مذہبی رویے ہمارے مخصوص سماجی اور معاشرتی جبر کی پیداوار ہیں۔ ایک زمانہ تھا، جب خلیفہ اور حکمران ہونے کے لیے ہمارے تمام علما اور فقہا قریشی النسل ہونا شرط لازم قرار دیتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب سیادت اور قیادت کی تمام صلاحیتیں اور اہلیتیں خاندانِ قریش میں مرتکز ہو کر رہ گئی تھیں۔ اس سلسلے میں بھی ایک قولِ رسولﷺ سند قرار دیا جاتا تھا جس میں آپ نے فرمایا تھا "الائمۃ من القریش"۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بجا طور پر اسے آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک پیش گوئی قرار دیتے ہوئے اس کا ترجمہ یوں کیا تھا کہ "حکمراں قریش میں سے ہوں گے۔" ہمارے علما نے اس کا ترجمہ کیا کہ "حکمراں قریش میں سے ہونے چاہئیں" مگر چونکہ شروع کے یہ ادوار قریشی غلبے کے ادوار تھے، علمائے اسلام قریشی ہونا شرطِ خلافت قرار دیتے ہوئے برابر قولِ رسولﷺ کا یہی ترجمہ کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ حالات بدلے اور دوسرے خاندانوں میں بھی وہ تمام تر خصائص پیدا ہوتے چلے گئے جو کسی زمانے میں صرف خاندانِ قریش کا خاصہ تھے تو علمائے کرام بھی یہ شرط عائد کرنا چھوڑتے چلے گئے۔ تعجب ہے کہ اب کسی مسلمان ملک میں ایک بھی عالم حکمرانی کے لیے قریشی ہونا شرط قرار نہیں دیتا۔

ایک وقت تھا کہ لاؤڈ اسپیکر حرام تھا۔ اب امام صاحب پانچ آدمی بھی بیٹھے ہوں تو لاؤڈ اسپیکر آن کیے بغیر درس ارشاد نہیں فرماتے۔

ایک دور میں (بلکہ مسلکی حد تک تو اب بھی) فوٹو حرام قرار دیا جاتا تھا۔ اب جب تک پریس کانفرنس میں فوٹو گرافر نہ پہنچ جائیں، حضرت مولانا صاحب لب کشا نہیں ہوتے۔

ایک دور میں فلم حرام ہونے میں شک کرنے والا بھی کافر قرار پاتا تھا۔ اب مولوی صاحب ٹی وی پر اپنے وعظ کی فلم چلوا کر اسے بہت بڑی خدمتِ اسلام سمجھتے ہیں۔

ایک وقت تھا کہ مخلوط مجلسیں اسلام کے خلاف تھیں۔ اب سینیٹ اور قومی اسمبلی کی مخلوط مجالس میں علما صرف شریک ہی نہیں ہوتے، اس کارِ خیر کے لیے باقاعدہ تنخواہ بھی وصول کرتے ہیں۔

اور تو اور جب شروع شروع میں شاہ سعود نے اپنے ہاں ٹیلی فون لگوایا تو علما و شیوخ نے کہا، یہ حرام ہے۔ اس میں شیطان بولتا ہے۔ ایک دن شاہ سعود نے آپریٹر سے کہا، دوسری طرف تلاوتِ قرآن لگا رکھیے، دربار میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجا دو۔ تعمیل ہوئی تو شاہ نے سب سے بڑے شیخ سے کہا، سنیے ٹیلی فون سے کیا آواز آ رہی ہے۔ شیخ نے سنا تو کہا، اسے یہ تو کلامِ الٰہی نشر کرتا ہے۔ اس دن سے سعودی عرب میں ٹیلی فون حلال ہو گیا۔

ایک زمانے میں تعلیم نسواں حرام تھی۔ بعض بڑے بڑے علمائے کرام کا کہنا تھا کہ لڑکی کو پڑھاؤ لیکن اسے لکھنا سکھانا حرام ہے۔ اس سے وہ غیر محرموں سے خط و کتابت کر سکتی ہے۔ اب بڑے بڑے علما کی بیٹیاں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مخلوط تعلیم پا رہی ہیں۔

کھڑا نہایت مستعدی سے پنکھا جھل رہا تھا۔ قریب ہی کمدار وحدت خاں ادب سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے دو ماتحت کراوے دروازے کے دائیں بائیں چاق و چوبند کھڑے تھے۔

مقدمات کی سماعت جاری تھی۔ سردار بیانات اور جرح کی روشنی میں قبائلی ضابطوں کے مطابق فیصلے کر رہا تھا۔ عام طور پر وہ فریقین کے مابین صلح صفائی کرانے کی کوشش کرتا۔ جرم سنگین ہوتا تو جرمانہ عائد کرتا۔ زیادہ سنگین ہوتا تو جرمانے کے ساتھ ساتھ قید کی سزا بھی دیتا۔ کمرے کی فضا بوجھل تھی۔

خلافِ معمول خاموشی کچھ زیادہ تھی۔ ایک بوڑھی عورت اپنا مقدمہ پیش کرنے کی غرض سے داخل ہوئی۔ اس کا لباس میلا کچیلا اور بوسیدہ تھا۔ سر کے بال بھی میلے چیکٹ تھے۔ جسم سے پسینے کے تیز بھبکے اٹھ رہے تھے۔ وہ آگے بڑھی اور سردار کے روبرو ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ سردار نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ بوڑھی عورت نے گڑگڑا کر فریاد کی۔ "سئیں سردار! سدا جیویں۔ سکھی صحت ہووین۔ سئیں! میں لٹ گئی۔ تباہ ہو گئی۔ میں فریادی ہوں۔ تیرے پاس نیاؤ کے لیے آئی ہوں۔ میں نے پکا یقین ہے تو میرے ساتھ نیائے ضرور کرے گا۔"

سردار نے عورت سے کہا۔ "بے دھڑک اپنا بیان پیش کر۔"

"سئیں! میرے پیٹ کا ملازمت ہوئی، مرن ہو گیا۔ تب سے میں رنڈ بیوہ ہوں۔" بوڑھی عورت نے گلوگیر لہجے میں بیان شروع کیا۔ "میری صرف ایک بیٹی روحی ہے۔ اس کا ابھی پرنا

نہیں ہوا کنواری ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ "سئیں، میری دھی کو اٹھا لیا گیا۔ چار روز سے وہ اسی کے پاس ہے۔ اس نے مجھے تنگ کر دیا، بے عزتا کر دیا۔ توں اسے سزا دے کر کالک کا داغ مٹا دے۔" اس نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے۔ "سئیں سردار، میرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ میں مصیبت کی ماری ہوں، غریب ہوں۔ سئیں میرا کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

سردار نے اسے تسلی دی۔ "صبر کر، صبر کر، اسے کون اغوا کر کے لے گیا؟"

"سئیں سردار! وہ چک رحمان کا بدھیل خاں ہے۔" عورت نے بتایا۔ "میرے پیو کا بھتریجا ہے۔ اس طرح وہ میرا ایک شلوار ہوتا ہے۔ بہت نزدیک کا رشتہ سا نکا ہے۔"

بدھیل کا نام سن کر رحیم داد چونکا۔ وہ بدھیل کو کئی بار دیکھ چکا تھا۔ بدھیل، شہ زور کا بہت وفادار اور جاں نثار آدمی تھا۔ سراب اور مرجان کی گرفتاری میں اس نے بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ ایسا زبردست کارنامہ انجام دیا تھا کہ سردار شہ زور کا بدنامی اور خجالت سے جھکا ہوا سر اونچا ہو گیا۔ سردار کا چہرہ دم بھر کے لیے متغیر ہو گیا مگر عورت بدھیل خاں کے خلاف بولتی رہی۔ "سئیں سب کو پتہ ہے، میری دھی اب تک اس کے قبضے میں ہے۔"

"توں نے اپنی دھی کو واپس لانے کی کوشش کی؟" سردار نے دریافت کیا۔ "تو بدھیل کے گھر گئی تھی؟"

"سردار! میں اس کے گھر گئی تھی۔" عورت نے جواب دیا۔ "پر اس نے ساوَنی کو واپس دینے سے انکار کر دیا۔ میری دھی کا نام ساوَنی ہے۔ بدھیل کے لیے تو وہ رشتے سے نیاڑی ہے۔ توں نے پتہ ہے، نیاڑی کے ساتھ لک چھپ کے یاری لگانا بلوچوں میں حرام سمجھا جاتا ہے اور اسے ورغلا کر لے جانا کتنا وڈا جرم ہوتا ہے۔ توں بلوچ سردار ہے، توں نے تو سب پتہ ہے ناں؟"

"جب تو بدھیل کے گھر اپنی دھی کو لینے گئی تو اس نے تجھے کیا کہا؟" سردار نے سوال کیا۔

"سئیں! وہ بہت ناراض ہوا، چیخ کر بولا، ساوَنی یہاں سے نہیں جائے گی۔ کوئی اسے نہیں لے جا سکتا۔" وہ لمحے بھر کے لیے ٹھٹکی۔ "سئیں اُس نے تو یہ بھی کہا، میرا کوئی کچھ نہیں [illegible] سکتا۔ میں سردار کا لاڈلا ہوں، میں اس کا۔ ۔ ۔ ۔"

"بکواس نہ کر۔" سردار نے جھنجلا کر ڈانٹا۔ "وہ میرا [illegible] ایسا نہیں کہہ سکتا۔" اس کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا، تیوری پر بل پڑ گئے۔ "کوئی میرا لاڈلا شاڈلا نہیں۔"

بوڑھی عورت زرد پڑ گئی، لرزتی ہوئی بولی۔ "سئیں سردار! میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔ میں نے تو اپنی ساوَنی واپس لینی ہے، میں نے بدھیل سے کیا لینا۔ توں نیائے کر سئیں سردار، سدا جیویں۔ رب راضی ہووے۔ میں صدقے ونجاں۔"

"تیرے ساتھ انصاف ہو گا۔" سردار نے مڑ کر وحدت [illegible] کی جانب دیکھا۔ "وحدت! کل صبح بدھیل کو ساوَنی کے ساتھ پکڑ کر کچہری میں پیش کیا جائے۔" وہ عورت کی طرف متوجہ ہوا۔ "اب تو جا۔ کل بدھیل اور ساوَنی کے ساتھ تیری بھی پیشی ہو گی۔" بڑھیا دعائیں دیتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔

دوسرے روز کچہری لگی تو بدھیل کو سردار شہ زور کے روبرو پیش کیا گیا۔ ساوَنی کی بوڑھی ماں بھی موجود تھی۔ سردار کے چہرے پر کچھ زیادہ ہی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ انگلیوں سے آہستہ آہستہ مونچھیں مروڑتا رہا۔ اس نے بوڑھی عورت کی جانب ہاتھ سے اشارہ کر کے بدھیل سے پوچھا۔ "تو اس ذال کو جانتا ہے؟" بدھیل نے اقرار میں گردن ہلائی، زبان سے کچھ نہیں کہا۔

ساوَنی کی ماں خاموش نہ رہی۔ "کیوں نہیں جانتا۔ [illegible] اچھی طرح جانتا ہے سئیں سردار!"

سردار ڈپٹ کر بولا۔ "بڑھیا! چپ کر کے کھڑی رہ۔ جب تجھ سے پوچھا جائے تب بول۔" ساوَنی کی ماں سہم کر خاموش ہو گئی۔ سردار نے بدھیل سے دریافت کیا۔ "اس ذال نے تیرے خلاف سیاہ کاری کا الزام لگایا ہے کہ تو اس کی دھی ساوَنی کو اٹھا لے گیا ہے اور وہ ابھی تک تیرے پاس ہے۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "تو اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہتا ہے؟"

"سئیں سردار! میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔ سب کچھ سچ بتا دوں گا۔" بدھیل نے کہا۔ "ساوَنی سے میں پیار کرتا ہوں، اسے اپنی رن بنانا چاہتا ہوں۔ میں اس کے ساتھ [illegible]

چاہتا تھا۔" اس نے نظریں موڑ کر بوڑھی عورت کو دیکھا۔ "میری ماں اس کے پاس منگنی کے لیے گئی' میں بھی گیا۔ ایک بار نہیں' بار بار گیا۔ اس کی منت کی پر اس نے ہر بار میری منت ٹھکرا دی۔"

ساونی کی ماں نے گھور کر بدھیل کو دیکھا' بدھیل بولتا رہا۔ "سئیں! اصل گالہہ یہ ہے۔ یہ ایک بڈھے سے ساونی کا پرنا کرنا چاہتی ہے۔ اس کا ناں تاج محمد ہے۔ وہ میرانی پور کا سنار ہے۔ اس کے پاس بہت مال منال ہے۔ یہ ساونی کے لیے اس سے دو ہزار روپے لے رہی تھی۔"

بوڑھی عورت تلملا کر بولی۔ "سئیں! اس سے پوچھ' یہ میرا کیا لگتا ہے۔ ساونی' میری دھی ہے۔ میری جس سے مرضی ہوگی' اس کے ساتھ ساونی کا پرنا کروں گی' یہ کون ہوتا ہے۔ یہ ساونی کو اٹھا کر کیوں لے گیا؟"

"سردار' یہ بالکل غلط کہہ رہی ہے۔ میں ساونی کو اٹھا کر نہیں لے گیا۔" بدھیل نے فوراً تردید کی۔ "ساونی اپنی مرضی سے میرے گھر آئی تھی۔"

"سئیں! یہ صاف جھوٹ بول رہا ہے۔" بوڑھی عورت کے لہجے میں تلخی تھی۔ "یہ اونٹھ پر بیٹھ کر رات کے اندھیرے میں میرے گھر آیا اور ساونی کو زبردستی اٹھا کر لے گیا۔"

"تجھے کیسے پتہ چلا کہ یہ ساونی کو زبردستی اٹھا کر لے گیا۔" سردار نے جرح کرنے کی انداز میں دریافت کیا۔ "کیا ساونی نے تجھ سے ایسا کہا تھا؟"

"نا سئیں۔" بوڑھی عورت نے انکار میں گردن ہلائی۔ "میں اس کے گھر گئی تھی پر اس نے مجھے ساونی سے ملنے ہی نہیں دیا۔ اس کی ماں نے اسے قید کر رکھا ہے۔ کسی سے اسے ملنے نہیں دیتی۔"

"سئیں سردار! یہ بالکل جھوٹ بول رہی ہے۔" بدھیل نے صفائی پیش کی۔ "ساونی کو میری ماں نے قید نہیں کیا۔ جب یہ میرے پاس آئی تو ساونی میرے گھر میں تھی ہی نہیں۔"

"کہاں ہے وہ؟" سردار نے بدھیل سے سوال کیا۔

"سردار! میں نے کچھ پتہ نہیں' وہ کہاں ہے۔" بدھیل نے بتایا۔

ساونی کی ماں تڑپ کر بولی۔ "سئیں! یہ بالکل جھوٹا ہے۔ ساونی اس کے گھر ہی میں ہے۔"

سردار نے وحدت خاں کورچانی کی طرف دیکھا "وحدت! کل تجھے حکم دیا گیا تھا کہ بدھیل کے ساتھ ساونی کو بھی لایا جائے۔ کدھر ہے وہ؟"

"سئیں سردار! میں بدھیل کے گھر خود گیا تھا۔" وحدت خاں نے وضاحت کی۔ "پر ساونی وہاں نہیں تھی۔"

"تو نے گھر کی تلاشی لی تھی؟" سرداری نے سوال کیا۔

"میں نے گھر کی پوری تلاشی لی تھی۔ ساونی وہاں نہیں ملی۔ اسے ڈھونڈنے کی ہر جگہ کوشش کی پر کچھ سراغ نہیں ملا۔"

"سئیں' اس نے اسے کہیں چھپا دیا ہے۔" ساونی کی ماں نے بدھیل کی طرف نفرت سے دیکھا۔ "اسے پتہ ہے' وہ کہاں ہے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "سئیں! مجھے میری ساونی دلوا دے۔ میں غریب ہوں۔ رنڈ بیوہ ہوں۔ میرا کوئی نہیں۔ میرے ساتھ نیائے کیا جائے۔ تو سردار ہے' مالک ہے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"تسلی رکھ۔" سردار نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "تیرے ساتھ پورا انصاف ہوگا۔"

بدھیل کے چہرے پر خوف کے سائے منڈلانے لگے۔ ساونی کی ماں آنسو پونچھنے لگی۔ کمرے میں سکوت ہو گیا پھر سردار کی آواز ابھری۔ "وحدت! ساونی کو پوری طرح تلاش کر' جہاں بھی ہے' پکڑ کر پیش کر' جب تک وہ برآمد نہیں ہوتی تب تک بدھیل قیدی رہے گا۔ اسے جیل میں بند کر دیا جائے۔"

مقدمے کی کارروائی آیندہ پیشی تک ملتوی کر دی گئی۔

دوبارہ سماعت شروع ہوئی تو ساونی کچہری میں حاضر تھی۔ اس کی ماں بھی موجود تھی' بدھیل بھی تھا۔ ساونی جوان اور خوش شکل تھی۔ قد نکلتا ہوا اور جسم چھریرا تھا' رنگ اجلا تھا مگر غذائیت کی کمی اور سخت مشقت کے باعث زرد پڑ گیا تھا' آنکھوں سے خوف جھلکتا تھا' اس کا لباس بوسیدہ اور میلا تھا۔ وہ دوپٹے سے چہرے کا نصف سے زائد حصہ چھپائے سہمی کھڑی تھی۔ کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے وحدت خاں نے ساونی کو پیش کیا۔ "سئیں سردار! ساونی حاضر ہے۔"

"تو نے اسے کہاں سے برآمد کیا؟" سردار نے دریافت کیا۔

وحدت نے بتایا۔ "آج صبح یہ خود ہی حاضر ہو گئی۔"

سردار نے نظر بھر کر ساونی کو دیکھا۔ "تیرا ناں ساونی ہے؟"

"ہا سئیں!" ساونی نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔

"تو اب تک کہاں تھی؟" سردار نے سوال کیا۔

"میں اپنی سوتر کے پاس تھی۔" ساونی نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ چک سلیم میں رہتی ہے۔ مجھے بہت پیار کرتی ہے۔ اس کا گھر والا بھی نیک بندہ ہے۔ دونوں نے مجھے بہت آرام سے رکھا۔"

"تو اس کے پاس کیوں گئی؟"

"ماں کے ڈر سے گئی تھی۔ یہ ناراض ہوتی، مجھے مارتی تھی۔"

"بدھیل کو پتہ تھا کہ تُو اپنی سوتر کے گھر میں ہے؟"

"نا سئیں!" ساونی نے انکار میں گردن ہلائی۔ "میں کسی کو بتائے بنا، ایک شام چپ چپاتے اس کے پاس چلی گئی تھی۔"

"سئیں سردار! یہ جھوٹ بول رہی ہے۔" ساونی کی ماں نے مداخلت کی۔ "اسے بدھیل نے اُدھر پہنچایا ہوگا۔ ایسے ہی یہ اسے اُٹھا کر بھی لے گیا تھا۔"

سردار نے اس مداخلت پر اُسے قہر آلود نظروں سے دیکھا پھر ساونی کی جانب متوجہ ہوا۔ "ساونی! تیری ماں کہتی ہے، بدھیل تجھے زبردستی اُٹھا کر لے گیا تھا۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟" ساونی گردن جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ ہر شخص کی نظریں ساونی کی جانب تھیں۔ ساونی نے دیر تک کوئی جواب نہیں دیا۔ سردار نے نرمی سے کہا "ڈر نہیں، سچ سچ بتا۔"

ماں نے بھی پچکار کر کہا۔ "ساونی! تُوں سردار سے صاف صاف بتا دے کہ بدھیل تجھے اُٹھا کر لے گیا تھا، اپنے گھر میں بند رکھا تھا۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا ناں؟"

ساونی نے ماں کی جانب توجہ نہ دی، سردار کی جانب دیکھا اور انکار میں گردن ہلانے لگی۔

"خالی گردن نہ ہلا۔" سردار نے ڈپٹ کر کہا۔ "جو کچھ کہنا ہے، زبان سے کہہ اور ٹھیک ٹھیک بیان کر۔"

"میں اپنی مرضی سے بدھیل کے گھر گئی تھی۔" ساونی کی آواز دھڑک رہی تھی، پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔

"سردار! یہ جھوٹ بول رہی ہے۔" ماں نے گلوگیر لہجے میں احتجاج کیا۔ "بدھیل نے اسے ڈرایا دھمکایا ہے۔"

سردار نے ساونی سے پوچھا۔ "کیا تیری ماں ٹھیک کہہ رہی ہے؟"

"نا سئیں!" اس بار ساونی کے لہجے سے اعتماد جھلک رہا تھا۔ "بدھیل نے مجھے بالکل ڈرایا دھمکایا نہیں۔ میں اس کے ساتھ راضی باضی تھی۔" اس کی آواز بھرا گئی، آنسو ڈھلک ڈھلک کر رخساروں پر گرنے لگے۔ "سئیں! میں تاج محمد سے پرنا نہیں چاہتی۔ ماں اس کے ہاتھ مجھے بیچ دینا چاہتی ہے۔ وہ بڈھا بوہڑ ہے۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ اُسے دیکھ کر مجھے گھن آتی ہے۔" ماں غصے سے دانت پیستی ہوئی ساونی پر جھپٹی، اس کی پیٹھ پر زور سے دوہتڑ مارا اور سر کے بال نوچنے کھسوٹنے لگی، چیخ چیخ کر کوسنے لگی۔

سردار کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "الگ ہٹ، چُپ کر کے کھڑی ہو۔ آگے تُو نے ایسی حرکت کی تو پھری سے باہر نکال دوں گا۔ جرمانہ ڈال دوں گا۔"

ساونی کی ماں سہم گئی، اس نے ساونی کے بال چھوڑ دیے۔ اور روتے ہوئے بولی۔ "سئیں! میں لٹ گئی، برباد ہو گئی۔ بدھیل نے اس پر جادو ٹونا کر دیا ہے۔" اس نے ہاتھ سے ساونی کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ ایسی ہو ہی نہیں سکتی۔ میں اس کی ماں ہوں۔ اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں نے اسے جنڑاں ہے۔ مجھ سے زیادہ اسے کون جانتا ہے۔"

"بہت بول چکی۔ بند کر اپنی بکواس۔" سردار نے اسے جھڑکا۔ "تو چُپ کر کے کھڑی نہیں رہ سکتی۔ تُو نے پتہ ہے، یہ پھری ہے۔" سردار نے گردن جھکائی اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے نظریں اُٹھا کر ساونی کو دیکھا۔

"ساونی! تو بدھیل کے پاس کتنے روز رہی؟"

"دو روز۔" ساونی نے سردار سے نظریں ملائے بغیر دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ اس کے چہرے پر سراسیمگی پھیل گئی۔

ساونی کی ماں ڈانٹ پھٹکار کے باوجود اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ "سئیں سردار! یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" بوڑھی عورت نے گھور کر ساونی کو دیکھا۔ "پر دو روز میں اس نے اپنی پت گنوا ڈالی۔" اس نے بدھیل کی طرف اشارہ کیا۔ "اس نے ساونی کو خراب کر دیا! سئیں سردار یہ کالا ہے، اسے کڑی سزا ملنی چاہیے۔"

"اگر یہ کالا ہے تو ساوئی بھی کالی ہوئی۔" سردار نے تیکھی نظروں سے اس کی ماں کو دیکھا۔ "تو نے پتہ ہے کالے اور کالی کی سزا کیا ہوتی ہے؟"

ساوئی کی ماں دم بخود رہ گئی۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے پھیل گئے۔ رحیم داد بھی کالے اور کالی کے الفاظ سن کر پریشان ہو گیا۔ اسے اب اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ کالے کالی کی سزا کیا ہوتی ہے۔ سردار نے ساوئی سے دریافت کیا۔

"سچ سچ بتا بدھیل نے تجھے خراب تو نہیں کیا؟"

"نا سئیں۔" ساوئی نے شرما کر بتایا۔ "میں بالکل ستھری ہوں۔ نیک بختی ہوں۔"

"کیا ثبوت ہے کہ بدھیل نے تجھے خراب نہیں کیا، تو کالی نہیں ہوئی؟" سردار نے جرح کی۔ ساوئی نظریں جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ سردار کچھ سوچنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ وحدت خاں کی طرف متوجہ ہوا۔ "وحدت!" اس نے ساوئی کی طرف اشارہ کیا "یہ کوٹ میں رہے گی۔ اسے پرسوں کچہری میں پیش کرنا۔ فیصلہ بھی اسی روز سنایا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے سئیں!" وحدت خاں نے نہایت مستعدی سے جواب دیا پھر دبی زبان سے دریافت کیا۔ "بدھیل کے بارے میں کیا حکم ہے؟"

"اسے چھوڑ دیا جائے۔ یہ اپنے گھر جا سکتا ہے مگر اسے اگلی پیشی پر کچہری میں حاضر ہونا ہو گا۔"

دوسرے روز رحیم داد مہمان خانے کے صحن میں مونڈھے پر بیٹھا تھا کہ بدھیل آ گیا۔ رحیم داد نے اسے حیرت سے دیکھا۔ "بدھیل! تو ادھر کیسے آ گیا؟"

"سئیں! میں نے سردار سے ملنا تھا۔" بدھیل نے جواب دیا۔

"سردار تجھے ملا؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"ہا سئیں۔ پر اس سے کوئی گالھ نہیں ہوئی۔ وہ جیپ پر بیٹھ کر چلا گیا۔" بدھیل خاں نے بتایا۔ "وہ اپنے ماناں کے پاس روجھان گیا۔ اس کا ماناں بیمار ہے۔"

"مگر تو سردار سے کیوں ملنا چاہتا تھا؟"

"سئیں! میں نے اسے یہ بتانا تھا کہ ساوئی بالکل ستھری ہے، بے گناہ ہے۔ میں نے تو اس کے ہتھ بھی نہیں لگایا۔"

"پر تو نے اسے اپنے گھر میں رکھا کیوں؟"

"سئیں! جب ساوئی چھپ کر میرے گھر آئی تو میں گھر ... ماں نے بھی برا منایا۔ میں نے ساوئی کو کہا کہ وہ اپنی ماں ... پاس واپس چلی جائے پر وہ رونے لگی' بولی' میں نے ماں کے پاس واپس نہیں جانا۔ وہ مجھے تاج کے ہتھ بیچ دے گی۔ سئیں! میں اسے اپنے گھر سے تو نہیں نکال سکتا تھا۔ وہ میرے گھر میں ... منگن آئی تھی۔" بدھیل رک رک کر بولتا رہا۔ "ویسے سئیں! میں اس سے بہت پیار بھی کرتا ہوں۔"

"وہ بھی تجھ سے پیار کرتی ہے؟" رحیم داد نے دلچسپی ... اظہار کیا۔

"پیار نہ کرتی تو میرے گھر کیوں آتی۔ میں تو اس سے پرنا ... چاہتا تھا۔ پر اس کی ماں مجھ سے بھی دو ہزار روپے مانگتی تھی۔ میں غریب راہک ہوں۔ اتنا روپیہ کہاں سے لاتا۔"

"تو سردار کا کرندہ نہیں ہے؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "میں تو سمجھتا تھا کہ تو اس کا کرندہ ہے۔ کرندہ نہ ہوتا تو سردار تجھے سہراب اور مرجان کو پکڑنے پر داؤد اور جبر خاں کے ساتھ کیوں لگاتا۔"

"سئیں! یہ اس کی مرضی ہے جو کام چاہے' لے۔ وہ مالک ہے اس کا حکم تو ماننا ہی پڑتا ہے۔"

"مان لے' سردار نے تجھے کالا اور ساوئی کو کالی قرار دیا۔ تب تو وہ تجھے اور ساوئی کو پھانسی پر بھی لٹکا سکتا ہے۔"

"قانون تو یہی ہے۔" بدھیل نے آزردگی سے کہا۔ "ویسے سردار کی مرضی ہے' جیسا چاہے فیصلہ دے۔"

رحیم داد نے سرگوشی کے انداز میں مشورہ دیا۔ "موت تیرے سر پر کھڑی ہے' تو یہاں سے بھاگ کیوں نہیں جاتا؟"

"نا سئیں! میں ایسا نہیں کر سکتا۔" بدھیل کے چہرے پر سراسیمگی چھا گئی۔ "میں نے بھاگنے کی کوشش کی تو سردار بالکل یہ سمجھے گا کہ میں گناہ گار ہوں۔ وہ مجھے کالا بتا کر ایک دم پھانسی پر لٹکوا دے گا۔ لگتا ہے' تو نے اس کا کاوڑ اور غصہ نہیں دیکھا۔ ایسا گرم ہو جاتا ہے کہ تجھے کیا بتاؤں۔" اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ "ویسے میں بھاگنا بھی چاہوں تو بھاگ نہیں سکتا۔ تو نے پتہ نہیں' حکم دار وحدت خاں نے میرے پیچھے دو کراوے لگا دیے ہیں۔ وہ میری کڑی ... رکھ رہے ...

...رہتے ہیں۔ ہر دم ساتھ رہتے ہیں۔"

"یہاں تو مجھے کوئی ایسا کرادا یا کرندہ نظر نہیں آتا۔" رحیم داد نے کہا۔

"دونوں کوٹ کے باہر بیٹھے ہیں۔" بدھیل نے سہمی ہوئی نظروں سے حویلی کے صدر دروازے کی جانب دیکھا۔ "دونوں ... ہیں۔ ہر دم چوکس رہتے ہیں۔"

"تو میرے پاس کیوں آیا ہے؟"

"سئیں! میں سردار سے جو کچھ بتانا چاہتا ہوں‘ توں اسے ...۔" بدھیل نے جھک کر رحیم داد کے پیر پکڑ لیے اور گڑگڑانے لگا۔

رحیم داد نے اپنے پیر چھڑاتے ہوئے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ "تو کہتا ہے تو میں سردار سے ضرور بات کروں گا پر اس کی مرضی پر ہے کہ مانے یا نہ مانے۔"

"میں نے پتہ ہے‘ وہ ضرور مان لے گا۔" بدھیل عاجزی سے بولا۔

رحیم داد نے کہا۔ "اچھا اب تو جا۔ تیرا زیادہ دیر یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔" بدھیل مڑا اور آہستہ آہستہ کوٹ کے صدر دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔

رات گئے سردار شہ زور واپس آیا۔ وہ سرخوشی کے عالم میں تھا‘ قدم بہکے ہوئے‘ آنکھیں چڑھی ہوئی۔ اس نے ایک مونڈھا کھینچا اور بیٹھتے ہوئے بولا۔ "معاف کرنا چودھری! مجھے لوٹنے میں دیر ہو گئی۔ جاتے ہوئے تجھ سے مل بھی نہ سکا۔"

"میں نے پتہ ہے‘ تیرا ماما بیمار ہے۔ تو اسی کے پاس گیا تھا نا؟" رحیم داد نے کہا۔ "اب اس کی طبیعت کیسی ہے؟"

"صبح کچھ زیادہ گڑبڑ ہو گئی تھی‘ پر اب پہلے سے ٹھیک ہے۔"

"بیماری کیا ہے اُسے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"ایک بیماری ہو تو بتاؤں۔ سب سے وڈی بیماری تو خود بڑھاپا ہے۔ بہت عمر ہو گئی ہے اس کی۔ چل پھر بھی نہیں سکتا۔ دن رات بستر ہی پر پڑا رہتا ہے۔ اب تو اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ دیر یوں ہو گئی کہ راجن پور سے تحصیل دار آیا ہوا ہے۔ اسے بھی ملنا تھا۔" سردار نے بتایا۔ "اس نے پکڑ کر بٹھا لیا‘ اور بھی سرکاری افسر موجود تھے۔ بوتل کھلی تھی۔ گلاس ٹکرا رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔ روٹی بھی ان کے ساتھ ہی کھائی۔" اس نے تاتل کیا۔ "تُو نے تو روٹی کھالی ہو گی؟"

"نہیں!" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "تیرا انتظار کر رہا تھا۔"

"حد کر دی تُو نے‘ اب تک بھوکا بیٹھا ہے۔"

"اب تو آ گیا ہے تو کھا لوں گا۔ ویسے مجھے زیادہ بھوک نہیں ہے۔" رحیم داد بدستور مسکراتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے سردار سے کہا۔ "تو نے کل صبح بدھیل اور ساوئی کے مقدمے کا فیصلہ کرنا ہے نا؟"

"کرنا تو ہے پر تو نے اس سے کیا لینا۔" سردار کے لہجے سے بیزاری جھلک رہی تھی۔ اس نے اپنی مخمور آنکھوں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "بدھیل تو تیرے پاس نہیں آیا تھا؟" نشے میں اس کا سر جھومنے لگا۔ "ضرور آیا ہو گا‘ مجھے ملا تھا‘ تجھے بھی ملا ہو گا۔ ملا تھا نا؟"

رحیم داد انکار نہ کر سکا۔ "کہتا تھا‘ میں نے تو ساوئی کو ہتھ بھی نہیں لگایا۔ وہ پاک دامن ہے۔"

"اس نے جو کچھ کہا‘ تو نے مان بھی لیا؟" سردار نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "سئیں چودھری! تو بہت سیدھا بندہ ہے۔ یہ تو سوچ‘ دونوں ای بھرپور جوان ہیں۔ یاری بھی لگا رکھی ہے۔ دو راتوں تک اکٹھے بھی رہے۔" اس کا لہجہ ناصحانہ ہو گیا۔ "جوانی تو اندھی ہوتی ہے نا‘ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تو نے یا میں نے کیا پتہ۔"

"مجھے تو دونوں ہی بے گناہ لگتے ہیں۔" رحیم داد نے بدھیل اور ساوئی کی حمایت کی۔

"تیرے پاس کیا ثبوت ہے کہ دونوں بے گناہ ہیں؟" سردار نے جرح شروع کر دی۔

رحیم داد کے پاس کوئی مناسب جواب نہ تھا۔ اس نے پینترا بدلا اور سردار کے ذہن میں بدھیل کے لیے ہمدردی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "تو نے یہ تو پتہ ہے‘ بدھیل کتنا وفادار بندہ ہے۔ سراب اور مرجان کو پکڑنے میں اس نے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔ تیری پگ اُونچی کرنے کے لیے اس نے یہ سب کچھ کیا تھا۔"

"وفاداری اپنی جگہ‘ پر وفاداری سے اس کا جُرم تو کم نہیں

ہو جاتا۔" سردار متاثر نہ ہوا۔ "میں نے انصاف کرنا ہے اور جرم سامنے رکھ کر ہی کرنا ہے۔"

"مان لے' بدھیل نے ساوَنی کو خراب کر دیا' تب تُو کیا کرے گا؟" رحیم داد نے دھڑکتے دل سے سوال کیا۔

"سزا تو وہی دینی ہوگی جو کالے اور کالی کو بلوچوں کے قانون کی رُو سے دی جاتی ہے" سردار کے لہجے میں تذبذب تھا۔

رحیم داد نے زیادہ کُھل کر بات کی۔ "یہ بتا' تُو نے کل کیا فیصلہ دینا ہے؟"

"میں نے اس بارے میں ابھی کچھ سوچا نہیں۔ جو بھی فیصلہ دوں گا' کل صبح سُن لینا۔" وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں نے اب جانا ہے' تو روٹی کھا کر سو جا۔"

رحیم داد کو دھڑکا تھا کہ سردار' بدھیل اور ساوَنی کو کالا اور کالی قرار دے کر پھانسی پر نہ چڑھا دے۔ وہ بدھیل اور ساوَنی کو اس طرح مرتے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ صبح وہ سردار سے اس سلسلے میں پھر بات کرنا چاہتا تھا مگر سردار خلافِ معمول ناشتے پر نہیں آیا' زنان خانے سے نکل کر سیدھا کچہری چلا گیا۔ اس نے رحیم داد کو کچہری میں بُلوایا بھی نہیں۔ رحیم داد بوجھل قدموں سے خود ہی وہاں پہنچ گیا۔ سردار نے اسے داخل ہوتے ہوئے دیکھا مگر خاموش رہا۔ رحیم داد ایک موڑھے پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ بدھیل اور ساوَنی دم بہ خود تھے۔ قریب ہی ساوَنی کی ماں ادب سے سر جھکائے کھڑی تھی۔ وہ خاصی خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ حویلی کا ماشیا پُشت پر کھڑا سردار کے کندھے اور بازوؤں کے پٹھے ہولے ہولے دبا رہا تھا۔ سردار نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور یوں گویا ہوا۔ "میں نے سب کے بیانات سُنے۔ ان کی جانچ پڑتال بھی کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ساوَنی کی ماں نے بدھیل کے خلاف جو الزام لگایا ہے' وہ ٹھیک اور درست ہے۔ بدھیل نے اپنی صفائی میں جو کچھ کہا ہے' اس کی تائید ساوَنی کے بیان سے ہوتی ہے پر ساوَنی برابر سے شریکِ جرم ہے۔ اس واسطے اس کے بیان کی کوئی اہمیت نہیں۔ بدھیل نے خود بھی مانا ہے کہ ساوَنی اس کے گھر میں دو روز تک رہی پر اس الزام سے انکاری ہے کہ وہ ساوَنی کو اٹھا کر نہیں لایا۔ اپنا بیان سچ ثابت کرنے کے لیے اس نے کوئی گواہی پیش نہیں کی۔"

"سئیں سردار! گواہی تو ساوَنی کی ماں نے بھی پیش نہیں کی۔" بدھیل خان نے دلیل دی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے تھے۔ ہونٹ خشک تھے۔ آنکھوں کے چراغ مدھم پڑ گئے تھے۔ چہرے پر موت کے سیاہ سائے منڈلا رہے تھے۔ وہ نڈھال اور ٹوٹا پھوٹا نظر آ رہا تھا۔

"اس کی دھی اٹھائی جائے اور وہی شہادت بھی پیش کرے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر تُو بے گناہ ہے تو اپنی بے گناہی کا ثبوت تُو نے دینا ہوگا۔ تیرے پاس کوئی ثبوت نہیں؟" سردار کی پیشانی پر بَل پڑ گئے۔

"سئیں سردار! میں سچ کہہ رہی ہوں' بدھیل مجھے اُٹھا کر نہیں لایا۔" ساوَنی نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "بدھیل بے گناہ ہے۔"

"سئیں' یہ جھوٹی ہے۔ ایک دم کوڑی ہے۔ جھوٹ بنا کر بدھیل کو بے گناہ ثابت کرنا چاہتی ہے۔" ماں نے قہر آلود نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔ "تیرے رون پٹن سے بدھیل بے گناہ نہیں بن سکتا۔ سئیں سردار' یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ بدھیل نے اسے خراب کر دیا۔ یہ کالی ہو گئی۔"

"تیرا یہ الزام درست نہیں ہے۔" سردار نے تیکھی نظروں سے ساوَنی کی ماں کی جانب دیکھا۔ "ساوَنی کو بدھیل نے خراب نہیں کیا تھا۔ یہ کالی نہیں کہی جا سکتی۔" رحیم داد نے سردار کا بدلا ہوا رویّہ دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ بدھیل اور ساوَنی نے بھی حیرت آمیز خوشی سے سردار کی جانب دیکھا۔ ان کے چہروں پر چھائی ہوئی وحشت رفتہ رفتہ زائل ہونے لگی۔

ساوَنی کی ماں نے احتجاج کیا۔ "سئیں سردار! میں نے پ... ہے۔"

"تُو نے کچھ پتہ نہیں۔" سردار درشت لہجے میں بولا۔ "بدھیل کے پاس دو روز ساوَنی رہی تھی یا تو؟ میں نے پتہ ... اور اچھی طرح پتہ ہے کہ ساوَنی کالی نہیں ہے۔" ساوَنی نے چونک کر سردار پر نظر ڈالی۔ پھر اُس کی گردن جُھک گئی۔ رخساروں پر سرخی پھیل گئی۔ سردار اُونچی آواز سے بولتا رہا۔ "جب ساوَنی کالی نہیں ہے تو بدھیل کیسے کالا ہو سکتا ہے۔" وہ ساوَنی کی ماں کی جانب متوجہ ہوا۔ "کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نا سئیں! تُوں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔" سردار کو غضب ناک دیکھ کر ساوَنی کی ماں کا چہرہ خوف سے فق ہو گیا۔ وہ گڑگڑا کر

معذرت کرنے لگی۔ "سئیں! توں سردار ہے' مالک ہے۔ توں غلط نہیں بول سکتا۔ ہرگز غلط نہیں بول سکتا۔ میں نے ہی غلط سوچا۔ بھُل ہو گئی۔ سئیں معافی دے دے۔" وہ زار و قطار رونے لگی۔ "سئیں! میں فریادی ہوں' تیرے پاس نیائے کے لیے آئی ہوں۔"

"ہنج نہ بہا' چُپ کر کے کھڑی رہ۔ تیرے ساتھ نیائے کیا جائے گا۔" سردار نے فیصلہ سنایا۔ "بدھیل کے خلاف یہ الزام ثابت ہو چکا ہے کہ وہ ساوِنی کو اُٹھا کر لے گیا' دو روز اسے اپنے گھر میں رکھا' اس لیے وہ قانون کی نظروں میں مجرم ہے۔ اس جُرم کی سزا کے طور پر اسے چَٹّی ادا کرنی ہوگی۔"

رحیم داد نے حیران ہو کر سردار کو دیکھا۔ سردار چَٹّی کی تفصیل بیان کر رہا تھا۔ "بدھیل کو پانچ سو روپے جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔ جرمانے کی رقم میں سے اڑھائی سو ساوِنی کی ماں کو تاوان کے طور پر دیا جائے گا۔ چَٹّی کے قانون کی رُو سے بدھیل کو ساوِنی کی طرح کی دو عدد جوان نینگر رن بھی پیش کرنی ہوں گی۔"

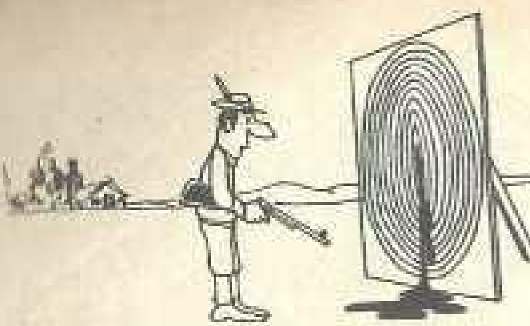
"سئیں سردار! میں دو نینگر رن کہاں سے لاؤں گا۔" بدھیل نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "میری تو صرف ایک بھین ہے۔ وہ بھی پندرہ برس سے کم ہی ہوگی۔ اس کے علاوہ ماں ہے۔" اس کے لہجے میں رقّت پیدا ہو گئی۔ "سئیں! میرا اور کوئی نہیں۔"

"بھین اور ماں کو ہی لے آ۔" سردار نے مُڑ کر ساوِنی کی ماں کی جانب دیکھا۔ "تیرا کوئی پتر ہے؟ نکّا ہو یا گھبرو' پرنا ہو یا بن پرنا۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بدھیل کی بھین سے اس کا پرنا کر دیا جائے گا۔ وہ اسے اپنی زال بنا کر رکھ سکتا ہے۔"

"نا سئیں! میرا کوئی پتر نہیں۔" ساوِنی کی ماں نے بتایا۔ "میں تجھے پہلے ہی بتا چکی ہوں' ساوِنی کے سوا میرا کوئی نہیں۔"

"ساوِنی کا کوئی بھرا نہیں' اس لیے بدھیل کی بھین اور ماں کو کوٹ میں رکھا جائے گا۔" سردار نے اعلان کیا۔ "جب تک بدھیل جرمانہ اور مقدّمے کی پوری فیس جمع نہیں کرائے گا' اپنی ماں اور بھین کو نہیں پہنچائے گا تب تک ساوِنی کو حویلی میں رہنا ہوگا۔ چَٹّی پوری کرنے پر بدھیل' ساوِنی کو ساتھ لے جا سکتا ہے۔"

فیصلہ سُن کر ساوِنی کی ماں اور بدھیل خاموش رہے مگر ساوِنی سب تک۔



بلک بلک کر رونے لگی۔ بدھیل سر جھکائے کچہری سے باہر چلا گیا۔ ساوِنی کی ماں بھی کمرے سے نکل گئی۔ ساوِنی کو دوبارہ زنان خانے میں پہنچا دیا گیا۔

صبح ناشتے پر سردار' رحیم داد کے پاس آیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد رحیم داد نے بدھیل کے مقدّمے کا ذکر چھیڑا۔ "سردار! یہ تو بتا' تُو نے کیسے پتہ چلا کہ ساوِنی کو بدھیل نے خراب نہیں کیا تھا۔ تُو نے ساوِنی کی ماں کو تو چُپ کرا دیا تھا پر تیرے پاس کیا ثبوت تھا کہ ساوِنی کالی نہیں ہوئی؟"

"سئیں چودھری! تو بالکل بھولا بادشاہ ہے۔" شہ زور' زور سے ہنسا۔ "تو نے پتہ نہیں' ساوِنی کل اور پرسوں ساری رات میرے کمرے میں رہی تھی۔" اس نے جھینپتی ہوئی نظروں سے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "جب مقدّمے کا فیصلہ مجھے کرنا تھا تو ثبوت بھی میں نے ہی لینا تھا نا؟"

"تب تو وہ کالی ہو گئی اور تو کالا۔" اس نے مسکرا کر سردار کو چھیڑا۔

"تو نے کوئی کچہری لگا رکھی ہے؟" سردار کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ "سردار کے ساتھ سونے پر کوئی رن کیوں کر کالی ہو سکتی ہے۔ تو نے یہ سوچا کیسے؟ لگتا ہے' تو خاندانی زمین دار نہیں ہے۔"

رحیم داد کی ہنسی ختم ہو گئی۔ معذرت کرنے کے انداز میں بولا۔ "ناراض نہ ہو' میں نے ایسے ہی پوچھ لیا۔"

سردار کی جھنجلاہٹ کم نہیں ہوئی۔ "اگر تیری ایسی ہی سوچ ہے تو اِدھر زمین الاٹ کرانے کا دھیان چھوڑ دے۔ تو نے کچھ پتہ نہیں کہ سرداری اور زمین داری کیا ہوتی ہے۔"

"میں تو مخول کر رہا تھا۔" رحیم داد نے اسے منانے کی کوشش کی پھر گفتگو کا رخ بدلنے کی غرض سے دریافت کیا۔ "یہ تو بتا' لاہور چلنے کا کب تک ارادہ ہے؟ میں اب زیادہ دیر نہیں ٹھہر

سکتا۔"

"چاکر کو تو آجانے دے۔ لگتا ہے' الاٹ منٹ میں کوئی پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے ورنہ چاکر کو اب تک الاٹ منٹ کا آرڈر لے کر آجانا چاہیے تھا۔"

"ایسا کر' کسی کو شہر بھیج کر چاکر خاں سے میرے کلیم کے کاغذات واپس منگوا لے۔" رحیم داد نے کہا۔ "الاٹ منٹ شلاٹ منٹ ہوتا رہے گا۔ مجھے لور جانے دے' تو بعد میں آجانا۔ میں کچھ روز شاہ جی کی کوٹھی میں ٹھہروں گا۔ اسے ملنے کے بعد ہی واپس کوٹلہ ہرکشن جاؤں گا۔"

"ابھی تھوڑا انتظار کر' چاکر جلد ہی آجائے گا۔" سردار نے کسی قدر ناگواری سے کہا۔ رحیم داد نے پھر اصرار نہیں کیا۔

○☆○

چند روز بعد چاکر خاں واپس آگیا۔ اس کا لباس گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ چہرے پر سفر کی تکان نمایاں تھی مگر ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک تھی۔ بغل میں کاغذات کی مسل دبی تھی۔ اس نے جھک کر سردار کے پیروں کو ہاتھ لگایا اور سر جھکا کر ادب سے خیر و عافیت دریافت کی۔ "خیر اے سئیں! خوش ہو' راضی ہو' خیر سلا اے۔"

"شکر اے' تساں اپنا احوال سنا۔" سردار نے جواب دیا۔ "اتنی دیر کیوں لگا دی؟ الاٹ منٹ میں کوئی چکر تو نہیں پڑ گیا؟"

"سئیں! ڈپٹی کمشنر لور گیا ہوا تھا۔ اس کی واپسی کا انتظار کرنا پڑا۔ دیر تو لگ گئی پر کام پکا ہو گیا۔" چاکر خاں نے مسل سردار کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ رہا' زمین کے الاٹ منٹ کا آرڈر۔" اس نے مسل کھول کر کلیم نامہ دکھایا۔

شہ زور نے کلیم نامہ پڑھا اور مسل رحیم داد کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ "سئیں چودھری! مبارک ہو۔ تجھے اڑھائی سو ایکڑ متروکہ اراضی دلاور والا میں الاٹ ہو گئی ہے۔"

رحیم داد کے چہرے پر خوشی سے سرخی پھیل گئی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ الاٹ منٹ اتنی آسانی سے مل جائے گا۔ چاکر خاں اپنی کارگزاری سنانے لگا۔ "سئیں! الاٹ منٹ لینے کے لیے میں بحالیات والوں کے پاس پہنچا' صدر دفتر کے اہل کاروں سے ملا' افسر مال اور تحصیل دار سے ملا' پٹواری سے ملا۔ تب کہیں فائل آگے بڑھوائی۔ کام نکلوانے کے لیے کئیوں کی مٹھی بھی گرم کی۔ سئیں' تو نے تو پتہ ہے' اس کے بغیر فائل آگے نہیں بڑھتی۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "دلاور والا بھی گیا۔ اراضی کا معائنہ کیا۔ بہت اچھی زمین ہے۔ فاضل پور سے نزدیک ہی ہے۔ فاضل پور موضع ہے۔ وڈی بستی ہے۔"

شہ زور نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چودھری! یہ اپنا چاکر بہت کام کا بندہ ہے۔ سچ پوچھ تو میری زمین داری اسی نے سنبھال رکھی ہے۔"

"پر سئیں' قبضہ ملنے میں مشکل پیش آئے گی۔" چاکر خاں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

رحیم داد خاموش رہا۔ سردار نے چونک کر پوچھا۔ "وہ کیوں؟"

"زمین راکھوں اور مزارعوں نے دبا رکھی ہے۔ پہلے بھی کئی بار مہاجروں کو الاٹ ہو چکی ہے پر راکھوں نے قبضہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ بہت گڑبڑ مچائی۔ ابھی تک جمے بیٹھے ہیں۔"

"ایسا ہے تب تو الاٹ منٹ ملنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔" شہ زور نے ترشی سے کہا۔ "تو نے الاٹ منٹ لینے سے پہلے اس طرف دھیان نہیں دیا تھا؟"

"دیا تھا سئیں! بالکل دیا تھا۔" چاکر خاں نے وضاحت کی۔ "صدر دفتر کے ایک اہل کار نے مجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔"

"اس کے خبردار کرنے پر بھی تو نے الاٹ منٹ آرڈر نکلوا لیا؟" سردار کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔

"سئیں فکر نہ کر۔ تمن دریشک کا علاقہ ہے۔ دریشکوں سے مدد مل جائے تو قبضہ مل جائے گا۔ سردار عظمت اللہ خاں دریشک سے تیری گہری یاری ہے' تو اس سے کہے گا تو وہ ضرور مدد کرے گا۔ ادھر اس کی زمین داری ہے۔ تھانے دار سے اس کا بہت میل ملاپ ہے۔ قبضہ حاصل کرنے کے لیے اپنا کام تو پولیس ہی سے پڑے گا۔ پولیس پیچھے ہو تو قبضہ لینے سے کون روک سکتا ہے۔ پولیسے راکھوں کی ساری زور زوری اور [illegible] ایسے نکال دیں گے کہ آگے انھیں سر اٹھانے اور گڑبڑ کرنے کی بھی ہمت نہیں ہوگی۔"

"عظمت اللہ خاں دریشک اپنا اچھا یار ہے۔" سردار کہنے لگا۔

لہجے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ "اس کی تھانے داری سے نہیں' سارے وڈے افسروں سے دوستی ہے۔ عظمت سے زمین کا قبضہ لینے میں پوری مدد مل سکتی ہے۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "سئیں چودھری! پروا نہ کر۔ زمین کا الاٹ منٹ بل گیا ہے' قبضہ بھی بل جائے گا۔"

"تو نے زمین کا الاٹ منٹ دلایا ہے تو قبضہ بھی دلا ہی دے گا پر اس کی دیکھ بھال بھی تُو نے ہی کرنی ہوگی۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے تجھے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں نے تو کوٹلہ ہرکشن ہی میں رہنا ہے۔ ویسے ادھر آتا جاتا رہوں گا۔"

"دیکھ بھال کرنے کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔" سردار نے اطمینان دلایا۔ "ویسے تُو نے کرنا بھی کیا ہے۔ زمین داری تو کاردار اور کمدار ہی چلاتے ہیں۔ تو اپنے کاردار کو ادھر بھیج دینا۔"

"میں اسے ضرور بھیج دوں گا پر وہ یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھیر سکتا۔ اُدھر کی ساری زمین داری وہی چلاتا ہے۔" رحیم داد نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ "میں تو ادھر کسی کو تیرے علاوہ جانتا بھی نہیں۔ جب تُو نے اتنا احسان کیا ہے تو زمین داری چلانے کے لیے کسی بھروسے کے بندے کا انتظام بھی تُو نے ہی کرنا ہوگا۔"

"احسان کی گل نہ کر۔" سردار نے کہا اور چاکر خاں سرگانی کی جانب متوجہ ہوا۔ "چاکر! تو نے چودھری کے لیے بندہ تلاش کرنا ہوگا۔ زمین داری کے کام میں تجربہ رکھتا ہو۔ محنتی اور ایمان دار بھی ہو۔"

"سئیں' عزیز خان گنھوال ٹھیک رہے گا۔"

"کون عزیز خان گنھوال؟ میں تو کسی ایسے بندے کو نہیں جانتا۔" شہ زور نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"سئیں' تُو نے اسے دیکھا تو ہے پر زیادہ نہیں جانتا۔" چاکر خاں نے مسکرا کر کہا۔ "میں جن دنوں مظفر گڑھ میں خاکوانیوں کے پاس ہوتا تھا' گنھوال بھی میرے ساتھ ہی تھا۔ میں ادھر آگیا تو اس نے بھی خاکوانیوں کی نوکری چھوڑ دی' آڑھت کا کام شروع کر دیا پر چلا نہیں۔ آج کل وہ خالی ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہشیار بھی ہے اور بھروسے کا بندہ ہے۔"

"اب کہاں ہوتا ہے وہ؟" سردار نے دریافت کیا۔

"سئیں' وہ راجن پور میں ہوتا ہے۔" چاکر خاں نے دادا... "چودھری کو جو اراضی الاٹ ہوئی ہے' گنھوال ہی نے اس کا کھوج نکالا تھا۔ یہ پہلے رائے بہادر بیتو رام کے پوتے بالا رام کی جگیر میں ہوتی تھی۔ بالا رام پاکستان بنتے ہی سرحد پار چلا گیا۔ اس کی ساری جگیر اور زمین داری ادھری رہ گئی۔" اس نے تامل کیا۔ "سئیں سردار' تو بالا رام کو تو جانتا ہی ہوگا؟"

"جانتا ہوں' بہت وڈا زمین دار ہوتا تھا۔" سردار نے مسکرا کر کہا۔ "اور اس کے دادا بیتو رام کو کون نہیں جانتا؟ ڈیرہ غازی خان میں اسسٹنٹ کمشنر رہ چکا تھا۔ بعد میں رابرٹ سنڈیمن کے ساتھ کوئٹہ چلا گیا۔ اُدھر بھی وڈا افسر لگا تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد راجن پور ہی آگیا تھا۔ بہت شان دار حویلی تھی اس کی۔ بالا رام اسی میں رہتا تھا۔"

بالا رام کی راجن پور والی حویلی بھی ابھی کسی کو الاٹ نہیں ہوئی۔ گنھوال بتاتا تھا' متروکہ اراضی قرار دے کر اسے کسٹوڈین کے حوالے کر دیا گیا۔ آج کل اس میں رانگھڑ مہاجر بسے ہوئے ہیں۔ کوشش کی جائے تو الاٹ ہو جائے گی۔ اے ڈی کمشنر چاہے تو الاٹ منٹ کے ساتھ ساتھ قبضہ بھی جلد مل جائے گا۔" چاکر خاں نے مشورہ دیا۔ "حویلی بہت عالی شان ہے۔ کیوں نہ اس کی الاٹ منٹ کے لیے بھی چودھری کی طرف سے درخواست لگا دی جائے۔"

"لگا دے' ضرور لگا دے' چودھری کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" سردار نے رحیم داد کی جانب دیکھا اور چند لمحے خاموش رہ کر چاکر خان سرگانی کی جانب متوجہ ہوا۔ "چاکر' یہ بتا' گنھوال اتنا ہشیار ہے کہ چودھری کی زمین داری اچھی طرح چلا سکے؟"

"سئیں سردار! میں نے بتایا نا کہ اسے برسوں سے جانتا ہوں' چودھری کے لیے بہت کار آمد ثابت ہوگا۔" چاکر خان نے سردار کو اطمینان دلایا۔ "ویسے چودھری کی زمین داری ہی کتنی ہے۔ کُل اڑھائی سو ایکڑ ہے۔ گنھوال تو وڈی سے وڈی زمین داری آسانی سے چلا سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے' اسے فوراً یہاں بلوا لے۔" سردار نے حکم دیا۔ "اچھا' اب تو جا۔ نہا کر روٹی شوٹی کھا۔ بہت تھکا ہوا لگتا ہے۔"

○☆○

کئی روز گزر گئے۔ رحیم داد کو عزیز گشوال کا انتظار تھا۔ گشوال تو نہیں آیا' نادر خاں آگیا اور اس طرح اچانک آیا کہ اسے دیکھ کر رحیم داد بھونچکا رہ گیا۔ سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ پہر دن گزر چکا تھا۔ کمرے کے باہر تیز اور چمکیلی دھوپ تھی۔ صحن میں چہل پہل تھی۔ ملی جلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور ابھر رہا تھا۔ نادر خاں کی غیر متوقع آمد سے رحیم داد کے ذہن میں طرح طرح کے اندیشے گردش کرنے لگے۔ اس نے نادر کے گرد آلود چہرے پر نظر ڈالی۔ ریل اور لاریوں کے تکلیف دہ سفر اور مسلسل شب بیداری کے باعث وہ خستہ حال اور کچھ زیادہ بوڑھا نظر آرہا تھا۔ داڑھی کے بال بڑھے ہوئے تھے' آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں' چہرے کی جھریاں نمایاں ہوگئی تھیں۔ رحیم داد نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ "نادر! خیر خیریت تو ہے۔ فکر کی تو کوئی گل نہیں؟ تو کھڑا کیوں ہے' بیٹھ جا۔"

"فکر کی کوئی گل نہیں۔" نادر خاں سرکنڈوں کے بنے ہوئے ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ "میں تو جی ایک ضروری مشورے کے لیے آیا تھا۔ میں نے تو پتہ بھی نہیں تھا کہ تو ادھر ہے۔" اس نے کندھے پر پڑے ہوئے پرنے سے چہرے کا پسینہ پونچھا۔ "میں تو سیدھا لمور گیا۔ سوچا تھا' تو شاہ جی کی کوٹھی پر ملے گا۔ جاتے ہوئے بتایا بھی یہی تھا۔ وہاں پہنچا تو اپنی جیپ باہر ہی کھڑی تھی۔ ڈرائیور بھی موجود تھا۔ اس کی زبانی پتہ چلا کہ تو ادھر ہے۔"

"شاہ جی کراچی سے آگیا؟"

"میں نے تو جی یہ بھی پتہ نہیں کہ شاہ جی کب کراچی گیا۔" نادر خاں نے کہا۔ "میں نے ڈرائیور سے اس کے بارے میں پوچھا بھی نہیں۔ کوٹھی کے اندر بھی نہیں گیا۔ وہاں سے سیدھا اسٹیشن پہنچا اور یہاں آنے کے لیے ٹرین میں سوار ہوگیا۔ ادھر کے سفر میں تو جی بہت تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ ڈیرہ غازی خان کے بارے میں تو نے پتہ ہی ہے کہ ادھر تو ٹرین بھی نہیں چلتی۔"

رحیم داد سفر کی اس رُوداد سے اُکتا گیا تھا' اس نے پہلو بدل کے پوچھا۔ "تو کیا مشورہ کرنے آیا ہے۔ کوئی خاص گل ہے؟"

"پچھلے دنوں رفیع ستہ دو بار آیا۔" نادر خاں نے بتایا۔ "پہلی بار جب وہ آیا اور اسے یہ پتہ چلا کہ تو موجود نہیں ہے تو خاموشی

"ذرا سنیئے۔ کیا آپ مجھے ایک سگریٹ عنایت کریں گے؟"

"ایک سگریٹ؟ یہ لیجیے پورا پیکٹ آپ رکھ لیجیے۔"

"بہت بہت شکریہ اب مہربانی کر کے ماچس بھی دیجیے تاکہ سگریٹ سلگائی جاسکے۔"

"کیوں نہیں یہ لائٹر حاضر ہے یہ بھی آپ رکھ لیجیے۔"

"آپ بہت نیک انسان ہیں۔ کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں لیکن ایک بات بتایئے آپ اتنے فیاض اور سخی کیوں ہیں؟ کیا آپ کوئی بہت بڑے رئیس ہیں؟"

"جی نہیں۔ بات یہ ہے کہ مجھے ڈاکٹر نے سگریٹ نوشی سے منع کردیا ہے پھیپھڑوں کے سرطان کی وجہ سے۔"

◆

برطانوی عدالت میں ایک شوہر نے اپنی بیوی سے طلاق لینے کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے تین بار ڈاکیے کے بازو اپنی بیوی کے گرد لپٹے دیکھے۔"

"یہ جھوٹ ہے جناب! سراسر جھوٹ۔" بیوی نے اپنا دفاع کیا۔ "ہمارا ڈاکیے کے بازو اتنے لمبے نہیں ہوتے کہ وہ تین بار لپٹ سکیں۔"

"دلیل معقول ہے۔" عدالت نے فیصلہ سنایا۔ "مقدمہ برخاست کیا جاتا ہے۔"

●

ہماری عورت بڑی تنہا ہے۔ وہ مخالف جنس سے سماجی فاصلے پر رہتی ہے اور اپنی ہم جنس سے نفسیاتی فاصلے پر۔
ممکن ہے جنوبی ایشیا کی پس ماندگی کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ یہاں مرد اور عورت دو الگ مخلوقات ہیں۔
عورت کے معاملے میں مرد نسل کا نہیں صرف رنگ کا قائل ہے۔

جمیلہ احمد صدیقی

سے چلا گیا۔ پچھلے ہفتے کو وہ پھر آیا۔ اس بار اس نے کھل کر مجھ سے گل کی۔ تو نے پتہ ہے' وہ غلّے کی اسمگلنگ کا دھندا کرتا ہے۔" نادر خاں نے بتایا۔ "کہتا تھا' جن دنوں تو اس کا مہمان تھا' اس نے اس بارے میں تجھ سے بات بھی کی تھی اور تو راضی بھی ہوگیا تھا۔"

"اتنا تو میں نے یاد ہے کہ ستہ نے غلّے کی اسمگلنگ کے بارے میں بات کی تھی۔" رحیم داد انکار نہ کرسکا۔ "وہ میری فصل بھی سرحد پار اسمگل کرنے کو کہتا تھا۔ دام بھی بہت اچھے

جاتا تھا، پر میں ہوں ہاں کر کے رہ گیا۔ سوچا تھا، فصل کی ڈاڑھی کے بعد تجھ سے اس معاملے میں بات کروں گا، پر ایسے کاموں میں ہاتھ ڈالتے سے خوف آتا ہے۔ اس میں خطرہ بہت ہے۔"

"خطرہ تو ہے" نادر نے کہا۔ "پر فائدہ بھی اتنا ہی زیادہ ہے۔ آڑھتی فصل کی اتنی قیمت نہیں ادا کریں گے جتنی اسمگلنگ سے ملے گی۔ ستہ کہتا تھا کہ لگ بھگ دگنی ہوگی۔"

"تو اس بارے میں کیا سوچتا ہے؟"

"میں نے کیا سوچنا ہے جی۔ فیصلہ تُو نے کرنا ہے۔" نادر خان نے کھسیا کر کہا۔ "ویسے اپنی فصل تو ابھی اپنے پاس ہے۔ آڑھتی چکر کاٹ رہے ہیں۔ نرخ تو تیری واپسی ہی پر طے ہوگا۔ میں نے ان سے یہی کہہ دیا۔"

"ستہ سے تُو نے کیا کہا؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"میں نے اسے کیا کہنا تھا جی۔" نادر نے بتایا۔ "یہی کہا کہ چودھری کی اجازت کے بغیر میں کچھ نہیں کر سکتا۔ جیسا وہ حکم کرے گا، میں نے ویسا ہی کرنا ہوگا۔" اس نے تامل کیا۔ "میں یہی معلوم کرنے آیا ہوں کہ اس سلسلے میں میرے لیے کیا حکم ہے؟ ستہ چند روز میں آنے کو کہہ گیا تھا۔ جو فیصلہ کرنا ہے، اس میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ فوراً جواب دینا ہوگا۔"

رحیم داد نے نادر خان کے رویے سے اندازہ لگا لیا کہ وہ غلے کی اسمگلنگ میں رفیع ستہ کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو کر آیا ہے مگر رحیم داد اس پر تیار نہیں تھا۔ وہ کسی ایسی مہم جوئی میں شریک ہونے سے ڈرتا تھا، جس میں گرفتار ہونے کا اندیشہ ہو۔ وہ پولیس کا سامنا کرنے اور عدالت کے رُو بہ رُو پیش ہونے سے گھبراتا تھا۔ اس میں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ صرف جیل جانے کا نہیں، بلکہ پھانسی کے پھندے پر لٹک جانے کا بھی خطرہ تھا۔ اسے متفکر دیکھ کر نادر خان نے پوچھا۔

"چودھری! تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

"نادر! بات یہ ہے، میں نے کبھی ایسا خطرناک دھندا کیا نہیں۔" رحیم داد نے اپنی پریشانی ظاہر کی۔ "میں فوراً کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ سوچ کر بتاؤں گا۔ تو تھکا ہوا ہے، جا کر آرام کر۔ تجھ سے بعد میں گل ہوگی۔"

"تیری مرضی۔ ویسے میرا ارادہ آج ہی واپس جانے کا تھا۔"

"نہیں، تو ابھی نہیں جا سکتا۔ تجھ سے بہت سی ضروری باتیں کرنی ہیں۔" رحیم داد نے ایک نوکر کو بلوا کے ہدایت کی کہ مہمان خانے میں نادر خان کے ٹھہرنے اور کھانے پینے کا مناسب بندوبست کر دیا جائے۔

شام کو رحیم داد صحن میں بیٹھا تھا۔ شہ زور سہ پہر کو روہان چلا گیا تھا۔ وہ موجود نہ ہوتا تو رحیم داد بادہ نوشی بھی نہ کرتا، حالاں کہ کئی بار سردار نے اصرار بھی کیا لیکن اکیلے بیٹھ کر شراب پینا اسے اچھا نہ لگتا۔ ملازم گلاس اور بوتل لاتا تو بھی وہ منع کر دیتا۔ البتہ بھنگ پینے میں اسے عار نہ تھا، اور لسی کو وہ بھنگ پر ترجیح دیتا۔ رحیم داد کے سامنے لسی سے بھرا ہوا کانسی کا لمبا گلاس رکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد نادر خان پہنچ گیا اور کرسی کھسکا کر رحیم داد کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ وہ غسل کر کے آیا تھا۔ لباس بھی صاف ستھرا تھا۔ تمام دن آرام کرنے کے بعد اب وہ ہشاش بشاش نظر آتا تھا۔

رحیم داد نے مسکرا کر دیکھا۔ "نادر! تو بہت دیر سوتا رہا۔"

"بہت تھک گیا تھا جی۔" نادر نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "لاریاں ایسی پرانی کھٹارا ہیں کہ چلنے میں ایک ایک پرزہ شور کرتا ہے۔ سڑک بھی کچی ہے۔ جگہ جگہ گڑھے ہیں۔ لاری میں ایسی گرد اُڑتی ہے، ایسے جھٹکے لگتے ہیں کہ جوڑ جوڑ ہل جاتا ہے۔ اب تک ہڈیاں دُکھ رہی ہیں اور خاک تو ایسی جمی کہ بار بار نہانے پر بھی ایسا لگتا ہے کہ خاک ابھی اُتری نہیں۔"

"پر لاری تو ادھر آتی نہیں۔" رحیم داد نے کہا۔ "سڑک تو بہت دور رہ جاتی ہے۔ تو شاہ میر تک آیا کیسے؟ تانگا تو ملتا نہیں ہوگا۔"

"بس جی، کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی گیا۔" نادر خان نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے دریافت کیا۔ "ستہ کے بارے میں کیا سوچا جی؟ میں نے واپس جا کر اسے جواب دینا ہوگا۔"

"سوچتا تو اس کے بارے میں دن بھر رہا، پر سمجھ میں نہیں آتا، کیا کیا جائے۔ تو نے اچھی طرح پتہ ہے، اسمگلنگ کے دھندے میں کانٹے بہت ہیں۔ ویسے روپے کی ابھی اتنی زیادہ ضرورت بھی نہیں کہ یہ کام کیا جائے۔"

"روپے کی ضرورت تو ہے اور بہت زیادہ ہے۔"

"کس لیے؟" رحیم داد نے حیرت سے نادر خان کو دیکھا۔

"زمین بڑھانے کے لیے۔" نادر خان نے کہا۔ "آپ

ں مجھے مینجر لگایا ہے۔ اپنے پاس لگ بھگ آٹھ سو ایکڑ اراضی ہے۔ اتنی کم اراضی کے لیے مینجری کرتے مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ میں تو چاہتا ہوں کہ زمین داری اور بڑھے تاکہ مینجری کرنے کا کچھ مزا آئے۔ مجھے بھی اپنی کارگزاری دکھانے کا موقع ملے۔"

"پر تو زمین داری بڑھائے گا کیسے؟ غیر مزروعہ اور پڑیلی زمین پر تو نے باغات لگا لیے۔ زمین داری بڑھانے کے لیے اور زمین کہاں سے آئے گی؟"

"اس کے بارے میں بعد میں بتاؤں گا۔" نادر خاں نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں، پہلے ستہ کا معاملہ طے ہو جائے۔"

"اچھا تو تو ہی بتا اس معاملے میں کیا کیا جائے؟"

"میں تو جی یہی صلاح دوں گا کہ ستہ کی بات مان لی جائے۔ اس میں جتنا فائدہ ہے، خطرہ اتنا زیادہ نہیں۔" نادر خاں نے دبی زبان میں کہا۔ "چودھری! تو نے شاید پتہ نہیں۔ غلے کی اسمگلنگ تو اپنا شاہ جی بھی کرتا ہے اور ساری اسمگلنگ رفیع ستہ ہی کے ذریعے ہوتی ہے۔ اب سے نہیں، برسوں سے ہو رہی ہے۔"

"پر شاہ جی نے کبھی مجھے ایسی بات نہیں بتائی۔" رحیم داد نے تعجب سے کہا۔ "تو نے کیسے پتہ چلا کہ شاہ جی اپنی فصلوں کی سرحد پار اسمگلنگ کرتا ہے اور ستہ کے ذریعے کراتا ہے؟" وہ لمحے بھر کے لیے ٹھٹکا۔ "شاہ جی نے ستہ کے بارے میں مجھے یہ بتایا تھا کہ وہ اسمگلر ہے پر یہ نہیں بتایا کہ ستہ کے ساتھ مل کر اسمگلنگ کرتا ہے۔"

"مجھے تو جی یہ گل ستہ ہی نے بتائی تھی۔" نادر خاں نے کہا۔ "وہ تو جی یہ بھی بتاتا تھا کہ شاہ جی کی فصل تو گوداموں اور کھلیانوں سے اٹھ اٹھ کر سرحد پار جاتی بھی شروع ہو گئی۔ سچ تو یہ ہے جی، مجھے اس بارے میں پہلے ہی سے پتہ تھا۔ ستہ کے ساتھ شاہ جی کی یاری کا اصلی سبب بھی یہی ہے۔"

"تیری باتوں کا صاف مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ ستہ کے ساتھ معاملہ کر لیا جائے۔" رحیم داد مسکرایا۔ "پر سوچ لے، ہے یہ کام بہت الٹا۔ جو کچھ کرنا ہے، تو نے ہی کرنا ہو گا۔"

"بس تم ہاں کرو جی۔" نادر خاں کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ ابھری۔ "مجھے تو صرف اجازت چاہیے۔ آگے کی مجھ پر چھوڑ دو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔

خان اعظم

منگول فاتح چنگیز خاں نے ہرات کا شہر فتح کیا تو دشمن فوجیوں اور حکمرانوں کے قتل عام کا حکم دے دیا اور پھر ان کے سروں کے مینار کا نظارہ کیا۔

شہر کے چند شرفا چنگیز خاں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ فاتح نے ان کا استقبال کیا، دربار میں بیٹھنے کی اجازت دی اور انھیں اپنی معروضات پیش کرنے کا حکم دیا۔ ہراتی شرفا نے اپنی جانیں بچانے کی خاطر اپنے سابقہ حکمرانوں کے مظالم اور عیاشیوں کی پوری فہرست کھول دی اور رقت انگیز انداز میں سابق حکمرانوں کے عہد میں رعایا کی حالت زار کا رونا رو دیا۔

چنگیز خاں سب کچھ سنتا رہا۔ ان کی گفتگو ختم ہوئی تو اس نے حکم دیا کہ "جو لوگ ایسے ظالم حکمران برداشت کرتے رہے اور اپنی مظلومیت پر قانع رہے، ان سب کے سر بھی سروں کے میناروں پر سجا دیے جائیں اور پرانا شہر نذر آتش کر دیا جائے۔"

ہرات کے اس پرانے شہر کے کھنڈر آج بھی موجود ہیں اور بڑی دردناک داستان سناتے ہیں۔

عبدالقادر حسن

سب کام بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گا۔"

رحیم داد رضامند ہو گیا۔ "میری طرف سے تجھے اجازت ہے۔"

"اب جی، یہ بھی سن لیں، میں زمین داری کس طرح بڑھانا چاہتا ہوں۔" نادر خاں نے کہا۔ "تجھے یہ تو پتہ ہی ہے کہ اپنی زمین داری کے نشیب میں جو چھوٹے زمین دار ہیں، ان کا پانی باغات لگانے کے بعد ہم نے کم کر دیا ہے۔ ان کی زمین کے لیے تو لگانے کو اتنا کم پانی مل رہا ہے کہ انھوں نے جو بیری لگائی سب سوکھ گئی۔ دوسری فصلوں کو بھی پورا پانی نہ ملا تو وہ بھی خراب ہو گئیں۔"

"ایسی بات ہے تو وہ بہت گڑبڑ کر سکتے ہیں۔" رحیم داد پریشان سا ہو گیا۔

"ان کو جو گڑبڑ کرنی تھی، کر چکے۔" نادر خاں نے بتایا۔

"اور تک درخواستیں لگائیں۔ سرکاری دفتروں کے بہت چکر کاٹے پر اپنا کام ایسا پکا تھا کہ کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ آخر چُپ کرکے بیٹھ گئے۔ تُو نے تو ساری باتوں کا اچھی طرح پتہ ہے۔"

"میں سمجھا وہ کوئی نئی گڑبڑ گھڑی کرنی چاہتے ہیں۔" رحیم داد نے لسّی کا گھونٹ بھرا۔ "کھیتوں کو لگانے کے لیے پانی نہ ملے اور فصلیں سُوکھ جائیں تو کوئی زمین دار یا مزارع کیسے چُپ کرکے بیٹھ سکتا ہے۔"

"انھوں نے یہ کیا کہ سندھ میں بیراجوں کی جو زمین نکلی ہے وہ الاٹ کرانی شروع کر دی۔ اب وہ آباد کار بن کر سندھ جا رہے ہیں۔"

"اِدھر کی اراضی کا کیا کریں گے؟"

"اُسے وہ فروخت کرنا چاہتے ہیں۔" نادر خاں نے بتایا۔ "اُدھر زمین داری چلانے کے لیے بھی تو روپے کی ضرورت ہوگی۔ صرف زمین الاٹ کرا لینے سے تو کام نہیں چلتا۔"

"تجھے، کیسے پتہ چلا کہ وہ اپنی زمین فروخت کرنا چاہتے ہیں؟"

"کئی تو میرے پاس آ چکے ہیں، ویسے بھی حقِ شفعہ کی رُو سے سب سے پہلے اپنا ہی حق بنتا ہے، اپنی زمینیں جو اُن کے ساتھ ملتی ہیں۔ اُن کو تو اپنی زمین فروخت کرنے سے پہلے ہم سے صلاح مشورہ کرنا ہی ہوگا۔ قانون یہی ہے۔"

"پر وہ تو اپنی زمینوں کی بہت قیمت مانگتے ہوں گے۔"

"مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔ پانی نہ ملنے سے وہ بہت پریشان ہیں۔ دوسری طرف سننے میں آیا ہے کہ بیراجوں کی زمین بہت زرخیز ہے۔ پانی بھی بہت ہے۔ وہ جلد سے جلد اُدھر جا کر کاشت شروع کرنا چاہتے ہیں۔"

"مطلب ہے، وہ اپنی زمینیں سستے میں فروخت کر دیں گے؟"

نادر خاں نے کہا۔ "ضرورت مند ہیں اس لیے سستے میں فروخت کر دیں گے۔"

"پر سوال یہ ہے کہ زمینیں خریدنے کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔ "اگر پوری فصل ربیع ستہ کے ذریعے اسمگل کرا دی جائے تب بھی اتنا روپیہ تو نہیں ملے گا کہ ساری زمینیں خریدی جا سکیں۔"

"ساری زمینیں خریدنے کا تو نہ میرا ارادہ ہے اور نہ اتنی گنجائش ہے۔" نادر خاں نے اپنی رائے ظاہر کی۔ "میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اتنی زمین خریدی جائے کہ اپنے پاس بچاس مربع اراضی ہو جائے۔"

"تو یہ کہنا چاہتا ہے، ساڑھے چار سو کلّا زمین خریدی جائے؟"

"ہاں، اپنے پاس کم سے کم اتنی زمین تو ہو کہ زمین داری کی کچھ شان نظر آئے۔"

"مگر اس کے لیے روپے کی بھی تو ضرورت ہوگی۔" رحیم داد کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔

"کچھ روپیہ اپنے پاس ہے، کچھ شاہ جی سے اُدھار لیا جا سکتا ہے۔" نادر خاں نے مشورہ دیا۔ "میں تو سمجھتا ہوں جی، وہ اس معاملے میں ضرور مدد کرے گا۔ چودھری! میں نے پتہ ہے، وہ تجھے کتنا مانتا ہے۔ وہ تو تجھے بہت وڈّا زمین دار دیکھنا چاہتا ہے۔ اوروں کی گل نہیں کرتا، خود مجھ سے وہ ایسا خیال ظاہر کر چکا ہے۔ تُو شاہ جی سے کہہ کے تو دیکھ، وہ ضرور تیری مدد کرے گا۔"

"تھوڑی بہت رقم تو وہ اُدھار دے سکتا ہے پر اتنی نہیں کہ ساڑھے چار سو کلّا زمین خریدی جا سکے۔" رحیم داد نے کہا۔ "ویسے بھی میں شاہ جی سے اُدھار مانگنا نہیں چاہتا۔ مان لے، اس نے انکار کر دیا تب کیا ہوگا۔ خامخا شرمندگی اُٹھانی ہوگی۔ جتنا اپنے پاس روپیہ ہے، بس اتنی ہی زمین خریدنے کی سوچ۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔ "روپیہ ہوگا تو بعد میں بھی زمین خریدی جا سکتی ہے۔"

"جیسی تیری مرضی۔" نادر خاں بددل سا ہو گیا۔ "پر میں ایک گل ضرور کہوں گا، ایسا موقع روز روز نہیں ملتا۔" اس نے بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "ویسے تُو نے پتہ ہے، زمین دار کتنا ہی وڈّا کیوں نہ ہو، اپنی زمین کم کرنے کے بجائے ہمیشہ بڑھانے ہی کے چکر میں رہتا ہے۔"

اتنے میں چاکر خاں سرکانی اندھیرے سے نکل کر سامنے آ گیا۔ رحیم داد نے اس سے مسکرا کر پوچھا۔ "تُو اکیلا ہی آیا؟ تیرا سردار کدھر ہے؟"

"میں! میں سردار کے ساتھ نہیں گیا تھا۔" چاکر خاں نے سب کو...

...وبولا۔
"...نے یہ تو پتہ ہو گا' وہ کب تک واپس آئے گا؟" رحیم داد
...اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
...ر خاں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "سئیں چودھری! پتہ
...سردار کب تک لوٹے گا۔ میں تو تجھے یہ بتانے آیا ہوں کہ
...کنھوال کل صبح یہاں پہنچ جائے گا۔ وہ ولاور والا گیا تھا۔
...اسی دیکھ کر اور ساری معلومات اکٹھی کر کے ہی تیرے پاس
...ئے گا۔ وہ بہت ہشیار بندہ ہے۔ تو اس سے مل کر بہت خوش
...۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر اسے تیرے پاس لگایا ہے۔
...داری کے کام کا اسے بہت تجربہ ہے۔ سارا کام سنبھال لے
...اس کے ہوتے ہوئے تو نے کوئی فکر کرنے کی ضرورت
...یں۔"
...رحیم داد نے نادر خاں کی بابت ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ "یہ نادر خاں
...۔ آج ہی کوٹلہ ہر کشن سے آیا ہے۔ میرا مینیجر ہے۔"
"تو نے اسے مشورے کے لیے بلایا ہے؟" سرگانی نے
...پوچھا۔
"نہیں۔" رحیم داد بولا۔ "اسے تو میں نے اب تک یہ بھی
...یں بتایا کہ ولاور والا میں میرے نام اڑھائی سو ایکڑ متروکہ
...ی اراضی الاٹ ہو چکی ہے۔"
سرگانی نے نادر خاں سے پوچھا۔ "سئیں' تو ادھر آرام سے
...ہے ناں' کوئی تکلیف تو نہیں؟"
"بالکل آرام سے ہوں۔" نادر خاں نے مسکرا کر جواب
...۔ "کوٹ کا ڈیرا بہت شان دار ہے۔ کمرے بھی اچھے اور
...کھلے ہوئے ہیں پر گرمی ادھر زیادہ ہے۔"
"اس بار کچھ زیادہ ہی گرمی پڑی ہے۔ تو شمشیر والی آتا تو
...ری اتنی نہ لگتی۔ دریا کا کنارہ ہے' صبح اور شام ٹھنڈی ہوا
...تی ہے۔ چودھری بھی پچھلے دنوں سردار کے ساتھ اُدھر ہوتا
...۔ یہاں آئے ہوئے تو اسے چند ہی روز ہوئے ہیں۔"
...ھوڑی دیر بعد سرگانی کسی کام کا عذر کر کے چلا گیا۔
نادر خاں نے رحیم داد سے کہا۔ "مجھے بھی اب اجازت دو'
...سویرے ہی نکل جاؤں گا۔"
"نہیں۔" رحیم داد نے حتمی لہجے میں کہا۔ "تجھ سے اور
...بھی ضروری باتیں کرنی ہیں۔"



"میں تو اس لیے فوراً واپس کوٹلہ ہر کشن جانا چاہتا تھا کہ
سٹہ چند ہی روز میں آنے کو کہہ گیا تھا۔" نادر خاں نے وضاحت
کی۔ "اب تو اسے ملنا ضروری ہو گیا ہے۔"
"میں نے تجھ سے ولاور والا کی زمین کے بارے میں صلاح
کرنی ہے۔" رحیم داد نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں' تو بھی ولاور
والا کا ایک چکر لگا کر دیکھ لے۔ اسی الاٹ منٹ کی خاطر تو میں
اِدھر آیا تھا۔ سچ پوچھ تو مجھے امید نہیں تھی کہ اتنی آسانی سے
الاٹ منٹ مل جائے گا۔"
"زمین تو جی جہاں ملے' ضرور لے لینی چاہیے پر اِدھر زمین
داری چلانے میں بہت دشواریاں ہیں۔ طرح طرح کے جھگڑے
بکھیڑے ہیں۔"
"فکر نہ کر۔ تجھے اِدھر نہیں لگاؤں گا۔" رحیم داد نے ہنس کر
کہا۔ "میں نے اس بارے میں پہلے ہی سوچ رکھا تھا۔ اِدھر کی
زمین داری چلانے کے لیے عزیز کنھوال کو بلایا ہے۔"
دوسرے روز دن چڑھے عزیز کنھوال رحیم داد کے کمرے
میں داخل ہوا۔ چاکر خاں اس کے ہم راہ تھا۔ نادر خاں دونوں
کی آمد سے پہلے ہی آ گیا تھا۔ سردار شہ زور خاں رات کے
پچھلے پہر لوٹا تھا اور ابھی تک زنان خانے سے مہمان خانے میں
نہیں آیا تھا۔ عزیز کنھوال ساٹھ کے پیٹے میں ہو گا مگر صحت بہت
اچھی تھی۔ جسم مضبوط اور گٹھا ہوا تھا۔ قد ذرا چھوٹا تھا۔
طبیعت میں خوشامد کی حد تک انکسار تھا۔ بات بات پر ہنستا اور

...سب رنگ

مزارعوں کے نام زمین سرکاری ریکارڈ میں منتقل ہو چکی ہے؟"
رحیم داد نے تیکھی نظروں سے چاکر خاں کو دیکھا۔

"سئیں تو فکر نہ کر۔" چاکر خان نے مسکرا کر رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ "پٹواری نے اپنی کارروائی ڈالی تو اس کے اوپر تحصیل دار بھی بیٹھا ہے۔ وہ انتقالات خارج کر کے زمین تیرے نام کروے گا۔ تحصیل دار کی سردار سے گہری یاری ہے۔ میری بھی اس سے اچھی جان پہچان ہے۔ سئیں توں بالکل پروا نہ کر۔ یہ کام مجھ پر چھوڑ دے۔ توں نے تو اس معاملے میں کچھ نہیں لینا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

عزیز گشکوال نے بھی چاکر خان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "تحصیل دار بالکل ایسا کر سکتا ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "انتقالات کیا، گرداوریاں تک منسوخ ہو سکتی ہیں، بدل سکتی ہیں۔ اپنا چاکر خان سب کچھ کرا سکتا ہے۔ اس کی تو صدر دفتر تک پہنچ ہے۔ جیسا چاہے گا، آرام سے کرا لے گا۔"

نادر خاں نے فکرمندی سے کہا۔ "مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ مزارع آگے چل کر بہت گڑبڑ پیدا کریں گے۔ اس نے سرگانی کو نظر بھر کر دیکھا۔ میں نے ادھر کے راہکوں مزارعوں کے بارے میں اچھی طرح پتہ ہے۔ بہت سرکش اور زور آور ہیں۔" نادر خاں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "چاکر خان! توں نے بھی سنا ہو گا۔ دو تین سال پہلے کا ذکر ہے۔ خریف کی فصل پر چوٹی کے لغاری سرداروں نے موضع کمال خاں کے چاہ ... کھوسہ مزارعوں اور راہکوں کو زمینوں سے بے دخل کرنے کے لیے نزدیک کے پہاڑوں سے سو سے بھی زیادہ ہدیانی بلوچوں کو بلایا۔ ان کے ذریعے سونجی کی فصل اٹھوانے کی کوشش کی۔ ہدیانیوں نے بستی پر رات کے اندھیرے میں حملہ کر دیا۔ ... کھوسہ مزارعوں نے حملہ آوروں کو گھیرے میں لے لیا۔ ... زبردست لڑائی ہوئی۔ آخر ہدیانی حملہ آوروں کو پسپا ہونا پڑا۔ ... بدحواس ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔"

"توں نے سنا، پر یہ نہیں سنا کہ بعد میں کیا ہوا۔" چاکر خاں نے بے نیازی سے کہا۔ "لغاریوں نے کھوسہ راہکوں کے خلاف دوسرا حربہ استعمال کیا۔ پولیس اور قانون کا چکر چلایا۔ ان کے خلاف دفعہ ۳۶۵۔ ۳۸/۳۸ کے تحت مقدمے بنوائے۔ ... لغاری زمین داروں کے خلاف کھوسہ راہکوں نے بھی پرچے چاک کرانے پر لغاریوں کے پرچے درج ہو گئے، کھوسوں کے پرچے خارج ہو گئے۔" اس نے نادر خاں کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ "راہکوں کو پولیس نے بند کر دیا۔ زمین داروں نے ان کی غیر حاضری میں سونجی کی فصل اٹھوا لی۔ بعد میں سارے سرکش راہک بے دخل بھی کر دیے۔" اس نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "سئیں، ادھر سرداروں کا قانون چلتا ہے، اور کوئی قانون نہیں چلتا۔ توں فکر نہ کر، سب کو دیکھ لیں گے۔"

جانگلوس، ہماری زمینوں کی ایک کہانی
دو بے اماں، بے سروسامان فراریوں کی سرگزشت
ان بستیوں کی رُوداد جہاں آدمی نہیں بستے۔
باقی واقعات آئندہ شمارے میں



عالی جناب سیّد احمد شاہ، المعروف پطرس بخاری 1898ء میں پیدایش، مقام، پشاور، نسبی پس منظر، سیّد زادگان، آبا و اجداد کی کشمیر سے ہجرت اور پشاور میں مستقل سکونت۔ مشہور وکیل اور مبلغ اسلام خواجہ کمال الدین کے ہاں والدِ محترم سیّد اسداللہ شاہ کی بہ حیثیت منشی ملازمت، پشاور میں ابتدائی تعلیم، مزید تعلیم کے لیے لاہور روانگی اور گورنمنٹ کالج سے اعزاز کے ساتھ انگریزی میں ایم اے۔ اعلا تعلیم کے لیے انگلستان کا سفر اور امانوئیل کالج سے انگریزی ادبیات میں امتیازی سند، وطن واپسی پر پہلے سینٹرل گورنمنٹ کالج، پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر، 1937ء میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستگی۔ 1940ء میں آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر جنرل کے منصب پر سرفرازی۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران ہندوستان میں نشریات کی توسیع کے لیے سات سال تک شبانہ روز جدوجہد۔ قیامِ پاکستان سے کچھ پہلے گورنمنٹ کالج لاہور میں پرنسپل۔ اسی دوران لندن میں انڈیا آفس لائبریری کے تقسیمِ املاک کے مذاکرے اور 1950ء میں وزیراعظم پاکستان خان لیاقت علی خان کے ساتھ تاریخی امریکی دورے میں تعاون اور مشیر کی حیثیت سے شرکت۔ غالباً اسی سال اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل مندوب کے عہدے پر تقرری، 1954ء تک اسی خدمت پر مامور، 1955ء میں سیکریٹری جنرل ڈاگ ہیمرشولڈ کی خواہش پر اقوام متحدہ کی جانب سے، شعبۂ اطلاعات کی سربراہی پر فائز۔ 1959ء تک ریٹائرمنٹ کی مدت، مگر صبح 5 دسمبر 1958ء کو نیویارک کے اسپتال میں داستانِ حیات تمام۔

صید و صیاد

مغرب سے ایک دل نشین، خیال آفریں داستان
اُن شکست خوردگان کی کہانی جن کا دل شیشے سے سوا تھا
نادرِ روزگار پطرس نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔

۳ دسمبر ۱۸۸۲ء کو رات کے وقت پیرس کا ایک نوجوان دریائے سین کے قدیم پُل پر چلا جا رہا تھا۔ اس نے اس جہانِ فانی سے ہمیشہ کے لیے اپنا تعلق منقطع کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ اس کے قدم نہایت آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔ جوں جوں وہ اپنی منزل کے قریب ہوتا جاتا، اس کا اطمینان و سکون بڑھتا جاتا۔ یہ نوجوان 'ایڈمنڈ سیوین' پُل کے عین وسط میں پہنچ کر جنگلے پر ہاتھ رکھے دریا کا سیاہ پانی کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کا جسم کسی قدر کانپا، دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لیے تیز ہوئی، پھر وہ سنبھل گیا اور عاقلانہ انداز میں اوور کوٹ اُتارنے لگا۔

اوور کوٹ تہ کرکے اس نے زمین پر رکھ دیا۔ تھوڑے سے تامّل کے بعد اس نے جنگلا مضبوطی سے پکڑ لیا اور آنکھیں بند کرلیں پھر وہ دریا میں کودنے ہی کو تھا کہ کسی نے اسے کندھے سے پکڑ لیا "ذرا ٹھہر جاؤ بھائی!" آہستگی سے اسے مخاطب کیا گیا۔

موت کے اس متمنّی نے اجنبی کا ہاتھ جھٹکا دے کر ہٹا دیا اور پھر چھلانگ مارنے لگا لیکن اب کی بار اس کا کندھا دو ہاتھوں نے زور سے کھینچ لیا اور پھر وہی آواز آئی "جناب! ذرا ٹھہر جائیے، صرف ایک گھنٹے کے لیے ٹھہر جائیے! کیا اتنا بھی آپ کو بہت معلوم ہوتا ہے؟"

سیوین نے مڑ کر دیکھا، اجنبی درمیانے قد کا ایک دُبلا پتلا سا آدمی تھا، چہرے کے باریک نقوش پر نیکی یا بدی کی کوئی تحریر نہیں تھی، صرف ایک تفکّر سا چھایا ہوا تھا، آواز اس نازک وقت میں بھی نہایت پُرسکون تھی۔ سیوین کو غصّہ سا آگیا، اس نے خود کو بڑی جدوجہد کے بعد خودکشی پر آمادہ کیا تھا، وہ جھلّا کر بولا۔ "آپ اپنے کام سے غرض رکھیے۔"

اجنبی نے کہا۔ "جناب! ابھی کچھ تو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ میرا ایک کام ہے جو پیرس بھر میں سوائے آپ کے کوئی نہیں کرسکتا ورنہ میں کاہے کو مُخل ہوتا، معاف کیجیے آپ کا خودکشی کا طریقہ نہایت بھدّا سا ہے لیکن مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں، میری دخل اندازی کسی اور سبب سے ہے۔ بات یہ ہے کہ اس وقت ایک خاتون کو آپ کی مدد کی بہت ضرورت ہے ورنہ یقین جانیے، میں کبھی یوں آپ کو تکلیف نہ دیتا۔"

سیوین درشتی سے ہنس کر کہنے لگا۔ "تم نے میرے پاس آنے میں غلطی کی ہے، ایک عورت ہی کی خاطر تو میں....." اس نے دریا کی طرف ہاتھ پھیلا کر کہا۔ "اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ عورت ہی کی صنف کے لیے میں یہاں جان کا خراج



ادا کرنے آیا ہوں۔ اس سے زیادہ میں کیا کرسکتا ہوں؟"

اجنبی بولا۔ "معاملہ ایک عورت کا ہے' اور آپ الزام ساری عورتوں کو دے رہے ہیں۔ اچھا آیئے' انکار نہ کیجیے گا' میں آپ کے منہ سے ناں نہیں سن سکتا۔ دوبارہ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ایک خاتون کی چل کے مدد کیجیے' ایک نوجوان خاتون کی' ایک حسین خاتون کی۔ ازراہِ کرم آپ اپنا سفر ایک گھنٹے کے لیے ملتوی کر دیجیے۔ صرف ایک گھنٹے کے لیے' کیا یہ بہت زیادہ ہے؟ اس کے بعد ابد تک جتنا بھی زمانہ ہے' آپ اس کے مالک و مختار ہیں۔ کیا آپ اس میں سے ایک گھنٹا بھی کسی کو نہیں بخش سکتے؟"

سیوین برگشتگی کے باوجود اجنبی کی باتیں غور سے سننے لگا تھا۔ اس نے پوچھا "آخر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

اجنبی نے کہا۔ "یہ دیکھیے' میں ابھی آپ سے کہتا ہوں۔ یہاں سردی ہے' آپ اتنی مہربانی کیجیے کہ اپنا اوور کوٹ پہن لیجیے۔ اور میرے ساتھ اس شراب خانے تک چلے چلیے' وہ جہاں سرخ روشنی نظر آرہی ہے' جو کچھ مجھے کہنا ہے' آپ وہاں پہنچ کر سن لیجیے گا۔ اگر اس سے آپ کی تشفی نہ ہوئی تو آپ بے شک واپس آجایئے گا' اتنی سی بات ہے۔"

سیوین نے دریا ایک نظر دیکھا اور اجنبی کی بات ماننے کے لیے تیار ہوگیا۔ اس نے اپنا کوٹ پہنا اور ساتھ ہولیا۔

اجنبی نے کہا "شکر ہے' آخر آپ مجھے مل گئے ورنہ خدا جانے میں کہاں کہاں مارا پھرتا۔ آج رات مجھے آپ سے پہلے دو آدمی آپ ہی کی طرح کے اور ملے تھے لیکن وہ کسی کام کے نہ تھے۔ نہایت فضول' انھوں نے میری سنی ہی نہیں' میں کیا کرتا۔ اب اس وقت وہ دونوں دوسری دنیا میں ہیں اور شاید تمنا کر رہے ہوں کہ کسی طرح واپس پیرس پہنچ جائیں لیکن آپ بالکل میرے مطلب کے آدمی ہیں۔۔۔ یہ لیجیے' ہم پہنچ گئے۔ یہ شراب خانہ ہے تو چھوٹا سا لیکن کیا مضائقہ ہے۔ پہلے آپ جناب۔"

کمرے میں دونوں ایک طرف ہوکر بیٹھ گئے اور ایک دوسرے کو غور سے دیکھنے لگے۔ اجنبی کی شکل اب صاف نظر آرہی تھی۔ چہرہ پہلے کی نسبت زیادہ متفکر تھا اور آنکھیں عقاب کی طرح چمک دار ہو گئی تھیں۔ مجموعی طور پر وہ ایک اچھی خاصی شخصیت کا حامل تھا۔

سیوین پچیس برس کا نوجوان تھا۔ چہرے کے نقش تیکھے ترشے ہوئے' لباس پیرس کے دیہاتیوں کا' رنگ ذرا زرد۔ وہ بے تابی سے بولا۔ "ہاں تم اپنا مدعا بیان کرو۔"

اجنبی نے کہا۔ "مجھے اپنا مدعا تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ چل کے شیر شکاری کھیلیے۔ شیر شکاری کے کھیل سے تو آپ واقف ہوں گے؟"

"جی نہیں۔"

"افسوس' انسان اپنی شہرت پر کیا بھروسا کرسکتا ہے۔ جناب! آپ نے میرا نام تو ضرور سنا ہو گا؟ مجھے پول کہتے ہیں۔"

سیوین نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے تمھارا نام کبھی نہیں سنا۔"

پول مایوسی کے انداز میں بولا۔ "مجھے افسوس ہے۔ بہرحال' بات یہ ہے جو لوگ اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہیں' ان

کے لیے میں نے ایک ایسا طریقہ وضع کر رکھا ہے، جس پر انھیں کسی طرح ملامت نہ ہو سکے۔ اگر آپ کو اس بات کا علم ہوتا تو آپ دریائے سین کے پاس جانے کے بجائے یقیناً میرے پاس آتے۔ اگر اشتہار دینے میں مجھ سے کوئی کوتاہی ہوگئی ہے تو یہ میرا قصور نہیں۔ میں مجبور ہوں۔ میرا کام ہی ایسا ہے لیکن میرا خیال تھا کہ آپ نے معزز طبقوں میں میرا ذکر ضرور سنا ہوگا۔"

سیوین نے کہا "بہتر ہے جو کچھ تمھیں کہنا ہے' جلدی کہو' آدھے گھنٹے سے زیادہ گزر چکا ہے اور مجھے ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا۔"

یول نے کہا۔ "میں معافی چاہتا ہوں۔ دیکھیے نا۔ آخر ایک موجد' ایک تخلیق کار بھی سینے میں دل رکھتا ہے' اس کی بھی حسیات کو صدمہ پہنچ سکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں' انسان ایک متمدن حیوان ہے' سماجی حیوان۔ تمدن' حقوق و فرائض کے باہمی تعلقات کا نام ہے۔ چند فرائض ایسے بھی ہیں' زندگی کے آخری لمحوں میں بھی جنھیں پورا کرنا ضروری ہے۔ کیا آپ کو دنیا سے یوں اکیلے جانا مناسب معلوم ہوتا ہے جب کہ کئی لوگ ایسے موجود ہیں جو آپ کے رخصت ہو جانے میں مدد دینے کے لیے تیار ہیں؟ تیار کیا' خواہش مند ہیں۔ ان کی مدد سے آپ کا آخری سفر نہ صرف زیادہ پُرلطف بلکہ زیادہ خوب صورت بنایا جا سکتا ہے۔ اس تن آفرینی کے لیے میں نے ایک معمولی سا کھیل ایجاد کیا ہے جس میں دو کھلاڑی اعلا درجے کا لطف حاصل کر سکتے ہیں اور ان میں سے ایک کا انجام قطعی یقینی ہوتا ہے۔ زندگی سے تنگ آئے ہوئے دو آدمی آپس میں قرعہ اندازی سے فیصلہ کر لیتے ہیں کہ کون شیر ہے اور کون شکاری۔ اس کے بعد شیر اپنے گلے میں ایک نقرئی گھنٹی باندھ لیتا ہے اور شکاری ہاتھ میں ایک بھرا ہوا پستول لے لیتا ہے۔ کمرے کے تمام چراغ گل کر دیے جاتے ہیں اور صید و صیاد کو تنہائی میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ پھر شیر کی مرضی کے مطابق موسیقی سے اس کی سامعہ نوازی کی جاتی ہے پھر موسیقی بند ہو جاتی ہے شیر کی حرکت سے اس کے گلے میں لگی ہوئی گھنٹی بجتی ہے۔ شکاری اندھیرے میں پہلے ایک دفعہ فائر کرتا ہے پھر ایک دفعہ اور کرتا ہے۔ پھر چراغ روشن کر دیے جاتے ہیں۔ اگر شیر زخمی ہو گیا ہو تو یقیناً مر جاتا ہے کیونکہ سب گولیاں زہر آلود ہوتی ہیں۔ اگر وہ بچ جائے تو گھنٹی اس کے گلے سے اتار کر شکاری کے گلے میں باندھ دی جاتی ہے اور کھیل پھر سے شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سلسلہ جاری رہتا ہے حتیٰ کہ ان میں سے ایک رخصت ہو جاتا ہے۔ پہلے پہل صرف مردوں میں اس کھیل کا رواج تھا۔ لیکن جب اس کی شہرت بہت بڑھ گئی تو ایک خاتون نے بھی اس میں شرکت کی درخواست کی۔ یہ بدعت کسی قدر پسند کی گئی۔ اب جہاں تک ممکن ہو سکے' ایک مرد' ایک عورت کا شریک بنایا جاتا ہے۔ عام طور پر وہ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں۔ اس کھیل کو بہت پسندیدگی نصیب ہوئی ہے صاحب؟"

میں نے اس میں ایک دو جدتیں بھی کی ہیں۔ مثلاً میں کبھی کبھی ایک خالی کارتوس بھی بھر دیتا ہوں۔ میرے سوا کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ کون سا کارتوس خالی ہے۔ اس سے ذرا لطف بڑھ جاتا ہے خودکشی کے خواہش مند معزز حضرات اور معزز خواتین کو اب یہ ضرورت نہیں کہ وہ دریائے سین میں پڑے پائے جائیں۔ وہ اب اس پُرلطف موت کو ترجیح دیتے ہیں۔"

سیوین نے پوچھا۔ "لیکن تمھاری اس ہرزہ سرائی کا مجھ سے کیا تعلق؟ اگر مجھے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا منظور ہے تو یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ تم اس میں کیوں دخل دیتے ہو؟ میں سمجھتا ہوں' تمھیں اس قبیح فعل کے لیے کسی فیس کی توقع ہے تو وہ تمھیں مجھ سے نہیں ملے گی۔ میں واپس پل پر جا رہا ہوں اور نہیں سمجھتا کہ کسی طرح بھی تمھارا ممنون ہوں۔" وہ اٹھا اور اپنی ٹوپی کے لیے اس نے ہاتھ بڑھایا۔

یول نے نوجوان کا کوٹ پکڑ کر کہا۔ "خدا کے لیے پانچ منٹ اور بیٹھ جائیے۔ میں آپ سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ آج رات ایک ڈیوک اور ایک خاتون کو آپس میں یہ کھیل کھیلنا تھا۔ خاتون تو پہنچ گئی ہیں لیکن ڈیوک صاحب اب تک تشریف نہیں لائے' ان کے بغیر کھیل کیسے کھیلا جا سکتا ہے۔ اس طرح کا واقعہ کبھی پہلے نہیں ہوا کہ کوئی فریق آیا نہ ہو۔ اس میں میری سخت بدنامی ہے۔ دربار میں یہ خبر پہنچ گئی تو

میری نام وری میں خلل آجائے گا۔ آپ چل کر دیوک کی جگہ لے لیجیے اور مجھے، نیز اس خاتون کو اپنا شرمندۂ احسان بنایئے اگر خدانخواستہ آپ اس کے نشانے سے بچ گئے تو آپ اس پر احسان کر کے تشریف لے آیئے گا۔"

سیون نے گھبرا کے پوچھا۔ "تم چاہتے ہو، میں اس کی جان لوں؟"

یول نے کہا۔ "یہ کیا ضروری ہے۔ ممکن ہے، آپ خود اس کا نشانہ بن جائیں۔ آپ یہ بتایئے کہ آپ کو دونوں میں سے کون سی بات پسند ہے، چشم زدن میں ایک حسین خاتون کے ہاتھوں مرجانا یا ایک دریا میں پڑے سڑتے رہنا؟ جہاں اس بات کا خطرہ بھی ساتھ لگا ہے کہ کوئی خدائی فوج دار آ کے آپ کو بچانہ لے۔ کس قدر شرم کی بات ہے۔ میرے ہاں، آپ کی تسلی کو کم از کم یہ خیال تو ہو گا کہ آپ کی موت دل پسند صحبت میں واقع ہوئی ہے۔"

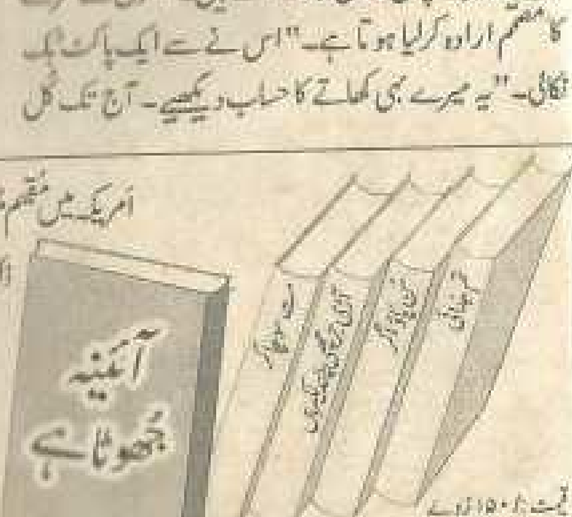
سیون نے کہا۔ "ممکن ہے، میں جاں بر ہونے کو ایک حسین عورت کے قتل پر ترجیح دوں۔ تمھیں تمھاری ایجاد مبارک ہو، جس کی بدولت تم نے خدا جانے کتنے انسانوں کو پیش از وقت مار دیا ہے۔"

موجد بولا۔ "دیکھیے، آپ بہت کج نگاہی سے کام لے رہے ہیں، آپ کے الفاظ سے مجھے صدمہ پہنچا ہے، ذرا غور فرمایئے، کیا میں نے کسی سے جا کر کہا ہے کہ تم قبل از وقت مرجاؤ؟ میرے پاس تو وہی لوگ آتے ہیں۔ جنھوں نے مرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہوتا ہے۔" اس نے ایک پاکٹ بک نکالی۔ "یہ میرے بہی کھاتے کا حساب دیکھیے۔ آج تک کل بیاسی فرمائشیں ہو چکی ہیں۔ ان میں سے باون مردوں کی تھیں اور تیس عورتوں کی۔ کل بیالیس بازیاں کھیلی جا چکی ہیں بیالیس اموات۔ اگر میرے مرتی اپنا طریقۂ مرگ خود سوچتے تو اموات کی تعداد اس سے تقریباً دگنی ہوتی، کیوں نہیں جناب! میں تو بنی نوع انسان کا مصلح ہوں، جانیں بچاتا ہوں۔"

سیون نے کہا۔ "اور تمھیں اس بات کا خیال نہیں کہ جو لوگ تمھاری بازی کے بعد زندہ بچ جاتے ہیں۔ وہ پھر کسی اور طرح خودکشی کر لیتے ہیں۔"

"معاف کیجیے، آپ پھر غلطی پر ہیں۔ پہلی اکتالیس بازیوں میں سے جو زندہ بچ گئے، ممکن تھا کہ وہ سب آپس میں پھر یہ کھیل کھیلتے حتیٰ کہ ان میں سے صرف ایک باقی رہ جاتا لیکن ہوا یوں کہ زندہ بچ جانے والوں میں سے صرف ایک نے دوبارہ مرنے کی خواہش کی۔ اس ایک کے سوا باقی سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور جاتے ہوئے میرا شکریہ بھی ادا کرتے گئے۔ اندھیرے میں گولی چلنے کا ڈر، ایک مختصر اکرشدہ انتظارِ مرگ، مجروح لاش کا گھناؤنا نظارہ۔ یہ ایسی فیصلہ کن باتیں ہیں کہ جو لوگ زندہ رہ جاتے ہیں، وہ یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ مرنا ہے تو گھر جا کر طبعی موت ہی مریں گے۔" وہ رکا۔ "اگر آپ چل کر اس خاتون پر تھوڑا سا احسان کریں اور خوش قسمتی یا بدقسمتی سے آپ اس کی گولی سے بچ جائیں تو مجھے یقین ہے، آپ بھی دل سے اعتراف کریں گے کہ آپ دوبارہ بچ گئے۔"

سیون نے کہا۔ "تمھاری بات تو غلط ہے لیکن اس میں کچھ



شک نہیں کہ تمھاری باتیں بہت دل چسپ ہیں۔ بہر حال میں یہ کھیل کھیلنے کو تیار ہوں' بقول تمھارے' زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ میری موت چند گھنٹے دیر میں آئے' اور کیا؟"

یول بہت خوش ہوا اور بڑے مرصّع فقروں میں نوجوان کا شکریہ ادا کرنے لگا۔

سیوین نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "بل ادا کرو اور چلو۔ وقت خاصا ضائع ہو چکا ہے۔"

شراب خانے سے نکلے تو یول آگے آگے چلنے لگا۔ چلتے چلتے وہ تنگ و تاریک گلیوں میں پہنچ گئے۔ جہاں کہیں کہیں آویزاں لیمپ کی ناکام روشنی رات کی سیاہی اور بھی تاریک کر دیتی تھی۔ یول نہایت خوش شعاری سے سلسلۂ کلام جاری رکھے ہوئے تھا' شاید اس ڈر سے کہ کہیں اس کا ساتھی خاموشی سے گھبرا کر واپسی کا ارادہ نہ کر لے۔ وہ دن بھر کی تازہ خبروں پر تبصرے کرتا رہا' کبھی شاہی دربار کے معاملات پر' کبھی کسی تازہ ترین ڈرامے کے متعلق کہ فلاں ایکٹریس نے بہت بری طرح ایکٹ کیا اور گاتے وقت بے سُری ہو گئی۔ اس طرح کی باتیں ختم ہو چکیں تو اس نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور چاند ستاروں کے متعلق ایک تقریر شروع کر دی۔ سیوین خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔

کوئی بیس منٹ چلنے کے بعد وہ ایک کشادہ بازار میں پہنچے اور ایک کسی قدر بڑے گھر کے دروازے کے سامنے ٹھہر گئے۔ یول نے گھنٹی کی رسّی پکڑ کے کھینچی۔ تھوڑی دیر بعد دروازے کی ایک کھڑکی سے کسی نے باہر جھانکا۔ "کون ہے؟"

یول نے کہا۔ "میں ہوں' دروازہ کھولو۔"

دروازہ کُھلا اور دونوں اندر داخل ہوئے۔ یول نے پوچھا۔ "وہ خاتون یہیں ہیں؟"

جواب ملا۔ "ہاں"

"وہ لوگ آئے ہیں؟"

جواب ملا۔ "نہیں آئے۔"

یول نے اپنے ساتھی کی آستین پکڑ کر کہا۔ "آئیے۔"

دونوں ایک کمرے میں داخل ہوئے' جہاں ایک بربط دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ میز پر ایک رباب رکھا تھا اور کرسی پر ایک عورت سوئی ہوئی تھی۔ اس کی شکل حسین نہیں تھی۔

سیوین نے مایوس ہو کر پوچھا۔ "کیا یہی وہ خاتون ہیں؟"

یول نے کہا۔ "نہیں صاحب! یہ تو بربط بجانے والی عورت ہے' انتظار کرتے کرتے تھک کر سو گئی ہے۔ وہ خاتون تو ساتھ والے کمرے میں ہیں۔ آپ اپنی ٹوپی اور لبادہ اُتار کر یہاں لٹکا دیجیے اور یہ ایک معمولی سی رسم ہے' اسے بھی پورا کر دیجیے یعنی یہ نیم نقاب پہن لیجیے۔ گم نامی میرے یہاں کا سب سے مقدم اصول ہے' ٹھیک۔ ادھر تشریف لائیے۔"

ساتھ کا کمرہ پہلے کمرے سے بڑا تھا۔ ساز و سامان مختصر تھا مگر جس قدر بھی تھا' اچھا تھا۔ ایک دیوار تصویروں سے بالکل عاری تھی۔ انگیٹھی میں لکڑیاں جل رہی تھیں اور آگ کے سامنے ایک عورت نہایت قیمتی لباس پہنے بیٹھی تھی۔ دروازہ کُھلا تو وہ چونک کر کھڑی ہو گئی۔ "اتنی دیر کر دی تم نے۔ اگر میرا دل مضبوط نہ ہوتا تو میں کب کی واپس چلی گئی ہوتی۔"

یول نے کہا۔ "مادام! میں تہِ دل سے معافی کا خواست گار ہوں۔ کچھ مشکلات پیش آ گئی تھیں جن کی وجہ سے میں رک گیا۔ یہ میرے ساتھ جو صاحب ہیں' یہ اس بے وفا شخص کی قائم مقامی کریں گے جو آنے کا وعدہ کر کے نہیں آیا۔ اب قاعدے کی رُو سے آپ کو آدھ گھنٹہ دیا جاتا ہے کہ آپ ایک دوسرے سے واقفیت پیدا کر لیجیے یا دنیا کے لیے کوئی پیغام چھوڑنا ہو تو وہ لکھ دیجیے"۔

عورت نے اُٹھ کر کہا۔ "میں ضرورت سے زیادہ انتظار کر چکی ہوں۔ اب اور انتظار کیا معنی؟" اس نے سیوین کو مخاطب کیا۔ "جناب! اگر ہم قاعدے کی خلاف ورزی کر کے یہ آدھ گھنٹہ استعمال میں نہ لائیں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہو گا؟"

سیوین نے کہا۔ "سچ تو یہ ہے کہ میں فوراً اس دنیا سے رخصت ہو جانا چاہتا تھا لیکن مجھے یول کی باتوں کا اور کچھ آپ کو دیکھ کر مجھ پر یہ اثر ہوا ہے کہ عجلت سے مجھے کوئی فائدہ معلوم نہیں ہوتا۔ آپ آدھ گھنٹے ٹھہر جائیے۔ مجھے آپ سے یہ درخواست کرنے کا حق ہے کیونکہ آپ نے میرا اصل

ارادہ درہم برہم کردیا ہے۔ آپ نہ ہوتیں تو میں اس وقت دریا کی تہہ میں پڑا ہوتا یا بہہ کر سیورے تک پہنچ گیا ہوتا۔"

خاتون نے کہا۔ "جیسا آپ مناسب سمجھیں لیکن افسوس کہ میں اس وقت اپنی رفاقت میں کوئی دل پذیری پیدا نہیں کر سکتی۔"

چند منٹ تک کمرے میں بالکل خاموشی رہی۔ سیوین اس حسینہ کے چہرے کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس میں شک نہیں کہ نقاب نے چہرے کا بالائی حصّہ مستور کر رکھا تھا پھر بھی ٹھوڑی کی گولائی، ہونٹوں کی کمان، چھوٹے چھوٹے کانوں کی خوب صورتی جو گھنگھریالے جال میں سے جھانک رہی تھی، اس بات کے لیے کافی تھی کہ سیوین نقاب پوش حصّے کے متعلق غور کرنے لگے۔ شاید خاتون بھی اسی طرح اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ ان کی آنکھیں کبھی کبھی چار ہو جاتی تھیں۔

اتنے میں خاتون بولی۔ "جناب! اگر ہمیں اپنی زندگی کے آخری لمحے اکٹھے ہی گزارنے ہیں تو شگفتگی سے کیوں نہ گزاریں۔ میں دو گھنٹے خاموش بیٹھی رہی ہوں۔ جی اکتا گیا ہے۔ خدا کے لیے کوئی بات کیجیے۔"

سیوین نے کہا۔ "ضرور، بسرو چشم، مگر کیا بات کروں۔ اچھا، میں آپ کی دل بستگی کی کوشش کرتا ہوں، سنیے۔ جب میں ادھر آ رہا تھا تو راستے میں یوں ستاروں کے متعلق باتیں کر رہا تھا۔ ایک طرف زہرہ دکھائی دے رہا تھا، یوں نے مجھ سے پوچھا تھا، یہ زہرہ یہاں کیسے آ گیا۔ اب اسی قسم کا ایک سوال میرے دل میں پیدا ہو رہا ہے کہ زہرہ یہاں کیسے آ گیا؟ کیا دنیا میں کوئی ایسا دل باقی نہیں رہا جسے توڑا جا سکے، کوئی ایسا شخص موجود نہیں جو حسن کا فریب کھا سکے؟ دل توڑنے کا مشغلہ اسی قدر دلچسپ ہے جس قدر یہ کھیل جو ہم کھیلنے والے ہیں۔ اس میں بھی صرف ایک ہی آدمی مجروح ہوتا ہے۔ میں پھر پوچھوں گا کہ زہرہ یہاں کیسے آ گیا؟ بلکہ کیسے آ گئی؟"

خاتون نے جواب دیا۔ "معلوم ہوتا ہے، آپ کو تشبیہوں کا شوق ہے۔ یہ سوال آپ کسی اور وقت کرتے تو میں اسے آپ کی دیدہ دلیری سمجھتی اور خاموشی کے سوا دوسرا جواب دینا گوارا نہ کرتی لیکن اب چوں کہ ہم میں سے ایک کو صرف آدھ گھنٹے اور زندہ رہنا ہے، میں سمجھتی ہوں کہ صاف گوئی سے کام لیا جائے۔ تو جناب! زہرہ کے یہاں موجود ہونے کی وجہ عطارد ہے، جس کی ظاہری شکل و صورت تو ایک اچھے بھلے انسان کی تھی لیکن دل دغا سے بھرا ہوا تھا۔"

سیوین نے کہا۔ "یہ ایک تشنہ بیان ہے۔ از راہِ کرم مجھے کچھ اور بتایئے۔"

خاتون نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ "میں اس سے زیادہ کیا بتاؤں اور کیوں بتاؤں۔ بہتر ہے، کیوں نہ جناب ہی یہاں اپنی آمد کے اسباب کے بارے میں کچھ بتائیں۔ مجھے آپ کا نام معلوم نہیں اور معاف کیجیے، میں آپ کو کسی آسمانی نام سے نہیں پکارنا چاہتی"۔

"آہ میں بھی کیا بتاؤں۔ یوں سمجھیے میرے یہاں آنے کا باعث بھی حُسن و خوبی کا ایک درخشندہ ستارہ ہے جو میرے ساتھ قران میں آیا ہے، وہ کچھ عرصے تک میری ہم راہی میں گردش کرتا رہا لیکن آخر وہ بھی آپ کے عطارد کی طرح کج رفتار نکلا۔ اب وہ ایک سپاہی کی آغوش میں چمک رہا ہے۔ میرے لیے یہ دنیا اس کے بغیر تاریک ہے اس لیے میں کسی دوسری دنیا میں جانا چاہتا ہوں۔"

"کیا آپ سے ایسا سلوک پہلے کبھی نہیں ہوا؟"

"کبھی نہیں، اسی لیے میں نے قسم کھائی ہے کہ اس طرح کا واقعہ آیندہ بھی کبھی پیش نہیں آئے گا۔"

"آپ کا خیال ہے، وہ اس قابل ہے کہ اس کے لیے جان یوں قربان کر دی جائے؟"

"کیا آپ کا محبوب اس قابل ہے؟"

خاتون نے جوش میں آ کر کہا۔ "ہرگز نہیں، قطعاً نہیں۔ آپ یہ نہ سمجھیے کہ میں موت کو شکستہ دل کا مرہم جان کر اس کی طلب گار ہوں، آپ کا شاید یہ خیال ہو لیکن نہیں، میں تو صرف اس لیے مرنا چاہتی ہوں کہ مبادا لوگ میری ہنسی اڑائیں۔ زندگی میں پہلے بھی دو مرتبہ مجھ سے یوں دغا کی گئی ہے، میں نہیں چاہتی کہ زندہ رہوں تو تیسری دفعہ بھی یہی صورت پیش آئے۔ تیسری دفعہ پھر یہی ہوا! مرد جھوٹے اور بے وفا ہوتے ہیں۔"

"مردوں ہی کا کیا ذکر، ایک آپ کو چھوڑ کر، عورتیں بھی تو کچھ کم نہیں۔"

دونوں غم زدہ نظروں سے اُسے دیکھتے رہے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد سیوین نے کہا۔ "محترم خاتون! اب زندگی کی چند گھڑیاں باقی ہیں، ہو سکے تو میری ایک خواہش پوری کر دیجیے۔ میں آپ کا خوب صورت چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

عورت نے نہایت بے پروائی سے کہا۔ "کیوں؟"

"میری آرزو ہے کہ میں اس خاتون کی شکل دیکھ لوں جو ابھی مجھے دوسری دنیا میں بھیج دے گی یا مجھ سے چند منٹ پہلے خود وہاں جا پہنچے گی۔"

عورت نے بے اعتنائی سے کہا۔ "فضول تمنّا ہے، آپ کو چاہیے کہ اس آخری وقت میں آپ اپنا دل ارفع و اعلیٰ خیالات میں مصروف رکھیں۔"

سیوین نے کہا۔ "یہ نہ کہیے۔ ابھی ابھی پول نے مجھ سے کہا تھا کہ انسان ایک متمدّن حیوان ہے۔ ہم ایک طویل طویل سفر کی تیاری کر رہے ہیں۔ اور اگر میں اپنے ہم سفر کی شکل دیکھنا چاہوں تو یہ کون سی تعجب کی بات ہے۔ معاف کیجیے، آپ کو میرا شرمندۂ احساں ہونا چاہیے۔ آپ نہ ہوتیں تو میری تکلیف کا اب تک خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ اس کے علاوہ آپ کی گولی کا نشانہ بننا یا آپ کو اپنا نشانہ بنانا کیا کوئی معمولی بات ہے؟ یقین کیجیے، آپ کی باتیں سن کر مجھے آپ کا چہرہ دیکھنے کی شدید تمنّا ہے۔"

کچھ دیر تک وہ تامّل میں رہی پھر کہنے لگی۔ "ٹھیک ہے فی الحقیقت، بقول آپ کے میں آپ کی احسان مند ہوں مجھے اس خواہش کی تعمیل میں کوئی عار نہیں، آپ بھی نقاب اتار دیجیے۔"

دونوں نے نقاب اُتار دیے۔ اور غور سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ سیوین خوش شکل تھا لیکن بے نقابی نے خاتون کے چہرے کا جو حُسن آشکارا کر دیا تھا، وہ سیوین کی توقع سے بالا تھا۔ باریک نفیس ابرو، جیسے کسی خوش مذاق مصوّر کی قلم طرازی، نیلی نیلی خوب صورت آنکھیں، لمبی لمبی مجوب پلکیں اور آنکھوں کی نیل گوں گہرائیاں۔ سیوین کا دل دھڑکنے لگا۔ خاتون نے کہا۔ "کیا میرے چہرے میں کوئی ایسی قباحت ہے جس کی وجہ سے دو مرد مجھ سے یوں منہ پھیر لیں؟"

سیوین نے کہا۔ "جو کچھ مجھے نظر آ رہا ہے، اس سے تو ایک تیسرا شخص بھی مسحور ہو سکتا ہے۔ اگر ان دونوں نے آپ سے بے وفائی کی تو اس کی وجہ اس دل کش صورت میں مجھے کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ کیا انھوں نے کوئی اور وجہ نہیں بتائی؟"

"ایک بے وفا کو میرا افلاس ناگوار تھا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ جب میرے والد کے ساتھ ہی میری دولت و ثروت بھی رخصت ہو گئی اور ناداری نے مجھے گھیر لیا تو میرا ہرجائی ایک دن مجھے ملنے آیا۔ وہ عشق و محبت کی داستان رک رک کے اور تھم تھم کے مجھ سے کہتا رہا۔ آواز میں عجز تھا، انداز میں انکسار تھا۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی کہہ گیا کہ میں محض اپنی آمدنی پر

منظور مانی

* آدمی غصے میں پُتلے سے باہر ہو جاتا ہے۔
* اب ٹیپ کا بند نہیں ٹیپ (TAPE) کا بند چلے گا۔
* غربت وہ وائرس ہے جو ناقابلِ علاج بیماریاں پیدا کرتا ہے۔
* دنیا میں دو سُپر طاقتیں ہوں گی یا ایک بھی نہیں ہو گی۔ یہ فطرت کا اصول ہے۔
* انسانی معاشرے کے سب سے خوب صورت اور خوش حال شہری بچے۔
* تجسس ترقی کی بنیاد ہے اسی لیے بچے "کیوں" کا لفظ سب سے زیادہ بولتے ہیں۔
* محبت کی شادی میں ہنی مون پہلے منا جاتا ہے۔
* لباس، جنگل کی چار دیواری
* لہجہ لفظوں سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔
* علم کی کمی کا احساس بھی علم سے پیدا ہوتا ہے۔
* ہونے کی کیا اہمیت اگر آپ نظر نہیں آ رہے۔
* یہ کیا اچھا کیچ ہوتا، اگر پکڑ لیا جاتا۔
* میں دولت کا مذاق اڑانے کے لیے تیار ہوں، ایک بار میرے پاس آئے تو۔

گھربار کے اخراجات کا کفیل نہیں ہو سکتا لہٰذا اب شادی کیسے ہو سکتی ہے۔ گویا وہ نامراد میرے جہیز کی ہوس میں منہ کھولے بیٹھا تھا۔ بہت دُور اندیش واقع ہوا تھا۔"

سیوین نے کرب سے کہا۔ "اوخدا! ایسی پری پیکر کی قربت تو بجائے خود ایک امیری ہے۔ وہ عشق نہیں تھا، عشق میں عاقبت کی پروا کسے ہوتی ہے۔ خیر، اور آپ کے عشق کا دوسرا شعلہ؟ آپ کا عطارد؟ کیا وہ بھی دُور اندیش تھا؟"

"نہیں، اب میں دولت مند ہوں۔ چچا کے مرنے کے بعد مجھے بہت کچھ ورثے میں ملا ہے۔ میرے سورما کا دل اور اس کی شمشیر چھ مہینے تک میری قدم بوسی کرتے رہے لیکن آہ کیا کہوں۔ جواں مرد سپاہی ایسے نہیں ہوا کرتے، اس نے یکایک حُسن کا معیار بدل لیا۔ ذرا اس کا عذر ملاحظہ فرمایئے اور میری دردمندی کا خیال کیجیے، اس نے مجھے لکھا کہ رنگوں اور زاویوں کے بارے میں میرے خیالات کچھ بدل گئے ہیں۔ گویا اب تک وہ اندھا تھا، کسی تو وارد نے اسے بصارت بخشی اور اسے نیلی آنکھوں کے بجائے بھوری آنکھیں اچھی لگنے لگیں۔"

سیوین نے کسی قدر جھجکتے ہوئے کہا۔ "بخدا یہ ممکن ہے معزز خاتون۔ ذرا مجھے دیکھیے، اب سے پہلے مجھے بھورا رنگ دنیا کے تمام رنگوں سے دل کش معلوم ہوتا تھا مگر اب مجھے اپنی پسند میں بھی تبدیلی محسوس ہو رہی ہے۔ لگتا ہے، اب مجھے نیلے رنگ کی قسم کھانی پڑے گی۔"

"کیا آپ اسی بھورے رنگ کا ذکر کر رہے ہیں جس کی خاطر آپ ایک گھنٹے پہلے جان دینے کو تیار تھے؟"

"ہاں! اتفاق سے میں ایک فن کار ہوں، شعر کہتا ہوں، جس بے رحم عورت کی خاطر میں آج جان دینے والا تھا، اس کی صورت میں مجھے تمام محاسن، تمام خوبیاں نظر آتی تھیں۔ میں نے اس کی تعریف میں قصیدے لکھ لکھ کے گائے تھے لیکن اب مجھے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ یہ محض میری گم راہی تھی۔ میں گاؤں کا رہنے والا ہوں، شہر سے مجھے نفرت تھی مگر اب مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو رہا ہے، میں اسے تمام عورتوں سے بڑھ کر حسین سمجھتا تھا، اس لیے کہ میں نے آپ کو نہیں دیکھا تھا۔"

خاتون کی جانب سے نفرت آمیز جواب ملا "محترم شاعر! کیا خوب! آپ بھی اپنے ہم قبیل، ہم جنسوں کی طرح پل پل بدلنے والے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کو بھورے رنگ کی پرستش کا دعوا تھا، اس کے لیے جان دینے کو تیار تھے۔ بہ مشکل ایک گھنٹہ گزرا ہو گا کہ آپ کو نیلا رنگ موہ لیتا ہے۔ شاید آپ نیلے رنگ کے لیے بھی جان دینے کو تیار ہو جائیں؟"

سیوین نے کہا۔ "میں نیلے رنگ کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں، یہ نیلی آنکھیں مجھے التفات کی نظر سے دیکھیں تو یہی زندگی جنّت ہو سکتی ہے۔"

خاتون طنزاً ہنس دی۔ "جناب! یقین مانیے، نیلا رنگ بھی مہربان نہیں ہو سکتا۔ آپ شاعر لوگ سمندر کو نیلا کہتے ہیں لیکن اس کی لہریں غرق کر دیتی ہیں۔ آسمان نیل گوں ہے لیکن اس کی بجلیاں سب کچھ تاراج کر دیتی ہیں۔ اور ابھی میں آپ کو دکھا دوں گی کہ نیلی آنکھیں پستول کا نشانہ بھی لگا سکتی ہیں۔"

سیوین نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔ "آپ کو شاید یاد نہیں کہ پستول اندھیرے میں چلانا ہو گا۔"

خاتون کے لہجے میں جوش بھرا ہوا تھا۔ "میں بہت خوش ہوں کہ آپ میرے مقابل آ گئے ہیں۔ آپ کو مارنے سے مجھے مسرّت حاصل ہو گی۔"

سیوین نے کہا۔ "اوہ، اب میری سمجھ میں آیا کہ آپ کے چاہنے والوں نے کیوں آپ سے بے اعتنائی کی۔ محترمہ! یہ برہم مزاجی نیلی آنکھوں کو زیبا نہیں، آپ بہت بے رحم ہیں لیکن آپ کے عطارد کا دل، معلوم ہوتا ہے، شعریت سے بالکل مبرّا تھا، مہتاب میں آپ کے حُسن کی زیبائی و رعنائی وہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ان نیلی آنکھوں میں غصّہ چمکتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آسمان کی نیل گوں گہرائیوں کے تلاطم میں کہیں آفتاب شعلہ فگن ہے۔ پھر اس پر بادل گھر آتے ہیں اور کس ناز سے بجلیاں چمکتی ہیں پھر شاید چند بوندیں بھی ٹپک پڑتی ہیں اور پھر سورج اپنا رُخِ تاباں بے نقاب کرتا ہے۔ جس شخص نے اس روح افزا نظارے کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں، وہ حُسن کی کیا قدر کر سکتا ہے! لیکن اگر

میں آج رات زندہ بچ جاؤں اور آپ پر شعر کہوں تو جو بدنصیب آپ کے ساتھ بے وفائی کر گئے ہیں' وہ کفِ افسوس ملیں گے۔ آپ کو فردوس کی پُرفضا گل گشت میں حسرت ہو گی کہ اے کاش میں اس بے چارے شاعر کی پرستش قبول کر لیتی اور زندہ رہتی تو اس وقت شہرۂ آفاق ہوتی۔"

خاتون اس کے چہرے کا نہایت غور سے مطالعہ کرتی رہی۔ آخر بولی "سبحان اللہ! کیا فصاحت ہے۔ کیا شاعر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ذرا یہ بتایئے' کوئی شخص آپ کی نظمیں شائع کرنا بھی گوارا کرتا ہے؟"

سیوین نے فخر و غرور سے کہا۔ "میرا نام ایڈمنڈ سیوین ہے۔"

"کون ایڈمنڈ سیوین؟" عورت چونکی۔ "وہی مان کا ماٹو کا رہنے والا؟"

شاعر نے کہا۔ "جی ہاں' میں وہی ہوں۔ شاید آپ نے میری نظمیں پڑھی ہوں۔ ہجر کی ایک صدی' شجرِ بے ثمر میری مقبول ترین نظمیں ہیں۔"

"میں نے آپ کا کلام تو کبھی نہیں پڑھا! ہاں' شاعر سیوین کا نام ضرور سنا ہے۔ مجھے بتایئے۔ آپ کی محبوبہ کون ہے؟ کیا اس بھوری آنکھوں والی کا نام ذوبایے تو نہیں؟"

"ہاں' ہاں مگر آپ اسے کیسے جانتی ہیں؟"

"میرا کپتان' میرا خداوند' میرا عطارد کا ماٹو میں اسی پر تو دیوانہ وار فگار ہو چکا ہے۔ مجھے اس نے خط میں لکھا تھا کہ وہ پہلے سیوین نامی ایک دیوانے شاعر کی دل دادہ تھی لیکن اب وہ اس پر ایک جنگ جو' بہادر سپاہی کو ترجیح دیتی ہے۔ میرے عطارد کو خط لکھنے کا بہت شوق ہے' نہایت تفصیل سے خط لکھا کرتا تھا۔"

غصے سے سیوین کا چہرہ تمتما اٹھا اور وہ بے تاب ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر وہ رک کر بولا۔ "تو گویا آپ ہی وہ معزز خاتون ہیں جس نے بے دردی سے میری مسرت' میری راحت مجھ سے چھنوا دی' اگر آپ اپنے جاں سپار' اپنے کماں دار کو اپنے پاس سنبھال کر رکھتیں تو میں اپنی زندگی شادماں گزارتا۔ میں ایک ضروری کام کے لیے شہر آیا تھا' مجھے کیا معلوم تھا کہ میری غیر حاضری میں میری دولت کوئی لٹیرا لوٹ لے جائے گا۔"

وہ ٹہلتا ہوا کمرے کی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک چلا گیا۔ وہاں سے مڑ کر اس نے اپنی نظریں خاتون کے چہرے پر جما دیں۔ گرمیٔ تقریر سے خاتون کے چہرے پر سرخی جھلک رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں ایک نور تھا' اس کے حسن کا طلسم پہلے سے بھی زیادہ ہوش رُبا ہو گیا تھا' شاعر کی اضطراب آمیز نگاہوں نے اس کی پلکیں انکسار سے جھکا دیں۔ شاعر آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور پیکرِ التجا ہو کر بولا۔ "سنیے' کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اپنے گوہر ناشناس جاں باز کو بھلا دیں اور میں اپنی ستم گر' وفا ناآشنا کو بھول جاؤں اور ......"

"اور کیا؟"

"اور ہم دونوں ایک دوسرے کے ہو جائیں؟"

خاتون نے ایک قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستی رہی' وہ اتنی دیر تک ہنسی کہ سیوین توہین سی محسوس کرنے لگا۔ عورت بولی۔ "معزز شاعر! مجھ سے آپ کے عشق کی پائداری کو تو نہیں سراہا جا سکتا البتہ میں آپ کی جدتِ طبع کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتی' افسوس کہ میں آپ کی یہ دانش مندانہ تجویز قبول نہیں کر سکتی۔ میں نے عشقِ صادق کی معرفت الفاظ سے کرنی چھوڑ دی ہے۔ جو مجھ سے شادی کرنا چاہے' اسے کچھ کر کے بتانا پڑے گا۔ میں اپنا دل کسی ایسے آدمی کو نہیں دے سکتی جو آج تو نیلی آنکھوں پر مرتا ہے پھر قوسِ قزح کے ساتوں رنگ باری باری اسے اپنی طرف مائل کر لیتے ہیں۔ مجھ سے ایسی حماقت نہیں ہو سکتی اور چوں کہ ایسے کسی شخص کا ملنا ناممکن ہے اس لیے......"

اتنے میں دروازہ کھلا اور ریول اندر داخل ہوا۔ دونوں کو بے نقاب دیکھ کر وہ چونکا اور کسی قدر درشتی سے کہنے لگا۔ "یہ سخت بے قاعدگی ہے' آپ دونوں از راہِ نوازش نقاب پہن لیجیے۔"

خاتون نے کہا۔ "اب کیا ہے؟ اب تو ہم نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا ہے۔ ریول! تمھیں جو کچھ کہنا ہے' جلدی کرو۔ یہ صاحب تو ایسے خشک گفتار ہیں جیسے کوئی واعظ ہوں' ویسے کہنے کو یہ شاعر ہیں۔ مجھے شاعروں سے کوئی رغبت

نہیں۔ میں شاعروں کو بھی گولی مار سکتی ہوں۔"

یول نے ایک تھیلی آگے بڑھا کر کہا۔ "اس میں کپڑے کی بہت سی چھوٹی بڑی کترنیں ہیں۔ آپ دونوں ایک ایک کترن نکال لیجیے۔ جس کے حصے میں چھوٹی کترن آئے گی' اسے شیر بننا پڑے گا۔"

خاتون نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر کپڑے کا ایک ٹکڑا نکال لیا۔ سیوین نے بھی اپنی قسمت آزمائی۔ دونوں کترنیں ایک ساتھ رکھ کر ناپی گئیں۔ خاتون پکار اٹھی۔ "میں شکاری ہوں۔"

سیوین نے کہا۔ "اور میں شیر ہوں' دیکھیے محترمہ! گولی بالکل سیدھی چلائیے گا۔ اس طرح قصہ جلد ختم ہو جائے گا۔"

یول نے کہا۔ "یہ دیکھیے۔ یہ گھنٹی ہے' اسے اپنے گلے میں ڈال لیجیے۔ اور ہلا کر دیکھ لیجیے' ٹھیک بجتی ہے یا نہیں۔ ٹھیک۔ اور یہ ہے پستول۔ اس میں کسی طرح کا نقص نہیں ہے۔ سیوین صاحب! آپ اس دیوار کے سامنے ہی رہیے اور جس وقت موسیقی بند ہو جائے' آپ دو قدم چلیے گا اور گھنٹی بجتے دیجیے گا۔" عورت سے اس نے کہا "آپ جس وقت گھنٹی کی آواز سنیں' فوراً پستول چلا دیں۔ لیجیے' آداب عرض۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ خدا کرے' آپ کا سفر جلد طے ہو جائے اور آپ کی منزل خوش گوار و دل پذیر ہو۔ سیوین صاحب! آپ کو کس طرح کی موسیقی چاہیے؟"

سیوین نے کہا۔ "کوئی دردناک سا سُر بجاؤ جس میں امیدیں خاک میں مل جانے کی کیفیت ہو اور جس میں نیلی آنکھوں کی سفاکی ہو اور ایک درد بھرے دل کا نالہ ہو نیز ایک بے رحم شکاری کے شکار کی آہ و زاری ہو۔"

"محترمہ! جو انتقام آپ کو مردوں کی صنف سے لینا ہے' وہ مجھ اکیلے کی ذات سے لے لیجیے۔"

یول نے طاق پر رکھی ہوئی شمعیں بجھا دیں' انگیٹھی کی آگ کے سامنے لوہے کا ایک تختہ رکھ دیا پھر میز کا لیمپ اٹھا کر باہر چلا گیا۔

دروازہ بند ہو گیا تو کمرے میں بالکل اندھیرا تھا' ساتھ کے کمرے سے بربط اور رباب کی دردناک موسیقی نے ماحول میں ایک بے تابی پیدا کر دی۔ تین منٹ تک یہی حالت رہی۔ اس کے بعد موسیقی بند ہو گئی۔ پھر محیط تاریکی اور خاموشی میں گھنٹی کی تھرتھری آواز بالکل صاف سنائی دی۔ پستول کی ایک گولی چل گئی۔

گھنٹی دوبارہ بجی۔ ایک اور گولی چلائی گئی۔ پھر یول لیمپ ہاتھ میں اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ پستول خاتون کے ہاتھ میں تھا' اس کی نال سے دھواں نکل رہا تھا۔ سیوین ویسے کا ویسا کھڑا تھا۔ یول نے دیوار پر نظر ڈال کر کہا۔ "گولیوں کے نشان کہاں ہیں؟ وہ ہیں' وہ دو سوراخ۔ خاتون! آپ کا نشانہ بہت غلط تھا۔ اب سیوین صاحب! آپ گھنٹی خاتون کو دے دیجیے میں پستول ابھی آپ کو بھر کے لا دیتا ہوں۔"

یول کونے میں میز کے پاس کھڑے ہو کر پستول بھرنے لگا۔

شاعر نے کہا۔ "محترمہ! آپ نے پستول بہت اونچا چلایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے مگر یاد رکھیے' میرے دل میں اتنا رحم نہیں ہے۔ میری ایک نہ ایک گولی ضرور مہلک ہو گی۔"

خاتون نے کہا۔ "گرامی قدر شاعر! یہی تو میری تمنا ہے۔"

یول نے پستول بھر کر سیوین کو دے دیا اور عورت سے پوچھا۔ "آپ کو کس طرح کی موسیقی چاہیے؟"

جواب ملا۔ "کوئی بے پروا سی چیز بجاؤ۔ دردناک سُر مجھے نہیں بھاتے۔"

دروازہ بند ہو گیا اور ایک لمحے بعد تاریکی میں ایک ہنستا کھیلتا سُر سنائی دیا۔ آخر وہ بھی بند ہو گیا۔ ایک گھنٹی کی آواز آئی اور ایک گولی چلی۔

خاتون نے آواز دی۔ "محترم شاعر! پستول ذرا نیچے کر کے چلائیے۔"

شاعر نے کہا۔ "نیل گوں آنکھوں والی ماہ جبیں! خدا حافظ۔"

اندھیرے میں ایک ہنستی ہوئی آواز نے جواب دیا۔ "اچھا بے وفا شاعر! خدا حافظ۔"

پھر گھنٹی بجی، ایک فائر ہوا اور ایک چیخ سنائی دی پھر جیسے کوئی زمین پر گرا۔

پول روشنی لے کے اندر آگیا۔ خاتون اپنی جگہ کھڑی تھی۔ سیوین کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ فرش پر پڑا تھا۔ خاتون نے ایک چیخ ماری اور گرتی پڑتی سیوین کے پاس پہنچ کر زمین پر بیٹھ گئی اور چلا چلا کر کہنے لگی۔ "میرے شاعر! میرے پیارے شاعر! آہ، تو نے اپنے آپ کو کیوں مار ڈالا۔ ہائے کس انداز سے تو نے خدا حافظ کہا تھا اور میں نے یوں ہی تیرا مضحکہ اُڑا دیا تھا۔ میرے خوب صورت شاعر! تو کیوں مر گیا؟"

پول نے شبہے کی نظروں سے دیوار دیکھ کر کہا۔ "لیکن وہ مر کیسے سکتا ہے؟ کارتوس تو خالی ہے۔"

"کیا کہا تم نے؟"

"آپ کو یاد ہوگا، میں نے آپ سے ذکر کیا تھا کہ میں کبھی کبھی ایک خالی کارتوس بھر دیا کرتا ہوں۔ پہلا کارتوس جو چلایا گیا، اس کا نشان تو دیوار پر موجود ہے اس لیے دوسرا کارتوس خالی ہوگا۔ سیوین صاحب کو یہ معلوم نہیں تھا کہ کارتوس خالی ہے، یہ مر کیسے سکتے ہیں۔ یہ صرف بے ہوش ہو گئے ہیں۔" وہ ذرا توقف سے بولا۔ "بے ہوش بھی نہیں۔ دیکھیے ان کی آنکھیں کھل رہی ہیں؟"

سیوین نے آنکھیں کھول دیں۔ عورت پر عجیب سی کیفیت طاری تھی، وارفتگی اور شیدائیت کی کیفیت۔ سیوین عورت کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔ "تو گویا میں جنت میں پہنچ گیا ہوں۔ تم بھی یہاں ہو۔ اوہ خدا! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟"

عورت نے آہستہ سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور کھڑی ہو گئی "نہیں میرے شاعر! ہم ابھی پیرس ہی میں ہیں۔"

"پیرس میں؟ کیا کہا تم نے؟ یہ کیا واہیات صورت ہے؟" سیوین اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں نے اپنے دل پر پستول چلایا تھا۔ یہ دیکھو، بارود کا نشان اس صداقت کا شاہد ہے۔"

پول بولا۔ "وہ خالی کارتوس تھا جناب! آپ کو نئے سرے سے کھیل شروع کرنا پڑے گا۔ خاتون! اب آپ کے شکاری بننے کی باری ہے۔"

عورت نے کہا۔ "اب مجھ سے یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں تنگ آگئی ہوں۔ براہِ مہربانی ایک گاڑی منگوا دیجیے۔ مجھے آج ہی ورسیلز پہنچنا ہے۔"

پول نے کہا۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔ ابھی تو کھیل شروع ہوا ہے۔ دیکھیے، ایک دو گھونٹ سے آپ کا خون ابھی پھر گرم ہو جائے گا۔ یہ پی لیجیے۔"

"آپ مجھے فوراً گاڑی منگوا دیجیے، سن رہے ہیں آپ؟"

پول مایوس ہو کر کمرے سے چلا گیا۔ سیوین آہستہ آہستہ فرش سے اُٹھا۔ خاتون نے اس سے پوچھا۔ "میرے اچھے شاعر! مجھے ایک بات بتائیے، آپ نے مجھ پر گولی کیوں نہیں چلائی؟"

"تم میرے عشق کی سچائی کا ثبوت مانگ رہی تھیں نا۔ چناں چہ میں یہی کر سکتا تھا کہ تمھارے لیے اپنی جان کی نذر دوں۔ افسوس، یہ بھی نہ ہوا۔"

خاتون نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "یہ آپ کیا جانیں؟" پھر وہ خاموش ہو گئی اور تھوڑی دیر بعد گویا ہوئی۔ "میرا نام جولیانا ہے۔ میں ملکۂ عالیہ کے درباریوں میں سے ہوں۔ کیا آپ اتنی تکلیف گوارا کریں گے کہ کل دوپہر کے بعد ورسیلز آکر مجھ سے ملیں؟ میں آپ کے شعر آپ کی زبانی سنوں گی۔ اور پھر ..."

"پھر کیا؟"

"اور پھر میرے شاعر! ہم ستاروں ہی ستاروں کی باتیں کریں گے۔"

شاعر نے پوچھا۔ "ان دو نیلے ستاروں کی جو اس وقت مجھ پر چمک رہے ہیں؟"

عورت نے نوجوان کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر کہا۔ "یوں ہی سہی۔"





صاحبِ قلم، صاحبِ کمال گلِ زار کی طرف سے
ایک عورت کی داستان
اس شیشہ نفس کو موسموں کے پست و بلند سے نسبت نہیں تھی

سن سیٹ بلیوارڈ

پوسٹ مارٹم کے وقت بھی وہ وزننگ کارڈ لاش کی مٹھی میں بھنچا ہوا تھا۔

اس روز بھی چارو جی اپنے معمول کے مطابق صبح ساڑھے پانچ بجے اٹھ گئی تھیں لیکن معمول سے تھوڑی سی زیادہ اُتاؤلی تھیں۔ ہمیشہ ہی اچھی طرح تیار ہو کر بال کنگھی، ہلکا سا غازہ، تاکہ جلد پر جھریاں ہوتے ہوئے بھی بڑھاپے کے پھٹے ہوئے مسام نظر نہ آئیں۔ پوشاک تو ہمیشہ اُن کے مذاق اور سلیقے کا ثبوت دیتی تھی۔ ثروت سے ہمیشہ کہا کرتی تھیں۔ "دیکھو آج بھی لوگ ہمیں دیکھتے ہیں تو کن انکھیوں سے گھور گھور کر تے ہیں۔ اشارے کرتے ہیں کہ چارو تا جا رہی ہیں۔ خود کے لیے نہ سہی اپنے مداحوں کے لیے ہمیں صحیح سلیقے سے رہنا چاہیے۔"

ثروت اُن کا خانساماں تھا۔ اس روز صبح جب وہ چائے کی ٹرے لے کر ان کے سامنے گیا تو چارو جی آئینے کے سامنے کھڑی خود ہی سے کچھ بات کر رہی تھیں، ذرا سی جھینپ گئیں۔ ثروت مسکرا دیا۔ اس عمر میں بھی میڈم کی شرمانے کی ادا کمال تھی۔ اس ادا نے جوانی میں لاکھوں پر ستار جاں بحق کیے تھے۔ "ثروت! کوئی گوپال داس بشرا آنے والے ہیں ہم سے ملنے۔ ذرا چائے ناشتے کا انتظام کر لینا۔"

"کون ہیں؟" ذرا تامل سے ثروت نے پوچھا۔

"کوئی رائٹر ہیں۔ ہم پر کتاب لکھنا چاہتے ہیں۔ اُن کا خط آیا تھا۔"

اس روز چارو جی کی چال میں اُتساہ کچھ زیادہ تھا۔ فلم انڈسٹری سے ریٹائر ہونے کے اتنے سال بعد کسی کو تو اس تنہا جان کا خیال آیا۔ شروع شروع میں بہت جرنلسٹ آیا کرتے تھے اس دور دراز کے بنگلے پر۔ مہابلیشور روز روز کون آتا



گل زار کے لیے جناب احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں "مختصر افسانے کا بھی حسن ہے کہ بات مختصر ہو اور دل میں اتر جائے۔ گل زار نے مختصر افسانوں کا یہ بھید پالیا ہے۔ "دھواں" (گل زار کا افسانوی مجموعہ) میں ایسا ایسا افسانہ شامل ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد زندگی کے بعض اسرار کا انکشاف ہونے لگتا ہے۔ قاری گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہے اور جب افسانے کے تاثر یا سحر سے نکلتا ہے تو اپنے دل ودماغ میں ایک مثبت تبدیلی محسوس کرتا ہے۔ بڑے ادب کی بھی سب سے بڑی 'افادیت' ہے۔"

جناب گوپی چند نارنگ کی رائے میں "ہر جگہ گل زار نے کوئی نکتہ، کوئی رمز، کوئی اوکھی بات، کوئی بھید ایسا رکھ دیا ہے کہ تجربہ یا واقعہ یا کردار کہانی بن گیا ہے۔ گل زار کہیں یک سُرے نہیں ہوتے، ان کے یہاں زندگی کی سرگم ہے اور ہر سُر دوسرے سے الگ ہے۔ کوئی کہانی کسی دوسری کہانی کا ظل (سایہ) یا عکس نہیں۔ گل زار کی کہانیوں میں زندگی کی کتاب ہے۔"

جناب اشفاق احمد کا ارشاد ہے۔ "گل زار دراصل ایک افسانہ نگار نہیں، کُوزہ گر ہے۔ گل زار کی ذہنی اور فنی تربیت تو شاید دلی اور بمبئی میں ہوئی لیکن رُوحانی اور آسمانی پروگرامنگ کا ذمے دار 'دینا' (ضلع جہلم) ہے جس نے اس کے فن کو منفرد نوع کی جلا بخش کر گل زار سے مختص کردیا ہے۔ اس کوزہ گر کے پاس واردات اور کیفیات کا اتنا وسیع ذخیرہ موجود ہے کہ وہ کسی بھی جغرافیائی ماحول میں اپنے اس مواد سے نئی طرز کا گل زار سجا سکتا ہے اور راہ روکو آواز دیے بغیر روک کے باندھ بھی لیتا ہے۔ گل زار نے کبھی پلاٹ کا بھاری پتھر نہیں اٹھایا، نہ اپنی فلموں میں، نہ افسانوں میں۔ میرے خیال میں یہی اس کی کام یابی کا سربستہ راز ہے کہ سبھی لوگ اس کے کنکھا منزل میں آکے بیٹھنا یوں پسند کرتے ہیں کہ یہاں حیوں کی گمبھیرتا اور زندگی کی پیچیدگی نہیں ہوگی۔ صرف زندگی ہوگی، اپنے پورے پھیلاؤ کے ساتھ جس میں

ہے۔ اور چارو لتا بھی بہت سال اپنے "کم بیک" پر جیتی رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ یہ آمد و رفت کم ہوگئی۔ کچھ عمر رسیدہ کرداروں کے رول بھی پیش ہوئے انھیں۔ لیکن بوڑھوں کے رول چارو جی نے منظور نہیں کیے۔ آئینے کے سامنے کھڑی ہوکر ٹھوڑی اُونچی کرکے اکثر دیکھا تھا خود کو۔ گردن پر کوئی سلوٹ نہیں تھی! عمر کا کوئی نشان نظر نہ آیا۔ خود سے کچھ مکالمے بھی ہوئے۔ عکس نے کبھی نہ بتایا کہ "تمھاری عمر ہوگئی ہے۔" یہ عکس صرف فلموں میں بولتے ہیں۔

ہاں ڈاکٹر ساہنی نے ضرور کہا تھا پہلے ہارٹ ـــــ ہارٹ پروبلم کے بعد۔ "دیکھو، تمھارا دل اب اتنا سب نہیں سہ سکتا جتنا بوجھ اس پر ڈالتی ہو۔ کسی دن کھڑے کھڑے فیوز اُڑ جائے گا۔ "سنگھ صاحب ہوتے تو شاید......."

شووت نے خبر دی، 'مشرا جی آئے ہیں۔' "ایں؟ ـــــ ہاں ـــــ مشرا جی۔" انتظار کے باوجود چارو لتا نام سن کر چونک گئیں۔ "بٹھاؤ' نیچے ہال میں بٹھاؤ۔ صوفوں کے غلاف اُتار دیے نا؟"

"جی میڈم"

"اور شینڈلیرز؟ روشن کردیا؟"

شووت اپنے فرائض خوب سمجھتا تھا۔ وہ آج بھی میڈم کی دھاک جما کر رکھتا تھا لوگوں پر۔ کبھی کبھار کسی پرستار کا کوئی خط آجاتا تو وہ بازار میں دس جگہ ذکر کرتا۔

چارو جی نے نیک لس پہنتے پہنتے محسوس کیا کہ ان کی گردن کچھ ڈھیلی ہوگئی ہے۔ گلوبند ہوتا تو یہ کمی چھپ جاتی لیکن اسے بکے تو دو سال ہوگئے۔ تین ہزار کا لیا تھا کسی زمانے میں۔ اب پکا تیس ہزار کا۔ سنگھ صاحب ہوتے تو کبھی نہ بکنے دیتے۔

چارو لتا جب سیڑھیوں سے اُتریں تو بالکل فلم کا کردار لگ رہی تھیں۔ ابھی آواز آئے گی۔ "اسٹارٹ ساؤنڈ ـــــ کیمرا ـــــ"

سوال و جواب نہیں ہوں گے، صرف نظارہ ہوگا، صرف تماشا ہوگا۔ گل زار کے پلاٹ سادہ، نرمل، عام فہم اور سامنے والے گھر کے سے ہوتے ہیں لیکن اس کے گھر کے اندر کیا تماشا ہو رہا اور کیا ناٹک چل رہا ہے، اس کی خبر قاری کو نہیں ہوتی۔ جیسے جیسے وہ اپنی پسند کے متعلقہ دریچے کھولتا جاتا ہے، قاری پُر مگھم بات ایک ایک کر کے عیاں ہونے لگتی ہے لیکن ایک اوٹ پھر بھی باقی رہتی ہے جسے وہ قاری کے تخیل کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ یہی گل زار کے منفرد فن کی گھنڈی ہے۔ گل زار نے جہلم اور دنیا میں ایسے ایسے مناظر کا نظارہ کیا ہے جو زندگی کے طویل اتار چڑھاؤ میں اس کی روح کا حصہ بن گئے ہیں۔

فلمی دنیا کا گل زار جسے لوگ مانّتا (مان تا = عزت و مرتبت) دیتے ہیں، اصل میں بنیادی طور پر وہی کتھا کار ہے جو کھیت کی اونچی منڈیر پر بیٹھا شیشے کی چلکور سے اپنے اندر کی باتیں لوگوں پر جھلکا رہا ہے اور لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی من کی مگھم بات کیسے کر سکتا ہے، خیال کو وجود میں کیسے لا سکتا ہے، اور یہی تو کوزہ گر کا کمال ہے۔ وہ مٹی سے کوزے نہیں بناتا، التفات اور خیال سے ان کی تشکیل کرتا ہے۔

اور خود ہندوستان کے نام آور فلم ساز و ہدایت کار اور اردو کے صاحبِ خیال شاعر و ادیب، ہمہ جہت، ہمہ صفات، عالی جناب گل زار کا کیا کہنا ہے؟ اپنے افسانوی مجموعے ہندوستانی ایڈیشن 'دھواں' اور پاکستانی ایڈیشن 'دست خط' میں گل زار لکھتے ہیں کہ انھیں افسانوں کے دورے پڑتے تھے۔ کبھی لمبے سفر پہ نکلے تو کوئی افسانہ اپنی پوری تشکیل کے ساتھ سامنے آ گیا، کبھی گاہے بگاہے لکھے ڈائری دہراتے ہوئے صفحوں میں رکھا مل گیا، کچھ افسانے یوں ہوئے کہ پھوڑوں کی طرح نکلے۔ یہ حالات، ماحول اور سوسائٹی کے دیے ہوئے تھے۔ کبھی نظم کہہ کے خون تھوک لیا اور کبھی افسانے لکھ کے زخم پر پٹی باندھ لی مگر ایک بات ہے، نظم ہو یا افسانہ ان سے علاج نہیں ہوتا۔ یہ آہ بھی ہیں، چیخ بھی، دہائی بھی۔ یہ انسانی دردوں کا علاج نہیں۔ یہ صرف انسانی دردوں کو سبا کے رکھ دیتے ہیں تاکہ آنے والی صدیوں کے لیے سند رہے۔

شراجی ہال میں لگے ہوئے سنگِ مرمر کے پھول بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں پیڈ نما کاپی تھی، جس میں شاید کچھ نوٹ بھی کر لیا تھا۔ چارو جی کو دیکھ کر شراجی نے بڑے ادب سے نمسکار کیا۔

"تشریف رکھیے۔" شراجی صوفے پر باادب بیٹھ گئے۔ بڑا اثر پڑتا تھا چارو جی کی شخصیت کا۔ بہت دیر تک شراجی کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔ بھلے سے شورت چائے کی ٹرے لے کر آ گیا۔ دو طشتریوں میں کچھ میٹھا کچھ نمکین۔

چارو جی نے چائے بنائی۔ "میرا پتہ کہاں سے ملا؟"

"گوکل صاحب نے دیا۔ آپ کے منیجر ہیں نا بمبئی میں؟"

"ہوں ـــــ بہت اچھا انسان ہے گوکل۔ بہت سال میرا کام سنبھالا ہے اُس نے۔ اب بھی وہی دیکھ ریکھ کرتا ہے۔ چائے لیجیے۔"

پھر ایک وقفہ بیچ سے گزر گیا۔ چارو جی خود ہی بولنے لگیں ـــــ "میں بہت تنہائی پسند ہوں۔ زیادہ کام کرنا بھی پسند نہ تھا۔ اُس وقت بھی زیادہ فلمیں نہیں کیں جب دن رات پروڈیوسروں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ بس بھاگ کر یہیں آ چھپا کرتی تھی۔"

"میں آپ کا مکان دیکھ سکتا ہوں؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں! تشریف لائیے۔"

چارو جی انھیں ساتھ لے کر سنگِ مرمر کے بتوں کے پاس رک گئیں۔ "اٹلی سے لائی تھی یہ جوڑی، بڑی مشکل ہوئی تھی اسے صحیح سلامت یہاں لانے میں۔ کئی سال تو میرے بمبئی والے مکان میں رہی۔ آپ نے تو وہ نہیں دیکھا ہوگا؟"

"نہیں!" بڑا مختصر سا جواب تھا لیکن مسکراہٹ کافی لمبی تھی۔

برآمدے سے گزرتے ہوئے چارو جی نے بتایا۔ "بڑے شوق سے یہ مکان بنوایا تھا ہم نے۔ بگّو صاحب سے بڑے جھگڑے ہوا کرتے تھے تب۔ کبھی پتھر کے چناؤ پر، کبھی لکڑی کے انتخاب میں۔ یہ ٹائلیں، بگّو صاحب بنگلور سے لائے

قلبِ ماہیت

ایک بار میری زندگی میں ایسا دور آیا جب میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ اگر وہ تمام بلند مقاصد پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیں جن کا میں دل دادہ ہوں تو کیا مجھے بہت مسرت ہوگی؟ میری روح سے آواز آئی کہ ہرگز نہیں۔ اس بھیانک جواب کا مجھ پر بہت برا اثر پڑا۔ میں خودکشی کا ارادہ کرنے لگا۔ میں اس ہیجانی عالم میں اتفاق سے ورڈس ورتھ کا شعری مجموعہ میرے ہاتھ لگ گیا۔ اس کی نظمیں پڑھ کر زندگی پر پھر سے میرا ایمان قائم ہو گیا اور میں خودکشی سے بچ گیا۔

(جون اسٹورٹ مل)

کراچی سے سید محسن ہاشمی کا تعاون

تھے۔ مکان کا نام میں نے ایک انگریزی فلم سے رکھا تھا۔ سن سیٹ بولیوارڈ۔ اور یہ ...... یہ پنجرا۔ اس میں کبھی کوئی پرندہ نہیں رکھا ہم نے، پتہ نہیں کیوں اٹھا لائے تھے ایک روز وہ ......" اور زور زور سے ہنسنے لگیں جیسے کوئی سین کر رہی ہوں۔ ایک بار تو شوت نے بھی باہر جھانک کر دیکھا۔ اس طرح ہنستے تو کبھی نہیں دیکھا تھا میڈم کو۔ ہاں، وہ زمانہ تھا جب نور اور نیلا آ جایا کرتی تھیں، ان کی ہم عصر ہیروئنیں۔

چارو لتا سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ "بس یہی کمی، کبھی کو قید کر لو اس پنجرے میں ...... وہ کہتے۔ تو پھر وہ بھی سنگِ مرمر کا ہونا پڑے گا۔ سنگِ مرمر بہت پسند ہے مجھے۔ اس پر ننگے پیر چلتے ہوئے بہت اچھا لگتا ہے مجھے۔ سنگھ صاحب کو ...... یہ انھی کا پورٹریٹ ہے۔"

وہ قدِ آدم تصویر تھی سنگھ صاحب کی۔ اوپر کے برآمدے میں لگی ہوئی۔ دونوں طرف شمع دان۔ شوت نے شمعیں جلا دی تھیں۔ وہ جانتا تھا میڈم وہاں ضرور جائیں گی۔ چپ چاپ کچھ دیر ایک ٹک وہ سنگھ صاحب کا چہرہ دیکھتی رہیں پھر آہستہ سے لبریز آنکھیں پونچھیں اور سر جھکا کے مڑ گئیں۔

مشرا جی پیچھے پیچھے چل رہے تھے اور وہ کہہ رہی تھیں۔ "بڑی چھوٹی تھی ہماری شادی شدہ زندگی۔ صرف تین سال چار مہینے اور اٹھارہ دن۔" ایک بار پھر انھوں نے سسکی لی۔

شوت ہال سے ٹرے ہٹا چکا تھا۔

پان کے لیے ایک بار چارو جی نے آواز دی۔ جواب نہ پا کر بجھ گئیں، باہر ہو گلباغ میں۔ خاموشی کا وقفہ اب انھیں اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مڑ کر مشرا جی سے کہا۔ "آپ کو کچھ پوچھنا ہے؟"

"اس گھر کا رقبہ کتنا ہوگا؟"

چارو جی نے کچھ منجمد سی آنکھوں سے دیکھا مشرا جی کی طرف ...... "رقبہ؟"

اور "بلٹ اپ ایریا؟"

چارو جی کچھ بجھ سی گئیں۔ "گوئل کو معلوم ہوگا۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں گوئل صاحب سے معلوم کر لوں گا۔" مشرا جی کھڑے ہو گئے۔

چارو لتا بھی صوفے کے بازوؤں پر پورا زور دے کر کھڑی ہو گئیں۔ "آپ کو گوئل نے کس لیے بھیجا تھا؟"

"یہ مکان دیکھنے کے لیے۔ کہا تھا، شاید جلد ہی بیچنا پڑے، دیکھ کے رکھو۔ کوئی گاہک تیار ہو جائے تو ......"

"آپ کا نام؟" چارو لتا نے بڑی ترشی سے پوچھا۔

"دیپک مشرا۔ پراپرٹی بروکر ہوں۔ پراپرٹی بیچنے خریدنے کی دلالی کرتا ہوں ......" اس نے اپنا کارڈ سامنے کر دیا۔

اچانک ان کا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔ ایک بار چلّانا چاہا لیکن آواز نہیں نکلی، صرف ہاتھ کے جھٹکے سے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

بروکر نے صفائی دینے کی کوشش کی۔ "دیکھیے، گوئل صاحب نے آپ سے بات کرنے کے لیے منع کیا تھا۔ کہا تھا کہ شاید آپ کو ......"

"گیٹ آؤٹ ......" اس مرتبہ چارو لتا چلّائیں لیکن آواز میں ایک خرخراہٹ سی آ کے رہ گئی۔

بروکر گھبرا کے فوراً چل دیا۔

کارڈ ہاتھ میں لیے چارو لتا اُسے باہر جانے تک دیکھتی رہیں۔ مڑ کے سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اچانک وہ لڑکھڑائیں۔ دل کا دورہ پڑا اور ......

پوسٹ مارٹم کے وقت بھی وزٹنگ کارڈ لاش کی مٹھی میں بھنچا ہوا تھا۔



بمبئی کے فتنہ پرور دنوں کا ایک واقعہ
ایک فساد زدہ کی کہانی، اس کا سایہ اس کا دشمن ہو گیا تھا۔
گلبرزار کی ایک خارزار تحریر۔

خوف

خوف سے اس کی نسیں تن رہی تھیں اور بیٹھے بیٹھے گھٹنے یوں کانپ جاتے تھے جیسے مرگی پڑنے والی ہو۔

شہر میں دنگے چلتے چار دن ہو گئے تھے۔ کرفیو کچھ دیر کے لیے صبح کھلتا تھا، کچھ دیر کے لیے شام کو۔ کرفیو کھلتا تو کچھ لوگ جلدی جلدی روز مرہ کی ضرورت کا سامان خریدتے، کچھ لوگ جلدی جلدی مار دھاڑ کرتے، آگ لگاتے، چاقو چلاتے اور کچھ لاشیں گرا کر کرفیو شروع ہونے سے پہلے ہی اپنے گھروں میں آ کر بند ہو جاتے۔ بمبئی میں گرم گرم خبریں اور گرم گرم لہو مسلسل بہہ رہا تھا، لیکن ریڈیو اور ٹی وی باقاعدہ اناؤنس کر رہے تھے کہ شہر کی حالت قابو میں ہے اور حالات نارمل ہوتے جا رہے ہیں۔

حالات نارمل ثابت کرنے کے لیے کل سے لوکل ٹرینیں بھی دیر تک چل رہی تھیں۔ بیشتر ڈبے خالی تھے لیکن روشنیاں پٹڑیوں پر دوڑتی نظر آئیں تو چار دن کے منجمد اندھیرے میں ذرا جنبش ہوئی۔ ریلوے ٹریکس کے دونوں طرف کی بستیوں میں جو سناٹا پتھرا گیا تھا، وہ ٹرین گزرنے سے کچھ دیر کے لیے کھڑکھڑایا تو پھر سے حرکت کی امید بندھی۔ یاسین آواز بھی سنتا تھا اور اُٹھ کر دیکھتا بھی تھا کہ شاید گاڑی چلنے لگی ہے۔ کل پانچواں دن ہوا، وہ اپنے گھر سے غائب تھا۔ اب تو انتظار ختم ہو چکا ہو گا اور اس کی تلاش شروع ہو گئی ہو گی۔ دن ختم ہونے ہی والا تھا کہ یاسین کا صبر ٹوٹ گیا۔ شام کا کرفیو کھلتے ہی وہ اندھیری کے اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ پلیٹ فارم سنسان تھا لیکن انڈی کیٹر پر ٹرین کا وقت ٹمٹما رہا تھا۔

ٹرین بہت آہستہ سے اسٹیشن میں داخل ہوئی، روز مرہ کے اسٹائل سے نہیں۔ جیسے خفا ہو، یا ڈری ہوئی سہمی ہوئی۔ کچھ لوگ تھے بھی ٹرین میں۔ اِکا دُکا وہ فیصلہ نہیں

کرلیا کہ کس ڈبے میں داخل ہو۔ اکثریت تو ہندوؤں کی ہے نا۔ دو دو چار چار کے گچھوں میں کہیں کہیں گھسے ہوئے کھڑے تھے۔ وہ پلیٹ فارم پر رُکا رہا مگر جب گاڑی چلنے لگی تو ایک دم بھاگ کر چڑھ گیا۔ اس نے وہی ڈبا چُنا جس میں اور کوئی نہ ہو۔ بغور دیکھا' چاروں طرف کوئی نہیں تھا۔ پھر ڈبے کی آخری بینچ پر کونے والی سیٹ میں جاکر ڈوب گیا' جہاں سے وہ پورے ڈبے پر نظر رکھ سکے۔ ٹرین نے رفتار پکڑی تو اس کی سانس میں سانس آئی۔

اچانک ڈبے کے دوسرے کونے سے ایک مُنڈی نمودار ہوئی۔ یاسین کے تو ہوش اُڑ گئے۔ گھٹنوں میں بھرے مرگی دوڑ گئی۔ جھک کر سیٹ کے اتنے نیچے ہو گیا کہ اگر وہ اس طرف آئے تو فوراً" بینچ کے نیچے چھپ جائے یا تن کے سامنے کھڑا ہو جائے' پوزیشن لے لے۔ ڈبے کا دروازہ بھی دُور نہیں تھا۔ لیکن چلتی گاڑی آہستہ ہو بھی گئی تو وہ شخص..........

اچانک وہ شخص اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ کھڑے کھڑے ہی اُس نے چاروں طرف دیکھا لیکن اس کے چہرے پر ڈر کے آثار نہیں تھے۔ وہ یقیناً ہندو ہے۔ یاسین کا پہلا ری ایکشن یہی تھا۔ وہ ٹہلتا ہوا گاڑی کے پرلے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ ہوا سے اس کا مفلر پھٹے جھنڈے کی طرح لہرا رہا تھا۔ کچھ دیر وہ باہر جھانک کر دیکھتا رہا' پھر لگا کہ کسی چیز کے ساتھ زور آزمائی کر رہا ہے۔ یاسین جہاں بیٹھا تھا وہاں سے صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ کوئی چیز کھینچ رہا تھا۔ کبھی دباتا تھا' کبھی اُٹھاتا تھا' کبھی کھینچتا تھا۔ یاسین کو لگا' کچھ توڑ رہا ہے۔ اچانک ایک زنگ آلود دروازہ زور سے گھسٹا اور ایک پُر زور کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ بند ہو گیا۔ اچھا ہوا' یاسین کے منہ سے چیخ نہیں نکلی۔ لیکن اس آواز سے وہ شخص خود بھی چونک گیا تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور اس طرف کچھ زیادہ دیر تک دیکھتا رہا جہاں یاسین چھپا ہوا تھا۔ یاسین کو شک ہوا' کہیں دیکھ ہی تو نہیں لیا اس نے؟ یا آہٹ پا گیا ہو؟ اس شخص کی زور آزمائی نے یاسین کے کلیجے میں ایک اور وحشت بٹھا دی۔ اگر آمنا سامنا ہو جائے تو کیا وہ اس کا مقابلہ کر پائے گا؟

وہ شخص ٹہلتا ہوا دوسری طرف کے دروازے پر جاکر کھڑا ہو گیا۔ گاڑی جو گیشوری کا ایک سنسان اسٹیشن پھلانگ گئی۔ گاڑی رک جاتی تو شاید وہ اُتر ہی جاتا لیکن یہ تو کرفیو کا علاقہ تھا اس لیے گاڑی نہیں رُکی۔ کرفیو کا علاقہ ہی زیادہ محفوظ ہوتا۔ کم سے کم وہاں پولیس تو ہوتی اور اب تو ملٹری بھی بُلوائی جا چکی ہے۔ شہر میں فساد زدہ علاقوں میں ان کے ہرے خاکی چھتوں والے ٹرک گھومتے ہوئے نظر آجاتے اور ان ہی رنگ کی وردیاں پہنے فوجی اپنی بندوقوں' رائفلوں کی نالیاں باہر نکالے رکھتے۔ پولیس تو بیکار ہو گئی تھی۔ اب اس سے کوئی ڈرتا بھی نہیں تھا۔ ہجوم بے دھڑک پولیس پر پتھر اور سوڈا واٹر کی بوتلیں پھینکتا تھا' اور تیزاب بھرے بلب بھی۔ پولیس اگر آنسو گیس کے گولے بھی چھوڑتی تو ہجوم کے لوگ گیلے رومال سے اٹھا کر وہی پولیس پر واپس پھینک دیتے۔ "ساکی ناکا" میں جب بیکری جلی جس میں وہ کام کرتا تھا تو کیا کیا تھا پولیس نے؟ دور کھڑی تماشا دیکھتی رہی اور وہ پتلی سی گلیوں میں بچتے بھاگتے ان گیرجوں کی طرف دوڑے تھے جدھر ٹھوکی پیٹی' پچکی لوہ چھلی موٹروں کے ڈھانچے کھڑے رہتے تھے۔ جان بچا کر بھاگے تھے چھپنے کے لیے' آٹھ دس لوگ تھے وہ۔ بھلا ہو بھاؤ کا' بھاگتے بھاگتے اس کی کمر کا کچھا پکڑ کے چائے والے کے باکڑے میں کھینچ لیا۔ بھاؤ کو تو معلوم تھا کہ وہ مسلمان ہے۔ لیکن وہ تو ہندو ہے' وہ کیوں بھاگا؟ بھاؤ کہہ رہا تھا۔ "جب ہجوم کے سر پر خون چڑھا ہو تو وہ نام پوچھنے کے لیے نہیں رکتے۔ ان کی پیاس خون سے بجھتی ہے یا آگ سے۔ جلادو' ماردو' نیست و نابود کردو۔ ان کا غصہ تبھی ٹھنڈا ہوتا ہے جب سامنے کچھ نہ رہے۔"

دوسرے دروازے کی کھڑکھڑاہٹ نے اسے چونکا دیا۔ ڈبے کے پرلی طرف کے دونوں دروازے اس شخص نے بند کر دیے تھے اور دیر تک اس طرف دیکھتا رہا جس طرف یاسین چھپا ہوا تھا۔ خوف نے پھر اس کا سر اپنے شکنجے میں لے لیا۔ وہ آدمی دروازے کیوں بند کر رہا ہے ڈبے کے؟ کیا اسے مار کے اس کی خون میں لتھڑی لاش وہ اسی ڈبے میں چھوڑ کر اتر جائے گا اگلے اسٹیشن پر؟ ٹرین اب آہستہ ہو رہی تھی کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔ اس آدمی کے قدموں میں پہلے سے زیادہ خود اعتمادی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کی طرف آ رہا

تھا۔ یاسین کی سانس بھاری ہو گئی۔ وہ ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کی آمد محسوس کر رہا تھا۔ ڈر تھا' سانسیں گھٹا ہو رہی تھیں' تھوک نگلا نہیں جا رہا تھا۔ کہیں اسے چھینک' اچھو نہ ہو جائے' وہ کھانس نہ دے۔ ورنہ یہیں سیٹ کے نیچے پڑے پڑے............

گاڑی رکی۔ کوئی اسٹیشن آیا تھا۔ وہ آدمی آرام سے اس دروازے پر آکر کھڑا ہو گیا جس طرف پلیٹ فارم تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اس کی جیب میں تھا۔ جیب میں کوئی ہتھیار ہو گا' پستول یا چاقو؟ یاسین نے سوچا' بھاگ کے دوسری طرف کے دروازے سے باہر کود جائے' لیکن جہاں چھپا تھا' وہاں سے نکلتے نکلتے تو وہ آدمی اس کا پیٹ چاک کر دے گا۔ پیٹ ہی کیوں؟ گلا کاٹ دے گا تاکہ آواز بھی نہ نکلے۔ چور آنکھ سے اس نے جھانک کر دیکھا۔ وہ شخص باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر سناٹا تھا۔ کسی کے قدموں کی آواز بھی نہیں آئی۔ یاسین نے بہت چاہا کہ کوئی آجائے لیکن کیا پتہ کون آئے؟ ہندو؟ مسلمان؟ ایک اور ہندو سہی۔ شاید بھاؤ جیسا کوئی رحم دل ہو۔ چائے کے باڑے سے کیسے اپنے جنیو پہنا کر وہ اسے اپنی کھولی تک لے گیا تھا۔ چار دن تک رکھا۔ اس نے کہا تھا "میں مراٹھا ہوں یاسین! لیکن روز گوشت نہیں کھاتا۔ تم کہو تو لے آؤں۔ پتہ نہیں کیسا ملے۔ حلال ولال میں سمجھتا نہیں۔ اور باہر کی حالت یہ ہے کہ سبزیاں سڑ رہی ہیں اندھیری میں لیکن بیچنے والا کوئی نہیں۔ لوٹ لو تو جتنی چاہے لے جاؤ............"

اور ریڈیو بھی کہہ رہا تھا کہ شہر کے حالات آہستہ آہستہ نارمل ہو رہے ہیں' گاڑیاں چل رہی ہیں' کچھ علاقوں میں بسیں بھی جاری کر دی گئی ہیں۔ ان چار دنوں میں اسے گھر والوں کی بہت فکر ہوئی۔ گھر والے بھی اس کی فکر کرتے ہوں گے۔ اسے ایک ڈر تھا' کہیں فاطمہ اسے ڈھونڈنے کے لیے بیکری کے پتے پر نہ چلی جائے۔ جس کھولی میں' میں چھپا تھا' وہاں سے ریل کی پٹری نظر آتی تھی' گاڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں' لیکن بھاؤ نے اسے جانے نہیں دیا۔

گاڑی ایک دھچکے سے چلی اور یاسین کھولی سے ڈبے میں آگرا۔ وہ شخص بائیں ہاتھ سے راڈ پکڑے بڑی خود اعتمادی سے کھڑا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ ابھی تک جیب میں تھا۔ گاڑی تھوڑی دور تک سرکتی گھسٹتی چلتی رہی۔ یہ گاڑی رفتار کیوں نہیں پکڑ رہی؟ سگنل نہ ملنے کی تو کوئی وجہ نہیں ہو سکتی' پٹڑیوں پر ٹریفک ہی کہاں ہے؟ ابھی تک کوئی گاڑی دوسری طرف سے نہیں گزری۔ گاڑی بہت دیر تک گھسٹتی رہی' گھسٹتی رہی اور جہاں آکر رکی وہ سمندر کا پل تھا۔ نیچے سمندر کی کھاڑی تھی جہاں سے اکثر لاشیں نکلنے کی خبریں اخباروں میں چھپا کرتی تھیں۔

یاسین کا دم گھٹنے لگا۔ اس خوف میں سانس لینا مشکل تھا۔ وہ شخص جیب سے ہاتھ کیوں نہیں نکالتا؟ اس کی آنکھوں سے پتہ چلتا ہے کہ حملہ کرنے والا ہے۔ کیا ہو گا جب حملہ کرے گا؟ اسے باہر نکلنے کے لیے کہے گا؟ یا سر کے بالوں سے پکڑ کے گھسیٹ لے گا اور زپ سے چاقو اس کے گلے پر رکھ دے گا۔ کیا کرے گا وہ؟...... اور کچھ کرتا کیوں نہیں؟

اسی وقت اس شخص نے جیب سے ہاتھ نکالا اور پھر زور آزمائی کرنے لگا۔ وہ تیسرا دروازہ بھی بند کر رہا تھا اور نیچے کھاڑی تھی۔ کود جائے تو موت یقینی تھی۔ خوف اب حد تک پہنچ رہا تھا۔ گھٹا بند ہو رہی تھی۔

اچانک کود کر یاسین باہر نکل آیا۔ اس آدمی نے چونک کر دیکھا اور جیب میں ہاتھ ڈالا۔ یاسین میں دفعتہ "پتہ نہیں کہاں سے اتنی طاقت آگئی' اس نے "یا علی" کہہ کر اس آدمی کو ٹانگوں کے بیچ سے اٹھالیا اور باہر پھینک دیا۔ نیچے گرتے گرتے اُس کی چیخ سنائی دی۔ "اللہ۔"

یاسین کھڑا رہا۔ گاڑی چل دی۔ یاسین کو حیرت ہوئی' کیا مسلمان تھا وہ بھی؟ لیکن وہ خوف کے شکنجے سے چھوٹا تھا' جیسے موت کے منہ سے واپس آیا ہو۔

اس رات وہ فاطمہ سے کہہ رہا تھا۔ "اگر ایسا نہ ہوتا تو میں بھی مسلمان ہونے کا فوراً کیا ثبوت دیتا اسے؟"

صاحبِ نظر، صاحبِ دل قارئین کے لیے
اس شمارے کی خاص کہانی
دوسری عالمی جنگ، سنگاپور کا محاذ
ایک سپاہی کی کہانی، اُس نے دشمنوں کا ایک ہی رُوپ دیکھا تھا
اردو کے شگوفہ ساز، شگفتہ کار ادیب و شاعر سیّد ضمیر جعفری کے قلم سے

جراہ

دوسری جنگِ عظیم بڑی وسیع جنگ تھی۔ کئی کئی ہزار میل لمبے چوڑے محاذ دنیا بھر میں کھلے ہوئے تھے۔ ہم لوگ حیران تھے کہ اتنی وسیع جنگ لڑی کیسے جا رہی ہے اور لڑا کون رہا ہے؟ صف کے عام سپاہی کا محاذِ جنگ اس کے بالکل سامنے ہوتا ہے۔ اپنے سیکٹر سے الگ دائیں بائیں، آگے پیچھے کیا ہو رہا ہے؟ کل کیا ہوگا؟ سامنے کی کھاڑی عبور کرنے، دائیں بازو کی ٹیکری سَر کرنے کے بعد ہمیں کدھر جانا ہے اور ان کے سر ہو جانے سے جنگ کی عاقبت کو کیا فائدہ پہنچے گا؟ ہم کس کی کمک پر ہیں؟ ہماری کمک پر کون ہے؟ کوئی ہے تو کہاں ہے؟ ظاہر ہے کہ ان باتوں کا علم درجہ بہ درجہ اُوپر کے افسروں کو ہوتا ہے۔ مقام و محل کے مطابق جتنا جاننا چاہیے، اسے بس اتنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ چناں چہ کوئی جتنا اوپر ہوتا، اتنا ہی پیچھے وہ ہوتا اور اتنا ہی زیادہ باخبر ہوتا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جنگ میں دراصل پیچھے والے آگے والوں کی رہ نمائی کرتے ہیں اور یہ ٹھیک بھی ہے۔ آگے والے بندوق اُٹھا کر لڑیں یا ایشیا، یورپ، افریقہ کے نقشے سنبھالتے پھریں؟

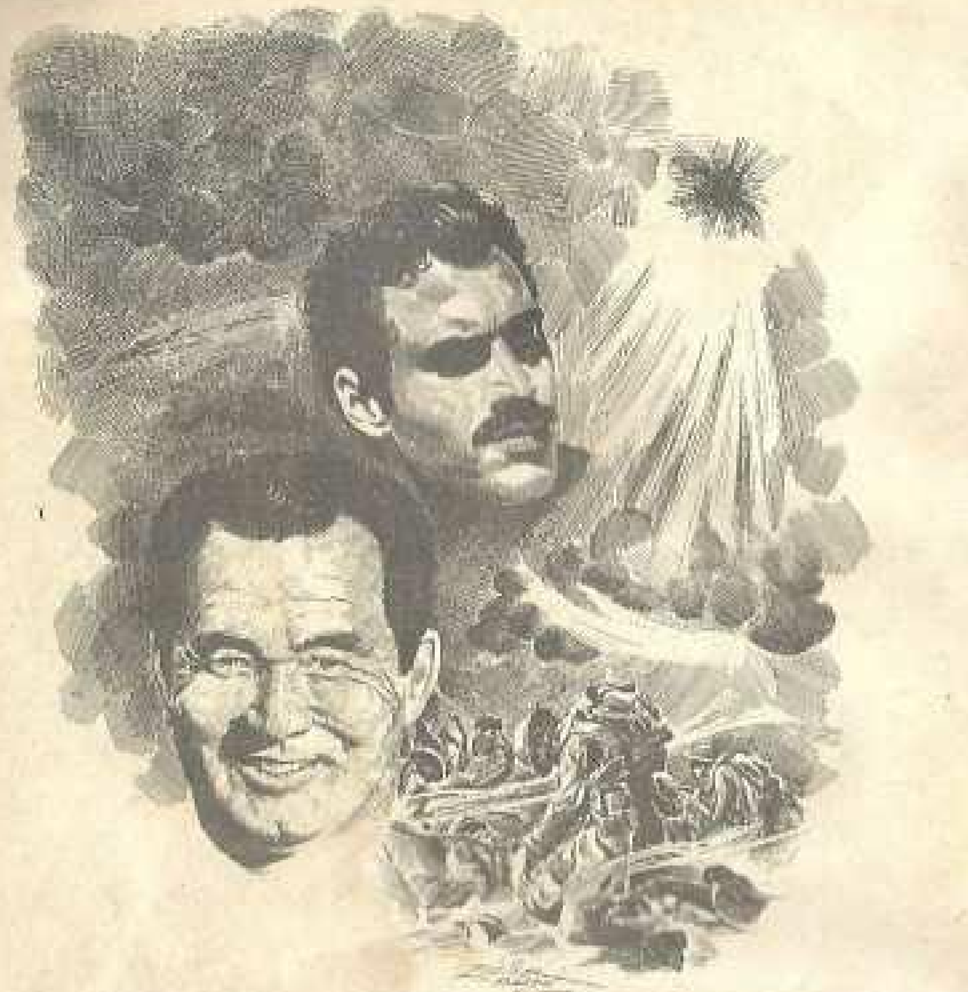
سنگاپور کی لڑائی بھی عجیب لڑائی تھی۔ ہماری پلٹن جزیرے میں زیرِ تعمیر ایک ہوائی اڈّے کی حفاظت پر متعین تھی۔ لڑائی کوئی پانچ سو میل دُور ملایا کے دوسرے کونے میں ہو رہی تھی۔ قیاس تھا کہ کچھ عرصے بعد ہمیں بھی محاذ پر جانا ہوگا مگر خبروں سے معلوم ہوا کہ محاذ خود ہماری طرف آ رہا ہے اور دو تین ہفتوں میں محاذ ہمارے سر پر تھا۔ ایک دن علی الصباح صوبے دار میجر صاحب نے حکم بھیجا کہ جوان مورچے چھوڑ کر بیرکوں میں واپس آ جائیں۔ سپہ سالار جنرل پرسیول نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہم حیران تھے کہ ہم نے تو اپنے ہوائی اڈّے سے ایک بھی جاپانی نہیں گزرنے دیا اور ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ بھی ہو گیا مگر ہمارے اختیار تو جنرل پرسیول کے حکم کے پابند تھے۔ یہ کوئی ہمارے گاؤں کا بلوا تو نہ تھا کہ ایک مرتبہ شروع ہو جائے تو بند ہی نہ ہو سکے۔

البتہ لڑائی بند ہوتے ہوتے میں خواہ مخواہ زخمی ہو گیا۔ قریب ہی ربڑ کا گنجان باغ تھا، سارا ملایا ہی ربڑ کا ایک گھنا باغ ہے۔ نہ جانے کہاں سے ایک گولی زنّاتی ہوئی آئی اور میرے دائیں پاؤں میں شگاف کرتی ہوئی نکل گئی۔ مجھے باقاعدہ زخمیوں کی طرح مورچے سے بیرک میں پہنچایا گیا۔

اب ہم اس انتظار میں تھے کہ جاپانی آئیں اور ہمیں قید کریں۔ یہ بڑا ہی کرب انگیز احساس تھا۔ جنگ میں حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں، آس پاس برستی موت میں بھی امید کی روشنی برابر جھلملاتی رہتی ہے۔ جب تک بندوق ہاتھ میں ہے، سپاہی اپنے آپ کو دنیا کی بلند ترین چوٹی پر محسوس کرتا ہے۔ دشمن کی قید، سخت اور بے میعاد، نامعلوم تاریکی کا ایک بے کراں سمندر تھی۔ اب ہم وطن اور عزیزوں سے دُور ہی نہ تھے، ان سے کٹ بھی گئے تھے۔

جنگ میں لاکھ صعوبتیں سہی، زندگی اور ہماہمی کا احساس برابر موجود رہتا تھا۔ سوائے ہوائی حملوں کے سوا جو بے شک سنگین ہوتے، زندگی کا دھارا رعنائی اور بانکپن سے بہتا تھا۔ دھاوا روز روز ہوتا بھی نہیں تھا۔ زیادہ وقت اقدام و دفاع کی منصوبہ بندی میں گزرتا۔ دونوں طرف فوجوں کے ٹڈی دل اس طرح پڑے رہتے کہ بعض راویوں کے بقول فوج زیادہ ہوتی تھی اور لڑائی کم۔

پھر لڑائی کے انتظامات کی طرح امن کے انتظامات بھی



نہایت عمدہ اور وسیع تھے۔ ملک ملک کی نعمتیں بہ افراط نصیب تھیں۔ جو چیزیں باہر دیکھنے کو نہ ملتیں، ہمیں ان کے انباروں کی وجہ سے باہر کی چیزیں دکھائی نہ دیتیں۔ مجھے یاد ہے، ہمارے قریب ہی گوالیار یا کسی اور ریاستی یونٹ کے ایک سردار صاحب فرنٹ لائن راشن کھا کھا کر اتنے موٹے ہو گئے تھے کہ اب فرنٹ لائن تک ان کا چل کر پہنچنا دشوار تھا۔

میرا پاؤں زخمی تھا۔ عام حالات میں مجھے انڈین ملٹری اسپتال میں داخل ہو جانا چاہیے تھا مگر اس افراتفری میں اسپتال کون جاتا۔ میں اپنی چوکی کے ہنس مکھ مدراسی نرسنگ آرڈرلی بنگ لم سے پٹی بندھوا کر ٹرک ہی میں پڑا رہا۔ ہمہ یاراں بہشت بنگ لم بذاتِ خود ایک دلچسپ نمونہ تھا۔ ہر وقت بشاش مسکراتا ہوا ملتا۔ خود جتنا سیاہ تھا، دانت اتنے ہی سفید تھے۔ جوان شفاخانے میں آتے تو اپنے معاشقوں کی رنگین کہانیاں بڑے دل کُشا انداز میں سناتا۔ اس کی اصل محبوبہ تو کہیں مالابار میں تھی مگر پچھلے دو تین برس وہ ایسے مقامات پر رہا تھا جہاں تامل یا تامل جیسے دراوڑ آباد تھے۔ چناں چہ جہاں جہاں وہ رہا، ایک آدھ محبوب اپنے پیچھے چھوڑ آیا۔ اب ان سب کے فوٹو سینے سے لگائے ہوئے تھا۔ میں جس وقت زخم کھا کر چوکی میں پہنچا، شدتِ درد سے کراہ رہا تھا۔ اس پر بنگ لم حسبِ معمول قہقہہ لگا کر بولا "ارے اتنا سا چوٹ پر چیختا ہے۔ ادھر دیکھے۔ ایک دل پر تم کو ٹکڑا زخم دکھاوے۔" اس نے بنیان اُتار کر جراحی کی میز پر رکھ دی۔ وہاں زخم تو خیر کہاں تھا البتہ میری طبیعت اس کی زندہ دلی سے بحال ہو گئی۔

جاپانیوں کے بارے میں مشہور تھا کہ آندھی کی طرح آتے ہیں اور بگولے کی طرح جاتے ہیں۔ قیاس تھا، آناً فاناً ہتھیار رکھوائیں گے اور اونٹوں کی قطار کی طرح ہمیں قیدی بنا کر کسی بندی خانے میں بند کر دیں گے مگر کئی روز تک

یکم جنوری، 1916 منگلا کے قریب ضلع جہلم کے چھوٹے سے گاؤں، چک عبدالخالق میں سیّد حیدر شاہ نامی، ایک نجیب الطرفین کے گھر حضرت قبلہ سیّد ضمیر حسین شاہ، ضمیر جعفری نے آنکھ کھولی۔ پردادا سلطان العارفین حضرت پیر سیّد محمد شاہ پوٹھوہار اور آزاد کشمیر کے مقبول صوفی اور پنجابی کے یگانۂ روزگار شاعر، صاحبِ سیف الملوک حضرت میاں محمد بخش کے ہم عصر تھے۔ فرش پر بچھے ہوئے ٹاٹ کے مدرسے میں ابتدائی تعلیم کا مرحلہ طے ہوا، پھر گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم اور گورنمنٹ کالج کیمبل پور سے میٹرک اور انٹر کی منزلیں سر کرتے ہوئے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ 1938 میں بی، اے کی سند حاصل کی۔ ساتویں جماعت ہی میں شعر و سخن کی کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں۔ ہر درس گاہ کے درون خانہ جریدے کے مدیر رہے۔ پنجاب یونی ورسٹی کے شعبۂ طلبہ کے ایک شعری مقابلے میں اپنی ایک نظم پر جسٹس سر شیخ عبدالقادر کے ہاتھوں، پہلا ادبی اعزاز، طلائی تمغہ حاصل کیا۔

تعلیمی سلسلے کے اختتام پر قلم ہی وسیلۂ رزق ٹھیرا۔ 35 روپے ماہانہ پر روزنامہ 'احسان' کے نائب مدیر کی حیثیت سے ملازمت شروع کی۔ اسی دوران اردو کے جلیل القدر ادیب چراغ حسن حسرت کے مقبول فکاہی رسالے 'شیرازہ' کی ادارت میں معاونت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ پھر کچھ عرصے جہلم، دلی اور شملے میں چھوٹی موٹی ہاتوگیری کے بعد برطانوی ہند فوج میں شامل ہوگئے۔ کوئی تین برس جنوب مشرقی ایشیا کے محاذ پر فوج کے تعلقاتِ عامّہ کے شعبے میں خدمات انجام دیں۔ فوج میں انھیں لاہور کے عہدساز مجلے "کارواں" کے مدیر کرنل مجید ملک، کرنل فیض احمد فیض، کیپٹن ن، م راشد اور لیفٹیننٹ کمانڈر حسن عسکری (ابن سعید) جیسے شاعروں اور ادیبوں کی رفاقت میں کام کرنے کا موقع ملا۔ دوسری عالمی جنگ سرد ہوجانے پر 1948 میں اپنے کیپٹن صاحب بہادر سیّد ضمیر جعفری کو آزاد وطن پاکستان آنے کی سعادت نصیب ہوئی اور انھیں کشمیر کی جنگِ آزادی کے محاذ اُوڑی کے مورچوں میں تعینات کردیا گیا۔ 1949 میں فوجی ملازمت ترک کرکے دوبارہ صحافت کے خارزار کا رُخ کیا کہ صحافت اور ادب سے تعلّق تو پہلی محبت والا تھا اور بہ قول کسے صحافت اور ادب تو جونک کے مانند ہے۔ روزنامہ غالب کے مدیر سہ دبیر مقرّر ہوئے۔ غالب کی مجلسِ ادارت میں مولانا نصراللہ خاں عزیز، شوکت تھانوی اور افضل صدیقی (بعد میں کراچی کے روزنامہ امن کے بانی مدیر) بھی شریک تھے۔ غالب جلد ہی دستِ وقت کے ہاتھوں مغلوب ہوگیا۔ پھر اپنے دو عسکری دوستوں کرنل مسعود اور کیپٹن

کوئی واقعہ رُونما نہیں ہوا۔ پر اس کا ابتدائی سنّاٹا ذرا ٹوٹا تو لنگر گپ کے بادشاہوں نے پھل جھڑیاں چھوڑنا شروع کردیں۔ جنگ لم کا خیال تھا کہ جاپانی ہماری یونٹ بھول ہی گئے ہیں۔

حوال دار کلرک منشی خاں جنگ چھڑنے سے پہلے کچھ روز کسی پرائمری مدرسے کے مدّرس رہ چکے تھے۔ اخبار بینی اور ریڈیو سننے کا خاص چسکا تھا۔ قائدینِ جنگ کے بیانات کا ایک ایک لفظ انھیں یاد تھا اور قائدینِ جنگ خدا معلوم کیا کہتے تھے کہ حوال دار منشی خاں پر ایک قسم کے فلسفے کی بڑی موٹی تہہ جم گئی تھی۔ بہرحال ہماری چوکڑی میں سب سے زیادہ باخبر آدمی وہی تھے اور وہ کہتے۔ "میں تو سمجھتا ہوں کہ جاپانی ہمیں قید کرنے سے انکار کردیں گے۔ قید ہونے والی فوج گنتی میں فاتح فوج سے کہیں زیادہ ہے۔ اتنی بڑی فوج کے ساتھ لڑا تو جاسکتا ہے' اسے قید نہیں کیا جاسکتا۔"

نائک پایندہ خاں ان پُرجوش جاں فروشوں میں سے تھے جو میدانِ کارزار میں اس بات کی تمنّا کرتے ہیں کہ اے کاش، کمانڈران چیف کی جگہ پورے آرمی گروپ کی کمان ان کے ہاتھ میں ہوتی اور وہ دنیا پر ایک مرتبہ روشن کرسکتے کہ لڑائی کا بانکپن کیا ہوتا ہے! چناں چہ ان کی رائے میں یہ قید کا نہیں یلغار کا محل تھا۔ ہتھیار تو جاپان میں جا کر بھی ڈالے جاسکتے تھے۔

کوارٹر ماسٹر حوال دار تراب علی ایک اور مزے کے آدمی تھے۔ وہ کوارٹر ماسٹر اسٹور میں اناناس کے مربّے کی خوشبو سونگھتے سونگھتے کچھ شاعر سے بن گئے تھے۔ کوئی بات ہورہی ہو' وہ بیچ میں یک بارگی ہاتھ کانوں پر رکھ کر۔ آواز بلند "سیف الملوک" کا یہ شعر الاپ دیتے۔

آج دی رات وصال والی جھلّے کی جاناں کیہڑا رنگ ہوسی
میلے فیر محمّد قسمتاں دے، کتھے شمع کتھے پتنگ ہوسی
(آج کی رات وصل کی رات ہے۔ کیا معلوم کل کیا رنگ ہو۔

انعام اللّٰہ کے اشتراک سے پنڈی کا پہلا روزنامہ 'بادِ شمال' جاری کیا۔ ترتیب و تدوین، پیش کش کے منفرد انداز اور اپنی خاص روش کی بنیاد پر ناقدوں نے 'بادِ شمال' کو ایک نئی روایت کا مظہر قرار دیا مگر شوق و جرأت، کاوش و محنت اور ہنر و تدبیر کی کرشمہ کاری کو مال و زر کا ایک گداز بھی چاہیے۔ ایک ہی سال میں بادِ شمال، بادِ مخالف کی زد پہ آگیا۔ کیپٹن صاحب قبلہ ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ اپنے گاؤں واپس چلے گئے اور 1915 میں جانے کیا سودا سمایا کہ اپنے علاقے کی دیہی نشست سے بہ طورِ آزاد امیدوار صوبائی اسمبلی کا انتخابی معرکہ سر کرنے کی ٹھان لی اور آئینے کو شرم سار کیا۔ اخبار کی بندش، انتخاب میں پسپائی نے رہے سہے خانگی معاشی معاملات اور دگرگوں کردیے۔ کیپٹن کے پاس کوئی چارہ نہ رہا کہ دوبارہ فوج کی بیرکوں میں پناہ لے۔

فوجی ملازمت کے اس دوسرے دور میں پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول اور جنرل ہیڈ کوارٹر میں شعبۂ تعلقاتِ عامّہ سے وابستگی رہی۔ پہلے ایوب خانی مارشل لا کے دوران میجر ضیاالحق (بعد میں مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور صدر پاکستان) کے ساتھ ایک بریگیڈ میں اور کچھ عرصے، 1959 میں لاہور مارشل لا ہیڈ کوارٹر میں جنرل بختیار رانا کے پریس آفیسر کی حیثیت سے ذمّے داریاں نبھائیں۔ وہیں سے ڈیپوٹیشن پر محکمہ دیہات سدھار کے ایڈیشنل ڈائرکٹر جنرل ہو کے کراچی وارد ہوئے۔ اس محکمے میں ممتاز مفتی، ابنِ انشا، احمد بشیر جیسے اہلِ قلم ان کے رفقائے کار تھے۔

مخدومی شاہ صاحب، ضمیر جعفری کے ایک شیدائی، نوجوان ادیب برادرم عطاالله عالی نے اپنے پیر و مرشد کے کارزارِ زندگی کے احوال مرتّب کیے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ سطور عالی صاحب کی اعانت سے ممکن ہوپائی ہیں۔ عطاالله عالی کا فرمودہ ہے کہ ضمیر جعفری اپنے ضمیر و خمیر سے نہ شہر کے آدمی ہیں نہ ملازمت سے ان کی طبعِ شاہانہ و خسروانہ کو کوئی نسبت ہے۔ وہ کتنے ہی شہروں میں رہے ہوں، ان کی روح ہمیشہ کھلے میدانوں، سبزہ زاروں، کوہ ساروں اور اپنے گاؤں کی مختصر گلیوں اور گاؤں کے کچے پکّے مکانوں میں بھٹکتی رہی ہے۔ اپنی عم زاد سے پہلی شادی لڑکپن میں ہوئی تھی۔ زن و شو شادی کے تلخ و شیریں سے نا آشنا تھے۔ یہ شادی دو چار ماہ سے زیادہ نہ ٹک سکی۔ دوسری شادی گجرات کے ایک معزز سیّد گھرانے، اردو کے جیّد ناقد، ممتاز شاعر سیّد عابد علی عابد کے عزیزوں میں ہوئی۔ اس وقوعے یا واردہ، میں کچھ کیوپڈ کو بھی دخل تھا۔ بہ قول عطاالله عالی، قضا و قدر کے ارادوں سے کون واقف ہے۔ شاہ صاحب کو اپنے دل بر و دل دار سے رفاقت کی مہلت بہت کم

⟵

دوبارہ اس طرح کی یک جائی مقدّر کی بات ہے۔ کون جانے شمع کہاں ہوگی اور پروانہ کہاں۔ کہاں میاں محمد صاحب)

صوبے دار میجر صاحب حسبِ معمول مصروف ترین آدمی تھے بلکہ جب سے لڑائی بند ہوئی تھی' ان کی مصروفیت اور فکر مندی کے درجنوں نئے دروازے کھل گئے تھے۔ ڈسپلن اور ٹرن آؤٹ پر پہلے سے زیادہ زور تھا۔ جوانوں کے حوصلے، نظم و ضبط اور آسائش سے متعلق چھوٹی چھوٹی جزئیات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ صبح و شام ہدایات کا سلسلہ جاری رہتا۔ وردی کا پیتل پہلے سے زیادہ چمک رہا تھا۔ ملایا کی عظیم اتحادی فوج ہتھیار ڈال چکی تھی۔ دنیا کا سیاسی نقشہ کچھ سے کچھ ہو رہا تھا۔ جنوب مشرق ایشیا میں سلطنتِ برطانیہ کا نہ غروب ہونے والا آفتاب ڈوب گیا تھا۔ جاپان کا چڑھتا سورج نصف النہار پر آگیا تھا مگر صوبے دار میجر صاحب کو ان حالات میں بھی اگر کوئی لگن تھی تو صرف یہ کہ قید میں بھی یونٹ کی روایات اور وقار کا پرچم کیوں کر بلند رکھا جائے اور جوانوں کی آسائش کا زیادہ سے زیادہ انتظام کیسے کیا جائے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایسے کٹھن حالات میں ان کی مخلصانہ قیادت اور عزم و ثبات کی ذاتی مثال نے جوانوں کا حوصلہ بڑی حد تک بحال رکھا۔

اودھر یونٹ میں سرکاری 'نیم سرکاری 'پکّی پکّی خبروں' افواہوں 'تبصروں' قیاس آرائیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ "آج بریگیڈ کمانڈر صاحب یونٹ میں آئے تھے۔ دو جاپانی افسر ساتھ تھے۔ تین گھنٹے کانفرنس ہوئی۔ جب وہ آئے تو ہمارے کرنل صاحب نے انھیں سلیوٹ کیا۔ جب وہ گئے تو ہمارے کرنل صاحب نے اسٹاف کار کا دروازہ کھولا۔ اسٹاف کار ہمارے بریگیڈ کی تھی مگر جھنڈا کوئی نیا سا تھا۔ جاتے وقت بریگیڈ کمانڈر نے کرنل صاحب سے ہاتھ ملاتے ہوئے گڈبائی کہا۔ جاپانی افسروں نے تھوڑا سا سر ہلایا۔ شاید مسکرائے بھی۔" "آج کرنل صاحب' ایڈجوٹنٹ اور کوارٹر ماسٹر سارا دن ہیڈ کوارٹر میں رہے۔" "آج دو جاپانی سارجنٹ کوارٹر ماسٹر

مل سکی۔ تیسری بیگم سے 1945 میں شادی ہوئی تھی۔ انھی سے دو بیٹے، ایک فوج میں کرنیل سیّد احتشام ضمیر، دوسرے امریکہ میں بس جانے والے سیّد امتنان ضمیر ہیں۔ شاہ صاحب اور بیگم صاحبہ اسلام آباد میں مقیم ہیں۔

ستمبر 1965 کی جنگ میں سیالکوٹ کے محاذ پر خدمت انجام دی۔ 1966 میں فوج سے سبک دوشی کے بعد سول ملازمتوں کا سلسلہ قسط وار کئی برس تک جاری رہا۔ کوئی 14 برس اسلام آباد کے ترقیاتی ادارے کے پہلے ڈائرکٹر تعلقاتِ عامہ رہے۔ گویا اُن کا شمار اِس شہرِ خواب کی پہلی اینٹ رکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ چند برس وفاقی وزارتِ اطلاعات کے نیشنل سینٹر میں ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل کے عہدے پر فائز رہے، کچھ عرصے ایک دوسری وزارت میں افغان مہاجرین کے مشیر، پھر اکادمی ادبیاتِ پاکستان کے جریدے 'ادبیات' کے مدیرِ اعلیٰ بھی رہے۔ 1988 میں یہی اُن کی آخری سرکاری ملازمت تھی۔ اِن دنوں اُردو کے فکاہی رسالے 'اردو پنچ' کی مجلسِ ادارت کے صدر نشیں اور ادبی رسالے 'چہار سُو' کے مدیرِ اعلیٰ ہیں۔ 1976 میں ادبی خدمات کے اعتراف میں تمغۂ قائدِاعظم، 1985 میں صدارتی تمغۂ حسنِ کارکردگی مل چکا ہے۔ شاہ صاحب کے کئی ملّی ترانے ریڈیو اور ٹیلی وژن کا اثاثہ ہیں۔ یہ منفرد اعزاز بھی اُنھیں حاصل ہے کہ افواجِ پاکستان کی کئی پلٹنیں اور کالم اُن کی ولولہ انگیز رجزوں پر مارچ کررہے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا، پاکستان ٹیلی وژن نے طویل دورانیے کا ایک مقبول اسٹیج شو 'آپ کا ضمیر' اُن کے نام سے منسوب کیا تھا اور انھی کی نظامت میں پیش کیا تھا۔ اُن کے گاؤں کو جرنیلی سڑک سے ملانے والی رابطہ سڑک، اِس صاحبِ سیف و قلم سے موسوم کردی گئی ہے۔ اُن کے نامِ نامی سے ضمیر فاؤنڈیشن بھی احباب نے قائم کی ہے۔ فاؤنڈیشن سے ہر سال ہزار روپے درس گاہ میں اوّل آنے والے اس بچّے کو دیے جاتے ہیں جہاں ہمارے ملک کے مایۂ افتخار، سرمایۂ ناز ضمیر جعفری نے تعلیم حاصل کی ہے۔

اب بہ ظاہر راوی چین لکھتا ہے مگر تخلیقی جرثومہ رگ و ریشہ سے پیوست ہو تو چین کہاں۔ قلم اُن کے وجود کا جزو ہے۔ پہلا شعری مجموعہ 'کارزار' 1940 میں شائع ہوا تھا۔ تصانیف کی تعداد اب چالیس سے متجاوز ہے۔ مزاح نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن سبھی اصناف میں خوب طبع آزمائی کی ہے۔ شعر و سخن اور مزاحیہ نثرپاروں کے علاوہ اخباری کالم نگاری میں بھی ضمیر جعفری کا اسلوب جداگانہ ہے۔ اُن کے کالم نوائے وقت، جنگ، غالب، بادِ شمال، خبریں، الاخبار اور کئی ہفت روزہ رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اُن کا تخلیقی

کے رجسٹر اور کوٹ میں اسلحہ کی پڑتال کرتے رہے۔ دونوں نے تلواریں لٹکا رکھی تھیں۔ ایک سارجنٹ کو ڈیوٹی اردلی کی اسٹک پسند آگئی۔ جاتے جاتے وہ اسٹک لے گیا اور کلائی سے اپنی گھڑی کھول کر ڈیوٹی اردلی کو دے گیا۔"

اب واقعات رُونما ہونے لگے۔ ایک روز کرنل صاحب نے پریڈ بلائی جو ہتھیاروں کے بغیر جنازے کا جلوس معلوم ہوتی تھی۔ کرنل صاحب نے حالات پر، جو روشن تھے، مزید روشنی ڈالی یعنی یہ کہ ملایا کی لڑائی ختم ہو چکی۔ اب ہم جاپانیوں کے قیدی ہیں۔ یہ آزمائش کا دور ہے جس کا سامنا حوصلے اور نظم و ضبط کے ساتھ کرنا ہے۔ یونٹ کی کمان کا موجودہ سلسلہ قائم رہے گا۔ البتہ اب ہم جاپانی افسروں کے حکم پر کام کریں گے۔ پھر جنگی قیدیوں کے طرزِ عمل سے متعلق ایک طویل ہدایت نامہ سنایا گیا۔ اسی شام صوبے دار میجر صاحب نے اپنے دربار میں یہ ہدایات دوبارہ نشر کرتے ہوئے بعض دفعات کی توجیہات سمجھائیں۔ مثلاً ایک دفعہ کچھ اس مضمون کی تھی کہ جو قیدی فرار ہونے کی کوشش کرے گا، اسے نہایت سنگین سزا دی جائے گی۔ جنگ کی سزاؤں میں موت ایک ادنا اور عام سزا ہوتی ہے لہٰذا ظاہر تھا کہ اس جرم کی سزا اذیت ناک موت ہوگی۔ لیکن صوبے دار میجر صاحب کا مشورہ یہ تھا کہ دفعہ خواہ کچھ کہتی رہے، ہم قید سے بھاگنے کی کوشش ضرور کریں گے۔ ہم قیدی ضرور ہیں مگر آزادی کی خواہش ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ صوبے دار میجر صاحب نے یہ الفاظ کچھ ایسے جوش اور جذبے سے کہے کہ اگر مصلحت کا خوف غالب نہ ہوتا تو ہم باآوازِ بلند زندہ باد کا نعرہ لگاتے۔

دوسرے روز یونٹ کا تمام اسلحہ بارود ٹرکوں میں لاد کر ایک جاپانی ڈمپ میں پہنچا دیا گیا۔ اس طرح ہماری قید پر گویا آخری مہر ثبت ہو گئی۔ جاپانیوں کی نگرانی میں یہ سارا کام خود ہمارے ہی جوانوں کو سرانجام دینا پڑا۔ آج ہمارے ہاتھ، ہمارے ہتھیار، ہماری گاڑیاں ان کے کام آرہی تھیں۔ مجبوری اور

سفر آج بھی تمام تر ذوق و شوق، چستی و مستعدی سے جاری ہے اور اب کچھ یوں ہے کہ جہاں جہاں اردو ہے، ضمیر جعفری کا نام رسا ہے۔

ادیبوں اور شاعروں کی، ہماری مردم خیز سرزمین میں کوئی کمی نہیں لیکن کبھی ضمیر جعفری سے مل کے دیکھیے، زندہ رہنے کو جی چاہے گا۔ مسئلہ تو یہی ہے کہ آدمی کون ہے، آدمی کہاں ہے۔ ضمیر جعفری آدمیت کا بھی اعتبار ہیں۔ پہلی مرتبہ آں سے ان سطور کے مرتّب کی یارِ جانی حضرت مولانا علامہ کوکب نورانی کے توسط سے ملاقات ہوئی تھی۔ اسلام آباد جانا ہوا تو فقیر نے فون کیا۔ کسی حجت کا موقع نہیں دیا، کہنے لگے، تیار رہنا، شام کو آرہا ہوں۔ راقم الحروف اپنے برادر مثال پروفیسر جمیل اختر خاں (سابق صدر شعبۂ اردو، کراچی یونی ورسٹی) کے ساتھ ایم این اے ہاسٹل میں ٹھیرا ہوا تھا۔ ٹھیک وقت پر شاہ صاحب بہ نفسِ نفیس دروازے پر دستکی تھے۔ سواری کسی کے پاس نہیں تھی۔ ٹیکسی میں افغان ریستورانوں کے علاقے کوچ کیا اور پہلی مرتبہ یہ بھرم بھی پاش پاش ہوا کہ ذائقے میں ایک دلی ہی کوئی شہر، عالم میں انتخاب نہیں تھا۔ دلّی کے کسی خدائی تخلیق کار نے شاید اپنے شہر سے آگے سفر نہیں کیا تھا۔ خوانِ افغان کا تجربہ تو ہمارے لیے لذت خیز، اشتہا انگیز تھا ہی، اصل سواد تو میزبان کا تھا۔ کیسا تپاک، کیا شفقتیں، کس درجے کا انکسار، وقت گزر گیا، وہ شام ابھی تک تازہ ہے۔

بات طویل ہو جائے گی، یقیناً اور بھی موقع آئیں گے، حضرت قبلہ سیّدی و مرشدی ضمیرِ قلم ضمیر جعفری کی ذات و صفات کے انکشاف و اعتراف کے۔ یہ "جروساں" کہانی جو اس تمہید و تعارف کا سبب بنی ہے، سنگاپور میں قیام کے دوران شاہ صاحب کی یادوں کا ماحصل ہے۔ پہلے یہ تحریر نقوش میں شائع ہوئی تھی۔ معلوم نہیں، اسے کہانی کہنا چاہیے یا واقعہ یا دونوں۔ آپ تو اندازِ بیاں، اسلوبِ نگارش دیکھیے۔ شاہ صاحب نے بیتے دنوں کی یادیں کس ہنرمندی اور خوش تدبیری سے مرتّب کی ہیں۔ شاعری، مزاح، صحافت اور صحافتی کالموں کی طرح سیّد صاحب قبلہ کچھ اس شہرِ خیالاں و خوابِ شعاراں، قصّہ خوانی و داستان نگاری کی طرف بھی توجہ دیتے تو کیا ستم کرتے!

مدیر

بے بسی کی اس سے زیادہ عبرت انگیز مثال میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ اس اسلحہ میں میری مونس و دم ساز رائفل بھی شامل تھی جسے میں نے ہمیشہ جان کی طرح عزیز رکھا تھا کیوں کہ وہ میری جان اور آبرو کی محافظ تھی۔ سچ کہتا ہوں کہ اس کے چھن جانے پر میرا اندوہ کسی عزیز ترین ہستی کی موت کے صدمے سے کم نہ تھا۔ قید کے دوران اور پھر خاتمہ جنگ پر میں نے اسلحہ کے مختلف قبرستانوں میں اپنی بچھڑی ہوئی رائفل بہت ڈھونڈی مگر نہ معلوم وہ جاپانیوں کے ساتھ کس محاذ پر جا پہنچی تھی اور عام سپر اندازی میں انھوں نے کسی محاذ پر کس فوج کے سامنے کہاں رکھ دی تھی۔

کچھ روز بعد سنگاپور بلدیہ کی عظیم الشان سلیٹی عمارت کے سامنے کھلے پاڈان (چمن) میں ایک بڑی پریڈ ہوئی جس میں سپر اندازی کی رسم ادا کرتے ہوئے انگریز سپہ سالار نے اپنی تلوار جاپانی سپہ سالار کے سامنے رکھ دی۔ نہ معلوم اس موقع پر انگریز جرنیل تلوار کہاں سے لایا ہوگا کیوں کہ مدت ہوئی تلوار کی حیثیت سے تلوار برٹش آرمی سے نکل چکی تھی۔ ہاں جاپانی فوج میں تلوار باندھنے کا رواج اب بھی موجود تھا۔

ہماری یونٹ اب بھی اسی زیرِ تعمیر ائرپورٹ پر متعین تھی۔ پہلے ہم اس کی حفاظت کرتے تھے، اب مشقت کرتے تھے۔ قیدی یونٹیں ضرورت و حالات کے مطابق ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیل ہوتی رہتی تھیں۔ ایک یونٹ جو قید کے وقت سنگاپور میں سڑک بنا رہی تھی، آزاد ہونے پر بورنیو میں سڑک بنا رہی تھی۔ ہم لوگ اس معاملے میں خوش قسمت نکلے۔ راشن کے اسکیل کی طرح گو کام کی نوعیت اور مشقت کا اسکیل بدلتا رہا مگر شروع سے آخر تک ہم اسی ٹاپو میں پڑے رہے اور جتھے بندی کی صورت بھی قریب قریب یوں کی توں باقی رہی۔

جنگی قیدی عموماً کیمپوں میں رہتے تھے۔ ہاں جو لوگ ’آئی این اے‘ میں شامل ہو گئے تھے، وہ باقاعدہ فوجوں کی طرح بارکوں میں رہتے۔ ان کی اپنی الگ تنظیم اور جدا ہیڈ کوارٹر تھا۔ لیکن ہماری طبیعت ادھر آئی ہی نہیں۔ ہمارا کرنل قید،

افسر قید' سردار قید' ہم بھی قید۔

پاؤں کے زخم کی وجہ سے میں ابھی کسی ڈیوٹی کے لائق نہیں تھا مگر ایک دن تڑکے تڑکے حوالدار بخش خاں دوڑا دوڑا آیا۔ "علی بہادر خاں! وردی پہن کر ایک دم تیار ہو جاؤ!" اس نے حکم دیا۔

"مگر استاد! میرا پاؤں۔" میں نے جواب دیا۔

"پاؤں واؤں کچھ نہیں یارا۔" حوالدار بخش خاں بولا۔ "ڈیوٹی ایسا ہے کہ پاؤں سر پر بھی رکھ کر جانا پڑے گا' ایک دم جانا پڑے گا۔ ہم کیا کرے۔"

"ایسی کیا ڈیوٹی پڑی ہے استاد؟"

"کوئی جاپانی کرنل ڈرائیور مانگتا ہے۔ اپنا سب ڈرائیور دسمینٹ ڈھونڈ رہا ہے۔ وہ اسی وقت ڈرائیور مانگتا ہے۔ تم پانچ منٹ میں تیار ہو جاؤ۔ اللہ مالک ہے یارا۔ جاپانی کرنل کا جیپ باہر کھڑا ہے۔ ایک جاپانی اس میں بیٹھا ہے۔ پانچ منٹ۔" حوالدار بخش خاں عجلت کی سیٹی بجاتا باہر جیپ کے پاس جا ٹھیرا۔ میں نے فوراً جنگل گرین وردی پہنی۔ شناختی کارڈ جیب میں رکھا۔ تیاری کے طور پر پاؤں کی پٹی کھول دی تاکہ زخم کا انکشاف واشگاف نظر آئے۔ پھر در و دیوار پر حسرت کی ایک نظر ڈالتے ہوئے جیپ میں جا بیٹھا۔ جاپانی سپاہی مجھے دیکھ کر مسکرایا پھر کچھ بڑبڑایا۔ میری سمجھ میں خاک نہ آیا۔

راستے میں کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ وہ کبھی کبھی میری طرف دیکھ کر مسکرا دیتا۔ میں بھی احتیاطاً تھوڑا تھوڑا مسکراتا' ذرا ذرا سر ہلاتا رہا۔

جاپانی کرنل ائرپورٹ کے قریب ہی ایک چھوٹے سے دو منزلہ بنگلے میں رہتا تھا۔ جیپ کی آواز سن کر نیکر پہنے ہوئے ایک ننگ دھڑنگ جاپانی برآمدے سے برآمد ہوا۔ میں سمجھا کرنل ہوگا۔ لنگڑا کر میں جیپ سے اترا' پاؤں جوڑ کر ٹھک سلوٹ کیا۔ وہ مسکرایا تو میری جان میں جان آئی۔ اشارے پر میں اس کے پیچھے پیچھے اندر ایک کمرے میں پہنچا جو بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ساز و سامان دیکھ کر شبہ ہوا کہ یہ کرنل نہیں ہو سکتا۔ بعد میں پتہ چلا کہ میری طرح کا سپاہی ہے۔ کرنل اوپر تھا۔

تھوڑی دیر میں جاپانی اپنے تھیلے سے گھڑی نکال لایا۔ اس نے اشارہ کر کے مجھ سے پوچھا۔ "تمھارے پاس گھڑی ہے؟" میں نے گردن اور ہاتھ نفی میں ہلا دیے۔ وہ تھیلے سے ایک پینسل نکال لایا۔ گھڑی میرے سامنے رکھ کر اس نے بارہ کے ہندسے پر پینسل کی نوک رکھی پھر منہ سے موٹر اسٹارٹ ہونے' ہارن بجنے کی آوازیں نکالیں۔ پھٹ پھٹ۔ پیں پیں پیں۔ میں سمجھ گیا کہ کرنل صاحب کو بارہ بجے موٹر کی ضرورت ہوگی۔

پھر اس نے اپنی جیب سے ایک فوٹو نکال کر مجھے دکھایا وہ اپنی بیوی اور تین بچّوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اشاروں میں مجھ سے کچھ پوچھتا رہا۔ غالباً میرے بیوی بچّوں کی بابت پوچھتا ہوگا۔ یہاں شادی تک نہیں ہوئی تھی مگر اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنے کی خاطر میں نے اسی فوٹو کی مدد سے اور ہاتھ کی انگلیاں اٹھا اٹھا کر یہ بتانے کی کوشش کی کہ میری ایک بیوی اور تین بچّے ہیں۔ خدا معلوم وہ کچھ سمجھا یا نہیں۔

اتنے میں اوپر سے کرنل صاحب اتر آئے۔ انھوں نے بھی صرف نیکر پہن رکھی تھی۔ قد' کاٹھ' ڈیل ڈول بھی ویسا ہی' پہلے انھوں نے اپنے سپاہی سے کچھ پوچھا پھر میرے قریب آگئے۔ ہاتھ ملایا۔ زخم دیکھا تو پاؤں پر جھک کر "چچ۔ چچ" کرتے رہے۔ پھر گھڑی پر بارہ کا ہندسہ مجھے دکھا کر منہ سے موٹر کا ہارن بجاتے ہوئے اوپر چلے گئے۔ کرنل کے جانے پر میری طرح جاپانی سپاہی نے بھی اطمینان کی سانس لی مگر چند سانسیں ہی لی تھیں کہ چوبی زینوں سے پھر ٹھک ٹھک کی آواز آئی۔ کرنل صاحب پھر چلے آرہے تھے۔ اب ان کے ہاتھ میں عمدہ جاپانی سگریٹوں کے دو پیکٹ تھے جو وہ مجھے تھما گئے۔

بارہ بجے کرنل نہایت سج دھج کی وردی پہن کر باقاعدہ کرنل بنا ہوا اترا۔ موٹر خانے سے اس نے موٹر نکالی اور مجھے پچھلی سیٹ پر بٹھا کر سیدھا اسپتال پہنچا جہاں ایک چھوکرے سے جاپانی ڈاکٹر نے بڑی توجہ سے میری مرہم پٹی کی۔

پھر کرنل سرانگون روڈ کے ایک دفتر میں بیٹھا رہا اور واپسی پر مجھے میری بیرک کے سامنے چھوڑ گیا۔ سرانگون روڈ پر جنگی قیدیوں کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ کرنل وہاں کا اعلیٰ اسٹاف افسر تھا۔ جب تک وہ دفتر کے اندر رہا' میں باہر اسٹاف کار میں بیٹھا

سگریٹ پیتا رہا۔ ایک مرتبہ اندر سے میرے لیے چائے بھی آئی۔

شام کو یاروں کی منڈلی جمع ہوئی تو ساتھیوں میں سگریٹ کا بچا ہوا پیکٹ تقسیم کیا گیا۔ دن کی رُوداد سنائی گئی جس پر دوستوں نے مبارک باد دی۔ ابھی خوش گپیاں ہو رہی تھیں کہ حوال دار بخش خاں آگئے۔ "یار! تم نے جاپانی کرنل پر کیا طلسم مارا ہے؟ ٹیلی فون آیا ہے' کل آٹھ بجے وہ ادھر خود تم کو لینے آئے گا۔ ایک دم تیار رہنا۔"

اب یہ روزانہ کا معمول ہو گیا کہ وہ صبح آکر مجھے اسپتال لے جاتا' مرہم پٹی کراتا اور ہیڈ کوارٹر سے واپسی پر مجھے میری بیرک میں چھوڑ جاتا۔ دو وقت چائے اور سگریٹوں کے دو پیکٹ کا روزینہ الگ مقرر تھا۔ قید کی حالت میں یہ کیفیت گویا دن عید اور شب شب برات سے کم نہ تھی۔ میں مصروف سرانگون روڈ پر دن بھر قیدیوں کے قافلے جس حال میں دیکھتا' اس کے بعد خود کو دیکھتا تو اللہ کا ہزار ہزار شکر بجالاتا۔ کام نہ دھام' دن بھر موٹر میں بیٹھا رنگا رنگ انسانوں کا سیلاب رواں دیکھتا رہتا۔ انڈین قیدیوں کے نمایندوں کو احکام و ہدایت کے لیے روزانہ اس ہیڈ کوارٹر میں آنا پڑتا تھا۔ ان سے بھی ملاقات ہو جاتی' بچھڑے ساتھیوں کی خیر خبر مل جاتی۔

سرانگون روڈ سنگاپور کی ہندوستانی سڑک تھی۔ آس پاس جنوبی ہند کے تامل ہندو یا چولیا مسلمان آباد تھے۔ ہاٹ بازار بھی انھی لوگوں کے تھے۔ وہ آبے کے سکھ جاگے (چوکی دار) اور مسلمان گوالے بھی عام نظر آتے۔ گویا اس اعتبار سے سرانگون روڈ میرے لیے دل چسپ ترین شاہ راہ تھی۔ ہمارے ہیڈ کوارٹر سے ذرا ہٹ کر سیال کوٹ کے ایک حاجی صاحب نے چھوٹا سا درزی خانہ کھول رکھا تھا جہاں وہ گجراتی وضع کا چوڑا حقہ ہر وقت گڑگڑاتا رہتا۔ مجھے بھی جب موقع ملتا' وہیں جا بیٹھتا' حقے کا دور چلتا' گپ شپ رہتی' دیس کی کچھ خبریں مل جاتیں۔

بازو کا زخم مندمل ہونے پر اسٹاف کار میں ہی چلا آتا تھا۔ اب مجھے ایک سائکل بھی دے دی گئی تھی۔ میں عموماً گاڑی بند کر کے شام کو یونٹ میں چلا جاتا۔ ایک دن اناڈی (کرنل کے اردلی) نے حکم سنایا کہ بوریا بستر یہیں اٹھا لاؤ۔ میرے لیے یہ بڑا گراں حکم تھا۔ رات کو یاروں کی منڈلی میں ہنس بول کر قید اور مسافرت اور تنہائی کا غم غلط کرنے کی چند ساعتیں مل جاتی تھیں' اب ان سے بھی محروم ہونا پڑے گا۔ حکم حاکم' مرگ مفاجات۔ دوسرے دن ہم اپنا مختصر سا بستر' مچھر دانی' کٹ بیگ اور حوال دار بخش خان کا مشہور و معروف حقہ عاریتاً مانگ کر بنگلے پر اُٹھ آئے۔ اناڈی نے حقہ نیچے سے اوپر تک بڑے غور سے دیکھا۔ میں نے حسبِ توفیق اس کی تکنیک سمجھائی' مشین چالو کر کے دکھائی۔ کرنل نے حقہ دیکھا تو ارشاد ہوا کہ یہ چیز یہاں نہیں چلے گی۔ چناں چہ اسی شام حقہ واپس اپنے تھان پر پہنچ گیا۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

اب میں رہتا تو بنگلے پر تھا مگر دونوں وقت کا کھانا بدستور لنگر پر جا کر کھاتا۔ یہ بھی دراصل بھائی بندوں سے ملنے اور حقہ پینے کا بہانہ تھا ورنہ بنگلے پر مجھے کھانے والے کی کوئی کمی نہ تھی۔ چاول' چائے' چینی' کافی' مکھن' میوہ' ہر چیز بہ افراط موجود تھی۔ آٹھویں دسویں کرنل کی ماں (وہ بھی کنوارا تھا) جاپان سے تحائف کی ٹوکری بھیج رہتی۔ اناڈی با اختیار اہلِ کار اور طبعاً نیک دل آدمی تھا۔ خود بھی کھاتا' ہمیں بھی کھلاتا مگر ہم نے اپنے لنگر کا دامن نہ چھوڑا بلکہ وقتاً فوقتاً چینی' چائے وغیرہ لنگر کو بھی سپلائی کرتے رہے۔

ابتدا میں کچھ عرصے زبان کی دقت ضرور حائل رہی مگر چوں کہ گھر کا ماحول' روزانہ کا معمول' افراد کی طبیعتیں سمجھ میں آگئی تھیں اس لیے اشاروں میں بول چال کی زبان آپ ہی آپ تخلیق ہو گئی تھی۔ کئی جاپانی الفاظ خود بہ خود زبان پر چڑھ گئے تھے لیکن کرنل اس صورتِ حال سے مطمئن نہ تھا۔ چناں چہ ایک دن وہ کہیں سے ایک جاپانی سارجنٹ کو پکڑ لایا جو رومن اردو جانتا تھا۔ اب وہ روزانہ ڈیڑھ دو گھنٹے رومن حروف میں مجھے جاپانی زبان پڑھانے لگا۔ میں نے بھی یہ سوچ کر کہ نہ معلوم یہ قید کب تک چلے' جی جان لگا کر جاپانی سیکھنی شروع کی اور تھوڑے ہی عرصے میں فر فر جاپانی بولنے لگا' اس دوران ایک دل چسپ لطیفہ ہوا میں اپنے یونٹ سے رومن اردو کی ایک کتاب اٹھا لایا تاکہ مانوس اسباق کا ترجمہ جاپانی میں پڑھ سکوں۔ کتاب کے بعض اسباق

سرکار انگلشیہ کی برکات سے لب ریز تھے۔ سارجنٹ نے مطالب سوجھے تو کتاب یہ کہہ کر باہر دھان کے کھیت میں پھینک دی کہ "یہ بکواس تو میں کبھی نہ پڑھاؤں۔"

میں مجید کی پوری مدت اسی بنگلے پر رہا۔ نچلی منزل میں پہلے اناڈی پھر منشی سے رفاقت رہی۔ کرنل مجھ پر ہزار مہربان سہی لیکن میرے اصل معاصرین یہی دونوں تھے۔ اناڈی تیز طرار، طرح دار اور حالاتِ حاضرہ سے خاصا باخبر نوجوان تھا۔ سیر سپاٹے کا بھی شوقین۔ وطن میں کسی لڑکی سے معاشقہ بھی چل رہا تھا، جسے وہ تقریباً روزانہ ایک طویل خط لکھتا۔ محبوبہ کا خط آتا تو کئی کئی روز ایک عجیب خمارِ مسرت میں اڑا اڑا پھرتا، باجا بجاتا، جھومتا گاتا، ناچتا کودتا۔ رات کو سامنے اپنی محبوبہ کی تصویریں پھیلا کر بیٹھ جاتا، ایک ایک فوٹو دس دس زاویوں سے دیکھتا۔ مجھے دکھاتا، داد کا طالب ہوتا۔ میں واہ واہ کے ڈونگرے برساتا۔

ہماری گفتگو زیادہ تر جاپان اور انڈیا کے بارے میں ہوتی۔ وہ مجھ سے انڈیا کی باتیں پوچھتا۔ عقیدے، رسم و رواج، کھانا پینا، عشق و محبت، ہر موضوع پر بحث رہتی۔ اسے ان باتوں کا چسکا تھا۔ ادھر مجھے اس طرح کی گفتگو کی قطعاً کوئی ٹریننگ نہ تھی۔ بہرحال اس کے شوق کا ساتھ دے رہا تھا۔ جو کچھ جیسا سمجھ میں آتا کہہ دیتا۔ بعد میں تو میں حوالدار منشی خاں سے حالاتِ حاضرہ اور کوائفِ ملکی کا باقاعدہ درس لینے لگا تاکہ اناڈی سے کچھ تو برابر کی چوٹ رہے۔ باتوں کا ماحصل عموماً ایک مشترکہ حیرت ہوتی۔ اسے انڈیا پر مجھے جاپان پر۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے کتنے ناواقف تھے لیکن یہ سب رات کی بات تھی۔ دن کو اس کے تیور یکسر بدل جاتے۔ کیا مجال کہ ڈیوٹی میں ایک آنچ کی کسر رہنے دے۔ جاپان کی جنگ وہ اپنی ذاتی جنگ سمجھتا تھا۔ شہنشاہ کے لیے تن من دھن ہر چیز قربان کر دینے پر ہر وقت آمادہ۔ ڈیڑھ دو برس کی یکجائی کے بعد اناڈی کو برما کے محاذ پر جانا پڑا اور پھر اس کی کوئی خبر نہ آئی۔

منشی جسے ہم منشی کہتے، نسبتاً خاموش طبع آدمی تھا، دن بھر کام میں جتا رہتا۔ کاشت کار خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اناڈی کے مقابلے میں اس کا جسم زیادہ گٹھا ہوا تھا۔ لہجے میں وسی ملائمت بھی نہ تھی۔ ورزش کا شوقین تھا مگر ساتھ ساتھ مصوری بھی کرتا تھا۔ ایک دفعہ قومی کھیلوں کے تذکرے میں میں نے اپنے ہاں کی کبڈی کا نقشہ کھینچا تو اس کھیل پر ایسا فریفتہ ہوا کہ ہفتے میں ایک دو بار مجھ سے کبڈی ہونے لگی۔ میرے لیے یہ بڑی آزمائش کا مرحلہ ہوتا۔ اگر میں اسے پچھاڑ دیتا تو اس طرح غضب ناک ہو جاتا جیسے ایک ملک نے دوسرے ملک کی توہین کر دی ہو۔ وہ زخمی شیر کی طرح جھپٹتا اور جب تک مجھے پچھاڑ کر زمین پر خوب رگڑ نہ لیتا، اسے کل نہ پڑتی۔ اگر میں دو تین پالیاں لگا کر ہار جاتا تو وہ الگ خفا ہوتا کہ میں اسے اسپورٹس مین نہیں سمجھتا، ناراض ہو کر کہتا۔ "میں وہ جیت شکست سے بدتر سمجھتا ہوں جو رعایت سے حاصل ہو، اگر تم نرمی سے کام لو گے تو میں تمہارے ساتھ سختی سے پیش آؤں گا۔" چنانچہ جب تک میں اسے پچھاڑ کر زمیں پر اچھی طرح رگڑ نہ لیتا، اس کی برہمی دور نہ ہوتی۔ وہ جسم سے دھول جھاڑتا اٹھتا، اٹھ کر مجھے شاباشی دیتا کہ میاں جیتے رہو، کیا پکڑ ہے، کیا چھل بل ہے! واہ واہ۔ کیوں نہ ہو، آخر انڈیا کے چیمپئن ہو۔ گویا وہ کبڈی میں انڈیا کے چیمپئن کے مقابلے میں صف آرا تھا، اور میں بھی چیمپئن بنا ہوا تھا۔

لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ وہ یہ کھیل بڑی رغبت سے کھیلتا تھا اور اس نے اس میں حیرت انگیز قدرت و مہارت پیدا کر لی تھی۔ یونٹ سے ایک 'دوتارا' اٹھا لایا تھا جب سے دوتارے پر وہ سیف الملوک کے بیت سنتا۔ سیف الملوک کے بیت سنانا تو خیر کوئی بات نہ تھی۔ مشکل بات یہ تھی کہ شعروں کا جاپانی میں ترجمہ بھی کرنا پڑتا تھا اور جیسا تیسا میری سمجھ میں آتا، میں کر دیتا۔ ترجمہ سن کر وہ بڑا حیران ہوتا، کہتا۔ "تمہارے شاعر تو بالکل ہمارے شاعروں کی طرح باتیں کرتے ہیں، اور سناؤ، اور سناؤ!"

رفتہ رفتہ سیف الملوک کی ابیات سے اس کی یہ دل چسپی میرے لیے اچھا خاصا وبال بن گئی۔ ہر روز میں نئے نئے شعر کہاں سے لاتا۔ میں سخت گھبرایا۔ حوالدار منشی خاں سے میں نے اپنی پریشانی کا ذکر کیا تو وہ ہنس کر بولے۔ "علی بہادر! تم جیسا احمق بھی شاید ہی کوئی ہو۔ پگلے! شعر پرانے سناؤ، ترجمہ نیا بناؤ۔" یہ نسخۂ دانش کارگر ثابت ہوا۔ بلکہ بعد میں

ایک اساتذہ یہ قول آئی کہ "مثنوی شعر مثنوی نہیں تھا صرف ترجمہ سنتا تھا۔ اسے دراصل میرا گانا پسند ہی نہ تھا۔ اسے بھی ہمارے کی موسیقی سے رغبت تھی یا شعر کے معنی سے۔ چنانچہ اب میں وہ ہمارے پر اشعار کا ترجمہ سناتا۔ "مثنوی گوارا کرتے" سے لے کر "بھی لالہ کی صحبت سے توں گی" تک کی جاپانی لوک گیتوں' کی حرفوں کا ترجمہ میں نے وہ ہمارے پر سنا ڈالا۔ البتہ مثنوی خان کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے میں نے ایک کام ضرور کیا کہ بول خواہ کیسے ہی ہوں' ترجمے کا اتفاق یہ ہے میں اپنی طرف سے اتنا اونچا رکھتا جیسے کسی جلسے میں مثنوی مولانا روم کا ترجمہ سنایا جا رہا ہو۔

کرنل کا سلوک شروع ہی سے کچھ طرف نہ تھا۔ زبان کی دشواری دور ہوئی تو میں اس کے اور قریب ہو گیا۔ میں روانی سے جاپانی بولتا تو وہ بڑا خوش ہوتا۔ افسروں کے سامنے مجھے فخر سے پیش کرتا۔ میں جاپانی بولتا' وہ تالیاں بجاتے۔ میں نہ جانے کتنے بڑے بڑے افسروں کے ساتھ جاپانی بول گیا۔

جیسا کرنل کم گو سا تنہائی پسند شخص تھا۔ ڈیوٹی کے بعد کم ہی گھر سے نکلتا۔ باغبانی اور مطالعہ' بس یہ دو مشاغل تھے۔ دفتر سے آتا تو مختصر باغبانی کرتا۔ کتاب ہر وقت ہاتھ میں رہتی۔ راتوں کو دیر تک باہر گھومنے کا بھی عادی نہ تھا۔ کوئی دوست جاپانی ہوتی تو صرف خود کار ہی لے جاتا۔ میں ساتھ ہوتا تو میرے کھانے پینے کا بڑا خیال رکھتا۔

باغبانی سے اس کا شغف دیکھ کر میں اکثر اس کا ہاتھ بٹانے لگتا۔ اس پر وہ بڑا خوش ہوتا۔ گھل مل کر پھول پھول باتیں کرتا۔ ایک روز اس نے پوچھا۔ "تم لوگ پھول اگاتے ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "ہمارے ہاں تو پھول ہی پھول نظر آتے ہیں اور مجھے تو پھولوں سے عشق ہے۔ میں نے خود اپنے گھر کے آگے پیچھے طرح طرح کے پھول لگا رکھے تھے۔ نہ معلوم اب وہ کھلتے ہیں یا مرجھا چکے۔" پھولوں سے اپنے عشق کے ثبوت میں مجھے پھولوں سنگاپور کے اس گرم مرطوب خطے کے لان میں پھولوں کا باغ لگانا پڑتا۔

ایک روز کرنل اور میں پھلواری میں نوشوں کی بیجی درست کر رہے تھے۔ کرنل بولا۔ "تمہارا نام تو ہم نے پوچھا سارجنٹ ہی نہیں۔"

"میرا نام علی بہادر خان ہے۔"

"یہ تو بڑا مشکل نام ہے۔ یہ تو اتنا ہی لمبا ہے۔ یہ نام نہیں چلے گا۔ آج سے تمہارا نام جرو سان ہے۔ آج سے تم فی پان (جاپانی) ہو۔" اور پھر کرنل نے مجھے پکارا "جرو سان!"

"جناب عالی!"

میں جرو سان بن گیا اور پھر دوسرے دن جاپانی ٹوپی لگا کر باقاعدہ فی پان بن گیا۔ یہ میرے لیے بڑا فائدہ مند ثابت ہوا۔ میں ایک بالکل عام قیدی تھا مگر کرنل نے مجھے جنگی قیدیوں کے جاپانی ہیڈ کوارٹرز کا امتیازی بیج دے دیا تھا جو بازو پر باندھ کر میں ہر جگہ بے روک ٹوک گھوم سکتا تھا۔ دوسرے قیدی مجھے رشک کے علاوہ کبھی کبھی خوف کی نظروں سے بھی دیکھتے۔ یہ سب فی پان ہونے کی برکتیں تھیں۔

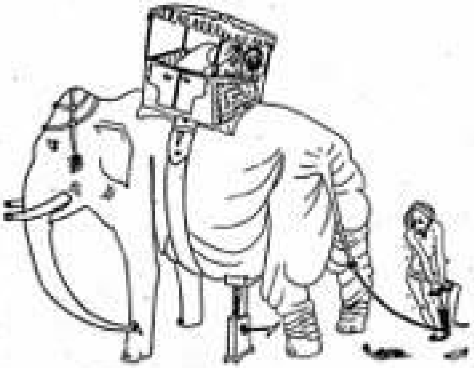
آئی این اے میں بھرتی کا بڑا زور تھا۔ ایک دن کرنل کہنے لگا۔ "جرو سان! تمہارا کیا خیال ہے؟"

میں اس سوال پر سخت گھبرایا۔ وہ تو یہ کہیے' خدا نے یاوری کی۔ فوراً جواب دیا۔ "مجھے آئی این اے میں شامل ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ میں تو فی پان ہوں۔"

کرنل اس زور سے ہنسا کہ اس بے ساختہ پن کے ساتھ اسے میں نے کبھی ہنستے نہیں دیکھا تھا۔ بولا "ہاں ٹھیک ہے۔ جرو سان فی پان ہے۔" فی پان کی تکرار سے بات بھی ٹل گئی۔

ایک دن کرنل نے مجھے دفتر میں بلایا۔ اس کی طبیعت کچھ مکدر نظر آئی۔ پریشان پریشان سے تھے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ سوچا شاید اتحادی لڑنے والوں کی طرف سے شکست کی خبر آئی ہے۔ ایسی خبر آتی تو ملایا کے تمام جاپانیوں کا موڈ سخت برہم ہو جاتا۔ کرنل کہنے لگا۔ "جرو سان! ہم پوچھتے ہیں کہ تم محمد ہو یا ہندو؟" (مطلب یہ تھا کہ مسلمان ہو یا ہندو) میں نے اپنی تمام حقیقت کھول کر بیان کی۔ سن کر وہ بولا۔ "ٹھیک ہے کوئی بات نہیں۔ ایک قیدی کیمپ میں چند محمد لوگ ایک آوارہ گائے کاٹ کر کھا گئے ہیں۔ اس پر ہندو فوجی لوگ شور مچا رہے ہیں۔"

اس واقعے کے بعد وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی عقائد و احساسات کے بارے میں بھی مجھ سے کبھی کبھی



سوالات کرتا رہتا۔ ظاہر ہے کہ میں خاندانی باتیں تو نہیں کر سکتا تھا' غلط بیانی کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا۔ تاہم جہاں تک ممکن تھا' میں دونوں فریقوں کو زیادہ سے زیادہ معلومات دلوانے کی کوشش کرتا رہا۔

ہا   اپنا پیام محبت تھا جہاں تک پہنچا

میرے گھر بار' بال بچوں کے بارے میں اکثر پوچھتا۔ میں چونکہ ایک بیوی اور تین بچے شروع میں بتا چکا تھا' لہٰذا اول سے جوڑ جوڑ کر بیوی بچوں کے نام' عادات اور مشاغل پر روشنی ڈالتا رہتا۔ بیوی بچوں کا ذکر کرتے ہوئے بسا اوقات میری آنکھوں میں آنسو بھی آ جاتے کیوں کہ دراصل جب میں بیوی بچوں کا ذکر کرتا تو میری آنکھوں کے سامنے اپنے بوڑھے ماں باپ اور چھوٹے بہن بھائیوں کی شکلیں آ جاتی تھیں۔ میرے آنسو دیکھ کر کرنل مجھے بہت سی تسلیاں دیتا اور کہتا: "میں بھی اپنی بیوی کو یاد کر رہا ہوں۔"

کچھ عرصے سے یہ افواہیں تو سن رہے تھے کہ اتحادیوں کا پانسا غالب آ رہا ہے۔ جرمنی دم توڑ چکا ہے۔ برما میں جاپانیوں کے قدم اکھڑ رہے ہیں مگر ہم قیدیوں کا اوڑھنا بچھونا صرف افواہیں تھیں۔ کہ خود دیکھتے تو ملایا میں بے شمار جاپانی فوج کیل کانٹے سے لیس پڑی تھی جس کا جتھا مضبوط اور زوال تک بیگانہ ہوا تھا۔ ان کے حوصلے بھی اب تک بلند تھے۔ کم از کم ہمیں کسی بے چینی کے آثار نظر نہ آتے۔ ان حالات میں اگرچہ ہم دل میں جاپانیوں کی شکست کی آرزو تو ضرور کرتے کہ دوبارہ وطن کے ساحلوں اور کھیتوں کی روشنی دیکھ سکیں مگر صورت حال کا قطعی علم نہ تھا کیوں کہ جو ریڈیو ہمارے ارد گرد گونجتے تھے' ان کی رو سے تو جاپان کا ہر قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ مایوسی کے لمحات میں ہم کبھی کبھی سوچتا شاید پچھلے ہم عمر اسی بنگلے کے لان میں کو بھی ٹہلتے ہوئے میں گزر جائے گی۔

ایک دن میں کچھ اسی طرح کی کیفیت میں سر جھکائے بیٹھا تھا کہ اچانک کرنل میرے کمرے میں آیا۔ جناب نے تمغوں سمیت پوری وردی پہن رکھی تھی۔ نقش و نگار والی تلوار ہاتھ میں تھی۔ میں سمجھا کسی تقریب یا پریڈ میں جا رہے ہیں۔ دیکھا تو کرنل کا چہرہ متغیر نظر آیا۔ میرے قریب آکر اس نے باقاعدہ فوجی انداز میں مجھے سلام کیا اور تلوار کھینچ کر میرے سامنے بڑھاتے ہوئے بولا: "جنرل صاحب! جاپان لڑائی نہیں ہارا مگر جنگ ہار گیا۔ شہنشاہ نے ہتھیار ڈالنے کا حکم دے دیا۔ جنرل صاحب! آج ہم تمہارے قیدی ہیں۔"

میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ دو آنسو نکل کر تلوار کے چمکتے ہوئے پھل پر پھسل گئے۔ یہ اپنی اچانک آزادی پر بے پایاں مسرت کے آنسو تھے یا کرنل کی مروت پر احسان مندی کا نذرانہ' میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔